مرتب
ڈاکٹر رشید امجد

پاکستانی ادب

۱۹۴۷ء-۲۰۰۸ء

انتخاب افسانہ

اردو

مرتب

ڈاکٹر رشید امجد

اکادمی ادبیات پاکستان،

اسلام آباد، پاکستان

نگران	:	فخر زمان
منتظم	:	خالد اقبال یاسر
تدوین وطباعت	:	سعیدہ درانی
اشاعت	:	2009
تعداد	:	پانچ سو
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	شناخت پریس، لاہور
قیمت	:	غیر مجلد: -/650 روپے
		مجلد: -/670 روپے

ISBN:978-969-472-202-2

Pakistani Adab

1947-2008

Intakhab urdu (Afsana)

Compiled By

Dr.Rashid Amjad

Publisher

Pakistan Academy of Letters

Islamabad,Pakistan

ترتیب

ooo

جارہی ہیں۔

اس انتخاب کا بنیادی مقصد اکسٹھ سال میں لکھی جانے والی نثر کا ایسا مجموعہ سامنے لانا ہے جس سے ہمارے اردو ادب کے مزاج اور رفتار کا تعین ہو سکے اور ایک ایسی عمومی تصویر سامنے آئے جس سے ہمارے قومی مزاج کی ترجمانی بھی ہو اور پاکستانی معاشرے کی ایک بھرپور تصویر کشی بھی ہو سکے۔ یہ انتخاب اکسٹھ سالوں کی بہترین تحریروں پر مشتمل نہیں بلکہ اس عرصہ میں لکھی جانے والی تحریروں کا ایک ایسا انتخاب ہے جس کا مقصد پاکستانی ادب کی ایک عمومی تصویر سامنے لانا ہے۔ کسی بھی انتخاب کے حسن و قبح پر بہت سی باتیں کی جا سکتی ہیں اور یہ بھی کہ کوئی بھی انتخاب کتنی ہی دیانتداری اور غیر جانب داری سے کیا جائے تکمیل کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ہم نے اپنی سی سعی کی ہے کہ ذاتی پسند یا ناپسند سے بالاتر ہو کر قومی سطح پر ایک انتخاب کیا جائے۔

اکادمی ادبیات پاکستان ڈاکٹر رشید امجد کی شکر گزار ہے کہ انہوں نے مسودے کو مرتب کیا۔

فخر زمان

پاکستانی اردو افسانہ: چند باتیں

تقسیم کے بعد پاکستانی افسانے کو اردو افسانے کی جو روایات ورثے میں ملیں ان میں ترقی پسند تحریک کی موضوعاتی وسعت اور حلقہ ارباب ذوق کی فنی جمالیات اور کسی حد تک ہیئت سازی شامل تھیں۔ اس وقت افسانہ زندگی کے کُل کی عکاسی کر رہا تھا کہ اس میں خارج کی تمام صورتیں اور باطنی دنیا کے معاملات موجود تھے۔ اگر ترقی پسند افسانے نے طبقاتی جبر اور عام آدمی کے مواضعات کو اہمیت دی تھی تو دوسری طرف حلقہ نے نفسیات، جنسیات اور کسی حد تک رومانیات کو بھی افسانے کا موضوع بنا دیا تھا۔ لیکن تقسیم کے فوراً بعد فسادات نے ساری صورت حال کو بدل دیا۔ یہ اتنا بڑا انسانی المیہ تھا کہ اس دور کا شاید ہی کوئی افسانہ نگار ایسا ہو جس نے اس موضوع پر نہ لکھا ہو۔ پاکستانی افسانے میں فسادات کا موضوع گڈریا (اشفاق احمد) تک موجود رہا۔ اُس کے بعد جن موضوعات نے افسانے میں پذیرائی حاصل کی ان میں ایک ہجرت کا دکھ، پرانی یادیں، ماضیت اور دوسرے نئی مملکت کے مسائل جن میں خوابوں کے ٹوٹنے کا المیہ اور لوٹ کھسوٹ کے ایک نئے دور کے آغاز کا المیہ شامل تھے۔ ناسٹولجیا کے اثرات ساٹھ کی دہائی اور بعد میں بھی موجود رہے۔ سماجی المیے طبقاتی جبر کی بڑھتی صورتوں اور ایک نئی طرح کی کالونیت نے فسادات سے بچ کر آنے والوں کے دلوں پر مرہم رکھنے کی بجائے ان پر نمک چھڑکا۔ فنی طور پر سنتالیس سے ساٹھ تک کا زمانہ خارجی حقیقت نگاری اور سادہ بیانہ کا دور ہے۔ بیانیہ اس عرصہ کا مجموعی اسلوب ہے۔ جس میں انفرادی رنگ و انداز موجود ہیں۔ موضوعات میں خارجی مناظر نمایاں ہیں مجموعی طور پر ان سالوں کا افسانہ زیادہ تر خارجی حقیقت نگاری اور سادہ بیانیہ کا افسانہ ہے۔

ساٹھ کی دہائی میں پاکستانی افسانہ جس نئے مزاج سے آشنا ہوا، اس کے پس منظر میں اردو افسانے کی ایک بڑی روایت موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ منٹو کی موت افسانے کے ایک دور کا خاتمہ اور ایک نئے دور کا آغاز تھا، وہ یوں کہ منٹو اردو افسانے کی ایک بڑی روایت کا نمائندہ تھا اور اس کی موت کے ساتھ ہی گویا یہ روایت بھی اختتام پزیر ہوئی لیکن منٹو نے ''پھندنے'' لکھ کر ایک نئی روایت کی بنیاد رکھ دی تھی۔ فکری پس منظر میں ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق دونوں کے اثرات اردو افسانے میں موجود تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی نے پاکستان میں ترقی پسند فکر کو منشور کی قید سے آزاد کر دیا تھا جس کا مثبت اثر یہ ہوا کہ ترقی پسندوں کی اکثریت حلقہ کے جلسوں میں آنے لگی، یوں فکر و فن کا ایک بہتر امتزاج سامنے آیا۔ مجموعی طور پر اس دور کا افسانہ فنی جمود کا شکار ہے۔ فنی اور فکری تبدیلی کا عمل ساٹھ کی دہائی میں وقوع پزیر ہوا جب نئی لسانی تشکیلات کے حوالے سے جدید فنی وسائل میسر آئے جس نے دیکھتے ہی دیکھتے نئی پاکستانی نسل کے افسانہ نگاروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

تقریباً اس کے آگے پیچھے مشرقی پاکستان میں بھی نئے افسانے کی تحریک شروع ہو گئی تھی اور کئی افسانہ نگار نئے

الجھنوں کا زمانہ ہے۔ پہلا مارشل لا
ساٹھ کی دہائی پاکستانی معاشرے میں سماجی اور سیاسی دونوں حوالوں سے
لگے دو سال ہو چکے تھے اور اس کی ظاہری چمک ماند پڑ چکی تھی۔ نئی لسانی تشکیلات کے نتیجے میں علامتی انداز اگرچہ فنی
حوالوں ہی سے سامنے آیا تھا لیکن پس منظر میں کہیں نہ کہیں سیاسی جبر کا دباؤ موجود تھا۔

ساٹھ کی دہائی بے یقینی اور تشکیک کا زمانہ ہے۔ چنانچہ اس دور میں جو افسانہ لکھا گیا وہ خارج کی بجائے باطن کی غواصی کرتا ہے، اسے فرد کی کہانی کہا گیا ہے۔ یہ کہانی دوسری ذات کی تلاش اور شناخت کا سفر ہے۔ پاکستانی افسانے کے رویے کو سیاسی پس منظر سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ سیاسی سطح پر یہ دور قومی شناخت کی گمشدگی کا دور ہے۔ چنانچہ اس دور کی کہانی میں شناخت ایک اہم موضوع ہے۔ ایک اور حوالہ سے یہ غیر وابستگی کا دور بھی ہے اور کسی حد تک اسے بیک وقت ترقی پسند تحریک کا ردعمل اور توسیع بھی کہا جا سکتا ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کا سارا زور خارجیت اور حقیقت نگاری پر صرف ہوا۔ ساٹھ کی دہائی میں اُس حقیقت نگاری اور بیانیہ کا تصور بدل گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ معاشرے میں ہیرو اور واضح نصب العین موجود نہیں تھا اور ہیرو کی غیر موجودگی میں ٹھوس کردار کی بجائے سایہ سایہ کردار وجود میں آئے۔ ساٹھ کی دہائی کے یہی موضوعات ہیں یعنی داخلیت، فردیت، غیر وابستگی، دوسری ذات کی تلاش، شناخت کا بحران۔

ساٹھ کی دہائی میں علامتی افسانے کا آغاز اچانک نہیں ہو گیا۔ اس سے پہلے منٹو کا ''پھندنے'' آ چکا تھا۔ کرشن چندر، عزیز احمد اور کچھ دوسرے سینئر لکھنے والوں کے یہاں بھی تبدیلی کا احساس جنم لے رہا تھا۔ منٹو کی موت کو اگر ایک عہد کا خاتمہ کہا جائے تو اب نئے عہد کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں۔ ''استانزے'' اور ''ماخذ'' کے دیباچوں نے نئی لسانی تشکیلات کی طرف متوجہ کیا۔ بہت سے دوسرے لکھنے والوں کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ لفظوں کے استعمال اور طرزِ اظہار کے مروجہ طریقوں میں اب ایک ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ سو نئی لسانی تشکیلات کی بات چل نکلی۔ نئے لکھنے والے اس سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اس میں کچھ سینئر لکھنے والوں کا نئے لوگوں کے ساتھ رویہ بھی تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر تحریک کے آخری دور کی طرح ترقی پسند تحریک بھی جمود کا شکار ہونے لگی تھی۔ بیانیہ حقیقت نگاری اور موضوعات کی یکسانیت نے خارج کو اتنی اہمیت دے دی تھی کہ باطنی دنیا گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا ردعمل بھی اتنا ہی شدید ہوا یعنی ایک تو غیر وابستگی کا اعلان اور دوسرے خارج کے برعکس تمام تر توجہ باطنی غواصی کی طرف یہ دونوں انتہائیں تھیں بعد میں اس میں سے وہ معتدل اور متوازن رویہ پیدا ہوا جو صحیح معنوں میں نئے افسانے کی بنیاد ہے۔ نئے افسانے کے ارتقا کو تین مراحل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اول ساٹھ کی دہائی کا علامتی و تجریدی افسانہ جس میں غیر وابستگی اور باطنی مسائل اور شناخت کا بحران بنیادی جز ہیں۔ یہ ایک حوالے سے ترقی پسند تحریک کا ردعمل بھی ہے۔ یہ دور خیال کی گنجلک کا دور ہے، گنجلک اس لیے کہ اب معاملہ سامنے کی چیزوں کا نہیں تھا۔ بلکہ باطن کی ایسی دھندلی دنیا سے تھا جہاں تجسیم کی بجائے تجرید ہے۔ اس کے ساتھ یہ اسلوبیاتی تبدیلی کا دور بھی ہے۔ اس میں ادبی جمالیات نہ سہی لیکن یہ نیا اظہار ضرور تھا۔ علامت و تجرید کا زمانی ٹھوس پس منظر بھی موجود تھا۔ ۵۸ء کے مارشل لا کا جوش و خروش دو سال بعد ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ خوش فہمیاں دور ہو گئی

تھیں۔ آزادی اظہار کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جارہی تھیں۔ ادیبوں کے ساتھ ساتھ اخبارات کو غلام بنانے کے منصوبے شروع ہو چکے تھے۔ کہیں گلڈ اور کہیں ٹرسٹ کی شکل میں اس کا آغاز ہو رہا تھا۔ چنانچہ بیانیہ حقیقت نگاری اور خارجیت کی جگہ علامتی تہہ داری اور شناختی بحران کی اہمیت واضح ہو رہی تھی۔ ساٹھ کی دہائی کی کہانی جدید بھی ہے، علامتی اور نیم استعاراتی اور نیم تمثیلی بھی اس دور کی علامت کے لیے داستانی اور اساطیری مواد کو بھی استعمال کیا گیا ذاتی علامتیں بھی وجود میں آئیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ عصری، سماجی، سیاسی پس منظر نے کہانی کو ٹھوس پن سے سیال پن میں ڈھال دیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہانی پن ختم ہو گیا بلکہ اس کا تصور بدل گیا اس سے پہلے ٹھوس واقعات کا منطقی تسلسل میرٹ کہلاتا تھا۔ وقوعہ کہانی کی بنیاد تھا اب یہ ہوا کہ خیال کا تسلسل بھی کہانی کی صورت اختیار کر گیا۔ اس سے پہلے عام طور پر وقوعہ افسانے کے لیے اور وقوعہ سے بلند ہونے والا خیال شاعری کے لیے خام مواد بنتا تھا۔ اب یہ ہوا کہ خیال بھی افسانے کی بنیاد بننے لگا۔ اس سے ایک تو یہ ہوا کہ کہانی کا ٹھوس پن اور واقعات کا منطقی تصور ختم ہو گیا۔ اور اس کی جگہ خیال کا تسلسل آ گیا اور دوسرے یہ خیال تسلسل کے حوالے سے نثر میں شعری وسائل کا استعمال بھی بڑھ گیا۔ جس سے ابلاغ کے کچھ مسائل بھی پیدا ہوئے لیکن اس کی وجہ صرف لکھنے والے نہیں تھے بلکہ قاری بھی تھا جس کی تربیت نسل در نسل پرانے ادب کے حوالے سے ہوئی تھی۔ اس کے لیے یہ نیا منظر نامہ خاصا اجنبی تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے اس نے نئی چیزیں پڑھیں وہ ان سے مانوس ہو گیا اور کچھ لکھنے والوں میں بھی اظہار کی نفاست اور پختگی آ گئی۔ ساٹھ کی دہائی باطن کی خواصی اور شخصی شناخت کے بحران کا عرصہ ہے لیکن ستر میں جب لوگ سڑکوں پر کھلم کھلا احتجاج کر رہے تھے وابستگی کے احساس کا نئی توانائی کے ساتھ آغاز ہوا لیکن وابستگی (کومٹمنٹ) ترقی پسند تحریک کی وابستگی سے مختلف بلکہ کسی حد تک نئی تھی۔ نیا افسانہ نگار معاشرے سے اپنے مضبوط رشتے کا اقرار تو کرتا ہے لیکن کسی مخصوص موضوع یا منشور کا پابند نہیں ہوتا اور اظہار کے جمالیاتی رویوں کو بھی اہم سمجھتا ہے۔

اس دور کی کہانی میں ایک نکھار بھی آیا۔ قاری نئے ادب سے مانوس بھی ہوتا جا رہا تھا اور لکھنے والوں کا عجزِ بیاں بھی مسلسل لکھنے سے اعجازِ بیاں میں بدلنے لگا تھا۔ ساٹھ کی دہائی کے افسانے پر جتنے بھی اعتراضات کیے جائیں ایک بات واضح ہے کہ یہ جدیدیت کا آغاز تھا جس میں رمز۔ علامت۔ استعارہ۔ تمثیل اور پیکر تراشی سے کام لیا گیا۔

ستر کی دہائی میں خارجی منظر نامہ بدل گیا۔ ۱۹۶۸ء کی تحریک نے اجتماعیت کے تصور کو پھر تازہ کر دیا۔ اسلوب اور فن کی بحثیں نئے انداز سے شروع ہوئیں اور ایک نئی اصطلاح ''نو ترقی پسندی'' وجود میں آ گئی۔ ستر کی دہائی کے افسانے میں شناخت کا مسئلہ تو موجود ہے لیکن اب اس میں وجودی اثرات بھی شامل ہو گئے تھے۔ فرد کی جگہ اجتماعیت نے لے لی تھی لیکن گمشدگی کا احساس اب بھی موجود تھا۔ یہ گمشدگی کسی لاشعوری احساس کا نتیجہ تھی۔ اس زمانے میں عربی عجمی روایت کی طرف واپسی اور زمینی تحریک کی باتیں بھی زور و شور سے ہوئیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ نے ان میں ایک رنگ بھر دیا اور پہلی بار پاکستانی ادب میں زمین کی اہمیت کا احساس اجاگر ہوا۔ اسے پاکستانی ادب کا آغاز بھی کہا جا سکتا ہے۔ محمد حسن عسکری نے پاکستانی ادب کی بات وقت سے پہلے کر دی تھی اس لیے اسے مناسب پذیرائی نہ مل سکی لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ نے زمین اور ادبی قومیت کے احساس کو ٹھوس دلیل فراہم کی۔ یہ نو ترقی پسندی کے آغاز کا زمانہ بھی ہے ایک بار پھر وابستگی کی اصطلاح وجود میں آئی لیکن نئے عنوان کے ساتھ جس میں موضوع اور فن کی وحدت پر زور دیا گیا یوں یہ وابستگی ترقی پسند تحریک کی وابستگی سے مختلف تھی اس نو ترقی پسندی میں عام آدمی سے وابستگی کے ساتھ فنی جمالیات کو بھی

اہمیت دی گئی۔ بدقسمتی سے اس دہائی کو ۱۹۷۷ء میں پھر ایک مارشل لاء کی اذیت اٹھانا پڑی۔ چنانچہ اسی کی دہائی مزاحمتی ادب کا زمانہ ہے۔ یکم جنوری ۱۹۷۸ء میں چھپنے والی کتاب ''گواہی'' اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے جس کے مرتب ڈاکٹر اعجاز راہی تھے۔ اس میں جو افسانہ نگار شامل تھے ان کی اکثریت نئے لکھنے والوں کی تھی۔

سماجی، سیاسی سطح پر یہ دور کرب، مایوسی اور بے بسی کا دور ہے چنانچہ مزاحمت کے ساتھ ساتھ اضمحلال اور افسردگی کے رویے علامتی انداز میں تقریباً ہر کہانی میں موجود ہیں۔

اگلی دو تین دہائیوں میں مابعد جدیدیت نے جو بنیادی طور پر جدیدیت ہی کی توسیع ہے یہ نعرہ لگایا کہ کہانی واپس آ گئی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کہانی کہاں گئی تھی اور اب کہاں سے واپس آئی ہے۔ کہانی نہ کہیں گئی تھی اور نہ واپس آئی ہے۔ فرق اس کے طریقہ کار کو سمجھنے کا ہے۔ ساٹھ کا زمانہ شناخت کے بحران اور باطنی غواصی کا زمانہ ہے۔ یہاں اشیاء ٹھوس نہیں سیال صورت میں ہیں چنانچہ کردار سایہ سایہ اور بے نام ہیں۔ کہانی کا ٹھوس پن منطقی بنیادوں پر نہیں بلکہ خیال کے تسلسل کی صورت میں موجود ہے ستر میں ذاتی شناخت کا بحران سیاسی شناخت کے بحران میں تبدیل ہوتا ہے۔ سیاسی عمل کے آغاز اور ہیرو کی موجودگی وضاحت کی دلیل ہیں۔ کہانی کا سیال پن بھی قدرے ٹھوس حقیقت میں بدلتا ہے۔ اگلی دہائی میں مزاحمت ہے۔ دشمن کی نشاندہی ہو چکی ہے۔ ہیرو کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ چیزیں سامنے ہیں جن کا اظہار ہو رہا ہے صرف بیان علامتی ہے۔ اگلی دہائیوں میں اگرچہ سیاسی سماجی منظر نامہ ظاہری سطح پر تبدیل ہوتا ہے لیکن اس کی اندرونی صورت وہی ہے۔ صرف چہرے بدلتے ہیں نظام نہیں بدلا کہانی کی صورت بھی بدلتی ہے ـــــ لیکن یہ سارا عمل ایک تسلسل اور ارتقائی مرحلوں کا حصہ ہے اس لیے کہانی نہ کہیں گئی نہ کہیں سے واپس آئی ہے۔

ساٹھ اور ستر کی دہائی میں تفہیم اور ترسیل کی کچھ باتیں بھی بحث کا موضوع بنیں۔ قاری جو نسل در نسل ایک طرح کی نثر پڑھنے کا عادی تھا، نئی تحریروں سے جلدی جلد مانوس نہ ہو سکا۔ حلقوں کی بحثوں اور تنقید نے بھی فضا کو خاصا خراب کیا۔ کہانی گم ہو گئی ہے قاری چلا گیا ہے جیسی باتیں، بغیر کسی جواز کے، نئے افسانے پر الزام کی صورت اختیار کر گئیں۔ یہ کسی نے نہیں بتایا کہ کہانی کہاں چلی گئی ہے، قاری کیوں دور ہو گیا ہے اور اب کہانی کہاں سے واپس آ گئی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آہستہ آہستہ قاری نئی کہانی سے مانوس ہوتا چلا گیا۔ اس سے عدم ابلاغ کا مسئلہ بھی ختم ہو گیا۔ نئے افسانے کی خاص بات پرانے بیانیہ کی بجائے نئی زبان کی تشکیل تھی جس میں شعری وسائل کو بھی استعمال کیا گیا۔

اسی کی دہائی پاکستانی معاشرے کی ایک اور بدترین سیاسی ابتری کا زمانہ ہے۔ ۱۹۵۸ء میں آنے والی سیاسی تبدیلی کا ردعمل بہت زیادہ نہیں ہوا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کو اس طرح کی تبدیلی کے معنی ہی معلوم نہ تھے اور ابتدا میں یہی سمجھا گیا کہ شاید یہ تبدیلی ان کے دکھوں میں کمی کر دے گی۔ دوسرے یہ کہ اس وقت تک کوئی آئین باضابطہ طور پر موجود نہ تھا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کے مطابق ابھی الیکشن ہونا تھے۔ اس لئے اسے کوئی بڑی بے ضابطگی خیال نہیں کیا گیا۔ یحییٰ کا مارشل لاء ایوبی دور کا خاتمہ تھا اور اس کے بارے میں بھی یہی خیال تھا کہ اس کا دورانیہ کم ہوگا۔ اور اس سے ایک نئی صورت حال جنم لے گی۔ اس لیے اس کے خلاف بھی کوئی قابل ذکر ردعمل نہیں ہوا لیکن ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کو اکثریت نے قبول نہیں کیا۔ اول اس لیے کہ یہ ۱۹۷۳ء کے آئین کی کھلی خلاف ورزی تھی جسے ایک منتخب اسمبلی نے متفقہ طور پر منظور کیا تھا، دوسرے اپوزیشن اور حکومت کے درمیان سمجھوتہ طے پایا گیا تھا اور اس پر صرف دستخط ہونا باقی تھے، اس لیے جمہوریت پسند حلقوں میں اس کی شدید مخالفت ہوئی۔ مارشل لاء جولائی ۱۹۷۷ء میں لگا اور جنوری ۱۹۷۸ء

رمزیت کے لیے افسانہ نگاروں نے شعور کی رو، داخلی خود کلامی، آزاد تلازمہ خیال کو تکنیکی حربوں کے طور پر استعمال کیا۔
مغرب کی جدید تحریکوں سوریئلزم، ڈاڈاازم اور سٹرکچرل ازم کو معیار بنا کر افسانے کی ساخت کو نیا رنگ روپ دیا گیا۔
کرداروں کی بجائے پرچھائیں کو اہمیت دینا، وقوعے پر خیال کو حاوی رکھنا، مکمل لفظوں اور جملوں کی بجائے دائروں،
لکیروں، قوسوں اور نقطوں کو نمایاں کرنا۔ لفظوں کو توڑنا پھوڑنا، فقروں کو ادلنا بدلنا، شاعرانہ تلازمے بنانا، پیکر تراشی کرنا،
اور تشبیہات و استعارات کو بہ تکرار استعمال کرنا اہمیت اختیار کر گیا۔ یہاں علامتیں زیادہ تر ذاتی نوعیت کی ہیں کیونکہ خارج
کی تلخی، بنجر پن اور اندھیرا تخلیق کار کو باطن کی طرف مسلسل سفر میں رکھے ہوئے ہے۔ ذات کی پنہائیوں میں اترنے اور
وجود کی معنویت کو تلاشنے کا عمل تیز تر ہے۔ خارجی سطح پر مظاہر فطرت اور اجسام و اماکن کو زاویے بدل بدل کر دیکھنے کی
کوششیں ملتی ہیں۔ پس منظر میں یہ فکر جڑ پکڑے ہوئے ہے کہ چیزوں اور قدروں کی حقیقت اضافی ہے، جگہ اور وقت کی
تبدیلی سے منظر کی ہیئت بھی بدل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے علامتی افسانے میں اظہار کی رنگارنگی عروج پر
ہے۔ کہانی کا مرکزہ زمین کی پیٹھ پر سے سرک کر دھند، غبار اور اندھیرے میں بنے اس جیسے ایک اور نقش میں حلول کر
گیا ہے۔ احساسات و کیفیات کو فوکس کرنا اہم ہے۔ نفسیاتی انسلاک و ادراک کا ایک طول کھینچتا تسلسل---- کہ جس
میں بیداری اور نیند کا ملا جلا تاثر ہے۔ انسانی زندگی کا ایک داخلی پورٹریٹ کہ جس میں ابعاد و امکانات کے متنوع
زاویے موجود ہیں۔ اس عہد کے علامتی افسانے میں بشریت، علاقائیت اور تجریدیت بہت اوپری سطح پر موجود ہیں
لیکن تغیر وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے نئے منظرنامے نے صورت حال کو قدرے تبدیل بھی کیا۔ احتجاج کا تند لہجہ،
بغاوت کا ہیجانی انداز، کرب، اداسی، افسردگی اور مایوسی کی گمبھیرتا، اکتاہٹ و جھنجھلاہٹ اور خارج سے باطن کی طرف
سمٹاؤ---- ایک توازن اختیار کر رہا ہے۔ اسلوبیاتی اور تکنیکی تجزیوں کے جوش میں جا و بے جا کی عدم تفریق---- اعتدال پر
آرہی ہے۔ تجریدیت تو قریب قریب ختم ہو چکی۔ علامتیت، رمزیت، تہہ داری اور اسلوب پرستی اب مواد کو ساتھ لے کر

لری انتشار کی یہ کیفیت معاشرے کو تو جس سمت میں لے گئی سو لے گئی لیکن افسانے کو اس نے متنوع موضوعات
ب سے آشنا کر دیا۔ یوں ساٹھ اور ستر کے بعد پاکستانی افسانہ نگار نے تکنیک اور اسلوب کی طرف بہت توجہ دی،
ح افسانے نے پرانی روایت سے الگ ہو کر اپنی پہچان بنانے کی کوشش کی جس کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں ابھی
ری ہے۔

○○○

رشید امجد

جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی

پولیس کو دیکھ کر نوجوان اس گلی میں جا چھپتے۔ اُس سے باہر نکل آتے۔ پولیس منہ دیکھتی رہ جاتی۔ اخبار والے اس عمل کو HIDE AND SEEK لکھتے۔ میں اس کو چھو چھپ چھپولیاں کہتا۔ یوں سمجھئے ایک دوسرے کا منہ کالا ہو رہا تھا۔ کیسوں کے حسابوں حالات کو جھکولا جا رہا تھا۔ ہمارے حسابوں کچولا جا رہا تھا۔ کوئی پولیس والا طلباء کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ اپنا حساب پورا کر لیتے تھے۔ طلباء پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ حساب برابر کر لیتی تھی۔ شہر کی ایسی فضا تھی جب مجھے ہوائی اڈے سے یاور الیاس کی کار لے کر الیاس پیلس پہنچی، میں نے راستے میں کئی جگہ پولیس کی مسلح گاردیں کھڑی دیکھیں۔ طلباء کے جلوسوں اور مظاہروں پر کئی بار گولی چل چکی تھی۔ یہ سب انتظام آمریت کے خلاف نکلنے والے جلوسوں کے سلسلے میں کیا جا رہا تھا آمریت کے خلاف جو بہت سے الزامات تھے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ملک کے تئیس (۲۳) خاندانوں کو اتنی مراعات دی گئی تھیں کہ اُنہوں نے ملک کی ساری دولت اپنے ہاتھ سمیٹ لی تھی۔

کتنی دلچسپ بات تھی کہ میں ان تئیس (۲۳) خاندانوں میں سے ایک کا مہمان ہو رہا تھا میرا کمرہ ڈے نش فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ری ورسیبل ائر کنڈیشنر لگا ہوا تھا۔ فوم ربڑ کا ڈبل بیڈ تھا۔ چپس کے فرش پر اعلیٰ قسم کے قالین بچھے تھے۔ کمرے کی دیواروں میں جدید طرز کے بنے ہوئے آبنوسی طاقچے بلغاریہ، روس اور امریکہ کی بنی ہوئی زیبائشی چیزوں سے آراستہ تھے۔ ملحقہ غسل خانے کی ٹائیلیں چم چم کر رہی تھیں۔ دیوار گیر سٹینڈ پر گلابی رنگ کا تولیہ لٹک رہا تھا۔ سبز رنگ کے واش بیسن پر صابن کی سفید ٹکیہ میرے انتظار میں چھوٹا سا پھول بنا دکھائی دے رہی تھی۔ دیوار گیر آئینہ میں مجھے اپنا چہرہ کچھ زیادہ ہی کھلا کھلا دکھائی دیا۔ اللہ ہُو غنی! ماحول کے بدلتے آدمی خود کتنا بدل جاتا ہے۔ یاور الیاس نئی کارخانوں کے مالک تھے۔ جب بھی ملے مروت اور اخلاق سے ملے۔ میرے افسانے شوق سے پڑھتے تھے۔ اس لئے مجھے بھی اُن سے ملنے کا شوق رہتا تھا۔ ایک روز مجھے کہنے لگے۔ الفت نے ادبیات میں ایم اے کر لیا۔ اب ادیب بننا چاہتی ہے۔ تم کبھی ہفتہ دس دن ہمارے آکر رہو۔ لڑکی سے ادب سے متعلق باتیں کرو۔ اُسے بتاؤ لکھنے کی تحریک کیونکر ہوتی ہے۔ افسانہ کس طرح لکھا جاتا ہے۔ لکھنے کی شوق میں وہ دیوانی ہو رہی ہے۔"

ایک دفعہ ٹالا۔ دو دفعہ ٹالا۔ تیسری دفعہ نہ ٹالا جا سکا۔ نتیجہ یہ کہ میں یاور الیاس کی فیملی کے ساتھ ٹیرس پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ پیڈسٹل فین چل رہا تھا۔ یاور الیاس کی بیوی پیالی میں میرے لیے چائے ڈال رہی تھی۔ اُس کے بازو اور پیٹ دونوں برہنہ تھے صرف چار گرہ کپڑا اُس کے سینوں پر پیوست تھا جو اس قفس سے بھی نکل جانا چاہتے تھے۔ اس کے بدن کے سارے حصے یوں نونے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ جیسے انہیں کمانیوں سے جوڑا ہوا ہو۔ اُس کی چال ان کمانیوں کی وجہ سے بڑی ورغلانے والی بن گئی تھی دوتر بوز اُس کے کمر کے چھلّے کے ساتھ لٹک رہے تھے یا شراب کی دو منکیاں تھیں۔ وہ چلتی تو ان منکیوں میں شراب چھلکتی۔ ایران اور لکھنؤ کے شاعروں کی طرح میری نگاہ بار بار جسم کے انہیں دو حصوں پر گھوم پھر رہی تھی۔ بیرا کھانے والی چیزوں سے بھری ہوئی ٹرالی میرے آگے لایا۔ الفت میرے ہاتھ میں پلیٹ اور نیپکن تھما رہی تھی کہ کسی ملازم نے آکر اُس سے کہا۔ "آپ کا فون آیا ہے۔"

الف پورچ میں جا کر کسی سے سے کہنے لگی "ہاں، وہ آ گئے ہیں۔ بس ایک ہفتے میں ادیب بن جاؤں گی۔" پھر زور سے ہنسی اور فون رکھ کر ہمارے ساتھ چائے میں آن شریک ہوئی۔

"وہ گٹھے ہوئے بدن اور موٹے نقوش والی اداس سی لڑکی تھی۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ اس نے بغیر دوپٹہ کے بیل باٹم اور اونچی کُرتی پہن رکھی تھی۔ بالوں کے پیچھے بینڈ پن لگا ہوا تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی مگر ان میں وسعت پانے والی اور وسعت

پائی ہوئی چمک کی کبھی دھوپ کبھی چھاؤں تھی۔ چائے پی کر اتالیق اور شاگرد اندر کمرے میں آن بیٹھے۔ میں فوم کشن والے صوفے پر بیٹھا پھر صوفے سے ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھ گیا جس طرح ہم مشرقی لوگ فرش پر بیٹھنے کے عادی ہیں۔ ''آپ نیچے کیوں اُتر بیٹھے۔ صوفہ آرام دہ نہیں۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ بہت آرام دہ ہے مگر اس طرح بیٹھنا زیادہ آرام دہ اور غیر رسمی ہے۔ زیادہ ڈرامینک ہے۔ میرے اٹھنے بیٹھنے پر پابندی نہیں ہوگی نا۔؟''

میرے مسکرانے پر وہ بھی مسکرائی اور صوفے پر سے اٹھ کر قالین پر بیٹھ گئی۔ اُس کی بھری بھری رانوں پر بیل باٹم اتنا تنگ ہو گیا کہ مجھے اب معلوم ہوا کہ اس لباس میں حرکت اور حرارت دونوں موجود ہیں۔ وہ اپنے نیچے کشن رکھ کر بولی۔ ''معلوم نہیں مرد کس وقت کیا چاہتا ہے۔''

''تمہارا یہ جملہ بہت افسانوی ہے۔ یہ تمہارا اپنا جملہ ہے یا کسی کا استعمال شدہ ہے''

اس کی آنکھوں میں دھوپ کی روشنی اور چھاؤں کے سائے سمٹنے لگے۔ میں نے لقمہ دیا۔ ''ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ حقیقت اور سچ نہ چھپائے۔''

''سچ ہی بتاؤں گی۔ یہ جملہ میرا نہیں۔ ممی کا ہے جو وہ ڈیڈی سے کہا کرتی تھی۔''

''تمہاری ممی جس کے ساتھ ہم نے ابھی چائے پی ہے''

''نہیں یہ میری سوتیلی ممی ہیں۔ یہ تو خوب سمجھتی ہیں کہ مرد کس وقت کیا چاہتا ہے۔''

جب بات سے بات نکلنے لگی تو میں نے پوچھا۔ ''ناچاقی کی وجہ؟''

''ڈیڈی کچھ چاہتے وہ کچھ کرتی۔ ڈیڈی چاہتے کمرے صاف ستھرے ہوں۔ باتھ روم کی صفائی دو دفعہ روزانہ ہو۔ تولیہ صاف ملے آفتابے روز مانجھیں۔ برآمدے کی کرسیاں اپنی جگہ سے نہ ہٹیں، ممی کہتی بھینس نے آج دودھ کم دیا ہے۔ اسے چارہ دیر سے ڈالا گیا۔ آج بھینس نے رسا تڑا لیا کل بھینس نے سینگ مار دیا۔ ممی کی ساری توجہ بھینس دودھ اور گھی اور مکھن پر لگی رہتی تھی۔ میری ماں سو فیصدی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ میرا باپ سو فیصدی شہری تھا۔ ایک روز ڈیڈی باتھ روم میں داخل ہوا تو ممی کموڈ پر بیٹھی نوکرانی کو بھینس کے لئے ہدایات دے رہی تھیں۔ ایک روز ڈیڈی کے ٹیبل لیمپ کا سبز بلب نہیں مل رہا تھا۔ یہ ٹیبل لیمپ ڈیڈی پیرس کی نمائش سے لائے تھے۔ معلوم ہوا ممی نے لیمپ سے سبز بلب اتار کر بھینس کے اصطبل میں لگوا لیا تھا۔ پھر ممی نے گھر کی تمام نوکرانیوں سے باری باری کہہ رکھا تھا کہ ڈیڈی کے قریب بھی مت پھٹکنا۔ سانڈ ہیں لتاڑ دیں گے۔ وہ اتنی سہمی رہتیں کہ ڈیڈی کے داخل ہوتے ہی گھبرا کر کمرے سے باہر نکل جاتیں۔ بتائیں میری ممی اب گاؤں میں کیا کرتی ہے!

''کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں نے کہا۔

''دودھ بیچتی ہے۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ ''میں چھٹی جماعت میں تھی جب ڈیڈی اور ممی کی علیحدگی ہوئی۔ میں دسویں جماعت میں ہوئی تو ڈیڈی نے دوسری شادی کی۔ ڈیڈی ایک دن مجھ سے کہنے لگے جب بیوی خاوند کی خواہش کا احترام نہ کرے تو خاوند کی زندگی بڑے جبر اور اذیت کے ساتھ گزرتی ہے''

''تخلیق کیا چیز ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جیسے آمر رعایا کی خواہش کا احترام نہ کرے تو رعایا کی زندگی بڑے جبر اور اذیت کے ساتھ گزرتی ہے۔ اس موضوع پر افسانہ تخلیق کیا جا سکتا ہے۔''

میں نے جواب دیا۔ ''حقیقت کے اظہار اور اس کی تلاش کا عمل۔ تم چونکہ حقیقت بیان کر دینے والی لڑکی ہو اس لیے تم میں افسانہ نویس بننے کے جراثیم موجود ہیں۔''

حقیقت کا اظہار تو فری سپیچ سے بھی ہو جاتا ہے۔ مگر فری سپیچ کہانی تو نہیں کہلا سکتی مثلاً امریکہ میں ایک مجمع عام کے سامنے

ایک اشتراکیت پسند لڑکی تقریر کر رہی تھی۔ بولی۔ کیا تم لوگوں کو معلوم ہے کہ لینن کو بڑی بڑی بھرپور چھاتیاں پسند تھیں۔ بالکل میری چھاتیوں جیسی۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے گریبان کے بٹن کھول دیئے۔ فری سپیچ سے اظہار تو ہو گیا مگر فری سپیچ سے کہانی تو نہیں بن سکی۔"

میں نے کسی قدر اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔ "فری سپیچ سے کہانی نہ بنے مگر کہانی کے لیے مسالہ تو مل جاتا ہے۔"

"آپ مجھے یہ بتائیں کہ کہانی جنم کس طرح لیتی ہے؟"

"زندگی کی دلکش بے قاعدگیوں کی کوکھ سے۔ قاعدے سے ہٹ کر بے قاعدہ ہو جاؤ۔ کہانی بن جائے گی۔ ابھی تم بڑے قاعدے سے باتیں کر رہی تھی۔ تم نے بے قاعدہ ہو کر اشتراکیت پسند لڑکی کی چھاتیوں کا ذکر کیا تو گویا کہ تالاب میں کنکر پھینک دیا اور تمہارے اپنے جسم کا پورا لب و لہجہ بدل گیا۔"

اس کی آنکھوں میں پھر سوچ کا چھلاوا نمودار ہوا۔

"میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا تو میرے دماغ میں آپ اور طرح کے تھے۔ اب دیکھا تو آپ کا چہرہ جلے ہوئے کلاسیکی عاشقوں کا سا ہے جیسے لڑکیوں کی مخلوق نے آپ کو بہت جلایا ہو اور آپ بگلے کی طرح پورے بھگت بنے سب کچھ سہہ جاتے رہے ہو۔"

میں مسکرا کر اتنا کہہ سکا۔ "تو لکھنے کے لئے تمہیں خام مواد مل گیا۔"

"میں آپ کو کیسی لگتی ہوں۔ کیا میرا نام کسی افسانے میں آ سکتا ہے؟"

"آ کیوں نہیں سکتا۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ الفت بولی۔ "آ جاؤ۔"

بیگم الیاس اپنی تمام جلوہ نما چیزوں کے ساتھ ساڑھی چپکائے دروازے میں کھڑی تھی۔ "الیاس ابھی آئے ہیں۔ کپڑے بدل رہے ہیں۔ ہم کسی کھانے پر مدعو ہیں۔ دیر سے واپس آئیں گے۔ میں نے بارمین سے کہہ دیا ہے ڈرنکس آپ کے لئے موجود رہیں گی۔"

"مگر میں تو نہیں پیتا۔"

"آپ نہیں پیتے میں نہیں مانتی۔"

یہ چھ لفظ نکلے تو اس کے منہ سے مگر کمر کی کمانی پہلے ٹوٹی پھر جڑی اور پھر اس طرح سے لچکی کہ اس نے میری نگاہ کے چور کو اپنی پیٹھ کے اتار کے پاس جا کر چھوڑ دیا۔ میں نے دیکھا اس کی پیٹھ کا اتار دو تربوزوں کی ڈھلوانوں میں مدغم ہو رہا تھا۔ دائیں تربوز پر سے ساڑھی نیچے کو کھسکا کر باندھی گئی تھی یا واللہ اعلم باندھنے کے بعد کولہے کے کچھ حصے کو برہنہ چھوڑنے کے لئے ایک طرف سے کھسکائی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کی کمر کے نچلے کا ملگجا خط زیادہ خوشنما اور دلآویز دکھائی دے رہا تھا۔

"تمہاری سوتیلی ماں کو کپڑے خوب پہننے آتے ہیں۔"

"بتائیں وہ اتنی نیچی ساڑھی کیوں باندھتی ہیں؟"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔"

"ڈانس کرنے والے کا ہاتھ نشے میں ان کی WAIST LINE پر آ کر رکا رہتا ہے۔ بڑے بڑے افسر ممی کے ساتھ ڈانس کرتے ہیں۔"

"یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ چار بچوں کی ماں ہے۔"

"بانی اور چھلیا ہفتے میں دو مرتبہ مالش کرتی ہیں۔"

"بانی اور چھلیا کون ہیں؟"

"یہ ممی کی TOILET ATTENDENT ہیں۔ ممی غسل کرنے کے بعد شیشے کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ بانی جسم پر تولیہ پھیرتی ہے۔ پھر چھلیا ایک ایک کپڑا پکڑاتی ہے۔"

مجھے یوں لگا کہ الفت اپنی ممی سے حسد کر رہی تھی اور جیسے یہ سب کچھ بناوٹی تھا۔ اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ نوکر آیا تو بولی۔ ''بانی اور چھلیا کو بھیجو۔''
بانی بگڑے ہاتھ پیر کی معمر عورت تھی جس کے نقوش بھرے پڑے تھے۔ اس کے اٹھے ہوئے گالوں کی ہڈیاں اور آنکھ کے خفیف بھینگے پن نے اس کے چہرے پر ایک عجیب گدازی مستی بکھیر دی تھی چھلیا کا لباس اس کے جسم پر تنگ ہو رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ پراسرار تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے جس نے اسے بہت ڈرامائی بنا دیا تھا۔ دونوں کی دونوں اپنی قوت کو بھنگڑا ناچنے والوں کی طرح اندر کھینچنے کے بجائے باہر پھینکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔
میں نے صرف دیکھا۔ کوئی بات نہ کی۔ دونوں اپنے ہونٹوں میں مسکراہٹ کی مٹھاس چوستی ہوئی باہر چلی گئیں۔ ان کے مسکرانے سے میرا خیال بری طرح ہزیمت کے راستے پر چل نکلا تھا مجھے کچھ تو بات کرنی چاہیے تھی۔ مجھے میاں لوگ سمجھتی ہوں گی۔ الفت کی آواز سے مجھے بڑا دلاسا ہوا ''آپ نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔''
''کیا بولتا؟'' اوپر سے مسکرا دیا۔
''میں آپ کو مان گئی۔''
''کیسے؟''
''یہ ممی کی نمبر نائنٹی نائن جاسوس ہیں۔ اچھا کیا آپ نے ان سے کوئی بات نہ پوچھی نہ کی۔''
''میں کھسکیلیوں سے بات نہیں کیا کرتا۔''
''کیسے جانا کہ یہ کھسکیلیاں ہیں۔''
''تھوڑی سی دنیا دیکھی ہے۔''
الفت بڑے سعادت مند بالکوں کی طرح ہاتھ جوڑ کر اٹھی اور میرے قریب والے صوفے پر بیٹھ کر بولی۔ ''مان گئی مگر آپ واقعی ڈرنک نہیں کرتے۔ بیرے کو بلاؤ۔ آپ کیا لیں گے؟''
میں نے روک دیا۔
''میں کھانا بھی اسی کمرے میں کھاؤں گا''
''کیوں؟''
''وہ جذبہ مجھ پر اتنا حکم بھی نہیں جما سکتا جو گوگاں کو دور افتادہ جزائر میں لے جا کر پوری زندگی وہاں گذارنے پر مجبور کر سکتا تھا۔''
''شوقِ فضول۔'' الفت مسکرائی۔
میں نے رات کو سوتے ہی سیر کا سوچ لیا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو عظیم الشان کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ ماتھے پر ہاتھ بڑی پھرتی سے رکھ کر چوکیدار نے صدر دروازے پر سلام کیا۔ شمال کی طرف مڑ گیا۔ میں نے دیکھا کوٹھی کی پشت پر نازک نازک پتوں والے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ وہاں سے مڑ کر میں کوٹھی کی فصیل کے ساتھ والی سڑک پر ہولیا۔ فصیل کے نیچے دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھینس کے گوبر پر لڑ رہی تھیں۔ دونوں نے تسلے اٹھا رکھے تھے۔ ایک کہہ رہی تھی۔ یہ گوبر میں نے پہلے دیکھا ہے۔ دوسری کہتی تھی اس پر پہلے میری نگاہ پڑی تھی۔ یہ میں اٹھاؤں گی۔ میں لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر چل دیا۔ فصیل کے اندر متمول لینڈ سکیپ اور فصیل سے باہر ڈھنڈار افلاس۔ میں سڑک سے مڑ کر کچی پگڈنڈی پر ہولیا۔ بھٹے سے آگے راستہ اونچا نیچا ہوتا ہوا ایک نالے پر جا کر رک گیا۔ میں اونچی چٹان پر بیٹھ گیا۔
اب کافی دن نکل آیا تھا۔ میں واپس آ رہا تھا اور سوچ رہا تھا جسم اور روح کا تعلق جسم میں بھی قیامت۔ روح بھی قیامت۔ دونوں بڑے بڑے پاور ہاؤس۔ دونوں میں کروٹیں لیتا سیلاب دونوں عظیم اور پھر یہ دونوں عظیم طاقتیں انسان کو محبت کرنا سکھاتی ہیں۔

الفت کے کھلے بال شانوں پر پڑ رہے تھے۔ اس نے گوگو عینک لگا رکھی تھی۔ تنگ سلیک کے اوپر ریشمی جرسی تھی جس میں اس کا سینہ اچھل رہا تھا۔

"میں ایکسر سائز کر کے آئی ہوں۔"

"میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"آپ میرا نوٹس ہی نہیں لے رہے"

"یہ سگار بہت اچھا ہے۔

"میں اور لا دوں گی۔"

"میں نے دیکھا ہے۔ اس لباس میں بہت گلیمر ہے۔"

"لباس میں ہے۔ مجھ میں کوئی گلیمر نہیں؟ آپ افسانوں میں تو بڑی سیدھی بات کرتے ہیں۔ مگر افسانے سے باہر بات گھما کر کرتے ہیں بوجھئے میں کون سی ایکسر سائز کر کے آئی ہوں؟"

"رسی ٹاپی ہوگی۔"

"واہ! ممی نے ایک ایسی ایکسر سائز بتائی ہے جس سے عورت کی چال میں گریس اور دلربائی پیدا ہوتی ہے۔ چلتے وقت گردن یوں اٹھا کر رکھئے۔ ایڑی کو ذرا بے معلوم ٹھونکا دیجئے کہ سینہ ہر قدم پر چھلک چھلک اٹھے اس طرح۔"

وہ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک گئی۔ پھر واپس آئی۔ خود پیدا کی گئی لرزش سے اس کے سینے چھلکنے لگے۔ پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسی اور صوفے پر گر گئی۔ "ایک دفعہ بڑا لطف آیا۔ ایم اے کلاس کی بات ہے پروفیسر نے ایک روز میرے بلاؤز پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ تم اتنا باریک بلاؤز پہن کر کالج نہ آیا کرو۔ میں نے اگلے روز بھی ویسا ہی بلاؤز پہنا۔ پروفیسر نے مجھے ٹوکا۔ میں نے کہا اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔"

تیسرے روز جب میں پھر وہی بلاؤز پہن کر گئی تو پروفیسر نے کلاس لینے سے انکار کر دیا اور واک آؤٹ کر گیا۔ لڑکوں نے پوچھا۔ "بات کیا تھی"۔

میں نے لکڑی کے روسٹرم پر چڑھ کر کہا۔ "پروفیسر کو میرے اس بلاؤز پر اعتراض ہے۔ آپ بتائیں آپ کو اس بلاؤز میں کوئی خرابی نظر آ رہی ہے۔"

ساری کلاس چلا اٹھی۔ ''کوئی خرابی نہیں۔ پروفیسر احمق ہے۔''
میں بگلے کی طرح پورا بھگت بنا سب کچھ سہہ رہا تھا۔ سنگتروں کے باغ میں آپ مدعو ہوں۔ سنگتروں سے بوٹے لدے پڑے ہوں باغ کا مالک سنگتروں کی رکابی بھر کر آپ کے سامنے رکھ دے آپ کا جی چاہے درختوں سے اتار کر کھانے کو۔ بعض تو ہاں اور نہ کی بیچ کے فن کو رومان کہتے ہیں۔ بعضوں کے لئے یہ فن گھٹیا اور بھونڈا ہوتا ہے۔ بیگم الیاس کا سراپا بھری برسات کی پھوار بن کر مجھ پر گر رہا تھا۔ مرد کا یہی اصیل عمل ہے کہ اس کا پیچھا کرو جو مل نہ سکے۔
''لو سگار پیئو۔''
الفت نے پیا اور کھانسنے لگی۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اس ہاں اور نہ کے بیچ والے مرحلے سے نکل آئے ہیں۔ میں نے سگار کا کش لے کر کہا۔ ''مجھے تو اپنی پہلی محبت یاد آ رہی ہے۔''
''کون تھی وہ؟''
''مسجد کے ملا کی لڑکی۔ جو ہمارے گھر روٹی لینے آیا کرتی تھی اور تمہاری پہلی محبت! تم بھی بتاؤ نا؟
''موٹر ڈرائیور۔ جو مجھے سکول سے لے جایا کرتا تھا۔''
میں نے بڑھاوا دیا۔ ''تمہاری محبت میری محبت سے اعلیٰ تھی۔ ملا کی لڑکی کے ہاتھ میں ایک بادیہ ہوتا تھا جس میں گھر گھر کا سالن مل کر ایک مغلوبہ بن جاتا تھا۔ اور تمہاری محبت کے ہاتھ میں مرسڈیز بنز کا اسٹیرنگ۔ مشین، جو انسان کو چاند پر پہنچا کر چاند کی خاک اڑا دیتی ہے۔''
''ہمارے موجودہ شوفر کو آپ نے دیکھا ہے جو آپ کو ایئر پورٹ سے لایا تھا۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔''
''بھلا آدمی لگتا ہے۔''
''بہت بڑا lover ہے۔ ایک دفعہ ایک پاؤندے سے ممی نے کپڑا خریدا۔ اس ڈرائیور کو بھی لے دیا چند دنوں بعد وہ پاؤندا پھر آیا۔ بڑا سخت پریشان تھا۔ ممی سے کہنے لگا۔ ایک ہزار کی مجھے ضرورت ہے آپ قرض دے دیں یا میری لڑکی ڈیڑھ ہزار میں خرید لیں۔ جب ڈیڑھ ہزار دوں گا لڑکی لے جاؤں گا۔ اگلے روز گوری چٹی جوان لڑکی لے آیا۔ جس پر ڈرائیور ریجھ پڑا اور جھٹ پٹ جا کر کہیں سے ایک ہزار روپے لے آیا۔ ممی نے ڈیڈی سے اجازت لے کر پانچ سو روپے اپنی گرہ سے دے دیئے۔ لڑکی ڈرائیور کی بے نکاحی بیوی بن گئی کچھ دیر بعد جب ہمیں خود ضرورت پڑی تو ممی نے ڈرائیور کو پانچ سو روپے دے کر لڑکی کو ففٹی ففٹی کر لیا۔''
''ہمیں ضرورت آ پڑی سے کیا مطلب؟!
''ڈیڈی کو چھوٹے منصب کے سرکاری افسروں کی تفریح کے لیے ایک گے لڑکی کی ضرورت آ پڑی۔ ممی نے زر گل کو چند دنوں کے لیے بانی اور چھلیا کی تحویل میں دے کر پرفیکٹ کر دیا۔ ممی کی اس دوراندیشی سے ڈیڈی نے تین لاکھ کا بزنس کمایا اور پندرہ روز کے لیے ممی کو پیرس لے گئے۔''
زرے گل مجھے دف و چنگ بجانے والی الف لیلائی کردار معلوم ہوئی۔ میں نے تڑپ کر کہا۔ ''مجھے زرے گل دکھاؤ۔''
''زرے گل جس کے پاس گئی اسے پوشیدہ بیماری لگا آئی۔ ممی نے ڈرائیور اور زرے گل کا علاج کرایا پھر زرے گل اس کے باپ کو واپس کر دی۔ پندرہ سو روپیہ واپس آ گیا۔ ڈیڈی کہنے لگے اس سودے میں ہمارا کیا گیا۔''
میں نے شکرانے کا ایک کش لیا اور فراغت سے سگار کی راکھ جھاڑی پر یہ سوچتے ہوئے کہ شکر ہے الفت کو کہانی لکھنی نہیں آتی ورنہ اس گھر میں تو کہانیوں کا ڈھیر لگ سکتا تھا۔
میں نے پوچھا ''بانی کا شوہر کہاں ہے؟ چھلیا کس کی بیوی ہے؟''
الفت اپنے شانے سے بال جھٹک کر بولی۔ ''کس کی بیوی، کس کا شوہر۔ بانی کا تعلق ہیڈ بیرے اور پہرہ دینے والے گن مین سے ہے۔ چھلیا کا ممی کے ڈرائیور سے اور خانسامے سے ہمارے کتوں کے ٹرینر کی بھی چھلیا پر نگاہ ہے۔''

''تمہاری ممی کو معلوم ہے؟''

''وہ کہتی ہیں جس گھر میں یہ آسائشیں ملیں تو کر اس گھر سے بھاگتے نہیں۔اس ڈر کے تو وہ غلام بن جاتے ہیں۔''

میں نے کش لے کر وانا سگار ایش پلیٹ میں مسل دیا۔ یا اللہ اس گھر میں کیسی کنفیٹی چھار ہی تھی جس سے میں بھی بیزار بھی تھا اور جس کا مشتاق بھی۔۔۔

میں نے کہا۔''آؤ کوئی اپنی بات کریں۔رات کیسے گئی؟''

''الٹے سیدھے خیال آتے رہے۔سچ سچ بتاؤں۔''

''ہاں۔''

''جی چاہتا رہا۔آپ کو قتل کردوں۔آپ کے تمام افسانوں پر قبضہ جمالوں۔اپنے نام سے چھپواؤں اور ادیب بن جاؤں۔''

اب کھل کھلا کر ہنسنے کی میری باری تھی۔میں نے کہا۔''تمہارا قصور نہیں۔یہ جونیئر ادیبوں پر جاسوسی فلموں کا اثر ہے۔کیونکہ وہ شارٹ کٹ کے متلاشی ہیں۔''

''اپنی تحریریں دکھاؤں''

''آج دیکھنے کا وعدہ تو ہے۔''

چنانچہ دن کا زیادہ حصہ الفت کی پرانی اور نئی تحریروں کو پرکھنے میں گزرا۔اس کی خاصی پھسپھسی تحریر تھی۔سوچ سوچ کر مشکل لفظ لاتی اور ان کو جا بیجا استعمال کر دیتی۔اس کی گفتگو جو چمک مارتی تھی۔وہ اس کی تحریر میں نہ تھی۔میں کہہ چکا تھا کہ تم میں افسانہ نگار بننے کے جراثیم موجود ہیں اس لئے حوصلہ افزائی کرتا رہا۔صرف چند منٹوں کے لیے بیگم الیاس ہمارے کمرے میں صرف یہ پوچھنے کو آئیں کہ مجھے کسی قسم کی تکلیف تو نہیں۔کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف کہوں۔کیسے کہتا کہ بہت بڑی تکلیف یہ ہے کہ آپ نہیں آتیں۔مجھے اس وقت نہیں بلاتیں جب مالش کر رہی ہوتی ہیں مجھے اس وقت یاد نہیں کرتیں جب شیشے کے سامنے الف کھڑی ایک ایک کپڑا بدلتی ہیں اور بانہیں اور چھلیا حیرت،خوشی اور افتخار سے پری پیکر کے چکنے سنہرے انگ پر نگاہیں رولتی پولتی ہیں۔

میری جان پر زیادہ عذاب یہ آیا کہ یاور الیاس الفت اور اس کے اتالیق کو پکچر پر لے گئے۔بیگم الیاس ہمارے ساتھ نہ جاسکیں۔ان کو خود کہیں جانا تھا۔

پکچر پر الفت کی تحریروں کا ذکر آیا اور میری طرف سے حوصلہ افزائی کا سن کر الیاس بہت خوش ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ الفت کے پاس مغربی میوزک کے جو ریکارڈ ہیں وہ بھی مجھے سننے چاہئیں تاکہ موسیقی میں بھی مجھے الفت کے ذوقِ سلیم کا علم ہو سکے۔ان کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ الفت مصوری بھی کرتی ہے۔

رات کو بڑی گہری نیند آئی۔نور کے تڑکے جب نیند کا سرور انگیز جھونٹا آتا ہے اور اس کے بعد غنودگی کی طنابیں ڈھیلی پڑنے لگتی ہیں۔صبح کا ستارہ اجالے کا نقیب بن کر آتا ہے اور پھر آپ ہی اس اجالے پر فدا ہو جاتا ہے۔میں نے اپنی پائنتی کی جانب ایک سایہ محسوس کیا۔خالی دماغ میں نیند بھری ہوئی تھی۔اور بھر گئی۔جسم کا سہلانے والا پروں کی طرح ملائم اور خاموش سیلاب میرے پاؤں کو چھونے لگا۔میں جیسے نیم خوابی کے عالم میں ساحلِ سمندر پر کھڑا تھا۔ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا۔میری پائنتی کے قریب مجھے قتل کرنے کے لئے کوئی بیٹھا ہوا تھا۔

''تم کون ہو۔''

''میں آپ کے پاؤں دبا رہا ہوں''۔

''مگر تم کون ہو۔اندر کس طرح آئی ہو؟''

''میں آپ کے لیے بیڈ ٹی لائی ہوں۔میں خدمت گار ہوں''۔

ایک سلونی سی نوجوان لڑکی میری پنڈلیاں دبا رہی تھی۔ میں نے پاؤں کھینچ لیے اور سائڈ لیمپ روشن کر دیا۔ لڑکی نے بیل باٹم پہن رکھا تھا جس کی سائڈ کے کسے ہوئے بٹنوں کے بیچ کے فاصلوں میں کولہوں کا گوشت پھنسا پھنسا دکھائی دے رہا تھا اور ریشمی کرتی کے پیچھے کا لب ولہجہ بڑا تیکھا تھا۔ گردن میں خواہ مخواہ اودے رنگ کا دوپٹہ جھول رہا تھا۔ میں نے پاؤں کھینچ لیے تو وہ میرے پاؤں چھونے کے لیے آگے بڑھی اور بڑھ کر بستر کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

''تم کدھر سے آئی ہو۔ کمرا تو اندر سے بند تھا۔''

''دیوار میں چور دروازہ ہے۔ مجھے اندر بیڈ ٹی جو لانی تھی۔''

''کل تو تم بیڈ ٹی نہیں لائی تھی''۔

''بیرا لایا تھا مگر آپ سیر کرنے جا چکے تھے۔ میں بی بی الفت کی ملازمہ ہوں۔ میں چھٹی پر گئی ہوئی تھی مجھے آدمی بھیج کر منگوایا گیا ہے کہ بی بی الفت کے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ انہیں تکلیف ہوتی ہے''۔

وہ صحت سے بھرا ہوا بدن دکھانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوگئی کہ دیکھو میری اہمیت مجھے آدمی بھیج کر منگوایا گیا ہے۔ میں کیا کرتی ہوں۔ پھر وہ اپنی سانولی کلائی پر ایک ایک کر کے اپنی چوڑیاں اکٹھی کرتی رہی اور ساتھ ساتھ دانتوں میں کچھ چباتی رہی۔ پھر آگے بڑھ کر بولی۔ ''چائے بناؤں''۔

جھکی تو خوشبو سے معلوم ہوا الائچیاں چبا رہی تھی۔

''میں خود بناؤں گا تم چلی جاؤ۔ کوئی آ جائے گا''۔

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور بولی۔ ''سائیں اس گھر میں کوئی آٹھ نو بجے سے پہلے نہیں اٹھتا۔ سارا گھر سویا پڑا ہے''۔

اس نے میرے کندھوں کو اپنی مٹھیوں میں دبوچ لیا۔ ''آپ مجھ سے ذرا دبوا کر تو دیکھیں''۔

''تم سے میں نے کہہ دیا ہے وہ تمہارا راستہ۔ اٹھاؤ اپنی چائے اور نکل جاؤ''۔

وہ چائے کو ہاتھ لگائے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

یہ کیا سازش تھی۔ کس نے کی تھی۔ کس کے خلاف تھی۔ یہ جال کیوں بچھایا گیا۔ میں چائے بنا کر چسکیاں لیتا رہا اور سوچتا رہا۔ بات وہی کہ مالک سنگتروں کی رکابی بھر کر سامنے رکھ دے اور آپ کا جی چاہے توڑنے کو درختوں سے اتار کر کھانے کو۔ مالی اور باغبان کو تھوڑا سا چکرا دینے کو --- میں اٹھا۔ تیار ہوا اور باہر کی ہوا کھانے کے لئے صنعت و حرفت کی اس عالی شان لینڈ سکیپ سے نکل آیا۔ چلتا چلتا نالے کو پار کر کے اونچی چٹان پر جا بیٹھا۔ صبح کی لطیف ہوا میں کتنی تازگی تھی۔ میں سامنے نشیب کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں کی زمین پرانے کھنڈروں کی طرح کہیں اونچی کہیں نیچی تھی۔ میں سگرٹ سلگا کر آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔ سامنے والی پگڈنڈی پر بیس برس کا ایک نوجوان لڑکا چلا آ رہا تھا اس کے ہاتھ میں ٹاٹ کا ایک تھیلا تھا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔

اس نے تھیلے میں سے نکال کر ایک پمفلٹ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ''وقت کا تقاضا'' جسے طالب علموں کی کسی تنظیم نے شائع کیا تھا۔

''آج اس پمفلٹ کی تقسیم کا آغاز آپ سے ہوا جناب کی تعریف''۔

''میں قریب ہی سے آیا ہوں۔ صبح کی سیر کر رہا ہوں''۔

''میں سٹوڈنٹ ہوں۔ اپنی تنظیم کا کارکن ہوں''۔

''جی۔ وہ رہا میرا گھر۔ خدا حافظ''

وہ چلا گیا۔ میں نے پہلے پمفلٹ کو دیکھا پھر نشیب کی طرف دیکھا۔ گھر کیا تھا۔ فقط ایک کوٹھڑی تھی۔ نواح میں دو چار درخت کھڑے تھے۔ میں چٹان پر سے اٹھ کر نیچے اترنے لگا۔ درختوں کے پاس ایک سانڈ بندھا ہوا تھا۔ ایک مفلوک الحال عورت چولہے میں آگ جلا رہی تھی۔ کوٹھڑی کے دروازے کے باہر ایک زرد رو نوجوان لڑکی کھٹولی پر نیم دراز تھی۔ چہرے سے

اس نے گلزارے کی طرف دیکھا اور کہا" تو سکولے جا گلزارے کل دیدوں گا فیس"۔
چولہے کے پاس بیٹھی عورت کاڑھے والا پیالہ دھونے لگی۔ بیمار لڑکی نے سر پر دوپٹہ باندھ کر کروٹ بدل لی لڑکا پگڈنڈی پر ہولیا۔ اس کا باپ زمین پر بیٹھ کر حقہ پینے لگا اور میں پلیا سے اتر کر اس کے پاس جا پہنچا، اس نے مجھے دیکھ کر قریب کی چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ میں نے کہا" میں ادھر سیر کرتا ہوا نکل آیا تھا"۔
"کیا آپ راستہ بھول گئے ہیں؟"
"نہیں"۔
مگر دل نے کہا۔ واقعی بھول گیا ہوں جو میں نے آج دیکھا ہے کب دیکھا تھا۔
"آپ کا ایک لڑکا ابھی ابھی مجھے راستے میں ملا تھا۔ یہ پمفلٹ اسی نے دیا ہے"۔
وہ میرا بڑا لڑکا ہے۔ کالج میں پڑھتا ہے۔ آج پھر بغیر کچھ کھائے پئے نکل گیا ہے"۔
"کچھ تو کھا جاتا۔ اتنی کیا جلدی تھی"۔
یہ سن کر وہ آدمی لحہ بھر کے لئے خاموش ہو گیا۔
"بس لڑکے آج کل جلوس نکالنے میں لگے ہوئے ہیں صبح صبح ہی گھر سے نکل جاتے ہیں"۔
"دوسرا لڑکا بھی کچھ کھا کر گیا ہے یا نہیں؟" میرے لہجہ میں بڑی اپنائیت آ گئی تھی۔
"چائے کے ساتھ باسی روٹی کھا گیا ہے"۔
میرے اپنائیت کے لہجے سے وہ کچھ حیران سا ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔
"میں وہاں پلیا پر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بھینس گابھن ہونے کے لیے آئی تھی۔ سانڈنس سے مس نہ ہوا۔ آپ کا کتنا نقصان ہوا؟"
"پانچ روپے کا"۔
"مل جاتے تو اچھا ہوتا۔ لڑکا اپنی فیس ہی لے جاتا۔ اسے آواز دے کر روکا تو تھا۔ مگر بھینس کو الا بچیاں چباتے سونگھ کر سانڈ پیچھے مڑ گیا"۔
"جی"!!
میری ہمدردانہ رازداری سے اس شخص کی آنکھوں میں ایک کرن سی چھوٹی اور اس کے ہونٹوں میں سے دردمندی اور ملنساری کی مسکراہٹ جھانکنے لگی۔

"صاحب جی۔ گزارہ نہیں ہوتا۔ فاقے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ بچوں کو پڑھانا بڑا مشکل ہے۔ میں کیا دکھ بتاؤں آپ کو۔ یہ دکھ بتانے کے لئے نہیں ہوتا سہنے کے لیے ہوتا ہے"۔ اس نے یہ بات اس لہجہ سے کی کہ مجھے بڑا حوصلہ والا شخص معلوم ہوا۔ میں نے دوبارہ اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ حقہ لیے یوں اعتماد سے بیٹھا تھا جیسے زمین کی تمام حاملہ مٹی اس کے پاؤں کے نیچے اکٹھی ہو گئی ہے اور وہ اس طرح سے تمام زمین کا واحد نمائندہ بن گیا ہے۔ پھر میری نگاہ چولہے کے سامنے بیٹھی اداس عورت کی طرف سے ہو کر بیمار لڑکی کی کھٹولی کا چکر لگا کر چارہ کھانے والے سانڈ پر آ کر رک گئی جو اِس گھر کا واحد کفیل تھا۔ اور کل کے بننے والے کفیل دونو نہال جو گھر سے خالی پیٹ روانہ ہو چکے تھے حیاتِ جامد کی طرح میرے خیال کے سامنے جم کر کھڑے ہو گئے۔

حیاتِ جامد کے استر اور انسانی جذبات کی تجریدیت میرے آگے پیچھے بکھری پڑی تھی۔ یہ الفت کی پینٹنگز تھیں جو مجھے دکھا رہی تھی۔ ایک تصویر بپھرے ہوئے سانڈ کی تھی جس کی پیٹھ پر نیم برہنہ عورت گری پڑی تھی اور سانڈ سینگ زمین کی طرف کئے سر پٹ دوڑے جا رہا تھا۔

"اِس کا نام؟" میں نے پوچھا

بولی۔ "عورت اور سانڈ"۔

پھر وقفہ کے بعد بولی۔ "سانڈ نسل کشی اور طاقت کی علامت سمجھا جاتا ہے آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ قدیم زمانہ میں اس کی پرستش کی جاتی تھی"۔

ٹیڑھی ترچھی لیٹی ہوئی نیوڈ تصویر دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا "یہ نقل ہے یا لائف"۔

"لائف"

"تمہیں سبجیکٹ کہاں سے ملا"۔

"یہ میری خادمہ ہے جو صبح آپ کے کمرے میں بیڈ ٹی لائی تھی"۔

"میں نے پہلے نہیں دیکھا اسے"۔

"یہ رخصت پر تھی۔ میں نے آدمی بھیج کر منگوایا ہے"۔

"کیوں؟"

"بیچاری کی توہین کرانے کو"۔

"صبح آپ نے بہت توہین کی"۔

"میں نے!!!"

میں تاڑ گیا کہ میں سازش میں ملوث ہو چکا۔ لگ گیا مجھ پر الزام بدمعاشی کا۔ بن گیا نکو۔ ہو گئی رسوائی۔

"آپ اتنے کنجوس کیوں ہیں کہ آپ نے اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ کوئی توجہ ہی نہیں دی حالانکہ وہ آپ کے بیڈ پر بیٹھی۔ اس نے آپ کے پاؤں دبائے۔ کندھے پکڑے آپ نے اسے چھوا تک نہیں اور الٹا کمرے سے باہر نکال دیا"۔

میں نے دل میں شکر یہ ادا کیا کہ سانڈ ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں نے پوچھا "تم نے چھپ کر کیوں دیکھا تھا"۔

"جی نہیں" بیچاری کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے آ کر پہلے ممی کو سارا حال بتایا پھر میرے پاس آ کر مجھے بتایا۔

"ممی نے اسے تیار جو کر کے بھیجا تھا"

"کیوں؟"

"ممی کہتی تھی بغیر رشوت کچھ نہیں ہوتا۔ چاہے کوئی بھی ہو"

ایک وقفہ تھا خاموشی کا جس میں میں بولا نہ وہ بولی۔ جیسے برقی پاور کے رک جانے سے فریجیڈ ئر ٹھہر جائے۔

"ممی آپ سے کہنا چاہتی تھی کہ آپ ہر مہینے الفت الیاس کے نام سے ایک کہانی کسی اچھے رسالے میں چھپوا دیا کریں اور تین سو روپے فی کہانی لے لیا کریں اور جب تفریح کرنی ہو الیاس پیلس آ جایا کریں"۔

یا اللہ اس پیلس میں کس طرح کی کثافت برس رہی تھی۔ انسان کو تولنے پرکھنے کے کون سے باٹ برتنے جا رہے تھے۔ کس نفس کی برات چڑھی ہوئی تھی۔ کس دولت اور تمول کا سیلاب تھا جو مثبت قدروں کو للکار رہا تھا۔

میرے اندر سے آواز آئی۔ ایسی تیسی تمہاری۔

''آپ خاموش کیوں ہو گئے''۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ تمہاری ممی جب مجھ سے یہ بات کرے گی تو میں کیا کہوں گا۔ ان کی میٹھی آواز ان کی رعنائیاں، ان کی خوشبو، ان کا گلیمر مجھ پر پھوہار بن کر برسنے لگا''۔ الفت کے اندر سے اطمینان کی سانس نکلی۔ خوشی سے بولی۔ آپ کا میری تصویروں کے متعلق کیا خیال ہے؟ ڈیڈی ایک سال کے لیے مجھے پیرس بھیجنا چاہتے ہیں وہاں کی آرٹ گیلریوں میں گھوموں۔ وہاں کے مصوروں سے ملوں''۔

''تم ضرور جاؤ۔ وہاں کے مصور جورات کو جاگتے اور دن کو سوتے ہیں تمہیں بہت کچھ سکھائیں گے۔'' جو تم پاکستان میں نہ سیکھ سکو گی''۔

وہ بولی۔'' مجھے ان ہی شکلوں والے مصوروں میں رہنے کا بڑا شوق ہے''۔

میرا جی یہ بھی کہہ دینے کو چاہا کہ لمبی زلفوں اور ڈاڑھیوں والے یہ مصور تمہیں پہلے بڑے مزے مزے سے نوچیں گے پھر اسی طرح چھیڑ ڈالیں گے جس طرح مہنت اور سادھو تیرتھوں پر آنے والی استریوں کو اپنی لمبی لمبی لٹوں اور ڈاڑھیوں کے سایہ میں چھیڑ ڈالتے تھے اور کوئی سود اس پانچ خصموں والی رانڈ کا سانڈ گلے سے آدھا ننگا اور نشے میں پورا دھت گھٹیا رپکڑے چرس کے بدبودار دھوئیں سے بھرے سٹوڈیو کی سیڑھیوں پر بٹھا لپٹنے پکڑنے اور مروڑ ڈالنے کے سُر الاپ رہا ہوگا اور تو اس ماحول میں اپنے غریب ملک میں تیار ہونے والی موم کی طرح پگھل رہی ہوگی اور تیری ممی کلب میں آنے والے سرمایہ دار خاندانوں کے نمائشی کنوارے لڑکوں کو تمہارے بر کے لئے دل ہی دل میں منتخب کر کے مسترد کرتی رہے گی۔ اور اپنے سرکل میں بڑی نخوت و تمکنت سے کہے گی۔ الفت پیرس میں آرٹ سیکھ رہی ہے۔

بیرا کافی لے آیا تو میں نے پوچھا'' آج کی خبر کیا ہے؟''

''دو دفعہ گولی چلی ہے۔ سنا ہے طالب علموں نے ایک پٹرول پمپ کو آگ لگا دی ہے دو بسیں جلا دی ہیں۔ شہر میں مکمل ہڑتال ہے''۔

رات کو بستر پر لیٹا تو طبیعت میں ایک اضمحلال تھا۔ سگار کا جو لطف آنا چاہیے تھا وہ نہ آیا اخباروں کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو ایسا لگا جیسے خبروں میں سچائی کی بو باس نہ ہو۔ میں صبح والا پمفلٹ دیکھنے لگا۔ خونِ تازہ رکھنے والے اے نوجوان طالب علمو! اب آپ لوگوں کو ایک نیا سماج تعمیر کرنا ہے جس کے لیے جدوجہد کرنی ہوگی۔ اس جدوجہد کا مطلب ایسا عمل ہے جو سب سے زیادہ افضل باوقار اور بلند ہے۔ اس عمل کو جاری رکھنے کے لئے خاص خصوصیات ضروری ہوتی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہمیت نظریے کی سچائی پر یقین کو حاصل ہے۔ کسی کارکن کو یہ یقین کہیں باہر سے حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ اس کی ذات میں سے پھوٹے گا جس کے لیے آپ کو قربانیاں دینی پڑیں گی۔

یاد رکھو پاکستان کا موجودہ نظام روپے کے پہیوں پر چلنے والی گاڑی میں سوار ہے جس نے غریب کو غریب تر بنا دیا ہے۔ اس نظام سے صرف سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچایا ہے اس لیے ملک کے ارتقائی عمل میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے۔

نئے پاکستان کی تعمیر کے لیے ہمیں تئیس سال کے جمع شدہ ملبے کو آگ لگانی پڑے گی غربت اور جہالت کو دور کرنے کے لیے جدوجہد ـــــ

مجھے نیند آنے لگی۔

صبح آنکھ کھلی تو سیر کے لیے یوں تیار ہوا جیسے ٹرین پکڑنی ہو۔ یہ بھی ڈر تھا کہ بیگم الیاس نئی نار کو کوئی نئی پٹی پڑھا کر اندر نہ دھکیل دے۔

اپنے سیر کے راستے پر سے ہوتا ہوا نالے کو پار کر کے اونچی چٹان پر جا پہنچا۔ پتلونوں والے نوجوان لڑکے ادھر ادھر جا رہے تھے۔ کوٹھڑی سے باہر چند لوگ جمع تھے۔ میں نیچے نشیب میں اتر گیا۔ مفلوک الحال عورت ہاتھ اٹھا اٹھا کر بین کر رہی تھی۔ وہ ایک چارپائی کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی جس پر ایک نعش پڑی تھی اور اس پر ایک میلا سا کپڑا۔ میں نے ایک پتلون والے لڑکے کو بلا کر پوچھا "کیا ہو گیا ہے"۔

"ہمارا ساتھی سٹوڈنٹ کل شام پولیس کی گولی سے شہید ہو گیا۔ وہ اس کی ماں ہے جو بین کر رہی ہے وہ اس کا باپ ہے جو خاموش بیٹھا ہے۔ وہ مرنے والے کا چھوٹا بھائی ہے"۔

مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے زمین کی تمام حاملہ مٹی بانجھ ہو گئی۔

مرنے والے کے باپ کی نگاہوں میں گہری اداسی کی زردی اور ٹھنڈی راکھ کی آمیزش تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا لوگ میری طرف دیکھنے لگے مرنے والے کا باپ میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر یوں دھاڑیں مار کر رونے لگا، جیسے میرا پرانا واقف ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے حصار ٹوٹ گیا۔ ناقابل تسخیر قلعہ کی کھائی میں خون بہے جا رہا ہے جو اذیت ناک کھڑا رو رہا ہے۔ یہ ماتم اور سوگواری کی ایسی فضا تھی جسے غربت اور مظلومیت مزید لتاڑے جا رہی ہو۔ خدایا کیا تجھے اس مفلس پر بجلی گرانی تھی۔ میں مرنے والے کے باپ کو ایک طرف لے گیا۔ میرا ہاتھ آپ ہی آپ پتلون کی جیب کی طرف گیا میں نے بٹوا نکال کر سو روپے کا نوٹ اس کو دیتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پاس جو ہوگا سو ہوگا۔ یہ تمہاری ضرورت کا وقت ہے۔ اپنے پاس رکھ لو"۔

دو نوجوان طالب علم بیچ میں آ کر بولے "جی نہیں۔ آپ کی نوازش۔ دفن کفن کا انتظام ہماری تنظیم کر رہی ہے"۔

اس پر اعتماد لہجہ کے ساتھ یہ وہ نوجوان بول رہے تھے یا مرنے والے کی روح تمام اطراف میں بکھر گئی تھی۔

انہوں نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں مفاد پرست غنیم کا ایجنٹ تھا۔ اگر وہ جان لیں کہ میں الیاس پیلس سے آیا ہوں تو میرے ایجنٹ ہونے میں کیا شک رہ جائے گا۔ میں نے اپنی دوستی ہپ پاکٹ میں اڑسا ہوا ان کی تنظیم کا پمفلٹ نکال کر دکھایا اور دردمندی سے کہا۔ "شہید ہونے والے نے کل یہ مجھے دیا تھا"۔

درد کے اس باہم رشتے سے میرے ذہن کے دریچے کھلنے لگے اور فیصلہ کرنے کی طاقت، وقت اور فضا کی سوگواری میں یکسر جذب ہو کر رہ گئی۔ اب الیاس پیلس کی طرف میرے قدم نہ اٹھے۔ میں ائیر پورٹ کی طرف چل دیا۔ منضبط نظام کی کسی ہوئی تمام پرانی طنابیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ معاشرے کے اندر کی جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔

ooo

ابوالفضل صدیقی

جوالا مُکھ

نہ معلوم کدھر سے عیدو کے اندر کا مرد جیسے تڑپ اُٹھتا! آنکھوں میں رس سا چھلک پڑتا اور سیدھا ہوتے ہوتے ہونٹ خاتون کے رُخساروں پر سے پھسلتے بیر بہوٹی سے ہونٹوں سے چپک جاتے اور نہایت چابک دستی کے ساتھ بھرے بھرے بدن کے گداز نقوش اور مخملی خطوط کے نشیب و فراز کا جائزہ لینے لگتے، اور پھر بڑے زور سے بھینچ لیتے اور وہ جیسے کاٹھ کے شکنجے میں کس جاتی۔

یہی نہیں کہ خاتون ہی کا خون متھ ہو جاتا۔ عیدو کے ہونٹ بھی چپچپا کر دبک سے جاتے۔ بیمار آنکھوں میں لال ڈورے اُچھل جاتے، سانس تھرتھرا جاتی۔ گویا بھولا ہوا سبق یاد آ جاتا اور پچھلے پانچ سال کی رات شب برات اور دن عید کے ہنگاموں میں سے اب اتنی ہی استعداد باقی رہ گئی تھی جیسے سر کچلنے کے بعد سانپ میں بل اور اینٹھ باقی رہتی ہے اور فالج کے مارے ہوئے عیدو کے اندر جیسے شبد کی صورت زہر لہراتا اور خاتون کو تو سچ مچ اُس وقت سانپ ڈس لیتا......!

بقول شخصے ...... ''زندہ درگور، قبر میں پاؤں لٹکائے'' زیر ناف کلیتہ مفلوج ...... نچلا دھڑ بے کار اور حرکت سے معذور، اور کمر کے خاص اعضاء کو تو بالکل ہی مردہ کہیے۔ مگر بقیہ پوری ریڑھ تندرست تھی اور اوپر کا بدن بلکل صحیح پھر بھی خود اُٹھ کر بیٹھ نہ سکتا تھا۔ اور جب خاتون اٹھا کر بٹھا دیتی تو کھونٹا سا بیٹھا تو رہتا لیکن بس بیٹھا ہی رہ جاتا اور بغیر سہارے لیٹ نہ سکتا اور لیٹ کر بھی تختے کی طرح پڑا ہی رہتا اور بغیر تھوڑے سے سہارے کے پُوری لاش کے ساتھ آسانی سے کروٹ بھی نہ لے سکتا تھا۔

اور خاتون جب کھانا لے کر آتی تو بالعموم رات کے کھانے کے بعد لٹاتے ہوئے سہارا دیتے وقت مفلوج عیدو میں ڈیڑھ سال پہلے والا شوہر جاگ پڑتا اور پھر وہ کر موجلی سرِ شام کی چھڑی مفت میں صبح تک پھنکتی رہتی.... خاتون میں شوہر گدگداتا رہتا اور یہ بے خبر پڑا سوتا رہتا..... چھ فٹا کوروں کا لٹھا سا کھڑا، چلتے پھرتے، کودتے پھاندتے خوابوں میں گم، جب اس کے بیس گرہ سینے اور سولہ گرہ چوڑے پیٹ کے نیچے بھینسے کی طرح چبوترہ سی کمر تھی جس میں جمنا پاروکی طرح مضبوط دو ٹانگیں تھیں جمنا پارو بیل کی طرح مضبوط اور کاٹھیاواڑی گھوڑے کی طرح تند ٹانگیں جن کی دھمک کے مارے دھرتی پانی چھوڑتی اور پاتال تھرتھراتا......... عیدو کو لیے لیے پھرتی اور عیدو تو خواب میں ہی عیدو ہوتا۔ مگر خاتون پر ساری رات جاگتے۔ عیدو ہی عیدو سوار رہتا.....!

فالج گرنے کے بعد چھ سات مہینے تو علاج کی مصروفیت اور تندرستی کی اُمید رہی۔ پھر جب گاؤں اور قصبوں تک کے سب ویدوں، حکیموں اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو کچھ دنوں ابدی معذوری کا شدید احساس اور دائمی ناامیدی، سنگین قنوطیت سی طاری رہی مگر پھر حالات کے استقلال اور وقت کے مرہم نے صبر کی کیفیت پیدا کر دی اور مجبور حالت سے مطمئن ہوتے ہی بھولی باتیں یاد آنے لگیں۔ بے معنی سی رجوعیت نے عود کیا۔ پہلے دو ایک روز تو ذرا ڈرتے ڈرتے شروعات کی اور پھر یہ مہمل اختلاط اور پیار رات کے کھانے کے بعد کا معمول بن گیا۔

جیسے خود کو دھوکا دیتے ہوئے خاتون نے شروع شروع میں تو کچھ دنوں تک نہ معلوم کیوں شوہر کی دل شکنی کے لحاظ میں شاید باطل خود فریب سی اُمید میں اس جُھوٹ مُوٹ کے کھیل کا ترکی بہ ترکی جواب دیا مگر اس کا جواب تو اس کا سوال ہی ہو سکتا تھا اور جب سرے سے سوال ہی غائب ہے تو جواب کیا ہو سکتا تھا جیسے کچھ اپنا منہ آپ ہی چڑھا کر رہ جاتی اور اس کے گلابی رخساروں، پنکھڑی سے ہونٹوں پر جیسے کالا ناگ سرِ شام نہ معلوم کتنے پھن مار دیتا۔ اس کے سینے، بازوؤں اور پشت پر اور نہ معلوم کہاں کہاں مشعل سی پھر جاتی اور پھر پوری رات انگاروں پر کٹ جاتی۔ چٹ، چٹ، چناچٹ، کباب کی طرح چٹختے، بھنتے، سلگتے اور ایک مرتبہ اندر ہی اندر جھنجھلا کر ذرا سنجیدگی کے ساتھ شوہر کی اس طلب مجہول پر اعتراض کیا اور اس کا جواب مانگا تو عیدو ٹٹولتا ٹٹولتا دل سے اتر کر خاتون کی بات کا جواب تلاش کرتا پیٹ تک پہنچا۔ خیر یہاں تک تو شاید کچھ بازگشت جیسی آواز محسوس بھی ہوتی تھی۔ مگر ایک ذرا بڑھ کر کمر پر تو موت کا سناٹا تھا اور وہ مہمل چیز بھی معدوم تھی.....! اور مس اور بوسہ خواہ حقیقی ہو یا مجازی تحریک تو

رکھتا ہی ہے اور یہ تو نہ "یہ" ہوتا ہے نہ "وہ"! مگر اس بے چاری کے لیے تو کسی مَد میں نہ ہوتے ہوئے بھی طوفان سائنڈ اور آگ سا تیز ہوتا اور بغیر کسی جواب کے عیدو اپنی حرکت سے باز آنے والا نہ تھا۔ اس شوخ بچّے کی طرح جو تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکریاں پھینک کر گول گول متلاطم لہروں کا تماشا دیکھتا ہے اور وہ بے چاری ہر رات جیسے پچھلے پانچ سال عیش کوشیوں اور شب باشیوں کے ردِ عمل سے دوچار ہو کر صبح کو خمار زدہ شرابی کی طرح اٹھتی جس کے پس منظر میں شراب کے سرور کا بھی کوئی سراغ نہ ہوتا..... خُمار ہی خمار سرِ شام کا چڑھا صبح تک !!..... اور صبح سے شام تک اعضا شکنی اور گھٹن ہی گھٹن! ہمہ وقت جلن ہی جلن.....؟ پیاس ہی پیاس سارا دن! بھوک ہی بھوک تمام رات!

خاتون نوجوان تھی۔ غضب کی تندرست بلا کی حسین، اور کل کی بات ہے اُس کی نوجوانی، تندرستی، نسائیت اور زوجیت کے پورے پُورے حقوق عیدو کندھے سے کندھا ملائے نہایت مستعدی کے ساتھ ادا کرتا رہا تھا۔ اچھے بھلے پر فالج گرا، اگر مر جاتا تو اس کا سوختہ نصیب جوان مٹی بھی سہارے لگ ہی جاتی اور کہیں نہیں تو چار پانچ برادر دو بول پڑھوا کر شبراتی سے ہی پلّو باندھ دیتے گھر کے گھر ہی میں، اس سے کیا کہ شبراتی دو بچوں کا باپ تھا اور اپنی جورو کا خصم، تھا تو عیدو کا بڑا بھائی، باپ کی جائداد اور بھائی کی ناک کسی اور کے کیسے حوالے کر دیتا۔ مرے پار نہ بھرے پار۔ گھر کی بہو تھی۔ بیوہ بھاوج نہ سہی دوسری بیوی بنا کر بھرتا ہی مرتا اور اب اکیلا اپاہج بھائی کو چارپائی پر پڑے پڑے کھلا ہی رہا تھا اور پامردی سے اکیلا دھڑی بھرآتا اور کھانے والے کُنبے کو ذرا سی آبائی زمین جوت کر پال رہا تھا۔ مگر خاتون تو سانپ کے مُنہ میں چھچھوندر تھی اور سانپ بھی گُر یا ٹوٹا..... اور سانپ بھی نہیں مسلے ہوئے سنڈے کے پلّے بندھی ہوئی..... اور خاتون کی زندگی کا دھارا ہر شام چڑھتا رہا اور ہر صبح اُبلتا رہا اور بہتا پانی تو اپنی سطح خود تلاش کرتا ہے..... اور پستی میں سکون پا کر ہی دم لیتا ہے۔

کمر، ٹانگوں سے اپاہج عیدو کے حواسِ خمسہ بڑے ذکی الحس ہو گئے تھے۔ کوئی موسم ہو وہ باہر تو نکل ہی نہ سکتا تھا، جاڑا ہو یا گرمی معالجین نے ہر موسم میں بند جگہ پر لیٹے لیٹائے پڑے رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔ تھوڑا بہت علاج و معالجہ رہی مالش ٹکور مستقل چلتی رہتی تھی۔ جاڑے کے بعد پہلی گرمی آنے پر خاتون نے اندر کوٹھری میں اُس چارپائی کے برابر اپنی چٹائی بچھالی اور بدستور وہیں لیٹتی رہی..... مگر جیٹھ بیساکھ اور ساون بھادوں کی جلتی اُبلتی راتوں میں وہ کیسے اندر سو سکتی تھی، پھر بھی شکایت نہ کی۔ مگر عیدو کو خود ہی احساس ہو گیا اور اس نے اصرار کر کے اس کا بستر کوٹھری کے سامنے چھپر کے برآمدے میں لگوا دیا اور پھر جاڑوں میں برآمدے کے ایک گوشے میں اس نے اپنا پیال ڈال لیا اور یہ اس کی مستقل سونے کی جگہ ہو گئی اور برآمدے میں تو خاتون اور بھی چوکنّی نیند سونے لگی۔ پھر اتنے عرصے میں شوہر کی نیند اور مرض کے مزاج کی بھی پوری محرم ہو گئی تھی۔ رات کے ہر حصّے میں پہلی مُٹھار پر مچھلی کی طرح تڑپ کر بستر سے نکل آتی اور شوہر کی پٹی سے آ کھڑی ہوتی، ایک دفعہ کوٹھری میں آواز دینے کی نوبت آجاتی تھی۔ مگر برآمدے میں تو جیسے پہلی سانس سن لیتی اور عیدو کے دماغ پر تو فالج نہ گرا تھا۔ اُسے تیمارداری اور خدمت کا شدید احساس تھا..... اس کے ساتھ اپنی زندگی کے پانچ سالہ ازدواجی دنوں کی چہلوں اور ہنگاموں کی یادیں رنگین خوابوں کی طرح علیل خون میں گونجتی تھیں۔ جیسے اسٹیج پر نغمہ ریزی کرتے ہوئے دو مغنّی آہستہ آہستہ نغمہ ختم کر کے چلے جاتے ہیں اور، پھر بڑی دُور سے میٹھی میٹھی مدھم نسائی آواز مرمریں سامعہ نوازی کرتی رہتی ہے اور اب! اب تو یک طرفہ نغمہ! دو سرا سُر، کن سُرا بھی نہیں، خاموش، گونگا!! اور آج! آج بھی اسے اس کی نوجوانی کے شدید تقاضے معلوم تھے اور وہ خاتون کے ہر پہلو کا آشنا تھا اور سچا محرمِ راز! اور اب تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے قہر گرانے کے ساتھ اللہ میاں نے اس کے حق میں فرشتہ رحمت بھی نازل کر دیا ہے اور پروگرام کی پہلی شق سے لے کر آخری شق تک رات کو بستر پر لیٹ کر سونے سے پیشتر روزانہ اس کی بند آنکھوں کے سامنے گھومتی، صبح ہی صبح پیشاب پاخانے کے برتن لے آتا اور بٹھا کر رفع حاجت کراتا، پھر تہمد کی گھنڈی لگا کر لٹاتا اور پیشاب پاخانہ اٹھا کر لے جاتا۔ تھوڑی دیر بعد گرم گرم دودھ کا پیالہ لے کر آتا اور پھر اٹھا کر ہاتھ سے پلاتا۔ دوپہر تک ایک دو پیشاب کراتا اور وقت، وقت پر کروٹ بدلواتا، پھر دوپہر کو شوربے یا دال میں گلی ہوئی روٹی لے کر آتا۔ اور کھڑے ہو کر کھلاتا..... سہ پہر تک دو مرتبہ پھر پیشاب کراتا اور چار کروٹیں بدلواتا اور پاؤں کمر پر مالش کرتا۔ سر میں تیل ڈال کر کنگھی کرتا۔ جمعہ کے جمعہ گرم پانی ناندھ بھر کر

لانا اور روئی کے گالوں سے تمام بدن پر پھارا پھیرنا۔ سر میں پڑا اور کھلی ڈال کر صفائی کرنا اور نہ معلوم کیا کیا کرنا۔ جتنی ''کریں'' تھیں سب بیوی ہی کے ذمے تھیں۔ اور شوہر کے سر ایک بھی نہیں اور شاید انہی ''کروں'' کے شدید احساس سے اس کے ٹھنڈے خون میں رات کے کھانے کے بعد لہری اٹھتی اور اس کے ہاتھ خاتون کے بدن پر ناچنے لگتے۔ اور ہونٹ رخساروں پر پھسل کر ہونٹوں سے جا چپکتے..... نہ معلوم کیوں؟ اور عیدو فلاسفر تو تھا نہیں آدمی تھا، آدمی بھی ایک چہارم، اور تین چہارم مٹی کا تودا۔ اگر چہارم بھی آدمی نہ ہوتا اور سب کا سب مٹی کا تودا ہی ہوتا تو بھی کہتے ہیں کہ مٹی کا تودا بھی احساس کر لیتا ہے۔ لیکن اس چہارم آدمی میں ہی پورے چار آدمیوں کی حس تھی اور تین چوتھائی مٹی کے تودے میں بچھو کے ڈنک جیسی سوزش! وہ خوب سمجھتا تھا کہ وہ اس کی روزی کا خود کفیل نہیں، اس کو بڑے بھائی کی محنت سے ملتی ہے۔ اس کی نوجوانی کے لہراتے جذبات کا کفیل نہیں اور شاید اس کی کفالت کبھی پر نہیں ہے جو روزی سے زیادہ شدید تقاضا ہے اور وہ بھرا ابھر جوانی چوکڑی بھولی ہرنی ہے ریت کے ٹیلوں میں گم! جسے اپنا راستہ یاد نہیں، بس جستیں ہی جستیں اور تلاش ہی تلاش مقدر ہے..... اور ماگھ پھوس کی ایک یخ بستہ اندھیری رات میں خدمت اور تیمارداری کے احسان کی چٹان کے تلے دبے بیمار و نزار عیدو کی خلاف معمول آنکھ کھل گئی۔ کوٹھری کے دروازے کا ایک کیوڑا بند تھا، دوسرا آدھا کھلا ہوا تھا۔ سامنے برآمدے میں پیال پر خاتون کا بستر تھا، اور جیسے پیال پر اٹھنے کی سرسراہٹ ہوئی اور پھر برآمدے کی دہلیز پر سایا سا جاتا معلوم ہوا، اور سائے کی حرکت سے عیدو نے اندازہ لگایا کہ خاتون اٹھ کر باہر گئی اور صحن میں دوسری جانب ایک اور سایا بڑھا، اور کہرے اور دھوئیں کی ڈولتی ہوئی متحرک کالی چادر میں لپٹے ہونے کے باوجود اس نے بڑے بھیا کے سائے کو پہچان لیا اور سمجھ گیا کہ شبراتی اپنی کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ صحن میں دونوں سائے جمع ہو گئے۔ سامنے کوٹھار کا دروازہ تھا اور جیسے دونوں کوٹھار کی جانب بڑھے اور کوٹھار کی زنجیر اور کیواڑ کھلنے کا مخصوص کھنکا، جس سے اردگرد کے کان بچپن سے خوب مانوس تھے اور پھر خواہ کتنے ہی آہستہ کیواڑ بند ہوئے مگر اس کی چرخ چوں تو عیدو کے کانوں میں، پوتڑوں میں پڑی تھی..... اور عیدو کی کوٹھری اندھیری تھی، خاتون کا برآمدہ اندھیرا تھا، گھر کا صحن گھٹاٹوپ تھا اور کوٹھار کی کوٹھری تاریک در تاریک تھی اور عیدو کی علیل نگاہ اپنی کوٹھری کے اندھیرے کو چیرتی، صحن کے اندھیرے کو پھارتی کوٹھار کے کیواڑوں کو توڑ کر اُس پار کی تاریکیوں میں سب کچھ دیکھ رہی تھی اور اندر گرمی کی نمی اور نمی سے جیسے ناک کے نتھنے پر محسوس ہو رہی تھی، برسات کی سیلن سی، بدبو، بھکراند..... گویا اسکرین پر دو کھیلتی مورتیں، زندہ! ایک جان اور دو قالب، رونکھا رونکھا، متحرک ہی متحرک، گرم ہی گرم، گرم اور نم اور اسے ایک جھرجھری سی محسوس..... ماگھ پھوس کی ملی جلی رات میں لو کی سی جھرجھری!..... مگر وہ تو حرکت سے بھی معذور تھا، گرمی سے بھی محروم..... مگر ناک کے ٹھنڈے نتھنے سے لے کر ناک تک سنسناہٹ ہوگئی..... جیسے کوئی چیز بڑی تیزی سے رینگتی چلی گئی۔ سَن سَن سَناناتا۔ سائیں!..... علیل خون میں جوار بھاٹا سا اٹھا اور کنارے دُور کہیں آدھے راستے پہنچ کر مندھا گیا..... لیکن دل تو مفلوج نہیں تھا اور دماغ بھی تندرست تھا، اور دل نے خون کی موٹی دھاریں صاف کر کے دماغ کی جانب اندھادھند پھینکنی شروع کیں..... اور دماغ نے تجزیہ کیا اور ایک لہر سیدھی نیچے کو بڑھی مگر کمر کے پتھریلے بند سے ٹکرا کر واپس آئی، اور جیسے ردِعمل میں سرسراتے ناگوں کی طرح لہراتی دماغ کی جانب لپکی، اور سینے میں سے گزرتے ہوئے لہراتے سانپ کترا کر جیسے دل کے کسی سوراخ میں جا چھپے اور پھر خون صاف ہو کر سلامت روی کی چال چلنے لگا۔ چند منٹ میں پوری ایک کتاب دل و دماغ کے مجاولے پر مرتب ہو کر سینے کے صندوق میں محفوظ ہوگئی۔ کھٹکے پر کان چونکے، کوٹھار کے کیواڑ کھلے اور بیوی اور بھائی کے سائے پھر صحن میں کانپتے ہوئے معلوم ہوئے، پیال کے تنکے بھن بھنائے اور خاتون کا سایا سامنے بستر میں دبک گیا اور معذور مفلوج کے اندر سوال اُبھرے اور اندر ہی اندر جواب مل گیا۔ ''ہوں! جنس کا جائزہ لینے گئے ہوں گے بھاوج جیٹھ کوٹھار میں..... ''مگر آدھی رات جنس کے جائزے کا کون سا وقت ہے؟..... ''ہوں۔ نہیں نہیں چور کا شبہ ہوا ہوگا..... چوہوں کے کھٹکے پر..... ہوں، اونہہ!''..... اور اس نے آنکھیں بھی بند کر لیں اور لحاف میں منہ بھی ڈھک لیا اور آنکھ بند کرتے ہی صبح کے پیشاب پاخانے سے لے کر نگاہ سوتے وقت کے دودھ کٹورے تک پہنچ گئی، اور پھر ز در سے بڑھ کر ہفتوں، مہینوں اور سالوں تک پیچھے دیکھتی چلی گئی اور اُلٹی چل کر پھر اور پھر آگے گئی تو زندگی کا روزگار تھا، تاریک اور لامحدود، اور اس کا کنارہ تو آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود کہیں

دُور دُور دکھائی نہ پڑا، خاتون یا معذوری کا سہارا، بڑھاپے کی ٹیک اور بیماری کی دوا..... اور عیدو دیہاتی، دل اور مجبوری میں سمجھوتا کرا کر سو گیا اور صبح کو بالکل مطمئن اٹھا، جیسے شیر خوار بچہ بیدار ہوتا ہے ماں کے ہاتھوں کا تھپکا میٹھی لوری پر گہری بے خبر نیند سو کر..... اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ تو جیسے اس پر ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ خاتون حسب معمول پیشاب پاخانے کا برتن لے کر آئی، اپنی معذوری اور بیماری..... اس کی خدمت اور تیمارداری..... اور پھر جیسے رات کے واقعات کا ہلکا سا سایا سا دماغ کے پردے پر منعکس ہوا اور فوراً ہی معدوم ہو گیا..... خاتون کی بھر بھراتی جوان..... شبراتی کی جاں فشانی..... جو اپنے بل پر اکیلا ذرا سی آبائی زمین کے سہارے پورے کنبے کا بار اٹھائے ہوئے ہے..... اور سب سے زیادہ خود اس کا اپنا بار، چارپائی پر پڑے پڑے! اور وہ اور خاتون دونوں اسی پر تو لدے ہوئے ہیں..... اور پھر، پھر تو وہ یہاں تک جا پہنچا!..... اور اگر شبراتی نے اپنے اوپر خاتون کا پورا بوجھ رکھ بھی لیا تو ایسی کیا بات ہے..... اور سمجھوتہ راسخ تر ہو گیا۔ بارٹل گیا..... اُدھار چک سا گیا..... دن کا دن چڑھ گیا اور رات کا رات اترتا ہوا قرض صبح کے صبح پاک!

بہار کی ایک نم ناک خنک صبح کو عیدو کی آنکھ جیسے کسی شور پر کھلی..... چڑ۔ چڑ۔ چڑ! اچڑ چھت سے دو چڑ ونٹے لڑتے ہوئے چارپائی کے برابر زمین پر آگرے اور گتھ گئے۔ اور چڑیوں کے دو جوڑے ہمیشہ سے چھت میں رہتے تھے اور عیدو کی تنہائی کے رفیق تھے اور عیدو ان میں سے ہر ایک کی جبلت کا پورا محرم اور دن کے سنسان گھنٹوں میں ان کے مشاغل دیکھ دیکھ کر وقت کاٹتا اور دل بہلاتا تھا، دو تین روز بڑے چڑے کی چڑیا غائب تھی۔ شاید کسی اور چڑے کے ساتھ چلی گئی تھی یا باز شکرے نے جھپٹ لی تھی اور چھوٹے چڑے کی چڑیا اس وقت محو ناز تھی۔ نیچے پہنچ کر دومنٹ پھُدک پھُدک کر چونچ پنجوں سے چلتی رہی پھر کشتی ہونے لگی کبھی یہ اوپر کبھی وہ..... کچھ دور پر چڑیا میٹھی دیکھتی رہی جیسے نتیجے کی منتظر، چارپائی پر پڑا عیدو دیکھتا با شاید نتیجے سے باخبر..... اور جیسے دونوں چڑوں کے خون کا جوش عیدو کے سینے میں سنسنایا، چڑیوں کا ذل کا ذل گردن سے رینگ کر کمر کی جانب بڑھتا محسوس ہوا..... مگر آگے تو راستہ بند تھا جیسے کچھ اپنا تھا ہی نہیں، گویا کسی اور کے، شاید شبراتی کے کمر، کولہے، رانیں، پنڈلیاں فٹ تھیں اور اوپر نیچے میں ربط نہ تھا، اور جب اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو چھوٹا چڑ اشکست کھا کر فرار ہو رہا تھا، اور دوسری نگاہ ڈالی تو سامنے کھونٹی پر بڑا چڑ ا اس چڑیا کے ساتھ اختلاط کر رہا تھا..... عیدو نے ایک لمبی سانس لی.....یہ تو گردن سے لے کر دُم تک پورے گریوں والا بھی شکست کھا گیا!..... اور شکست کھانے کی قوت تو تھی اس میں! اور یہاں تو یہ بھی نہیں..... شکست کھا کر بھی شکست کے لیے اسے کسی کی مدد درکار ہے۔ پاؤں سے لے کر کمر تک افتاں و خیزاں نگاہ چڑھی اور جیسے رونگٹے رونگٹے پر ٹھوکر کھاتی کمر پر پہنچ کر چاروں خانے چت جا پڑی، آنکھیں بند ہو گئیں، ذرا دیر میں بھاوج کی گرج اور بیوی کی چنچناہٹ پر کان چونکے، صحن میں دونوں لڑ رہی تھیں۔ شروع شروع میں تو مکالے گول گول رہے مگر وہ دونوں کے مکالمے اچھی طرح سمجھتا رہا اور لفظ لفظ کی وضاحت اس کے دماغ میں گونجتی رہی، مگر وہ یہی سمجھے رہا کہ دیورانی جٹھانی کی روایتی، تُو ،تُو ،مَیں مَیں ہے..... اونہہ! گھریلو..... دال، آٹے، چاول، گڑ، تیل، گھی کے گرد گھومتی ہوئی لڑائی جیسی گھر گھر میں ہوا کرتی ہے۔ اور اس نے آنکھیں بند کر کے دبیز رضائی بھی منہ پر ڈھک لی۔ اور خیر آنکھیں تو بند کیے بند بھی ہو جاتی ہیں، مگر یہ کان! یہ کان کم بخت تو ہر وقت کھلے ہی رہتے ہیں اور سات تہوں میں دباؤ لاکھ انگلیاں ٹھونسو، ظالم سنتے ہی رہتے ہیں۔ اور عیدو کے کان تو جیسے اس کے دماغ کے اندر کی آوازوں سے پنپتا پنپتا کر بھاوج کا کہا سن رہے تھے۔ اور عیدو کی آنکھیں تو اندھیرے میں بھی دیکھتی تھیں۔ کھلی بند یکساں اور اندھیرے کو نکھار میں اور بھی زیادہ اور بھی واضح!..... یہ تو روز روشن تھا! اور بھاوج قیاس اور شبہے پر کہہ رہی تھی مگر عیدو کے کان بھی سن رہے تھے اور آنکھیں بھی دیکھ رہی تھیں..... اور کچھ سمجھائی کو کیا سمجھانا، اور اس نے تو دل تک کو سمجھا لیا تھا، خاتون کے طلائی مکھن سے چکنے چکنے ہاتھ جن میں سہاگ کی چوڑیاں جھنجھناتی ہیں وہ برف کی چوٹی سا سینہ ہے جس میں لاوا ابھر ابھرتا ہے، ریشم کی پوٹ سی کمر جس میں مچھلیاں سی تڑپتی ہیں اور انھیں کے بل پر کھڑی ہو کر وہ اس کے کیچوے جیسے وجود کو پالتی ہے، اور کیچوا تو نہ سن سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے..... اور پھر کمر ٹوٹا کیچوا تو رینگنے کا بھی اہل نہیں ہوتا، تو وہ پھر کیوں دیکھے اور کیوں سنے۔

مگر کمر ٹوٹا، اندھا، بہرا کیچوا تو سب سنتا رہا اور سب کچھ ہوتا رہا اور دیکھتا بھی رہا۔

''ہوں چھنال!..... تیرا تو اللہ نے چھین لیا اور تو نے مجھ پر ہاتھ صاف کیا..... داسعہ بازے۔''

''چپ، چھنال ہوگی تو، آئی بڑی تہمت دھرتی۔'' خاتون نے بڑی مشکل سے جھینپ دبا کر کہا۔

''اچھا رنڈی، تہمت! کیا میں اندھی ہوں؟ اور تو تو اندھلا گئی ہے آگ میں جیسوا۔'' جیسے شبراتی کی بیوی کے منہ سے یکے بعد دیگرے شعلے ہی شعلے نکل پڑے۔

''چل ستر خصمی..... '' خاتون نے سنبھلتے ہوئے جیسے کسی اور کے حلق سے نکالا۔

''جا جا چھنال! چوری اور سینہ زوری بات کرنے کے قابل ہے تو بھی۔'' دروزے پر شبراتی کی مضارسن کی مدھم آواز میں کہا۔

''چھنال تو یا میں، آئی بڑی کوئی وہ بن کے۔'' شبراتی کی چاپ سن کر خاتون نے روہانسی آواز میں کہا.....

اور اتنے میں شبراتی کی شیر جیسی گرج سنائی دی، جس کے لوہے کی لاٹ سے قد میں بھینسے کی طرح مضبوط اور کاٹھیاواری گھوڑے کی طرح تند پڑتی ہوئی ٹانگیں لگی تھیں، جن کی دھمک کے مارے دھرتی پانی چھوڑتی اور پاتال تھرتھراتا تھا۔ جو سب کا کفیل تھا اور ہر بات کا اہل..... اور کمرتو تا کبھو ابھی تو اسی کی اہلیت کے بل پر بلبلایا کرتا تھا۔

شبراتی کی گرج پر خاتون سہم کر چپکی ہوئی، شبراتی کی بیوی ایک دو دفعہ چیخی چلائی اور پھر بیل ہانکنے کے ہنٹر کے ڈنڈے (آر) کی آواز سنائی دی اور شبراتی کے دونوں بچوں کی چیخ پکار اور بیوی کی آہ و بکا ذرا دیر بس شور ہی شور! اور پھر ڈنڈا پٹنے کی دھما دھم، اور پھر مدھم شور! اور پھر مکمل خاموشی۔

اور یہ روزانہ کا نہیں تو اٹھواڑے میں چار دن کا معمول بن گیا اور ہمیشہ شبراتی کا ڈنڈا بیچ میں پڑ کر بیچ بچاؤ کرا دیتا، اور جب شبراتی کھیت پر ہوتا اور لڑتے لڑتے صبح سے دوپہر ہو جاتی اور دوپہر کو خاتون عیدو کے لیے دودھ روٹی لے کر آتی تو عیدو کی آنکھیں اسے چار نہ ہوتیں، گردن جھکائے ہی جھکائے کٹورا لے لیتا اور ایک دم سٹروپ جاتا جیسے جُرا چرا ڈرا ڈرا سا اور کھا پی کر بغیر رکی ہوں، ہاں کے لیٹ جاتا اور آنکھیں بند کر لیتا، مبادا خاتون کہیں آج کی لڑائی کی بات چھیڑ دے.....

اور بات تو کوٹھار سے نکل کر پہلے شبراتی کی بیوی کی کوٹھری میں پہنچی تھی اور جب وہاں شبراتی کا گھوڑی، استر، جوتا ختم نہ کر سکا تو نکل کر صحن میں ناچنے لگی۔ اور اس ناچ کو شبراتی کا ڈنڈا بھی نہ روک سکا اور سب گھر والوں نے حتیٰ کہ ذہین اور تیز گوش قسم کے پڑوسیوں تک پہنچ چکی تھی البتہ عیدو کے منہ در منہ نہ پہنچی تھی، مگر سب کو یک گونہ حیرت ہوئی اور سب سے زیادہ عیدو کو، بات تو بدستور چلتی رہی مگر شبراتی کی بیوی خاموش ہوگئی اور چھ مہینے روز روز کی چیخ چیخ اور دھائیں دھائیں کے بعد اس کی یہ سکون کی کیفیت حیرت زدہ تھی۔ حتیٰ کہ اب شبراتی کے کوٹھرے سے بھی یہ بھوت چڑیل کے چیخنے کی آوازیں نہ آتیں۔

شبراتی کی بیوی کی پہاڑ سی اٹل نسائیت کا بڑا اقتصادی مصلحت کے ساتھ سمجھوتا ہوا، اگرچہ ان کی عورت والی جبلّت اندر ہی اندر رلاوے کی طرح پکتی رہی مگر خارجی طور پر پرسکون سا رہا اور مصلحت کا پلّہ تو ہمیشہ سے بھاری رہا ہے اور وہ بھاری بھرکم پن کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتی رہی جیسے کسی خاص مطمح نظر کے تحت خونی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر بھی اندھی رہی، اور لالچ تو اندھا کر دیتا ہے اور بہرا اور گونگا بھی، اور آبائی زمین سے تو بڑی محبت ہوتی ہے اور شبراتی نے آبائی زمین داری کا سبز باغ اس کے دونوں لڑکوں کے حق میں دکھایا، اور عیدو اور خاتون کو نکال دینے سے آدھی زمینداری نکل جانے کا خطرہ ظاہر کیا..... اور زن، زر، زمین کے روایتی جذبات پر زمین کا لالچ غالب آیا اور اولاد کے مستقبل کے لیے ماممتاؤں نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں اور ان میں سے ایک یہ بھی تھی۔

مگر آج آثار شدید تھے جیسے چھیوں مہینے کے شور آج ایک دم صحن میں پھٹ پڑے تھے۔ خاتون تو خیر علیحدہ تھی۔ آج منہ در منہ اور اس کی بیوی میں ہو رہی تھی۔ اور خلاف معمول شبراتی ڈھیلا اور بیوی تنی ہوئی تھی..... تھوڑی تو تو، میں میں کے بعد شبراتی دروازے سے نکل گیا اور شبراتی کی بیوی گلے میں رسّی ڈال کر چھپر کے شہتیر میں لٹکنے لگی۔ بچوں نے دوڑ کر شور مچایا اور چوپال سے اٹھ کر شبراتی اندر بھاگا اور خیریت گزری کہ وقت پر آ گیا اور ابھی لٹکنے نہ پائی تھی کہ گلوخلاصی کر کے پکڑ لیا، تو دیواروں سے زور زور سے سر ٹکرانے لگی۔ اور آج پہلی مرتبہ شبراتی نے اپنا ڈنڈا کھلّل محسوس کیا اور پھانسی اتارتے گلے پر ڈنڈا تو ڈنڈا تلواریں بھی کھٹل ہو

جاتی ہیں۔اور شبراتی نے ہمیشہ لات سے اتارنے والا بھوت بات سے اتارنا چاہا اور پھانسی کے پھندے سے نکلی ہوئی عورت کے رونگٹے رونگٹے سے زخمی شیرنی کی سی چنگاریاں چیخ پڑیں اور شبراتی کے" کیوں کیوں، کیا بات ہے! کے رسمی سوال جواب میں جیسے چھ مہینے کی سیکڑوں خاموش عورتیں جاگ پڑیں۔" تو نہیں مانتا کیا بات ہے! تیری وہ ہوتی سوتی تو سب جانتی ہے نگوڑی چھنال نے تجھے یہ نہیں بتایا پانچ مہینے بیت گئے بیسوا کو اور تو تو میری چھاتی پر سال بھر سے دکھ دکھاتے مونگ دل رہا ہے بڑا چھنالا کہیں کا مکار!"

'اور پانچ مہینے بیت گئے' سن کر تو ایک دفعہ شبراتی اچھل پڑا کچھ کہتے بن نہ پڑی، سٹ پٹا کر سنبھلا، چور ضرور تھا مگر کوتوال سے ساز باز کیے ہوا چور تھا۔ ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔

"جھوٹ بالکل جھوٹ بکتی ہے"

"میں جھوٹ بکتی ہوں۔کل سب پر کھل جائے گا۔اور دور کیوں جاؤ اپنی اس نگوڑی بیسوا سے پوچھ لو اور پوچھ بھی کا ہے کو لو، دیکھ لو نا! وہ سامنے کھڑی ہے چھنال، مٹکا سا پیٹ لیے"..... اور خاتون مظلومیت کے انداز میں پنکھے کی آڑ پکڑنے لگی جیسے کوئی پھنسا ہوا چور..... اور کن انکھیوں سے اس جانب دیکھ کر شبراتی اچھی طرح سنبھل گیا اور ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔

"تو ہی تجی! چل! تو کیا بات ہے!"

اور جیسے شبراتی کی بیوی کے نتھنوں سے سانپ پھنکار پڑے۔"چل چھنالے مکار، جھوٹے، فریبی اور سال بھر سے مجھے دم دلاسے دے رہا ہے، بتا تیرے میرے بیچ کیا بات ہوئی تھی جو میں سال بھر سے منہ سیے بیٹھی بھیتر بھیتر پھنک رہی ہوں اور تو گل چھرے اڑا رہا ہے۔"

"کیا بات ہوئی تھی؟" شبراتی نے اپنے ڈھیلے انداز کو جھٹکے دار لہجے سے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"ہوں.........." اور جیسے سر سے پاؤں تک ناگنیں ہی ناگنیں لہرا پڑیں۔ادب، لحاظ، تمیز، میاں بیوی سب رشتے کٹ ہی گئے تھے جواب طلبی ہی جواب طلبی تھی۔"آج کیسا بہرہ بنتا ہے، موا مکار سال بھر سے مجھ رنڈیا کو دم دلاسے دے رہا ہے کہ باپ کی سب جائیداد تیرے لڑکوں کو ملے گی اور میری آنکھوں میں تکلے گھونپ گھونپ کر سامنے....."

"تو کیا عیدو باپ کا بیٹا نہیں، ڈھٹائی اور عذر لنگ کے سہارے جیسے شبراتی نے بات بدلنی چاہی۔

اور جیسے شکاری کتا خرگوش کو جھنجوڑ کر پھینک دیتا ہے"چل چل دور رہو مت بنے! جھوٹے، سب معلوم ہے، کون کون حرامی باپ کا ہے اور تو کیا جانے گا زانی کار، حرامی بچے! تیری اماں چھنال کو بھی معلوم تھا حلال کیا ہوتا ہے، مٹے چھنالے! نگوڑے پاپی! موئے کتے! اب بتا جو تو نے سال بھر سے مجھے دم دلاسے دیے۔" اور سوتیا ڈاہ کا جوالا مکھی بھڑ بھڑا کر لاوا اگل رہا تھا۔مگر سال بھر کی ڈھیل میں شبراتی کی ڈھٹائی چٹان کی طرح بے حس اور اٹل ہو گئی تھی، کچھ شوخی اور بے حیائی کے ملے جلے انداز میں کہتا ہوا باہر نکل چلا گیا" خیر یہی سہی" مجھے اس سے کیا، مرے تو تینوں کو ملے گی۔"

اور شبراتی کے پیٹھ پھیرتے ہی چھتوں اور چھپریوں پر گلبریوں اور چھپکلیوں کی طرح چپکی پڑوسنیں صحن میں اتر آئیں، اور بات تو سب ن ب نہ جانے کب سے جانے پڑی تھیں، آج نیا شگوفہ کھلا تھا، نیچے آتے ہی تجاہل عارفانہ سے دو طرفہ سوالات جوابات کا روغن چھڑکا اور بھبیاں پھر بھڑک اٹھیں، ایک ہنسوڑ پیہم قہقہے لگا رہی تھی، دوسری خرخری ہنسنے پر مخصوص سنجیدگی سے ڈانٹ رہی تھی، تیسری بول پڑی" گھر بیٹھے آیا پوتا، بویا نہ جوتا۔ کوئی ٹھنڈی پنچائتین بول پڑی۔" بویا نہ جوتا کیوں ہوا؟ اس کا تو سات ہاتھ کا خصم بیٹھا ہے۔ جب تک ایک بڑبوڑھی نے لقمہ دیا" بیٹھا کہاں ہے بہن لیتا ہے جبھی تو.....!" اور آنکھ مار کر شبراتی کی بیوی کی جانب اشارہ کیا اور شبراتی اور عیدو کی بیویاں غراتی بلیوں کی طرح لڑتے لڑتے غٹ پٹ سی ہوگئیں۔ یہ لیکی وہ بھی اور برآمدے میں بنی اور بات" ڈرگس ڈران" سے بڑھ کر" بلٹیل پوائنٹ" پر پہنچ گئی، دنادن ہونے لگی، برآمدے کی دہلیز پر پہنچ کر شبراتی کی بیوی بڑے تڑاخ کے ساتھ بولی" نہیں آج تو بوا کو چھوڑوں گی۔" اتنی پچ بیبیوں کے سامنے منہ پہ بیسوا چھنال بارہ تالی سے!" اور پھر زہر کا سا گھونٹ بھر کہا کہا۔ بتا چھنال بتا! یہ کہاں سے لائی؟ رنڈی! اور ایک دم برآمدے میں بڑھی، خاتون بے چاری دو قدم پیچھے

پڑوسیں بات لے اڑیں۔

'ہے ہے بیبیو! بُرا زمانہ ہے۔'

'چودھویں صدی ہے چودھویں! حرام حلال ہے حلال حرام!'

'ارے جس کا باپ زندہ اسے کون حرامی کہے!'

'اور بوا کسی کے کہے کوئی حرامی ہو جاتا ہے؟'

'اے لو بہن وہ تو پچھلی پولیس کھول رہا ہے، اور اب تو معلوم ہے گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔'

'ہاں بیبیو! اللہ جانے تین برس تو منہ پر موچھیں رکھوائے کنوارا اجتھیار ابھاوج کے کولہے لگا کھاتا رہا تھا۔'

'ہوں بہن! تین چار برس بھر کے کمائی کھائی تو بُرے جیون بُرے حوالوں کہیں جا کر چوتھے برس بیاہ منگنی کی بات اٹھائی۔'

'ہاں ہاں سو اُس وقت سب سمجھے، دیور کے مال کمائی حصہ بانٹ کے مارے بسورتی ہے،'

'ہاں بی بی ہم بھی یہی سمجھے تھے مال کھا رہی ہے کنوارے دیور کا اس لیے بیاہ منگنی نہیں پلٹنے دیتی، لو آج گل کھلا!،'

'کچھ مت کہو بیبیو توبہ کرو توبہ! چودھویں صدی ہے چودھویں، شیطان موا پلک مارتے ہی ڈگاتا ہے۔'

'اور دیکھ لو نا آج اس بے چاری خصم والی پہ کیسے دندنا دندنا کر چڑھ چڑھ بیٹھتی تھی اور اپنی سب بھول گئی نطفہ لیک!'

'دھوئی دھائی چندا سی'

'کیوں نا زمانہ سیدھا ہے آج، مسٹنڈے خصم والی جو ہے لمبی ناک ہے اور چندا سے بیٹوں کی اماں ہے، (قہقہہ لگایا)

'پھر آج پونچھ جڑ سے لی اس لُنجے نے!'

اور شبراتی کی بیوی کٹی پتنگ کی طرح ڈولتی ڈولتی اپنے کوٹھارے میں چلی گئی اور بڑے زور سے چیخ کر کیواڑ بند کر لیے اور کیواڑوں کے دھماکے پر سب پڑوسنوں نے ڈراپ سین والا قہقہہ لگایا اور جو کچھ باقی رہ گیا تھا، وہ بڑبڑاتی اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔

شام کو خاتون کوٹھری میں آئی عیدو پر چھائی ہوئی سی، جیسے بیساکھ جیٹھ کی گرمیوں میں بیچ در بیچ آکاش بیل شاداب ہو کر گوبند کی صورت چڑھی ہوئی سوکھے سوکھے چوسے ہوئے درخت کی مٹھرائی مٹھرائی پتیوں اور اینٹھی اینٹھی روڑی بے جان سی شاخوں کو ڈھانپے ہوتی ہے۔ قدم مٹھی بھر کھنچا ہوا سا، سینہ پیٹ سے آگے ابلا پڑتا اور پیٹ سینے سے آگے جاتا تھا اور کولہوں پر تو

جیسے دو دنبیوں کی چکتیاں بھل تھلا کر کپڑوں سے باہر نکلی پڑتی تھیں۔ عیدو نے اوپر سے نیچے تک بھانپا، دائیں سے بائیں تک پرتا اور وہ خاتون کے جوڑ جوڑ، بند بند کا آشنا تھا، پانچ سالہ محرم راز اور تین سالہ رفیق حیات..... اندر سے باہر تک دیکھ کر اندازہ کیا کہ خاتون بندتوری کی طرح پھول رہی ہے۔

اینڈتی اکڑتی، لال لال بیر بہوٹی جیسے پھل سے لدی ہوئی..... گلابی رخساروں پر برستا کی شفق پھوٹ پڑی ہے اور پنکھڑی سے ہونٹوں پر یاقوت کی چھوٹیں تڑپ رہی ہیں، اور سراپے میں بجلی سی لہرالہرا جاتی ہے، بشرہ کا ہرنی جیسا مخصوص انتشار اطمینان اور سکون سے بڑھ کر بانکپن اور استغنا تک پہنچ رہا ہے جیسے ابھی ابھی نیند سو کر دو چار انگڑائیاں لے کر آ کھڑی ہو۔

عیدو نے کچھ عجیب سی نگاہ ڈالی، اور خاتون نے آنکھوں ہی آنکھوں میں الھڑ پن سے جواب دیا مگر جیسے اس کا جواب الٹا ہو کر اس کے منہ پر پڑا..... اور عیدو نے نہ معلوم کیا سوچ کر بال کی نوک سے لے کر پاؤں کی انگلی تک نشیب وفراز کا جائزہ لیا اور اپاہج نظریں والوں کے گھونگھر سے نکل کر چمکتی پیشانی سے پھسلتی رخساروں اور ہونٹوں کے پیچ وخم میں ناچتی آہستہ آہستہ صراحی دار گردن سے گھوم کر اترتی اور سینے کی گولائیوں اور بازوؤں کے اتار چڑھاؤ میں چکرا گئیں اور وہاں سے قلابازی کھا کر کمر کے کولہوں کے گداز میں پھنستی لڑکھڑاتی رہیں اور پھر! بھٹک بھٹکا کر جب پیٹ کے ''پرمعنی'' ڈھلاؤ پر پہنچیں تو جم کر رہ گئیں بہتیری پھسلائیں ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ اور عیدو نے دیکھا کہ خاتون انگیٹھی سی دہک رہی ہے۔ انگارے ہی انگارے بھرے اور جیسے جوہڑ کے گدلے پانی کو شفق کا عکس چمکا دیتا ہے اور عیدو کی علیل آنکھوں کے دھندلے آئینے پر خاتون کی تمام سرخیاں مچل پڑیں..... اور اس وقت تو وہ عیدو کے لیے دودھ ملائی لے کر آئی تھی۔ تمام دن لڑائی کی بھینٹ چڑھا تھا، نہ دوپہر چولہا گرم ہوا تھا، نہ اب..... گھر بھر میں کسی کے منہ پر اڑ کر کھیل نہ گئی تھی۔ صبح کا ایک کٹورا دودھ پئے عیدو تمام دن یوں ہی پڑا تھا..... شام کا دودھ دوہ کر شبراتی خاموشی کے ساتھ رکھ کر باہر چلا گیا تھا۔ اور وہ تو اٹوائی کھٹوائی لیے اندر پڑی تھی۔ خاتون نے چپکے سے دودھ گرم کیا۔ جلدی جلدی دو روٹیاں پکائیں اور کھانڈ ملا کر ملیدا کیا اور دودھ میں ڈال کر لے آئی..... کٹورا برابر تپائی پر رکھا، اور معمول کے مطابق اُٹھنے کو سہارا دینے کے لیے عیدو پر جھکی، ار ایک ہاتھ گردن کے پیچھے دوسرا کمر کے نیچے ڈال کر حسب معمول سہارا دیا، اور سہارا دیتے وقت دونوں کے چہروں میں تین چار انچ کا فاصلہ رہ جایا کرتا تھا اور آنکھ ایک دوسرے سے بھڑ سی جایا کرتی تھی، اور عیدو کی آنکھوں میں تو شعلے سے لپک اٹھے۔ نتھنے پھول گئے، کنپٹیاں پھڑک گئیں اور بیمار، مفلوج، اپاہج بستر مرگ کی ارزل ترین سطح سے اُچک کر زندگی کی ان ہیبت ناک بلندیوں تک جا پہنچا جہاں ملک الموت کے بھی پَر جلتے ہیں، عیدو کے اندر کا مرد پھٹا، ٹائم بم کی طرح تند اور تلوار کی طرح تیز تین سال کی معذوریوں اور مصلحتوں اور سمجھوتوں کا تھپکا مرد! اور بیٹھ کر سیدھے ہوتے ہوتے غوں، غاؤں، غپ!! خاتون کا سر عیدو کے ہاتھوں کے شکنجے میں تھا اور پتلی کھڑی ناک جبڑوں میں! اور جیسے عیدو کے جبڑوں میں نو نہاروں کا زور سمٹ آیا تھا، اور خاتون کے ہونٹوں پر اس کی تھوڑی کی ڈاٹ لگ گئی تھی، بے چاری کی چیخ بھی منہ سے باہر نہ نکل سکی اور جب کچ کچ گاجر کی طرح چبا کر پوری ناک نگل گیا تو خاتون کا چہرہ گرفت سے اپنے آپ آزاد ہو گیا۔

OOO

احمد علی

ہماری گلی

میرا مکان پنڈت کے کوچہ میں تھا۔ میرے کمرے کے دروازے میں دو پٹ تھے۔ نیچے کا حصہ بند کردینے سے صرف اوپر کا حصہ ایک کھڑکی کی طرح کھلا رہ جاتا تھا۔ یہ کھڑکی پتلی سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے مرزا دودھ والے کی دکان تھی اور میرے دروازے کے برابر صدیق بنئے کی اور اس کے برابر عزیز خرادی کی اور آس پاس کمہاروں کی دکانیں، عطار کی دکان، پان والے کی اور دو چار اور دکانیں تھیں۔ مثلاً قصائی کی، بساطی کی، حلوائی کی دکان۔

ہمارے محلّے سے ہوکر لوگ دوسرے محلوں میں جاسکتے تھے۔ اس لیے سڑک برابر چلا کرتی تھی۔ اور اس طرح کے لوگ راستہ بچانے کے لئے میری کھڑکی کے سامنے سے گذرتے کبھی کوئی سفید پوش گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں چھتری لگائے ہوئے چلا جاتا۔ کبھی شام کو کوئی ولایتی منڈا اپنے انگریزی ٹوپی لگائے چھڑکاؤ کے پانی سے بچتا ہوا۔ اپنے کپڑوں کو چھینٹوں سے بچاتا، بچوں اور لڑکوں سے کتراتا ہوا اور ان کے گھورنے پر غراتا اور آنکھیں نکالتا ہوا گزر جاتا۔ کبھی کبھی کوئی راہگیر عاجز آکر لڑکوں کو مارنے کے لئے لکڑی یا چھڑی اٹھاتا اور بھاگ کر لڑکے چلاتے "لولو ہے بے، لولو ہے"۔ پھر مرزا دودھ والے کی بھرّائی ہوئی آواز سنائی دیتی۔

"ابے لمنڈو! کیا کرتے ہو؟ تم کو گھروں میں کچھ کام نہیں؟ اور اگر کوئی پاس بیٹھا ہوتا تو مرزا اس سے کہنے لگتا۔ "ان کی ماؤں کو تو دیکھو۔ لونڈوں کو چھوڑ رکھا ہے کہ سانڈ بیلوں کی طرح گلیوں میں رولا مچایا کریں۔ حرامزادوں کو گالی گلوچ اور دھینگا مشتی کے علاوہ اور کچھ کام ہی نہیں۔"

اور مرزا کی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں چمکنے لگتیں اور اپنی سفید تکونی داڑھی پر ایک ہاتھ پھیرتا اور کسی خریدار کی طرف مخاطب ہوجاتا اور کونڈے میں سے دہی یا کڑھاؤ میں سے دودھ نکال کر ملائی کا ٹکڑا اڈالتا اور خریدار کی طرف بڑھا دیتا۔

لوگ کہتے تھے کہ مرزا کی رگوں میں شریف خون دورہ کرتا ہے، لڑکپن میں سبق یاد نہ کرنے پر اس کے باپ نے اس کو گھر سے نکال دیا اور کچھ روز مارے مارے پھرنے کے بعد اس نے دکان کرلی۔ اس کے بعد اکثر اس کے باپ نے اس سے معافی بھی مانگی اور خوشامد بھی کی لیکن مرزا نے شادی کرلی اور اس کا کام چل نکلا۔ اس کی دوکان کے چھوٹے چھوٹے ملائی کے پیڑے شہر بھر میں مشہور تھے اور اس کا دودھ بہت لذیذ ہوتا تھا۔ رات کو کوئی دودھ لینے آتا تو وہ اس کو آب خورے اور لٹیا میں خوب اچھالتا یہاں تک کہ اس میں سے جھاگ نکلنے لگتا۔ چمچے سے ملائی کا ٹکڑا اس صفائی سے توڑتا کہ دودھ ہلنے تک نہ پاتا تھا۔ اکثر اس کی بیوی دکان پر بیٹھتی تھی۔ وہ بوڑھی ہوگئی تھی..... اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی کمر جھک گئی تھی اور منہ میں ایک دانت باقی نہ تھا۔ اس کی اونچی پیشانی اور اس کے گورے رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی اچھے گھرانے کی عورت ہے۔

لیکن اب ان کا کاروبار کم ہوگیا تھا کیونکہ ضعیفی کی وجہ سے وہ زیادہ محنت نہ کرسکتے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا مرچکا تھا اور اب ان کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ تھا۔ ترک موالات کے زمانے میں جب آزادی کا خیال ملک میں ادھر سے ادھر تک ہل چل مچائے تھا، مرزا کا لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ جلوس میں شریک ہوا۔ گاندھی جی کی جے اور بندے ماترم کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ گھنٹہ گھر پر گوروں کی فوجیں مسلح کھڑی تھیں، کپتان پولیس، ڈپٹی کمشنر اور چند اور انگریز کھڑے تھے اور لوگوں کے ہجوم اور قومی غصہ کو پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ لوگ آگے جانا چاہتے تھے لیکن فوجیں ان کو آگے جانے سے روک رہی تھیں۔ لوگوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور ڈپٹی کمشنر نے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں بہت سے لوگ کام آئے اور مرزا کا بیٹا بھی مرنے والوں میں تھا۔ بڑی دیر کے بعد جب لاش لے جانے کی اجازت ملی تو لوگ مرزا کے لڑکے کی لاش کو اس کے گھر لائے۔

ساری دکانیں بند تھیں اور محلّہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جاڑوں کی دھوپ مردہ اور سرد معلوم ہوتی تھی۔ نالیوں میں صفائی نہ

ہوئی تھی اوران میں سڑاند پھوٹ رہی تھی۔ جب لاش گھر میں آئی تو مرزا اور اس کی بیوی سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ ان کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ ان کا بیٹا جو ابھی زندہ تھا، ہنس بول رہا تھا، جس نے صبح ہی پیڑے تیار کئے تھے، کڑھاؤ مانجھا تھا۔ جو کپڑے بدل کر اپنے کسی دوست سے ملنے گیا تھا اب زندہ نہیں ہے بلکہ مر چکا ہے۔ وہ بار بار خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو دیکھتے تھے اور مرزا کی بیوی لاش سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ لوگوں نے اس کو الگ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک منٹ کے لیے لاش سے علیحدہ نہ ہوتی تھی۔ وہ "ہے ہے میرا لال" کہہ کہہ کر روتی تھی اور کبھی کبھی اس کے منہ سے چیخ نکلتی اور وہ چلاتی:

ان فرنگیوں کو خدا غارت کرے۔ میرے لال کو مجھ سے چھین لیا۔ خدا کرے کہ یہ غارت ہوں۔"

مرزا پاگلوں کی طرح کبھی گھر کے اندر کبھی باہر بولایا ہوا پھرتا۔ صدیق بنئے نے اپنی دکان کھولی تھی اور مرزا جو بال بکھیرے ہوئے ادھر سے گذرا تو کسی نے آواز دی اور پوچھا۔ "بھائی بڑا افسوس ہوا حادثہ کیا پیش آیا؟"

مرزا کی آنکھوں میں ایک آنسو باقی نہ تھا لیکن اس کے سارے چہرے پر کرب کی حالت تھی۔

"تقدیر پھوٹ گئی۔ میرا پلا پلایا لڑکا جاتا رہا۔" یہ کہہ کر مرزا گھر کی طرف چلا گیا۔

گاہک جو کھڑے ہوئے تھے پوچھنے لگے کیا ہوا۔ صدیق نے جھک کر دیکھا۔ اسی وقت ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سڑک پر گرد و غبار اڑنے لگا۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا ہوا میں اٹھا اور کچھ دور اوپر جا کر الٹتا پلٹتا نیچے کی طرف گرنے لگا۔ مرزا کے بکھرے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ گلی میں غائب ہوگیا۔

"ہوا کیا۔ ترک موالات کرنے گیا تھا، گولی لگی اور مر گیا۔ نہ جانے اپنے کام میں دل کیوں نہیں لگاتے۔ سرکار کے خلاف جانے کا یہی نتیجہ ہے۔ کڑا جوان تھا۔ ان دوزخ کے چیونٹوں اور کھدر پوشوں کا شکار ہوگیا"۔

یہ کہتے کہتے صدیق نے ایک مٹکے میں کفگیر ڈالا۔ بہت سے مٹکے دیوار میں گڑے ہوئے تھے اور گاہک کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ کفگیر میں دال نکال کر صدیق نے گاہک کی طرف بڑھائی۔ گاہک جو بے غوری سے صدیق کی باتیں سن رہا تھا۔ دال کو اپنے کپڑے میں باندھنے لگا۔ یکا یک اس کی نگاہ دال پر پڑی اور بولا۔ "وامیاں باشا! یہ کون سی دال دے رہے ہو میں نے تو ارہر کی مانگی تھی۔ ذری پھرتی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ بیوی بکے گی۔"

گھر میں مرزا کی بیوی اپنا سر دے دے مار رہی تھی اور بین کر کے روتی تھی اور انگریزوں اور گاندھی کو کوستی تھی۔ یامین کی ماں کو جب اس حادثے کی خبر ملی تو وہ پرسے کے لیے آئی۔ اس کا جوان لڑکا بھی دیوار کے نیچے دب کر مر گیا تھا اور وہ اس کے ننھے بچوں کو سلائی کر کے پالتی تھی۔ دونوں گلے مل کر خوب روئیں اور مرزا کی بیوی کو ذرا تسلی ہوئی...... آخر کار لڑکے کو دفن کرنے لے گئے۔ رات اندھیری تھی اور بے بسی تاریکی کی طرح سارے محلّہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا سرد تھی۔ اور محلّہ میں سیل کی وجہ سے جاڑا زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ لیمپوں کی دھیمی روشنی میں محلّہ بھیانک اور ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا اور سڑک پر کوئی جاندار چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ صرف مرزا کی دکان کے اندر کئی بلیوں کے غرانے اور کھڑ بڑ کی آواز آ رہی تھی۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد تک اکثر مرزا کی بیوی کے گانے کی آواز آیا کرتی تھی:

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ، نہیں میرے دل کو قرار ہے

لیکن پھر وہ خاموش رہنے لگی اور کام کاج میں مشغول رہتی۔

میرے مکان کی ڈیوڑھی میں ایک پرانا کھجور کا درخت تھا۔ ایک زمانے میں اس میں پھل لگا کرتے تھے اور شہد کی مکھیاں غذا کی تلاش میں نیچے اتر آتی تھیں۔ اس کی بڑی ڈالیوں پر اکثر جانور آ کر بیٹھتے اور بھولے بھٹکے کبوتر راتوں کو بسیرا کر لیا کرتے تھے لیکن اب اس کے پتے جھڑ گئے تھے، ڈالیاں گر چکی تھی اور اس کا تنا سیاہ اور بدہیئت رات کی تاریکی میں اس بانس کی طرح کھڑا رہتا جو کھیتوں میں جانوروں کو ڈرانے کے لیے گاڑ دیا جاتا ہے۔ اب نہ اس میں جانور منڈلاتے تھے، نہ شہد کی مکھیاں اس طرف آتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کوا اس کے ٹھنٹھ پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتا اور اپنا گلا پھاڑتا یا کوئی چیل اس پر ذرا دیر کو چلچلاتی اور پھر اڑ جاتی۔ صبح کو بڑھتی ہوئی روشنی میں تنا آسمان پر چمک اٹھتا تھا لیکن شام کو فضا کی بڑھتی تاریکی میں آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل

ہو جاتا اور رات میں مل جاتا۔ رات کو اکثر گھر داخل ہوتے وقت میری نگاہ اس موٹے اور بھیانک تنے پر پڑتی پھر اس کے ساتھ ساتھ اٹھتی آسمان پر جاتی۔ تارے چمکتے ہوتے تھے اور ٹھیک اس کے سرے پر بنات النعش کا آخری ستارہ مجھ کو دکھائی دیتا تھا لیکن وہ تنا میری نگاہ اور آسمان کے درمیان حائل ہو جاتا اور میں تاروں کے پھیلاؤ کو نہ دیکھ سکتا۔

محلہ میں اکثر ایک پاگل عورت آیا کرتی تھی۔ کسی نے اس کے بال کاٹ دیئے تھے اور اس کا سر اس کے توانا اور بھاری جسم پر ایک اخروٹ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ خدا ترس لوگ کبھی کبھی اسے کپڑے پہنا دیا کرتے تھے لیکن چند گھنٹوں کے بعد وہ پھر ننگی ہو جاتی تھی۔ یا تو کوئی کپڑوں کو اتار لیتا یا وہ خود ان کو پھاڑ کر پھینک دیتی تھی۔ اس کے منہ پر ہمیشہ رال بہا کرتی اور اس کے ہاتھ ہمیشہ اکڑے ہوئے رہتے۔ وہ ہمیشہ مٹک مٹک کر سڑک پر ناچتی اور تھرکتی اور گونگوں کی طرح گن گن کرتی جیسے ہی وہ محلہ میں داخل ہوتی تو لڑکوں کا ایک غول اس کے پیچھے پیچھے تالیاں بجاتا اور ''ننگی'' کہہ کہہ کر پتھر پھینکتا اور منہ چڑاتا۔ عورت ''ایں ایں'' کرتی اور کونوں میں چھپتی۔ جب کبھی مرزا کی دکان کے سامنے یہ واقعہ ہوتا تو مرزا لڑکوں پر چیختا ''ابے سسرو تمہیں مرنا نہیں ہے! بھاگو یہاں سے دور ہو''۔

لیکن ذرا دیر کے بعد لڑکے پھر جمع ہو جاتے۔

اکثر بڑے آدمی بھی اس سے مذاق کرتے۔ وہ بدصورت ضرور تھی لیکن اس کی عمر زیادہ نہ تھی۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اکثر منو جو کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا، لیکن اب بدمعاشوں میں مل گیا تھا، اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہتا ''کیوں، تیرے بچہ کب ہوگا؟''

اور ننگی ایک درد انگیز وحشیانہ آواز نکالتی اور اپنے ہاتھ آگے بڑھا کے جو ڈھیلے اور لجلجے رہتے کسی راہ گیر یا دکاندار سے مخاطب ہو کر منو کی طرف اشارہ کرتی۔ اس کی کریہہ آواز میں ایک منت ہوتی۔ ایک بےکس و بےبس شخص کی وہ التجا جو اپنے حاکم یا اپنے سے زیادہ طاقتور انسان سے کرتا ہے کہ مجھے بخش دو اور بچا لو۔ مگر اور لوگ بھی مذاق کرنے میں شریک ہو جاتے اور زور زور سے قہقہہ لگاتے........

ہندوستان میں ہزار ہا لوگ ایسے ہیں جن کو سوائے کھانے پینے اور مر جانے کے کسی بات کا احساس نہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں، بڑھتے ہیں، کمانے لگتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں دنیا کی کسی بات سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسانیت کی بو ان میں نہیں ہوتی۔ زندگی کی عظمت کا ان کو کوئی احساس نہیں جیسے غلام کوئی کام کرنے اور مر رہنے کے علاوہ کوئی دوسری حقیقت ہی نہیں جانتے۔ زندگی کا طلوع اور موت کا غروب ان کے لیے دونوں یکساں ہیں۔ ان کے لیے دن کام کرنے اور راتیں سونے کو بنی ہیں۔ بس یہی ان کی زندگی کی حقیقت ہے۔ اور صرف موت ان کو زندگی سے نجات دلا سکتی ہے۔

ایک اور چیز جو ہمارے محلے میں کثرت سے دکھائی دیتی تھی، وہ کتے تھے، مرے ہوئے اور فاقہ زدہ۔ اکثر کو کھجلی تھی اور ان کی کھال میں سے گوشت نظر آتا تھا۔ اپنے بڑے بڑے دانتوں کو نکوس کر وہ اپنے پٹھے کھجاتے تھے یا قصائی کی دکان کے سامنے ایک ہڈی کے پیچھے ایک دوسرے کو نوچتے اور لہولہان کر دیتے۔ وہ اپنی دمیں ٹانگوں کے بیچ میں دبائے نالیوں میں سونگھتے دبے دبے آتے تھے اور قصائی کی دکان کے سامنے چھیچھڑوں پر جھپٹتے لیکن اکثر جیسے ہی ان کو کوئی گوشت کا ٹکڑا یا ہڈی دکھائی دیتی تو چیلیں اوپر سے جھپٹا مارتیں اور ان کے سامنے سے گوشت کو اٹھا لے جاتیں۔ پھر وہ ایک ایسے آدمی کی طرح جو خفیف ہو گیا ہو اپنی دم دبائے ہوئے سڑک کو سونگھا کرتے یا اپنی جھینپ آپس میں لڑائی کر کے اور ایک دوسرے کا خون بہا کر مٹاتے۔

صبح کو بہت سویرے شیرا چنے بیچنے والے کی آواز آتی۔ وہ اپنی جھولی میں گرم گرم تازہ بھنے ہوئے موٹے چنے گلی گلی اور کوچہ کوچہ بیچتا پھرتا تھا۔ اس کی عمر کوئی چالیس سال کے قریب تھی لیکن وہ دبلا اور سوکھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں ابھی سے نمایاں ہو گئی تھیں اور اس کی خشخشی داڑھی میں سفید بال آ گئے تھے۔ اس کی آنکھیں ایک بیمار آنکھوں کی طرح تھیں جن کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے اور جن میں بھوک اور غربت اور مصیبت صاف جھلکتے تھے۔ ان کے ڈھیلوں میں باریک باریک سرخ رگیں دور سے دکھائی دیتی تھیں جیسے یا تو نشے میں یا کئی دنوں کے فاقے اور بخار کے بعد پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے سر پر ایک

کپڑے کی میلی ٹوپی رکھی تھی۔ گلے میں پھٹی ہوئی قمیض اور اس کی اُنگی دھوتی میں سے پتلی پتلی ٹانگیں دکھائی دیتی تھیں۔
عرصہ ہوا وہ ہمارے شہر میں کسی نزدیک کے ضلع سے کام کی تلاش میں آ گیا تھا۔ وہ رات کو ایک مسجد میں پڑا رہتا اور دن بھر شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا لیکن شہر والوں کی حالت روزگار کے معاملہ میں گاؤں اور قصبوں سے کسی طرح بہتر نہیں اور شیرا کو کوئی کام نہ ملا مسجد میں میر امان اللہ نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ شیرا نے ان کو اپنا قصہ سنایا۔ میر صاحب کو اس کی حالت پر ترس آیا اور وہ اسے اپنے گھر لے گئے۔ شیرا نیک اور دیانت دار آدمی تھا۔ کچھ عرصہ بعد میر صاحب نے اسے پانچ روپے دیئے اور کہا۔
''ان سے کوئی کام شروع کر دینا اس لیے میں یہ روپے دیتا ہوں۔ جب تمہارے پاس پیسے ہوں تو یہ رقم واپس کر دینا ورنہ کوئی فکر کی بات نہیں''۔
شیرا نے دال اور کابلی چنوں کا خوانچہ لگایا۔ کچھ عرصے میں شیرا کو بہت سے محلّہ والے جان گئے اور اس کا سودا خوب بکنے لگا۔ سال بھر کے اندر ہی اس نے میر صاحب کے روپے واپس کر دیئے۔ اپنے بیوی بچوں کو بلایا اور ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگا اور بہت خوش تھا۔
اسی دوران میں عبد الرشید کو سوامی شردھانند کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا کا حکم ہو گیا۔ سارے شہر کے مسلمانوں میں ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ پھانسی والے روز جیل کے باہر ہزار ہا آدمیوں کا ہجوم تھا۔ وہ سب دروازہ توڑ کر اندر گھس جانا چاہتے تھے لیکن جب پولیس نے عبد الرشید کی لاش کو دینے سے انکار کر دیا تو لوگوں کے جوش اور غصے کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا...... کہ کس طرح جیل کو مسمار کر دیں اور اس مردِ غازی کی لاش کو ایک شہید کی طرح دفن کریں۔
اس دن شیرا کسی کام سے جامع مسجد کی طرف گیا ہوا تھا۔ آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا اور سڑکیں ایک شہرِ خموشاں کی طرح اجاڑ اور سنسان معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کو کئی ایک بھوکے کتے پڑے ہوئے دونے چاٹتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ایک نالی میں ایک مرا ہوا کبوتر پڑا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف کو مڑ گئی تھی۔ اس کی ٹانگیں سخت اور نیلی اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے پر پانی میں بھیگ گئے تھے اور اس کی ایک آنکھ کریہہ معلوم ہو رہی تھی۔ شیرا کھڑا ہو کر اس کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں سامنے سڑک کے موڑ سے کلمہ کی آواز زور زور سے آنے لگی۔ لوگ ایک جنازہ لیے چلے آ رہے تھے۔ جوں جوں جنازہ شیرا کی طرف آتا گیا پیچھے بھیڑ اور زیادہ نظر آتی گئی۔ یہاں تک کہ دور دور تک آدمیوں کے علاوہ کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ خلقت عبد الرشید کے جنازے کو کسی طرح لے بھاگی تھی۔ شیرا بھی جنازے کی طرف بڑھا اور کندھا دینے میں شریک ہو گیا۔ اتنے میں سامنے سے پولیس نمودار ہوئی اور انہوں نے جنازہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور کئی ایک آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں میں شیرا بھی تھا اور اس کو اس بلوے میں شرکت کرنے کی بدولت دو سال کی سزا ہو گئی۔
اب وہ قید بھگت چکا تھا لیکن اس کے گاہک اس کی آواز سے ناآشنا ہو چکے تھے اور اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ دوبارہ خوانچہ لگا سکے۔ کچھ لوگوں نے چندہ کر کے اسے دو روپے دے دیئے اور ان سے شیرا نے پھر کام شروع کیا اور اب چنے بیچتا پھرتا تھا لیکن اب اس کی آواز میں پچھلا کرارا پن باقی نہ رہا تھا اور مصیبت اور تکلیف اس کی ہر پکار میں سنائی دیتی تھی۔ تاہم بچے اس کی آواز سن کر چنے لینے کو دوڑتے تھے اور وہ مٹھی سے نکال کر چنے تولتا اور ان کو دیتا تھا۔
ایک اور شخص جو ہمارے محلے میں ہر روز رات کو آیا کرتا تھا وہ ایک اندھا فقیر تھا بہت چھوٹا تھا اور اس کی چگی داڑھی پر ہمیشہ خاک پڑی رہتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا بانس کا ڈنڈا رہتا تھا جسے ٹیک ٹیک کر وہ آگے بڑھتا تھا۔ وہ بالکل حقیر اور ناچیز معلوم ہوتا تھا جیسے کوڑے کے ڈھیر پر مکھیوں کا غول یا کسی مری ہوئی بلی کا ڈھنچر لیکن اس کی آواز میں وہ مایوسی اور درد تھا جو دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچ دیتا تھا۔ جاڑوں میں اس کی آواز جیسے سارے محلّہ میں بے بسی پھیلاتی ہوئی کہیں دور سے آتی۔ میں نے آج تک اس سے زیادہ اثر رکھنے والی آواز نہیں سنی، اور ابھی تک وہ میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ بہادر شاہ کی غزل اس کے منہ سے پھر پرانے زمانے کی یاد تازہ کر دیتی تھی۔ جب ہندوستان اپنی نئی بندشوں میں نہیں جکڑا گیا تھا۔ اس کی آواز سے صرف بہادر شاہ کے رنج کا ہی اندازہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ہندوستان کی غلامی کا نوحہ سننے میں آتا تھا۔ دور سے اس کی آواز آتی تھی۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے وہ میں ایک مشت غبار ہوں

لیکن محلہ کے شرفا اس کو پیسے دینے سے گھبراتے تھے کیوں کہ وہ چرس پیتا تھا۔

ایک روز رات کو میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ گرمیوں کی رات تھی اور کوئی دس بجے کا وقت۔ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں لیکن کوابی اور مرزا کی دکانیں ابھی تک کھلی ہوئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ تو سو گئے تھے۔ اور کچھ ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔ ہوا میں خشکی اور گرمی تھی اور نالیوں میں سے سڑاند پھوٹ رہی تھی۔ مرزا کی دکان کے تختے کے نیچے ایک سیاہ بلی گھات لگائے بیٹھی تھی جیسے کسی شکار کی فکر میں بیٹھی ہو۔ ایک شخص نے ایک آنہ کا دودھ لے کر پیا اور آبخورے کو زمین پر ڈال دیا۔ بلی دبے پاؤں تختے سے نیچے نکلی اور آبخورے کو چاٹنے لگی۔ اسی وقت میری کھڑکی کے سامنے سے کلو گذری۔ اس کا رنگ سیاہ تھا لیکن شباب نے اس کی چہرے پر ایک رونق اور خوبصورتی پیدا کر دی تھی۔ اس کی چال میں ایک بے باکی اور الھڑ پن تھا اور جسم زندگی کے ابھار سے توانا اور سبک تھا۔ وہ منصف صاحب کے یہاں ملازم تھی جن کی بیوی نے اس کو چھٹپن سے ہی پالا تھا۔ اب وہ بیوہ ہو گئی تھی اور اسے بیوہ ہوئے بھی تین سال گذر گئے تھے لیکن محلہ کے نوجوانوں کی نگاہیں اس کی طرف گڑی رہتی تھیں۔

جب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچی تو منو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کلو جھنجھلا کر بولی:

''مواشٹنڈا کہیں کا، تجھ پر خدا کی مار۔ ایک عورت کو اکیلا دیکھ کر ہاتھ ڈالتا ہے''۔

منو بولا

''تیری جوانی پھر کس کام آئے گی؟''

''ہٹ دور ہو، موئے میرا ہاتھ چھوڑ۔''

برابر ایک مکان کی چھت پر دو بلیوں کے لڑنے کی آواز آئی۔ اسی وقت کلو نے زور سے جھٹکا دیا اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''جھاڑو پیٹے، جوانا مرگ سمجھتا ہے مجھ میں دم نہیں۔ اتنا پٹیواؤں گی کہ عمر بھر یاد کرے گا۔''

مرزا جو ایک خریدار کو دودھ دینے کے بعد ذرا دیر کے لیے گھر چلا گیا تھا اسی وقت واپس آیا اور کلو کا آخری جملہ اسے سنائی دیا اور وہ بولا:

''کیا بات ہے کلو! کیا ہوا؟''

لیکن کلو پیچھے مڑے تیزی سے مڑے بغیر گلی کے اندر داخل ہو گئی۔ عزیز خیراتی جو اپنی دکان کے سامنے سو رہا تھا، شور سے اٹھ گیا۔ منو کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''ابے منو! کیا بات ہے؟''

منو مایوسی اور غصہ سے بھرا کھڑا تھا۔ اس کا منہ خشک ہو کر ستا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک سانپ کی آنکھوں کی طرح زہریلی اور تیز ہو گئی تھیں۔ کوڑے کے ڈھیر پر ایک بلی کی آنکھیں ذرا دیر چمکتی ہوئی دکھائی دیں لیکن پھر غائب ہو گئیں۔ منو نے ذرا دیر چھپی ہوئی ناامیدی کی آواز میں جواب دیا۔

''کچھ نہیں یار، کلو تھی۔''

''نہیں میاں ہتھے نہیں چڑھی۔ ہاتھ جھٹک کے بھاگ گئی۔ لیکن سی جائے گی کہاں؟''

اور بلیاں ابھی تک لڑ رہی تھیں۔ وہ ایک بھیانک طریقے سے غرانے کے بعد زور زور سے چیختی تھیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسری کو کھا جائیں گی۔ پھر میاؤں میاؤں کر کے ایک بھاگ نکلی اور بلا غراتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

عزیز خیراتی نے منو کو اپنے پلنگ پر بٹھا لیا اور سرہانے سے بیڑی نکال کر اس کی طرف بڑھائی لیکن منو نے اپنی قمیض کی جیب میں سے ایک چاندی کا سگریٹ کیس نکالا اور عزیز سے کہا۔

''لومیاں تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں تمہیں ایک بڑا بڑھیا سگریٹ پلاتا ہوں۔''
اور ایک سگریٹ نکال کر عزیز کو دیا۔
''ارے یار میں نے کہا اب کے کس کا مار لایا؟''
''میاں یاروں کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جس کو نہ دے مولا، اس کو دے آصف الدولہ۔ اگر اللہ میاں کے بھروسے پر رہتے تو کام چل لیا ہوتا۔''
''میاں ہوش کی لوگ، دس سے ڈرو، دوزخ میں جلو گے، توبہ کرو۔''
''جا یار یہ بھی کیا گدھوں کی باتیں کرتا ہے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کھاؤ پیو اور مزے کرو۔ اس سے زیادہ استاد نے سکھایا ہی نہیں۔ میں تو مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور پڑے پڑے اینڈتا ہوں۔ کہاں کی دوزخ لگائی۔ اگر ہوئی بھی تو بھگت لیں گے۔ اب کہاں کا روگ پالا۔''
''بس یار بس۔ کیوں خراب باتیں منہ سے نکال رہا ہے۔ سب آگے آگے جاتا ہے۔ ساری اکڑ دھری رہ جائے گی۔''
''اچھا یار تو تو اس طرح باتیں کرنے لگا، میں اب چل دیا۔''
ذری سن تو یار۔ ایک بات مجھے دنوں سے حریان کرائی ہے۔ قسم کھا بتادے گا؟''
''اچھا جا کیا یاد رکھے گا۔ اللہ قسم بتادوں گا۔''
''یہ بتا تو آخر چوری کیوں کرتا ہے؟''
''بھئی اس کی نہیں بدی تھی''
دیکھ قول دے چکا ہے۔''
''اچھا جا تو جیتا میں ہارا۔ جو سچ پوچھو تو یار یہ ہے کہ میں کبھی چوری نہ کرتا۔ تو جانتا ہے میرے رشتہ دار کافی امیر لوگ ہیں۔''
''جد ہی تو میں اور بھی حریان ہو رہا ہوں۔''
''میرا ایک بھائی لگتا تھا۔ لونڈا نمکین تھا۔ یہ کوئی دس برس کی بات ہے۔ تو میری کچھ اس سے چل گئی تھی۔ ہم دونوں مدرسے میں ساتھ پڑھتے تھے۔ اس نے ماسٹر سے میرے شکایت کر دی اور جتیں لگوائیں۔ میرے اوپر بھوت سوار ہوگیا۔ میں نے کہا سالے بدلہ نہ لیا ہو تو پیشاب سے مونچھیں منڈا دوں گا۔ ایک موقع پر کہ میں نے سالے کا بستہ چرا لیا۔ اس کے اندر بڑی بڑھیا بڑھیا چیزیں تھیں۔ اس سے شروعات ہوئی۔ پھر ایک مرتبہ مجھے ایک ماموں کا سگریٹ کیس پسند آ گیا۔ میں ان سے مانگ تو نہ سکتا تھا لیکن میں نے پار کر دیا۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ ان حرامزادوں کے پاس روپے بھی ہیں اور اچھی اچھی چیزیں بھی۔ کیوں نہ اڑا لیا کروں اور پھر تو میرا ہاتھ خوب صاف ہوگیا۔ یار سچ پوچھو تو یہ لوگ کبھی غریب کو مر کر بھی کوئی چیز نہ دیں۔ ان سے تو بس اسی طرح چیزیں وصول ہو سکتی ہیں۔''
''پھر تو نے وہی فضول باتیں شروع کر دیں۔ اچھا اب میں چلا نہیں تو گھر میں تو تو میں میں ہوگی۔'' یہ کہہ کے وہ اٹھا اور عزیز کی کمر پر زور سے تھپڑ مار کر روانہ ہوگیا......

ہمارے محلہ کی مسجد میں نثار احمد اذان دیا کرتے تھے۔ یہ قوی ہیکل اور مضبوط تھے۔ ان کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور ان کی داڑھی مہندی سے سرخ رہتی تھی۔ ان کا سر تا منڈا تھا لیکن پہلوؤں میں اور گدی پر ان کے پٹھے بال پڑے رہتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ٹھیک بیچ میں ایک بڑا سا گٹا پڑ گیا تھا جس کا رنگ راکھ کا سا تھا اور الگ دور سے چمکتا تھا۔ اکثر وہ میری کھڑکی کے سامنے سے کھنکھارتے ہوئے گذرتے تھے۔ وہ گاڑھے کا ڈھیلی موریوں کا پائجامہ اور گاڑھے کا کرتا پہنے رہتے تھے اور ان کے کندھے پر ایک بڑا سا سرخ رنگ کا چھپا ہوا رومال پڑا رہتا تھا۔ ان کی آواز میں ایک ایسا کرارا پن گرمی کے ساتھ ساتھ وہ نرمی تھی جو انسان کو کم عطا ہوتی ہے۔ ان کی اذان دور دور مشہور تھی اور ان کی آواز بہت دور سے سنائی دیتی تھی۔ شروع شروع میں ان کی آواز سے اس پکار کی شان ٹپکتی تھی جو مسلمانوں کو نماز کے لیے بلاتی ہے۔ پھر اختتام کے قریب آواز کی جھنکار میں کمی ہوتی اور ان کے جملے بل

...میں اذان سنتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اختتام کے قریب آ گئی حی علی الصلوٰۃ کی خاموشی پیدا کرنے والی آواز کانوں
میں گونجنے لگی۔ پھر حی علی الفلاح، حی علی الفلاح کی آواز سناٹا چھاتی ہوئی، دنیا کی بے ثباتی کا یقین دلاتی باریک لمبی تان کے
...کے چہرے گرد اور دھواں اور غبار۔ اپنے موہوم
دھیمے سروں میں ہوتی اس آہستگی اور دل وابستگی سے ختم ہوئی کہ یہ نہ معلوم ہوتا کہ آواز رک گئی ہے یا ساری دنیا پر خاموشی طاری
ہے، ایک گہری خاموشی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا سے پرے بہت دور ایک اور دنیا ہے جس میں ازل اور ابد دونوں ایک ہیں
اور یہ دنیا ہیچ اور موہوم ہے۔ آواز اس طرح فضا میں کھو گئی جس طرح افق پر زمین ختم ہوتی ہے اور آسمان شروع ہو جاتا ہے اور تمیز
نہیں ہو سکتی کہ زمین ختم بھی ہو گئی یا ہر جگہ آسمان ہی آسمان ہے۔ اسی طرح آواز اس آہستگی سے رک گئی کہ آواز اور خاموشی میں
امتیاز ہو سکتا تھا۔ آواز کانوں میں گونج رہی تھی لیکن یہی شبہ ہوتا تھا کہ صرف خاموشی کانوں میں ہیجان بپا کیے ہوئے ہے۔

اور میں سوچتا ہوں کہ یہ اذان ہماری زندگی کی حقیقت کو کس خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔ وہی بے بسی اور مایوسی جو ہماری رگ
رگ میں پیوست ہو گئی ہے۔ وہی ناامیدی اور خارجی حقیقت کا خوف جو ہم کو ایک داخلی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، اس
اذان میں موجود تھے۔ ہم دنیا کو چھوڑ کر ازل اور ابد کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ آدمی کو بھلا کر خدا کی تلاش میں مشغول رہتے ہیں
اور ہماری زندگی کی ہر چیز ہم کو اس بات کی ترغیب دلاتی ہے۔ ہمارا ہر گیت ہمیں یہی لوریاں سناتا ہے۔ ہمارے پیروں میں
بیڑیاں ہیں لیکن ہم ان کے رگڑ کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ وہ ہم کو ایک خارجی حقیقت نہیں معلوم ہوتیں۔ ہمارے ہاتھوں میں
ہتھکڑیاں پڑی ہیں، ہمارے گلوں میں طوق ہیں۔ ہماری زبانوں پر قفل ڈال دیے گئے ہیں لیکن ہم کو کسی بات کا احساس نہیں،
ہمارا جسم سن ہو چکا ہے، ہماری روح سو گئی ہے اور ہم اپنی بے بسی پر مگن ہیں اور لاپروائی اور بے حسی کی زندگی گزارتے ہیں حتیٰ کہ
موت اپنے پنجے بڑھاتی ہے اور اپنی تاریک آغوش میں کھینچ لیتی ہے۔ ہماری نیک نامی اور بدنامی دونوں برابر ہیں۔ ہماری زندگی
اور موت دونوں یکساں ہیں اور اذان کی آواز کی طرح ہم اس طرح زندگی سے موت میں بدل جاتے ہیں کہ کوئی تمیز نہیں کر سکتا ہم
کبھی زندہ بھی تھے یا سب وہم و گمان تھا اور ہم موت کے دلارے ہمیشہ سے ان کی لوریوں سے مخمور غفلت کی نیند سویا کرتے
تھے۔

ایک رات کو مرزا کی دکان پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو عزیز تھا، ایک کوابی اور ایک

دو آدمی اور جمع ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے حقہ رکھا تھا اور وہ باری باری کش کھینچ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

''میں تو یار ہر ایک چیز میں اس شان کو دیکھ رہا ہوں۔''

اس پر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں غور سے سننے لگا۔

اتنے میں ایک گاہک آیا اور اس نے مرزا سے پانچ پیسے کا دودھ مانگا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مرزا نے ایک آبخورا اٹھایا اور دودھ نکالنے کے لیے لٹیا دودھ کی طرف بڑھائی۔ اس آواز نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''پرلے دن میں چاندنی چوک میں سے جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک بچھیا آ رہی تھی۔ اسی جگہ ایک بچہ پڑا ہوا تھا۔ گائے بچے کے پاس آن کے رک گئی۔ میں نے سوچا کہ دیکھو اب کیا کرتی ہے۔ دلے میں صاحب اس بچھیا نے اپنے چاروں پیر جوڑ کر ایک قلانچ ماری اور بچے کو صاف پھلانگ گئی۔ مجھ کو تو اس جناور کی عقل میں اس کی شان نظر آ گئی۔''

مرزا کا ایک ہاتھ کڑھاؤ کے پاس تھا، دوسرے میں آبخورہ تھا اور بولنے والے کی طرف گھور رہا۔ عزیز بولا:

''واہ واہ کیا اس کی شان ہے!''

مرزا نے لٹیا میں سے دودھ لیا اور اس کو اچھالنے لگا۔ اتنے میں ایک دوسرا شخص بولا:

''ہاں میاں اس شان کا کیا پوچھ رہے ہو۔ ایک مرتبہ حضرت سلیمان کو حکم ملا کہ محل بناؤ۔ تو بس صاحب انہوں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ جناتوں نے آنا فانا میں بڑے بڑے پتھر اور سلیں لا لا کر جمع کر دیں اور مدت لگ گئی۔ تم جانتے ہو جناتوں کا کام کتنی پھرتی کا ہوتا ہے۔ آج اتنا کل وتنا۔ تھوڑے ہی دنوں میں محل آسمان سے باتیں کرنے لگ گیا۔ حضرت سلیمان روز اس جگہ جا کے دیکھا کرتے تھے کہ کوئی کام میں سستی تو نہیں کر رہا ہے تو بس صاحب ایک دن محل کھڑا ہو گیا۔ اب صرف اس کے اندر کی قتلیں اور فتر صاف کرنے رہ گئے۔ دوسرے روز پھر حضرت سلیمان اپنی لکڑی ٹیک کے کھڑے ہو گئے اور ملبہ باہر پھینکنے کا حکم دے دیا لیکن اتنے میں وہاں سے کچھ اور ہی حکم آ چکا تھا۔ اب دیکھئے محل کی شان کہ یہاں تو اس کی صفائی ہو رہی ہے اور وہاں اس لکڑی میں گھن لگنا شروع ہو گیا لیکن وہ ڈٹے کھڑے رہے یہاں تک کہ گھن لگتے لگتے مونٹھ تک پہنچ گیا۔ لیکن ان کو ذری بھی خبر نہیں ہوئی اور لکڑی راکھ کی طرح یوں جھڑ گئی اور ان کا خود کا دم نکل گیا۔ ادھر تو ان کا کام تمام ہوا، ودھر جب جناتوں نے دیکھا کہ جن کا رعب شعب تھا وہ ہی نہیں رہے تو چھپت بنے۔ لیکن میں تو اس بات پر حریان ہو رہا ہوں کہ اب ان قناتوں اور فتروں کو کون صاف کرگا؟''

عزیز کے ہاتھ میں حقہ کی نلی اس کے منہ کے برابر رکھی ہوئی تھی۔ اور وہ بولنے والے کی طرف گھور رہا تھا۔ مرزا کا ایک ہاتھ جس میں لٹیا تھی، اور آبخورہ والا نیچے، اور وہ قصہ میں محو تھا۔

میں نے زور سے قہقہہ لگایا لیکن پھر سوچ میں پڑ گیا کہ واقعی ان ''قتلوں'' اور ''فتروں'' کو کون صاف کرے گا۔

ہوا کا ایک اور جھونکا زور سے آیا اور مٹی کے تیل کا لیمپ گل ہو گیا اور سڑک پر اندھیرا تھا۔ اس وقت لوگ مرزا کی دکان سے اٹھ کر روانہ ہونے لگے اور میں بھی گھر کے اندر چلا گیا۔

OOO

احمد ندیم قاسمی

پہاڑوں کی برف

میں نے قلم کو کاغذ پر جھکایا ہی تھا کہ آواز آئی: ہے بی بی۔خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔تیرا بچہ جیوے۔میں نے قلم کو واپس قلم دان میں رکھ دیا۔اگر اس قلم کی قیمت چالیس پچاس روپے نہ ہوتی تو میں اسے یقیناً پٹخ دیتا۔صبح سے بارہ ایک بجے تک کی سوچ بچار کے بعد مجھے مزے کا ایک فقرہ سوجھا تھا،مگر بھکارن کی آواز نے اسے یوں نوچ لیا تھا جیسے پھونک مارنے سے چراغ کی لو غائب ہو جاتی ہے۔

کیا بھلا سا فقرہ تھا!میرے افسانے کا یہ پہلا ہی فقرہ قاری کے ذہن کو جکڑ لیتا۔

ملازم مکان کی تیسری منزل میں تھا۔بھکارن کی آواز اس تک شاید نہ پہنچ سکی تھی ورنہ میری ہدایت کے مطابق بھکارن کو اس کی طرف سے،دفع ہو جانے کا مشورہ فوراً ملتا۔بھکارن بھی ایک ہی آواز لگا کر شاید چل دی تھی۔

یکا یک کھوئے ہوئے فقرے کے چند الفاظ گڈ مڈ صورت میں ابھرے ایک جلتی ہوئی دیا سلائی بجھے ہوئے چراغ کی طرف بڑھی۔۔۔اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا۔۔۔مگر نہیں میں نے برف کے رنگ میں کوئی اور رنگ بھی ملایا تھا۔لالہ صحرائی کا رنگ،یا شاید شفق شام کا رنگ،یا ممکن ہے۔۔۔ہے بی بی۔خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔تیرا بچہ جیوے!

تو وہ کم بخت ابھی تک وہیں۔نیچے صدر دروازے میں کھڑی تھی!

دیا سلائی دھوئیں کی ایک منحنی لیکر چھوڑ کر بجھ گئی اور میں پکارا۔بیباں گھر میں نہیں ہیں۔

بی بی۔نہیں تو بابو،تو ہی خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے،ہے تجی،تیرا بچہ جیوے۔

میں خاموش رہا۔بھکاریوں سے زبان لڑانا میرا شیوہ نہیں۔ان کے پاس سب سے بڑی دلیل بھوک کی ہوتی ہے اور مجھے اس دلیل کا کبھی کوئی جواب نہیں سوجھ سکا۔

کچھ دیر کے بعد ذہن کی دھند میں حرکت پیدا ہوئی اور افسانے کا ابتدائی فقرہ جیسے آنکھیں ملنے لگا۔۔۔

اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح۔۔۔

دے دے نا تجی۔تو ہی دے دے نا۔اب کے بھکارن کی آواز جیسے میرے سر پر گونجی۔میں نے دیکھا تو وہ میرے کمرے کے دروازے میں یوں کھڑی تھی کہ اس کا پورا دھڑ باہر سیڑھی پر تھا۔مجھے اس کا صرف ہاتھ نظر آیا جس سے اس نے کواڑ کو پکڑ رکھا تھا۔اس ہاتھ کا رنگ پہاڑوں کی برف کا سا تھا۔چمکتا ہوا سفید،مگر کہیں کہیں ہلکی سی نیلاہٹ دیتا ہوا۔شاید اس کی رگوں کا رنگ تھا۔مگر اس کے ناخنوں نے مجھے زیادہ سوچنے کی مہلت نہ دی۔یہ ناخن میل سے اٹے ہوئے تھے اور کٹے پھٹے اور دندانے دار تھے۔پھر میرے دیکھتے دیکھتے اس کی انگلیوں میں ایک نہایت متوازن حرکت پیدا ہوئی۔۔۔تو یہ ایسی بےفکری بھکارن ہے کہ بھیک ملنے تک کا وقت گزارنے کے لئے کواڑ پر ڈھولک بجانے لگی ہے!۔۔۔کیا ایسوں کو بھیک دینا جائز ہے؟۔۔۔مگر کیا اتنے سفید ہاتھوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دینا جائز ہے؟۔۔۔لیکن کیا ہر مجبوری جائز ہو سکتی ہے؟۔۔۔

میں نے تکیے کے نیچے سے ایک آنہ اٹھایا اور بولا یہ لے۔

وہ بولی ادھر پھینک دے بابو۔

نہ جانے مجھے اس بھکارن کے طرز عمل پر غصہ سا کیوں آنے لگا تھا۔میں نے آنہ پھینکنے کی بجائے پٹخ دیا۔یہ آنہ کواڑ پر بج کر کمرے کے اندر دہلیز سے کوئی ایک گز کے فاصلے پر رکا۔بھکارن نے سیڑھی پر سے ہی جھک کر ہاتھ بڑھایا۔یوں اس کے چہرے کا ایک رخ بھی میرے سامنے آ گیا۔مگر یہ سب کچھ ایک سیکنڈ کے تیسرے حصے میں ہوا۔یوں لگا جیسے بجلی سی میرے کمرے میں کوند کر اڑ گئی ہے۔مجھے دروازے تک پہنچنے میں کل دو سیکنڈ لگے ہوں گے مگر سیڑھیاں خالی تھیں۔میں پلٹ کر تیزی سے گلی میں

بھکارن [illegible] مماثل ہو جاتا تھا۔ یہ چہرہ [illegible]
سائیکی اور افروڈائیٹ ---- ہر اساطیری خاتون کے ساتھ یہ چہرہ مماثل ہو جاتا تھا۔ یہ چہرہ میرے ذہن نے اس سامنے آیا تھا، اور جتنی دیر میں سامنے کا لفظ بولا جا سکتا ہے، غائب ہو گیا تھا۔ اس اڑتے ہوئے ثانیے میں میرے ذہن نے اس چہرے کی کتنی تفصیلیں محفوظ کر لی تھیں، پتلی اور بے حد سیاہ بھویں۔ موٹی اور بے حد سیاہ آنکھیں۔ لمبی اور بے حد سیاہ پلکیں۔ ستواں ناک میں نتھنوں کا بے حد خفیف ابھار۔ بے حد سرخ ہونٹ۔ بے حد نکیلی ٹھوڑی بے حد سیاہ گال۔ بالکل پہاڑوں کی برف کی طرح۔

پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی۔ دراصل یہ سب کچھ اس ذہنی فضا کا نتیجہ تھا جو میں نے اپنے افسانے کا آغاز کرتے ہوئے قائم کر لی تھی۔ انسان بھی کتنا بے اختیار جانور ہے! اس پر خود اپنے ذہن کا جبر کتنا شدید ہوتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں قلم اٹھا کر افسانے کا پہلا کھویا ہوا فقرہ ڈھونڈنے لگا۔

مگر چراغ کی بجھی ہوئی لو پہلے کسی کو ملی ہے جو مجھے ملتی! ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں افسانے کا پہلا فقرہ نہ لکھ سکا تو ایک یہی افسانہ کیا، میں کبھی کوئی افسانہ نہیں لکھ سکوں گا جیسے یہی ایک کھونٹی تھی جس پر مجھے اپنے خیالوں کا سارا اپشتارا ٹانگنا تھا، اور اب یہ کھونٹی ٹوٹ گئی ہے تو میرا ہر خیال پتھر بن گیا ہے اور میں پتھروں کے اس بوجھ تلے دوہرا ہوا جا رہا ہوں۔

پھر ردی خریدنے والے نے گلی میں، ایک سانس میں کوئی بیس الفاظ کا فقرہ نہایت کراری آواز میں ادا کیا اور مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ یہ ردی والا پچھلے کئی برس سے ہر روز ایک دو بار اس گلی میں سے گزرتا تھا اور میرے مکان کے سامنے ضرور رکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں پڑھنے لکھنے والا آدمی ہوں، اور ایسے آدمیوں کے ہاں ردی بہت عام مل جاتی ہے۔ میں اس آواز کا عادی تھا۔ افسانہ لکھتے ہوئے بھی میں نے یہ آواز سنی تھی اور میرے افسانے کی روانی میں اس نے کبھی کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ مگر آج مجھے ردی والے پر اتنا غصہ آیا کہ میں قلم رکھ کر اٹھا۔ کھڑکی میں سے نہایت قہر آلود نظروں سے دیکھنا چاہا مگر میری نظر سب سے پہلے گلی کے نکڑ پر پڑی اور مجھے پہلی بار تجربہ ہوا کہ تصور ٹھوس بھی ہو سکتا ہے---- بھکارن دوسری گلی میں مڑ رہی تھی۔

میں جیسے اس کے تعاقب میں بھاگا۔ میں کتنی گلیوں اور سڑکوں کو طے کرتا ہوا نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔ نہ جانے میں ٹریفک سے کیسے بچا اور چوراہوں کو کیسے پار کیا۔ نہ جانے میں نے کتنے سگرٹ کب جلائے اور کہاں پھینکے پھر جب میں مال روڈ کے ایک چوک میں ٹریفک سگنل کی سرخ بتی دیکھ کر رکا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں کہیں جا رہا ہوں۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟ کیوں بھئی، میں کہاں جا رہا ہوں؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

میں عشق کے سب مرحلوں اور تمام منزلوں سے آگاہ ہوں۔ میں ذرا ذرا سی بات پر رو بھی دیا ہوں اور بڑے بڑے دکھوں کو پی بھی گیا ہوں، مگر مجھے ایسی وحشت کا تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ ایک میلی کچیلی، بدبودار اور اجڈ بھکارن کی صرف ایک نیم رخی جھلک نے میرے خون کو کھولاؤ کے نقطے پر پہنچا دیا ہے اور میں وہاں جا رہا ہوں جہاں سے اگر واپس نہ آ سکوں تو شہر کے بچے مجھ پر پتھراؤ کر دیں۔ تو کیا یہ سچ ہے کہ ہر انسان میں تھوڑا سا جنون ضرور ہوتا ہے؟ مگر میرا یہی جنون کیا کم ہے کہ جب لوگ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہوتے ہیں تو میں افسانہ لکھ رہا ہوتا ہوں۔ اور جب میرے احباب شراب پی رہے ہوتے ہیں تو میں سوچ رہا ہوتا ہوں کہ ان کے لاشعور میں کس قیامت کے رن پڑ رہے ہوں گے۔ مجھے جنون کی اسی مقدار پر قانع رہنا چاہیے۔

میں گھر لوٹ آیا۔ میں نے رات کا ایک بہت بڑا حصہ اپنے لٹے ہوئے افسانے کا فقرہ سوچنے میں کاٹا مگر جہاں پہاڑوں کی برف میرے ذہن میں آئی، وہیں بھکارن نے سیڑھی پر سے ہاتھ بڑھا کر آنہ اٹھایا اور کشت خیال میں یونانی اصنام کے چہروں کی ندیاں امڈ پڑیں۔

میں صبح کو یوں بروقت اٹھا جیسے رات پوری نیند سویا ہوں۔ پھر اپنے کمرے میں اس اہتمام سے آ بیٹھا جیسے سورج کے نکلنے

ہی دو پہر ہو گئی ہے اور بھکارن اب آتی ہی ہو گی۔ اس مسئلے پر دیر تک میرے اور میرے ذہن کے درمیان خاصی تلخ بحث ہوتی رہی۔ میں کہتا تھا کہ دیکھو تو۔ میرے ہاتھ میں قلم ہے۔ میں تو افسانہ لکھنے بیٹھا ہوں، مگر میرا ذہن کہتا تھا کہ نہیں۔ تم تو بھکارن کا انتظار کر رہے ہو۔ اس وقت تو میں نے الٹا اپنے ذہن کو جھوٹا ثابت کر دیا تھا۔ مگر جب دو پہر کو بھکارن آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں اسی کا منتظر ہوں۔

آواز آئی ہے بخی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے تیرا بچہ جیوے۔

اور میں نے سوچا کہ کیا کسی شاعر نے کبھی اس سے بہتر شعر بھی کہا ہے؟

عجیب بات ہے کہ نہ تو پلنگ پر سے کود کر اٹھا اور نہ قلم کو قلمدان میں رکھا میں نے بڑے ٹھنڈے انداز میں صرف اتنا کہا۔ ارے تو آج پھر آ گئی؟

اس پر مجھے لگا جیسے وہ ہنسی ہے۔ نہایت مختصر مگر نہایت سریلی ہنسی۔ جیسے چینی کی پیالی کو چینی کی پیالی چھو جائے۔ پھر وہ میرے کمرے کے دروازے پر سے بولی۔ بابو تیرا بچہ جیوے۔

میں نے دیکھا تو وہ میرے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی کہ اس کا پورا دھڑ باہر سیڑھی پر تھا۔ مجھے اس کا صرف ایک ہاتھ نظر آیا جس سے اس نے کواڑ کو پکڑ رکھا تھا۔ اس ہاتھ کا رنگ پہاڑوں کی برف کا سا تھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کل سے یہیں کھڑی ہے۔ وہ ازل سے یہیں کھڑی ہے۔

یکا یک میں ڈرا کہ کہیں وہ کواڑ پر ڈھولک نہ بجانے لگے۔ کل میں نے اس کی انگلیوں کی متوازن حرکت سے اپنی شدید ہتک محسوس کی تھی۔ بھیک اتنی بے نیازی سے نہیں مانگی جاتی۔ بھکارن کو بھیک سامنے آ کر مانگنی چاہیے۔ طوائفوں تک نے اپنے لیے اخلاق کا ایک ضابطہ مقرر رکھا ہے۔ بھکارن کو کم از کم بھیک مانگنے کا سلیقہ آنا چاہیے، سو شاید اس کی بے نیازی کو شکست دینے کے لئے، یا گذشتہ آٹھ پہر کی بھڑکتی آگ کو بجھانے کے لئے، یا یونہی بے ارادہ میرے منہ سے نکا لے۔ لے جا۔

''لا'' وہ بولی اللہ تجھے بہت دیوے بخی۔ اللہ تیرا بچہ جیوے بخی۔

ایک دم وہ ساری کی ساری اندر آ گئی میں اپنے حکم کی اتنی بھر پور تعمیل کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ میں نے ایک آنہ اتنی تیزی سے اس کی بے حد گابی ہتھیلی پر گرا دیا جیسے وہ آنے کے انتظار میں ذرا دیر اور اسی طرح میرے سامنے کھڑی رہی تو میں کھڑکی میں سے کود جاؤں گا۔

مگر وہ آنہ لے کر بھی اسی طرح کھڑی رہی میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ شلیف پر رکھے ہوئے مٹی کے ایک کھلونے کو دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس ایک لمحے میں اس کے سراپا کا اس نظر سے جائزہ لیا کہ کوئی خامی نظر آئے تو اسے اپنے ذہن میں سے نوچ کر پھینکنے میں آسانی ہو مگر یکا یک اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ہرن ہے؟

میں نے کہا۔ نہیں۔ ہرنی ہے۔

وہ بے اختیار چینی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں بجاتی دروازے میں سے نکل گئی۔

میں تیزی سے کھڑکی میں آیا۔ وہ ایک آنے کو بچوں کی طرح اچھالتی اور جھپٹتی ہوئی جا رہی تھی۔ پھر وہ دوسری گلی میں مڑ گئی۔

عورت فطرت کی نہایت خوب صورت تخلیق ہے مگر حسن تخلیق کی داد کا بھی ایک قرینہ ہوتا ہے۔ نو شگفتہ پھول کو دیکھ کر ہمارے احساسات کو ایک انگڑائی سی آتی ہے اور ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ شفق میں رنگے ہوئے بادلوں کو ہم پیار سے دیکھتے ہیں اور اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ رات کو چھت پر گرتی ہوئی بوندوں کی موسیقی چند لمحوں کے لئے ہمیں آسمانوں سے اترا ہوا ساز ینہ معلوم ہوتی ہے اور پھر ہم سو جاتے ہیں میں نے خوب صورت عورتوں کو بھی ہمیشہ اس قرینے سے دیکھا ہے حسن کی طرف ذرا سی زیادہ توجہ دیجئے تو پھر آپ کسی اور طرف ذرا مشکل ہی سے متوجہ ہو سکیں گے۔ مگر جب کوئی حسن زبردستی اتر آئے تو زندہ رہنے کی دو ہی راہیں باقی رہ جاتی ہیں۔ یا تو حسن سے نفرت کرنے لگو اور بھیڑیئے کی طرح مار مار کر کھاتے ہوئے مر جاؤ یا پھر دنیا کے

دوسرے تمام کاموں سے ہاتھ کھینچ لو اور سمندر کے ساحل کی سی زندگی گزار دو کہ وہ فقط ایک کام کرتا ہے۔ وہ سمندر کے مچلتے ہوئے حسن کے لئے اپنا آغوش ہر لمحہ کھولے رکھتا ہے۔ کبھی کبھار موجیں اسے چند سیپیاں دے جاتی ہیں، مگر ایک اور موج آتی ہے اور ان سیپیوں کو بھی سمیٹ لے جاتی ہے۔ اس کے باوجود ساحل کا آغوش ازل سے کھلا ہے اور ظاہر ہے کہ اس یک طرفہ کاروبار میں کوئی قرینہ نہیں ہے۔

یہ سوچ کر حسن یہ موج مجھے بھی ساحل کی سی افتادگی کی طرف لیے جا رہی ہے۔ مجھے اپنے آپ پر ایک بار پھر ہنسی آ گئی۔ مجھے تو یہ سوچ کر قلوپطرہ پر بھی ہنسی آ جاتی ہے کہ اس کی ناک ننھی سی تھی۔ اتنی بڑی ملکہ اتنی ذرا سی ناک کے ساتھ کیسی عجیب لگتی ہوگی ، اور میں تو سپارٹا اور ٹرائے کی فوجوں پر بھی یہ سوچ کر مسکرا دیتا ہوں کہ جب ہیلن کی جوانی ڈھل گئی ہوگی، تو اسے دیکھ کر طرفین اپنی اپنی حماقت پر کیسے کیسے جھینپتے ہوں گے۔ ہنستے ہوئے میں نے قلم اٹھایا اور یوں لکھنے بیٹھ گیا جیسے آج افسانے کا ایک پہلا فقرہ ہی کیا، آخری فقرہ بھی لکھ کر اٹھوں گا۔

اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا۔۔۔ اس کا رنگ ان پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا، جن پر ۔۔۔ اس کا رنگ پہاڑوں کی اس برف کی طرح صاف تھا جو۔۔۔ اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح اس حد تک صاف تھا کہ۔۔۔

اور پھر چینی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں بجنے لگیں۔

ایک موج آئی اور ساحل کو یادوں کی نمی بخش کر پلٹ گئی۔

اتنی گلابی اس قدر گلابی، اس حد تک گلابی ہتھیلی پر صرف ایک آنہ چمکا اور میں نے اپنے آپ کو گالی دے دی۔۔۔ کمینہ، بڑا حسن کار بنتا ہے۔ فطرت کی اس شہ رگ کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی قیمت کیا صرف ایک آنہ ہے؟ تف ہے تجھ پر اور تیری حسن کاری پر!

دوسرے دن کی دوپہر تک کا وقت میں نے اس مجرم کی طرح گزارا جو جرم کرنے کے بعد اپنے اندر جھانکے تو اس کا ضمیر اس پر تھوک دے۔۔۔ ان دنوں تو ایک آنہ میں ایک چپاتی بھی نہیں آتی!

مگر سارے لاہور میں صرف میں ہی تو میں ہوں جس سے اس نے ایک آنہ لیا ہوگا۔ نہ جانے پورے دن میں اس نے کتنوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوں گے؟ تو کیا جس طرح وہ میرے پاس آئی ہے، اسی طرح دوسروں کے ہاں بھی جاتی ہوگی؟ سارا شہر مجھے اپنا دشمن نظر آنے لگا۔۔۔ اچھا تو ذہن میں نراجیت یوں پیدا ہوتی ہے!

کل رات میری کشت خیال میں صرف یونانی اصنام کے چہروں کی ندیاں امڈتی رہی تھیں۔ مگر آج رات تو ادھر ایک چہرہ نمودار ہوتا، ادھر ایک شعلہ سا بھڑک اٹھتا پھر دھواں سا چھا جاتا۔ پھر پتھر سے برستے۔ پھر ایسی آوازیں سی آئیں جیسے کوئی شیشے کی کرچیاں پیس رہا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کل سارا دن گھر سے باہر رہوں گا۔ کل کسی ڈاکٹر سے بھی مشورہ کروں گا۔ کل نماز بھی پڑھوں گا۔

مگر صبح بہت دیر سے آنکھ کھلی نماز کا وقت نکل چکا تھا۔ نہانے اور ناشتہ کرنے میں بھی خاصی دیر لگی اور پری کی منزل میں بیٹھا اخبار پڑھنا شروع کیا تو دوپہر تک پڑھتا رہا۔ جب ملازم نے آ کر کہا کہ پڑوسی چند منٹ کے لیے اخبار مانگ رہا ہے۔ تو میں نے وقت دیکھا۔ یکایک کسی چیز نے جیسے میرے اندر اچھل کر مجھے کمرے سے باہر سے اور میں سیڑھیوں پر سے اتنی تیزی سے اترا کہ بچے بھی یوں نہیں اترتے ہوں گے۔ اپنا کمرہ کھول کر میں سیدھا کھڑکی کے پاس گیا اور گلی میں جھانکا۔ دو بجے سگرٹ کی ڈبیوں سے مکان بنا رہے تھے اور گلی میں ایک بڑھیا گزر رہی تھی جو ہوا سے بھرے ہوئے برقعے میں بہت چھوٹی لگ رہی تھی۔

میں پھر اوپر کے کمرے کی طرف لپکا اور ملازم سے پوچھا۔ کوئی مجھ سے ملنے تو نہیں آیا تھا؟

وہ بولا۔ ''آپ سو تو نہیں رہے تھے صاحب، کہ کوئی آتا تو میں نہ بتاتا۔''

مزید کریدنے کے لیے مجھے کوئی دوسرا قرینے کا سوال نہ سوجھ سکا اور ملازم جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا۔ ''بس صبح صبح ایک

سبزی والا تھا، یا اخبار والا، یا پھر ابھی ابھی وہ منگتی آئی تھی''۔۔۔مجھے اپنی طرف گھورتا دیکھ کر وہ بولا۔''کوئی بھی تو نہیں آیا صاحب۔کیا آپ نے کسی کو وقت دے رکھا تھا؟''

میں جواب دیئے بغیر پلٹ آیا۔تو وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی! تو وہ اتنی غیر اہم تھی کہ اس کے آنے کے باوجود کوئی نہیں آیا تھا!

کیا فرشتوں کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ آج کے دن کو بھی میری زندگی میں شمار کریں!

سیڑھیوں پر سے آہستہ آہستہ اترتا ہوا میں گلی میں آ گیا۔پھر دوسری گلی میں سے ہوتا ہوا سڑک پر آیا اور دور تک نظریں دوڑائیں کہ شاید وہ کسی راہ گیر کا دامن تھامے کھڑی ہو۔شاید کسی دکان کے سامنے پڑی ہوئی سڑی چیزوں میں سے کوئی کم سڑی ہوئی چیز چن رہی ہو۔شاید وہ کسی درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر اداس کھڑی ہو کہ آج اس کی لگی بندگی آمدنی میں سے ایک آنہ کٹ گیا۔

سڑک پر معمول کی زندگی رواں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اور واقعی کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔یہ کتنی عجیب بات ہے کہ انسانوں کے اندر کے طوفان ان کے اندر ہی چلتے رہتے ہیں۔ہر انسان کے اندر سے اس کا طوفان باہر آ جائے تو کیسی قیامت برپا ہو جائے۔

میں واپس اپنی گلی میں آیا تو بچوں نے سگرٹ کی ڈبیوں سے پنج منزلہ مکان تعمیر کر لیا تھا اور میرے ساتھ والے مکان کے دروازے پر ایک بی بی، ردی والے کے ہاتھ اپنی اولاد کی پرانی کاپیاں بیچ رہی تھی۔

اور وہ میرے مکان کی دہلیز پر بیٹھی تھی۔۔۔تو میری خیرات اس کے لئے اتنی اہم ہے؟۔۔۔وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بیٹھے بیٹھے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دے دیا۔اس کے پاؤں اتنے میلے تھے جیسے وہ غلطی سے کسی دوسرے کے پاؤں لگا کر چلی آئی ہے۔البتہ آج اس کے ہاتھ دھلے ہوئے تھے اور ناخن کٹے ہوئے تھے! آج تو تمہارے ناخن کٹے ہوئے ہیں۔میں نے یوں فاتحانہ انداز میں کہا جیسے محض میرے پاس آنے کی تقریب میں اس نے اپنے پیکر میں یہ خاص اصلاح کی ہے۔

اور اس نے اپنے ہاتھ یوں گود میں چھپا لئے جیسے کہیں سے چرا لائی ہے اور اب پکڑی گئی ہے۔پھر چینی کی پیالی سے چینی کی پیالی چھو گئی اور میں اوپر لپکا۔اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے اسے بلانا چاہا مگر پھر رک گیا جیسے میرے منہ سے ایک لفظ نکلا تو سارے شہر میں گونج جائے گا۔پھر میں نے اشارتاً اسے اوپر آنے کو کہا اور وہ ادھر آنے لگی، مگر مجھے دروازے میں کھڑا دیکھا تو وہ سیڑھیاں چھوڑ کر رک گئی۔اس نے بھویں اٹھا کر اوپر میری طرف دیکھا اور میں یوں ایک طرف ہٹ گیا جیسے نہ ہٹا تو کہیں نیچے ڈوب جاؤں گا۔

میں نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک اٹھنی اٹھائی اور اس کی طرف بڑھا دی۔اس نے ہاتھ پھیلایا مگر اٹھنی دیکھ کر کھینچ لیا۔نہیں بابو میرے پاس بھان نہیں۔

تم اٹھنی لے لو۔میں نے اس کے بھولپن سے خوش ہو کر کہا۔

پوری؟ اس نے پوچھا۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ہاں۔تمہارے پاس بھان جو نہیں ہے۔

ایک آنہ لینے والی بھکارن کے لیے اٹھنی ایسی ہی ہے جیسے افسانہ نگار کی ایک لاکھ کی لاٹری نکل آئے۔سو میں نے طے کر لیا کہ اس نے اٹھنی کے لیے ہاتھ پھیلایا تو میں اسے کلائی سے پکڑوں گا، اور ظاہر ہے جائز طور سے پکڑوں گا کیونکہ میرے پورے آٹھ آنے اس کے پاس ہوں گے۔پھر جب میں اس کی کلائی اپنی گرفت میں لے لوں گا تو اس سے کہوں گا۔۔۔میں اس سے کہوں گا۔۔۔میرے افسانے کا پہلا فقرہ ایک کوندے کی طرح میرے ذہن میں چمکا اور پہاڑوں کی برف پر شفق برس پڑی۔مگر قبل اس کے کہ میرا ذہن پورے فقرے کو سنبھالتا، میں نے دیکھا کہ وہ جا رہی ہے۔

اٹھنی تو لیتی جاؤ میں کچھ ایسے لہجے میں بولا جیسے کوئی ننگا عشقیہ شعر پڑھ رہا ہوں۔

وہ پلٹ کر، اور دروازے میں سے جھانک کر بولی۔ لے تو لی تخی۔

یہ میں نے بہت بعد سوچا کہ میرے اٹھنی دکھانے اور اس کے جانے کی ایک صدی میں وہ ایک لمحہ کب وارد ہوا تھا جب میں نے اسے اٹھنی دی تھی، اور جب میں نے یہ سکہ اس کے ہاتھ پر رکھا تھا، تو اس کی کلائی پکڑ لینے کا فیصلہ مجھے کیوں یاد نہیں آیا تھا۔

پھر ایک دم مجھے احساس ہوا کہ میرا کچھ کھو گیا ہے۔ اٹھنی کے علاوہ میرے افسانے کا پہلا فقرہ بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی وہ مجھے صرف اپنا چہرہ دے گئی تھی، جو اس کے جانے کے بعد دیر تک دروازے میں سے جھانکتا رہا۔ پھر وقفے وقفے سے دکھائی دینے لگا۔ پھر دھندلا گیا۔ پانچویں دن تو وہ بالکل غائب ہو گیا۔ میں نے چھٹے اور ساتویں دن شہر کی سب لائبریریوں میں یونانی سنگ تراشی پر لکھی ہوئی ضخیم کتابیں چھان ماریں مگر مجھے وینس سائیکی اور افروڈائیٹ کے شہروں میں وہ چہرہ نظر نہ آیا جوان سب سے کسی نہ کسی تفصیل میں مختلف تھا شاید بھکارن کے نتھنوں کے خفیف ابھار نے اس کی ناک کے دونوں طرف، وینس کی ناک کے مقابلے میں زیادہ متناسب قوسیں پیدا کر دی تھیں۔ یا شاید سائیکی کی گردن بھکارن کی گردن کے مقابلے میں کوتاہ بھی تھی اور میلی بھی، یا ممکن ہے افروڈائیٹ کے مقابلے میں بھکارن کے ہونٹوں کے گوشے زیادہ گہرے، زیادہ جذباتی تھے میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بھکارن کا چہرہ اپنے مجموعی تاثر کی صورت میں مجھے ضرور یاد تھا مگر جب میں اس کی صرف آنکھوں یا صرف گالوں یا صرف ہونٹوں کے بارے میں سوچتا تو سارا چہرہ برف کی طرح پگھلنے لگتا۔

ساتویں دن، شام کے قریب مجھ پر یکا یک انکشاف ہوا کہ میں نہایت بے معنی زندگی گزار رہا ہوں۔ چہرے غالب کے شعر نہیں ہوتے کہ جب چاہا اٹھا کر پڑھ لو۔ یہ تو سامنے آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ چہرے تو لمحے ہیں اور لمحے کب واپس آئے ہیں تم نے ایک چہرہ دیکھا۔ مانا کہ یہ بے حد حسین، بے حد عجیب چہرہ تھا، لیکن جیسے یہ چہرہ جس کے بارے میں تم سوچ تک نہ سکتے تھے کہ کسی عورت کا ایسا چہرہ بھی ہوگا۔ یکا یک تمہارے سامنے آیا اور گزر گیا، اسی طرح کئی اور چہرے آتے رہیں گے اور گزرتے رہیں گے، اور اگر تم ہر چہرے پر سے نظریں ہٹانا بھول گئے تو آخر کار ایک روز تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے ہمدردوں نے تمہیں پاگل خانے بھجوا دیا ہے۔

ہفتے میں یہ پہلی رات تھی جب میں سکون سے سویا۔ جب میں اٹھا تو سورج کافی چڑھ آیا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے افسانے کا پہلا فقرہ لکھنے بیٹھ گیا۔ جلتی ہوئی ایک دیا سلائی بجھے ہوئے چراغ کی طرف بڑھی اور پہاڑوں پر برف چمکنے لگی۔ ہر طرف ہزاروں آئینے لگ گئے جب میں ہزاروں سورج چمک رہے تھے پھر خیرگی کے اس طوفان میں ایک چہرہ ابھرا اور آواز آئی۔

ہے تخی

میں پلنگ پر سے کود کر اترا اور دروازے میں سے جھانکا۔ پھر بجلی کی سی تیزی سے سیڑھیاں اتر کر گلی میں پہنچ گیا۔ پھر دوسری گلی میں چلا گیا۔ پھر سڑک پر آ گیا۔ وہاں معمول کی زندگی رواں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اور واقعی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ صرف اتنی سی بات ہوئی کہ محلے کے ایک تانگے والے نے میرے پاس آکر حیرت سے پوچھا۔ کیوں بابو جی۔ خیریت تو ہے؟ آپ ننگے پاؤں کیوں کھڑے ہیں؟

تانگے والے نے میرے ننگے پاؤں دیکھ لیے تھے، مگر میرے ذہن کو، جو زخم زخم ہو رہا تھا، ایک تانگے والا کیا۔ کسی نے بھی نہ دیکھا۔ کوئی کسی کے زخم نہیں دیکھتا۔ شاید اس لیے کہ زخم دیکھنے دکھانے کی چیز نہیں ہیں، یا شاید اس لیے کہ سب کے اپنے اپنے زخم ہوتے ہیں۔

تو کیا یہ زخم جو میرے ذہن میں ہے، کسی اور کے ذہن میں بھی ہے؟ اگر ہے تو وہ کہاں ہے کہ میں اسے اپنے سینے سے لگا ذرا سا رو لوں۔ انسان آخر زخموں کے ان ناطوں کو کیوں چھپاتے پھرتے ہیں جو ظاہر ہوں تو سب انسان پیار سے ایک دوسرے کو لپٹا لیں۔

تانگے والے کو جواب دیے بغیر، میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور بستر پر سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر یوں پھیل کر

لیٹ گیا جیسے کڑے کوسوں کا سفر طے کر کے آ رہا ہوں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ذہن سے رجوع کیا، مگر اس نے بھی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ سب سو رہے تھے۔ چاروں طرف نہایت ڈراؤنا سناٹا مسلط تھا۔ آج ردی والا بھی کہیں مر گیا تھا۔
میں نے غنودگی کے عالم میں دیکھا کہ بھکارن میرے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے بخی، تیرا بچہ جیوے۔
میں نے چادر نوچ کر پھینک دی۔ وہ دروازے پر سچ مچ کھڑی تھی اور کہہ رہی تھی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے بخی، تیرا بچہ جیوے۔''
میں کچھ ایسے لہجے میں بولا جیسے وہ باقاعدہ میرے نکاح میں ہے اور میں اس سے ہر قسم کی جواب طلبی کر سکتا ہوں۔ تم اتنے دنوں کہاں تھیں؟ میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ آج تم پورے ایک ہفتے کے بعد میرے پاس آئی ہو؟
میرے لہجے کا اثر صرف اس کی آنکھوں پر ہوا جو آج کسی گلابی دوا کے حلقے میں بجی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ وہ چمک جو انتہائی پیار ڈر کی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔
بولو۔ کہاں تھیں تم؟ میں کڑکا۔
میں یہیں تھی بابو۔ اور کہاں تھی۔ وہ بچے کی طرح بولی۔
تو پھر تم ایک ہفتے تک آئیں کیوں نہیں؟ میں نے اسی لہجے میں پوچھا۔
اور وہ بولی۔ میں انختی جو لے گئی تھی بخی۔ ایک آنہ اس دن کا۔ باقی سات آنے سات دنوں کے آج آٹھواں دن تھا تو آ گئی۔
بھکارن کا چہرہ پھرکی کی طرح گھوما اور ایک آن میں پہاڑوں کی برف تڑاخ پڑاخ کر کے چٹخی اور اس کے بڑے بڑے چٹانوں کے سے تودے چیختے چنگھاڑتے ہوئے آئے اور میرے سر پر ٹوٹنے لگے۔ وحشیوں کی طرح میں نے بستر پر سے تکیہ اٹھا کر دور پھینک دیا اور اس کے نیچے پانچ پانچ دس دس روپے کے جتنے بھی نوٹ رکھے تھے۔ انہیں مٹھی میں لے کر میں بھکارن کی طرف بڑھا۔ اس کی کلائی کو لکڑی کی طرح پکڑ کر میں نے یہ نوٹ اس کی مٹھی میں ٹھونس دیئے اور چیخا۔ ''ان روپوں میں جتنے بھی آنے ہیں، اتنے دنوں سے اگر تم ایک بھی دن پہلے یہاں آئیں تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ جا، دفع ہو جا۔''

ooo

زمین کے نیچے

میری بھی ایک ہَوبی ہے۔ میری ہوبی چہروں کوغور سے دیکھنا ہے، میں ہر چہرے کوغور سے دیکھتا ہوں، بچوں کے چہرے بوڑھوں کے چہرے۔ لڑکوں کے چہرے۔ لڑکیوں کے چہرے۔ مردوں کے چہرے۔ عورتوں کے چہرے اس طرح میری نظر کلیوں کی کیاریوں میں، بنجر زمینوں میں اور سرسبز میدانوں میں سے ہوتی ہوئی درۂ خیبر کی خوفناک گھاٹیوں میں جا پہنچتی ہے جہاں اگر کسی کی نظر کسی عورت پر پڑ جائے تو اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

میری ہابی بڑی خطرناک ہے اس کے آزادسرے غنڈہ ایکٹ سے ٹکراتے ہوئے رگڑ کھاتے کھاتے ہوئے گذرتے ہیں اس کے ڈانڈے تعزیرات پاکستان کی مشہور دفعات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے جیل کی سلاخوں سے جا ملتے ہیں۔

یا خدا! میں نے یہ ہوبی کیوں اختیار کی ہے؟

اس سے بہتر تھا میں تتلیوں کے پر جمع کرتا اور ان کو اپنے ڈرائنگ روم کی دیواروں پر سجا کر اس کو نمائش گاہ بنالیتا۔ اور میں نے پینٹنگ کی ہوبی کیوں نہ اختیار کی؟ پینٹنگ کی ہوبی جس کو پکا سو نے اس قدر آسان کر دیا ہے کہ چھ ماہ کا ایک بچہ رنگوں اور برشوں اور ہاتھوں کی مدد کے بغیر اپنے پیروں سے اور اپنے پیشاب سے تجریدی آرٹ کے بہترین نمونے پیدا کر سکتا ہے اور پھر کتابیں پڑھنے کی ہَوبی بھی تو تھی۔ ٹی ایس ایلیٹ کی کتاب ہاتھ میں ہو تو کافی ہاؤس میں یا کسی ادبی میٹنگ میں بیٹھا ہوا انسان کبھی ایڈیٹ معلوم نہیں ہوتا گھر کی سب دیواروں کے ساتھ کتابوں والی الماریاں کھڑی ہوں اور سب الماریوں میں موٹی موٹی کتابوں کی ڈبل قطاریں لگی ہوں تو انسان خوامخواہ ایک بڑا ادیب یا ایک بڑا شاعر یا ایک بڑا نقاد معلوم ہوتا ہے۔ چاہے وہ کیبنیٹ منسٹر ہو۔ اور کتابیں پڑھنے کی ہوبی یعنی کتابیں جمع کرنے کی ہوبی انسان کی موت کے بعد اُس کے وارثوں کے لیے اور لاوارثوں کے لیے بڑی بھاری جائداد ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اب کتابیں کرم خوردہ ہو کر نوادرات میں شامل ہوگئی ہیں۔ خصوصاً وہ کتابیں جو فٹ پاتھ پر سے پہلے ہی کرم خوردہ خریدی گئی تھیں، اب اور بھی کرم خوردہ ہو کر بالکل نایاب ہوگئی ہیں چنانچہ آپ کے سویم پر آپ کا خلفِ رشید آپ کی کتابوں کا قیمتی سرمایہ اُردو بورڈ کے کسی عہدہ دار کو اس کی فاتحہ ختم کرتے ہی پانچ سو فیصدی منافع پر فروخت کر دے گا۔ اور اگر آپ کو غلط فہمی ہے کہ آپ کی موت تک اردو بورڈ کا وجود ختم ہو چکا ہوگا تو اس غلط فہمی کو فوراً سے پیشتر دور کیجئے۔ اردو بورڈ کا وجود کبھی ختم نہیں ہوگا کیونکہ اردو بورڈ کا کام صرف اُردو لغت تیار کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس کا کام حکومت سے مالی امداد لینا بھی ہے۔

اور میری ہوبی کیا ہے؟ میں ایک چہرے کو غور سے دیکھتا ہوں اور اُس کو تحت الشعور یا لاشعور کے تاریک غاروں میں پھینک دیتا ہوں اور پھر سالہا سال تک اس بات کا انتظار کرتا ہوں کہ وہ چہرہ پھر نظر آئے تاکہ میں ان تاریک غاروں سے اس کی شبیہ نکال کر یہ دیکھوں کہ وہی چہرہ ہے یا کوئی اور ہے۔ یا یہ چہرہ وہی ہوتے ہوئے بھی کوئی اور تو نہیں ہے۔ میں کسی لڑکی کا چہرہ دیکھتا ہوں۔ تو یہ سوچنے لگتا ہوں کہ اس کا رنگ، کس پھول سے ملتا ہے۔ اور جب میں کسی پھول کو دیکھتا ہوں تو یہ سوچتا ہوں کہ یہ کونسی لڑکی کھڑی ہے۔ جب میں کسی عورت کا چہرہ دیکھتا ہوں تو اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ ماں لڑکی سے زیادہ خوبصورت ہے۔ پھر میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ لڑکی خوبصورت ہوتی ہے یا ماں خوبصورت ہوتی ہے۔ جب میں کسی بوڑھے کا چہرہ دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا کہ اب آخری بس سٹوپ نزدیک ہے۔ اور جب آخری بس سٹوپ آجاتا ہے تو میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ آخری سٹوپ ہے یا پہلا بس سٹوپ ہے؟

اس طرح میں چہروں کی تلاش میں جگہ جگہ گھومتا پھرتا ہوں۔

اور میں اس وقت پرانی کلفٹن پر بیٹھا ہوں۔

پرانی کلفٹن کی چٹان تھیٹر کے سٹیج کی طرح بچی ہوئی ہے۔ زندگی کا ڈرامہ ہو رہا ہے۔ سامنے گہرائی میں ببول کے درخت،

اُن سے پرے کلفٹن کی عمارت اُس کے پاس گھاس کے قطعے اور پھولوں کے تختے، اُن کے آگے ساحل کی ریت، سمندر کی لہریں، پانی میں ابھری ہوئی چٹانیں، منوڑے کا جزیرہ اور اس کا لائٹ ہاؤس پرانی کلفٹن کی سٹیج پر زندگی کا ڈرامہ دیکھ رہے ہیں اور میں اس پتھر کے بنچ پر بیٹھا ہوا ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے میں اس ڈرامے کا ڈائریکٹر ہوں۔

میرے پاس پاکستان رائٹرز گلڈ کا ایک ممبر بیٹھا ہے جو ہر ممکن طریقے سے میرا وقت ضائع کرنے کی کوشش کر رہا ہے میں نے اُس کی کوئی بات نہیں سُنی لیکن اُس کی آخری بات سننے کے لائق تھی۔

اس بات سے اُس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اور میں نے کہا "یقیناً میں بڑا ادیب نہیں ہوں اور نہ میں بڑا ادیب بن سکتا ہوں۔ آپ کے فیصلے سے پہلے مجھے اس صداقت کے ثبوت مل چکے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میرے ماں باپ زندہ ہیں۔ بڑا ادیب بننے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو جائیں۔ چنانچہ غالب کے ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے اور چارلس ڈکنز کو بڑا ادیب بننے کے لیے یتیمی کی ٹھوکریں کھانی پڑی تھیں۔ دوسرے بڑے ادیبوں کے بارے میں میں نے تحقیقات نہیں کی، ورنہ میں ثابت کر دیتا کہ تمام بڑے ادیب بیچارے یتیم تھے۔ اور سب نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز پر لوگوں سے داد کی بھیک لینے کے لیے "یتیموں کی فریاد سن لیجئے" کا گیت گایا تھا بلکہ اس سلسلے میں تحقیقات کی بھی ضرورت نہیں۔ فارمولا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یعنی چونکہ وہ بہت بڑے ادیب تھے اس لیے اُن کے ماں باپ بچپن میں ضرور مر گئے ہوں گے۔ بائی دی وے، آپ کے ماں باپ زندہ ہیں یا فوت ہو گئے ہیں؟"

اُس نے جھنجھلا کر جواب دیا "زندہ ہیں"۔

میں جلدی سے بولا۔ "مجھے افسوس ہے"۔

وہ اور بھی جھنجھلا گیا۔ "دیکھو اس بکواس کو بند کرو اور مجھ سے پوچھو کہ میں یہ کیوں کہتا ہوں؟"

میں نے کہا "میں جانتا ہوں۔ اس کا دوسرا ثبوت۔۔۔۔"

اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم کچھ نہیں جانتے۔ چپکے بیٹھے رہو اور میری باتیں غور سے سنو!"

میں نے اپنے اوپر احترام طاری کرتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا، ابا جان!"

وہ بولا "دیکھو! ہماری رائے تمہارے بارے میں یہ ہے کہ تم میں ایک بڑا ادیب ہونے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ لیکن تمہیں احتیاط کی ضرورت ہے۔ تمہارے ادب میں ایک بہت بڑی کمزوری ہے"۔

میں نے پوچھا "کیا؟"

اُس نے جواب دیا۔ "زبان"

"زبان تو میرے منہ میں ہے"

"دیکھو تم بے وقوف نہ بنو۔ نہ دوسروں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرو۔ تم خوب جانتے ہو زبان سے میری مراد کیا ہے تمہارے افسانوں کی زبان درست نہیں۔ تم مستند اردو نہیں لکھتے تم انگریزی بولتے ہو۔ انگریزی میں سوچتے ہو اور اردو میں لکھتے ہو۔ اردو ادب تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اور ادب میں تمہیں کوئی مقام نہیں مل سکتا۔"

یہاں ہماری گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ایک لمبی داڑھی والے شخص نے ہمارے پاس آ کر زور سے السلام علیکم کہا۔ ہم چونک گئے۔

لمبی داڑھی والے نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ نے پہچانا نہیں مجھے؟"

میں نے اپنی نظروں سے اس کی داڑھی کے بال پرے ہٹا کر اُس کو پہچان لیا۔ وہ این۔ ڈی۔ انصاری تھا۔ یعنی نور دین انصاری چونکہ وہ بڑا نوردین تھا اس لیے اُس نے اپنے نام پر انگریزی کا ملمع چڑھا کر اُس کو این ڈی انصاری کر لیا تھا۔ جس طرح بد وضع لوگ انگریزی لباس پہن کر خوبصورت ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اے ڈی سبزواری یعنی اللہ دتا سبزواری جس کا سلیس اردو میں ترجمہ دتا سبزواری ہوتا ہے اور جیسے ایف۔ ایم۔ بلتستانی یعنی فقیر محمد بلتستانی۔

نوردین میرا کلرک تھا۔ وہ اپنے کندھوں پر اتنا بوجھ اٹھا سکتا تھا جتنا گدھا اٹھا سکتا ہے۔ اس لیے اس نے میرے دفتر کے کام کے ساتھ پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایف۔اے پاس کیا پھر بی اے اور پھر ایل ایل بی اس کے بعد اس نے ملازمت چھوڑ دی اور وکیلوں کے سائن بورڈ پر ایسے نام موثر ثابت نہیں ہوتے جیسے نوردین بی اے ایل ایل بی یا جمعہ خان بی ایس سی ایل ایل ڈی یا اللہ ڈوایا ایم اے، ایل ایل بی کیونکہ ایسے نام ایل ایل بی کو بھی نوردین بنا کے رکھ دیتے ہیں۔

ایک دن میں جونا مارکیٹ میں سے گذر رہا تھا۔ پرانے کوٹھوں کی ایک دکان کے اوپر دوسری منزل کی اکھڑے ہوئے پلستر اور دھندلائے ہوئے چونے والی ایک کھڑکی پر مجھے ایک سائن بورڈ نظر آیا۔ این۔ ڈی انصاری بی اے۔ ایل ایل بی میں اس بورڈ کو دیکھ کر اس طرح آگے بڑھ گیا جس طرح لوگ وکیلوں کے بورڈ دیکھ کر بڑھ جایا کرتے ہیں۔

یکایک مجھے اُس کھڑکی میں سے کسی نے آواز دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ نوردین تھا۔ اُس کے منہ پر داڑھی نہیں تھی۔ اس لیے میں نے فوراً اس کو پہچان لیا۔ ہم فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔

میں نے پوچھا'' کیسی چل رہی ہے وکالت''۔

اُس نے کہا خوب۔''

میں نے پھر پوچھا'' کتنی آمدنی ہو جاتی ہے۔''

اُس نے جواب دیا'' اس وقت میری ماہوار آمدنی پانچ روپے سے لے کر پانچ ہزار تک ہے''۔

'' پانچ روپے سے لے کر پانچ ہزار تک، یعنی؟''

'' یعنی کسی مہینے تو پانچ ر پے بھی نہیں ملتے۔ کسی مہینے پانچ ہزار سے بھی زیادہ کما لیتا ہوں۔''

سامنے کی مسجد سے ایک بوڑھا سفید ریش دائیں ہاتھ میں تسبیح لٹکائے ہوئے ہمارے پاس سے گذرا اُس نے میلے ملیشا کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اور اس کے پاؤں میں نیا قیمتی جوتا تھا۔ اُس نے ہمارے برابر آ کر نوردین کو بڑے احترام سے سلام علیکم کہا اور پھر نیپئر روڈ کی طرف چلا گیا۔

میں نے نوردین سے اپنی گفتگو جاری رکھی۔'' کتنی مدت سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کیا کام کی زیادتی ہے؟''

اُس نے جواب دیا۔'' کام ہے بھی اور نہیں بھی۔ کبھی تو مقدموں کے سلسلے میں پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے دوروں پر چڑھا رہتا ہوں۔ اور کبھی ہفتوں، مہینوں اس چوبارے میں پڑا اکھٹل مارتا رہتا ہوں۔''

میں نے کہا۔'' معلوم ہوتا ہے تمہارے موکل دور دور پھیلے ہوئے ہیں''۔

وہ بولا۔'' ہاں، میں تمام مغربی پاکستان کے جیب کتروں کا وکیل ہوں''۔

میں نے ایک قہقہہ بلند کیا اور نوردین کے ایسی بے ساختگی سے یہ خبر ہم پہنچانے پر لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا'' ویل ڈن، نوردین، ونڈرفل، مجھے اتنی دیر کے بعد تم سے ملنے پر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ آج تم سے ملنے کے بعد میری ایک دیرینہ تمنا پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ شاید تمہیں معلوم ہے مجھے دو قسم کے انسانوں کی زندگی سے بے حد دلچسپی ہے۔ پاگلوں کی زندگی سے اور مجرموں کی زندگی سے، پاگلوں کی زندگی کا تو میں نے کافی مطالعہ کیا ہے۔ میں نے پاکستان کے سب پاگل خانے دیکھے ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان میں پاگل خاتونوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ حالانکہ اتنے بڑے ملک میں ہر شہر کے اندر بلکہ ہر محلے میں ایک پاگل خانہ ہونا چاہیے۔ ہماری نئی حکومت کو اس طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے اور جہاں تک مجرموں کی زندگی کا تعلق ہے۔ میں اس کے مطالعے سے بالکل محروم رہا ہوں۔ مجھے امید ہے تم مجھے اس کے موقعے بہم پہنچاؤ گے''۔

نوردین نے جواب دیا۔'' انشاءاللہ''۔

اس دن کے بعد نوردین مجھے آج نظر آیا ہے۔

میں نے پاکستان رائٹرز گلڈ کے ممبر سے نوردین کا تعارف کرایا۔'' یہ ہیں مسٹر این۔ ڈی۔ انصاری۔ بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل۔ اور یہ مسٹر دیوانہ دریا بُردی۔ مشہور شاعر۔ تشریف رکھیے انصاری صاحب۔

نوردین ہمارے پاس پتھر کے بنچ پر بیٹھ گیا۔
میں نے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔''انصاری صاحب، آپ نے تو داڑھی رکھ لی ہے؟ آپ تو داڑھی کے خلاف تھے''۔
انصاری صاحب نے سنجیدہ ہو کر کہا۔''میرے موکلوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں بنیادی جمہوریت کے انتخاب میں حصہ لوں اور میرے ووٹروں نے مجھ سے یہ شرط لگائی کہ جب میں مومنوں کی شکل اختیار نہ کروں، مجھے ووٹ نہیں دیں گے''۔
میں نے حیران ہو کر پوچھا۔''تم بنیادی جمہوریت کے ممبر بھی ہو؟''
اُس نے فخر سے جواب دیا''مجھے بھاری اکثریت سے بنیادی جمہوریت کا نمائندہ چُنا گیا تھا''۔
دیوانہ دریابُردی نے پوچھا۔''مقابلے میں کون تھا''۔
''میرے مقابلے میں سیاست دانوں کی حکومت کے دو وزیر تھے''۔
میں نے پر جوش لہجے میں کہا۔''زندہ باد۔ بہت بہت مبارک باد، بڑا معرکہ مارا!''
انصاری نے جواب دیا۔''شکریہ!''
اور پھر یہ کہہ کر کہ میں ابھی آتا ہوں، وہ ہمارے پاس سے اُٹھ کر کینٹین کی طرف چلا گیا۔
انصاری کے جانے کے بعد دیوانہ دریابُردی اور میں زبان کے مسئلے پر تبادلہ خیالات کرنے لگے۔ میں نے کہا۔''دیوانہ صاحب! مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ زبان موضوع سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ زبان ذریعہ ہے۔ مقصد نہیں ہے۔ راستہ ہے، منزل نہیں ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ کسی وقت زبان موضوع سے زیادہ اہم تھی۔ وہ ہمارے ادب میں غزل کا زمانہ تھا غزل کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ صرف الفاظ ہوتے ہیں۔ غزل کے شاعر کو صرف یہ کہنا ہوتا ہے کہ وہ سات سال کی عمر میں ایک لڑکے یا لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا۔ اب ستر سال ہو گئے ہیں لیکن اس عشق میں کمی نہیں ہوئی۔ اس ایک بات کو ستر ہزار انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ الفاظ! الفاظ! الفاظ! کیوں کہ سات سال کی عمر سے شروع ہو کر ستر سال کی عمر تک قائم رہنے والا عشق انسان نہیں کر سکتا۔ صرف الفاظ کر سکتے ہیں، پھر جب ہمارے پاس کہنے کے لیے اور بھی باتیں پیدا ہو گئیں تو نظم ایجاد ہوئی۔ افسانہ ایجاد ہوا۔ موضوع آگے بڑھ گیا۔ زبان پیچھے ہٹ گئی''۔
دیوانہ دریابُردی نے کہا''کیا پوچھ سکتا ہوں کہ اگر تمہارا تجزیہ درست ہے تو غزل دوبارہ کیوں زندہ ہو گئی ہے؟''
میں نے جواب دیا۔''غزل اس لیے دوبارہ زندہ ہو گئی ہے کہ شاعروں کے پاس اگرچہ کہنے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن وہ کہہ نہیں سکتے۔ صلح کل ہیں، بزدل ہیں، کلرک ہیں''۔
دیوانہ دریابُردی کے چہرے پر دیوانگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اُس نے غصے میں اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔''اب تم پھر ذاتیات پر اتر آئے ہو۔ تم نے ہمیشہ مجھ پر ذاتی حملے کیے ہیں۔ تم میری اور میری غزل کی مقبولیت سے اس قدر جل گئے ہو کہ ہر جگہ میرے خلاف پروپیگنڈا کرتے پھرتے ہو۔ اس وقت تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں کلرک ہوں، اس لیے بزدل ہوں اور غزل اس لیے کہتا ہوں کہ اس پر حکومت کی گرفت نہیں ہو سکتی۔ اور نوکری کو گزند نہیں پہنچتا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں حکومت سے نہیں ڈرتا۔ اگر میں حکومت سے ڈرتا ہوں تو آج میں کلرک نہ ہوتا۔ منسٹر ہوتا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ میں غزل کی محبت میں میٹرک بھی پاس نہیں کر سکا اور تم ادب کے لیے میری اتنی بڑی قربانی کی قدر کرنے کی بجائے مجھ پر طنز کے تیر چلاتے ہو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ غزل اردو ادب کی بہترین صنف ہے......''
میں نے دیوانہ دریابُردی کی لمبی تقریر کا اندازہ لگا کر اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا''۔ غزل اردو شاعری کا ایسٹریکٹ آرٹ ہے جس میں دھوپ کی جڑوں اور گدھے کے سینگوں اور پہاڑ کی مینڈکوں اور ہاتھی کے بیجوں کو کوٹ کر اور کپڑ چھان کر کے مچھلی کے خون میں پکایا جاتا ہے۔ جب تین جوش آ چکتے ہیں تو اس میں گلہریوں کا عرق ڈالا جاتا ہے۔ اس طرح جو قوام تیار ہوتا ہے۔ اس سے ایک حسین و جمیل خاتون کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ اس تصویر کے نیچے صابن دانی رکھ کر اُس کو نمائش میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ جب تماشائی پوچھتے ہیں کہ بھئی یہ صابن دانی کس طرف سے ہے تو ان پر لعنت بھیجی جاتی ہے۔ بالکل یہی حال غزل کا ہے۔ ایک شعر کہنے

کے بعد غزل گو شاعر کے دماغ کا سوئچ آؤف ہو جاتا ہے اور اس پر مکمل نسیان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ بھول جاتا ہے کہ وہ ابھی ابھی کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے ابھی ابھی یہ کہا تھا کہ حضور چائے میں چینی ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ صرف چمچہ ہلا دیجئے، چائے میٹھی ہو جائے گی۔ اور اب وہ یہ کہہ رہا ہے کہ حضور آپ رقیب کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر واپس جا رہے ہیں، میری قبر پر بھی ایک لمحے کے لیے فاتحہ کہنے کو ٹھہر جائیے۔ مردوں کو زندہ کرنے کا کام یا تو صرف حضرت عیسیٰ نے کیا تھا یا اب غزل کر رہی ہے——''

اس کے بعد میری توجہ انصاری کی طرف چلی گئی۔ میں اپنی گفتگو کا سلسلہ قطع کر کے انصاری کو دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ انصاری ایک ایسے شخص کی طرف جا رہا ہے جس کو میں دیر سے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اُسے کہاں دیکھا ہے۔ میں اپنی باتوں کے دوران میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اُس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ لیکن میں اس کو پہچان نہیں سکا تھا۔ اور پھر جب میں دیر تک اسے پہچان نہ سکا تو مجھے خیال آیا کہ میں اُس کو پہچاننے کی کوشش کیوں کر رہا ہوں۔ اور میں نے اُس کو پہچاننے کی کوشش ترک کر دی۔

اب جب میں نے انصاری کو اس کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو میں نے اُس کی طرف پھر غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا کہ اگر انصاری اس شخص کو جانتا ہے تو جب وہ میرے پاس واپس آئے گا۔ تو میں اس سے اس کے بارے میں پوچھوں لوں گا۔

لیکن انصاری نے اُس کے ساتھ کوئی بات نہ کی وہ اُس کے نزدیک سے گذر گیا اور اُن چار آدمیوں کے پاس جا کر ٹھہر گیا جو کینٹین کے سامنے کھڑے چائے پی رہے تھے۔ انصاری بھی اُن کے ساتھ چائے پینے لگا۔

ادھر دیوانہ دریابُردی غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اُس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں تمہارے خیالات زبان اور غزل کے بارے میں نہایت لغو اور لچر ہیں۔ ہم تو تمہارے دوست ہیں۔ لیکن اگر کسی کٹر اردو دان طبقے میں تم نے یہ باتیں کر دیں تو پٹ جاؤ گے''۔

میں نے کہا ''ہاں، میں غزل کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ غزل بوڑھے بچوں کے لیے نرسری رائم کا کام دیتی ہے''۔

میں نے کہا ''ہاں، میں غزل کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ غزل بوڑھے بچوں کے لیے نرسری رائم کا کام دیتی ہے''۔

دیوانہ دریابُردی نے پُوچھا ''نرسری رائم کیا؟''

''نرسری رائم انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ نرسری رائم ایسے اشعار کو کہتے ہیں۔ جن کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میں نثر میں اس کی مثال دیتا ہوں۔ مطلع ملاحظہ ہو۔ چاولوں کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ زمین گول ہے۔ مطلع ثانی ملاحظہ کیجئے۔ مچھلیاں درختوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سمندر میں آگ لگ گئی ہے۔ شعر سنیئے:۔''

نہیں نہیں، میں نہیں سننا چاہتا۔ یہ سراسر بکواس ہے۔ یہ اردو ادب کی توہین ہے۔ خدا کے لیے اردو ادب کا پیچھا چھوڑ دو۔ اور انگریزی میں لکھنا شروع کرو۔''

میں انگریزی میں نہیں لکھ سکتا۔ انگریزی غیر ملکی زبان ہے۔ انگریزی سے میری صرف دوستی ہے۔ اردو سے مجھے محبت ہے''۔

دیوانہ دریابُردی کے چہرے پر تھوڑی سی بشاشت پھیل گئی۔ وہ بولا ''مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی ہے کہ تمہیں اردو سے محبت ہے لیکن انگریزی سے دوستی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ انگریزی زبان ہمیں غلامی سکھانے کے لیے اس ملک میں آئی تھی۔ اب ہماری ذہنیت اس قدر غلامانہ ہو گئی ہے کہ انگریزی ہمیں اپنی دوست معلوم ہوتی ہے۔ اردو سے محبت کرنے والوں کو عربی اور فارسی سے دوستی کرنی چاہیے۔ عربی اور فارسی اردو کے والدین ہیں''۔

میں نے کہا۔ ''اردو کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ عربی اور فارسی کم سے کم ہمارے ہاں تو ادب کی حد تک انتقال کر گئیں۔ یہ ہمارے ماضی کے ادب کی زبانیں ہیں اور ہم حال میں اور مستقبل میں زندہ ہیں''۔

دیوانہ دریابُردی میری گفتگو کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے حقارت آمیز انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور نئی کلفشن کی طرف دیکھنے

لگا۔ وہاں کئی بسیں آ کر کھڑی ہوگئی تھیں۔

اُس نے کہا ''میں پیدل واپس جانے کے موڈ میں نہیں ہو۔ رش ختم ہوگیا ہے۔ چلو بس میں چلیں''۔

میں نے کہا۔ ''میں تو پیدل واپس جاؤں گا۔ آپ چلئے میں بعد میں آ جاؤں گا۔''

لیکن جانے سے پہلے اُس نے ایک آخری بات کہنا اپنا فرض سمجھا۔ ''میں تمہیں ایک دفعہ پھر مشورہ دوں گا کہ اپنی زبان کی طرف توجہ دو بامحاورہ زبان لکھو اور اس میں چٹخارہ پیدا کرو''

میں نے جواب دیا'' مجھے محاوروں اور فارسی ترکیبوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ ایسے محاورے جیسے ناک کا بال ہونا۔ تھوک کر چاٹنا۔ پیشاب میں سے مچھلیاں پکڑنا تو میں برداشت بھی نہیں کر سکتا اور زبان کا چٹخارہ میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ میں نے اردو زبان میں چٹخارہ کہیں نہیں دیکھا۔ رہی یو۔ پی کی اردو، تو وہ موجودہ اردو کی نانی تھی۔ وہ دلی میں پیدا ہوئی۔ لکھنؤ میں جوان ہوئی اور حیدر آباد دکن میں فوت ہوگئی۔ اُس کی اکلوتی لڑکی نے پنجاب کے ایک گھبرو جوان سے شادی کر لی، جو مکئی کی روٹی اور ساگ کا دلدادہ تھا۔ اسی طرح اردو سادہ ہوگئی اور بناوٹوں سے پاک ہوگئی۔ میں تو جو بات کہنا چاہتا ہوں، اُس کو چبائے بغیر دوسرے کے سامنے پھینک دیتا ہوں''۔

دیوانہ دریا بُردی پھر طیش میں آ گیا اور بنچ پر بیٹھ گیا اور زور زور سے بولنے لگا۔ ''تم نے ہمارے کلاسیکی ادب کی توہین کی ہے میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ اگر تم ادب میں زندہ جاوید رہنا چاہتے ہو تو ہمارے کلاسیکی ادب کا مطالعہ کرو''۔

میں نے جواب دیا۔ ''تخلیقی کام کرنے والوں کو کلاسیکی ادب کے مطالعے کا وقت کہاں ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادب کا مطالعہ ادبی مورخوں کا کام ہے۔ جو بعد میں ترقی کر کے ادبی نقاد بن جاتے ہیں اور ادیبوں کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ تخلیقی کام ہول ٹائم جوب ہے تخلیق صرف تخلیق کی اجازت دیتی ہے۔ کسی دوسرے کام کی اجازت نہیں دیتی۔ تخلیقی ادیب اگر تخلیق کے علاوہ کوئی اور کام مثلاً کلاسیکی ادب کا مطالعہ وغیرہ بھی کر سکتے ہوں تو اسی نسبت سے ان میں تخلیقی قوتیں کم ہوتی ہیں۔ تخلیقی ادب پیدا کرنے والوں کا ماضی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کے مطالعے کا میدان حال اور مستقبل میں پھیلا ہوا ہے اور اتنا وسیع اور سرسبز اور خوشگوار میدان ہے کہ اس کو چھوڑ کر کلاسیکی ادب کے تاریک اور بدبودار ریکارڈ روم میں جھانکنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ آپ اپنی مثال لیجئے۔ آپ نے کلاسیکی ادب کا اتنا مطالعہ کیا ہے، اتنا مطالعہ کیا ہے کہ آپ صرف غزل کے قابل رہ گئے ہیں۔''

دیوانہ دریا بُردی کی دیوانگی کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ پہلے پیلا ہوا، پھر سُرخ ہوگیا اور پھر نیلا ہوگیا اور قریب تھا کہ وہ اپنے کلاسیکی ادب کی پوری طاقت سے مجھ پر حملہ کر دیتا کہ سرخ رنگ کی ایک خوبصورت کار ہمارے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ اور اس میں سابق آرٹسٹ رمزی نے نکل کر مجھے کہا۔

''ہیلو کمانڈر''۔

میرے بےلوث عزیز دوست جو تعداد میں بہت کم ہیں مجھے بڑے پیار سے بڑے پرخلوص لہجے میں کمانڈر کہتے ہیں۔ اور ان کا مطلب ہوتا ہے کہ تم کمانڈر شانڈر کچھ نہیں ہو۔ ہمارے دوست ہو۔ ہمارے پاس بیٹھو۔ ہمارے ساتھ باتیں کرو۔ لیکن جب سابق آرٹسٹ رمزی یا ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری یا پروفیسر ممتاز حسین مجھے کمانڈر کہتے ہیں تو ان کا مطلب ہوتا ہے کہ میاں تم افسانہ نگار وغیرہ کچھ نہیں ہو تم صرف کمانڈر رہو۔ اپنا کام کرو۔

اب سابق آرٹسٹ رمزی سے تو مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور پروفیسر ممتاز حسین کے خلاف میں نے جوابی حملوں کا انتظام کر لیا ہے۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں آئندہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو صرف ڈاکٹر کہوں گا اور پروفیسر ممتاز حسین کو صرف پروفیسر اس طرح بہت سے لوگ ڈاکٹر سے مویشیوں کا ڈاکٹر سمجھیں گے اور پروفیسر سے پروفیسر کوکب یا پروفیسر سامری۔ اور اگر وہ پھر بھی باز نہ آئے تو پھر میں ایک دن اُن کے سامنے کھڑا ہو کر اعلان کر دوں گا کہ میں بغیر کسی شک و شبہ کے ایک مکمل مکمل افسانہ نگار ہوں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میں تنقید نگار نہیں ہوں۔

میں نے آرٹسٹ رمزی کو سابق آرٹسٹ کہا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آرٹسٹ رمزی مصور ماضی ہے اور وہ ہمارے

ماضی کے آرٹ کا نمائندہ ہے۔ جس طرح چغتائی آرٹ۔ چغتائی آرٹ ماضی کا آرٹ ہونے کے باوجود حال اور مستقبل کا آرٹ بھی ہے۔ کیونکہ وہ زندہ جاوید ہے۔ سابق آرٹسٹ رمزی سے میری مراد یہ ہے کہ وہ کسی وقت میں آرٹسٹ ہوتا تھا اب وہ موٹروں کا دلال ہے۔

رمزی نے خوبصورت سرخ کار میں سے نکل کر کہا۔ ''ہیلو کمانڈر!'' ---- ہیلو دیوانے''

دیوانہ دریا بُرد دی نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''دیوانے نہیں۔ دیوانہ دریا بُرد دی!''

رمزی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''حضرت دیوانہ دریا بُرد دی، آپ کے تخلّص کے ساتھ یہ بڑی ٹریجڈی ہے کہ گفتگو میں اور سٹیٹمنٹ میں دیوانہ اکثر دیوانے بن جاتا ہے۔ مثلاً دیوانے نے غزل پڑھی۔ دیوانے نے حجامت کروائی۔ اگر کہا جائے۔ دیوانہ نے غزل سنائی اور دیوانہ نے حجامت بنوائی تو یہ غلط گرامر ہے''۔

پھر رمزی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''کمانڈر یہ کار پسند ہے، بڑی سستی مل رہی ہے۔ ٹیسٹ کر رہا ہوں۔ اچھی سروس دے رہی ہے۔ پندرہ میں مل جائے گی''۔

میں نے کہا۔ ''جناب میرے پندرہ ہزار روپے کہاں ہیں''۔

اُس نے مشورہ دیا۔ ''اچھا یہ کار خرید لیتا ہوں۔ تم دس میں میری کار خرید لو۔ او کے چیریو''۔

اس نے کار سٹارٹ کر لی۔

دیوانہ دریا بُرد دی نے جلدی سے کہا'' ۔ بھئی۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔

سابق آرٹسٹ رمزی اور دیوانہ دریا بُرد دی چلے گئے۔

اچھا ہوا میں اکیلا رہ گیا کچھ دیر پہلے ٹیڈی لڑکیوں کا ایک غول آیا۔ میں اُن کو غور سے دیکھنا چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی اپنے ٹیڈی ڈریس کے باوجود بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک سُوٹ کیس تھا۔ اس سوٹ کیس کے بُوجھ سے اُس کے جواں سال جسم کے سڈول حصوں میں قیامت کا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ اُس کے تنگ لباس کو پھاڑ کر باہر نکلے پڑتے تھے۔

لیکن کیا میں اُس لڑکی کو دیکھ رہا تھا؟

نہیں میں اُس ٹیڈی گرل کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں اُس سوٹ کیس کو دیکھ رہا تھا جو اُس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ لڑکیاں کلفٹن کے ساحل سے پکنک کر کے آئی تھیں اور اسی سوٹ کیس میں غالباً ان لڑکیوں کے سوئمنگ سوٹ بند تھے۔ پھر میں اس سوٹ کیس کو غور سے کیوں دیکھ رہا تھا۔

یکا یک اس سوٹ کیس میں اور اس شخص میں رشتہ پیدا ہو گیا جس کو میں دیر سے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اُس کو پہچان لیا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے مجھے سوٹ کیس دیا تھا۔

میں لاہور کے ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا میری پکچر فیل ہو گئی تھی۔ پروڈیوسر نے میرا معاوضہ دینے سے صاف انکار کر دیا تھا میرے پاس ہوٹل کا بل ادا کرنے اور کراچی کے ٹکٹ کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ اُس دن شام کو یہ شخص میرے پاس آیا۔

اس نے کہا۔ ''میں آج کراچی جا رہا تھا۔ لیکن کسی خاص وجہ سے مجھے یہاں رکنا پڑ گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کراچی جا رہے ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو آپ میری جگہ اس ٹکٹ پر سفر کیجئے۔ یہ لاہور سے کراچی تک سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ ہے۔ اور یہ ایک ہزار روپیہ آپ کے ضروری اخراجات کے لیے ہے۔ اس سفر کو ملتوی کرنے میں ہماری فرم کا لاکھوں کا نقصان ہے''۔

اس نے ٹکٹ اور ایک ہزار روپے کے نوٹ میرے سامنے میز پر رکھ دیئے اور اُٹھ کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا جاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''اب میں آپ سے رات کے دس بجے پلیٹ فارم پر ملوں گا۔ ایک آدمی ایک سوٹ کیس لائے گا۔ میں اس کو آپ کے کمپارٹمنٹ میں رکھوا دوں گا۔ کراچی سٹیشن پر اسی قسم کا ایک آدمی آ کر یہ سوٹ کیس اٹھا کر لے جائے گا آپ ان دونوں آدمیوں سے کوئی بات نہ کیجئے اور اگر راستے میں اس سوٹ کیس کے بارے میں کوئی تفتیش ہو جائے تو آپ کہیں گے کہ یہ سوٹ کیس آپ کا

نہیں اور ہم دونوں کے بارے میں آپ مکمل لاعلمی ظاہر کریں گے''۔

اس کی جلدی نے اور میری مالی حالت نے مجھے سوچنے کا موقعہ نہ دیا۔

اچھا! یہ ہے وہ آدمی!

سامنے سے این۔ڈی۔ انصاری آتا ہوا نظر آیا۔ اُس کے ساتھ ہی سفید ریش بوڑھا تھا جو میں نے جونا مارکیٹ میں مسجد سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ اُس نے میلے ملیشیا کے کپڑے پہنے ہوئے تھے لیکن اُس کا جوتا نیا نہیں تھا۔

این۔ڈی انصاری نے تعارف کرایا۔''ان سے ملئے یہ مغربی پاکستان میں سب سے بری جیب تراش ہیں۔

پھر اُس نے بوڑھے سے مخاطب ہو کر کہا۔''فرہاد خان، ان کا بٹوا اور پین دے دو''۔

فرہاد خان نے میرا بٹوا اور پین دے دیا۔ میرا بٹوا عید کی نماز کے بعد مسجد سے نکلتے ہوئے ہجوم میں گم ہو گیا تھا اور پین بس میں کسی نے نکال لیا تھا۔

انصاری نے کہا۔''فرہاد خان، اب تم جاؤ''۔

فرہاد خان چلا گیا۔ انصاری میرے پاس بیٹھ گیا۔

میں نے کہا۔''انصاری، یہ کیا''

اُس نے جواب دیا۔''جس دن فرہاد خان نے آپ کا بٹوا اور پین نکالا ہے۔ گینگ کے ساتھ میری ڈیوٹی تھی یہ چیزیں اُسی دن سے میرے پاس محفوظ پڑی تھیں پچھلی دفعہ جب آپ کی مجھ سے ملاقات ہوئی ہے میں آپ کو یہ بتانے کی جرأت نہ کر سکا کہ آپ کی چوری میرے سامنے ہوئی پھر جب آپ نے مجرموں کی زندگی سے دلچسپی کا اظہار کیا تو یہ میرے لیے آسان ہو گیا''۔

میں نے کہا۔''پھر تم نے پچھلی ملاقات میں یہ چیزیں واپس کیوں نہ کیں؟''

''اس وقت آپ کے بٹوے کے پیسے مجھ سے خرچ ہو گئے تھے۔ آج آپ کو یہاں دیکھ کر میں یہ چیزیں ابھی ابھی لے کر آیا ہوں''۔

میں نے دیکھا کہ انصاری کے ذہن پر یہ باتیں گراں گذر رہی ہیں۔ اس لیے میں نے موضوع بدل دیا۔ میں نے کہا''اب میں سمجھا کہ تم نے اپنی صورت کیوں بدل رکھی ہے''۔

اُس نے کہا۔''بنیادی جمہوریت کا نمائندہ چنا جانے کے بعد میں اپنی اصلی صورت کی طرف واپس آنے ہی والا تھا کہ ہماری یونین میں تنسیخ عائلی قوانین کمیٹی قائم ہو گئی اور مجھے اس کا صدر چن لیا گیا۔ چنانچہ مجھے اپنی موجودہ ہیبت جاری رکھنی پڑی مجھے عائلی قوانین کے خلاف تقریریں کرنی پڑتی ہیں اور ان کی مذمت میں عورتوں کے جلوس تنظیم دینے پڑتے ہیں، اس میں رشوتوں کے علاوہ یہ ہیئت کذائی بھی بہت کام آتی ہے''۔

''ارے نوردین، تم عائلی قوانین کے خلاف بھی کام کر رہے ہو۔ یہ تو بڑی حماقت ہے۔ عائلی قوانین عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے بنے ہیں''۔

''مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ یہ قوانین سب عورتوں کی حفاظت نہیں کرتے۔ ان عورتوں کو ان قوانین سے سخت نقصان پہنچا ہے جن میں کوئی نہ کوئی نمایاں نقص ہو ان بیچاریوں کی شادیاں صرف ان مردوں سے ہو سکتی ہیں جن کی پہلے شادیاں ہو چکی ہوں۔ عائلی قوانین نے ان کی شادیوں کے چانس بالکل ختم کر دیئے ہیں۔ چنانچہ میں اس وقت تک ایسی عورتوں کے چالیس جلوس نکلوا چکا ہوں۔ ان میں وہ عورتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں جن کے شوہروں نے چار چار شادیاں کر رکھی ہیں۔ کیونکہ وہ چاہتی ہیں کہ وہ مصیبت میں پھنسی ہیں تو سب مصیبت میں پھنس جائیں''۔

میں نے کہا۔''میں ہرگز ماننے کے لیے تیار نہیں کہ عائلی قوانین نے کسی کو نقصان پہنچایا ہے۔

اُس نے کہا۔''مجھے پہنچایا ہے میرا ایک مالدار بوڑھی عورت سے دوسری شادی ہونے ہی والی تھی کہ عائلی قوانین آ گئے۔ اور میرا دولت مند ہونے کا چانس مارا گیا۔ اور اس عورت کا شادی کا چانس مارا گیا۔ اب ادھر وہ عورتوں کو عائلی قوانین کے خلاف

بھڑ کا رہی ہے۔ اِدھر میں آدمیوں کو ان کے خلاف اُکسا رہا ہوں۔ اور اس سلسلے میں ہم دونوں کے لیڈری کے چانس بھی چمک اُٹھے ہیں''۔
یکا یک کالے رنگ کی ایک بہت بڑی چمکدار کار کے ہارن نے سب کو چونکا دیا۔ وہ کار تقریباً درمیان میں آ کر رک گئی۔ اُس کار میں ایک لمبا تڑنگا شاندار آدمی نیلے رنگ کے سوٹ میں اور گہرے رنگ کا چشمہ لگائے باہر نکل کر کار کے پاس کھڑا ہوگیا۔ اور ہجوم کو غور سے دیکھنے لگا۔
انصاری پر سکتے کا عالم طاری ہوگیا۔ وہ دیر تک نیلے سوٹ والے آدمی کو دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔
آخر میں پوچھا۔ ''انصاری کیا بات ہے؟''
انصاری چپ چاپ نیلے سوٹ والے آدمی کو دیکھتا رہا۔
میں نے پھر پوچھا۔ ''کیا بات ہے انصاری؟''
انصاری نے اِدھر اُدھر دیکھا اور نہایت مدھم آواز میں مجھ سے بولا۔ ''آج یہاں بڑے خوفناک واقعات پیش آنے والے ہیں''۔
''کیا؟''
''قتل!''
''کس کا؟''
''زیادہ سوالات مت کیجئے''۔
''یہ کون ہے؟''
''گینگ کا سردار''۔
میں نے اٹھ کر کہا۔ ''میں جا رہا ہوں''۔
اُس نے اُسی رازدارانہ مدھم آواز میں کہا۔ ''نہیں آپ کو آج رات کی گاڑی سے پشاور جانا ہے۔ ایک آدمی سٹیشن پر ایک سوٹ کیس لے کر آئے گا۔ ایسا ہی ایک آدمی اس کو پشاور سٹیشن پر اتار لے گا۔ دونوں آدمیوں سے کوئی بات نہ کیجئے۔ راستے میں سوٹ کیس کے بارے میں کوئی تفتیش ہوجائے تو کہیے کہ سوٹ کیس آپ کا نہیں''۔
میں گھبرا گیا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''انصاری نہیں مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔ مجھے جرائم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں مجرموں کی زندگی کا مطالعہ نہیں کرنا چاہتا''۔
اور میں اُٹھ کر جلدی جلدی نئی کلفٹن کی طرف چل پڑا۔

ooo

اے حمید

دیوداسی، گلاب اور دریا

دریائے کرنافلی بہہ رہا تھا۔

اور میں سندر بن کے گنجان جنگل میں سنبل کے ایک درخت کے ساتھ لگا، روپا کی راہ دیکھ رہا تھا۔ لیکن میں روپا نہیں آئی تھی۔ اور شاید اب وہ کبھی نہ آئے۔ ڈاک بنگلے میں جب میں نے آرٹسٹ دوست کو روپا کی کہانی سنائی تو اس نے اپنا چینٹ میز پر رکھ کر حیرانی سے مجھے دیکھا۔

''شاید تم نے کوئی خواب دیکھا ہے؟''

لیکن میں نے خواب نہیں دیکھا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ پام اور ناریل کی چھاؤں میں چھپے ہوئے درگا دیوی کے قدیم مندر کی سیڑھیوں پر ایک سندر لڑکی ماتھے پر تلک لگائے، شانوں پر سیاہ کالے بال بکھرائے، ہاتھ میں پیتل کی تھال میں روپل کی کلیاں سجائے ملے۔ میری طرف مسکرا کر دیکھے اور مجھے اپنے پیچھے چلے آنے کا اشارہ کرے اور پھر اگلی صبح کو وہاں کچھ بھی نہ ہو۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے پہلی بار ڈوبتے سورج کی روشنی میں مندر کی سیڑھیوں پر دیکھا تو اس نے گیروے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی اور اس کے صندلیں شانے کھلے تھے اور سیاہ بالوں کے مہک بھرے سائے اس کی کمر پر لہرا رہے تھے۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور منہ موڑ کر مندر کی طرف چلی گئی تھی اور مجھے راگ مالکونس کی قدیم استھائی یاد آ گئی۔

مکھ موڑ موڑ مسکات جات
کیسی رسیلی نار کر سولہ سنگار
مکھ موڑ موڑ مسکات جات

اور پھر جب میں نے مندر کے تاریخی ہال کمرے میں قدم رکھا تو ایک پتھریلے استھان پر اسی دیوداسی کی مورتی تھی اور دیوار گیر میں شمع جل رہی تھی جس کی سنہری روشنی میں دیوداسی کے رخسار سرخ گلابوں کی طرح جل رہے تھے۔ پھر اس نے مورتی کے آگے روپل کی کلیاں رکھیں۔ دوزانو ہو کر بیٹھ گئی اور ہاتھ جوڑ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور کبیر کا یہ بھجن گایا۔

نین بھرے تری اور
کیوں لیو مکھ موڑ سجنوا
نین بھرے تری اور

میرے نین بھی دیوداسی کی طرف تھے اور اس نے منہ پھیر لیا تھا اور آنکھیں بند کرلی تھیں اور پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ آنسوؤں سے تر تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے کنول کے پھول کرنافلی دریا کی لہروں سے بھیگ کر نکلے ہوں۔ پھر وہ آہستہ سے اٹھ کر میرے پاس آئی اور سامگری سے چندن لے کر اس نے میرے ماتھے پر ٹیکا لگایا اور مسکرائی۔ شمع کی روشنی میں اس کے دانت گولکنڈہ کے موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ پھر اس نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے مندر کے دوسرے ایوان میں لے گئی۔ اس ایوان میں دیواروں پر ہزاروں برس پرانی دیوداسیوں کے مجسمے کندہ تھے اور ہر زاویے میں رقص کا ایک روپ تھا۔

میں نے اس دیوداسی کی مورتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میری آج سے ہزاروں برس پہلے کی مورتی ہے اور میں نے حیرت کے عالم میں دیوداسی کی مدھ بھری سیاہ بھونرا آنکھوں کی طرف دیکھا۔ مجھے ان آنکھوں کی تاریک اور روشن گہرائیوں میں مہاکال اور قدیم عہد کے کئی روپ بنتے بگڑتے دکھائی دیے اور میرے عقب میں کرنافلی دریا کی لہروں کا سنگیت تیز ہو گیا اور جنوبی سمندروں سے آنے والی تیز اور مرطوب ہواؤں میں پام کے درخت اور ناریل کی ڈالیوں نے زور زور سے جھومنا شروع کردیا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مندر کی فضا

ملکوتی سنگیت سے بھر گئی ہے اور دیوار کی ایک ایک مورتی نیم روشن موسیقی بھری فضا میں رقص کر رہی ہے، گھنگروؤں کی آواز، مردنگ کے توڑوں اور ستاروں کی جھنکار میں دیوداسی خود بھی رقص کا ایک شعلہ بن گئی ہے جو بے قرار ہو کر میری طرف لپک رہے ہے۔

پھر جیسے یہ خواب سا ٹوٹ گیا۔ کرنافلی دریا کی لہریں سکون پر آ گئیں اور شمع کی دھیمی دھیمی روشنی میں دیوداسی نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے مندر سے باہر لے آئی۔ مندر کی سیڑھیوں پر اس نے گلاب کا سرخ پھول مجھے دیا اور یہ کہہ کر مندر میں واپس چلی گئی۔

''کل ضرور آنا میں انتظار کروں گی''

اور پھر جب کل میں اپنی سیاہ مدھ بھری آنکھوں والی دیوداسی سے ملنے سفید گلاب کا پھول ہاتھ میں لے کر مندر کی سیڑھیوں پر گیا تو وہاں گھاس اگی ہوئی تھی۔ مندر کی دیواریں شکستہ ہو رہی تھیں۔ مندر کی پتھریلی دہلیز جنگل اور خودرو جھاڑیوں میں چھپ گئی تھی۔ چھتوں میں کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ ایک گلہری میرے پاؤں کے اوپر سے کود کر سال کے قدیم درخت پر چڑھ گئی۔

مندر ویران تھا اور دو ہزار برس پرانی تاریخ کے کرم خوردہ اوراق کی داستان دہرا رہا تھا۔ نہ وہاں کوئی مورتی تھی اور نہ دیوداسی۔ مندر کے ہال میں گہرا اندھیرا اور سیلن تھی۔ میں نے دیا سلائی جلائی اور اس کے روشنی میں مجھے وہی دیوداسی اپنی مدھ بھری آنکھیں جھپکاتی مسکراتی نظر آئی۔ میں مندر سے باہر نکل آیا۔ میرا آرٹسٹ دوست کہتا ہے کہ میں نے کوئی خواب دیکھا ہے اور میں اس پرانے سنبل کے درخت کے نیچے کھڑا اپنی دیوداسی کا انتظار کر رہا ہوں اور کرنافلی دریا بہہ رہا ہے۔ یہ دو ہزار سال تک بہتا جائے گا۔ اور میں دو ہزار سال تک دیوداسی کا انتظار کروں گا۔

○○○

حجاب امتیاز علی

صنوبر کے سائے

میں جب سے ان پہاڑی علاقوں میں آئی تھی "نہر روحناک" کی رعنائیوں کا ذکر ہر خاص و عام سے سنتی تھی، لوگ کہتے، اس کے صنوبر کے سایوں سے ڈھپے ہوئے کناروں پر سہانے خوابوں کی رومان جھلملاتی ہے۔ پہاڑی خانہ بدوشوں کا بیان تھا کہ نامعلوم پہاڑوں کی بلندیوں نے ایک مقام پر آسمان کے نیل میں شگاف کر رکھا ہے اور روحناک کی نیلی دھاروہیں سے اترتی اور کوہساروں میں سے ہرتی پھرتی اس وادی میں ایک ندی بن کر آنکلیت ہے۔

بھلا آپ غور کیجئے۔ ان رومانی فقروں کو سن کر مجھ جیسی سیر و سیاحت کی دلدادہ سے کب نچلا بیٹھا جا سکتا تھا؟

ایک دن میں نے اپنی محبوب سہیلی جسوتی سے مچل کر کہا "جسوتی ہمیں یہاں آئے دو ہفتے گزر چکے۔ مگر ہم نے نہر روحناک کی سیر اب تک نہیں کی۔ تم پسند کرو تو آج شام کشتی کی سیر کو چلیں۔"

جسوتی کو آپ جانتے ہیں۔ سفید چہرے والی سلیم الطبع لڑکی ہے۔ اس سفر میں، میں اسے اپنے ساتھ تقریباً کھینچ کر لائی تھی۔

اس نے مسکرا کر کہا "جیسی تمہاری مرضی روحی، لیکن پانی سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

اسی وقت جسوتی کے ایک محبوب حبشی نژاد خانہ زاد نے کہا "خاتون میں نے سنا ہے ساحل روحناک پر ایک مشاق سو سال کا بوڑھا ملاح رہتا ہے۔ اس کی کشتی کبھی لہروں پر ڈگمگاتی۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسی ملاح کی کشتی کرائے پر لے لی جائے۔"

میں نے بے پروائی سے کہا "کوئی ملاح اور کوئی کشتی ہو۔"

جسوتی کہنے لگی "سو سال کا ملاح، خاک کشتی چلاتا ہوگا۔"

خانہ زاد نے کہا۔ "خاتون سنا ہے وہ ستر سال سے کشتی پانی کرتا ہے، اور آج تک اس کی کشتی کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔"

غرض اسی وقت ہم نے اسے کشتی کرایہ پر لینے اور شام کی چائے کا انتظام کشتی ہی میں کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ جب ہم دونوں اس مقام پر پہنچے۔ جہاں سے سیاح، روحناک کی سیر کے لیے پانی کا سفر شروع کرتے ہیں تو ہم نے دیکھا، کہ ایک سرخ اور نیلے رنگ کا مرصع شکارا ہمارے انتظار میں ہے۔ اس کے موتیوں کے کانپتے ہوئے پردوں میں سے ایرانی قالین پاروں پر رکھے ہوئے خوش وضع اور خوش قطع تکیئے دعوت استراحت دے رہے تھے۔

میں نے مسکرا کر جسوتی سے کہا۔ "یہ "خلیفہ بغداد کا محراب" تفریح معلوم ہوتا ہے۔"

اندر آرام سے نیم دراز ہونے کے بعد ہم نے مڑ کر کشتی چلانے والے کو دیکھا۔ ایک پیر صد سالہ کشتی کے پرلے سرے پر چپو ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سفید لمبی داڑھی کے بال ہلکی ہلکی ہوا سے کانپ رہے تھے۔ پرانی آنکھوں میں زندگی کی تابانی و درخشانی نہ تھی۔ بلکہ...... جیسے ایک دھند میں سے ماضی کی حسرت دیدار چمکتی نظر آ رہی تھی۔

حبشی خانہ زاد نے چائے تیار کر رکھی تھی۔ ہم گرم گرم چائے کے خوشگوار گھونٹ حلق سے اتارتے دھیرے دھیرے روحناک کی طرف جا رہے تھے۔ جس کے نیل پر غروب آفتاب مچل مچل کر شباب پاشی کر رہا تھا۔

منظر بتدریج وارفتہ سا ہوا جا رہا تھا۔ ہواؤں میں نکہت بڑھ رہی تھی۔ پانی کی چھوٹی چھوٹی لہروں کی آواز پر شبہ ہوتا تھا۔ جیسے کہیں دور خواب کے جزیرے میں پانی برس رہا ہو، فطرت اپنی بے ساختہ رعنائیوں کا دامن پھیلائے ہمارے سامنے تھی۔ ایک تصویر جس میں ڈھلتے ہوئے سورج کا ہر لحہ نئے انداز سے رنگین موقلم کی شعبدہ بازیاں دکھا رہا تھا۔ اے اللہ! سچ مچ وہ خواب کی سرزمین تھی، رومان کا جزیرہ تھا۔ سیدھے اور تناور صنوبر، جیسے دم بخود کھڑے تھے، اور ان کے درمیان سے کہیں پھولوں سے ڈھنپی ہوئی ڈھلوانیں نظر آتیں۔ کہیں ایک اچھوتے نور میں نہائے ہوئے ہرے نیلے اور کہیں افق کے سحاب پاروں میں کھوئے ہوئے

کہسار۔

ہم چپ تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا، ہم کتنی دور نکل گئے، اور ہمارے شکارے کو چلنے کتنا وقت ہو گیا۔

یکا یک حبشی خانہ زاد کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

''جناب واپس چلئے۔ آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پانی کے راستوں پر ہم بھٹک جائیں۔''

بوڑھے ملاح نے ایسے چہرے سے، جس پر مسکراہٹ کا شبہ ہو سکتا تھا کہا۔ ''راہ سے بھٹکنا ناممکن ہے۔ میں ساٹھ ستر سال سے ان آبی راستوں کا عادی ہوں۔''

میں ذرا دیر چپ چاپ ملاح کا چہرہ تکتی رہی۔ جس پر زندگی کے گرم و سرد نے طرح طرح کی جھریاں ڈال رکھی تھیں۔ پھر پوچھا ''گویا تم قریب قریب ایک صدی سے یہاں رہتے ہو؟''

''جی ہاں''

''تمہارا مکان کہاں ہے؟''

''مکان کہیں نہیں...... صنوبر کے ان سایوں تلے پڑ رہتا ہوں......''

مجھے محسوس ہوا۔ یہ کہتے ہوئے اس کے ضعیف سینے نے اک آہ بھری ہے۔

''صنوبر کے سایوں تلے'' میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''بے پناہ گرمی اور لرزا دینے والی سردی، تمہیں زندگی سے بیزار نہیں کرتی۔ اس کا تمہارے پاس کیا علاج ہے؟''

''علاج؟'' اس نے ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''میرے پاس پرانی یادیں ہیں جس کے پاس کوئی یاد نہ ہو۔ اس پر کسی موسم کا اثر نہیں ہوتا۔'' میری دلچسپی یکلخت بڑھ گئی۔ ''تمہارا ماضی تو افسانوں سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔''

مگر بوڑھے نے میری بات کی طرف توجہ نہ دی۔ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔ ''مجھے صنوبر کے سایوں تلے رہنا پسند ہے۔ مجھے ان سایوں سے چند گھنٹے کی مفارقت بھی شاق گزرتی ہے۔ جب ہی تو میں شہر میں مزدوری کرنے نہیں جاتا۔ میں ان سایوں تلے کشتی لیے ادھر ادھر پھرتا رہتا ہوں۔''

''کیا تم ہمیں اس راز سے آگاہ کر سکو گے کہ صنوبر کے سایوں سے تمہیں کیوں عشق ہے؟'' میں نے التجا کے لہجہ میں پوچھا۔

''یہ کوئی راز نہیں۔'' اس نے دم توڑتے ہوئے سورج کے مقابل ایک سیاہ تصویر بن کر کہا۔ ''سبھی جانتے ہیں کہ مجھے صنوبر کے سایوں سے کیوں محبت ہے اور کیوں میں اپنی زندگی کے آخری سانس ان کے نیچے ختم کرنا چاہتا ہوں۔''

جسوتی اور میں کہنیاں تکیوں پر رکھ کر متوجہ ہو گئیں کشتی بہاؤ پر جا رہی تھی۔ بڈھا چپو ہاتھ میں تھامے بے پروائی سے اپنی کہانی کہہ رہا تھا۔

(۳)

آج سے ستر سال پہلے کا ذکر ہے۔ کہ دنیا میری نظروں میں جوان تھی۔ زندگی کی ہر ہر کروٹ میں ہزاروں ہی دلفریبیاں محسوس ہوتی تھیں۔ میں غریب ملاح نہ تھا۔ ان پہاڑی علاقوں کا خوشحال تاجر تھا۔

بہار کے موسم میں ایک دن شام کے آسمان پر سنہرا چاند ہنس رہا تھا۔ جب میں اسی روحناک کے ساحل پر انہیں صنوبر کے سایوں تلے چہل قدمی کے لیے نکل آیا۔

میری نظر پہاڑی حسن کے ایک نادر نمونہ پر پڑی...... ایک کمسن لڑکی پر، جو صنوبر کے سائے تلے ایک سبز پتھر پر بیٹھی ایک ٹوکری بن رہی تھی۔ مجھ سے تفصیل کی رنگینی نہ مانگئے۔ رات کا اندھیرا اتر آئے گا۔ سمجھ لیجئے میں خود وہاں نہ آیا تھا۔ مجھے وہ قوت وہاں کھینچ لائی تھی۔ جو ہر نوجوان کے دل کو زندگی کے پھولوں کے درمیان کشاں کشاں لیے پھرتی ہے۔

ہم میں محبت شروع ہو گئی۔ ہم شباب کی ایک رنگین وادی میں باہم محبت کرنے لگے۔ ہم ہر روز انہیں صنوبر کے کانپتے ہوئے سایوں تلے ملتے اور اپنی آرزوئیں ایک دوسرے کے دھڑکتے ہوئے دل سے کہتے۔ بہت جلد ہماری شادی ہو گئی۔''

اسی وقت اچانک صنوبر کے درخت پر سے ایک ناشاد بلبل کی ایک چلائی۔ بوڑھے نے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر لرز کر کہا۔
''یہ دیوانہ پرند کیا کہہ رہا ہے؟ یہی نا؟ کہ محبت بہت ظالم چیز ہے۔''
جسوتی نے مجھے اور میں نے جسوتی کو چپ چاپ دیکھا۔ اس بوڑھے دل میں یقیناً کبھی شعر کے چشمے ابلتے رہے تھے۔ بوڑھے نے چند ہاتھ چپو کے چلائے اور ایک آہ بھر کر بولا۔
''شادی کے بعد چھ مہینے نہایت سنہرے گزرے، پھر ایک نحس خواب نے ہماری زندگی کا رخ پلٹا دیا۔
ایک صبح جونہی میری بیوی نے تکیئے پر نیند سے آنکھیں کھولیں۔ اداس لہجے میں بولی۔'' میں نے ایک ہولناک خواب دیکھا ہے۔''
میری محبت کی نظروں نے اس سے پوچھا۔'' کیا خواب؟۔''
بیوی نے آہ کھینچ کر کہا۔'' میں نے رات تقدیر کے فرشتے کو دیکھا، جو پہاڑوں کی بلندیوں پر اپنے پر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے رات تک اپنے بالوں میں ایک کاسنی رنگ کا گلاب نہ سنوارا تو تمہارا گھر اجڑ جائے گا۔''
آج سے ستر سال پہلے دنیا بہت اوہام پرست تھی۔ چنانچہ بیوی کا یہ ہولناک خواب سن کر میرا عشق سہم گیا۔ میری پریشانی دیکھ کر بیوی بولی۔'' پراتنے فکر کی کیا بات؟''
میں نے کہا۔'' فکر کیسے نہ ہو؟ شریں ترین! کیا تجھے نہیں معلوم کہ کاسنی رنگ کا گلاب ان پہاڑوں میں نایاب ہے؟''
میری بیوی کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔'' ایا ب؟ پھر کیا کرو گے؟ کاسنی رنگ کا گلاب آج رات تک بالوں میں لگانا ضروری ہے۔ ورنہ ہمارا یہ مسکراتا ہوا گھر تباہ ہوجائے گا۔ فرشتے نے یہی کہا تھا۔''
نامعلوم اندیشوں سے گھبرا کر وہ رونے لگا۔'' میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا اور وعدہ کیا کہ اطراف کے علاقوں کے تمام باغوں میں، شہر کے باغبانوں کو بھیجوں گا اور تاکید کروں گا کہ کسی نہ کسی طرح اسے دستیاب کر کے کاسنی رنگ کا ایک گلاب لے آئیں۔''
میری بیوی اپنے لمبے لمبے بال کھول کر نہانے کے لیے چشمے پر چلی گئی۔ تا کہ گلاب کے آنے سے پہلے بال سنوار لے۔
میں پریشانی کے عالم میں اسی وقت کاسنی گلاب کی تلاش میں نکل گیا۔ شہر کے ہر باغبان سے ملا مگر ایک ایک نے کہا کہ اس علاقے میں کاسنی رنگ کا گلاب کہیں نہیں مل سکتا۔ بیزار اور مایوس ہو کر میں حاکم شہر کے باغبان کے ہاں گیا۔ اپنی ضرورت اس کے آگے کہی۔ وہ بڑا ہی سفاک آدمی تھا۔ سوچ کر بولا۔'' کاسنی گلاب ہمارے باغ میں ہے تو۔ پر اس کی قیمتی چھ اشرفی سے کم نہیں۔''
میں نے چھ اشرفیاں اس کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ اور کاسنی گلاب لے کر خوش خوش گھر پہنچا۔
میری بیوی کاسنی گلاب دیکھ کر باغ باغ ہوگئی اور مسکرا کر بولی۔'' اگر آج میں کاسنی گلاب بالوں میں نہ سنوار سکتی تو جانے ہم پر کیا مصیبت آتی۔''
میں نے کہا۔'' اسے فوراً بالوں میں لگالو۔''
پر نہ جانے اس نے کس خیال سے کہا۔'' میرے بال گیلے ہیں ابھی نہ لگاؤں گی۔ جب رات شروع ہوگی تو لگالوں گی۔''
یہ کہہ کر اس نے ایک بلوری صراحی میں پانی بھرا، اور پھول کو ہاتھ میں دیکھ کر تازہ ہوا کے خیال سے صراحی دریچے میں رکھ دی۔ میں دن بھر گلاب کی سرگردانی میں اپنے کام پر نہ جاسکا تھا۔ دکان پر جا بیٹھا۔ رات کے وقت جب گھر واپس آرہا تھا، تو میرا پرانا دوست حمری مجھے میرے گھر کے قریب ہی مل گیا۔ اسے میں نے ادھر کئی ہفتوں سے نہ دیکھا تھا خوش ہو کر گلے سے لگالیا۔
''میں تمہارے ہی ہاں گیا تھا تم نہ ملے تو مایوس ہو کر واپس آگیا۔''
اس نے یہ جملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ میری نظر اس کے عبا کے کاج پر پڑ گئی۔ میرا خون میری رگوں میں جم گیا۔
میں نے یکلخت پوچھا۔'' حمری یہ کاسنی گلاب تمہیں کہاں سے ملا؟''
حمری طبعاً شوخ تھا۔ ہنس کر بولا۔'' کیوں؟ تمہیں کیونکر فکر پیدا ہوئی؟ میری محبوبہ نے مجھے تحفہ دیا ہے۔ نایاب چیز ہے۔''

میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور میں لڑکھڑا سا گیا۔ وہ خواب تقدیر کا فرشتہ! اس کی پیشن گوئی! سب جھوٹ تھا! محض حمری کی عبا کا کاج سجانے کے لیے میری بیوی نے یہ رنگین جھوٹ تراشا تھا۔ ہائے ظالم زندگی! سنگدل زندگی!''

(۴)

میں غصہ میں کانپتا ہوا گھر پہنچا۔
مجھے دیکھتے ہی میری بیوی دوڑی آئی، اور اشک آلود آنکھوں سے بولی۔ افسوس، بدبختی دیکھو کہ وہ پھول غائب ہو گیا۔ اے خدا اب میں کیا کروں؟ ہم پر ضرور کوئی مصیبت نازل ہوگی۔'' ''ضرور نازل ہوگی''۔ میں نے گرج کر کہا ''موت سے زیادہ بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ سمجھ لو کہ تمہاری موت آگئی۔''
بیوی حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ مگر اس وقت مجھے اس کی ایک ایک حرکت سے عیاری ٹپکتی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے چیخ کر کہا ''تمہاری موت آگئی۔ تقدیر کے فرشتے کی پیشن گوئی کے لیے تیار ہو جاؤ۔''
اس کی ان مکار باتوں نے میرے تن بدن میں شعلے بھڑکا دیے۔ میں نے اس کے نرم بازوؤں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اس زور سے دیوار پر دھکا دیا کہ ٹکر کھا کر اس کے سر سے خون کا ایک سرخ فوارہ پھوٹ نکلا۔
راتوں رات میں نے اسے اسی صنوبر کے سائے تلے دفنا دی، جہاں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔
ایک جنون کی بے اختیاری میں میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ اتفاق سے میرا دوست حمری پھر مجھے ایک گلی کے موڑ پر مل گیا۔ اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں سے خون اتر آیا۔
وہ ہنس کر بولا۔ ''تمہاری آنکھیں ایسی سرخ ہو رہی ہیں جیسے تم خون کر کے آئے ہو۔''
وہ اس طرح باتیں کر رہا تھا، گویا میں اس کے راز سے ناواقف ہوں۔
میں نے لپک کر اس کے گریبان پکڑ لیا اور بولا۔ ''بدمعاش! تو سمجھتا ہے کہ میں نے خون نہیں کیا؟ میں اسے ٹھکانے لگا چکا ہوں۔ یہ کہہ کر کاسنی رنگ کا گلاب میں نے اس کی عبا کی کاج سے نوچ کر زمین پر دے مارا، اور اپنے جوتوں کی مجنونانہ حرکت سے مسل ڈالا۔ حمری آنکھوں میں دہشت لیے میرا چہرہ تک رہا تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ میں نے اس کی محبوبہ کا خاتمہ کر دیا، اور اب اس کا کام تمام کر دینے پر آمادہ ہوں تو اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور کہنے لگا۔ ''کوتاہ اندیش اور جلد باز! تو بدبخت ہے! وہ گلاب تو میں نے سڑک پر سے اٹھایا تھا۔ میں بازار میں سے گزر رہا تھا کہ گلاب کا پھول دیکھ کر اٹھا لیا۔ شاید تمہارے ہی دریچے سے نیچے گر پڑا ہو۔'' یہ سن کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ایک ایسا اندھیرا...... جس نے آج تک دنیا کی نیرنگیوں کو مجھ سے اوجھل کر رکھا ہے۔

(۵)

''تقدیر کے فرشتے کا کہنا درست نکلا۔ میری بیوی اس رات کاسنی گلاب اپنے بالوں میں نہ سنوار سکی۔ ہمارا گھر میری بیوقوفی اور جلد بازی کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔
آج اس قصے کو ستر سال گزر گئے۔ مگر میں اپنی غلطی پر نادم، اس مٹی کی پرستش کر رہا ہوں۔ جس میں ان صنوبر کے سایوں تلے محبت دفن ہے۔''
کشتی ساحل سے آلگی۔

○○○

ادھ کھایا امرود

(۱)

کوئی دوسرے کے ادھ کھائے امرود کو کیوں کھانے لگا۔ جب لنکا کا کوٹ ایک مرتبہ سر ہو چکا، اس کے جدید پھاٹک کُھل ٹوٹ چکے، تو اس پر یورشیں کرنے میں کیا تُک تھی۔ اور حسن جہاں افراز مینو کو اس کمتری کا احساس تھا۔ سو یہی وجہ تھی کہ ہم حدیقہ والی کوٹھی کے شرقی برآمدے کی طرف شام کی چائے پر بیٹھے تو وہ کہ جس کے نظریں کبھی نچلی نہ ہوا کرتی تھیں، جب وہ سامنے بیٹھی ہوا کرتی تو ایسا محسوس ہوا کرتا تھا جیسے اس کی آنکھیں جھلمل جھلمل کھلونے ہوں۔ اس کی آنکھیں گویا اڑتی تتلی کے پروں کی طرح رنگ پر رنگ پیش کرتی رہتیں تھیں۔ لیکن آج اس کی آنکھوں میں نچلا پن تھا۔ اور حزیں سنجیدگی۔ ایک مرتبہ چائے پیتے ہوئے میرے منہ سے ذرا سپر سپر کی آواز نکل گئی تو وہ مجھے جھپکانے کے لیے ذرا زور سے سپر سپر کر کے چائے پینے لگا لیکن وہ تو ایسی خاموش رہی جیسے ماں بیٹھی ہو...... وہ اخبار نویس اور پارلیمانی سیکرٹری سے بھی زیادہ حاضر جواب تھی...... مگر آج تو کھسیانت سے اس کا منہ بیاہ ہوا تھا۔

باہر بجلی چمک رہی تھی بادل ایسا گھنا ہوا تھا کہ جیسے برسنے پر پانی نیزوں چڑھ جائے گا۔ کوٹھی کے جنوبی حصے میں جولو کاٹوں کی نکڑی تھی۔ اس کے اندھیروں میں بسیرا کرتی ہوئی سانجھ چڑیاں بول رہی تھی۔ شرقی برآمدے کے آگے کھڑے ثمر آور جھمکدا اسیند ودے آم ہریالے ماحول میں تجل معلوم ہو رہے تھے۔ مینو کا چہرہ بھی انہیں آموں ایسا تھا۔ پچھلے سال انہیں دنوں جب تھوڑا سا برسنے کے بعد دکھنا یا دلوں کو چھتر بتر کر رہی تھی تو انہیں آموں کے درمیان میں نے اس عشوہ گر سے سوال کیا تھا۔

''آپ کو گندھرپ کے معنی آتے ہیں؟''

''نہیں''۔

''اس کا مطلب ہے عشقیہ شادی، کیا آپ کو یہ پسند ہے؟

''...... پہلے پیار اور بعد میں شادی؟''

''اچھا مینو تو اگر یوں ہو جائے...... پہلے پیار بعد میں شادی اور شادی کے بعد بھی مسلسل پیار، اور......

''...... اصل مقصد وصل دوامی ہو؟''

''چندے خاموش رہیے ہمیں آپ کی باتیں پسند نہیں، ہم آپ کے پاس سے ابھی ابھی جایا چاہتے ہیں۔ پھر یہ اڑنگ بڑنگ باتیں فضاؤں کو سناتے رہیے گا۔''

''مجھے مضطرب چھوڑ کر نہ جایئے...... نہ جایئے!''

''قرائن بتاتے ہیں کہ آپ دماغی توازن کھو چکے۔ سراسیمگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے قیام مباح نہیں۔''

''آپ جیسی شستہ اور کتابی زبان کوئی نہیں بول سکتا۔''

''ہمیں مرزا غالب نے بھی یہی کہلا بھیجا تھا۔''

''دل چاہتا ہے کہ آپ کی باتیں ہی سُنے جائے۔''

''لیکن آپ کی جانب ہمارا میلانِ طبیعت ہی نہیں۔''

''آپ سلام ناز کر کے تشریف لے جاسکتی ہیں۔''

''ہمیں یہ بھی گوارا نہیں۔''

''کچھ گوارا بھی ہے۔''

''کچھ بھی نہیں''۔

''کیوں کیا خطا کیا قصور!

''نہ خطا نہ قصور، یہ ہمارا اقتضائے طبیعت ہے''

''جب سے تم منکر ہوئیں...... دل ڈوبا جا رہا ہے۔''

''دھڑام سے گرنے کی آواز تو ہمیں بھی آتی تھی۔''

''بدلی کی چھاؤں میں پھوار پڑتی ہوتی اور ہم دونوں تی منزلہ کی بارہ دری میں بیٹھے ساون کے نیزوں چڑھے ندی نالوں کو آپس میں لڑتے دیکھتے۔''

''آپ کے سفلی احساسات آپ کو مبارک۔''

''آپ کو برشگالی رات میں جھینگر بولتے ہوئے کیسے لگتے ہیں۔''

''جیسے بھی لگتے ہیں...... آپ ہرزہ سرائی جاری رکھیے۔ہم چلے۔''

''مینو میری عزیز تھی، بدر بھی عزیز تھا۔ان دونوں کی رسم منگنی تو نہ ہوئی لیکن ویسے ہر طور سے معاملہ طے ہو چکا تھا۔بدر کو مجھ پر اس لیے ترجیح دی گئی کہ اسے فوج میں کمیشن مل گیا تھا مجھے انتخابی بورڈ والے اس لیے نہ لیتے تھے کہ مجھ میں کچھ کچھ امرد ہونے کا شائبہ تھا۔صدر بورڈ نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ اس سے تو پانچ میل کی دوڑ بھی نہ دوڑی جائے گی۔میرے متعلق ان کا اندازہ قطعی غلط تھا۔شکار میں بدر نے مجھ سے زیادہ جفاکشی کبھی نہ دکھائی تھی۔بلندستانی جنگلوں میں مَیں نے جیٹھ کے روزے رکھتے ہوئے شکار کھیلا تھا۔اور بدر نے پیاس اتنی محسوس کی تھی کہ اس نے اکثر تیسرے پہر سے پہلے ہی روزے توڑ دیے تھے۔

یہ ابھی چھ مہینے کی بات تھی۔بقر عید کا مہینہ تھا۔محرم سے اگلے چاند میں بدر اور مینو کی شادی ہو جانے والی تھی کہ میں اپنے ایک اور عزیز اور بے تکلف دوست جمالی کے ساتھ کوٹلہ شاہی میں بیٹھا ہوا تھا جاپانیوں کے جذبہ خود کشی پر گفتگو ہو رہی تھی۔باہر گرد اٹھانے والا اندھیاؤ چل رہا تھا۔فضا ایسی ہو رہی تھی جیسے شیطان اس میں قدیم روما کے زمانے کی رتھیں گھڑ گھڑ چلا رہے ہوں ہم تیسری منزل پر تھے میری طبیعت اتنی چلبلا رہی تھی جیسے میں کھڑکی کھول کر سر کے بل سرک کے کھڑنجے پر گر پڑوں گا۔میرے آزار کا کوئی علاج دکھائی نہ دیتا تھا۔پھر جمالی نے کہا۔

''میں یونانی، اوڈیسس اور شیواجی مرہٹہ سے زیادہ چالاک ہوں، تمہاری مینو سے شادی میری ذمہ داری ہے۔اس کی شادی سیکنڈ لفٹیننٹ بدر سے کبھی نہ ہو سکے گی۔گو وہ ہمارے خاندان سے ہے اور تم نہیں، سیکنڈ لفٹیننٹ بدر کو اس کی ضرورت تم سے زیادہ نہیں ہے جو اندھیاؤ چل رہا ہے، میں اسے تو روک نہیں سکتا۔البتہ یہ شادی ضرور روک دوں گا۔

جمالی نے یہ بہادرانہ الفاظ تو استعمال کر دیے تھے۔اور وہ تھا بھی بڑا ہی سچا اور دلاور انسان لیکن میرے دل میں اسی وقت سے یہ الجھن پیدا ہو رہی تھی کہ جمال اپنا قول کیسے پورا کرے گا۔مینو کا حاصل کرنا میرے لیے قطب تک پہنچنے سے کم نہ تھا۔اب جمالی کے قول نے بھی ایک ایسے ہی قطب کی صورت اختیار کر لی تھی۔ان قطبین تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ مجھے نظر تو نہ

(۲)

جمالی کے آباؤ اجداد کبھی ملک کے تاجدار رہ چکے تھے۔ان کی جائے پیدائش شاہی کوٹلہ میں تھی جس کے جنگی دروازے تھے۔اور گھوگھس بھی تھی۔ہمارے بزرگ ان کے سپہ سالار تھے۔ہمارا قیام حدیقہ میں تھا...... حدیقہ چہار دیواری والے باغ کو کہتے ہیں۔حسنِ جہاں افروز کا تعلق شاہی کوٹلہ والوں سے تھا۔ان دونوں خاندانوں میں رشتے بیاہ ہو رہے تھے۔جمالی کے والد کا تنازع خطاب اور پنشن کے سلسلے میں دوسرے خاندانی دعوے داروں سے چل رہا تھا۔اور جب ملک کی آخری بڑی عدالت نے فیصلہ جمالی کے والد کے حق میں کر دیا تو شاہی کوٹلہ میں ایک زبردست مجلس جشن وسماع برپا ہو رہی تھی چوٹی کی گائن طوائفیں بلائی گئیں تھیں اور سبزہ زار چوگان میں گنڈیری دار درباری شامیانے نصب تھے۔

بیگمات اور معزز مہمان خواتین نوبت خانے کے بلند پھاٹک میں بیٹھی رقص وسرود سے بہرہ ور ہو رہی تھیں۔سامنے بانگی

کے کپڑے ایسا جھینا جھینا سُرخ پردا پڑا ہوا تھا۔ مرغول دار پھاٹک کے پیچھے شمال میں سنگ مرمر کے کُھلے فرش پر میز کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میزوں پر طرح طرح کے ٹھنڈے مشروبات اور پان سجے ہوئے تھے۔ کہ خواتین جب چاہیں آئیں۔ حسب ضرورت شربت وغیرہ نوش جان کریں پان کھائیں، الا ئچی سپاری، ااور زردہ چاندی کے نقشین چوگھڑوں میں رکھا تھا جس کسی کو تشنگی محسوس ہوتی یہاں آتی اور جو چیز چاہتی بے پیتی۔ اس مرمریں صحن کے ہر دو جانب شرق وغرب لال پتھر کی مرغول درزوں والی ایک منزلہ عمارت تھی۔ دروں پر زری دار بینگنی پردے پڑے تھے۔ یہاں بستروں کا انتظام تھا اور اندر عود ولوبان، دار چینی اور دیگر مشمومات سے خلوت گاہیں معطر تھیں جو کوئی تھک جائے یہاں آ کر آرام کر سکتی تھی۔ اس چوگردہ عمارت کے شمال میں جوسہ دریاں تھیں، وہاں کنیزوں کے آرام کرنے کا بندوبست تھا۔ صحن سے جو حویلی بھی دکھائی دے رہی تھی جس کے تی منزلہ پر بیٹھے ہوئے جمالی نے کا تھا۔ ''یہ جواندھیاؤ چل رہا ہے، میں اسے تو نہیں روک سکتا۔ البتہ یہ شادی ضرور ضرور روک دوں گا۔'' میں سبزہ زار چرگان میں نصب دباری شامیانے میں بیٹھا اسی تی منزلہ کی طرف کبھی کبھی نظریں اٹھاتا ہوا سوچ رہا تھا۔ ''کیا جمالی اس شادی کو روک سکتا ہے! جس طرح چلتا ہوا اندھیاؤ نہیں رُک سکتا۔ اسی طرح یہ بھی نہیں سکتی۔''

جب رات کی کمر ٹوٹی اور چاند نے مسجد سہ گنبد پر سے کھیت کیا مشروبات کی دیکھ بھال کرنے والی کچھ کنیزیں تو شمالی سہ دریوں میں سو گئیں اور کچھ بلند پھاٹک کے پیل پایوں کے پاس بیٹھ کر گا تا سننے لگیں تو حسنِ جہاں افروز مینو کو پیاس نے ستایا۔ وہ چمک دار وصلی جو تابلا جراب پاؤں میں پہنے ہوئے صحن میں آئی۔ اس کے پاؤں گورے پن کی اور چکناہٹ میں سنگ مرمر کو مات کر رہے تھے۔ اس نے برف میں لگی ہوئی بوتل تیلی سے پی اور اور کچھ شربت گلاس سے پیا۔ اس وقت اس کے ذرا بھیگے بھیگے ہونٹ واقعی آب وآتش کی آمیخت کا سماں پیدا کر رہے تھے۔

وہ واپس جانے ہی والی تھی کہ ایک لمبے تڑنگے مضبوط آدمی نے اسے اس طرح اٹھا لیا جیسے چڑی مار کبوتر کو دبوچ لے۔ حملہ آور اسے پردے پڑی ہوئی شرقی استراحت گاہ میں لے آیا۔ حملہ آور کی گرفت اتنی کڑی تھی کہ وہ مینو کو تڑپنے بھی نہ دے رہا تھا۔ پھر وہ خوب ہلکاں کی گئی۔ اس کا جھاڑ کا آزار بند چاقو سے کاٹ ڈالا گیا۔ سنہری شلوار ایسے ہلکے رنگ کی جیسے عطر ہو۔ تار تار ہو چکی تھی کامدار قمیض کی دھجیاں اڑ گئی تھیں۔ حملہ آور نے اندر جاتے ہی روشنی گل کر دی تھی۔

پھر ایک کنیز نے صحن میں شور مچانا شروع کر دیا۔ ڈاکو، ڈاکو بیگم مینو۔ بیگم مینو۔ دوڑیو، دوڑیو! اس شور پر بلند دروازہ میں بیٹھی تمام مستورات صحن میں ڈھوک آئیں ..... اخفائے واردات..... ناممکن تھا حسنِ جہاں افروز مینو تو گویا چھاپے میں چھپ گئی تھی۔ اس کے بدنامی کا ٹیکہ لگ چکا تھا۔ مردوں تک خبر پہنچ گئی بے چاری خستہ اندام، دریدہ ملبوس، حسنِ جہاں افروز مینو کچھ ہی منٹ میں ایسی بن گئی تھی۔ جیسے ڈربے کا دروازہ بند ہو گیا ہو۔ کوئی مرغی باہر بیٹھی رہ جائے، رات کے سناٹے میں باہر بلاؤ پھاڑنے لگے تو وہ چیخ پکار ہو کہ ہمسایوں کے بچے تک میں ہُدک ہُدک کر جاگ پڑیں۔ مینو کے عطر ایسے ہلکے سنہرے رنگ کی شلوار سُرخ ہو رہی تھی، چولی کے بٹن اور تکمے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس کا زعفرانی دوپٹہ، رومال، کانوں کا ایک جواہر جڑ آویزہ اور اس کے چہرے کی وغد غاہٹ یہ سب غائب تھے۔ تشہیر اتنی ہو چکی تھی کہ اس سے کوئی بھی نہ دیا رفت کرتا تھا۔ اس کے منہ میں بولی بھی نہ تھی۔ امرود ادھ کھایا ہو چکا تھا۔ لنکا کے کوٹ کے جید پھاٹک کھل چکے تھے۔ کنیزیں بار بار حاشا رحمان، حاشاللہ کہتی پھر رہی تھیں۔

(۳)

سیکنڈ لفٹیننٹ بدر اور حسن افروز جہاں بیگم مینو کی شادی عشق ومحبت کی اساس پر نہ ہو رہی تھی۔ جو اس کی بناء پر عشق ومحبت ہوتی تو اس کا توڑنا مشکل ہوتا اور مینو اس واقعے کی مجرم بھی گردانی نہ جا سکتی تھی۔ جو کوئی راہ جار ہا ہو۔ لیکن کوئی دوسرا اسے زبردستی پکڑ کر کچھ دیر کو راہ سے گمراہ کر دے۔ تو اسے بے راہ تو نہیں کہہ سکتے۔ پر یہاں تو مسئلہ ہی دوسرا درپیش تھا۔ عورت کی عصمت ایک مرتبہ گئی تو سدا کے لیے گئی۔ ادھ کھائے امرود کا کوئی گاہک نہ تھا۔ گو رشتہ قطع کرنے کی کوئی باقاعدہ اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ لیکن بدر کی طرف سے یہ رشتہ منسوخ سمجھا گیا تھا۔ جس طرح سے ہٹلر کو کسی ملک پر حملے کرنے سے پہلے الٹی میٹم کی ضرورت محسوس نہ ہوا کرتی تھی۔ اس طرح بدر کی جانب سے اس ضمن میں کوئی اعلان متوقع نہ تھا۔ اب میرے امتحان کی گھڑی آن پہنچی تھی کہ میرا دعویٰ محبت فرضی تھا؟ کیا میں نے صرف بڑ ماری تھی۔ شاہی کوٹلہ میں بدر یا کوئی اور ادھ کھائے امرود کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا تو کیا ہم اہلِ حدیقہ بھی انہیں کی پیروی کر رہے تھے؟

حادثے کے اگلے ہی دن مجھ سے ملے بغیر جمالی پہاڑ پر چلا گیا تھا ورنہ اسی سے اپنے دل کی بات کرتا۔
ادھر مینو کو یہ معلوم تھا کہ میں اس کا خویش ہوں۔ اگر دنیا میں اس کی کسی مرد ذات سے کچھ تھوڑی بہت بے تکلفی تھی، تو صرف مجھ سے تھی۔ میں نے خلاف تہذیب و اخلاق اس سے محبت کا اظہار تک کر دیا تھا۔ رواج کے مطابق ان دونوں خاندانوں میں بیٹی والے کسی صورت بھی بیٹے والوں کو رشتہ کی پیشکش نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اس تھوڑی بے جا بے تکلفی اور منہ پھٹ پنے کی آڑ لیتے ہوئے جو میری مینو کے ساتھ تھی، وہ چاہتی تو میرا جذبہ محبت للکار اتو جا سکتا تھا کہ" کہیے محبت وحبت اب بھی باقی ہے یا اس کا مرنڈا بن چکا۔" اب اس کا امن میرے دل میں تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ میری چھوٹی بہن اور اپنی سہیلی کی معمولی سی علالت کی خبر پا کر عیادت کو پہنچی تھی۔ گو گل پارہ خانم کو صاحب فراش ہوئے دو دن ہو چکے تھے لیکن اسے نزلے کا معمولی بخار اور آدھے سر کا درد ہی تو تھا۔
چنانچہ شام کی چائے پر جب باہر بجلی چمک رہی تھی اور بادل ایسا گھنا ہوا تھا۔ جیسے اب برسا، اب برسا میں اس ترک طناز کی مدامی خنداں اور تنقیدی نگاہوں میں نچلا پن دیکھ کر یہ بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ آج یہاں کس مقصد کے لیے پہنچی ہے۔ میرے دل کو یہ تسلی ہو رہی تھی کہ وہی شاخ گل جس کے لیے میں کب سے دل پر ہاتھ دھرے فقیروں کی طرح پلہ پسارے پھر رہا تھا، وہ شاخ گل شجر سے کٹ کر کسی دوسرے کے پلے میں گرنے کو اس طرح سے لٹک چکی ہے جیسے کسی کا زخمی ہاتھ گلجنڈرے سے کھل کر لٹک گیا ہو۔ آج وہ پلہ جس میں وہ گرا چاہتی تھی، نیچے سے ہٹا لیا گیا تھا۔ اب اُسے گرنا تھا یا تو جوتوں کی جگہ زمین پر یا شجر پر ہی لٹکے لٹکے سوکھ جانا تھا۔ میرے خیال میں اب وہ اتنی عاجز آ چکی تھی کہ اس آس پر میری طرف جھکے کہ میں اسے گرد آلودگی سے بچانے کے لیے اپنا پلہ پسار لوں گا۔
میں نے اسے پورے ایک سال سے نہ دیکھا تھا۔ ہماری آخری ملاقات حدیقہ ہی کے سیندوریے آموں میں ہوئی تھی۔ جب وہی عشقیہ شادی کا ذکر آیا تھا۔ زیادہ عرصہ گذر جانے کے سبب اب میرے دل میں اس کی وہ تڑپن باقی نہ رہی اور میں اسی لیے مذبذب تھا کہ ایک گرے ہوئے موتی کا مول کروں یا نہ کروں پر آج جو میں نے اس کی مضمحل صورت اور نچلی نچلی آنکھیں میز کے دوسری طرف سے دیکھیں تو اوسان بجا نہ رہے۔ میں سوچنے لگا جو وہ مجھ سے سوال کرے۔" کہیے اب آپ اس نظریے پر قائم ہیں کہ پہلے پیار اور پھر شادی؟" تو کیا میں اس کا یہ جواب دوں گا۔" میں اب اس نظریے پر قائم نہیں ہوں۔" نہیں، میرا جواب تو یہ ہونا چاہیے۔" مینو مجھے اب بھی تمہاری ویسی ہی آرزو ہے۔"

(۴)

تو ہم شام کی چائے حدیقہ والی کوٹھڑی کے شرقی حصے میں پی رہے تھے جس کے آگے جھمکدار طوطا پری آمون کی زیبائش تھی۔ گل پارہ خانم کا بستر علالت انتہائی جنوبی کمرے تھا۔ مینو چائے پی کر اسی کے پاس چلی گئی تھی۔ بڑی جنوبی کھڑکی کے پاس صوفہ اس طرح سے رکھا ہوا تھا کہ وہاں بیٹھ کر باہر دیکھ سکتے تھے۔ مینو اسی صوفے پر بیٹھی پیانو بجا رہی تھی کیونکہ گل پارہ خانم کے آدھے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اور مینو یہ کہا کرتی تھی کہ وہ ایسا پیانو بجاتی ہے کہ کیسا ہی درد سر ہو آرام ہو جاتا ہے، مریضہ کے درد سر کو آرام ہوا ہو یا نہیں، البتہ مینو نے پیانو بجا کر میزبان کو سُلا ضرور دیا تھا۔ اور تکلف میں سونا بھی آرام کے مترادف ہے، مینو نے یہ غزل چھیڑی ہوئی تھی۔

اس کو پا کر بھی اسے پانے کی حسرت چاہیئے
وصل ہیں بھی چاشنیٔ درد فرقت چاہیے
گو ہیں ان معصوم آنکھوں میں ہزاروں خوبیاں
کچھ شرارت بھی مگر حسب ضرورت چاہیے
اجنبیت جن کی فطرت، بے رخی جن کا شعار
کچھ نہ کچھ ایسوں سے بھی صاحب سلامت چاہیے

لوکاٹوں کے گھنیرے گھنیرے ماحول میں بسیرا کرتی ہوئی سانجھ چڑیاں اب بھی بول رہی تھیں۔ میرا دل مینو سے باتیں

نہیں معلوم ہی ہے کہ میں تمہارے لیے کب سے بے [illegible]

ہیں..... اب کیا ہوگا؟ ادھر میرے گھر والے بھی نہیں مانتے تم ہی کوئی ترکیب لڑاؤ۔ یہ نہ مانیں تو نہ مانیں میں اس ضمن میں آزاد ہوں اور تم بھی.....

مینو نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ تو میں نے فون پر بات کی۔

"میرا خط پہنچ گیا ہوگا؟"

"جی....."

"اور جواب؟"

"ایسے خط شرمندہ جواب نہیں ہوا کرتے آپ سے خط و کتابت روا نہیں۔"

"تو پھر میرے گھر والے تو راضی نہیں۔"

"وہ رضامند نہیں تو ہم بھی رضامند نہیں۔"

"کیوں؟..... قصور؟

"جب تک ہمارے والدین رضامند نہ ہوں۔"

"تو میں کب تک یوں بیٹھا روتا رہوں۔"

جب تک مَن کال نہ پڑ جائے۔"

(۵)

جب میں نے یہ داستان شاہی کوٹلہ کے اسی سہ منزلہ پر بیٹھ کر ساون کی ٹھنڈی ٹھنڈی بھینی بھینی نم ہوا میں سانس لیتے ہوئے جمالی کو سنائی تو اس نے کہا۔

"عالی خان! سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے میری عدم موجودگی میں کوئی جادو چلاتے ہوئے میرے والدین کو درست کرلیا۔ لیکن جب مینو کے گھر پیغام رسانی کی گئی تو وہ نہ مانتے تھے ان کا خیال تھا کہ اس طرح لڑکی سُسرال میں خوش نہ رہ سکے گی۔ حدیقہ والے ہمیشہ سوچتے رہیں گے کہ "اس کے ساتھ وہ حادثہ پیش آچکا ہے۔ یہ عفیفہ نہیں، اور اسی لیے

ہمارے لائق بھی نہیں ہے اسے کیوں سر مڑھا گیا۔ یہ کچوکے کس سے برداشت ہو سکیں گے؟" شادی اب پھر جوکھوں میں پڑ گئی تھی۔ جمالی مینو کے گھر جانے کو تیار نہ تھا، البتہ اس نے اس کنیز کو وہاں بھیجا جس نے مرمریں صحن میں اس رات شور مچایا تھا۔ اس کنیز کے ساتھ ایک مفصل خط مینو کا دوپٹہ، رومال اور کانوں کا ایک جواہر جڑا اویزا بھی تھا۔ اس طلسمی واقعے کی تہہ میں جمالی کی تیز ذہنیت کارفرما تھی۔ یہ تکلف اس نے میرے لیے پیدا کیا تھا۔ حسن جہاں افروز بیگم مینو سپورن تھی۔ امرود کے کسی کے ہونٹ تک مس نہ ہوئے تھے لنکا کے کوٹ میں تا حال ایک تانگی نہ پڑی تھی۔ یہ سارا کھیل جمالی نے اپنی بات پوری کرنے کو رچایا تھا۔

اب اس عفیفہ کا رشتہ بدر سے بھی ہو سکتا تھا لیکن اس طرف جو سرد مہری برتی گئی اس نے پالا چتا دیا۔ بدر بہت تڑپا لیکن اس نے تو چراغ سے اپنی بتی خود ہی نکال لی تھی۔ اب وہ چراغ دوسرے کی بتی سے روشن ہونے والا تھا اور یہ روشنی یقیناً زیادہ اجلی اور دیرپا ثابت ہونے والی تھی۔ سیکنڈ لفٹیننٹ بدر کو دوسرا موقع کون دیکھتا۔

جھر جھر سے جھر جھر ے سفید بادلوں میں نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔ صحن چمن میں موسری کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ لمبے لمبے تیلیا نیلے بازوؤں اور سفید پیٹ والے پہاڑی کستورے ٹوٹو کرتے ہوئے کوٹھے کے پیش گاہ پر اڑتے بیٹھتے پھر رہے تھے۔ ان کی ٹنر ٹنر سے چاؤ کی خوشی پھوٹ رہی تھی۔ میں شام کے وقت لان میں سوگی اور کسمسا یہ سا بیٹھا پیڈسٹل پنکھے کی ہوا کھا رہا تھا کہ جمالی نے آ کر مجھے یہ فرحت آمیز خبریں سنائیں۔ اور میں نے اس کا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر ازراہِ تشکر چوم لیا جو اس کی کوشش نہ ہوتی تو معاملہ پھر کھٹراک میں پڑ گیا تھا۔ مجھے اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ جنگلی ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا پھرنے لگوں۔

جب اہل حدیقہ اور شاہی کونلہ والوں کی باہمی غلط فہمیاں دور ہو گئیں تو میں اور مینو دلہا دلہن بن گئے، میں نے اوّل ملاقات میں اس سے کہا۔

"پہلے پیار پھر شادی اور شادی کے بعد بھی مسلسل پیار۔"

"پہلے تو میرا نظریہ اس سے کچھ مختلف تھا۔ اب اپنا نظریہ کوئی نظریہ نہیں رہا۔"

"کس لیے"

"اس لیے کہ اب تو شرعاً وعرفاً جو آپ کا نظریہ ہے، وہی میرا بھی ہے؟"

"پہلے تو آپ مجھے لاجواب کر دیا کرتی تھیں۔"

"اب آپ ہی وہ دستور العمل چھوڑ چکی ہوں، اب تو لاریب آپ کی رضا میری رضا ہے۔ اور وہ جو پہلے مجھ میں دخل فصل معلوم ہوا کرتا تھا وہ دخل فصل ہرگز نہیں نہ تھا مجھے تو آپ سے بڑی نزدیک کی نسبت تھی آپ تو شہ رگ سے بھی زیادہ میرے قریب ہیں۔ لیکن میری جبلت تربیت، وضع داری نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ میں آپ کو جواب باصواب نہیں دے سکتی تھی۔ مسیح مرد ہونے کے باوجود جب مصلوب کیے گئے تو چلائے تھے۔ آٹھ پہر ضبط کی سولی پر ہونے کے باوجود میرے منہ پر نالہ وفریاد نہ تھا۔ میں اپنے ضبط کی خود آپ کی داد دیا کرتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی میرا قدم بھی ڈگمگانے لگتا تھا۔ مثلاً جب آپ سپر سپر چائے پی رہے تھے۔ تو آپ نے مجھے قتل ہی تو کر ڈالا تھا۔ آپ کے اُن سپر سپر کرتے ہوئے ہونٹ کی جنبش کیا بتاؤں کیسی معلوم ہوتی تھی، بس مَیں بتا نہیں سکتی۔"

"پر آپ تو مجھے چڑانے کے لیے خود بھی سپر سپر چائے پینے لگی تھیں۔"

"آپ نے وہ سپر سپر تو ملاحظہ فرمائی تھی لیکن یہ ملاحظہ نہ فرمایا تھا کہ میں اپنے ہونٹ بھی تو کاٹ رہی تھی۔"

"لیکن جو کہیں آپ کی شادی اس فوجی سے ہو جاتی تو کیا آپ کو پھر بھی میرا خیال رہ سکتا تھا۔"

"کبھی کبھی نہ رہ پاتی جو میں اس کی ذرا سی سرسراہٹ محسوس کرتی تو اسے اس طرح علیحدہ کر دیتی جیسے ترازو کے پلڑے سے تولا ہوا بوجھ، اور میں اپنی طبیعت بدر سے ذوق وشوق کے ساتھ باندھ لیتی۔"

OOO

گوری گلاباں

سبز پیر کے مزار پر کیسے ہار پھول چڑھانے جاتی؟ مزار سمجھ کر لوگ مجھی پر ہار پھول چڑھانے چلے آرہے تھے۔ وہ ایک زندہ لاش کو سجانے کے آرزو مند تھے۔

صندوقچی نوٹوں اور روپوں سے بھری تھی لیکن جھجے خان کی تسلی کرنے سے قاصر تھی۔ سائے اونچی اونچی مٹیوں اور پھتکوں تک جا پہنچے تھے۔ کتنی ہی نوچیاں اڈے بند کر کے آرام کی غرض سے اُٹھ گئیں یا اپنے یاروں کے گلے میں بانہیں ڈال کر چلی گئی تھی البتہ چٹی جان نہیں ٹلی تھی۔ ظالم کیا چھاتی تانے رہتی، گردن اونچی رکھتی اور اکڑ کر بولتی۔ اس سے چڑ کر چنو مستری نے ایسی گمبھی بنائی کہ سوکھے پٹانے کی طرح چیخنے لگی، تب سے چنو مستری کو دیکھ کر دوسری طرف گردن پھیرنے لگی لیکن وہ مجھ پر ہمیشہ مہربان رہا۔ جب آتا دیر تک بالوں میں ہاتھ پھیرتا۔ میرے بال ہیں بھی بہت پیارے پیارے، ایسے سنہری جیسے صبح کے سورج کی سہانی سہانی کرنیں۔ بازوؤں کو کانٹا، ان کا سڈول پن للچائی ہوئی نظر سے دیکھتا، کبھی دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر جھلاتا اور کھلونا سمجھ کر باولے بچوں کی طرح کھیلتا۔ مجھے کبھی نہ ستاتا، جانتا تھا کہ میں پھول کی طرح نازک ہوں۔ اگر کبھی چٹی جان والا سلوک کرتا تو میرا دم ہی نکل جاتا۔

یہ کبھی چور گلی سے نہیں آیا۔ ادھر سے تو کالج کے لڑکے، اخباروں والے شاعر، داڑھی والے بزرگ، سفید پوش اور سیاسی جماعتوں کے کارکن آتے۔

سبز پیر کے مزار پر سلام کرنے نہ گئی تو افسوس ہوا اور اب سر شام فرصت ملی تو ہمت نہ رہی۔ مشین بھی ایک وقت تھک جاتی ہے اسے بھی کبھی بند کر دیا جاتا ہے، میں تو پھر انسان تھی لیکن آج تو مجھے مشین سے بھی زیادہ کام کرنا پڑا۔ فرصت ملی ہی تھی کہ چنو مستری مونچھوں پر تاؤ دیتا اور دانت نکالتا آیا۔ اسے ابھی ابھی آنا مرنا تھا! مجھے تھکن نے ایسے چور کر رکھا تھا جیسے بدن پر سے چھکڑا گذر گیا ہو۔ ابھی ابھی ایک بدتمیز جٹ سے فراغت پائی تھی اور اسے دھکے دے کر باہر نکالا تھا۔

چنو مستری لکڑی کی سیڑھی پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے شلوار جھٹکی اور جمائی لی۔

آنکھوں میں اندھیرا پھرنے لگا۔ ایک گلی تنگ..... چور دروازے کی طرح چھپی ہوئی..... دوسرے بھیڑ، تیسرے تھکن۔ یہاں دوپہر کے بعد ہی شام کا اندھیرا ہونے لگتا ہے۔ اٹھی اور اٹھ کر لیمپ جلانے لگی۔ لیمپ کی طرح میرا بدن بھی جلنے لگا اور رفتہ رفتہ تیل کی مقدار گھٹنے لگی لیکن کیا کرتی۔ جب تک تیل کی ایک بوند بھی رہتی ہے جلنا پڑتا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ لیمپ نہ جلاتی اور کواڑ بھیڑ کر کوٹھڑی میں جا پڑتی لیکن چنو مستری کا کیا کرتی؟ پھر جھجے خاں تھا۔ وہ کام چور سمجھ کر بڈی پسلی سہلاتا۔

چنو مستری مسکرایا اور بولا..... ''گلاباں خیر تو ہے؟ ابھی سے جمائیاں لے رہی ہو؟''

میں نے کہا..... ''ہاں تھک رہی ہوں۔ صبح سے اب تک مزدوری کی ہے۔''

''واہ، تم بھی کتنی لالچن ہو! ناحق جان ہلکان کرتی ہو۔''

''پھر کیا کروں؟''

''اونہہ، تم تو ایسے کہتے ہو جیسے یہ میرے بس کا روگ ہو۔''

''ہاں، اور کیا؟''

''جھجے خاں کو نہیں دیکھا؟''

''جھجے خاں؟ ہاہاہا۔ وہ کس کھیت کی مولی ہے، میں اس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔''

''میری ہڈی پسلی کب سلامت رہنے دو گے؟ جھجے خاں تو پھر تگڑا ہے۔ مار سہہ لے گا اور میرا تو دم ہی نکل جائے گا۔''

''تم تو ناحق کیوں گھبراتی ہو۔''

کون جانے میرے دل کا روگ؟ ایک بابو آتا تھا..... شریف اور نیک دل، بیوی بدکار تھی، طلاق لے گئی، میرے پاس آنے لگا۔ میں نے مانوس کرلیا۔ بیچارا کس چاؤ سے انارکلی لے گیا! سینڈل لے دی۔ لپ سٹک، کریم، پوڈر اور دوسرا سامان لے دیا۔ پلٹ کر گھر آئے تو نتھے خاں اس پر برس پڑا۔ کہنے لگا..... بابو جی! رستہ ناپو! ہم نوسر بازوں کو منہ نہیں لگاتے، گلاباں سے پیار بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ کل کلاں کو یہ تمہارے ساتھ مل جائے اور پھر بھاگ جائے تو ہمارا پٹڑا ہو جائے گا۔ اس کے پاس دیر تک مت ٹھیرا کرو! کام کیا اور چلتے بنو ...... ''پھر ظالم نے چاقو بھی دکھایا۔ بچارا بابو سہم گیا، آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور انگوٹھی کی نشانی تھما کر چلا گیا۔ اس رات نتھے خاں نے مجھے کس بری طرح پیٹا، سنو کہیں کا۔

اگر وہ بابو پھر آتا تو اسے کہتی کہ جیسے بھی بن پڑے مجھے نکال کر لے جائے، مجھ سے نتھے خاں کی سختیاں نہیں جھیلی جاتی۔ جوں جوں جوانی ڈھل رہی اور آمدنی گھٹ رہی تھی توں توں نتھے کی گھرکیاں بڑھ رہی تھیں۔ آئے دن پسلیاں سہلانے لگا تھا۔ میری کوکھیں بروقت دکھنے لگی تھیں۔ بروقت ڈاکٹر کا لیپ باندھا رہتا تھا۔

چنو مستری نے ایک ہاتھ ران پر جمایا اور دوسرے سے ہتھوڑی پکڑ لی، ایسا لگا جیسے اہرن پر زور زور سے ہتھوڑا پڑنے سے میدان میں رکھا ہوا لوہا پھیلتا اور چپٹا ہوتا گیا ہو۔ سر میں یوں ٹیسیں چلنے لگیں جیسے کوئی کھوپڑی میں بیٹھا سوئیاں چبھو رہا اور ساتھ ساتھ وحشیانہ قہقہے لگا رہا ہو۔ بدن کی یہ حالت تھی جیسے تیز تیز ناخنوں سے میٹھی میٹھی کھجلی مناتے مناتے جلنے لگا۔ ہڈیاں یوں تڑخیں تھیں جیسے کبھی کبھی رات کو لالٹین کی گرم گرم چمنی تڑختی ہو۔ جی چاہتا تھا کہ گدیلوں کے ڈھیر پر جاپڑوں اور کوئی کمسن لڑکا بدن کھوندے اور سرد باد سے سکون سال جاتا۔ چین کے لیے کتنی بے چین تھی لیکن چنو مستری تلوار کی طرح سر پر لٹک رہا تھا۔

لوگ تعریف کرتے اور گوری گلاباں کہہ کر پکارتے لیکن کس بری طرح مٹی پلید کرتے۔ جو ادھر سے گزرتا چھیڑ کر جاتا۔ میرے بدن پر ان کے ہاتھ یوں چلتے جیسے ماہر سازندے کی انگلیاں سارنگی اور ستار پر۔ بعض تو طبلہ جان کر کرخت ہاتھوں سے تھاپ تک لگا جاتے۔ سوچتی کہ ان سے کہوں ...... گھر جا کر ماں بہن کو چھیڑو!..... لیکن سوچنا بے کار تھا، دکانداری کی بات تھی، گاہکوں کو کیسے منع کرتی؟ ایسا کرتی تو نتھے خاں میری ہڈی پسلی ایک کر دیتا۔ پھر ایک اور مصیبت تھی۔ علاقے کی بعض بارسوخ اور معزز ہستیوں کی مفت خدمت کے لیے میں وقف تھی۔ کبھی کبھی قسمت جاگتی تو سفارش کے سلسلے میں اونچے اونچے کوٹھوں تک جانا پڑتا۔

آج صبح طبیعت کتنی مزے میں تھی! خوشی سے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ سارا بدن پھول کی طرح لگتا تھا۔ شیشہ دیکھا تو چہرے پر کیسی چمک تھی! اور جب سب سے پہلا گاہک بھتے چڑھا تو طبیعت بگڑ گئی۔ بدن پر کیا گھنیرے بال تھے۔ دانت پیلے پیلے، منہ بدبودار، بدن تارا میرا کے تیل سے لت پت۔ نرا درندہ تھا۔ کسی پہلوان کا ناخلف پٹھا ہوگا۔ جب گیا ہے تو حلق سوکھ گیا، دل بیٹھ گیا، ہونٹ سل گئے اور مسکراہٹ تو رفو ہوگئی۔ پھر دوسرا آیا، کپڑے صاف ستھرے تھے، منہ میں پان کا بیڑا دبائے تھا لیکن کانا تھا، صورت دیکھ کر گھن آتی تھی، جاتے ہوئے کہہ گیا کہ علاقے کا نیا صفائی کا دارغہ ہے۔ دن بھر گھناؤنی سے گھناؤنی صورت دیکھی اور اب یہ موت کا فرشتہ راستہ گھیرے کھڑا تھا۔ دوسرا موقع ہوتا تو میں اس سے ہنس کر بولتی کیونکہ آدمی اچھا تھا لیکن اس وقت تو جان عذاب میں تھی۔

میں نے کہا..... ''ذرا دم لینے دو!''

بولا..... گلاباں! تمہارا چہرہ اتر گیا ہے۔''

وہ رکتا نظر نہ آتا تھا اور اب بلکنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جانتی تھی کہ نڈھال ہوں کوئی دوسرا جتائے تو دکھ ہوتا۔ اترا ہوا چہرہ مٹی کی طرح بے قیمت ہوتا ہے، اس سے دھندا نہیں چلتا۔ دراصل سرخی پوڈر کی جمی ہوئی تہہ اتر چکی تھی اور اب نئی تہہ چڑھانے کی ضرورت تھی لیکن فرصت ہی کب ملی۔

پیڑ کے پتے دن بھر کی دھوپ کھا کر سوکھ کر کھنک ہو جاتے اور یہی بے گھر عورت کا حال ہوتا۔ اس وقت نام کی سکت نہ رہی

تھی ایسا لگا جیسے کسی نے رگوں سے جان کھینچ لی ہو۔
اس نے ہاتھوں میں میری انگلیاں تھام لیں اور انہیں دھیرے دھیرے دبانے لگا۔ جی چاہا کہ اسی طرح دبائے جائے بلکہ بدن بھی دبا دے۔ پھر جب تھکن جاتی رہے اور نیند آجائے تو اُٹھ کر چلا جائے لیکن ایسا کہاں تھا؟ اس کی آنکھیں سلگ رہی اور شرارت سے بھری تھیں۔ موٹے موٹے ہونٹ بے تابی سے کانپتے، لرزتے، مسکراتے اور ہنستے تھے۔ بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ اس وقت وہ میری خیریت نہ چاہتا تھا۔
برساتی نالے کبھی تو بڑا شور مچاتے اور کبھی سوکھ کر غائب ہو جاتے۔ دن لدر ہے تھے۔ چاہتی تھی کہ سو جاؤں اور کم از کم اس وقت تک سوئی رہوں جب تک پھر برسات نہ آجائے، پھر جل تھل نہ جائے اور پھر سوکھے ندی نالے نہ بہنے لگیں۔
اس نے زور سے شانے دبا کر کہا...... ''کب تک ستاؤ گی؟''
سمجھتی تھی کہ یہ دل کی بھڑاس نکالے بغیر نہ ٹلے گا۔ جب تک گیس نہ نکل جائے سوڈے کا پانی اُبلتا رہتا ہے لیکن کیا کرتی ،نڈھال بدحال تھی، جبراً مسکرائی، بولی.....
''بلا کی بھوک لگ رہی ہے۔''
''پھر؟''
''پھر کیا؟ ابھی کھانا کھا کر آتی ہوں۔''
''لیکن گلاباں میں بھی تو بھوکا ہوں۔''
ہاں سچ ہے۔ وہ بھی تو بھوکا تھا، میری ہی طرح وہ بھی بے کل تھا اور بدحواس بھی۔ نہ میں بھوک مٹائے بغیر جی سکتی تھی نہ وہ جی سکتا تھا لیکن یہ کیا ستم تھا کہ ہم دونوں کو ایک ہی وقت بھوک لگ گئی۔
آخر اپنی بھوک کو ترجیح دینے کی جرأت ہوئی۔ میں نے ملائم لہجے میں کہا..... ''ذرا صبر کرو! میں جھٹ سے کھانا کھا آؤں۔''
''اور پھر؟''
''پھر تمہارے انتظار کا پورا پورا حق ادا کروں گی۔''
''سچ۔''
''ہاں سچ، آزما کر دیکھ لو۔''
''چلو، ایسا بھی کر دیکھتے ہیں۔''
''لو میری کرسی پر ٹک جاؤ!''
میں اٹھی اور وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ چبوترے سے اتری اور میں نے گھر کا رخ کیا۔ جاتے جاتے اس نے تاکید کی نیت سے کہا..... ''زیادہ دیر مت لگانا۔''
میں نے مڑ کر دیکھا اور مسکرا کر تسلی بخش جواب دیا۔
چکلے سے نکل کر کٹڑی میں گئی۔ میاں مجید کی عالی شان حویلی ہمیشہ کی طرح سج رہی تھی۔ نوکر چاکر پھلواڑی میں فواروں سے پانی چھڑک رہے تھے۔ قہقہوں اور گپوں کی مجلس گرم تھی۔ صحن میں نرم نرم گدوں والی کرسیاں بچھی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ ان پر جا کر بیٹھ جاؤں لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ میاں مجید تو مجھے ذلیل چیز سمجھتے تھے۔ میں ان کی حویلی میں قدم بھی نہ رکھ سکتی تھی۔ اس حویلی کے برابر میں تنگ اور اندھیری کوٹھڑیاں تھیں۔ گلی سڑی زندگیوں کو صرف یہاں پناہ مل سکتی تھی۔ یہیں چکلے والیاں تھک ہار کر آتیں اور چراغوں یا لالٹینوں کی مدھم روشنی میں پڑی سسکتیں۔ ان کوٹھڑیوں میں وہ عورتیں بھی رہتیں جنہیں لوگ بھگا لاتے۔ اونچے مکانوں میں اونچے لوگ رہتے اور کوٹھڑیوں میں ذلیل لوگ۔ یہ اور بات ہے کہ ذلیل لوگوں کے پیسے سے اونچی حویلیوں کی ... یں قائم رہتیں۔ شیخ مجید معقول کرایہ وصول کرتا۔ شہر میں وہ اتنا عزت والا سمجھا جاتا جتنے ہم ذلت والے سمجھے جاتے۔

آہستہ آہستہ کوٹھڑی تک پہنچی۔ فرش قدرتی تھا اور چھت کے شگافوں سے بھی قدرت نظر آتی تھی۔ اُمید تھی کہ ایک دن چھت بھی گر جائے گی اور پھر قدرتی چھت کے نیچے آرام کرنا پڑے گا۔ اینٹیں اکھڑتی رہتیں اور میں قدرت کا تماشہ دیکھتی رہتی۔ میاں مجید کو ان کوٹھڑیوں کی مرمت کا کبھی خیال نہ آیا، بلکہ مرمت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کرایہ دار بہت ہیں لیکن مکان کم اور مکانوں کے مالک اس سے بھی کم۔ مالک جس حال میں چاہے کرایہ داروں کو رکھتے بلکہ جی چاہتا تو رکھتے ہی نہیں۔

کوٹھڑی میں پہنچی تو لالو سو رہا تھا، اسے جگایا۔

لالو میرا بڑا خیال رکھتا تھا بلکہ سچ پوچھو تو وہ مجھ پر عاشق تھا۔ قسمت کا مارا پھولوں کے ہار بیچتا تھا۔ ایک دن گلی میں نکل آیا اور بڑے چاؤ سے میرے گلے میں ہار ڈال گیا اور پھر ایسا ہوا کہ میرے گلے کا ہار بن گیا۔ جانے کیوں مجھ سے ڈرتا تھا اور تھمے خاں سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ میری اور تھمے خاں کی خدمت کرتا۔

تھمے خاں ہمیشہ لالو کا طعنہ دیتا اور کہتا..... ''یار تو خوب ڈھونڈا ہے۔''

اور میں دل ہی دل میں اسے گالی دیتی۔

میری صورت دیکھتے ہی لالو کی جان میں جان آجاتی لیکن مجھے نہ جانے کیا ہوتا۔ جہاں وہ سامنے آیا اور میرے ماتھے پر تیوری چڑھ گئی۔ عجیب مجبوری تھی۔

لالو نے کھری چارپائی خالی کردی اور حواس بجا کر کے بولا.....

''بی بی جی! آج بڑی دیر کردی۔''

''ہاں۔''

''کیا بھوک نہیں لگی؟''

''لگی ہے۔''

چارپائی پر بے اختیار جا پڑی اور وہ بسم اللہ کہہ کر مجھے دبانے لگا۔

''دبالوں تو کھانا گرم کر کے لاتا ہوں۔''

''لے آنا۔''

وہ جوں جوں دباتا گیا نیند آتی گئی۔ سوتے میں دیکھا کہ پرانا بابو آیا اور مجھے بھگا کر لے گیا۔ ہم بھاگ رہے ہیں اور پیچھے تھمے خاں آرہا ہے، اس کے ہاتھ میں وہی چاقو ہے جو اس نے ایک دفعہ پہلے بابو کو دکھایا تھا۔ ہم بھاگتے بھاگتے تھک گئے۔ پسینہ آگیا، رفتار گھٹ گئی۔ حتیٰ کہ تھمے خاں آپہنچا اور اس نے بابو کے پیٹ میں چاقو بھونک دیا۔ میری چیخ نکلی، آنکھ کھل گئی، لالو پنکھا جھل رہا تھا، میاں مجید کی حویلی سے ریڈیو کی آواز آرہی تھی، کوئی گا رہا تھا.....

سیاں سانورے بھئے بانورے،
وچن کرت نت جھوٹے

میری سمجھ میں خاک نہ آیا۔ کس کے سیاں، کہاں کے سیاں، کس کے وچن، کیسے وچن؟ یہ پیار کی باتیں گلنے سڑنے والی زندگیوں کے نصیب میں کہاں؟

گھبراہٹ دیکھ کر لالو نے پوچھا..... ''بی بی جی! کیا ہوا ہے؟''

میں نے چلّا کر کہا..... ''لالو! یہ تھمے خاں مجھے نہیں جینے دے گا، لالو! میرا گلا گھونٹ دو! اس تنگ گلی اور تنگ کوٹھڑی میں مجھ سے نہ رہا جائے گا۔''

میں بولتی چلی گئی ـــــ حرام زادہ، غنڈوں کو تین سو روپے دے کر مجھ اٹھوا لایا اور اب تین ہزار سے زیادہ مجھ سے کما چکا ہوگا۔ کہتا تھا ـــــ پہننے کو ریشمی کپڑے ملیں گے، رہنے کو عمدہ مکان ہوگا، سیر کے لیے موٹر تانگے ملیں گے، اچھے سے اچھا کھانا ملے گا، ٹھاٹھ ہی ٹھاٹھ ہوگا ـــــ کمینہ کہیں کا! پاپلین سے اوپر پہننے کو کپڑا نہیں دیتا، رہنے کو یہ گھناؤنی کوٹھڑی لے دی ہے، سینما تک

جانے نہیں دیتا، ڈاکٹر کے لیے ٹیکے کے دام تک دینے سے ہچکچاتا ہے، کتنا چیخی چلائی ہوں تب جا کر ٹیکے لگوانے کو تیار ہوا ہے، نہ لگواتی تو اب تک کوڑھ بھی ہو جاتا۔ کوئی مرے اس کی بلا سے۔ یہ دوسری نوچی لا بٹھاتا، میرا گوشت گھل رہا ہے اور یہ بغرے کا بغرا ہو رہا ہے، حرامی کے بدن پر کیسی چربی چڑھ رہی ہے، دن بھر بھنگ، چرس اور چانڈو کا نشہ کرتا ہے، جواء کھیلتا ہے، گھڑ دوڑ پہ جاتا ہے۔

میں بولتی چلی گئی اور بدن میں انگارے بھرتے گئے۔

لالو سمجھا یہ کُل بھوک نے کھلایا ہے۔ جب تک بھوک نہ مٹے گی غصہ کم نہ ہوگا۔ وہ جھٹ الماری کی طرف لپکا اور دو آم اٹھا لایا۔ نہ جانے وہ یہ آم کہاں سے لایا تھا۔ آموں کی طشتری میں چاقو رکھ کر انہیں میرے آگے دھر گیا اور بولا ——— ''بی بی جی! ابھی آم کھاؤ، روٹی بھی گرم کر کے لاتا ہوں۔''

میں نے کچھ جواب نہ دیا، الفاظ ختم ہو چکے تھے لیکن غصہ ابھی باقی تھا، کافی رات گزر گئی تھی، اگرچہ تھکن نہ رہی تھی لیکن ایسی توانائی بھی کہاں تھی، بہتے پانی کب لوٹتے ہیں اور پگھلتی ہوئی موم پھر کب جلی ہوئی بتی کا حصہ بنتی ہے۔ دن ڈھلنے لگا تھا اور چھاؤں بڑھنے لگی تھی، اس کا باعث نتھے خاں تھا، وہی مجھے موت کے گڑھے میں دھکیل رہا تھا۔ میرا رواں رواں چیخ رہا تھا، میری جان دُہائی دے رہی تھی، قاتل وار کیے جا رہا تھا لیکن دنیا اندھی، بہری اور گونگی تھی، شائد ساری دنیا نتھے خاں سے ڈرتی تھی۔ اس کا وہ چاقو آموں کی طشتری میں پڑا تھا جسے دکھا کر اس نے بیچارے بابو کو بھگا دیا۔ دنیا اس کے اس چاقو سے خوف زدہ تھی۔ قاتل کتنا آزاد تھا اور میں کتنی بے بس تھی۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ اژدھے کے بل پر لپٹی ہوئی گائے کو چھڑائے۔

میں نے غصے میں چیخ کر کہا——— ''نتھے خان حرامزادہ ہے۔'' یہاں تک کہ ایک زور کا طمانچہ میرے منہ پر آ لگا۔ نتھے خان سامنے کھڑا تھا، منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی، آنکھیں سُرخ تھیں، نشہ خوب چڑھا تھا، بدن لڑکھڑا رہا تھا۔

بولا..... حرامزادی! مجھے گالیاں دیتی ہے، جانتی نہیں میں کون ہوں؟ ٹانگیں چیر کر رکھ دوں گا۔''

اس نے فقرہ ختم کرتے ہی ایک اور طمانچہ رسید کیا۔ مجھے بڑا تاؤ آیا۔

میں نے کہا——— ''تو بدذات ہے، کمینہ ہے، ذلیل ہے، عورتوں کی کمائی کھاتا ہے اور حرام پر پیٹ پالتا ہے، تو انسان نہیں شیطان ہے۔''

اس نے طمانچے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن میں سرک کر ایک طرف ہٹ گئی، جانے کیسے میرا ہاتھ آموں کی طشتری تک گیا۔ میں نے چاقو پکڑا اور نتھے خاں کے پیٹ میں گھونپ دیا۔

نتھے خاں گر پڑا اور لالو بھاگ کر اس کے پیٹ سے چاقو نکالنے لگا۔

میں کوٹھڑی میں سے نکلی اور اپنے اڈے کی طرف بھاگی۔ وہاں تو اندھیرا ہو رہا تھا۔ ایسا لگا جیسے اندھیرے کا دیو کوٹھڑی کی کے اندر گھسا ہے۔ کرسی خالی پڑی تھی اور بڑی بھیا تک لگ رہی تھی۔ برابر والی کوٹھڑی سے چنو مستری اور پتلی جان کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔

میں نے چبوترے پر چڑھنا چاہا لیکن چکرا کر گر پڑی، پھر گلی بھر کے مکان مجھ پر آ گرے اور میں ان میں دب کر رہ گئی۔

OOO

دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم [illegible]
سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی اور دکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے، آوازیں مدھم تھیں، جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں، چپکے چپکے، دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں، ہولے ہولے لوگ قدم اٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اونچی آواز پیدا نہ ہو۔

مسعود بغل میں بستہ دبائے اسکول جا رہا تھا۔ آج اس کی چال بھی سست تھی۔ جب اس نے بے کھال کے تازہ ذبح کیے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید دھواں اٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھوئیں نے اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بن دیا۔ اس گرمی نے اسے راحت پہنچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فضا میں اُجلا پن نہیں تھا۔ روشنی تھی مگر دھندلی۔ کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی جس سے فضا میں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا اس لیے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب اسکول پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی خوشی نہ ہوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا۔ سب لڑکے خوش تھے جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بستے ایک جگہ رکھ کر اسکول کے صحن میں اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گئے تھے۔ کچھ آ رہے تھے اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اسے بالکل افسوس نہ ہوا۔ اس کا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ البتہ اس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہوا تھا تو ان کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی، اس لیے کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان میں چکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا۔ یہ سب باتیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں۔ سردی کی شدت اس کے کیچڑ سے لت پت کپڑے، سرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ جاتے تھے۔ ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر آ کر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ ـــــ یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا۔ چنانچہ جب اس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سنی تو اسے یہ بیتی ہوئی باتیں یاد آ گئیں اور اس نے سوچا، جب سکتر صاحب کا جنازہ اٹھے گا تو بارش شروع ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور ان کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ بلبلا اٹھیں گے۔

مسعود نے یہ خبر سن کر سیدھا اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنے ڈیسک کا تالہ کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اسے دوسرے روز پھر لانا تھیں، اس میں رکھیں اور باقی بستہ اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں اس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے دیکھے۔ ان میں سے ایک تو اب قصائی نے لٹکا دیا تھا۔ دوسرا تختے پر پڑا تھا۔ جب مسعود دکان پر سے گزرا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا، چھو کر دیکھے۔ چنانچہ آگے بڑھ کر اس نے انگلی سے بکرے کے اس حصے کو چھو کر دیکھا جو ابھی تک پھڑک رہا تھا۔ گوشت گرم تھا۔ مسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی۔ قصائی دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے جب اپنی ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سنائی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے ابا جی ان ہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں۔ اب گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ماں اور بڑی بہن۔ ماں باورچی خانہ میں بیٹھی سالن پکا رہی تھی اور بڑی بہن کلثوم پاس ہی ایک کانگڑی لیے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔

چونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے جس پر اسلامیہ سکول کے سکتر کی موت کا کچھ اثر نہیں پڑا تھا، اس لیے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔ چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ گھر میں اپنے ابا جی سے پڑھ چکا تھا۔ کھیلنے کے لیے بھی اس کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ایک میلا کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لوڈو اور اس قسم کے دوسرے کھیل جو اس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھیلتی تھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ سمجھ سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کو فطرتاً ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

بستہ اپنی جگہ رکھنے اور کوٹ اُتارنے کے بعد وہ باورچی خانہ میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور درباری کی سرگم سنتا رہا جس میں کئی دفعہ سارے گاما آتا تھا۔ اس کی ماں پالک کاٹ رہی تھی۔ پالک کاٹنے کے بعد اس نے سبز سبز پتوں کا گیلا گیلا ڈھیر اٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالک کو آنچ لگی تو اس میں سے سفید سفید دھواں اٹھنے لگا۔ اس دھوئیں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آ گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کہا: ''امی جان! آج میں نے قصائی کی دکان پر دو بکرے دیکھے، کھال اُتری ہوئی تھی اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا، بالکل ایسے ہی جیسا کہ صبح سویرے میرے منہ سے نکلا کرتا ہے۔''

''اچھا۔!'' یہ کہہ کر اس کی ماں چولہے میں لکڑیوں کے کوئلے جھاڑنے لگی۔

''ہاں اور میں نے گوشت کو اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔''

''اچھا۔'' یہ کہہ کر اس کی ماں نے وہ برتن اٹھایا جس میں اس نے پالک کا ساگ دھویا تھا اور باورچی خانہ سے باہر چلی گئی۔

''اور یہ گوشت کئی جگہ پھڑکتا بھی تھا۔''

''اچھا۔۔۔'' مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی، ''کیسے پھڑکتا تھا؟''

''یوں۔۔۔یوں۔'' مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

''تو پھر کیا ہوا؟''

یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے کچھ اس طور پر نکالا کہ مسعود ایک لحظے کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔

''پھر کیا ہونا تھا، میں نے تو ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا۔۔۔ گرم تھا۔''

''گرم تھا۔۔۔ اچھا مسعود یہ بتاؤ تم میرا کام کرو گے؟''

''بتائیے''

''آؤ، میرے ساتھ آؤ۔''

''نہیں آپ پہلے بتائیے کام کیا ہے۔''

''تم آؤ تو سہی میرے ساتھ۔''

''جی نہیں ـــــ آپ پہلے کام بتایئے۔''
''دیکھو میری کمر میں درد ہو رہا ہے ـــــ میں پلنگ پر لیٹتی ہوں، تم ذرا پاؤں سے دبا دینا ـــــ اچھے بھائی جو بھی ہوئے ـــــ اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے۔'' یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع کر دیں۔
''یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے۔ جب دیکھو درد ہو رہا ہے، اور پھر آپ دبواتی بھی مجھی سے ہیں۔ کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں۔'' مسعود اٹھ کھڑا ہوا۔
''چلیے، لیکن میں یہ آپ سے کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا۔''
''شاباش ـــــ شاباش۔'' اس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سرگموں کی کاپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔
صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ مٹیالے بادل جھکے ہوئے تھے۔
''مسعود، آج ضرور بارش ہوگی ـــــ''
یہ کہہ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔
جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا، ''دیکھیے باجی، گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دوں گا۔''
''بہت اچھا، لیکن تم اب خدا کے لیے زیادہ نخرے نہ بگھارو۔ ادھر میرے پلنگ پر آ کر جلدی کمر دباؤ ورنہ یاد رکھو بڑے زور سے کان اینٹھوں گی۔'' کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی۔
مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی اور دیوار کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دبانا شروع کر دی۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا، جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔
کلثوم کے کولھوں پر گوشت زیادہ تھا۔ جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اس نے قصائی کی دکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا۔ اس احساس نے چند لمحات کے لیے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کیے جن کا کوئی سر نہ تھا نہ پیر۔ وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی خیال مکمل نہیں ہوا تھا۔
ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے۔ اسی قسم کی حرکت جو اس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی۔ اس نے بڑی بددلی سے کمر دبانا شروع کی تھی مگر اب اسے اس کام میں لذت محسوس ہونے لگی اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ یہ بھنچی بھنچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی اس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔
ٹائم پیس میں گیارہ بج گئے مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دباتا رہا۔ جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی۔
''شاباش مسعود، شاباش۔ اور اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبا دو، بالکل اسی طرح ـــــ شاباش میرے بھائی۔''
مسعود نے دیوار کا سہارا لے کر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں سی تڑپ گئیں۔ بے اختیار ہنس پڑی اور دُوہری ہو گئی۔ مسعود گرتے گرتے بچا، لیکن اس کے تلوؤں میں مچھلیوں کی وہ تڑپ منجمد سی ہو گئی۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لے کر اپنی بہن کی رانیں دبائے۔ چنانچہ اس نے کہا، ''یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا۔ سیدھی لیٹ جایئے، میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔''
کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں اِدھر اُدھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی اس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا۔

''نا بھائی ـــ میرے گدگدی ہوتی ہے۔ تم اوٹ پٹانگ طریقے سے دباتے ہو۔''

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے۔

''نہیں اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا ـــ آپ اطمینان رکھیے۔ اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔''

دیوار کا سہارا لے کر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہو گیا۔ ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اس نے اپنے پیر چلانے شروع کیے۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسّے پر ایک بازی گر کو دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازی گر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسّا اسی طرح پھسلتا ہوگا۔

اس سے پہلے کئی بار اس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو کہ اسے اب محسوس ہو رہی تھی پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا کلثوم کو اگر ذبح کر دیا جائے تو کھال اُتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟ لیکن ایسی بے ہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

''بس۔ بس۔'' کلثوم تھک گئی۔ ''بس۔ بس۔''

مسعود کو ایک دم شرارت سوجھی۔ وہ پلنگ پر سے نیچے اُترنے لگا تو اس نے کلثوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی کرنا شروع کر دی۔ ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے۔ لیکن جب اس نے ارادہ کر کے اس کے لات جمانی چاہی تو مسعود اچھل کر زد سے باہر ہو گیا اور سلیپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔ بادل اور بھی جھک آئے تھے۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کیے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے۔ مسعود کا جسم ایک دلنواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا اس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھرجھری سی اس کے بدن میں لہر اُٹھی۔ سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پَر پھلائے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ گل داؤدی اور نازبو کے ہرے ہرے پتے اوپر لال لال گملوں میں نہا رہے تھے۔ فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں۔ ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے اردگرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا جس کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ان باتوں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا مگر اس کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا۔ پھر بھی ایک گمنام سا مزا اس سوچ بچار میں اُسے آ رہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہو گئے اور دبانے سے ان پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کس لیں اور ان کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی مگر وہ نم آلود ہو گئے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے لیے وہ باورچی خانہ میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا، ابھی اس نے پہلا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آ گیا۔ باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔ بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی۔ مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے جہاں اس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی شیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا جس کے باعث اس کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی سی ذھن پیدا ہو گئی۔

میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی۔ اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی، ''کون؟''

''جی کھیل رہا ہوں۔''

''کھیلو......'' پھر تھوڑے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا، ''تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے...... زیادہ شور نہ مچانا۔''

یہ سن کر مسعود نے گیند وہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لیے سامنے والے کمرے کا رُخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نیم وا۔ مسعود کو ایک شرارت سوجھی۔ دبے پاؤں وہ نیم وا دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹ کھول دیئے۔ دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس پاس لیٹی تھیں، خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔

بملا کے بازو کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی۔

مسعود کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس کے دماغ میں دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے اُلٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اسے دفعتاً اپنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا جس نے کچھ دیر کے لیے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔

بیٹھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا اور زیادہ زور لگانے پر ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ جائے گا۔ اس نے گھٹنے پر ہاکی کے ہینڈل میں خم پیدا تو کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ جب وہ تھک کر ہار گیا تو جھنجھلا کر اس نے ہاکی پرے پھینک دی۔

OOO

کوشش کے باوجود جب وہ ناکام رہا تو اس نے کار کو اسٹارٹ کرنے لگا مگر کار اسٹارٹ نہ ہوئی۔
جب وہ ہر کوشش کے باوجود بھی کار اسٹارٹ نہ کر سکا تو مجبوراً اتر کر نیچے آ گیا۔ ایک بار وہ پھر ڈرتے ڈرتے خون میں ڈوبے ہوئے آدمی کے پاس گیا، اب اس نے کراہنا بند کر دیا اور آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ درّانی اس کے قریب وحشت زدہ سا کھڑا سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ کئی بار اس نے سوچا کہ کار چھوڑ کر وہاں سے پیدل ہی بھاگ کھڑا ہو مگر وہ ایسا نہ کر سکا اس لیے کہ کار کی موجودگی اس کے خلاف پورا پورا ثبوت بہم پہنچا سکتی تھی۔
کوئی پندرہ منٹ بعد سڑک پر موٹر کی روشنی جھلکتی نظر آئی۔
ذرا ہی دیر بعد ایک ٹرک کھڑکھڑاتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ اس نے اپنے حواس درست کیے۔ آگے بڑھ کر ٹرک کو رکوایا اور ڈرائیور کے قریب جا کر کہنے لگا۔
''ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ مجھ کو فوراً تھانے لے چلو۔''
ٹرک کے اندر ڈرائیور کے ہمراہ ایک آدمی اور بیٹھا تھا۔ دونوں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ ان کے سامنے خون میں لتھڑا ہوا ایک کالا کلوٹا آدمی پڑا تھا۔ ذرا آگے بڑھ کر ایک موٹر کھڑی تھی جس کا اگلا حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ڈرائیور نے گھبرا کر پوچھا۔
''بڑا زبردست ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ کیا ایک دم سامنے آ گیا تھا؟''
درّانی تیزی سے بولا۔ ''باتیں کرنے کا وقت نہیں۔ مجھ کو جلدی لے چلو۔''
وہ جھٹ سے ٹرک پر چڑھ گیا اور ٹرک شور مچاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ تھانہ وہاں سے کوئی میل بھر دور تھا۔ درّانی ٹرک سے اتر کر سیدھا تھانہ کے اندر چلا گیا۔ رات کی ڈیوٹی پر جو سب انسپکٹر تعینات تھا دروازے ہی پر اس کی درّانی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ اس وقت گشت پر جا رہا تھا۔ درّانی نے اس کو علیحدہ لے جا کر حادثہ کی نوعیت بتائی۔ دو سو روپے زبردستی اس کی جیب میں ڈالے اور ذرا اطمینان ہو گیا تو اس کو لیے ہوئے ڈیوٹی روم میں پہنچا۔ چھوٹے بھائی کو ٹیلی فون پر ہدایت کی کہ وہ اسٹیشن ویگن لے کر فوراً تھانہ آ جائے۔
آدھا گھنٹہ کے اندر اندر اسٹیشن ویگن تھانہ پر موجود تھی۔ درانی اور سب انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ہمراہ اس میں سوار ہو کر موقعہ واردات کی طرف چل دیے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو سڑک اسی طرح سنسان پڑی تھی۔ وہ آدمی خاک پر بے سدھ پڑا تھا۔ سب انسپکٹر نے اس کے جسم کو چھو کر دیکھا۔ ابھی تک وہ زندہ تھا۔ البتہ بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ زخمی کو اسٹیشن ویگن میں ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا۔
رات کے پچھلے پہر جب درّانی گھر پہنچا تو بے حد تھکا ہوا تھا۔ ہسپتال سے اس کو یہ رپورٹ مل ہی چکی تھی کہ زخم مہلک نہیں

آ ئے ہیں۔ البتہ ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ کر چکنا چور ہوگئی تھی۔ لہٰذا وہ ایکسیڈنٹ سے بے نیاز ہو کر اس وقت صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کار کو جو نقصان پہنچا ہے اس کے عوض بیمہ کمپنی سے کس طرح پانچ ہزار کی رقم وصول کی جائے۔ وہ دیر تک بستر پر پڑا اس کے متعلق اسکیم بنا تا رہا۔

یہ تو پتہ نہیں کہ پولیس کے روز نامچے میں حادثہ کی کیا رپورٹ درج کی گئی البتہ بعض اخبارات میں اس ایکسیڈنٹ کے متعلق جو خبریں شائع ہوئیں۔ ان سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اس آدمی کا نام عبداللہ تھا۔ رکشا چلایا کرتا تھا۔ حادثہ کی رات وہ مالک کو رکشا واپس کر کے گھر لوٹ رہا تھا۔ نکلسن روڈ کے موڑ پر وہ ایک تیز رفتار کار کی زد میں آ گیا۔ زخم ایسا کاری لگا تھا کہ وہ اسی وقت بے ہوش ہو گیا۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھا۔

عبداللہ ڈیڑھ ماہ تک سرجیکل وارڈ میں پڑا رہا۔ جس روز اس کو ہسپتال سے چھٹی ملی تو اس کو وہاں لینے صرف اس کی بیوی آئی تھی۔ کالا کلوٹا عبداللہ جس کی ایک ٹانگ کٹ چکی تھی اور جس کی چودہ سالہ لڑکی ایک دوسرے رکشا والے کے ساتھ فرار ہوگئی تھی۔ اور جواب بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا جسم کبڑوں کی طرح جھک گیا تھا۔

اب وہ تمام دن کوٹھڑی میں پڑا کھانستا رہتا۔ بات بات پر بیوی سے لڑ پڑتا۔ اس کو بے تحاشا گالیاں دیتا اور مارنے کی دھمکیاں دیا کرتا۔ اس کا رنگ اور سیاہ ہو گیا تھا۔ داڑھی بڑھ کر بے ترتیب ہو گئی تھی۔ آنکھوں سے ہر وقت وحشت برسا کرتی۔ اس کا چہرہ روز بروز خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ ملنے جلنے والے جو از راہ ہمدردی کبھی کبھی اس کے پاس آ کر گھڑی دو گھڑی بیٹھ جاتے تھے۔ اب وہ بھی اس سے کترانے لگے تھے۔

عبداللہ جس محلہ میں رہتا تھا اور اس کی آبادی زیادہ تر نچلے طبقہ کے افراد پر مشتمل تھی۔ بستی میں ہر طرف جھکی ہوئی چھتوں والے نیم پختہ مکانات تھے۔ چند قدیم وضع کی عمارتیں تھیں جو امتدادِ زمانہ سے کھنڈر بن گئی تھیں۔ درمیان میں انگریزوں کا پرانا قبرستان تھا جس کے چاروں طرف پختہ دیواریں تھیں۔ قبرستان پر ایک اونچی سی لاٹ تھی جس پر سنگ مرمر کا ایک کتبہ آویزاں تھا یہ کسی کرنل کی قبر تھی جس کی تمام زندگی میدانِ جنگ میں غنیم سے لڑنے میں گزری تھی۔ مگر اس کی موت خودکشی سے واقع ہوئی تھی۔ محلہ بھر میں مشہور تھا کہ مرنے کے بعد کرنل بھوت بن گیا ہے۔ اکثر سنسان راتوں میں ان لوگوں نے اس کو گلیوں میں منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ جب کبھی بھی وہ کسی کو نظر آیا تو اس کی زبان پر ایک ہی سوال ہوتا۔ ''مکھن ٹوش۔'' خدا معلوم اس کی اس طلب کا کیا پس منظر تھا البتہ اتنا ضرور ہے کہ جس کسی سے بھی اس کی مڈبھیڑ ہوئی اس نے ہمیشہ یہی آواز سنی۔ اور یہ آواز اتنی خوفناک ہوتی کہ اچھے بھلے جی دار آدمی کے اوسان خطا ہو جاتے اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا۔ یہی وجہ تھی کہ قبرستان کے احاطہ کے ساتھ ساتھ جو پتلی سی گلی جاتی رات گئے راہ گیر اس سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

اس کے علاوہ محلہ کی دوسری خصوصیت سکینہ بیگم تھیں جن کے شوہر لاکھوں روپے کی جائیداد چھوڑ کر مرے تھے۔ صرف ایک لڑکا تھا وہ بھی چند سال ہوئے کہ گھر سے روٹھ کر چلا گیا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس نے ماں سے ارہر کی کھچڑی کی فرمائش کی تھی۔ سکینہ بیگم کی اس روز طبیعت کچھ ناساز تھی۔ باورچی نے کچھ توجہ نہ دی۔ دسترخوان پر کھچڑی نہ پا کر صاحب زادے اس قدر برافروختہ ہوئے کہ بغیر کچھ کھائے دسترخوان سے اٹھ گئے اس کے بعد اس کو کسی نے نہیں دیکھا۔ البتہ کچھ عرصہ بعد یہ اطلاع ملی کی وہ ٹرین کے حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ اس بات کے کئی عینی گواہ تھے مگر سکینہ بیگم کسی طرح اس بات کو ماننے پر رضامند نہ تھیں۔ اگر کوئی ایسی بات کہتا بھی تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتیں۔ ایک سانس میں ہزاروں کوسنے دے ڈالتیں۔ لہٰذا سب نے اس حقیقت کا ان سے اظہار ہی کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ بعض عورتوں نے ان کو ٹھگنا شروع کر دیا وہ آئے دن کوئی نت نیا قضیہ گھڑ لاتیں اور ان سے کچھ نہ کچھ اینٹھ کر لے جاتیں۔ ہر تہوار پر وہ اپنے بیٹے کا نیا جوڑا سلواتیں، خاندان کی ہر خوبصورت لڑکی کے لیے اپنے بیٹے کا پیغام دیتیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مشاطائیں بلواتیں اور ان کے ذریعہ بہو تلاش کرواتیں۔ کوئی پوچھتا تو مسکرا کر کہتیں۔ ''بس آنے ہی والا ہے۔ ابھی کل ہی تو ایک شخص آیا تھا جس سے اس نے میری خیریت دریافت کروائی ہے۔'' کبھی کبھی وہ اس کے خط کا بھی حوالہ دیتیں اور پھر مزے لے لے کر خواہ مخواہ ایک طویل طویل قصہ سنا ڈالتیں۔ ہر روز وہ اس کے آنے کا

انتظار کرتیں۔ ہر شام ارہری کی کھچڑی تیار ہوتی اور صبح باسی ہو جاتی جس سے محلّہ کے کسی مسکین کا پیٹ پل جاتا۔ کئی سال سے یہی سلسلہ چل رہا تھا۔ جب سے عبداللہ ایک ٹانگ سے معذور ہوا تھا اس کھچڑی میں سے اس کو بھی حصہ مل جاتا۔ سویرے ہی سویرے اس کی بیوی بارہ دری کی ڈیوڑھی پر پہنچ جاتی اور جب واپس لوٹتی تو دونوں میاں بیوی کے لیے ایک وقت کے کھانے کا بندوبست ہو جاتا۔

عبداللہ کے دن اسی طرح کٹ رہے تھے اتفاق سے اس کی بیوی بیمار پڑ گئی۔ طبیعت اچانک کچھ ایسی گڑ بڑ ہوئی کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہوگئی۔ عبداللہ کو متواتر کئی روز فاقہ کرنا پڑا۔ آخر جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو ایک روز رات گئے اس نے بیسا کھی سنبھالی اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دسمبر کا مہینہ تھا آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ سرِ شام ہی سے محلّے میں سناٹا پڑ گیا۔ عبداللہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قبرستان سے ملحق تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوا تو اس کی دھندلی روشنی میں آدمی کا سایہ نظر آیا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ عبداللہ وہیں ٹھہر گیا۔ جب وہ قریب آیا تو عبداللہ نے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ وہ آدمی ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے عبداللہ کے چہرے کی جانب دیکھا اور ایکبارگی اس کی گھگھی بندھ گئی۔ پھر وہ حلق کے اندر سے نہ جانے کیسی کیسی آوازیں نکالتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ میں دیا ہوا ایک بنڈل بھی گر پڑا۔

عبداللہ خود بھی گھبرا گیا۔ لمحہ بھر تک وہ سکتہ کے سے عالم میں کھڑا رہا پھر اس نے بڑھ کر بنڈل اٹھایا۔ کھول کر دیکھا۔ گرم گرم امرتیاں تھیں۔ عبداللہ کی باچھیں کھل گئیں۔ فوراً ہی گھر پہنچا۔ دونوں میاں بیوی نے مزالے کر امرتیاں کھائیں اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

دوسرے روز رات کو عبداللہ پھر گلی میں پہنچا اس وقت کچھ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ سردی اور بڑھ گئی تھی۔ وہ دیر تک گلی میں کھڑا رہا مگر کوئی بھولے سے بھی اس طرف نہیں گزرا۔ سردی کے مارے اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ آخر جب وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ رہا تھا تو اچانک ایک مونگ پھلی بیچنے والا گلی میں داخل ہوا۔ عبداللہ نے اس کے قریب جا کر بجائے ہاتھ پھیلانے کے ناک میں منمنا کر کہا۔

''ذرا ٹھہر جانا بھائی!''

عبداللہ کا ہیبت ناک چہرہ، بھوتوں کا سا لہجہ اور سنسان رات۔ اس آدمی پر کچھ ایسا خوف طاری ہوا کہ کئی لمحہ تک تو وہ آنکھیں پھاڑے چیخنے کی بے سود کوشش کرتا رہا اور پھر بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑا۔ عبداللہ نے اطمینان سے چادر میں سوا سیر مونگ پھلیاں باندھیں اور چُپ چاپ گھر آ گیا۔

ان دو واقعات سے محلّہ بھر میں سنسنی پھیل گئی۔ لوگوں میں چرچا ہونے لگا کہ کرنل کا بھوت اب راہگیروں کو بہت پریشان کرنے لگا ہے۔ پاس پڑوس کے رہنے والوں پر خاصی دہشت طاری ہوگئی تھی۔ عبداللہ نے اس خوف سے اور بھی فائدہ اٹھایا جب راستے سنسان پڑ جاتے تو وہ چپ چاپ گلی کے اندھیرے میں دبک کر کھڑا ہو جاتا۔ ادھر کوئی راہگیر گلی میں داخل ہوا اور وہ اس کی تاک میں لگ گیا۔ قریب آتے ہی وہ بڑی ہیبت ناک آواز میں کہتا۔ ''مکھن نوش۔'' اب اس نے باقاعدہ کرنل کے بھوت کا روپ اختیار کر لیا تھا اور اس کا یہ حربہ کارگر بھی ثابت ہوا۔ پہلے وہ صرف کھانے پینے کی چیزوں پر اکتفا کر لیتا تھا پھر ایسا بھی ہوا کہ اگر آدمی بے ہوش ہو جاتا تو وہ اس کی جیبیں ٹٹول کر ساری نقدی اپنے قبضہ میں کر لیتا۔

محلّہ میں کرنل کے بھوت کا چرچا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگوں میں خوف و ہراس زیادہ پھیل گیا تھا ادھر عبداللہ اپنے کام میں اتنا منجھ گیا تھا اور اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اکثر تو وہ چھپ کر آدمی کو دبوچ بھی لیتا تھا کسی کو صرف قہقہہ لگا کر خوفزدہ کر دیتا۔ کسی کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ کسی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا جیسا موقعہ ہوتا وہ اسی مناسبت سے نیا حربہ استعمال کرتا۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ راہگیروں نے رات کو قبرستان کے پاس والی گلی سے بالکل گزرنا چھوڑ دیا۔ مگر عبداللہ پر اس کا بھی اثر نہ ہوا۔ اس نے گلی سے باہر نکل کر سنسان راتوں کے اندھیرے میں راہگیروں سے اپنا ''ٹیکس'' وصول کرنا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ بھی ایک مدت تک چلتا رہا۔

تلاش میں مارا مارا پھرتا۔

اتفاق ہوا کہ عبداللہ کو کئی روز تک کوئی شکار نہیں ملا۔ اس کی بیوی نے سکینہ بیگم کے گھر ایک مدت سے آمدورفت بند کر دی تھی لہٰذا دونوں کو مسلسل کئی وقت کے فاقے کرنے پڑے۔ اس رات عبداللہ بڑی بے چینی کے عالم میں اندھیری گلیوں میں منڈلا رہا تھا رات آدھی سے زیادہ گزر گئی مگر کوئی بھولا بھٹکا راہگیر اس کو نہیں ملا۔ اس کی بے چینی اور بڑھ گئی، اس لیے کہ اب رات کی وہ گھڑی قریب آ رہی تھی جب صرف گشت کرنے والے کانسٹیبلوں کے بھاری بھاری قدموں کی آہٹ سنائی پڑتی اور جن کی نظروں سے بچنے کے لیے اس کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ آخر جب وہ ناامید ہو گیا تو اس نے ایک نئی تجویز سوچی۔ کئی مکانوں کے دروازوں سے کان لگا کر اس نے اندر کی آہٹ لی اور پھر ایک دروازہ پر جا کر آہستہ سے دستک دی لیکن اس وقت وہ خود بھی خوف سے کانپ رہا تھا اس لیے کہ اس دفعہ وہ نیا حربہ آزما رہا تھا۔ جو بے حد خطرناک تھا۔ وہ کرتا بھی کیا۔ اس وقت اس کے علاوہ اور چارہ کار بھی نہ تھا۔

اس نے رک رک کر کئی بار دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد کسی نے اندر سے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''کون''

عبداللہ نے آہستہ سے کہا ''دروازہ کھولو۔''

فوراً ہی دروازہ کھل گیا کسی نے اندر سے جھانک کر پوچھا ''کون ہے سامنے آؤ۔'' عبداللہ اندھیرے سے نکل کر ایک دم اس کے سامنے آ گیا اور خوفناک آواز میں بولا۔

''مکھن نُوش۔''

اس آدمی کی سٹی گم ہو گئی۔ گلا پھاڑ کر بولا ''باپ رے باپ۔''

عبداللہ نے اس دفعہ اور بھی بھیانک آواز میں کہا۔ ''مکھن نُوش''

وہ آدمی یکبارگی چلّانے لگا۔ ''بھوت۔ بھوت۔''

اپنے سابقہ تجربہ کے پیش نظر عبداللہ کو اب وہاں سے کھسک جانا چاہیئے تھا لیکن وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ دروازے پر کھڑا رہا۔ اس نے سوچا کہ اب تو یہ خوف زدہ ہو چکا ہے ایک وار اور کروں گا تو بے ہوش ہو کر گر ہی پڑے گا۔ اس نے انتہائی خوفناک لہجہ میں حلق سے آواز نکالی۔

''ماکھان نُوش۔''

اس آدمی پر عبداللہ کو اس خوفناک آواز کا یہ اثر ہوا کہ وہ اور بھی وحشت ناک طریقہ پر چیخنے لگا۔ کمرے کے اندر کچھ اور لوگ بھی سو رہے تھے۔ پہلے تو وہ بیدار ہوئے، ذرا دیر سہمے پڑے رہے پھر سب خوف زدہ ہو کر چیخنے لگے۔

''بھوت۔ بھوت''

اتنی بہت سی آوازوں کا شور سن کر عبداللہ بھی گھبرا گیا۔ وہ فوراً ہی دروازہ پر سے ہٹ آیا اور کسی نہ کسی طرح قبرستان کے پاس والی تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ اب آس پاس کے مکانوں میں لوگ جاگ اٹھے تھے۔ کچھ دروازوں سے نکل کر باہر آ گئے تھے۔ کچھ اونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔ عبداللہ نے دیکھا گلی کے دونوں سروں پر ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔ آگے جانے کے بجائے وہ اندھیرے میں دیوار سے چمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ کئی سیکنڈ تک وہ اسی عالم میں کھڑا رہا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اچانک کوئی تیزی سے آ کر اس سے ٹکرایا اور پھر ''بھوت۔ بھوت'' کہتا ہوا سرپٹ بھاگا۔

اس کے بعد ایک بارگی بہت ملی جلی آوازیں ابھریں۔

عبداللہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اچانک ایک پتھر اس کے داہنے کندھے پر آ کر زور سے لگا۔ یہ ابتداء تھی۔ اس کے بعد تو چاروں طرف سے پتھر آ کر گلی میں گرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔

''گلی میں بھوت ہے۔''

''وہ دیکھو! کچھ نظر آ رہا ہے۔''

اس کے بعد ''بھوت۔ بھوت'' کا نعرہ پھر بلند ہوا اور پتھروں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ پتھر برابر آ کر اس کے جسم پر لگ رہے تھے اور ایک پتھر تو اس زور سے اس کے ماتھے پر لگا کہ وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت ایک دوسرا پتھر اس کی کن پٹی پر لگا اور عبداللہ نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔

قریب ہی ایک بدرو تھا عبداللہ نے سوچا کہ کسی طرح اگر وہ اس میں داخل ہو جائے تو وہ اس سنگ باری سے بچ جائے گا یہی طے کر کے وہ گھسٹتا ہوا بدرو کی طرف کھسکنے لگا۔ اچانک ایک بڑا سا پتھر اس کے سر پر آ کر گرا اور عبداللہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ پھر ایک بارگی وہ گلا پھاڑ کر چیخا۔

''ہائے مرا۔''

اس کے بعد عبداللہ کئی بار چیخا کئی بار اس نے التجا کی لیکن دوسری طرف اس قدر شور تھا کہ کوئی اس کی آواز نہ سن سکا۔ پتھر برابر چلتے رہے۔ لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے رہے وہ اس وقت کرنل کے بھوت کو سنگسار کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح چلا رہے تھے اور گلی کے اندر بے تحاشا پتھر برسا رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کا شور بڑا خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔

دوسرے دن محلّہ والوں نے دیکھا۔ گلی کے بیچوں بیچ ایک بے حد غلیظ آدمی منہ اوندھائے پڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم کے ہر حصہ پر کالا کالا خون بہہ کر جم گیا تھا۔ اس کا چہرہ بدرو کے اندر تھا اور کیچڑ میں لت پت۔ یہ عبداللہ تھا جو رات ہی کو مر گیا۔

ooo

غلام عباس

نواب صاحب کا بنگلہ

گلابی جاڑوں کی ایک رات کوئی تین بجے کا عمل ہوگا کہ اچانک صمصام الدولہ کی آنکھ کھل گئی۔ انھیں ڈرائنگ روم میں ،جوان کے کمرے سے ملا ہوتھا، کچھ کھڑکا سنائی دیا تھا۔ پہلے انھوں نے سوچا کہ تیز ہوا سے کوئی چیز گر پڑی ہوگی، مگر پھر یاد آیا کہ ڈرائنگ روم کے سارے دروازے اور کھڑکیاں انھوں نے خود ہی تو بند کی تھیں۔ گھر میں کوئی پالتو جانور بلی یا کتا بھی نہ تھا جس سے گمان ہوتا کہ اس کے دوڑنے بھاگنے سے کوئی چیز گر پڑی ہوگی۔ وہ کچھ فکر مند سے ہو کے بستر سے اٹھ بیٹھے۔ شب خوابی کے لباس پر گون پہنا، پھر کمرے کے ایک کونے سے اپنی چاندی کی موٹھ والی چھڑی اٹھائی اور نواب بیگم کو جگائے بغیر جو گہری نیند میں مدہوش ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھیں، وہ دبے پاؤں ڈرائنگ روم کی طرف چل دیے۔

نواب صمصام الدولہ کی عمر کوئی پچپن برس کی ہوگی۔ تھے تو چھوٹے سے قد کے، مگر ہاتھ پاؤں میں بڑا کس بل تھا۔ سرخ وسفید رنگت، بڑی بڑی روشن آنکھیں، کڑ بڑی مونچھیں، کتابی چہرہ جس سے شکوہ، بردباری اور حلم ٹپکتا تھا۔

نواب صاحب ڈرائنگ روم کے دروازے کے قریب پہنچ کے ذرا رک کے اور پردے کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ جب انھیں کوئی آہٹ سنائی نہ دی اور نہ اندھیرے میں کوئی سایہ چلتا پھرتا دکھائی دیا تو انھوں نے کمرے میں داخل ہو کے بجلی کا بٹن دبا دیا۔ بجلی کی روشنی میں انھوں نے دیکھا کہ کمرا تو خالی پڑا ہے۔ البتہ ایک چھوٹی سی تپائی گری پڑی ہے اور اس پر پیتل کا جو خاکستر دان رکھا تھا وہ فرش پر اوندھا پڑا ہے۔ البتہ ایک یقین ہو گیا کہ بنگلے میں ضرور کوئی چور آ گھسا ہے۔ وہ بڑی دلیری کے ساتھ چور کی تلاش میں بنگلے کے ایک ایک کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ بنگلے میں ڈرائنگ روم کے علاوہ چار بیڈ روم تھے۔ ان میں سے ایک کو تو نواب صاحب اور نواب بیگم خود اپنے تصرف میں لاتے تھے اور باقی تین بند پڑے تھے۔ کیوں کہ ان کا اکلوتا صاحب زادہ مدت ہوئی کاروبار کے سلسلے میں کسی دور دراز ملک میں جا کر وہیں کا ہو رہا تھا اور دونوں صاحب زادیاں شادی کے بعد اپنے اپنے شوہر کے گھر آباد ہو گئی تھیں۔ بنگلے میں اب فقط نواب صاحب اور بیگم رہتے تھے۔ کوئی مستقل ملازم بھی نہ تھا، بس ایک چھوکرا تھا جو دن بھر ادھر اُدھر کے کام کر کے شام کو اپنے گھر چلا جاتا تھا۔

نواب صاحب بڑی کفایت شعاری سے گزر بسر کرتے تھے، نہ موٹر تھی نہ بگھی گھوڑا۔ پھر بھی ان کا شمار معززین شہر میں ہوتا تھا اور انھیں اکثر شہری تقریبات میں شمولیت کے لیے دعوت نامے آیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ ان کی اعلیٰ نسبی، خاندانی وجاہت اور ذاتی شرافت تھی۔ انھیں فخر تھا کہ ان کا شجرۂ نسب کئی واسطوں سے نادر شاہ افشار سے جا ملتا ہے۔ ان دنوں وہ کچھ چپ چپ سی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے موجودہ مشاغل کا کسی کو علم نہ تھا اور نہ ہی کوئی ان کی آمدنی کا ٹھیک ٹھیک حال جانتا تھا۔ بعض کہتے تھے کہ انھیں اپنی زمینوں سے خاصی رقم مل جاتی ہے، بعض کہتے تھے کہ ان کا صاحب زادہ دوسرے تیسرے مہینے ایک خطیر رقم انھیں بھیجتا رہتا ہے۔ وہ طبعاً کم آمیز اور تنہائی پسند تھے۔ نہ کسی سے ملتے جلتے نہ کوئی ان سے ملنے آتا۔ بس اپنے بنگلے کی چار دیواری میں وہ اپنا خاندانی نام سینے سے لگائے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کیے جا رہے تھے۔

نواب صاحب نے تینوں بیڈ روم ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے، مگر انھیں چور کہیں نظر نہ آیا۔ باورچی خانہ بھی خالی پڑا تھا۔ وہ توشہ خانے کے پاس پہنچے۔ اس کا دروازہ کھولنا چاہا تو اندر سے بند پایا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ چور اسی کے اندر ہے۔ انھوں نے چھڑی سے دروازہ ٹھوک کر تحکمانہ لہجے میں کہا، ”اندر کون ہے؟“

چند لمحے خاموشی رہی۔ انھوں نے دروازہ پھر ٹھوکا، ”تم جو کوئی بھی ہو فوراً دروازہ کھول کر باہر آ جاؤ۔“ اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ نواب صاحب نے بہت ڈانٹ کر کہا، ”دیکھو! اگر تم ایک منٹ کے اندر باہر نہ نکل آئے تو میں باہر سے دروازہ بند کر کے پولیس کو خبر کر دوں گا۔“

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر نواب صاحب نے تیز روشنی میں چور کا چہرہ غور سے دیکھا تو انہیں کسی ندامت یا بدکرداری کے آثار نظر نہیں آئے، نہ خوف یا گھبراہٹ کا نشان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی اور ہونٹوں پر خفیف سا تبسم، وہ بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: "آپ بھی تشریف رکھیے تو یہ ناچیز اپنا تعارف کرائے۔"

نواب صاحب کچھ مبہوت سے ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

"اس خاکسار کو بشیر علی کہتے ہیں۔ اردو میں اچھی خاصی اور انگریزی میں معمولی شدبد رکھتا ہوں۔ افسوس کہ میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔"

"میاں صاحب زادے۔" نواب صاحب نے اس کی بات کاٹ کر کہا: "یہ باتیں تو بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں آئے کس لیے ہو؟"

چور نے بڑی بے باکی سے کہا: "آیا تو میں چوری کی نیت ہی سے تھا مگر میں نے سخت دھوکا کھایا۔"

"دھوکا کھایا؟ کیسا دھوکا؟"

میں نے یہ بنگلہ دوسرے بنگلوں سے الگ تھلگ اور ذرا اسنسان جگہ دیکھ کر چوری کے لیے تاکا تھا۔ پھر بنگلے کے باہر آپ کے نام کا جو بورڈ لگا تھا، نواب صمصام الدولہ تہوّر یار جنگ بہادر، اس نے بھی میرے لیے بڑی کشش پیدا کر دی۔ پھر میں نے یہ دیکھا کہ یہاں نہ تو کوئی چوکیدار ہے، نہ نوکر چاکر۔ بس آپ اور آپ کی بیگم ہی رہتی ہیں۔ یہ بات بھی چوری کے لیے بڑی سازگار تھی۔ چنانچہ جب آدھی رات گزر گئی تو میں بڑی امیدیں لیے ہوئے دیوار پھاند کر آپ کے بنگلے میں داخل ہو گیا، لیکن نواب صاحب! یقین جانیے یہاں قدم رکھنے کے دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی حماقت اور انتہائی ناتجربے کاری کا احساس ہو گیا۔"

"وہ کیوں کر؟"

"وہ یوں نواب صاحب! بے تکلفی معاف کہ یہ بنگلہ سراسر ایک فریب ہے، ایک دھوکا ہے۔ اس بنگلے میں کوئی ایک چیز بھی تو ایسی نہیں جو چرانے کے قابل ہو۔ ذرا اس ڈرائنگ روم ہی پر نظر ڈالیے۔ یہ دقیانوسی صوفہ سیٹ، یہ پرانا قالین، جس میں جگہ جگہ سوراخ ہیں، یہ پرانی گول میز، یہ بے ڈھنگی تپائیاں جن کا روغن اتر چکا ہے، دیوان پر یہ میلا سا پلنگ پوش بچھا ہے۔ یہ پرانے مخملی گاؤ تکیے، یہ بوسیدہ پردے۔ بھلا کوئی چور انھیں چرانے کی حماقت کر سکتا ہے اور اگر کر بھی لے تو ان کو اٹھا کے لے کہاں جائے گا۔ چوروں کو، نواب صاحب! جس چیز سے دلچسپی ہوتی ہے، وہ اول تو ہے نقدی۔ اس کے بعد جواہر اور زیورات کی باری آتی ہے اور ان کے بعد نوادر، سونے چاندی کے ظروف، گھڑیاں خواہ جیبی ہوں یا کلائی کی، پھر ریشمی کپڑے، بنارسی ساڑیاں، قیمتی گرم کپڑے کے عمدہ سلے ہوئے مردانہ سوٹ، پھر آتشی اسلحہ جیسے بندوق یا پستول، یا پھر تفریح، یا دل بہلاوے کی چیزیں ریڈیو یا ٹرانزسٹر، سلائی کی مشین بھی بری نہیں، گو ذرا بھاری ہوتی ہے۔ آپ کے ہاں سے تو معاف کیجیے گا نواب صاحب! میرے ہاتھ عمدہ قسم کا ایک قلم تک نہیں لگا۔ مہربانی کر کے اپنے بنگلے کے دروازے سے اپنے نام کا بورڈ اتروا لیجیے، یا پھر اپنا نام بدل لیجیے، ورنہ

مجھ ایسے نہ جانے کتنے احمق اور ناتجربے کار چور یہاں آ کر ناحق اپنا وقت ضائع کرتے رہیں گے۔ آپ کے تینوں بیڈروم، جو خالی پڑے ہیں، ان میں ٹوٹے پھوٹے نواڑی پلنگوں کے سوا کچھ بھی نہیں اور پھر خود آپ کے اپنے بیڈروم میں.....''

''تو کیا تم میری خواب گاہ میں بھی داخل ہوئے تھے؟''

''جی داخل ہی نہیں ہوا، پورے دو گھنٹے آپ کی موانست میں گزارے ہیں۔ اس دوران آپ برابر زور زور سے اور آپ کی بیگم صاحبہ ہلکے ہلکے خراٹے لیتی رہیں۔ جب سب طرف سے مایوس ہو کر میں آپ کے کمرے میں پہنچا اور میں نے تجوری دیکھی تو میری باچھیں کھل گئیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میری محنت اکارت نہیں جائے گی۔ میں اس بنگلے سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ پورے دو گھنٹے کی جدوجہد کے بعد تجوری کھولنے میں کامیاب ہو گیا، لیکن نواب صاحب! آپ میری مایوسی کا اندازہ نہیں کر سکتے جب اس تجوری سے چند کاغذات کے سوا میرے ہاتھ کچھ نہ لگا اور یہ کاغذات کیا تھے، ایک تو تھا آپ کا خاندانی شجرہ اور دوسرے تھے آپ کے اپنے اور صاحب زادیوں کے نکاح نامے۔ گھبرائیے نہیں نواب صاحب! میں نے احتیاط سے پھر انھیں تجوری میں بند کر دیا تھا، اس کے بعد آپ کے کپڑوں کی الماری کی طرف متوجہ ہوا مگر اس میں بھی مجھے دو تین پرانی شیروانیوں اور بوسیدہ ساڑھیوں کے سوا، جن کا رنگ اڑ چکا تھا، کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے آپ کی شیروانیوں کی سبھی جیبیں ٹٹول ڈالیں مگر قسم لے لیجیے جو کسی میں سے ایک چونی تک نکلی ہو۔ میں بہت تھک کر اور مایوس ہو کر آپ کی خواب گاہ سے نکلا اور دوبارہ ڈرائنگ روم میں پہنچا کہ جانے سے پہلے ایک نظر اور ڈال لوں، مگر میری بے احتیاطی، بلکہ لاپروائی نے مجھے تپائی سے ٹھوکر کھلوائی۔ کھڑ کا سن کر آپ جاگ اٹھے اور مجھے توشہ خانے میں پناہ لینی پڑی۔ تو نواب صاحب! یہ ہے میری کہانی۔''

نواب صمصام الدولہ بڑے غور سے چور کی باتیں سنتے رہے۔ وہ خاموش ہوا تو انھوں نے پوچھا: ''کیا تمھیں یہ ڈر نہیں کہ میں تمھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔''

ہرگز نہیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ، معاف کیجیے گا، ایسی حماقت کبھی نہیں کریں گے۔ جب تک میں نے اس بنگلے کا جائزہ نہیں لیا تھا، مجھے یہ ڈر ضرور تھا مگر اب مطلق نہیں۔ شاید آپ مجھے چھ ماہ یا سال کی قیدی کی سزا دلوانے میں کامیاب ہو جائیں، مگر اس کے ساتھ ہی آپ کی ثروت و خاندانی وجاہت اور نام و ناموس کا پول بھی تو سارے شہر پر کھل جائے گا۔ پولیس کے افسر موقعہ واردات دیکھنے آئیں گے اور پھر اخباروں میں میرا بیان چھپے گا کہ افسوس صد افسوس، مجھے خواہ مخواہ یہ ذلت اٹھانی پڑی، کیونکہ نواب صمصام الدولہ تہور یار جنگ بہادر کے بنگلے میں تو ایک بھی چیز ایسی نظر نہ آئی جو چرانے کے قابل ہوتی تو آپ اپنے جیسوں کو کیا منہ دکھانے کے قابل رہیں گے؟''

نواب صاحب سے اس کا کچھ جواب نہ بن پڑا۔ چند لمحے خاموشی رہی، چونکہ رات زیادہ گزر چکی تھی، اس لیے نواب صاحب نے یہ قضیہ نمٹانے کے لیے پوچھا۔

''تو میاں صاحب زادے! اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''بس مجھے تھوڑی سی نقدی دلوا دیجیے۔ یقین جانیے نواب صاحب! میں نے آج دن بھر کچھ نہیں کھایا۔'' نواب صاحب چند لمحے سوچتے رہے، پھر بولے۔

''تم چپ چاپ یہیں بیٹھے رہو۔ میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ میں گئے۔

نواب بیگم ابھی تک میٹھی نیند سو رہی تھیں اور ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھیں۔ نواب صاحب نے آہستہ سے ان کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

''نواب بیگم! نواب بیگم! ذرا اٹھنا۔''

نواب بیگم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ ''کیا ہے نواب صاحب؟''

''مجھے کچھ روپے چاہئیں۔''

''روپے؟ بھلا میرے پاس کہاں سے آئے۔''

''وہ جو صبح میں نے تمہیں پانچ کا نوٹ دیا تھا وہ کیا ہوا؟''

''ارے بھول گئی۔ وہ تو ہے یہیں سرہانے کے نیچے۔''

'تولاؤ جلدی سے نکال کر دے دو۔''

''کیا کیجیے گا اس نوٹ کو؟''

''بھئی ایک دوست کو دینا ہے۔ بے چارہ بڑی مصیبت میں گرفتار ہے، جبھی تو ایسے ناوقت میرے پاس آیا ہے۔ جلدی کرو نواب بیگم! میں نہیں چاہتا کہ بے چارہ مایوس ہو کر بنگلے سے خالی ہاتھ چلا جائے۔''

ooo

بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ انجام کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے۔ اور نہر کی کھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پرچہ لگا کر میں کالونی کھل گئی ہے۔ اور نئے آباد کاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی، دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائل پور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی۔ اس لیے پاپیادہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ بہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے۔ اور پوچھ پاچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پاپیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانی چرخہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقرعید کا تہوار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیے۔ زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ انہوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی لیکن ان کے نزدیک سو روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔ عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑانوالہ سے رخصت ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا اس کے بعد جب کبھی گیارہ پیسے پورے ہو جاتے وہ فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔ ساری عمر جمعرات کی شام کو اس عمل میں بڑی وضع داری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آگئی لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انہیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا ہے جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی ماں جی کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لیے جمع کر رکھے تھے چونکہ وہ جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی، نہ کوئی زیور، اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں تین جوڑے سوتی کپڑوں کے ایک جوڑا دیسی جُوتا، ایک جوڑا ربڑ کے چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہننے کے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تن دوسرا اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیئے کے نیچے رکھا رہتا تھا۔ تاکہ استری ہو جائے تیسرا دھونے کے لیے تیار ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آ جاتا تو وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انہیں سوٹ کیس دیکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لیے انہیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی بنا کر انہیں جائے نماز میں لپیٹا۔ جاڑوں میں اُونی فرد اور گرمیوں میں ململ کے دوپٹے کی بکل ماری اور جہاں کہیں چلے سفر آخرت بھی انہوں نے اس سادگی سے اختیار کیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھے نہا دھو کر بال سکھائے اور چند منٹوں میں زندگی کے سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ جس خاموشی سے دنیا میں رہی تھیں۔ اسی خاموشی سے عقبیٰ کو سدھار گئیں۔ غالباً اسی موقع کے لیے وہ اکثر یہ دعا مانگا کرتی تھیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ چلتے چلاتے اٹھا لے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے......

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی، دھنیے، پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے تو کھا لیتی تھیں۔ لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں کبھی بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے کے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتیں تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں اکثر و بیشتر دوپہر کا شاذ و نادر رات کا گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسرے کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھیں۔ سب کا بھلا خاص کر اپنے یا اپنے بچوں کے لیے انہوں نے براہ راست کبھی کچھ نہ مانگا۔ پہلے دوسروں کے لیے مانگتی تھیں اس کے بعد مخلوقِ خدا کی حاجت روائی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو انہوں نے اپنی زبان سے کبھی "میرے بیٹے" یا میری بیٹی کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال کہا کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کام کوئی کر دیتا تو انہیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا اور احسان مندی سے سارا دن اسے دعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھاؤ کچھ قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔

جڑانوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خوردسال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لائل پور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں تو انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ انہیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں کہ اس زمانے میں ان کے ذہن میں کالونی کا تصور ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا جو کہیں سر راہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہوگا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لائلپور کے علاقے میں پا پیادہ بھٹکتا رہا۔ لیکن کسی راہ گزر پر انہیں کالونی کا خضر صورت رہنما نہ مل سکا۔ آخر تنگ آ کر اُنہوں نے چک نمبر ۳۹۲ میں جو ان دنوں نیا نیا آباد ہو رہا تھا ڈیرے ڈال دیے۔ لوگ جوق در جوق وہاں آ کر آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شاید یہی ایک طریقہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس پھوس کی جھونپڑی بنائی اور بنجر اراضی کا ایک قطعہ تلاش کر کے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ انہی دنوں محکمہ مال کا عملہ پڑتال کے لیے آیا۔ نانا جی کے پاس الاٹمنٹ کے کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ انہیں چک سے نکال دیا گیا اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قرق کر لیے۔ عملے کے ایک آدمی نے کی بالیاں بھی ماں جی کے کانوں سے اتر والیں۔ ایک بالی اتارنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے زور سے کھینچا جس سے ماں جی کے بائیں کان کا زیریں حصہ بُری طرح سے پھٹ گیا۔

چک نمبر ۳۹۲ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لُو چلتی تھی۔ پانی رکھنے

کے لیے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں نظر آتا ماں جی اپنا دوپٹہ بھگو لیتیں تاکہ پیاس لگنے سے اپنے چھوٹے بھائیوں کو چسائی جائیں۔ اس طرح وہ چلتے چلتے چک نمبر ۵۰۷ میں پہنچے جہاں ایک پہچان کے آبادکار نے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلاتے تھے۔ نانی مویشی چرانے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گایوں کے لیے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انہیں اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی پیڑوں پر گذارہ ہوتا تھا کبھی خربوزے کے چھلکے اُبال کر کھال لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کچی انبیاں گری ہوئی مل گئیں تو ان کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے توریئے اور کلتھے کا ملا جلا ساگ ہاتھ آ گیا۔ نانی مزدوری میں مصروف تھی۔ ماں جی نے ساگ چولہے پر چڑھایا۔ جب پک کر تیار ہو گیا اور ساگ کو الّن لگا کر گھوٹنے کا وقت آیا تو ماں جی نے ڈوئی ایسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پیندا ٹوٹ گیا اور سارا ساگ بہہ کر چولہے پر آ پڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانٹ پڑی اور مار بھی رات کو سارے خاندان نے چولہے کی لکڑیوں پر گرا ہوا ساگ انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

چک نمبر ۵۰۷ نانا جی کو خوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آبادکاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر ان کو ایک مربع زمین مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور تین سال میں ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی توں توں آبائی وطن کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ خوشحالی کے پانچ سال گذارنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر منیلہ کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشہ دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرے ان کی آنکھوں پر پڑ گئے جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوبِ چشم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انہوں نے ساری عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں سے فوراً گھل مل جاتیں سفر کی تھکان اور راستے کے گرد و غبار کا ان پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اونچے درجوں میں بہت بیزار ہوتیں۔ ایک دو بار جب انہیں مجبوراً ایرکنڈیشن ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو تھک کر چُور ہو گئیں اور سارا وقت قید کی صعوبت کی طرح ان پر گزرا۔

منیلہ پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان کو درست کیا۔ عزیز و اقارب کو تحائف دیے۔ دعوتیں ہوئیں اور پھر ماں جی کے لیے بَر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں لائل پور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی۔ ان کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لیے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانٹھنے کے لیے نانی جی انہیں ہر روز نت نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دلہنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں۔ ان دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا دوبھر ہو گیا تھا میں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے۔ خیال بخش مربع دار کی بیٹی جا رہی ہے۔ دیکھیے کون سا خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔

''ماں جی! آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟'' ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر اُن سے پوچھا کرتے۔

''توبہ توبہ پُت'' ماں جی کانوں پر ہاتھ لگاتیں میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی مہربانی ہو گی۔''

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لیے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبداللہ صاحب سے ہو گئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبداللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اُٹھا تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری آبائی جائیداد رہن پڑی ہے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھونپڑے میں اُٹھ آئے۔ زر اور زمین کا یہ انجام دیکھ کر انہوں

نے ایسی جائیداد بنانے کا عزم کرلیا جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جاسکے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹریکولیشن میں اول آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اُڑتے اُڑتے یہ خبر سرسید کے کانوں میں پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا خاص منشی گاؤں میں بھیجا اور عبداللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا اور بی۔اے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے لیکچرار ہو گئے۔

سرسید کو اس بات کی دھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں میں جائیں۔ چنانچہ انہوں نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا کہ وہ انگلستان میں جا کر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کر کے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادت مندی آڑے آئی اور انہوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سرسید کو بے حد غصہ بھی آیا اور دُکھ بھی ہوا۔ انہوں نے لاکھ سمجھایا بجھایا، ڈرایا، دھمکایا لیکن عبداللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

''کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟'' سرسید نے کڑک کر پوچھا۔

''جی ہاں'' عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ ٹکا سا جواب سن کر سرسید صاحب آپے سے باہر ہو گئے کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے انہوں نے عبداللہ صاحب کو لاتوں، مکّوں، تھپڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا اور کالج کی نوکری سے برخواست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا۔ ''اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمہارا نام بھی نہ سن سکوں۔''

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے۔ اتنے سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انہیں سب سے دُور افتادہ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ناک کی سیدھ گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

جن دنوں ماں جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی۔ انہی دنوں عبداللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوگ لکھا ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہو گئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تاکہ عبداللہ صاحب دلہن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی تھیں۔ اتفاقاً یا شاید دانستہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

ماں جی کی سہیلیوں نے انہیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر ان سے پانچ پانچ روپے وصول کر لیے۔ عبداللہ صاحب نے ماں جی کو بہت سے روپے پیش کیے لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بہت اصرار بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

''اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی؟'' عبداللہ صاحب نے پوچھا

''اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلوا دوں گی۔'' ماں جی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبداللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انہوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبداللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی خوبصورت بنگلہ، وسیع باغ۔ نوکر چاکر دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ جب عبداللہ صاحب دورے پر باہر چلے جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر

خاص سیاسی انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا۔ لیکن ماں جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثر انداز نہ ہوتا تھا بلکہ ماں جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی۔

ان دنوں سر مالکم ہیلی حکومت برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روسی اور چینی سرحدوں پر پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں۔ انہوں نے فراک پہنے ہوئے تھے اور پنڈلیاں کھلی تھیں۔ یہ بے حجابی ماں جی کو پسند نہ آئی۔ انہوں نے لیڈی ہیلی سے کہا "تمہاری عمر جیسے تیسے گزرنی تھی، گزر ہی گئی ہے اب آپ اپنی بیٹی کی عاقبت تو خراب نہ کرو" یہ کہہ کر انہوں نے مس ہیلی کو اپنے پاس رکھ لیا اور چند مہینوں میں اُسے کھانا پکانا، سینا پرونا، برتن مانجھنا، کپڑے دھونا سکھا کر ماں باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کچز سرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آئے۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکائے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کچز نے اپنی تقریر میں کہا۔ "مسٹر گورنر جس خانساماں نے یہ کھانے پکائے ہیں، براہ مہربانی میری طرف سے آپ ان کے ہاتھ چوم لیں۔"

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرحاں و شاداں گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک گوشے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا رہی ہیں۔

ایک اچھے گورنر کی طرح عبداللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چومے اور کہا اگر لارڈ کچز یہ فرمائش کرتا کہ وہ خود خانساماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں؟"

"میں" "ماں جی تنک کر بولیں۔" میں اس کی مونچھیں پکڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیتی۔ پھر آپ کیا کرتے؟"

"میں" عبداللہ صاحب نے ڈرامہ کیا میں ان مونچھوں کو روئی میں لپیٹ کر وائسرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمہیں ساتھ لے کر کہیں اور بھاگ جاتا۔ جیسے سرسید کے ہاں سے بھاگا تھا۔

ماں جی پر ان مکالموں کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا تھا لیکن ایک بار ----- ماں جی رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں۔ جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے۔

گلگت میں ہر قسم کے احکامات "گورنری" کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا۔

"بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ!"

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ رگِ ظرافت پھڑک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا۔ بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے۔ گورنری تو دراصل تمہاری سوکن ہے۔ جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔"

مذاق کی چوٹ تھی۔ عبداللہ نے سمجھایا بات آئی گئی ہو گئی لیکن ماں جی کے دل پر غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاب سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دل کا حال سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آ گئی۔ ہائے ہائے ہمارے راج میں ایسا ظلم میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ صاحب کی خبر لیں۔

جب یہ مقدمہ مہاراج پرتاب سنگھ تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا افتاد آ پڑی۔ لیکن جب معاملے کی تہہ تک پہنچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضعدار تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ گلگت سے گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیر وزارت کے نام سے پکارا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی تک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سن کر مہارانی نے ماں جی کو بلا کر خوشخبری سنائی کہ مہاراج نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا۔

''اب تم دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔'' مہارانی نے کہا۔'' ہمارے لیے بھی دعا کرنا۔
مہاراجہ اور مہارانی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔
اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سوجھتا۔
ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دُنیا میں کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر صبر وشکر، تسلیم ورضا کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پردے میں کتنے دُکھ۔ کتنے غم، کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔
اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کیے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصے بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا بیٹا۔ عین عالم شباب میں انگلستان جا کر گذر گیا۔
کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اللہ کا مال تھا اللہ نے لے لیا۔ لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو رویا نہ کرتی ہوں گی؟

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر پچپن سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب بان کی کھردری چارپائی پر حسب معمول گاؤ تکیہ لگا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائنتی پر بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر ان کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکا یک وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے'' بھاگوان شادی سے پہلے میلے میں میں نے تمہیں گیارہ پیسے دیے تھے۔ کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟''
ماں جی نے نئی نویلی دلہنوں کی طرح سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے سینے میں بیک وقت بہت سے خیال امڈ آئے'' ابھی وقت کہاں آیا ہے۔ سرتاج شادی کے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے۔ لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ نباہ کیا ہے۔ اس پر میں نے تمہارے پاؤں دھو کر پینے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمہیں پہنانی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے میرے سرتاج۔
لیکن قضا قدر کے بہی کھاتے میں وقت آ چکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اٹھایا تو عبداللہ صاحب گنے کی قاش منہ میں لیے گاؤ تکیہ پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہتیرا بلایا، ہلایا، چمکارا لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔
ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے سے لگا کر تلقین کی بچو، رونا مت۔ تمہارے ابا جی جس آرام سے رہے تھے۔ اسی آرام سے چلے گئے اب رونا مت ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔''
کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اپنے ابا کی یاد میں نہ رونا ورنہ ان کو تکلیف پہنچے گی۔ لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس خاوند کی یاد میں نہ روئی ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک انہیں ایک الہڑ دلہن سمجھا اور جس نے'' گورنری'' کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لا کر نہیں بٹھائی۔
جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لیے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں، جو قیامت تک انہیں عقیدت کے بیابان میں سرگرداں رکھے گا۔
اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن مسجد کا ملاں پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔
ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔
ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اگر رو دیا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔

OOO

محمد احسن فاروقی

بہت دیر ہوگئی

رقیہ پارٹی سے واپس آکر جلدی جلدی کپڑے بدل کر مسہری پر پڑ گئی۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر آنکھوں میں آنسو نہیں آرہے تھے۔ پارٹی کا سماں ایک گڑبڑ خواب کی طرح اس کے سامنے آرہا تھا۔ ہاں سعید، سعید کو دیکھنے، سعید سے ملنے کے لیے ہی وہ ایسے کپڑے پہن کر گئی تھی جو آٹھ برس پہلے اس نے پسند کیے تھے۔ آٹھ سال پہلے ایسی ہی ایک پارٹی میں سعید نے سب سے الگ ہو کر اس سے کہا تھا۔ تمہارے کپڑے یہاں سب سے اچھے لگ رہے ہیں۔ تم سب سے زیادہ جچ رہی ہو۔ اس نے کہا تھا ''بہت شکریہ۔'' ہلکے سرخ رنگ کے پھولوں والی قمیض، سفید شلوار، کان میں یاقوت کے بندے، پیر میں سرخ چپل، چہرہ پر گلابی پوڈر اور ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک یونہی وہ آج بھی سج کر گئی تھی۔ مگر آٹھ برس میں سعید کیسا بدل گیا تھا۔ سب کے سامنے کہنے لگا ''ارے رقیہ۔ تم کس قدر بدل گئیں۔ کیا ہوا گالوں میں گڑھے کیسے پڑ گئے اور چہرہ پر یہ نشان کیسے جو پوڈر سے بھی نہیں چھپتے۔'' وہ یہ کیا کہہ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس نے تمام جذبات پر پانی، ٹھنڈا برف کا پانی ڈال دیا۔ آٹھ برس سے وہ اس کے خیال میں محو تھی۔ وہ تعلیم حاصل کرنے انگلینڈ اور پھر امریکہ گیا تھا۔ دل کہا کرتا کہ واپس آکر وہ اسی کو پسند کرے گا۔ نسیمہ کو وہ جو بھی خط لکھتا اس میں رقیہ کو ضرور پوچھتا شاید وہ بھی اسے اتنا ہی چاہنے لگا تھا۔ کیا سچ مچ پوچھا کرتا تھا یا نسیمہ محض مروت میں کہہ دیتی تھی۔ ''بھیا کا خط آیا ہے تم کو پوچھا ہے۔'' آخر وہ براہ راست بھی اسے خط لکھ سکتا تھا۔ مگر کبھی کوئی پرزہ بھی نہیں لکھا اور اب آکر تو اس نے اسے اجنبی کی طرح پہچانتے ہوئے گالوں میں گڑھے، چہرہ پر نشان ہی دکھائی دیے۔ وہ بھی کچھ زیادہ تگڑا اور بڑا نظر آیا تیس سے اوپر نکل گیا ہے۔ رقیہ کو پہلے سے زیادہ اچھا لگا...... مگر اچھا لگنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو اسے اچھی نہیں لگی۔ وہ ریحانہ، پروین، رعنا سب سے کھلکھلا کھلکھلا کر ہنستا رہا۔ رقیہ کی طرف جب بھی رخ کیا تو خاموش ہوگیا اور پھر سب کے سامنے اس کے چہرہ پر تنقید کرنے لگا۔

اس نے اپنا رخ کپڑوں کی الماری کی طرف کیا، جس میں قد آدم شیشہ لگا تھا۔ اس کے چہرے پر جو چھائیاں پڑ گئی تھیں صاف دکھائی دیں۔ یہ کم بخت کسی طرح نہیں جاتیں کیسی کیسی دوائیں کیسی کیسی کریمیں لگائیں اور یہ گڑھے شمیم تو انہی کی تعریف کرتا تھا۔ ''ہائے نزاکت'' کہہ کر تڑپ جاتا تھا۔ مگر وہ اسے بالکل نہ بھایا۔ اس کے دل میں سعید گھسا ہوا تھا۔ یہ سعید جو ایک دفعہ آگ لگا کر بالکل الگ ہوگیا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس نے کبھی کہیں دور سے اسے دیکھا تھا۔ اب اک دم سے دیکھ کر یاد کیا۔ انگلینڈ اور امریکہ میں نہ معلوم کتنی لڑکیوں سے ملا ہوگا۔ وہاں کی لڑکیاں تو خود مردوں کا پیچھا کرتی ہیں اور پاکستانی انہیں خاص طور پر بھاتے ہیں۔ اور اب یہاں کوئی انہی کی طرح کی ڈھونڈ لے گا۔ اتنا کوالیفائیڈ ہوکر آیا ہے اونچی جگہ ملے گی اور نہ جانے کتنے رئیسوں کی لڑکیاں اس کے پیچھے دوڑیں گی۔ پارٹی سے جاتے وقت بھی کئی اس کے ساتھ موٹر میں گئیں۔ رقیہ کو کوئی اشارہ بھی نہیں کیا۔ شمیم کس قدر لٹو تھا مگر رقیہ نے اسے لفٹ ہی نہیں دی۔ آخر کو اس نے شگفتہ سے شادی کر لی۔ رقیہ نے کہا تھا۔ ''پیچھا چھوٹا دو برس تک اس نے ہلکان کیا۔ اس سعید سے کتنا اچھا تھا۔

پھر کلیم سے ملاقات ہوئی۔ بڑا مالدار۔ اس نے رقیہ کے پیچھے کئی ہزار خرچ کردیے ہوں گے۔ پرزنٹ، سینما، ہر تفریح میں ساتھ، مگر رقیہ نے اس کی طرف بھی رخ نہیں کیا۔

آٹھ برس بڑا لمبا وقت ہوتا ہے۔ وہ انٹر میں تھی سعید بھی اس کے ساتھ تھا۔ بی ایس سی میں ساتھ رہا۔ اور اس کے بعد انگلینڈ چلا گیا آٹھ برس، دو برس ایم اے کے، ایک پی ٹی کا اور پانچ برس کی ملازمت، تین برس پہلے تک ہر طرف سے پیغام آتے رہے ابا، اماں، بھائی سب نے رشتہ لگانا چاہا اور آخر میں رومانہ کے والد۔ اس کمبخت اطہر نے کہا تھا ''یہ ایسی نارنگی ہے جو پیڑ پر لگے لگے سوکھ گئی۔'' کیا وہ سچ تھا۔ ''اب کوئی جوان تو پھنستا نہیں کوئی دوجا جو کرلے تو کرلے۔'' قمر کی اماں نے کہا تھا۔

''عورت بیسی اور کھیسی اور تو اب تیس کو ہونے کو آئی، اب شادی ہو چکی۔''

''ادھر لڑکی نے نوکری کی اور اُدھر شادی کے دروازے اس کے لیے بند ہو گئے۔''
''ارے نوکری سے عورت سوکھنے لگتی ہے اور اگر موٹی ہو تو ڈھل جاتی ہے۔''
''لڑکیاں بی اے میں آتی ہیں تو بچوں کی طرح کھلی ہوئی اور بی اے کرتے کرتے مرجھانے لگتی ہیں اور ایم اے کے بعد تو بالکل کھپٹا ہو جاتی ہیں۔ چہرہ پر خون بھی نہیں رہ جاتا۔''
''جوبن تیرے ڈھل گئے اک آن خالی رہ گئی، سرمایہ تیرا بک گیا دکان خالی رہ گئی۔'' بڑا پست شعر مگر قاسم بات بات میں یہ سنا دیتا تھا۔''
''تم سمجھتی ہو کہ جو جو وقت جا رہا ہے وہ وہ تمہاری لڑکی کی قیمت بڑھ رہی۔'' خالہ جان نے اماں سے کہا۔
''اے، بہن کیا کروں کوئی جڑتا ہی نہیں۔''
''آج کل کے زمانے میں گھر بیٹھے کوئی نہیں آتا۔ لڑکی اِدھر اُدھر لے جاؤ۔ فیشن کرنے دو۔ اور لڑکیوں کے ساتھ پھرنے دو۔ کوئی نہ کوئی پسند کر لے گا۔ آخر نسیم کی اسی طرح شادی ہوئی۔ یہ پڑھانے جانا، چلے آنا کافی نہیں ہے۔'' خالہ نے مشورہ دیا تھا۔
مگر اس وقت بھی کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس کے دل میں سعید کیا بیٹھا تھا۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو۔ یہ دل میں کون کہتا تھا۔ ''آئے گا آنے والا آئے گا آنے والا'' وہ آنے والا آ گیا۔ مگر کس تیور سے آیا۔ ''تمہارے چہرہ پر دھبے، تم بدل گئیں۔'' دل کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اب اگر رخ کرے تو ٹھوکر مار دے۔ مگر اب اس کے رخ کرنے کی کوئی امید نہ تھی۔ آٹھ برس سے پلتی ہوئی امید سے اس کی عادت پڑ گئی تھی،۔ ایک اسٹروک میں ختم ہو گئی۔ اب اس کے دل سے ایک آہ نکلی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔
ہائی اسکول کے سرٹیفکیٹ کے حساب سے بھی وہ اب تیس کی تھی حالانکہ وہ اپنے کو ۲۲ سے ۲۴ تک کا بتاتی تھی سب کہتے رہنے کے باوجود اسے یہ احساس نہ تھا کہ اس کا حسن ڈھل گیا ہے آج سعید نے اس کے آنکھوں کے سامنے کے سب پردے اک دم ہٹا دیے تھے۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ تکیہ گیلا ہو گیا۔ اس نے والدہ سے کہہ دیا تھا آج کھانا نہیں کھاؤں گی پارٹی میں بہت کھا لیا ہے۔ اب اسے رات بھر روتے رہنے یا روتے روتے سو جانے کے سوا اور کچھ کام نہیں تھا۔
گھنٹے بھر سے زیادہ رونے دھونے اور کروٹیں بدلنے کے بعد کچھ طبیعت ہلکی ہوئی اور اب اسے اس کی شاگردہ رومانہ کے والد نعیم صاحب سی ایس پی ریٹائرڈ یاد آئے۔ وہ اپنی لڑکی کو روز کالج پہنچانے اور لے جانے موٹر پر آتے تھے۔
''ڈیڈی یہ ہماری مس ہیں پروفیسر رقیہ۔''
''آپ کہاں رہتی ہیں آیئے آپ کو آپ کے گھر اتار دوں گا۔''
اور پھر وہ روز ہی اسے اس کے گھر سے لیتے اور گھر پہنچا دیتے۔ کیسی آنکھیں گڑو گڑو کر وہ رقیہ کو دیکھتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نظر جسم کے آر پار ہو جائے گی۔
''مس آپ ہمارے گھر ہوتی چلیں۔'' رومانہ نے کہا تھا۔
اور اس کا گھر کیسا بڑا، کیسا عمدہ، لان، گھاس، پھولوں کی کیاریاں، ایک طرف نیم کا درخت، دو ہزار گز کا پلاٹ، چار بڑے بڑے حصے دو منزلے، دو ہزار کا کرایہ اور آٹھ سو پنشن جس حصے میں رہتے تھے، دو بڑے بڑے بیڈ روم، ایک ہال، بڑا اسیٹ صوفے کا اور کھانے کی میز چائے پر کیا کیا سامان تھا۔
''رومانہ کی شادی میرے بھائی کے لڑکے سے ٹھہری ہے۔ وہ جلدی کر رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں بی اے پاس کر لے تو شادی ہو۔ اس کی ماں کو مرے ہوئے چار برس ہو گئے۔ اس کی شادی ہو گئی تو میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ میرے تین لڑکے ملازم ہیں۔ سب کی شادیاں ہو گئیں۔ دو لڑکیاں بھی بیاہ گئیں۔ اب یہ رہ گئی ہے۔''
''سب بھائی ڈیڈی سے کہتے ہیں کہ آپ ایک اور شادی کر لیجیے۔ ابھی آپ ساٹھ کے نہیں ہے'' رومانہ نے کہا تھا۔
نعیم صاحب کچھ نہیں بولے۔ بڑی حسرت سے رقیہ کو دیکھتے رہے تھے۔ اب تو روز ہی وہ رقیہ کو اپنے گھر لے آتے۔

''آپ رومانہ کو گھر پر پڑھا دیا کیجئے۔ آپ جو ٹیوشن فیس کہیں گی میں دوں گا۔ موٹر پر گھر سے لے آیا کروں گا۔ موٹر پر پہنچا آیا کروں گا۔''

''وقت کہاں ہے'' رقیہ نے کہا تھا۔

آپ کالج سے یہاں آتی ہیں، چائے پی کر تھوڑی دیر آرام کریں، ہمارے یہاں مہمانوں کے لیے ایک بیڈروم خالی ہے اس میں آپ آرام کریں اور پھر لان پر سے دھوپ چلی جانے کے بعد میں لان پر بیٹھ کر آپ سے پڑھوں گی اگر دیر ہو جائے تو رات کا کھانا بھی ہمارے ساتھ کھالیا کیجئے گا۔ آخر ڈیڈی گاڑی پر آپ کو پہنچا ہی آیا کریں گے۔''

نعیم صاحب رومانہ کو لیے ہوئے اس کے گھر بھی آئے تھے اور اس کے والد سے اجازت لے لی تھی۔ پہلے مہینہ کے دوسو روپیہ والد کے ہاتھ میں رکھ دیے تھے۔'' آپ اتنے باوقار اور ذمہ دار آدمی ہیں اگر رقیہ آپ کے یہاں رہ بھی جائے تو ہم کو کوئی اعتراض نہ ہوگا'' والد نے کہا تھا۔

اور پڑھانا تو نام کا تھا، نعیم صاحب سیر کراتے تھے، ریستورانوں میں لے جاتے تھے۔ کھانے کے بعد گھر چھوڑ جاتے تھے۔ کتنا خلوص، کتنی محبت، کتنا آرام

''ہاں یہ بڈھے لوگ بہت چاہتے ہیں، اچھا ہے شادی کر لے۔ ابھی دس بیس برس تو چل جائے گا۔'' خالہ جان نے کہا تھا۔

اور رومانہ کی شادی ہوئی نعیم صاحب کے سب لڑکے لڑکیاں، بہوئیں، داماد آئے گھر بھر گیا۔ کرایہ والے حصوں میں بھی کمرے مانگ لیے گئے، نعیم صاحب نے سب کے سامنے کھانے کی میز پر کہا'' یہ پروفیسر رقیہ، رومانہ کی خاص استانی ہیں۔ شادی کی سب باتوں میں ان کی رائے اہم رہے گی۔''

رومانہ کے بیاہ جانے کے بعد بھی نعیم صاحب موٹر لے کر آتے رقیہ کو کالج پہنچاتے اور پھر واپس بھی لے آتے۔ دو سال میں وہ ان سے بے باک ہوگئی تھی۔ وہ اس سے ''تم'' سے بات کرنے لگے تھے۔ اسے عمدہ پارکر کا فاؤنٹین پین اور اومیگا گھڑی لے دی تھی۔

پھر ایک دن خط اس کے ہاتھ میں دیا اور بوکھلاہٹ میں موٹر چلا کر غائب ہوگئے تھے۔

''رقیہ تم نے میری زندگی کے ۳۵ برس کم کر دیے جب میں نے تمہیں پہلے دن دیکھا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ جب میں بیس برس کا تھا تو میرے سامنے ایک لڑکی آئی تھی وہی اب پھر آگئی۔ میری اس سے شادی نہیں ہو سکی تھی۔ اور وہ مر گئی تھی۔ گھر والوں نے رومانہ کی ماں سے شادی کر دی تھی مگر میں تمام زندگی اسی شکل کو تلاش کرتا رہا، جو تمہاری ایسی تھی۔ اب تم مل گئی ہو...... آگے کچھ نہیں کہتا۔ تم خود سمجھ لو۔''

وہ بڑے شرمیلے آدمی تھے۔ یہ خط دینے کے بعد کئی دن وہ غائب رہے۔ پھر رقیہ کو کالج لینے پہنچے۔ وہ ان کی موٹر پر بیٹھ تو گئی مگر سخت نگاہ سے انہیں دیکھتی رہی انہوں نے اپنا ورد جاری رکھا مگر کھل کر کبھی بات نہیں کی۔ رقیہ نے ان کے گھر جانے یا ان کے ساتھ سیر کرنے سے انکار کیا۔

انہوں نے رقیہ کے والد سے سب حال بیان کر کے کہا'' آپ کی اجازت ہو تو میں رقیہ سے شادی کا پروپوزل کروں۔''

والد نے اجازت دی۔ اماں نے بھی کہا'' کیا برا ہے اتنا مالدار ہے۔ اسکول میں روز کی گھس گھس سے تو اچھا ہے اور پھر ایک لاکھ کی جائیداد مہر میں رکھنے کو بھی کہا ہے۔ میں تو کر دوں گی۔ وہ تم سے کہے گا تم انکار نہ کرنا۔''

اب رقیہ بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھی اور چیخ کر رونے لگی۔ ہائے وہ اس سے کیوں تن گئی تھی۔ اس سعید کے مارے یہ کیسا اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔

پھر روتے روتے سو گئی اور نہ معلوم کیسے کیسے خواب دیکھتی رہی۔ بار بار آنکھ کھل جاتی اور وہ کہتی'' ایسا محبت دار آدمی۔ اُف۔ اُف۔ امی سے کیسے کہا گیا تھا کہ اب سے آپ میرے گھر نہ آئیے گا۔'' اور پھر نعیم صاحب اس کے گھر نہ آئے تھے۔ کئی مہینے ہوئے تھے۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات مہینے سے وہ نہیں آئے تھے۔ اٹھتے ہوئے اس نے طے کیا کہ وہ خود نعیم صاحب

کے یہاں جائے گی۔

وہ کالج کے وقت سے ایک گھنٹہ پیشتر گھر روانہ ہوئی۔ رکشہ پر بیٹھ کر نعیم صاحب کے گھر کی طرف چلی۔ گھر جوں جوں قریب آتا گیا وہ وہ اس کا دل دبدبا تا گیا۔ رکشہ گھر سے آگے نکل گئی اور وہ رکوانا بھول گئی۔ پھر اس نے رکشہ والے سے کہا ''واپس لے چلو'' مگر گھر کے پاس پہنچ کر قریب کی گلی میں مڑوائی کافی دور جا کر پھر کہا ''واپس لے چلو'' کئی دفعہ ایسا کرنے کے بعد رکشہ والا بولا ''کہاں تک چکر کھلائیے گا؟'' اس نے جواب دیا، ''تم کو اپنے کرائے سے مطلب ہے کہ چکر سے۔ میں دن بھر چکر لگواؤں گی۔ تمہارے میٹر سے جو کرایہ بنے لے لینا۔'' رکشہ والا خاموش ہو گیا اور چکر لگا تا رہا۔

پانچویں چکر میں نعیم صاحب کے گھر سے چار گھر آگے ایک گھر سے ایک لڑکی نکلتی دکھائی دی۔ جس نے اس کو سلام کیا۔ اس نے رکشا والے سے کہا، ''یہاں روک دو۔'' لڑکی اس کے پاس آگئی۔ اس نے کرایہ دیا اور لڑکی کی طرف رخ کر لیا۔

''کیا مس آپ کوئی مکان ڈھونڈ رہی ہیں؟''

''تم میری شاگرد رہی ہو مجھے یاد آیا۔ کب پڑھتی تھیں۔ کیا نام ہے تمہارا یہ یاد نہیں رہا۔''

''میں رومانہ کے ساتھ پڑھتی تھی۔ اس کی شادی میں بھی شریک تھی۔ پھر یونیورسٹی میں گئی۔ اب ایم اے فائنل میں ہوں۔ رومانہ کے والد نعیم صاحب مجھے یونیورسٹی پہنچا دیتے ہیں۔ آج دیر ہو گئی۔ قریب ہی تو گھر ہے دیکھنے جا رہی ہوں کہ کیا ہو گیا۔ میرا نام فہمیدہ ہے۔ آپ کو یاد نہیں۔''

''اچھا تم جاؤ۔ مجھے ادھر جانا ہے۔''

''آپ نے رکشا تو چھوڑ دی۔ ساتھ چلیے نعیم صاحب کے موٹر میں بیٹھ کر چلی جائے گا۔ آپ کے کالج کا وقت قریب ہے۔ کیا آج کالج نہیں جائیے گا۔''

رقیہ شپٹائی مگر اس کے دل کو اس لڑکی کی وجہ سے ڈھارس ہوئی اور اس کے منہ سے نکل گیا ''اچھا چلو۔''

دونوں دس قدم ہی گئی ہوں گی کہ نعیم صاحب موٹر پر آتے دکھائی دیے۔ موٹر روک کر بولے ''ارے آج دیر ہو گئی۔ اچھا چلو۔'' اب انہوں نے رقیہ کو بھی دیکھا اور بولے ''آپ ادھر کہاں آگئیں، آپ بھی بیٹھ جائیے کالج اتار دوں گا آپ کے۔''

فہمیدہ نعیم صاحب کے پاس بیٹھی اور رقیہ پیچھے بیٹھی۔ اسے اس کے کالج پر اتار کر نعیم صاحب چلے گئے۔

جھوٹا، مکار کہتا تھا کہ تمہاری ایسی صورت کی تلاش میں میں تیس پینتس برس سے تھا اور اب مجھے دیکھا بھی نہیں۔ سات مہینے کے اندر ہی اس صورت کو جس کو اتنے برسوں سے تلاش تھی بھول گیا۔ یہ جوان بھرے بھرے جسم کی تھرکتی ہوئی فہمیدہ کو دیکھ کر لٹو ہے ساٹھ برس کا مرد اپنی لڑکی کی برابر۔ سب سے چھوٹی لڑکی کے برابر کی لڑکی سے اٹک رہا ہے۔ اور لڑکی بھی پھیلی جا رہی ہے۔ ہاں ایک لاکھ کا مہر، موٹر، کوٹھی کون دے گا۔ رقیہ کو خریدنے چلا تھا۔ وہ نہیں بکی تو اب اس سے زیادہ جوان خرید رہا ہے۔ اچھا ہوا تھا کہ رقیہ نے اس سے انکار کر دیا تھا۔ اب کبھی اس کی طرف رخ نہ کرے گی......

اس سے درجے بھی نہ پڑھائے گئے۔ ہر درجہ کو ٹال ٹال دیا۔ ٹیچرز روم میں آ کر سب سے الگ بیٹھی۔ ایک کتاب کھول کر سامنے رکھی اور سر اس پر جھکایا اور سوچتی رہی۔

''اے آج کیا ہے رقیہ چپ چپ گم صم ہو؟'' کئی ساتھنوں نے پوچھا۔

''میرے سر میں درد ہے۔ شاید بخار آنے والا ہے۔'' اس نے سب کو ٹال دیا۔

چھٹی کے وقت جب وہ کالج سے باہر آئی تو دیکھا نعیم صاحب موٹر لیے کھڑے ہیں۔ وہ موٹر کی طرف پیٹھ پھیر کر آگے بڑھ رہی تھی تو وہ لپکتے ہوئے پاس آئے اور بولے ''رقیہ میں تمہیں گھر پہنچانے آیا ہوں چلو میرے ساتھ موٹر ہیں۔''

وہ ہچکچائی مگر ساتھ ہو لی۔

موٹر بڑھاتے ہوئے نعیم صاحب بولے۔ ''آج کیا تھا جو تمہیں یاد ہماری آئی؟''

رقیہ خاموش رہی۔

''آج تم میرے پاس آئیں تھیں مگر میرے گھر میں آنے کی ہمت نہ پڑی۔ میں نے دیکھا کہ کئی بار تمہاری رکشہ میرے گھر کے سامنے سے گزری میں نے تیس برس مجسٹریٹی کی ہے۔ ہزاروں قسم کے لوگ دیکھے ہیں۔ میں انتظار کرتا رہا کہ تم شاید اتر کر آؤ۔ اسی میں فہمیدہ کے پاس پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ اب تمہیں کیا کہنا ہے بتاؤ۔''

''آپ نے یہ سب فرض کر لیا ہے۔ سب غلط۔ سات مہینے ہوئے ہیں آپ سے پرجھاڑ کر الگ ہوگئی تھی۔ مجھے آپ سے ملنے کا کوئی شوق نہیں آپ ہی میرے پیچھے دوڑے آئے۔''

''خیر یہ سب جانے دو۔ تم کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ صورت جو میرے ذہن میں تیس برس سے تھی سامنے آگئی جب تم سے بار بار ملا تو یہ بھی محسوس ہوتا رہا کہ تم اس کے مقابلہ میں بالکل بے جان اور بے حس ہو۔ وہ کھلی ہوئی تھی تم مرجھائی ہوئی۔ صورت تو ضرور ہے اسی کی سی مگر اس کا بھوت اور پھر جب تم نے انکار کر دیا تو میرا دھیان اس سے مشابہت سے زیادہ تمہارے سوکھے پن تمہاری بے حسی پر جانے لگا۔ فہمیدہ کے ماں باپ نہیں ہیں چچا کے یہاں پل رہی ہے۔ رومانہ کی شادی کے بعد سے برابر میری دلجوئی میں لگی ہے۔ اس کے چچا چچی اور چچازاد بھائی بہن اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ وہ ایم اے پریوس کر چکی تھی۔ میں بھی کہتا ہوں ایم اے کر لے دو مہینے اور ہیں۔ کسی دن بھی ہم دونوں نکاح کر لیں گے۔

''جب یہ سب ہے تو پھر آپ کیوں میرے پیچھے لگنے کو آتے...... اور اور میرے گھر کی سڑک تو پیچھے رہ گئی یہ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔''

''ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔ اگر تم کہو تو اپنے گھر چلوں اور بات پوری کر لوں۔''

''نہیں نہیں آپ مجھے یہیں اتار دیجیے میں گھر چلی جاؤں گی اور اب کبھی میری طرف رخ نہ کیجیے گا۔ فہمیدہ میں مگن رہیے۔''

''خیر میں تمہیں تمہارے گھر پہنچائے دیتا ہوں۔ بات صرف یہ کہنا ہے کہ میں نے تمہارے رخ میں صاف تبدیلی دیکھی۔ اور مجھے پھر وہی صورت یاد آگئی۔ جس کا تم ہلکا سا چربہ ہو۔ فہمیدہ کو اتار کر میں گھر جاتا مگر لاشعوری طور پر تمہارے کالج پہنچ گیا۔ آگے کچھ نہیں۔ اب بہت دیر ہوگئی۔ یو ہیو کم ٹو لیٹ۔ ٹو لیٹ ٹو لیٹ۔''

نعیم صاحب نے اسے اس کے گھر پر اتارتے وقت کہا۔ ''بہت دیر ہوگئی'' اور موٹر لیے ہوئے چلے گئے۔

رقیہ گھر میں داخل ہوئی تو کچھ غصہ کے عالم میں تھی۔ اپنے کمرے میں جا کر کپڑے اتارے نچنت ہو کر والدہ اور والد کے ساتھ چائے پینے آئی۔ بات بات میں وہ نمایاں طور پر گم ہو جاتی۔ ماں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ نبض دیکھی اور کہا ''کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آج شاید کام بہت تھا تھک گئی۔''

''جی ہاں تھک گئی ہوں اب جا کر لیٹوں گی''۔

بہت دیر ہوگئی، بہت دیر ہوگئی۔ آخر وہ کس خواب خرگوش میں تھی؟ نسیمہ نے دھوکے میں رکھا۔ نہیں وہ خود دھوکے میں تھی۔ سعید نے بس ایک دفعہ الگ لے جا کر کہا تھا۔ ''تم آج بہت جچ رہی ہو'۔ آج۔ آج اور وہ اس آج کو دوام سمجھ گئی۔ آٹھ برس تک انتظار۔ خواہ مخواہ کا انتظار وہ آیا تو یہ کہتا ہوا ''ارے تمہارے چہرہ پر یہ داغ کیسے ہیں۔'' جیسے وہ کوئی جانور تھی۔ جس کو خریدنے سے انکار کرتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔ کیا وہ نسیمہ کے پاس جائے۔ اور اس سے پوچھے؟ کیا پوچھے؟ وہ اور بھی ہنسے گی۔ شاید یہ تاڑ کر کہ رقیہ اس کے بھائی کو چاہتی تھی۔ اسے بناتی رہی۔ پیٹھ پیچھے کہتی ہو گی۔ ان کے دماغ میں ہوائی جہاز چھوٹے ہوئے ہیں میرے بھائی سعید پر ریجھی ہیں کبھی اس نے کوئی بات کر لی ہوگی یہ سمجھ گئیں کہ مر رہا ہے۔ ''ذرا اپنی اوقات میں رہیں، ذرا اپنا منہ آئینہ میں دیکھیں۔ اور اب تو سوکھ کر اچھوار ہو گئی ہیں۔ کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ یہی کہتی ہو گی سب سے اور بھائی کے آنے پر رقیہ کو بلایا پارٹی میں کہ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ لے۔ اچھا اس نے یہ ترک کیا اور اس کا میاں ضمیر اسے کہتا سنا گیا۔ ''بالکل معمولی بلکہ معمولی سے بھی گری ہوئی اور بنواب اس کے آٹھ بچے ہو گئے۔'' کیا کہنے لگی۔ تم نے نعیم صاحب سے انکار کر دیا۔ غضب کیا۔ اب تمہیں کون پوچھے گا۔ اچھا تھا کہ ماں باپ نے ہائی اسکول کے بعد ہی میری شادی کر دی تھی۔ میں نے چار بچے ہونے کے بعد انٹر جوائن کیا۔

سن معلوم ہوتے ہیں۔ جمیلہ کا میاں اس سے سال بھر چھوٹا تھا۔ مگر دو سال ہی میں مر گیا۔ اب بیوہ بیٹھی ہے ایک لڑکا لیے ہوئے۔ محض وہم ہے سن کے فرق سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہاں حیثیت، مال، آرام سب کچھ ہے، فہمیدہ اس سے دس برس چھوٹی ضرور ہوگی۔ مگر اسے نعیم صاحب سے کوئی انکار نہیں۔ اسے تو کوئی برابر کا مل سکتا ہے اگر ذرا انتظار کر لے۔ مگر کیوں انتظار کرے۔ خطرہ مول لیے۔ پھر محسوس ہو بڑی دیر ہوگئی۔ مگر اب وہ کیا کرے نعیم صاحب بھی ہاتھ سے نکل گئے، صاف صاف کہہ گئے۔ ٹولیٹ ٹولیٹ یہی کہے گی کہ مجھے گھریلو زندگی اچھی نہیں لگتی۔ لومڑی کو انگور نہیں ملے تو کھٹے ہیں۔ بنو کہنے لگے گی۔ آخر اس کے بابت بات کرنا ہی کیا فرض ہے۔ شادی کی بات ہی نہ کرو۔ کوئی بات کرے تو ٹال دو۔ جب پڑھتی تھی تو اس نے افسانے لکھے تھے۔ اب پھر لکھنے لگے۔ دل بہل جائے گا۔ ہاں کئی ایک ناول لکھے۔ فرزانہ نے اب تک دس ناولیں لکھ ڈالیں۔ وہ بھی یہی کرے۔ پڑھانے میں جی نہیں لگتا۔ ناولوں سے بڑی آمدنی ہوگی۔ موٹر، بنگلہ، سب ہی ہو جائے گا۔ نعیم کے پاس کیا ہے۔ یہی تو ہے اور جب مشہور ہو جائے گی تو بہت سے لڑکے آیا کریں گے۔ کتاب پر تصویر دیکھ کر نہ معلوم کتنے لوگ خط لکھیں گے۔ تصویر میں یہ چہرہ کے داغ میں نہیں آئیں گے۔ اور اس رخ سے بیٹھ کر تصویر کھنچوائے گی کہ یہ گڑھے نظر نہ آئیں۔ اور ہاں مس خاتون نے اپنے بابت لکھا۔ میں نے پہلا ناول چودہ برس کے سن پر لکھا۔ ایم اے کے بعد لکھا۔ یعنی تیرہ برس کی تھیں۔ جب ایم اے پاس کیا۔ خوب چھ برس کے سن میں ہائی اسکول کیا۔ یہ نہ کہو کہ ہائی اسکول کا سرٹیفکیٹ منہ میں تھا جب پیدا ہوئیں مگر یہ سب حساب کون لگاتا ہے۔ وہ بھی مشہور کرا دے گی کہ بیس برس کی ہے جوان جوان لڑکے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں گے۔ کوئی نہ کوئی پرپوز ضرور کرے گا۔ چھوٹے سے شادی کر لی۔ لونڈا پھانس لیا۔ کیا ہے؟ شاہدہ نے نہیں کر لیا ہے۔ لوگ تو ہر چیز پر اعتراض کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہاں مرد کو جب شوق چراتا ہے تو کچھ بھی نہیں دیکھتا۔ بیل کی طرح منہ اٹھائے ہوئے دوڑنے لگتا ہے۔ کوئی دوڑتا آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ اب کے جو آئے گا اسے نہ جانے دے گی۔ ضرور پھانس لے گی۔ مگر آئے گا بھی۔ ان جوانوں کا ٹھیکہ نہیں۔ دوڑتے ہیں اور پھر بھاگ لیتے ہیں۔ دیر ہوگئی، کیا سچ مچ دیر ہوگئی؟؟؟؟.......

ooo

ممتاز مفتی

گرو، بالکا، راستہ

میں قدم قدم چل رہا ہوں، چلے جا رہا ہوں۔ کارواں کے پیچھے پیچھے قدم قدم۔
میرے گرو نے کہا تھا۔ یہی ایک راستہ ہے۔ واحد راستہ جو ہمیں منزل پر لے جائے گا۔
کون سا راستہ؟ میں نے پوچھا۔
جس پر ہم گامزن ہونے والے ہیں۔ اس نے جواب دیا تھا۔ دیکھو وہ بولا، اسی راستے پر چلتے رہنا، رکنا نہیں۔ انحراف نہ کرنا۔
میں اسی راستے پر چل رہا ہوں۔ کارواں کے پیچھے پیچھے قدم قدم۔ دل میں امید کی لو لگائے۔
راستے کے کانٹوں سے میرے پاؤں لہولہان ہو رہے ہیں۔ میری ٹانگیں دلدل میں پھنس پھنس جاتی ہیں۔ یہ دلدل مجھے چلنے نہیں دیتی۔ قدم قدم پر پاؤں پکڑ لیتی ہے۔ روکتی ہے۔ مت جاؤ۔ مت جاؤ۔ دیکھو تو یہ کیسا راستہ ہے۔ اوں ہوں راستے ایسے نہیں ہوتے۔
چاروں طرف دھول اُڑ رہی ہے۔ میرا سر، منہ، بال دھول سے اٹ گئے ہیں۔ میری آنکھیں دھول کی کنکریوں سے بھر گئی ہیں۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے ابھر آئے ہیں۔ گرد وپیش سرخ ہو رہا ہے۔ نہیں، یہ میرا کارواں نہیں ہو سکتا۔ میرے کارواں کا رنگ سرخ نہیں، سبز ہے، جو آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ یہ سرخ رنگ تو خون کا رنگ ہے۔ تشدد کا رنگ ہے۔
نہیں نہیں، مت جاؤ۔ میرے دل سے آواز اٹھتی ہے۔ یہ وہ راستہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو راستہ ہی نہیں ہے۔ یہ تمہیں کہیں نہیں لے جائے گا۔ احمق! راستے ایسے نہیں ہوتے۔ وہ تو سیدھے راستے ہوتے ہیں۔ ان میں داؤ پیچ نہیں ہوتے۔ گھنگھریاں نہیں ہوتیں۔ راستے تو خشک ہوتے ہیں، دلدل نہیں ہوتے۔ صاف ہوتے ہیں۔ کانٹے بچھے نہیں ہوتے۔ رک جاؤ۔ آگے مت جاؤ۔
گرو کا چہرہ میرے سامنے معلق ہو جاتا ہے۔
رکو نہیں۔ وہ کہتا ہے۔ چلتے جاؤ۔ یہی وہ راستہ ہے، اس راستے پر چلے بغیر تمہیں استحکام نصیب نہیں ہو گا۔ تم منزل پر نہیں پہنچ پاؤ گے۔ چلو چلتے رہو، چلتے رہو۔
شرم سے میری گردن جھک جاتی۔ سارے جسم میں احساسِ نفریں کی رو دوڑ جاتی ہے۔
میں کیسا بالکا ہوں جو گرو کی آخری وصیت کا پالن نہیں کر سکتا!
وہ کہنے والا گرو نہ تھا۔ اس کا مسلک کر دکھانا تھا، وہ توڑنے کا قائل نہ تھا۔ جوڑتا تھا میں کبھی ناامید ہو جاتا تو کہتا، تم بے شک اس سے امید توڑ دو، لیکن وہ کبھی انسان سے مایوس نہیں ہوتا۔ امید بہت بڑا تعلق ہے۔ انوٹ تعلق۔ ناامیدی تعلق توڑ دیتی ہے۔
اس نے مجھے صرف ایک نصیحت کی تھی، صرف ایک۔ وہ نصیحت نہیں، وصیت تھی۔
وہ ہماری آخری ملاقات تھی۔
مجھے علم نہ تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔
اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ اسے علم تھا۔ ورنہ وہ وصیت نہ کرتا۔
نہیں، میں نہیں رکوں گا۔ میں اس کی وصیت پر ضرور عمل کروں گا چاہے کچھ بھی ہو۔ راستہ دلدل ہے تو بڑا ہو، کانٹے بچھے ہیں تو کیا ہوا۔ دھول اڑتی ہے تو پڑی اڑے۔ مجھے راستے کی صعوبتوں کی پروا نہیں ہے۔ راستے تو ہمیشہ رکاوٹوں سے اَٹے ہوتے ہیں۔

میں نئے عزم کے ساتھ چل پڑتا ہوں۔کارواں کے پیچھے پیچھے قدم قدم۔

بائیں، یہ کارواں کے راہبر مڑ کیوں گئے۔الٹے ہاتھ کیوں چل پڑے۔وہ تو کہتے تھے یہ صراط مستقیم ہے۔ایسا کیوں ہے کہ وہ کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ اور ہیں۔کیا انہیں راستے کے مفہوم کا شعور نہیں کہ یہ موڑ تو ذات کے موڑ ہیں۔

ذات کے گرد گھوم گھوم کر تو ہم نے سالہا سال سے راستہ کھوٹا کر رکھا ہے۔ذات کی گھمن گھیریوں نے تو ہمیں لٹو بنا رکھا ہے۔سالہا سال سے ایک ہی جگہ گھوم رہے ہیں، آگے بڑھنے سے محروم کر رکھا ہے۔

نہیں نہیں، جس راستے پر ذات کا ہنومان کھڑا ہو، وہ ہمارا راستہ نہیں ہے۔وہ ہمیں آگے نہیں لے جا سکتا، ذات کا راستہ تو چکر میں گھومتا ہے۔جہاں سے چلتے ہو وہیں آ پہنچتے ہو۔

کیا راہبروں کو یہ احساس نہیں کہ ان کے پیچھے کارواں آ رہا ہے۔معصوم مخلص افراد کا کارواں۔ایسے افراد جن کا مسلک ماننا ہے، جاننا نہیں۔جو بن جانے، مان لینے کے عادی ہیں۔جو پوچھے بغیر کدھر کو جا رہے ہیں، پیچھے پیچھے چلنے کے عادی ہیں۔جو سالہا سال بھٹکنے کے بعد بڑی توقعات لیے، منزل پا لینے کی امید رچائے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔

میں رک جاتا ہوں۔نہیں میں نہیں جاؤں گا۔میں ذات پرستوں کے پیچھے چلنے کو تیار نہیں ہوں۔میں ان کے پیچھے نہیں چلوں گا۔جو کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ اور ہیں۔جو ہم کا ڈھول بجا کر مجمع اکٹھا کرتے ہیں اور پھر میں کی ڈگڈگی پر رقص کرنا شروع کر دیتے ہیں۔نہیں میں نہیں جاؤں گا۔اس لیے کہ وہ اپنے وچن کا پالن نہیں کر رہے۔میں غصے میں چیختا ہوں۔

وچن کا پالن تو تو بھی نہیں کر رہا۔گرو کی آواز سنائی دیتی ہے۔پھر ان میں اور تجھ میں کیا فرق ہے۔گرو کا چہرا ابھرتا ہے، یوں ٹوٹا ہوا ہے جیسے انڈا ضرب لگنے سے چور چور ہو جاتا ہے۔

کر تو رہا ہوں وچن کا پالن۔میں کہتا ہوں۔

لیکن تیرا جی نہیں چاہتا ہے نا۔وہ پوچھتا ہے۔

ہاں میرا جی نہیں چاہتا۔

نہ چاہ کر کرنے سے تو نہ کرنا بہتر ہے۔اس کی دکھ بھری آواز ڈوب جاتی ہے۔چند ساعتوں کے بعد اس کی آواز پھر ابھرتی ہے۔

دراصل تم بٹ گئے ہو، ایک سے دو ہو گئے ہو۔بٹ جانا بدترین صورت ہے۔منکر ہو جاؤ۔انکار کر دو۔لیکن بٹو نہیں۔اس راستے پر چلنے والے بہت سے لوگ کارندے، راہبر بٹے ہوئے ہیں۔میں اور ہم بٹے ہوئے ہیں۔وہ بھی بٹے ہوئے ہیں، تو بھی بٹا ہوا ہے۔یہ کہہ کر گرو چپ ہو جاتا ہے۔

دیر تک خاموشی طاری رہتی ہے۔پھر وہ دبی آواز میں کہتا ہے۔میں نے تجھ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایسا ہو گا۔ہم کے دعوے ہوں گے۔ہم کے پردے میں میں کی گھمن گھیریاں ہوں گی۔طمع کے مگر مچھ منہ کھولے ہوں گے۔ہم کے ڈھول پر ضرب لگے گی۔میں کی طوطیاں بجیں گی۔آزادی کا منہ زور گھوڑا آگے ہوگا۔قانون کی بہلی پیچھے پیچھے گھسٹتی آئے گی۔ہچکولے کھائے گی، لیکن یاد رکھو، اسی غلیظ شیرے سے ہی شفاف شربت بنے گا۔

تیوری چڑھا کر کہتا ہے، تم کیسے بالکے ہو گرو کو ماننے کے سکون کو چھوڑ کر جاننے کے کرب میں پڑے ہو۔

ہاں، وہ سچ کہتا ہے۔میں بالکا ہوں۔میرا کام جاننا نہیں۔میرا کام دیکھنا نہیں، سننا نہیں۔جانچنا نہیں میرا کام ماننا ہے، چلنا ہے، چلتے جانا ہے۔مجھے آنکھیں موندھ لینی چاہئیں۔کان بند کر لینے چاہئیں تاکہ گرد و پیش میں اڑتی ہوئی دھول کو نہ دیکھ سکوں۔رستے میں بیٹھے ہوئے ٹھگوں کو دیکھ کر گھبرا نہ جاؤں، ان ڈاکوؤں سے خوف نہ کھاؤں جو دو دو ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔انتظامیہ میں ہونے والی دھاندلیوں کو جان سکوں، افواہوں پر کان نہ دھروں۔

کیا کہا؟ میرے ساتھ راستے پر چلنے والا پوچھتا ہے۔افواہوں پر کان دھرنے کی کیا ضرورت ہے! خبریں پڑھ لو۔وہ اخبار میری جانب بڑھا دیتا ہے۔یہ لو۔

نہ نہ نہ۔ میں چلاتا ہوں۔ مجھے اخبار نہ دکھاؤ۔ میں اخبار پڑھنا نہیں چاہتا۔ میرا دل پہلے ہی کمزور ہے۔ اخبار پڑھ کر وہ ڈُب، جھٹکے کھانے لگتا ہے۔ اخبار دیکھ کر ایسے لگتا ہے جیسے میں ننگا ہو گیا ہوں۔ نہیں نہیں میں حقائق جاننا نہیں چاہتا، مجھے خواب دیکھنے دو، جاگنے کے خواب۔

اے قافلے کے رہبرو! اللہ کے واسطے اپنی دی ہوئی آزادی اظہار واپس لے لو۔ ہمیں ننگا نہ کرو پلیز۔ یہ سب کچھ ڈھکا چھپا رہنے دو۔

یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ایک خاتون کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مجھے شک پڑتا ہے، محترمہ میں کہتا ہوں کہ سکون بخش گولیاں بنانے والوں نے راہبروں کو آزادی اظہار دینے پر اکسایا ہے۔ کیا تم جانتی ہو کہ مسکن گولیوں کی سیل چار گنا بڑھ چکی ہے۔

بے شک۔ اخبار نہ پڑھو۔ وہ کہتی ہے۔ ٹی وی جو ہے۔ میں بھی اخبار نہیں پڑھتی۔ یہ دیکھو میرے پاس جیبی ٹی وی ہے۔ میں ہر وقت اسے پاس رکھتی ہوں۔

میرے ساتھ ساتھ چلنے والا چلا کر کہتا ہے۔ میاں یہ جمہوریت کا راستہ ہے۔ آزادی کا راستہ ہے۔ مسکن گولیاں بنانے والوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بکری بڑھائیں۔

کیا کہا؟ یہ جمہوریت کا راستہ ہے؟ آر یو شیور۔ میں پوچھتا ہوں۔

وہ دونوں قہقہہ مار کر ہنستے ہیں۔

کیا راہبروں کو پتہ ہے کہ یہ جمہوریت کا راستہ ہے۔ میں پوچھتا ہوں وہ تو روز لاؤڈ اسپیکر پر ہمیں بتاتے رہتے ہیں۔ تم ان کی تقریریں نہیں سنتے کیا۔

خاتون حیرانی سے میری طرف دیکھتی ہے۔

کیا وہ خود کو بھی بتاتے ہیں یا صرف ہمیں بتاتے رہتے ہیں، میں پوچھتا ہوں۔

بے وقوف، میرے ساتھ ساتھ چلنے والا قہقہہ مار کر ہنستا ہے۔ عوام کو بتانے کی ضرورت ہوتی ہے مسٹر۔ خود کو بتانے کا کیا مطلب؟

مجھے دور دور سے آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

دیکھو دیکھو وہ کیا کر رہے ہیں۔ تم دیکھتے کیوں نہیں ہو؟

سنو سنو وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ تم سنتے کیوں نہیں ہو؟

نہیں، میں نہیں دیکھوں گا۔ میں نے آنکھیں میچ لی ہیں۔

نہیں نہیں میں نہیں سنوں گا۔ میں نے کانوں میں روئی ٹھونس لی ہے۔

یہی میرا رستہ ہے۔ میں اسی راستے پر گامزن رہوں گا۔ میں انحراف نہیں کروں گا۔ یہی راستہ ہمیں منزل پر پہنچا سکتا ہے۔ اسی غلیظ راب سے شفاف شربت نکلے گا۔

نہیں، میں نہیں سوچوں گا۔ میں بٹنا نہیں چاہتا۔ میں دو نہیں بنوں گا، ایک ہی رہوں گا۔

میرزا ادیب

درونِ تیرگی

کمرے کے سب دروازے، کھڑکیاں اور روشندان ایک مدت سے بند پڑے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کمرے کے اندر فضا پر ہر وقت ایک بوجھل، سرد اور بھیانک تاریکی رینگتی رہتی تھی۔ اس گہرے اندھیرے میں نہ تو کبھی سورج کی حیات آفریں شعاعوں نے سانس لینے کی کوشش کی تھی اور نہ کبھی چاند تاروں کی ٹھنڈی روشنی نے اسے چھوا تھا اور تو اور ہوا کی لہریں بھی کسی وقت اندر آنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ شاید انہیں بھی کمرے کی نحوست آثار منجمد تیرگی سے ڈر لگتا تھا۔

یہ کمرہ زندگی کی تمام ہمہمہ زائیوں سے بالکل محروم ہو چکا تھا...... اور اگر اس میں زندگی کا کوئی نشان تھا بھی تو صرف ان ننھے ننھے نظر نہ آنے والے ہزاروں ذرّات کی بدولت تھا جو ایک دیوار سے لے کر دوسری دیوار تک فضا میں دن رات سرکتے رہتے تھے۔ ان میں بھی حرکت اس وقت پیدا ہوتی تھی جب کبھی ہوا کی کوئی لہر یا سورج کی کوئی کرن دروازے کے سوراخ یا دیوار کی دراڑ میں سے اندر آ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں کبھی کسی قسم کا اضطراب یا ہلچل نظر نہیں آتی تھی۔ وہ تاریکی کے اجزا بن کر رہ گئے تھے۔ ان میں انفرادیت نام کو بھی باقی نہیں رہی تھی۔

یہی ماحول طاری تھا کہ ایک دن اسی تاریک کمرے کے ایک تاریک تر گوشے میں ایک چھوٹا سا ذرہ نڈھال ہو کر زمین کے بالکل قریب پہنچ گیا اور انتہائی مایوسی کے عالم میں بولا۔

''توبہ، کس قدر اندھیرا ہے۔ کہیں بھی روشنی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ نہ جانے کب اس سے نجات ملے گی؟''

یہ الفاظ سن کر ایک بوڑھے ذرے نے حقارت انگیز قہقہہ لگایا۔

''خوب! ناچیز ذرّے ہو کر روشنی کی سوچ رہے ہو بیٹا! ہم اندھیرے کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ اندھیرے ہی سے وابستہ رہیں گے۔ ہمارا وجود تاریکی سے الگ نہیں ہے۔''

''ہمیں کبھی نجات نہیں ملے گی۔ کبھی اس اندھیرے سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔'' ننھا ذرہ بولا۔

''کبھی نہیں...... میری مانو ایسی بے ہودہ باتیں نہ سوچا کرو۔ یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تم ایک حقیر ذرے ہو۔''

یہ کہہ کر بوڑھے ذرے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ننھا ذرہ سہم کر خاموش ہو گیا کچھ اور پوچھنے کی اس میں ہمت نہیں رہی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک ہی دفعہ روشنی دیکھی تھی...... اور اس وقت اس کا سینہ ایک شدید تیز و تند ولولے کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ اس کی رگ رگ میں ایک پُر لذت سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ اور اسے پہلی مرتبہ محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک حقیر، ایک بے مایہ وجود نہیں ہے...... اپنی دنیا میں اس کی کچھ اہمیت بھی ہے...... وہ کچھ کر بھی سکتا ہے۔ اس میں کچھ کر سکنے کی ہمت بھی ہے۔ اس کے سامنے ایک وسیع، ایک روشن دنیا پھیلی ہوئی ہے۔ جس میں وہ پرواز کر سکتا ہے۔ ناچ سکتا ہے، گا سکتا ہے...... مگر افسوس اسی وقت ہوا کے ایک جھونکے نے اسے دروازے سے پیچھے دھکیل دیا اور کچھ دیر کے بعد جب اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اس کے اردگرد دوبارہ بے کنار اور ہمہ گیر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور اس کے جسم کا ہر عضو بری طرح دکھ رہا تھا۔ اس کے سارے حسین خواب چٹان کی طرح سخت اندھیرے سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئے تھے اور بظاہر تاریکی سے نکل کر روشن دنیا میں جانے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ تاہم شدید سے شدید مایوسی بھی اس مشعل کو بجھانے میں کامیاب نہ ہو سکی جو ایک مرتبہ روشنی دیکھنے کے بعد اس کی دل کی گہرائیوں میں جل چکی تھی...... اسے توقع تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور اندھیرے کی تہوں سے نکل کر باہر کی لامحدود دنیا میں پہنچ جائے گا...... اور وہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک اسی گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔

بوڑھے ذرے کے تلخ اور ہمت شکن الفاظ نے اس پر گہرا اثر کیا تھا۔ اس لئے وہ اپنے وجود کو سنبھال نہ سکا۔ اور زمین پر گر پڑا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ وہ بے بس ہو کر، مجروح ہو کر، چپ چاپ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اسی حالت میں یکا یک

بوڑھے نے حسب معمول کرخت لہجے میں کہا۔
"تمہارا خیال ہے گھر کی مالکن پھر کبھی یہاں آجائے گی اور کمرے کا دروازہ کھول دے گی۔"
ننھے ذرے نے کوئی جواب نہ دیا...... دراصل یہ الفاظ اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکے تھے اور اگر وہ یہ الفاظ سن بھی لیتا جب بھی کچھ نہ کہہ سکتا۔ مایوسی نے اسے بیدم کر دیا تھا۔
بزرگ ذرے نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔
"گھر کی مالکن کبھی نہیں آئے گی یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔ اس زمانے میں گھر کا کچھ سامان یہاں پڑا تھا اور وہ یہی سامان لینے کے لئے یہاں آگئی تھی۔ ورنہ وہ اس متعفن فضا میں کبھی آنے کا ارادہ نہ کرتی۔ سنا بیٹا! تم سن نہیں رہے کیا؟"
ذرہ خاموش تھا۔
"غائب کہاں ہو گئے ہو...... اچھا بھئی تمہاری مرضی۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" بڑے ذرے کی بوڑھی آواز ایک لمحے کے لئے تھرتھرائی اور پھر گہرے اندھیرے میں جذب ہوگئی۔ کچھ دیر گزرنے پر ننھے ذرے کا شعور بیدار ہونے لگا۔ اسے وہ واقعہ تمام جزئیات کے ساتھ یاد آگیا جس سے وہ ابھی ابھی دوچار ہوا تھا۔ اس نے بزرگ ذرے کی آواز نہیں سنی تھی۔ تاہم وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے اردگرد پھیلے ہوئے بزرگ ذرے کس انداز میں سوچا کرتے ہیں اور روشنی کی تمنا کو کتنا بیہودہ خیال تصور کرتے ہیں۔
ذروں کی دنیا کا یہ سب سے ننھا وجود چند لمحے مسلسل حیرت و مایوسی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ وہ پوری طرح مایوس ہو جانا چاہتا تھا۔ مگر ہو نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خلش سی، ایک اضطراب سا موجزن تھا۔ اس خلش اور اضطراب میں روشنی کی آرزو کے علاوہ ایک قسم کا باغیانہ احساس بھی کارفرما تھا۔ اپنے آپ کو وہ اس قدر حقیر نہیں سمجھتا تھا کہ ایک مرتبہ زمیں پر گر کر دوبارا اٹھنے کا نام ہی نہ لے اور روشنی کی تمنا کو ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دے۔
اس سے بہت دور، کافی بلندی پر اندھیرے کے سینے میں روشنی کی ایک نہایت مدہم سی ننھی سی لکیر لرز رہی تھی اور یہی لکیر اس کی نظر کا مرکز بن گئی تھی...... نہ صرف مرکز بن گئی تھی بلکہ اس کے اندر زندگی کی نئی امنگ اور نئی ترنگ بھی پیدا کر رہی تھی...... وہ مایوسی کی سطح سے بلند ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا...... آخر گھر والے اس کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے کھول کیوں نہیں دیتے۔ انہیں ہم سے کیا دشمنی ہے۔ وہ ہمیں کیوں اس محدود فضا میں بند کر کے روشنی سے محروم کر رہے ہیں۔"
کافی دیر کے بعد وہ گرتا پڑتا اوپر آگیا۔ اب وہ اپنے سامنے بزرگ ذرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بوڑھے سے یہ سوال پوچھنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے کہ یہ بوڑھا اسے مایوس کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسے بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔
بزرگ ذرہ اس کا خیال بھانپ گیا اور کہنے لگا۔
"میں نے ایک دفعہ کہہ دیا ہے کہ ہم تاریکی کا ایک حقیر حصہ ہیں۔ آخر سوچو روشنی کے ساتھ ہمارا کیا واسطہ ہے تم بالکل ننھے ہو۔ بے فائدہ اس چیز کے لئے بیتاب ہو جسے کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ میری مانو، اس قسم کی خیال آرائی نہ کیا کرو۔ سنا تم نے بیٹا۔"
ننھا ذرہ اب خاموش نہ رہ سکا۔ جھٹ بول اٹھا۔
"وہ لوگ دروازہ کیوں نہیں کھول دیتے۔ دروازہ کھلے گا تو روشنی خود بخود اندر آجائے گی۔"
"بہت خوب۔" بزرگ ذرے نے خوفناک قہقہہ لگایا۔ "تم انسان سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بیتابی کا خیال کر کے دروازہ کھول دے گا۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ تم نے انسان کو سمجھا ہی نہیں...... اسے ہم حقیر ذروں کی کیا پروا ہو سکتی ہے...... اگر تم نے اس مجنونانہ خواہش کو دماغ سے نہ نکالا تو ایک دن تمہارا دم گھٹ جائے گا اور تم مر جاؤ گے۔"
اس وقت ذرے کی آنکھوں پر مایوسی کے سائے چھا گئے۔
تاریک فضا اور تاریک ہوگئی۔ روشنی کی وہ ننھی لکیر بھی نہ جانے کہاں غائب ہوگئی۔ ذرے کا دم سچ مچ گھٹنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو ہوا میں چھوڑ دیا...... اس حالت میں اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔
پستی سے لے کر انتہائی بلندی تک چاروں طرف گہری تاریکی مسلط تھی۔ اس تاریکی میں اس کے ہم عمر، لاکھوں ذرے اپنی

مختصر سی دنیا میں گردش کر رہے تھے۔ آگے بڑھتے تھے، ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے اور پھر پیچھے چلے جاتے تھے۔ ان میں کئی ایسے بھی ہوں گے، جنہیں روشنی کی تمنا ہوگی جو وسیع اور روشن دنیا میں پرواز کرنا چاہتے ہوں گے۔ لیکن اپنے گردوپیش بے شمار رکاوٹیں دیکھ کر ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہوں گے۔ ان کی خواہشیں سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہوں گی اور نوجوان ذرہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ راستے کی مشکلات کا مقابلہ کر کے دروازے تک پہنچ جانا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ پہلے بھی اس نے اوپر جانے کی کوشش کی تھی مگر طاقت ور ذروں نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ وہ ایک بیوقوف اور ضدی بچے کو ہلاکت آفریں تگ ودو سے بچانا چاہتے تھے ..... کم از کم ان کا نقطۂ نظر یہی تھا اور ان کی باتوں سے بزرگانہ شفقت نمایاں تھی۔

''کیا وہ اسی طرح ختم ہو جائے گا......؟'' اس نے سوچا اور روشنی کا تصور پوری شدت کے ساتھ اس کے دل میں جاگ اٹھا ور وہ اپنے اندر ایک نئے ولولے کا ہیجان محسوس کر کے بلندی کی طرف پرواز کرنے لگا۔

نئی فضاؤں میں گردش کرتے ہوئے ذرے جب اس سے ٹکرائے تو وہ ایک کہیں سے کہیں جا پہنچتا۔ ایک مرتبہ تو وہ اسی پستی میں پہنچ گیا۔ جہاں سے نکل کر وہ اوپر اٹھا تھا۔ اگرچہ وہ چند لمحے وہاں ٹھہرا۔ لیکن اس مختصر سے وقفے میں بھی اس کے بزرگوں اور ساتھیوں نے طعن وتشنیع سے اسے پریشان کر دیا۔

ایک بزرگ کہنے لگا۔

''دیکھو ایسی بے ہودہ حرکت نہ کرو۔ تم نہیں جانتے کہ.....''

اس سے پہلے کہ بزرگ کا فقرہ مکمل ہوتا۔ وہ تیزی سے اوپر کے کرے میں آ گیا۔

خوش قسمتی سے ہوا کا ایک جھونکا ادھر آ نکلا۔ اور اس جھونکے نے اسے فضا کے اس حصے میں پہنچا دیا جو کافی بلند تھا اور جہاں وہ پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔ یہاں پہنچ کر ذرا رک کر اس نے نیچے دیکھا۔ دور اس کے پست ہمت ساتھی کلبلا رہے تھے اور اپنی محدود تاریک دنیا میں بے معنی گردش کر رہے تھے۔ یہاں سے اپنا پہلا مقام اسے اس قدر پست نظر آیا کہ وہ خود ہی اپنی کامیابی پر حیران رہ گیا۔ مگر حیرت ومسرت کے یہ لمحے بہت جلد ختم ہو گئے کیونکہ اب وہ جن ذروں کے درمیان موجود تھا وہ اسے اپنے ساتھی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ تاریک پستیوں کا باسی کہتے تھے۔ اور اسے اپنے کرے میں آنے کی اجازت دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب اس نے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ نئے ساتھی بجائے اس کے کہ اس کی ہمت وعزم بلند پر تحسین کہیں۔ الٹا اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ایک ذرے نے تو صاف صاف کہہ دیا۔

''بھئی! یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ یہاں تک پہنچ گئے۔ اب فوراً واپس چلے جاؤ۔ تمہارا مقام اسی پستی میں ہے۔ جہاں سے تم آئے ہو۔ اگر ہم میں سے کسی کے طاقتور وجود سے تمہارا تصادم ہو گیا تو ایک ہی لمحے کے اندر فنا ہو جاؤ گے۔ یا زخمی ہو کر نیچے زمین پر گر پڑو گے، اور زمین کے ذروں میں جذب ہو کر رہ جاؤ گے اور پھر کبھی نہیں اٹھ سکو گے!''

باقی ذروں نے بھی یہی کوشش کی کہ وہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر واپس چلا جائے۔ لیکن تھکاوٹ کے باوجود وہ اوپر جانے لگا۔ یہاں تک کہ ایک نئی بلندی پر پہنچ گیا۔

اس بلندی پر اس کی ملاقات ایک تیز رو مسافر سے ہو گئی۔ یہ ذرہ بھی اسی کی طرح ایک دور دراز گوشے سے نکل کر بالائی حصے کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ چنانچہ وہ خوشی خوشی اس کا ہم سفر بن گیا۔

ایک دن وہ دونوں ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے کہ یکا یک اس کا ساتھی چیخ اٹھا۔

''آندھی۔''

''کیا؟'' نوجوان ذرہ آندھی کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

''باہر آندھی آ رہی ہے، یہ شور سن رہے ہو نا!'' اس کا ساتھی بولا۔

''مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ باہر وسیع دنیا میں بھی اندھیرا چھا گیا ہے۔ اتنی جلدی رات کیونکر آ گئی ہے آج؟'' اس کے ہم سفر نے بتایا۔ آندھی تیز وتند ہوا کو کہتے ہیں اور اگرچہ کمرے کے سب دروازے بند ہیں، تاہم آندھی کے

جھونکے اندر بھی آ جائیں گے اور اگر ہم کسی جھونکے کی زد میں آ گئے تو وہ نہ جانے ہمیں کہاں پھینک دے اور...... یہ بھی خبر نہیں کہ......"

یکا یک اِدھر اُدھر ایک ہلچل سی مچ گئی......ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ چھوٹے ذرے نے محسوس کیا کہ سب ذرے مل کر اسے پستیوں کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ خوف سے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس کا تھکا سا وجود اس طرح گردش کرنے لگا جیسے کسی طاقت ور چیز سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔

کافی عرصے کے بعد جب اس کا شعور بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک تنکے کے سرے پر چمٹا ہوا ہے اور یہ تنکا دیوار کی طرف جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ دیوار کے ساتھ جا لگا ہے۔ فضا میں ابھی تک اندھیرا مسلط تھا اور لحہ بہ لحہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ارگرد جتنے ذرے موجود تھے۔ وہ سب کے سب تھک کر، مضمحل ہو کر سو رہے تھے۔ ایک بڑا مایوس کن خیال اس کے ذہن میں آیا......"کیا میری زندگی حرکت اور حرارت سے محروم ہو گئی ہے اور کیا میں اپنا سفر پورا کر کے پھر اسی ناپیدا کنار تاریکی کا جزو بن رہا ہوں۔ جس کے بطن سے میں پیدا ہوا تھا۔ کاش میں اس ناکامی سے پیشتر صرف ایک مرتبہ دروازے سے نکل کر روشنی کے سیلاب میں چھلانگ لگا سکتا......صرف ایک مرتبہ اور......

"روشنی میں جانے کا مزا دیکھ لیا ہے نا!" قریب سے ایک بوڑھی آواز آئی۔

"کیا مطلب؟" اس نے کہنے والے کی طرف مخاطب ہوئے بغیر پوچھا۔

"مطلب کیا......شکر کرو اس کمرے کے سب دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں......اگر ایک بھی کھڑکی کھلی رہتی تو ہم میں سے کسی کا وجود بھی سلامت نہ رہتا۔ ہم مٹی کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو گئے ہوتے۔ ہمیں بند دروازوں اور کھڑکیوں نے بچا لیا ہے۔"

بات بالکل درست تھی۔ آندھی کا ایک ہلکا سا جھونکا اندر آ سکا تھا اور اس ہلکے سے جھونکے نے ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ اگر وہ باہر ہوتا یا دروازہ کھلا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ مایوس تھا۔ مگر اب کے مایوسی میں کچھ اطمینان بھی تھا۔

وقت چپ چاپ گزرتا رہا اور ایک دن پھر اس نے یکا یک بلندی پر ایک روشن نقطہ دیکھ لیا۔ اس کے سینے میں سوئی ہوئی امید جاگ اٹھی۔ "ہائے وہ باہر کی دنیا کس قدر وسیع، کس قدر خوبصورت ہے۔" اس نے آہ بھر کر کہا اور اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ اوپر آ گیا ہے۔ ایک نئے مقام پر۔"

"ننھے بھائی کیا کر رہے ہو؟"

اس نے دائیں طرف دیکھا۔ اس کا پہلا باہمت ہم سفر پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ امنگ از سرِ نو اس کے اندر پیدا ہو گئی۔

ابھی اس نے کچھ نہیں کہا تھا......وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کہے۔ اتنے میں اس کا ہم سفر بولا۔

"مجھے افسوس ہے۔ میں تمہارے ساتھ جا نہیں سکتا۔ دیوار کے ساتھ جالا لٹک رہا ہے۔ میں اس میں بہت بری طرح پھنس گیا ہوں۔ نہ جانے کب تک یہاں گرفتار رہوں گا۔ ایک نہ ایک دن ہوا کا جھونکا آئے گا اور مجھے اس قید سے رہائی دلا دے گا۔ جب تک وہ جھونکا آئے میں اس بوجھل غبار سے نہیں نکل سکتا۔"

"کوشش تو کرو۔"

"کوشش تو کرتا ہی رہوں گا۔ تم تہہ روشنی کی تلاش میں نکل جاؤ۔ میں بھی کبھی نہ کبھی آؤں گا۔ کبھی نہ کبھی ضرور آؤں گا۔"

"نہیں۔ جب تک تم ساتھ نہیں چلو گے میں یہیں رہوں گا۔" یہ کہتے ہوئے چھوٹے ذرے کا دل ہمدردی سے لبریز ہو گیا۔

دوسرا ذرہ بولا۔"اس کا خیال نہ کرو۔ اس وقت فضا کافی پرسکون ہے۔ تمہیں راستے میں زیادہ تکلیف نہیں ہو گی۔" دوسرے ذرے کے لہجے میں عزم اور ارادے کی مضبوطی جھلک رہی تھی۔

اپنے ہم سفر سے محرومی کے احساس نے اس کے سینے میں درد کی لہریں دوڑا دیں۔ اور اس کے ذہن میں ایک چبھن سی ہونے لگی۔

"یہیں ٹھہر جاؤں یا روانہ ہو جاؤں......" وہ سوچنے لگا۔ اس وقت واقعی فضا پرسکون تھی اور بلندی پر تاریکی کی پیشانی سے

ـں تھرتھرا رہا ہے...... اسے کچھ سوجھتا نہیں تھا...... کچھ دیر کے بعد وہ اپنے نئے ماحول سے آشنا ہونے لگا...... اس کے چاروں طرف ایک نئی دنیا بکھری ہوئی تھی...... ایک نئی دنیا جس میں روشنی بھی تھی اور وسعت بھی، جو بڑی شاداب اور بڑی خوبصورت تھی۔ اسے روشن دنیا کے ذرے بڑے ہمدرد نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ ان کے صحت مند چہروں پر مایوسی اور افسردگی نہیں تھی بلکہ مسکراہٹ کی سرخی پھیلی ہوئی تھی اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اس کا استقبال کر رہے ہیں۔ اپنی کامیابی سے سرشار وہ روشنی کے چشمے میں تیرتا رہا...... یہاں تک کہ وہ تھک گیا...... اچانک ایک دم تاریکی چھا گئی۔ اس نے حیران ہو کر ایک ذرے سے پوچھا۔

''روشنی کہاں گئی؟''

نئے ذرے نے جواب دیا۔

''اب شام ہو گئی ہے۔ کمرے کے باہر وسیع دنیا میں روشنی کا منبع یعنی سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر رات کے غار میں اتر رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چاند اور ستارے نکلیں گے...... تھوڑی سی روشنی اندر آ سکے گی...... آہ خوب صورت اور حیات آفریں روشنی تو باہر ہے...... باہر کی لامحدود دنیا میں۔''

''میں اسی لامحدود دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔'' چھوٹا ذرہ بولا اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔

''آگے ہوا کے بڑے تیز اور تند تھپیڑے ہیں جو ہمیں پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔ باہر جانا ممکن نہیں۔''

''...... مگر وہ دیکھو باہر جانے کا راستہ ہے...... وہ دروازے میں۔'' وہ بولا۔

''راستہ ہے لیکن باہر نکلنا بے حد مشکل ہے۔ وہاں ہوا بہت تیز ہے۔''

''کوئی پروا نہیں...... میں باہر جاؤں گا...... میں باہر کی سنہری اور روشن دنیا میں ضرور جاؤں گا...... ضرور جاؤں گا۔''

اور یہ کہتے ہوئے وہ پھر پرواز کرنے لگا! اوپر ہی اوپر...... بلند سے بلند تر فضا میں۔

OOO

بے آباد جزیرے

کوچی پہنچ کر سب سے پہلے راماشی سے ملاقات ہوئی۔

ہمیں اس جزیرے پر اُترے تیسرا روز تھا۔ بارش موسلا دھار برس رہی تھی۔ میں اپنی ہٹ میں پلنگ کی پٹی پر پاؤں رکھے، ٹانگیں پسارے کرسی پر نیم دراز اُونگھ رہا تھا کہ راماشی اس طرح میری کرسی کے قریب آ کر گری جیسے کسی نے اسے دروازے میں کھڑی کر کے دھکا دیا ہو۔ میں نے چونک کر درمیان کی طرف دیکھا۔ ہڈسن چوکھٹ سے کندھا بڑھائے کھڑا تھا۔ آتشدان میں بھڑکتے شعلوں کا عکس اس کی سرخی مائل بلوری آنکھوں میں جھلملا رہا تھا۔ وہ مجھے حیران دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا۔

''اِٹ از فور یُو کیپٹن۔''

پھر راماشی سے مخاطب ہو کر تحکمانہ لہجے میں جاپانی میں کوئی بات کہی۔ وہ تڑپ کر اُٹھی اور جلدی جلدی میرے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگی۔ ہڈسن اسے اشاروں پر ناچتی پا کر ہنسا اور لڑکھڑاتا ہوا اپنی ہٹ کی طرف چلا گیا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ میرے بوٹ اتار کر وہ فرش پر بیٹھ گئی اور اپنی فراک کے دامن سے صاف کرنے لگی۔

میں نے اس کے سراپا پر نظر ڈالی۔ وہ سڈول جسم اور زردی مائل رنگ والی قبول صورت لڑکی تھی۔ صورت اجڑی اجڑی تھی۔ خدوخال کا تناسب بکھرا ہوا تھا۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر قریب کھینچ لیا۔ وہ بلا حیل و حجت گردن جھکا کر کرسی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہیروشیما اور ناگاساکی جل کر راکھ ہو چکے تھے ان کے کھنڈروں تلے جاپان کی عظمت دفن ہو کر رہ گئی تھی اور فاتح فوجیں اس ملک پر اپنا قبضہ مکمل کرنے آئی تھیں۔

ہڈسن کی بدولت پچھلے تین روز میں کئی جاپانی لڑکیاں افسروں کے تصرف میں لائی جا چکی تھیں۔ وہ ایسی لڑکیوں کو تلاش کرنے اور ان کے کس بل نکالنے کا ماہر تھا۔

آتش دان میں لکڑیاں چٹخیں تو لمحہ بھر کو سناٹا ٹوٹ گیا۔ میں نے ٹھوڑی پکڑ کر راماشی کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی پلکوں پر لرزتے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے اور وہ کرسی کے بازو پر سر رکھ کر رونے لگی۔ وہ روتی رہی اور میں اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو انگلیوں کی کنگھی بنا کر سنوارتا رہا۔

اس کے طرزِ عمل میں کوئی انوکھی بات نہ تھی ہڈسن کے ہتھے چڑھ کر جو بھی لڑکی آتی پہلے پہل وہ طوفان کی زد میں آئی ہوئی نازک شاخ کی طرح لرزتی۔ نوگرفتار پنچھی کی طرح پھڑپھڑاتی اور پھر اس ماحول میں اس طرح رچ بس جاتی جیسے اسی ماحول کا ایک حصہ ہو۔ نیا ماحول ان لڑکیوں کو ایسا راس آتا کہ وہ رات گئے تک وہیں اٹھلاتی پھرتیں۔ مترنم قہقہے گونجتے رہتے اور سپیدئ سحر کے قریب وہ مچھلی، گوشت اور پھلوں کے بند ڈبے سنبھالے چپکے سے کھسک جاتیں راماشی بھی انہی لڑکیوں میں سے ایک تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر سرخ سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھیکی مسکراہٹ چہرے پر لا کر صاف ستھری انگریزی میں بولی۔

''آئی ایم سوری کیپٹن۔''

اور اُٹھ کر اس طرح کام میں لگ گئی جیسے اپنے ہی گھر چلی آئی ہو۔

جن حالات میں وہ وہاں لائی گئی تھی وہ بڑے افسوسناک اور تکلیف دہ تھے۔ پھر بھی اس کا آنا غنیمت تھا۔ وطن سے دور آ کر میں تنہا اور اُداس تھا۔ ماحول پر افسردگی ٹوٹ کر چھائی ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میرے اور اُس کے درمیان اجنبیت کے فاصلے جلدی سے سمٹ جائیں پھر وہ کھلکھلا کر ہنسے اور موتیوں کی لڑی ٹوٹ کر بکھر جائے۔ ہٹ کے نیم تاریک ماحول میں میٹھی میٹھی

سرگوشیاں ابھریں اور رسیلے لبوں کا رس شہد بن کر ٹپکے راماشی کے گداز اور لچکیلے جسم کا خیال آتے ہی پلنگ سرسوں کے پھولوں سے لبالب بھر گیا۔

میں رات کے حسین تصور باندھے بیٹھا تھا کہ وہ چپکے سے آئی اور کرسی سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے کولہوں کا بیضوی ابھار کرسی کے بازو پر پھیل گیا۔ میرا جی چاہا اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گود میں بٹھا لوں کہ میری نظر سے اس کے رخساروں پر پھیلی گیلی گیلی لکیروں پر پڑی، تصورات کا آئینہ گر کر چور چور ہوگیا۔

وہ چلی گئی اور رات اور بھی ویران ہوگئی۔

اگلے روز وہ آئی اور پھر روزانہ آتی رہی۔ میں جب بھی اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے لاتعداد بگولے اپنے دامنوں میں زرد پتوں کے ہجوم لیے ویران قبرستانوں میں چکراتے پھر رہے ہوں۔ وہ آسیب زدہ مکان کی طرح پراسرار دکھائی دیتی جس کی کھڑکیاں اور دروازے مدت سے بند پڑے ہوں۔ اس کی موجودگی میں ماحول دم سادھ لیتا۔ کربناک سناٹا چھا جاتا۔ ہٹ میں اس کے قدموں کی چاپ اس طرح ابھرتی جیسے وقت دھیرے دھیرے کراہ رہا ہو اور پھر سناٹے پر سناٹے کی ایک تہ اور چڑھ جاتی۔

اس پر موسم بڑا گندا اور واہیات تھا۔ دن بھر دُھند چھائی رہتی۔ راتوں کو سرد ہوائیں چھت کی ٹائیلوں میں منہ چھپا کر روتی رہتیں ایسے میں راماشی کی وجہ سے اعصاب پر خواہ مخواہ عورت سوار ہو جاتی۔ سچی بات ہے میں اس سے جان چھڑانے کی تجویزیں سوچنے لگا۔

اس روز صبح سے برف گر رہی تھی۔ میں جس وقت میس (MESS) میں داخل ہوا ہڈسن بار کے کاؤنٹر پر جھکا پی رہا تھا۔ میں نے دروازے میں رک کر کپڑوں سے برف جھاڑی۔ وہ میرے لمبے بوٹوں کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لے کر بولا۔

''گھوڑ سواری سیکھ رہے ہو؟''

''سواری کے لیے گھوڑا کہاں ہے؟''

میں نے الٹا اُسی سے سوال کیا اور کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے مجھے آنکھ ماری اور ہنس کر بولا۔

''گھوڑی تو ہے۔'' پھر مڑ کر بار مین سے کہنے لگا۔ ''ایک پیگ وسکی چھوٹا والا۔''

میں نے اس کا شانہ ہلا کر اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔

''راماشی کو کسی اور کے ساتھ نتھی کر دو۔''

''کیوں؟''

کیا ضرورت ہے آخر ان لڑکیوں کی؟''

میں نے بیزاری سے کہا۔ وہ منہ کھول کر میری صورت تکنے لگا۔ بار مین نے گلاس میری طرف سرکا دیا۔ میں گلاس ہاتھ میں لے کر اس سے کھیلنے لگا وہ کھلکھلا کر ہنسا اور کہنے لگا۔

''مائی ڈیر کیپٹن۔ ناک۔''

اس نے اپنی ناک کی پھنک چٹکی میں لی کر مروڑی۔ اس کی سرخ ناک اور بھی سرخ ہوگئی۔ پھر وہ میری طرف جھک کر آپ ہی آپ اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا۔

''لڑکیاں قوم کی ناک ہوتی ہیں۔ جب وہ راتیں غیر مردوں کے ساتھ بسر کریں تو ناک کٹ جاتی ہے۔''

اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ سے گلاس لیا اور ایک ہی گھونٹ میں وسکی کا چھوٹا پیگ حلق سے اتار لیا۔ اور پھر زور سے میرا کندھا تھپتھپا کر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

میں ہٹ میں واپس آیا تو راماشی جا چکی تھی۔ میں کمبل اوڑھ کر بوٹوں سمیت پلنگ پر لیٹ گیا۔ پتہ نہیں کیوں ہڈسن کی سرخ ناک میری آنکھوں میں گھسنے لگی۔ اچانک میرے سرہانے کوئی درخت کے گیلے تنے پر زور زور سے کلہاڑے چلانے لگا۔ میں کمبل

پرے پھینک کر جلدی سے اٹھا۔ ہٹ سنسان پڑی تھی۔ باہر نکل کر دیکھا تو حدِ نظر تک برف کی چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ ہٹس کا بے ترتیب سلسلہ سیاہ دھبوں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میرے پڑوس میں پچیس تیس گز کے فاصلے پر ہڈسن کی ہٹ تھی۔ میں اس طرف لپکا۔

ہٹ میں گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر ہڈسن پر پڑی وہ کمان کی صورت پرلی طرف منہ کیے فرش پر پڑا تھا۔ اس کے پیروں میں راماشی کھڑی تھی۔ اس کا فراک تار تار ہو کر شانوں میں جھول رہا تھا۔ اس کی گول گول چھاتیوں پر لمبی خراشیں تھیں۔ ان خراشوں سے خون رس رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ہڈسن پر مرکوز تھیں۔

میں نے ہڈسن کا کندھا پکڑ کر اسے اپنی جانب کروٹ دی۔ اس کی آنکھوں اور منہ کے درمیان ایک بھیانک سوراخ منہ پھاڑے مجھے گھور رہا تھا۔ گولی ناک کو توڑتی ہوئی حلق میں اتر گئی تھی۔ اس نے ہچکی لی اور راماشی کے فراک کی دھجیاں اس کی مٹھیوں میں دب کر رہ گئیں۔ راماشی ابھی تک بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے ریوالور چھینا اور رومال سے صاف کر کے ہڈسن کے پہلو میں ڈال دیا۔ اس کی مٹھیوں سے راماشی کے فراق کی دھجیاں نکالیں۔ اپنے اور راماشی کے قدموں کے نشانات مٹائے اور اسے اپنی ہٹ میں لے آیا۔

راماشی کمبل اوڑھے پلنگ پر بیٹھی تھی اور میں اس کے سامنے بیٹھا سوچ رہا تھا...... ناک سُسری کا کیا ہے۔ کٹنے پر آئے تو پل بھر میں کٹ جائے...... میں اسے جیپ میں بٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آیا۔

فاتح فوجوں کے جنگل میں آگ لگ گئی اور جب جاپانی لڑکیوں کا ریوڑ کمانڈر کے روبرو پیش کیا گیا تو خلافِ توقع راماشی کے چہرے پر گلاب سے کھلے ہوئے تھے۔ کمانڈر نے اس سے پوچھا۔

''کیپٹن ہڈسن کو مارا؟''

راماشی نے اتنے زور سے نفی میں سر ہلایا کہ اُس کے بالوں کی جھالر پیشانی پر بکھر گئی۔ میں کمانڈر کی طرف جھکا اور نظریں نیچی کر کے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

کل شام یہ لڑکی میرے ساتھ تھی۔''

کمانڈر نے مسکرا کر معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور دوسری لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں ہٹ کی طرف آتے ہوئے اپنے اندر والے مجنوں کی بوکھیوں پر دل ہی دل میں ہنسا۔ میں اس اجنبی لڑکی کو بھلا کیوں موت کے منہ سے بچاتا پھر رہا تھا۔ میرا اس کے ساتھ کیا رشتہ تھا!...... میں تو اس ملک میں جاپانی قوم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے آیا تھا۔

ہٹ میں داخل ہوا تو راماشی میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بھاگی ہوئی آئی اور میرے گلے میں بازو حمائل کر کے جھول گئی۔ میں اسے کلاوے میں لے کر پلنگ پر چت لیٹ گیا۔ میرے سینے پر ریت کے گدگدے ٹیلے ذرا دیر کو دبے اور ہوا کا دوسرا ریلا انہیں پھر سنوار گیا۔ وہ ٹانگیں سکیڑ کر مجھ پر سوار ہو کر بیٹھ گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں کا بوجھ میرے سینے پر ڈالتے ہوئے جھک کر میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

''تم دیوتا ہو؟''

''نہیں۔ میں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اپنے پہلو میں لٹا لیا اور اس کی جانب کروٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں اُلو کا پٹھا ہوں۔''

''اوہ۔'' وہ نچلا ہونٹ لٹکا کر کسمسائی اور پھر نظریں جھکا کر بولی۔ ''کل امی آپ کو سڑک تک دیکھنے آئی تھیں۔ پر آپ ٹھہرے ہی نہیں۔

''تم نے ٹھہرنے کے لیے تھوڑا ہی کہا تھا؟''

''مجھے خیال ہی نہ رہا۔'' اس نے بھولپن سے کہا۔'' پھر امی نے جونہی مجھے دیکھا لپٹا کر زار و قطار رونے لگیں۔ ان کے دل

میں تو اسی روز سے چور تھا جب ہڈسن مجھے چھاپہ مار کر گرفتار کر کے لایا تھا۔ اس کا خیال تھا مجھے رات سے پہلے پہلے گولی مار دی جائے گی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔

جاپانی لڑکیوں کو رام کرنے کا اور ان سے بلا تامل اپنی بات منوانے کے لئے ہڈسن اسی طرح ان لڑکیوں کو ان کے گھروں سے گرفتار کر کے لایا کرتا تھا۔ میں نے شرارتاً پوچھا۔

''گرفتاری کے بعد تمہارا کیا خیال تھا؟''

''میرا خیال......'' اس نے بات کرتے کرتے رک کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ ''میرا خیال تھا میں رات کی رات میں کہیں کی نہ رہوں گی۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اس لڑکی کو صدیوں سے جانتا ہوں...... میں نے اس کے سر کے نیچے رکھے ہوئے بازو کا حلقہ تنگ کر کے اسے سینے سے لگا لیا۔ بے ہنگم دھڑکنوں کے شور سے دل کے کواڑ بجنے لگے۔ اس نے اپنے اور میرے درمیان دونوں مٹھیوں کی دیوار حائل کر کے ایک دم سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

''تم ان لوگوں کے ساتھ یہاں کیوں آئے ہو؟''

میں نے کہا۔

''میں تمہیں بھگا لے جانے آیا ہوں۔''

وہ تڑپ کر اٹھی اور کہنے لگی۔

''تو پھر بھگا لے چلو۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے...... ابھی بھگا لے چلے۔''

میں اسے بھگا کر اس کے گھر لے گیا۔ اور وہیں اس کے پاپا سے عجیب سی ملاقات ہوئی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ میں اس کی کال کوٹھڑی میں جا گھسا۔

راماشی مجھے ایک کمرے میں بٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا خیال تھا اس کا گھر جاپانیوں کے روایتی گھر کی طرح ہوگا۔ مگر وہاں نہ فرش پر چٹائیاں بچھی تھیں نہ کمرے کے وسط میں نیچی تپائی پر بلوری کٹوروں سے دھواں اٹھ رہا تھا میں نے سوچا جس طرح ہماری تہذیب کا گاؤ تکیہ اور چاندنی دیوان خانے سے اٹھ کر کوٹھڑی میں پہنچ گئے ہیں اسی طرح جاپانی تہذیب بھی بوریا بستر لپیٹ کر کسی اندھیرے کمرے میں دبکی پڑی ہوگی۔ میں متجسس سا اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

اس کمرے سے ملا ہوا ایک اور کمرہ تھا۔ درمیانی دروازہ بند تھا۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ کہیں سے روشنی کا گزر نہ تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ جب آنکھیں اندھیرے سے قدرے مانوس ہوئیں تو میں نے دیکھا کونے میں ایک ادھیڑ عمر آدمی سر نیہوڑائے کرسی پر بیٹھا دیوار کے ساتھ رکھا ہوا پالنا جھلا رہا ہے۔ وہ میری آمد سے بے نیاز پالنا جلاتا رہا۔ اس برف خانے میں میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے یونہی کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا دیا۔ روشنی کا ایک قتلہ اس اندھیرے کمرے میں آن گرا جیسے پردے سے لگ کر کھڑا تھک گیا ہو۔ روشنی دیکھ کر وہ ادھیڑ عمر آدمی کرسی پر اچھلا اور چلانے لگا۔ راماشی نہ جانے کہاں سے میری طرف لپکی اور کہنے لگی۔

''پردہ گرا دو ساشا کو لو لگ جائے گی۔''

وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے آئی مجھے کریدی لگی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

''ساشا کون ہے؟''

اس نے آنکھیں نیم وا کر کے بغور میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

''میرا بیٹا۔''

ساتھ ہی نڈھال ہو کر دھپ سے صوفے پر گر گئی۔ اس کا زرد چہرہ گھبراز رد ہو گیا۔ مجھے دھچکا سا لگا۔ پرائی عورت سے دل لگا بیٹھنے پر شرمسار ہو کر میں نے سر جھکا لیا۔ کمرہ کسی اندھے کنوئیں کی طرح بھائیں بھائیں کرنے لگا اور پھر اس اندھے کنوئیں سے

راماشی کی آواز آئی۔
ہماری ایک چھوٹی سی دنیا تھی جہاں میں بارا کو اور ہمارا ساشا رہتے تھے۔ بارا کو ہیروشیما کے مقامی ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ پھر ہماری بدلی یوکوہاما ہوگئی۔ یوکوہاما جانے سے پہلے میں ایک دن کے لئے امی اور پاپا سے ملنے یہاں چلی آئی۔ جس روز میں یہاں پہنچی اسی روز ہیروشیما پر بجلی گری اور میں مجسم ہوکر رہ گئی۔
''پتہ نہیں میں کب تک گرداب میں پھنسی غوطے کھاتی رہی...... پاپا، ساشا اور بارا کو ڈھونڈنے گئے اور جب وہ واپس آئے تو ان کی آنکھوں میں سربریدہ ہیولے دست وگریباں تھے۔ وہ بے حال سے دروازے کے چوکھٹے میں جڑے کے جڑے رہ گئے۔ ان کا منحنی سا وجود اور بھی سکڑ گیا میں ان کی طرف بھاگی اور ماں ہوتے ہوئے پتہ نہیں کیسے منہ پھاڑ کر پوچھا۔
''پاپا! ساشا مر گیا؟''
انہوں نے مجھے گود میں لے لیا اور سینے سے لگا کر بولے۔
''پگلی ساشا نہیں مر سکتا۔ اسے کوئی نہیں مار سکتا۔''
پھر انہوں نے چھتی پر سے وہ پالنا اتار جس میں امی مجھے بچپن میں لٹا کر جھلایا کرتی تھیں اور اب...... اب پاپا اس اندھیرے کمرے میں بیٹھے اس پالنے کو جھلاتے رہتے ہیں۔''
راماشی کی آنکھیں ابھی تک ماضی کی راکھ میں دفن یادوں کے ذخیرے کو کرید رہی تھیں۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر پکارا۔
''راماشی''
وہ اس بچے کی طرح چونکی جس نے ابھی ابھی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ میں نے اس کے شانوں کے گرد بازو ڈال کر کہا۔
''راماشی، ساشا کبھی نہیں مر سکتا۔''
اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور میرے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ ہمارے درمیان اجنبیت کے فاصلے لمحہ بھر میں سمٹ گئے۔
راماشی میرے خیالوں میں بس گئی۔
ایک رات ہم بتی بجھائے پلنگ پر خاموش لیٹے تھے۔ راماشی کھڑکی سے جھانکتے چودھویں کے چاند کو دیکھ رہی تھی اور میں اتھاہ جھیلوں میں جھلملاتے چاند کو تک رہا تھا۔ سرد ہوائیں ہٹ کی چھت پر ٹائلوں میں چھپی گنگنا رہی تھیں۔ اس نے میری طرف کروٹ لی اور پوچھنے لگی۔
تمہارے دیس کا چاند بھی ایسا ہی ہے؟''
میں نے کہا۔
''میرے دیس میں تو چاند کی کھیپ ہوتی ہے۔''
''کھیپ!!!''
وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔
''اور کیا...... میرے دیس میں جب گاؤں کی گوریاں شفاف پیشانیوں پر جھومر سجائے ترنجن میں بیٹھ کر چرخے کاتتی ہیں تو آسمان کا چاند بدلی میں چھپ جاتا ہے۔''
وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے مستفسرانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔
''تمہارے دیس کی لڑکیاں بہت خوبصورت ہیں؟''
میں اس کے ذہن میں کھد بداتے وسوسوں کو بھانپ کر دل ہی دل میں مسکرایا اور جذباتی بن کر کہا۔
''مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ کھانے والی لڑکیاں خوبصورت نہیں ہوں گی تو کیا بدصورت ہوں گی! ان کے چہرں پر تو

چناروں کی آگ کا پرتو رقص کرتا ہے۔ ان کی لمبی پلکوں کی گھنیری چھاؤں میں تھکے ہارے مسافر بیٹھ کر ستاتے ہیں اور جب وہ چلتی ہیں تو دھرتی ان کے قدموں میں بچھ جاتی ہے۔"

وہ مرجھا گئی اور کہنے لگی۔

"میرے چہرے پر تو سرسوں پھولی ہوئی ہے۔ ایک بھولے بھٹکے مسافر نے میری پلکوں کے سایے میں دو گھڑی کو ڈیرا ڈالا تھا۔ بیچارہ اس سایے میں جل کر راکھ ہو گیا۔"

وہ اس وقت چاندنی کا دوپٹہ اوڑھے، پاؤں لٹکائے پٹی پر بیٹھی تھی۔ پلکوں کی جھالر پر دو موتی جھلملا رہے تھے۔ میں چپکے سے اٹھا اُس کے پیروں میں فرش پر آلتی پالتی ماری اور دونوں ہاتھ باندھ کر کسی پجاری کی طرح سر جھکا لیا۔ میرے جی میں آئی اس سے کہوں...... تُو تو ایشیا کی بیٹی ہے۔ لیکن وہ جلدی سے اٹھی اور میرے ہاتھ تھام کر میری گود میں لیٹ گئی اور کہنے لگی۔

"مجھے اپنے دیس لے چلو۔ میں وہاں ترنجن میں بیٹھ کر چرخہ کاتوں گی۔"

اس کی آواز میں پہاڑی جھرنوں کا سنگیت تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا۔

فتح کا سہرا دراصل ابراہم کے بیٹوں کے سر تھا۔ جب اس سہرے کی نمائش گلی گلی ہونے لگی تو ہم اتنے دنوں سے اس علاقے میں گولہ بارود کے ذخیروں کو فلیتہ دکھانے اور جاپانی فوج کے مردے پر سو درے مارنے کی جو کاغذی کارروائیاں کر رہے تھے ان کو عملی جامہ پہنانے کا کام انہوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو ہماری حیثیت براتیوں کی سی ہو گئی اور پھر براتیوں کی ٹولیاں ایک ایک کر کے واپس ہونے لگیں۔

ہڈسن کی لائی ہوئی جاپانی لڑکیاں پرانے ڈیرے چھوڑ کر نئے ڈیروں کی طرف چل دیں۔ پرانے ڈیرے ویران ہو گئے۔

کوچی میں وہ میری آخری رات تھی۔ راماشی اور میں دو بے آباد جزیروں کی طرح پڑے تھے اور ہمارے درمیان ابھی سے کھاری پانیوں کی دیوار حائل ہوتی جا رہی تھی، میں اس سے بہت سی اَن کہی باتیں کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس پنچھی کی طرح حیران تھا جس کے آشیانے کے چار تنکے آندھی اڑائے لئے جا رہی ہو۔ جب خاموشی ناقابلِ برداشت ہو گئی تو میں نے جھنجھلا کر اسے جھنجھوڑ ڈالا اور اسے سامنے بٹھا کر پوچھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی۔"

وہ شرما گئی۔ اس کے رخسار گلابی ہو گئے ہیں۔ میں نے اس کے قریب ہو کر کہا۔

"میں چاہتا ہوں تمہاری مانگ میں سفید واد کیھ کر میرے گھر والے بنا کہے سمجھ جائیں کہ میں دلہن لے کر آیا ہوں...... چلو ابھی کسی پگوڈے میں چل کر شادی رچالیں۔"

اس نے مسکرا کر میری آنکھوں میں دیکھا اور مان گئی۔ لیکن جب چلنے کے لئے تیار ہوئے تو وہ دروازے میں رک کر کھڑی ہو گئی اور اداس لہجے میں بولی۔

یہاں کی شادی کا اب کیا اعتبار!...... جہاں شام کی شادی صبح کو ٹوٹ جائے...... تم مجھے ساتھ لے چلو۔ میں جانتی ہوں سورج نکلتے ہی تمہارا جہاز روانہ ہو گا...... میں آپ ہی پہنچ جاؤں گی۔"

خیالات کی آندھی نہ جانے اسے کیسی کیسی بھول بھلیوں میں اڑائے لیے پھر رہی تھی۔ میں کہنے ہی والا تھا کہ میں تمہیں دل میں چھپا کر لے جاؤں گا کہ وہ جلدی سے مڑی اور چلی گئی۔

اس رات کے پچھلے پہر میرے ساتھیوں نے چوری چوری وہ کیبن دلہن کی طرح سجایا جس میں راماشی سفر کرنے والی تھی۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق علی الصبح آ گئی۔ اس کے چہرے پر دلہنوں کا سا نکھار تھا۔ سرخ فراک کا عکس چہرے پر جھلک رہا تھا۔ چمکیلی آنکھوں میں بجلیاں کوند رہی تھیں اور گلابی ہونٹوں سے رس چھلک رہا تھا۔ وہ مجھے بے محابہ اپنی طرف دیکھتے پا کر شرما گئی اور ریلنگ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے پاس باریک ڈوری کی ایک ریل تھی وہ ڈوری کا ایک سرا پانی میں ڈبو کر کھیلنے لگی۔

دھندلکے میں جاپان کے جزیرے سوئے ہوئے تھے۔ مجھے یوں ہی خیال آیا کہ میں نے چار ماہ کا طویل عرصہ کوچی کے

ایک ہٹ میں بند پڑے پڑے گزار دیا۔ اتنا بھی نہ ہوا کہ وہ اجڑا دیار گھوم پھر کر دیکھ لیتا۔ میں نے راماشی سے کہا۔
اگر ایک دن کے لئے روانگی ملتوی ہو جائے تو ہم ہیروشیما ہو آئیں۔"
اس کی آنکھوں میں دھوئیں کا ایک بادل سا اٹھا اور دیکھتے دیکھتے پھیل گیا۔ اس سے پہلے کہ بادل برستا وہ آنکھیں جھپکا کر بولی۔
تم نے پاپا کو تو دیکھا ہی ہے۔ انہی کو ہیروشیما سمجھ لو۔"
اور ہوا کے رخ پر کھڑی ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اس کی متغیر حالت دیکھ کر مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہوا۔ اتنے میں لنگر اٹھایا جانے لگا۔ وہ ڈیک پر گہما گہمی دیکھ کر چونکی۔ اس نے جلدی سے ڈوری کا ایک سرا مجھے پکڑایا اور گینگ وے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔
میرے زخم ابھی بہت گہرے ہیں۔ ذرا مندمل ہو جائیں میں خود ہی تمہارے دیس آ جاؤں گی۔"
پھر گینگ وے پر رُک کر کہنے لگی۔
ڈوری چھوڑ نہ دینا۔ میں ساحل پر کھڑی ڈور چھوڑتی جاؤں گی۔ آنکھوں سے اوجھل ہو کر بھی تھوڑی دیر تعلق قائم رہے گا۔"
میں ڈوری کا سرا پکڑے رہا۔ وہ ڈوری چھوڑتی رہی۔ رفتہ رفتہ ساحل دور ہوتا گیا اور پھر...... پھر ساحل نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ڈوری میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

ooo

اختر جمال

زنانِ مصر اور زلیخا

یوسف اور زلیخا کی کہانی مذہبی کتابوں میں تو رمز اور کنائے میں بیان ہوئی ہے لیکن بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے اس قصہ کو کہانی کی صورت میں نظم ونثر میں لکھا ہے مگر وہ سب چیزیں مرد کے نقطۂ نظر کی ترجمان ہیں جس میں ہر چیز کا الزام انجام کار عورت پر عائد کیا جاتا ہے۔ اس کہانی میں ان رمز وعلامات کو نئے انداز سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ (اختر جمال)

مصر کی سب خوبصورت اور معزز عورتوں نے کہا حاشا! یہ انسان نہیں کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔ اور انہوں نے یوسف کو دیکھ کر مارے حیرت کے اپنے انگوٹھے کاٹ لئے اور ان کے انگوٹھوں سے خون رسنے لگا۔ زلیخا نے کہا وہ ایک جیتا جاگتا آدمی ہے جو کھاتا پیتا اور سوتا ہے وہ فرشتہ نہیں۔ فرشتوں سے بڑا ہے۔ میں چاہتی ہوں تم سب اسے سجدہ کرو اس طرح تمہارے انگوٹھوں سے خون بہنا بند ہو جائے گا اور تمہارے زخم بھر جائیں گے۔

زلیخا، بشر تھی اور بشر تو شک رشک اور حسد کا پتلا ہے۔ اس لئے زلیخا سوچ میں پڑ گئی کہ زنانِ مصر کی حیرت کی وجہ یوسف کا حسن ہے یا اسے یہاں دیکھنے کی حیرت میں خوف شامل ہے۔ زلیخا نے سوچا کہ آخر اس نے بھی تو یوسف کو دیکھ کر اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے ہیں پھر یہ عورتیں ہوش وحواس کیوں کھو بیٹھیں عزیزِ مصر اور سارے دربار نے یوسف کا حسن دیکھا تھا پھر آخر شہر کی معزز بیگمات نے اپنے انگوٹھے کیوں کاٹ لئے۔ کیا وہ یوسف سے ڈرتی ہیں؟ کیا وہ ان کے رازوں کا امین ہے اور اس لمحہ زلیخا بدگمانی میں مبتلا ہوگئی اس نے سوچا کہ یوسف ان عورتوں کو دیکھ کر گھبرا کیوں گیا تھا۔ وہ حیران اور پریشان سا جلدی سے وہاں سے نکل گیا تھا۔ اگر کھڑا ہو جاتا۔ ٹھہر جاتا تو شاید پھر وہ انگوٹھے نہ کاٹتیں کیا یوسف ان عورتوں کو پہلے سے جانتا تھا۔ اس رمز کو جاننے کے لئے زلیخا مچل اٹھی آخر انگوٹھے کاٹنے جانے میں کیا مزہ ہے؟ پھر اس نے سوچا اب وہ یوسف کو لائے گی اور ان سب عورتوں کو سجدے کا حکم دے گی دیکھیں وہ اسے سجدہ کرتی ہیں یا نہیں......!

زلیخا دوڑی دوڑی یوسف کے پیچھے پیچھے گئی اور بھاگتے ہوئے یوسف کا دامن پکڑ کر بولی، ٹھہرو......وہ ایک لمحہ کو رُکا زلیخا نے کہا۔ ''ذرا میرے ساتھ اندر آؤ۔''

یوسف حیران پریشان گھبرایا ہوا تھا۔ وہ زلیخا کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ اس نے سوچا وہ ان سب عورتوں سے کیسے پیچھا چھڑائے اس نے دعا کی کہ خدا مجھے ان عورتوں کے شر سے محفوظ رکھے۔

زلیخا کی نیت کا حال خدا ہی جانتا تھا وہ اتنی معصومیت سے اس کا دامن پکڑے اسے اندر بلا رہی تھی مگر یوسف زلیخا کو بھی مصر کی دوسری معزز عورتوں کی طرح سمجھا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

تب زلیخا نے بھاگتے ہوئے یوسف کا دامن زور سے پکڑ لیا۔ یوسف تیزی سے دروازے کی طرف بھاگا۔ دامن کی دھجی پھٹ کر زلیخا کے ہاتھ میں رہ گئی۔ زلیخا اندر آئی تو اس نے دیکھا کہ مصر کی معزز بیگمات اپنے انگوٹھے پکڑے درد سے تڑپ رہی تھیں۔ زلیخا نے دامن کی وہ دھجی پھاڑ پھاڑ کر سب عورتوں کو بانٹ دی اور کہا کہ لو اپنے انگوٹھوں پر پٹی باندھ لو۔ عورتوں نے انگوٹھوں پر پٹیاں باندھ لیں تو خون بہنا بند ہو گیا اور ان کے انگوٹھے چمک اٹھے وہ پٹی روشن ہوگئی۔ اس لئے کہ یوسف کے دامن کی دھجی تو بس روشنی کی ایک لکیر تھی۔

زلیخا نے مسکرا کر ان عورتوں سے کہا۔ ''اگر تم انگوٹھے کی جگہ ہاتھ کاٹ دیتیں تو تمہارا پورا ہاتھ روشن ہو جاتا۔'' پھر زلیخا نے باری باری سب عورتوں کو گلے لگایا اور وہ اپنے روشن انگوٹھوں کو دیکھتی ہوئی خوشی خوشی رخصت ہوئیں۔

جب کاہن اعظم کو بتایا گیا کہ مصر کی معزز عورتوں کے انگوٹھوں سے روشنی کی شعاعیں نکلتی ہیں تو کاہن اعظم نے کہا وہ سب عصمت مآب عورتیں ہیں اور انکے ساتھ مقدس روشنی ہے۔ یہ سن کر مصر کے شریف اور بڑے آدمی اپنی اپنی عورتوں پر فخر کرنے لگے اور ان عورتوں کو دیوداسیوں سے بھی بڑا مرتبہ دیا گیا تھا ہر طرف ان کی عصمت اور بزرگی کی دھوم مچ گئی۔

عزیز مصر نے زلیخا سے کہا کہ مصر کی سب عصمت مآب اور پاک دامن عورتوں کے انگوٹھے روشن ہو گئے ہیں تم اپنا انگوٹھا دکھاؤ۔" زلیخا نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا تو اس کا انگوٹھا روشن نہیں تھا وہ تو ایک معمولی ہاتھ تھا۔

تب عزیز مصر نے دکھ سے کہا۔"میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ آج مصر کے سب مردوں کے سامنے میرا سر جھک گیا۔"

کاہن اعظم نے جب سنا کہ زلیخا کا ہاتھ ایک معمولی عورت کا ہاتھ ہے اور اس کے انگوٹھے سے روشنی کی شعاعیں نہیں نکلتیں تو اس نے کہا۔"افسوس عزیز مصر کی بیوی ایسی ہو۔"

ادھر جب لوگوں نے یوسف کا پھٹا ہوا کرتا دیکھا تو زلیخا کے مجرم ہونے میں کسی کو شک نہ رہا۔ بزرگوں نے گواہی دی کہ کرتا پیچھے سے پھٹا ہے اس لئے زلیخا مجرم ہے۔

زلیخا کا دل دکھ سے بھر گیا اس نے سوچا کہ یوسف کے دل میں کوئی چور تھا۔ آخر وہ بھاگا کیوں کھڑا نہ رہا۔ اس کے ساتھ اندر کیوں نہ آیا نہ وہ بھاگتا نہ کرتا پھٹتا۔ مگر وہ کسی سے کیا کہتی وہ مجرم بنی خاموش کھڑی رہی۔

زلیخا کا جی چاہا کہ وہ ان سب بزرگوں کو یہ راز بتا دے کہ اگر وہ یوسف کا دامن نہ پھاڑتی تو اُن سب عورتوں کے انگوٹھے روشن نہ ہوتے مگر وہ خاموش رہی اسے اپنی چھوٹی سی نیکی کا ڈھنڈورا پیٹنا اچھا نہ لگا۔ یہ کم ظرفی تھی اور لوگ نیت نہیں دیکھتے وہ ظاہری عمل دیکھتے ہیں اور اس کا نام انہوں نے انصاف رکھ لیا ہے لیکن زلیخا کو دکھ اس بات کا تھا کہ یوسف نے بھی اسے نہیں پہچانا اور وہ اسے غلط سمجھا۔ وہ تو سب کو اس کے سامنے سجدہ کرانا چاہتی تھی۔

زلیخا چپ رہی وہ کسی سے کیا کہتی کوئی اس کی بات سمجھنے والا نہ تھا۔

زلیخا پر تہمت لگ گئی حالانکہ اس کا انگوٹھا صحیح سالم تھا۔ شاید اس کا جرم یہی تھا کہ اس نے انگوٹھا نہیں کاٹا تھا اور یوسف کو دیکھ کر بھی اپنے ہوش وحواس برقرار رکھے تھے۔

عزیز مصر نے زلیخا کی روشن آنکھوں میں دیکھے بغیر نفرت سے منہ موڑ لیا اور بولا۔"تم نے بری نظر سے غیر کی طرف دیکھا ہے۔ زلیخا نے کہا۔"مجھے کوئی غیر نظر ہی نہیں آتا۔" پھر اس نے عزیز مصر اور سب بزرگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اپنا سر بلند رکھا۔

پھر وہ سب یوسف کو سامنے لائے اور اس کا پیچھے سے پھٹا ہوا کرتا دکھایا گیا۔ یوسف نے زلیخا کی طرف دیکھا زلیخا مسکرائی۔ یوسف اپنا سر اونچا اٹھائے چل رہا تھا۔

عزیز مصر نے زلیخا سے کہا۔"اب تم کیا کہتی ہو۔"

زلیخا مسکرا کر بولی۔"بے شک یہ سچا ہے۔" اور اپنا سر جھکا لیا۔ زلیخا دل سے یوسف کی صداقت پر ایمان لے آئی تھی۔ اور وہ یوسف کے وہاں سے بھاگنے کا رمز سمجھ گئی تھی۔

عزیز مصر نے کہا۔"تو مان گئی کہ تو نے بری نگاہ سے غیر کو دیکھا ہے۔"

زلیخا نے پھر وہی بات دہرائی۔ میں نے آج تک کسی غیر کو نہیں دیکھا مجھے غیر نظر ہی نہیں آتا۔ میری آنکھیں تو بس آپ کو دیکھتی ہیں۔

عزیز مصر نے کہا۔ لیکن میں تو یہاں ہوں۔"

زلیخا نے مسکرا کر یوسف کی طرف دیکھا اور بولی۔"میں یہاں ہوں۔"

یوسف اس کی بات سمجھ گیا اور اس کا سر جھک گیا۔ اس نے کہا"مجھے جیل خانے جانا منظور ہے۔" زلیخا نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا لیا اور مسکرانے لگی۔

زلیخا اپنے محل میں آ کر سوچنے لگی کہ قافلے والے جب یوسف کو مصر لے کر آئے تو راستے میں انہوں نے جگہ جگہ پڑاؤ ڈالا ہوگا کاش وہ گھوم پھر کر دیکھ سکتی کہ اور کہاں کہاں کن کن عورتوں نے مارے حیرت کے انگوٹھے کاٹے تھے۔ زلیخا کا جی چاہا کہ وہ ایک انعام مقرر کرے تا کہ سب عورتیں اسے اپنے کٹے ہوئے انگوٹھے دکھانے آئیں اور انعام لے لیں۔ پھر اس نے سوچا کہ انعام کے لالچ میں تو ہر ایک اپنا انگوٹھا کاٹ کر آ جائے گی۔ اور یہ کام زلیخا کے مرتبہ اور شان کے خلاف تھا کہ وہ سارے جہاں کی عورتوں کے انگوٹھے دیکھتی پھرے اور پھر اس نے سوچا آخر یہ جان کر کیا کرے گی۔ اس کی بلا سے۔ سارے جہاں کی عورتیں اپنے انگوٹھے کاٹ ڈالیں۔ جیت اس وقت یوسف کی ہوتی اگر زلیخا بھی اپنا انگوٹھا کاٹ لیتی۔ مگر اس کا انگوٹھا سلامت ہے۔ اس لیے جیت اس کی ہوئی......اور انصاف کے دن تو یوسف بھی اسے پہچان ہی لے گا......! اور وہ انصاف کے دن کا انتظار کرنے لگی۔

جیل خانے کا محافظ تنگ اور تاریک تہہ خانے کے حجرہ میں بند کرنے یوسف کو لے کر چلا۔ مگر جوں جوں تہہ خانے میں اترتا جاتا تھا اس کی آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں اس نے سوچا سورج آسمان پر نکلتا ہے یا وہ زمین کی گہرائیوں میں کہیں دفن ہے اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ سورج اس کے ساتھ چل رہا ہے اس لئے کہ اس کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اسے جیل خانے کا داروغہ بنے ہوئے سالہا سال ہو گئے تھے روشنی سے لا کر تاریکی میں بند کرنا اس کا کام تھا مگر آج پہلی مرتبہ اسے نیا کام دیا گیا تھا۔ روشنی کو قید کرنے کا کام۔

داروغہ نے تہہ خانے کے آخری تنگ اور تاریک حجرے کا دروازہ کھول کر یوسف کو اس میں بند کر دیا اور جب کوٹھڑی میں بڑا سا آہنی تالہ ڈال کر وہ مڑا تو گھبرا کر پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کی درز سے روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں اور وہ شعاعیں لوہے کے تالے کے آر پار نظر آ رہی تھیں۔ داروغہ حواس باختہ ہو کر وہاں سے چلا واپسی میں وہ قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا تھا۔ اور گرتا تھا۔ اسے تعجب تھا کہ جس اندھیرے حجرے میں وہ پل بھر میں داخل ہوا تھا اس حجرے سے واپسی میں وقت اتنا لمبا کیوں ہو گیا ایسا لگ رہا تھا کہ ساری عمر اندھیرے غاروں میں دھکے کھاتا رہے گا۔ اور راستہ نہیں ملے گا۔ دروازہ نہیں آئے گا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ واپس جائے اور یوسف کے قدموں پر گر کر اس سے معافی مانگ لے مگر پھر عزیز مصر کے خوف سے وہ اندھیرے میں راستہ ٹٹول ٹٹول کر چلتا رہا۔

جب وہ قید خانے سے باہر نکلا تو رات کا وقت تھا۔ اس نے سوچا خدا جانے ایک رات گزری ہے یا اس سفر میں کئی راتیں گزر چکی ہیں۔ اس لئے کہ اس کی داڑھی کے کالے بال سفید ہو گئے تھے۔

اندھیری رات میں مصر کے بالا خانوں میں دیئے روشن نظر آئے تو اس نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا آج کوئی تہوار ہے۔ مصر کی سب عورتوں نے چراغاں کیوں کیا ہے؟

لوگوں نے اسے بتایا کہ آج رات مصر میں اتنی تاریکی ہو گئی تھی جیسے کنعان کا چاند نہیں مصر کا چاند چھپ گیا۔ عزیز مصر نے اندھیرے سے گھبرا کر چراغاں کا حکم دیا۔ پھر بھی تاریکی دور نہ ہوئی تو مصر کی وہ سب پاک دامن عورتیں اپنے اپنے بالا خانوں پر ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو گئیں جن کے انگوٹھے روشن تھے اور یہ جو چراغوں کی لوئیں نظر آ رہی ہیں یہ مصر کی بزرگ اور نیک عورتوں کے انگوٹھے چمک رہے ہیں۔

زلیخا نے اس رات عجیب خواب دیکھا۔ مگر اس نے اپنے خواب کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ اور سوچا آج کی رات مقدر کو نیند آ رہی ہے۔ مگر وہ ضرور جاگے گا۔ تاریکی میں سارا مصر سو رہا تھا۔ روشن انگوٹھوں والی عورتیں بھی اپنی خوابگاہوں میں واپس چلی گئیں تھیں اور گہری نیند میں تھیں تقدیر کا فرشتہ بھی سو گیا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا قلم اور کاغذ سوتے میں بھی اس کے پاس تھے وہ نیند کی غفلت میں لکھ رہا تھا زلیخا نے چپکے سے تقدیر کے فرشتہ کے ہاتھ سے قلم لے لیا اور کہا۔ ''اپنی کہانی میں خود لکھوں گی۔'' سارا مصر سو رہا تھا۔ زلیخا جاگ رہی تھی۔

زلیخا نے وہ خواب بھی سوتے ہوئے نہیں جاگتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ عجیب الجھن میں تھی کہ یہ عالم بیداری ہے یا عالم خواب اور آپ سے آپ اس کا سر اَن دیکھے خدا کے سامنے جھک گیا۔ اس نے جھک کر سجدے میں ان دیکھے خدا سے اقرار کیا نہ میں ہوں نہ یوسف ہے بس تو ہے! اور یوسف تو تیرے اجالے کی کرن لایا تھا اور جو کچھ میں نے عزیز مصر کے سامنے کہا تھا وہ تیرا

یوسف کے [illegible] ی۔ فرہاد نے ہر
لمحہ میں وہ سارا سفر طے کرچکی تھی وہ سفر جس کو طے کرنے کے لئے مجنوں نے ساری زندگی دشت کی خاک چھانی
کھودی تھی۔ اور یوسف نے جیل خانے کی صعوبت گوارا کی وہ سارا سفر زلیخا نے پلک جھپکاتے میں طے کر لیا تھا۔ عرفان کے اس
لمحہ میں جب اس نے اپنا سر کاٹ کر ہتھیلی پر رکھا تھا۔ اس کا سارا وجود روشنی بن گیا تھا۔ مگر یہ سب باتیں وہ کسی کو نہیں سمجھا سکتی تھی وہ
خاموش رہی۔ زلیخا نے اپنی سہیلیوں کو جب اپنے بڑھاپے پر ترس کھاتے دیکھا تو کہا۔ ''یہ بھی کتنی اچھی بات ہے کہ میں تمہیں اس
بوڑھے جسم کی بدولت نظر آ رہی ہوں، میں تو خود کو نظر بھی نہیں آتی۔ ''بس وہی ہے۔''

اس کی ایک سہیلی ہنس کر بولی کون؟ یوسف؟

زلیخا نے کہا۔ ''تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتی ہو اس لئے تم اسے یوسف کہہ لو تو کوئی حرج نہیں ہے!''

پھر زلیخا انہیں اپنے ساتھ لائی اور کہا، ''دیکھو یہ الماریاں...... ان میں وہ سب لباس ٹنگے ہوئے ہیں جو ازل سے ابد تک کے ہیں۔ میں جو لباس چاہوں پہن سکتی ہوں۔ انوکھے دیسوں کے خوبصورت لباس! تم جسے میرا جسم سمجھ کر میرے بڑھاپے پر ترس کھا رہی ہو وہ تو میرا لباس ہے۔'' پھر اس نے انہیں وہ سب لباس پہن کر دکھائے۔ کبھی وہ سیتا بن گئی کبھی دروپدی، کبھی لیلیٰ کبھی شیریں پھر وہ ہنس کر بولی زندگی کے اس رواں دواں سمندر میں سے آخر میں تمہیں لباس کہاں تک نکال نکال کر دکھاؤں یہ ہیر ہے یہ سوہنی ہے۔ یہ قلوپطرہ ہے یہ انارکلی ہے اور یہ نور جہاں ہے...... اور یہ سب سے خوبصورت لباس یہ جوگیا رنگ کی ساری اور منکوں کی مالا...... یہ وہ جوگن ہے جس کا نام میرا تھا اور جس کے بول قیامت تک زندہ رہیں گے۔ پھر اس نے سب الماریاں بند کر دیں مصر کی سب عورتیں حیران پریشان تھیں جیسے کسی سحر میں ہوں۔ وہ کبھی آنکھیں ملتی تھیں اور کبھی کھولتی تھیں آخری الماری باقی رہ گئی تھی۔ زلیخا نے کہا میں اسے نہیں کھول سکتی اس میں عالم مثال کے لباس ہیں۔ وہ سب لباس جنہیں محبت نے جنم دیا ہے یہ وہ سب خیال ہیں جو کل حقیقت بنیں گے۔

عورتوں نے کہا ''یہ لباس کیسے ہیں؟''

زلیخا نے کہا۔ ''عالم مثال میں نہ جسم ہے نہ خیال بس وہ لباس تو صرف ایک حکم ہے۔''

ایک عورت نے پوچھا ''حکم کیا ہے؟''

زلیخا بولی۔ ''وہ روح ہے۔''

زلیخا نے کہا۔تم سب موت سے ڈرتی ہو بڑھاپے سے خوف کھاتی ہو اور سدا جوان رہنے کی آرزو کرتی ہو۔اب یہ لباس دیکھ کر تمہارا خوف دور ہوا یا نہیں؟"

عورتوں نے کہا۔"ہاں اب ہمارے دلوں سے موت کا خوف جاتا رہا ہے۔"

زلیخا بولی۔"موت کا دکھ اور خوف تو بانجھ زمین کا دکھ اور خوف ہے وہ زمین جس پر پھل اور پھول آتے ہیں اسے موت کہاں۔"پھر وہ مسکرانے لگی ایک عورت بولی۔"ہمیں موت کے بارے میں بتاؤ۔موت کیا ہے۔"زلیخا نے کہا۔"جسم سے جسم کا ملاپ موت ہے فنا ہے اور تم جسے فراق کہتی ہو وہ زندگی ہے۔روح کا روح سے ملاپ ہوتا ہے۔"

ایک عورت نے کہا،"کیا روح کا ملاپ زندگی میں ممکن ہے۔"

زلیخا بولی ہاں ممکن ہے مگر اس وقت جب تم جیتے جی جسم سے باہر نکل سکو اور یہ وہ راز ہے جو صرف خضر کو معلوم ہے اور وہ کسی کو نہیں بتاتا۔آؤ میں تمہیں آب بقا کا راز بتاؤں تا کہ تم حیات جاوید پالو۔"

ایک عورت نے کہا۔حیات جاوید کیا ہے۔"

زلیخا ہنس پڑی۔"وہ ایک لمحہ ہے دید کا ایک لمحہ! دیکھ لینا اور پہچان لینا! اگر حیات کے لامتناہی سمندر میں وہ ایک لمحہ تمہیں حاصل ہو گیا تو تم جام جہاں نما کی مالک ہو۔"

ایک عورت نے پوچھا"جام جہاں نما کیا ہے۔"

زلیخا بولی وہ تمہارا دل ہے اس آئینہ کو جتنی جلا دے سکو گی اتنی ہی دور دیکھ سکو گی۔ماضی، حال، مستقبل ایک لکیر کے سب روشن نقطے نظر آئیں گے پھر تم وقت کی قید میں نہیں ہو گی۔وقت تمہاری قید میں ہو گا۔

ایک عورت نے کہا،"اس آئینے کو کیسے صاف کریں۔"

زلیخا نے کہا۔"دیکھو تم سب مٹی کے کوزوں کی پروا کرنا چھوڑ دو۔ہستی کے بازار میں ان کوزوں کی کمی نہیں جو چیز پیالے میں ہے وہ قیمتی ہے۔وہ شراب ہی آب حیات ہے۔وہ روشنی ہے......وہ تمہاری روح ہے اور یہ روح کی غذا ہے!

ان عورتوں نے کہا اب ہم تمہاری باتیں سمجھ گئے ہم آج اپنے روشن انگوٹھوں کا حال اپنے شوہروں کو بتا دیں گے۔یوسف سچا ہے اور عزیز مصر کے سامنے تمہاری بے گناہی بھی ثابت ہو جائے گی۔زلیخا نے محبت سے انہیں گلے لگایا اور بولی۔"تمہارا راز میرا راز ہے اگر تم نے یوسف کو چاہا اور پسند کیا تو میں خوش ہوں۔اس لئے کہ یوسف مجھ سے الگ نہیں۔نہ میں یوسف سے جدا ہوں۔تم نے اسے چاہا تو مجھے چاہا......!اور میری بے گناہی اور سب پر تو ثابت ہے عزیز مصر کے ساتھ میں نے زندگی گذاری ہے وہ مجھے جانتا ہے۔تم سب جانتی ہو......مصر کے سب لوگ جانتے ہیں مگر میری بے گناہی یوسف پر انصاف کے روز ثابت ہو گی جب اسے میری نیت کا حال معلوم ہو گا۔"

اس رات ان سب معزز اور پاک دامن عورتوں نے اپنے اپنے خاوندوں کو اپنے انگوٹھے زخمی ہونے کا حال سنایا اور کہا یوسف بھی سچا ہے اور زلیخا بھی سچی ہے اور پاکدامن ہے۔"ان سب کے انگوٹھوں کی روشنی یکا یک غائب ہو گئی تو ان کے مردوں نے کہا"کاش تم نے اپنی زبانوں پر تالا ہی رکھا ہوتا تو اچھا تھا۔"

عورتوں نے مردوں سے کہا کہ"وہ روشنی اپنے مقام پر واپس آگئی ہے۔اور اب وہ ہمارے دلوں میں ہے۔"

جب انہوں نے زلیخا کی باتیں اپنے مردوں کو سنائیں تو وہ بولے اگر مصر کے کاہنوں نے زلیخا کی باتیں سن لیں تو وہ اسے بھی جیل خانے میں ڈلوا دیں گے یا اس سے بدتر کوئی سزا دیں گے۔عورت ناقص العقل ہوتی ہے اس کی بات مان کر تم نے انگوٹھوں کی مقدس روشنی کھو دی وہ جو بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہی ہیں اس سے پوچھو کہ آج تک کوئی عورت پیغمبر یا اوتار ہوئی ہے؟ عورتیں یہ سن کر چپ ہو گئیں۔

جب وہ عورتیں زلیخا کے پاس آئیں تو انہوں نے اپنے مردوں کی باتیں سنائیں زلیخا ان کی باتیں مسکرا مسکرا کر سنتی رہی پھر بولی عورت نے پیغمبر اور اوتار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اس لئے کہ دعویٰ کرنا عورت کو زیب نہیں دیتا۔سورج دنیا سے یہ نہیں کہتا کہ

وقت کے ساتھ ٹھہر گئی تھیں اور یوسف وہی یوسف تھا۔

مگر زلیخا وہ زلیخا نہیں تھی۔ زلیخا تو سفر میں تھی اور جس طرح پھل پک کر درخت سے لٹک جاتا ہے اس طرح وہ جیتے جی جسم کی قید میں سے نکل آئی تھی فنا کی منزل سے گذر کر بقاء کی اس منزل میں تھی جہاں سب لباس اس کی الماریوں میں بند تھے مگر اسے اپنا بوڑھا جھریوں والا لباس پسند تھا۔ اگر وہ لباس بدل لیتی تو عزیز مصر اور دوسرے لوگ اسے نہ پہچانتے اور یوسف کے جیل خانے سے آنے تک وہ اس لباس میں رہنا چاہتی تھی تا کہ یوسف کا امتحان لے سکے اور دیکھ سکے کہ یوسف اسے پہچانتا ہے یا نہیں

جب یوسف زلیخا کے سامنے آیا وہ اسے نہیں پہچانا۔ وہ بیگانوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے سے خاموش گذر گئے۔

پھر قحط سالی کا دور آیا تو عزیز مصر کے خواب کی تعبیر لوگوں نے حرف بہ حرف پوری ہوتی دیکھ لی۔ عزیز مصر نے یوسف کو اپنے تخت کا وارث بنایا کیونکہ وہی انہیں قحط بیماری اور اندھیرے سے نجات دلانے والا تھا اور اسے یوسف پر بھروسہ تھا اور مصر کے لوگ اسے اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔

اور جب یعقوب کی آنکھیں روشن ہوئیں اور اس نے یوسف کو اس کے خواب کا مطلب سمجھایا تو سب کے سر اس کے سامنے جھک گئے۔

سب کے خواب سچ بن کر ظاہر ہوئے مگر زلیخا نے اپنے خواب کا کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے خواب کی تعبیر جاننا چاہتی تھی اور خوابوں کی تعبیر بتانے والا یوسف تھا جو اسے پہچانتا نہ تھا۔ اس لئے اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھنے جانا زلیخا کو کچھ اچھا نہ لگا پھر اس نے سوچا کہ اس کے خواب کی تعبیر بھی اسی طرح ایک دن سامنے آئے گی جس طرح سب کے خوابوں کی تعبیر سامنے آتی ہے اور اس دن اسے یوسف پہچان لے گا۔

کچھ عرصہ بعد یوسف نے اپنے محل میں دعوت کی جس میں سب معزز لوگ مدعو تھے اس دعوت میں وہ عورتیں بھی تھیں جن کے انگوٹھوں کا ایک زمانے میں بڑا چرچا تھا ان کے خاوند بھی ساتھ تھے اور اس دعوت میں یوسف نے عزیز مصر کی بیوہ کو بھی بلایا تھا۔

جب زلیخا ان سب عورتوں کے درمیان بیٹھی تو یوسف کی اس پر نظر پڑی اور وہ سوچ میں پڑ گیا۔

زلیخا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یوسف کو آج یاد دلائے گی کہ وہ کون ہے اور ایک لمحہ کے لئے زلیخا نے وہ لباس پہن لیا جسے اتار کر اس نے مصر کی ملکہ کا لباس پہنا تھا وہ لباس کنعان کی اس دوشیزہ کا تھا جو یوسف کے ساتھ لڑکپن میں بھیڑیں اور بکریاں چرایا کرتی تھی اور جب ایک دفعہ اس نے یوسف کے بھائیوں کو کنوئیں میں دھکا دے کر اسے گراتے دیکھا تو اسے نکالنے دوڑ پڑی اس کے

بھائی جا چکے تھے۔ وہ بیقراری کے عالم میں کنوئیں میں کود گئی۔ اور جب وہاں اس نے یوسف کو زندہ سلامت چودھویں کے چاند کی طرح چمکتے دیکھا تو اسے اتنی خوشی ہوئی کہ اس خوشی کی تاب نہ لا کر اس نے اپنی جان دے دی۔ یا پھر یہ ہوا کہ یوسف کے پاس جا کر اس نے دوسرا جسم بیکار سمجھ کر پھینک دیا ہو۔

یوسف نے اس لمحہ زلیخا کو پہچان لیا! قید کاٹنے کا پورا عرصہ گذار کر یوسف وہ راز سمجھا جو زلیخا عزیز مصر اور سب بزرگوں کی موجودگی میں سمجھنا چاہتی تھی جب زلیخا نے کہا تھا کہ میں یہاں ہوں تو یوسف نے سوچا تھا کہ زلیخا نے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے مگر آج جب اس نے زلیخا کو کنعان کی دوشیزہ کے پرانے لباس میں دیکھا جو کنوئیں میں رہ گیا تھا تو وہ اس لمحہ اس جملے کا مطلب سمجھ گیا کہ میں یہاں ہوں۔''

جب حقیقت بے نقاب ہوئی تو کنوئیں سے نکال کر مصر کے بازار میں لایا جانا۔ سب عورتوں کے انگوٹھے کاٹنا اور زلیخا کا دامن پکڑنا سب باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں زلیخا کا وہ لباس بہت خوبصورت تھا اور مصر کی سب معزز عورتوں کے ملبوسات بہت خوبصورت تھے اور اس لئے یوسف نے ان کے شر سے بچنے کی دعا کی تھی۔ یوسف نے سوچا کہ کاش زلیخا اس وقت رمز اور اشارے میں بات نہ کرتی اور وہ بتا دیتی کہ وہ کون ہے تو پھر مصر کے تخت پر بیٹھنے کے بعد وہ سالہا سال غم نہ کرتا کہ وہ مصر کا بادشاہ ہونے کے بجائے کنعان کا ایک فقیر ہوتا۔ اس نے سوچا کنوئیں سے عزیز مصر کے محل تک اسے جو چیز لائی تھی وہ کنعان کی مٹی کی خوشبو تھی جس میں اس کی روح مقید تھی۔ اور وہ سارے عرصہ اپنی روح کو تلاش کرتا رہا اب اگر مصر کی عورتوں نے اپنے انگوٹھے کاٹ لئے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔

جب زلیخا نے دیکھا کہ اسے یوسف نے پہچان لیا تو غم کا بوجھ اس کی روح سے ہٹ گیا اور اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ اس کا رواں رواں کھل اٹھا۔

مصر کے لوگوں نے جب اس لمحہ زلیخا کو پھول کی طرح ہنستے دیکھا تو وہ بولے کہ یوسف کو دیکھ کر زلیخا خوشی سے جوان ہو گئی ہے یہ بات سن کر یوسف بھی مسکرانے لگا اور زلیخا بھی مسکرانے لگی۔ اس لئے اپنی حقیقت وہ خود جانتی تھی یا پھر یوسف جانتا تھا۔

یوسف بے قرار ہو کر مسند سے اترا اور چاہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے مسند پر اپنے برابر جگہ دے۔ مگر زلیخا محبت اور وقت کے رمز سے آشنا تھی۔ وہ یوسف کو وہ لباس کیسے دے دیتی جو عزیز مصر کی ملکیت تھا۔

یوسف نے ہاتھ بڑھا کر لمحہ کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ سورج اور چاند ٹھہر گئے لمحہ اس کی گرفت میں آ گیا۔ اس نے زلیخا کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر پکڑ کر فوراً ہی چھوڑ دیا۔

یوسف اگر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسی طرح کھڑا رہتا تو وقت کا وہ لمحہ ہمیشہ کے لئے ٹھہر جاتا اور سورج اور چاند تو سفر کرنے کے لئے ہیں یوسف کو وہ ایک لمحہ مصر کی بادشاہت سے زیادہ قیمتی معلوم ہوا جب اس نے وقت کو گرفت میں لے لیا تھا۔

اور جب یوسف نے زلیخا کا ہاتھ پکڑا تو زلیخا اپنی خواب کی تعبیر جان گئی زلیخا نے دیکھا کہ وہ تو صرف روشنی تھا جسم نہیں تھا اور یوسف نے زلیخا کا ہاتھ پکڑ کر محسوس کر لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی ہاتھ نہیں ہے اور اسی لئے اس نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہی چھوڑ دیا تھا لمحہ کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔ چاند اور سورج کو سفر کرنے دیا۔

سب لوگ حیران اور پریشان کبھی یوسف کو دیکھ رہے تھے اور کبھی زلیخا کو اور ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ اور پھر ان سب کی حیرت دور کرنے کو یوسف نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ وہ پھٹا پرانا کرتا لے آئے جسے آنکھوں پر رکھتے ہی اس کے باپ کی آنکھیں روشن ہو گئی تھیں۔

جب یوسف کا چھوٹا بھائی وہ کرتا لے آیا تو سب نے دیکھا یہ وہی کرتا تھا جس کا دامن پیچھے سے پھٹا ہوا تھا۔

سب کے سامنے یوسف نے وہ پرانا پھٹا ہوا کرتا پہنا تو سب کی آنکھیں چندھیا گئیں وہاں یوسف کے بجائے انہیں نور کا ایک ہالہ نظر آیا تب یہ رمز ان کی سمجھ میں آ گیا کہ سالہا سال پہلے یوسف نے اپنے باپ کو جو پھٹا پرانا کرتا بھیجا تھا تو اسے روشنی بھیجی تھی۔ زلیخا نے اپنا سر جھکا لیا اور یوسف سے بولی تو سچا ہے میں ہی نادان تھی کاش میں نے یہ کرتا نہ پھاڑا ہوتا۔

یوسف نے مسکرا کر کہا اگر تو وہ کرتا نہ پھاڑتی تو روشنی کرتے ہی میں رہتی تو نے وہ کرتا پھاڑا تو روشنی ہر طرف پھیل گئی جب تک میں اپنے جسم کی قید میں تھا روشنی بھی قید تھی۔ پھر اس نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔ ''ہم جب تک اپنی قید سے باہر نہ نکلیں خود بھی تاریکی میں رہتے ہیں اور جب اپنی قید سے باہر آ جاتے ہیں تو سب کو روشنی میں لے آتے ہیں۔''

اور اس لمحہ مصر کے لوگوں نے روشنی سے چکا چوند میں چندھیائی ہوئی آنکھیں مل مل کر دیکھا تو وہاں نہ یوسف تھا اور نہ زلیخا تھی۔ بس ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی۔

ooo

اشفاق احمد

گڈریا

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے۔ میں اپنے گرم بستر میں سر ڈھانپے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے جھنجوڑ کر مجھے جگا دیا۔

"کون ہے؟" مَیں نے چیخ کر پوچھا۔ اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا اور گُھپ اندھیرے سے آواز آئی۔ "تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا۔"

"کیا؟ میں نے لرزتے ہاتھ کو پرے دھکیلنا چاہا۔" کیا ہے؟"

اور تاریکی کا بھوت بولا۔ "تھانے والو نے رانو کو گرفتار کر لیا...... اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔"

"داؤ جی کے بچے۔" مَیں نے روہنسے ہو کر کہا۔ "آدھی رات تنگ کرتے ہیں...... دفعہ ہو جاؤ مَیں نہیں آپ کے گھر میں رہتا۔ مَیں نہیں پڑھتا...... داؤ جی کے بچے...... کتے!" اور مَیں رونے لگا۔

داؤ جی نے چمکار کر کہا۔ "اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہوگا؟ پاس نہیں ہوگا تو بڑا آدمی نہ بن سکے گا، پھر لوگ تیرے داؤ کو کیسے جانیں گے؟"

"اللہ کرے سب مر جائیں۔ آپ بھی آپ کو جاننے والے بھی__ اور مَیں میں__ مَیں بھی۔" اپنی جواں نامرگی پر مَیں ایسا رویا کہ دو ہی لمحوں میں گھگھی بندھ گئی۔

داؤ جی بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے جاتے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "بس اب چُپ کر۔ شاباش—— میرا بیٹا۔ اس وقت یہ ترجمہ کر دے، پھر نہیں جگاؤں گا۔"

آنسوؤں کا تار ٹوٹا جا رہا تھا۔ مَیں نے جل کر کہا۔ "آج حرامزادے رانو کو پکڑ کر لے گئے، کل کسی اور کو پکڑ لیں گے۔ آپ کا ترجمہ تو——"

"نہیں نہیں۔" انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔ "میرا تیرا وعدہ رہا، آج کے بعد رات کو جگا کر کچھ نہ پوچھوں گا—— شاباش اب بتا۔ "تھانے والو نے رانو کو گرفتار کر لیا۔"

میں نے روٹھ کر کہا۔ "مجھے نہیں آتا"

"فوراً نہیں کہہ دیتا ہے۔" انہوں نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "کوشش تو کر۔"

"نہیں کرتا۔" مَیں نے جل کر جواب دیا۔

اس پر وہ ذرا ہنسے اور بولے۔ "کارکنان گزمہ خانہ رانو را توقیف کردند—— کارکنان گزمہ خانہ، تھانے والے۔ بھولنا نہیں نیا لفظ ہے، نئی ترکیب ہے، دس مرتبہ کہو۔"

مجھے پتہ تھا کہ یہ بلا ٹلنے والی نہیں ناچار گزمہ خانہ والوں کا پہاڑہ شروع کر دیا۔ جب دس مرتبہ کہہ چکا تو داؤ جی نے بڑی لجاجت سے کہا۔ "اب سارا فقرہ پانچ مرتبہ کہو۔" جب پنجگانہ مصیبت بھی ختم ہوئی تو انہوں نے مجھے آرام سے بستر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا۔ "بھولنا نہیں! صبح اُٹھتے ہی پوچھوں گا۔"

پھر وہ جدھر سے آئے تھے، ادھر لوٹ گئے۔

شام کو جب میں ملاّ جی سے سیپارے کا سبق لے کر لوٹتا تو خراسیوں والی گلی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ بستے تھے مگر مَیں صرف موٹے ماشکی سے واقف تھا جس کو ہم سب "کدو کریلا ڈھائی آنے" کہتے تھے۔ ماشکی کے گھر کے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا جس کے تین طرف کچے مکانوں کی دیواریں اور سامنے کے رخ آڑی ترچھی لکڑیوں اور

ہے کمینہ ـــ بھلا کون ہے وہ؟'' ... جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ ہر بات میں اپنی ٹانگ پھنساتا ... پاس سے مجھے زناٹے کا ایک تھپڑ دیا۔

''داؤ جی۔'' میرے بھائی نے تنک کر پوچھا۔

''وہ جو بیٹھے پاس، وہ داؤ جی۔'' مَیں نے آنسو پی کر کہا۔

''بکواس نہ کر۔'' میرا بھائی چڑ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا۔ ''ہر بات میں میری نقل کرتا ہے۔ کتا ـــ شیخی خورا۔''

پھر مَیں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ راہ چلتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ داؤ جی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے مجھے تھپڑ کیوں مارا۔ وہ تو اس کی عادت تھی۔ بڑا تھا نا اس لیے ہر بات میں اپنی شیخی بگھارتا تھا۔ داؤ جی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لیے میں کوشش کر کے گلی سے اس وقت گزرنے لگا جب وہ آ جا رہے ہوں

انہیں سلام کر کے بڑا مزہ آتا تھا اور جواب پا کر اس سے بھی زیادہ۔ ''وہ جیتے رہو'' کچھ ایسی محبت سے کہتے کہ زندگی دو چندی ہو جاتی اور آدمی زمین سے ذرا اوپر اُٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا ـــ سلام کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر یونہی چلتا رہا اور اس اثناء میں مجھے اسی قدر معلوم ہو سکا کہ داؤ جی گیرو رنگی کھڑکیوں والے مکان میں رہتے ہیں اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے۔ مَیں نے اپنے بھائی سے ان کے متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑ جاتا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس کے پاس گھڑے، گھڑائے دو فقرے ہوتے تھے۔ ''تجھے کیا'' اور ''بکواس نہ کر'' مگر خدا کا شکر ہے کہ میرے تجسس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ اسلامیہ پرائمری سکول سے چوتھی پاس کر کے میں ایم۔ بی ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا تو داؤ جی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤ جی کھتری تھے اور قصبہ کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے۔ لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے ہوشیار تھا۔ اس کی پگڑی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی اور چہرہ بلی کی طرح چھوٹا۔ چند لڑکے اسے میاؤں کہتے تھے اور باقی نیولا کہہ کر پکارتے تھے مگر میں داؤ جی کی وجہ سے

اس کو اس کے اصلی نام سے پکارتا تھا۔ اس لیے وہ میرا دوست بن گیا اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیاں دے کر پکے یار بنے رہنے کا وعدہ کر لیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہوگا جب میں امی چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسا دینے والی دوپہر تھی لیکن شیخ چلی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق مجھ پر بھوت بن کر سوار تھا اور میں بھوک اور دھوپ دونوں سے بے پروا ہو کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔ امی چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی صاف ستھرا اور روشن پیتل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی تھی۔ آگے مستطیل صحن، سامنے سرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ۔ عشق کے چند پودے اور دھنیا کی ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیوں کا ایک زینہ جس کی محراب تلے مختصر سی رسوئی تھی۔ گیرو رنگی کھڑکیاں ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو امی چند نے چلا کر "بے بے نمستے!" کہا اور مجھے صحن کے بیچوں بیچ چھوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بوریا بچھائے بے بے مشین چلا رہی تھیں اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی بڑی سی قینچی سے کپڑے قطع کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلاتی رہی۔ لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا۔ "بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے۔"

مشین رُک گئی۔

"ہاں ہاں۔" بے بے نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جز دان کی رسّی مروڑتا اور ٹیڑھے میڑھے پاؤں دھرتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آ لگا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" بے بے نے چمکار کر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے اپنا نام بتایا۔

"آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے۔" اس لڑکی نے قینچی زمین پر رکھ کر کہا۔ "ہے نا بے بے؟"

"کیوں نہیں بھائی جو ہوا۔"

"آفتاب کا کیا؟" اندر سے آواز آئی۔ "آفتاب کا کیا بیٹا؟"

"آفتاب کا بھائی ہے داؤ جی۔" لڑکی نے رکتے ہوئے کہا۔ "امی چند کے ساتھ آیا ہے۔"

اندر سے داؤ جی برآمد ہوئے۔ انہوں نے گھٹنوں تک اپنا پانجامہ چڑھا رکھا اور کُرتا اُتارا ہوا تھا مگر سر پر پگڑی بدستور تھی۔ پانی کی ایک ہلکی سی بالٹی اٹھائے وہ برآمدے میں آ گئے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "ہاں بہت شکل ملتی ہے اور یہ گولو مولو سا ہے۔" پھر بالٹی فرش پر رکھ کر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پاس ہی کاٹھ کا ایک سٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں اوپر اٹھا کر انہوں نے آہستہ سے انہیں جھاڑا اور پھر بالٹی میں ڈال دیے۔

"آفتاب کا خط آتا ہے؟" انہوں نے بالٹی سے پانی کے چلّو بھر بھر کر ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آتا ہے جی۔" میں نے ہولے سے کہا۔ "پرسوں آیا تھا۔"

"کیا لکھتا ہے؟"

"پتہ نہیں جی، ابا جی کو پتہ ہے۔"

"اچھا۔" انہوں نے سر ہلا کر کہا۔ "تو ابا جی سے پوچھا کرنا! ـــ جو پوچھتا نہیں اُسے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا۔"

مَیں چپ رہا۔

تھوڑی دیر انہوں نے ویسے ہی چلّو ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "کون سا سیپارہ پڑھ رہے ہو؟"

"چوتھا۔" مَیں نے وثوق سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تیسرے سیپارے کا؟" انہوں نے پوچھا

"تلک الرسل" انہوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھٹکتے اور ہوا میں لہراتے رہے۔ بے بے مشین چلاتی رہی، وہ لڑکی نعمت خانے سے روٹی نکال کر برآمدے کی چوکی پر لگانے لگی اور مَیں جزدان کی ڈوری کھولتا لپیٹتا رہا۔

امی چند ابھی تک بیٹھک کے اندر ہی تھا اور مَیں ستون کے ساتھ ساتھ جھینپ کی عمیق گہرائیوں میں اُتر تا جا رہا تھا۔ معاً داؤ جی نے نگاہیں میری طرف پھیر کر کہا۔ ''سورۂ فاتحہ سناؤ۔''

''مجھے نہیں آتی جی۔'' مَیں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

انہوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ الحمدللہ بھی نہیں جانتے؟''

''الحمدللہ تو جانتا ہوں جی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے۔ ''ایک ہی بات ہے! ایک ہی بات ہے!!'' پھر انہوں نے سر کے اشارے سے کہا۔ ''سناؤ۔''

جب مَیں سنانے لگا تو انہوں نے اپنا پانجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا اور جب مَیں نے ولا الضالین کہا تو میرے ساتھ ہی انہوں نے بھی آمین کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ ابھی اٹھ کر مجھے کچھ انعام دیں گے کیونکہ پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے تایا جی کو الحمدللہ سنائی تھی تو انہوں نے بھی ایسے ہی آمین کیا تھا اور ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا مگر داؤ جی اسی طرح رہے بلکہ اور بھی پتھر ہو گئے۔ اتنے میں امی چند کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو میں نے عادت کے خلاف آہستہ سے کہا۔ ''داؤ جی سلام۔'' اور انہوں نے ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہولے سے جواب دیا۔ ''جیتے رہو۔'' بے بے نے مشین روک کر کہا۔ ''کبھی کبھی امی چند کے ساتھ کھیلنے آجایا کر۔۔۔''

''ہاں ہاں آجایا کر۔'' داؤ جی چونک کر بولے۔ ''آفتاب بھی آیا کرتا تھا۔'' پھر انہوں نے پالٹی پر جھکتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دور ہو گیا۔'' اور فارسی کا شعر پڑھنے لگے۔

یہ داؤ جی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی اور اس ملاقات میں یہ نتائج اخذ کر کے چلا کہ داؤ جی بڑے کنجوس ہیں۔ حد سے زیادہ چُپ سے ہیں اور کچھ بہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو مَیں نے اپنی ماں کو بتایا کہ میں داؤ جی کے گھر گیا تھا اور وہ آفتاب بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے۔

اماں نے قدرے تلخی سے کہا۔ ''تو مجھ سے پوچھ تو لیتا۔ بے شک آفتاب ان سے پڑھتا رہا ہے اور ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر تیرے ابا جی ان سے بولتے نہیں ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا، سو اب تک ناراضی چلی آتی ہے۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ تو ان کے ہاں گیا تھا، وہ خفا ہوں گے۔'' پھر اماں نے ذرا ہمدرد بن کر کہا۔ ''اپنے ابا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔''

مَیں ابا جی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا مگر سچی بات تو یہ ہے کہ مَیں داؤ جی کے ہاں جاتا رہا اور خوب خوب ان سے معتبری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچھائے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے۔ مَیں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کہتے۔ ''گولو آ گیا۔'' پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے۔ ''کوئی گپ سُنا۔'' اور میں اپنی بساط اور سمجھ کے مطابق ڈھونڈ ڈھونڈ کے کوئی بات سناتا تو وہ خوب ہنستے۔ بس یونہی میرے لیے ہنستے حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ دلچسپ باتیں بھی نہ ہوتی تھیں۔ پھر وہ اپنے رجسٹر سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے، لے ایک سوال نکال۔ اس بات سے میری جان جاتی تھی لیکن ان کا وعدہ بڑا رسیلا ہوتا کہ ایک سوال اور پندرہ منٹ باتیں۔ اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ باتیں۔ چنانچہ میں مان جاتا اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا لیکن ان کے خود ساختہ سوال کچھ ایسے الجھے ہوتے کہ اگلی باتوں اور اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال حل ہو جاتا تو وہ چٹائی کو ہاتھ لگا کر پوچھتے۔ ''یہ کیا ہے؟'' ''چٹائی'' مَیں منہ پھاڑ کر جواب دیتا۔ ''اوں ہوں۔'' وہ سر ہلا کر کہتے۔ ''فارسی میں بتاؤ۔'' تو میں تنگ کر جواب دیتا۔ ''لو جی، ہمیں کوئی فارسی پڑھائی جاتی ہے۔'' اس پر وہ چمکار کر کہتے ''مَیں پڑھاتا ہوں گولو، مَیں جو سکھاتا ہوں۔۔۔ سنو! فارسی میں بوریا، عربی میں حصیر۔'' میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا۔ ''بخشو جی بخشو، فارسی بھی اور عربی بھی۔ میں نہیں پڑھتا جی معاف کرو۔'' مگر وہ سُنی ان سُنی ایک کر کے کہے جاتے۔ ''فارسی بوریا عربی حصیر۔'' اور پھر کوئی چاہے اپنے کانوں میں سیسہ بھر لیتا داؤ جی کے الفاظ گھستے چلے جاتے۔۔۔ امی چند کتابوں کا کیڑا تھا۔ سارا دن بیٹھک میں بیٹھا لکھتا پڑھتا رہتا۔ داؤ جی اس کے اوقات میں مخل نہ ہوتے تھے لیکن ان کے داؤ امی چند پر بھی برابر

ہوتے رہتے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر گھڑے سے پانی پینے آیا، داؤ جی نے کتاب سے نگاہ اٹھا کر پوچھا۔ ''بیٹا ڈو کا ناؤن کیا ہے؟''

اس نے گلاس منہ کے ساتھ لگائے لگائے ''ڈیڈ'' کہا اور پھر گلاس گھڑونجی تلے پھینک کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ داؤ جی پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ گھر میں ان کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔ اکیلے داؤ جی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے بانگ لگا کر کہتے۔ ''قرۃ بیٹا یہ قینچی تجھ سے کب چھوٹے گی؟'' اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑ تھی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی ''تو نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں گرتے سینے لکھوا دیے ہیں۔ منہ اچھا نہ ہو تو شبد تو اچھے نکالنے چاہئیں۔'' اور داؤ جی ایک لمبی سانس لے کر کہتے۔ ''جاہل اس کا مطلب کیا جانیں۔'' اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھتا اور اس کے منہ میں جو آتا، کہتی چلی جاتی۔ پہلے کوسنے، پھر بددعائیں اور آخر میں گالیوں پر اتر آتی۔ بی بی روکتی تو داؤ جی کہتے۔ ''ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں برسنے کو۔ تم انہیں روکو مت انہیں نو کو مت۔'' پھر وہ اپنی کتابیں سمیٹتے اور اپنا محبوب حصیرا اٹھا کر چپکے سے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔

نویں جماعت کے شروع ہی سے مجھے ایک بُری عادت پڑ گئی اور اس بُری عادت نے عجیب گُل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبہ کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معالجے سے تو ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی لیکن باتیں بڑی مزیدار سناتے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے، جنوں بھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی گھریلو زندگی کی داستانیں ان کے تیر بہدف ٹونکے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں معجون کے چند ڈبوں، شربت کی دس پندرہ بوتلوں اور دو آتشی شیشیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ داواؤں کے علاوہ وہ اپنی طلسماتی تقریر اور حضرت سلیمانؑ کے خاص صدری تعویزوں سے مریض کا علاج کیا کرتے۔ انہی باتوں کے لیے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کھچے چلے آتے اور فیض یاب ہو کر جاتے۔ ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا۔ میں اپنے ہسپتال سے ان کے لیے خالی بوتلیں اور شیشیاں چرا کر لاتا اور اس کے بدلے میں وہ مجھے داستان امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لیے دیا کرتے۔ یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دبک کر انہیں پڑھا کرتا اور صبح دیر تک سویا رہتا۔ اماں میرے اس رویہ سے سخت نالاں تھیں۔ ابا جی کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے، اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کروں گا۔ رات طلسم ہوشربا کے ایوانوں میں بسر ہوتی اور دن کلاس میں بنچ پر کھڑے ہو کر۔ سہ ماہی امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بچا۔ ششماہی میں بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے موقع پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں صندلی نامہ، فسانہ آزاد اور الف لیلیٰ ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ فسانہ آزاد اور صندلی نامہ، گھر پر رکھے تھے لیکن الف لیلیٰ سکول کے ڈیسک میں بند رہتی۔ آخری بنچ پر میں جغرافیہ کی کتاب تلے سند باد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا۔

بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی ہائی سکول پہنچی۔ امی چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اوّل آیا تھا۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر دانش گاہ نے میرا نام بھی ان چھ لڑکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہسپتال کے رہٹ کی گدی پر آ بیٹھا اور رات گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیے اور کدھر جانا چاہیے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عمرو عیار کے ہتھکنڈوں اور سند باد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے مسلسل اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا زیست کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اماں سفید چادر اوڑھے مجھے ڈھونڈتی ادھر آ گئیں اور ابا جی سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی وافی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی اور صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسب معمول اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں سے خوشیا، کوڈو اور یوسف یب مسجد کے پچھواڑے نال کے پاس بیٹھے

ہوتے رہتے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر گھڑے سے پانی پینے آیا، داؤ جی نے کتاب سے نگاہ اٹھا کر پوچھا۔ ''بیٹا ڈوکا ناؤن کیا ہے؟''

اس نے گلاس منہ کے ساتھ لگائے لگائے ''ڈیڈ'' کہا اور پھر گلاس گھڑونچی تلے پھینک کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ داؤ جی پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ گھر میں ان کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔ اکیلے داؤ جی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے بانگ لگا کر کہتے۔ ''قرۃ بیٹا یہ قینچی تجھ سے کب چھوٹے گی؟'' اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑ تھی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی ''تو نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں گرتے سینے لکھوا دیے ہیں۔ منہ اچھا نہ ہو تو شبد تو اچھے نکالنے چاہئیں۔'' اور داؤ جی ایک لمبی سانس لے کر کہتے۔ ''جاہل اس کا مطلب کیا جانیں۔'' اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھتا اور اس کے منہ میں جو آتا، کہتی چلی جاتی۔ پہلے کوسنے، پھر بددعائیں اور آخر میں گالیوں پر اتر آتی۔ بی بی روکتی تو داؤ جی کہتے۔ ''ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں برسنے کو۔ تم انہیں روکو مت انہیں نو کو مت۔'' پھر وہ اپنی کتابیں سمیٹتے اور اپنا محبوب حصیرا اٹھا کر چپکے سے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔

نویں جماعت کے شروع ہی سے مجھے ایک بُری عادت پڑ گئی اور اس بُری عادت نے عجیب گُل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبہ کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معالجے سے تو ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی لیکن باتیں بڑی مزیدار سناتے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے، جنوں بھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی گھریلو زندگی کی داستانیں ان کے تیر بہدف ٹونکے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں معجون کے چند ڈبوں، شربت کی دس پندرہ بوتلوں اور دو آتشی شیشیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ داداؤں کے علاوہ وہ اپنی طلسماتی تقریر اور حضرت سلیمانؑ کے خاص صدری تعویزوں سے مریض کا علاج کیا کرتے۔ انہی باتوں کے لیے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کھچے چلے آتے اور فیض یاب ہو کر جاتے۔ ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا۔ میں اپنے ہسپتال سے ان کے لیے خالی بوتلیں اور شیشیاں چُرا کر لاتا اور اس کے بدلے میں وہ مجھے داستان امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لیے دیا کرتے۔ یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دبک کر انہیں پڑھا کرتا اور صبح دیر تک سویا رہتا۔ اماں میرے اس رویہ سے سخت نالاں تھیں۔ ابا جی کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے، اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کروں گا۔ رات طلسم ہوشربا کے ایوانوں میں بسر ہوتی اور دن کلاس میں بنچ پر کھڑے ہو کر۔ سہ ماہی امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بچا۔ ششماہی میں بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے موقع پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں صندلی نامہ، فسانہ آزاد اور الف لیلیٰ ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ فسانہ آزاد اور صندلی نامہ، گھر پر رکھے تھے لیکن الف لیلیٰ سکول کے ڈیسک میں بند رہتی۔ آخری بنچ پر میں جغرافیہ کی کتاب تلے سند باد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا۔

بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی ہائی سکول پہنچی۔ امی چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اول آیا تھا۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر دانش گاہ نے میرا نام بھی ان چھ لڑکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہسپتال کے رہٹ کی گدی پر آ بیٹھا اور رات گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیے اور کدھر جانا چاہیے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عمرو عیار کے ہتھکنڈوں اور سند باد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے مسلسل اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا زیست کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اماں سفید چادر اوڑھے مجھے ڈھونڈتی ادھر آ گئیں اور ابا جی سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی وافی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی اور صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسب معمول اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں سے خوشیا، کوڈو اور یوسف مسجد کے پچھواڑے نال کے پاس بیٹھے

مانوس دعا سُنی۔

''ان کو پہچانتے ہو؟'' ابا جی نے سختی سے پوچھا۔

''بے شک! 'مَیں نے ایک مہذب سیلز مین کی طرح کہا۔

''بے شک کے بچے، حرامزادے، مَیں تیری یہ سب ---''

''نہ نہ ڈاکٹر صاحب'' داؤ جی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔'' یہ تو بہت ہی اچھا بچہ ہے۔ اس کو تو---''

اور ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر تلخی سے کہا۔'' آپ نہیں جانتے منشی جی اس کمینے نے میری عزت خاک میں ملا دی۔''

''آپ فکر نہ کریں۔'' داؤ جی نے سر جھکائے ہوئے کہا۔'' یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین ہے اور ایک دن---''

اب کے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آ گیا اور انہوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔'' کیسی بات کرتے ہو منشی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی برابری نہیں کر سکتا۔''

''کر لے گا، کر لے گا--- ڈاکٹر صاحب۔'' داؤ جی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔'' آپ خاطر جمع رکھیں۔''

پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔'' میں سیر کو چلتا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ آؤ، راستے میں باتیں کریں گے۔''

ابا جی اسی طرح کرسی پر بیٹھے غصّے کے عالم میں اپنا رجسٹر اُلٹ پلٹ کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ میں نے آہستہ آہستہ چل کر جالی والا دروازہ کھولا تو داؤ جی نے پیچھے مُڑ کر کہا۔'' ڈاکٹر صاحب بھول نہ جایئے گا، ابھی بھجوا دیجئے گا۔''

ابا جی نے ویسے ہی چیزیں پٹختے '' اچھا'' کہا اور داؤ جی خدا حافظ کہہ کر میرے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئے۔

داؤ جی مجھے اِدھر اُدھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے نہر کے اسی پل پر لے گئے جہاں پہلے پہل میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انہوں نے پگڑی اتار کر گود میں ڈالی، سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا

اشارہ کیا۔ پھر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا۔ "آج سے میں تمہیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اوّل نہ لا سکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوادوں گا۔ میرے ہر ارادے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا۔۔۔"

"مجھ سے پڑھائی نہ ہوگی۔" میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

"تو اور کیا ہوگا گولو؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا "میں بزنس کروں گا، روپیہ کماؤں گا اور اپنی کار لے کر یہاں آؤں گا۔ پھر دیکھنا۔۔۔"

اب کے داؤ جی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا۔ "خدا ایک چھوڑ تجھے دس کاریں دے لیکن ایک اَن پڑھ کی کار میں نہ میں بیٹھوں گا نہ ڈاکٹر صاحب۔"

"میں نے جل کر کہا۔ "مجھے کسی کی پروا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے گھر راضی رہیں، مَیں یہاں خوش۔"

انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "میری پروا بھی نہیں؟" میں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ وہ دکھی ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے۔

"میری پروا نہیں؟ او گولو میری بھی پروا نہیں؟"

مجھے ان کے لہجہ پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کی تو ہے مگر۔۔۔" انہوں نے میری بات نہ سنی اور کہنے لگے۔ "اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے منہ سے ایسی بات نکل جاتی، اگر مَیں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا۔۔۔ تو۔۔۔ تو۔۔۔" انہوں نے فوراً پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے۔ "میں حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ کتا۔ میں حضرت مولانا کی خاک سے بدتر۔ بندہ ہو کر آقا سے یہ کہتا لعنت کا طوق نہ پہنتا۔" پھر انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے اور سر بالکل گود میں جھکا کر بولے۔ "مَیں ذات کا گنڈریا۔ میرا باپ منڈا اسی کا گوالا۔ میں جہالت کا فرزند۔ میرا خاندان ابوجہل کا خانوادہ اور آقا کی ایک نظرِ کرم، حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے چنتو کو منشی چنت رام بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں منشی جی، میں کہتا ہوں رحمتہ اللہ علیہ کا کفش بردار۔۔۔ لوگ سمجھتے ہیں۔۔۔" داؤ جی کبھی ہاتھ جوڑتے، کبھی سر جھکاتے، کبھی انگلیاں چوم کر آنکھوں کو لگاتے اور بیچ بیچ میں فارسی کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا پشیمان سا ان کا زانو چھو کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ داؤ جی! داؤ جی! اور داؤ جی "میرے آقا، حضرت مولانا میرے مرشد" کا وظیفہ کیے جاتے۔ جب جذب کا یہ عالم دور ہوا تو نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے۔ "کیا اچھا موسم ہے۔ دن بھر گرمی پڑتی ہے تو خوشگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے۔" پھر وہ پُل کی دیوار سے اٹھے اور بولے۔ "چلو اب چلیں بازار سے تھوڑا سا سودا خریدنا ہے۔" مَیں جیسا سرکش و بدمزاج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا، اس سے کہیں زیادہ منفعل اور خجل ان کے ساتھ لوٹا۔ گھمے پنساری یعنی ویسو یب یب کے باپ کی دکان سے انہوں نے گھریلو ضروریات کی چند چیزیں خریدیں اور لفافے گود میں اُٹھا کر چل دیے۔ میں بار بار ان سے لفافے لینے کی کوشش کرتا مگر ہمت نہ پڑتی۔ ایک عجیب سی شرم ایک انوکھی سی ہچکچاہٹ مانع تھی اور اسی تامل اور جھجک میں ڈوبتا ابھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ بھید کھلا کہ اب میں انہی کے ہاں سویا کروں گا اور وہیں پڑھا کروں گا کیونکہ میرا بستر مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی ہمارے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک ہری کین لالٹین بھی رکھی تھی۔

بزنس مین بننا اور پاں پاں کرتی پیکارڈ اڑائے پھرنا میرے مقدر میں نہ تھا۔ گو میرے ساتھیوں کی روانگی کے تیسرے روز مالی بعد ان کے والدین بھی انہیں لاہور سے پکڑ لائے لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انارکلی میں ہمارا دفتر پتہ نہیں ترقی کے کون سے شاندار سال میں داخل ہو چکا ہوتا!

داؤ جی نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ مجھے تباہ کر دیا، مجھ پر جینا حرام کر دیا۔ سارا دن سکول کی بکواس میں گزرتا اور رات، گرمیوں کی مختصر سی رات، ان کے سوالات کا جواب دینے میں۔ کوٹھے پر ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے اور موگ رسول اور مرالہ کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں۔ مَیں نے ٹھیک بتا دیا ہے۔ وہ پھر اسی سوال کو دہرا رہے ہیں۔ میں نے پھر ٹھیک بتا دیا ہے اور انہوں نے پھر انہی نہروں کو آگے لا کھڑا کیا ہے۔ میں جاتا اور جھڑک کر کہتا۔ "مجھے پتہ نہیں، میں نہیں بتاتا۔" تو وہ

اب نیند آ رہی ہے!"

"اور وہ ترکیب نحوی؟" وہ جھٹ پوچھتے۔

اس کے بعد میں چاہے لاکھ بہانے کرتا، ادھر اُدھر کی ہزار باتیں کرتا مگر وہ اپنی کھاٹ پر ایسے ہی بیٹھے رہتے بلکہ اگر کوئی ذرا سی دیر ہو جاتی تو کرسی پر رکھی ہوئی پگڑی اٹھا کر سر پر دھر لیتے۔ چنانچہ کچھ بھی ہوتا، ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔

امی چند کالج چلا گیا تو اس کی بیٹھک مجھے مل گئی اور داؤ جی کے دل میں اس کی محبت پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب مجھے داؤ جی بہت اچھے لگنے لگے تھے لیکن ان کی جو باتیں مجھے اس وقت بری لگتی تھیں، وہ اب بھی بُری لگتی ہیں بلکہ اب پہلے سے کسی قدر زیادہ، شاید اس لیے کہ اب میں نفسیات کا ایک ہونہار طالب علم ہوں اور داؤ جی پرانے ملائی کتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بری عادت ان کی اٹھتے بیٹھتے سوال پوچھتے رہنے کی تھی اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھتا رہے، پڑھتا رہے اور جب اس مدقوق کی موت کا دن قریب آئے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دے دے۔ صحت جسمانی قائم رکھنے کے لیے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا۔ لمبی سیر اور وہ بھی صبح کی۔ تقریباً روز سورج نکلنے سے دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے۔ "اٹھ گولو موٹا ہو گیا بیٹا۔" دنیا جہان کے والدین صبح جگانے کے لیے یہ کہا کرتے ہیں کہ "اٹھو بیٹا، صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا۔" مگر وہ "موٹا ہو گیا" کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے۔ میں منمناتا تو چمکار کہتے۔ "بھدا ہو جائے گا بیٹا تو گھوڑے پر ضلع کا دورہ کیسے کیا کرے گا؟"

اور مَیں گرم گرم بستر سے ہاتھ جوڑ کر کہتا۔ "داؤ جی خدا کے لیے مجھے صبح نہ جگاؤ، چاہے مجھے قتل کر دو۔ مجھے جان سے مار دو۔"

یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ وہ فوراً میرے سر پر لحاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے بے کو ان داؤ جی سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور داؤ جی ان سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ سارا دن محلے والیوں کے کپڑے سیا کرتیں اور داؤ جی کو کوسنے دیے جاتیں۔ ان کی اس زبان درازی پر مجھے بہت غصہ آتا تھا مگر پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار وہ ناگفتنی گالیوں پر اتر آتیں تو داؤ جی میرے پاس بیٹھک میں آ جاتے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتے۔

تھوڑی دیر بعد کہتے۔ ''غیبت کرنا بڑا گناہ ہے۔ لیکن میرا خدا مجھے معاف کرے۔ تیری بے بے بھٹیارن ہے اور اس کی سرائے میں مَیں میری قرۃ العین اور تھوڑا تھوڑا تو بھی۔ ہم تینوں بڑے عاجز مسافر ہیں۔'' اور واقعی بے بے بھٹیارن سی تھی۔ اس کا رنگ سخت کالا تھا اور دانت بے حد سفید۔ ماتھا محراب دار اور آنکھیں چنیاں سی۔ چلتی تو ایسی گربہ پائی کے ساتھ جیسے (خدا مجھے بھی معاف کرے) کٹنی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے۔ بچاری بی بی کو ایسی ایسی بری باتیں کہتی کہ وہ دنوں دن رو رو کر ہلکان ہُوا کرتی۔ ایک امی چند کے ساتھ اس کی بنتی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ ہم دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے داؤ جی سے پیار نہ تھا۔ یوں تو بی بی بچاری بہت اچھی لگتی تھی مگر اس سے میری بھی نہ بنتی تھی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں۔ داؤ جی نیچے بیٹھے ہیں اور بی بی اوپر برساتی سے ایندھن لینے آئی تو ذرا رُک کر مجھے دیکھا، پھر منڈیر سے جھانک کر بولی۔

''داؤ جی پڑھ نہیں رہا ہے، تنکوں کی چار پائیاں بنا رہا ہے۔''

مَیں غصیل بچے کی طرح منہ چڑا کر کہتا۔ ''تجھے کیا، نہیں پڑھتا۔ تو کیوں بُڑبُڑ کرتی ہے---- آئی بڑی تھانیدارنی۔''

اور داؤ جی نیچے سے ہانک لگا کر کہتے۔ ''نہ نہ گولو مولو بہنوں سے نہیں جھگڑا کرتے۔''

اور مَیں زور سے چلّاتا۔ ''پڑھ رہا ہوں جی، جھوٹ بولتی ہے۔''

داؤ جی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آجاتے اور کاپیوں کے نیچے نیم پوشیدہ چار پائی دیکھ کر کہتے۔ ''قرۃ بیٹا تو اس کو چڑایا نہ کر۔ یہ جن بڑی مشکل سے قابو کیا ہے۔ اگر ایک بار پھر بگڑ گیا تو مشکل سے سنبھلے گا۔

بی بی کہتی۔ ''کاپی اٹھا کر دیکھ لو داؤ جی، اس کے نیچے ہے وہ چارپائی جس سے کھیل رہا تھا۔''

میں قہر آلود نگاہوں سے بی بی کو دیکھتا اور وہ لکڑیاں اٹھا کر نیچے اتر جاتی۔ پھر داؤ جی سمجھاتے کہ ''بی بی یہ سب تیرے فائدے کے لیے کہتی ہے ورنہ اسے کیا پڑی ہے کہ مجھے بتاتی پھرے۔ تو فیل ہو یا پاس، اس کی بلا سے! مگر وہ تیری بھلائی چاہتی ہے۔ تیری بہتری چاہتی ہے۔'' اور مجھے داؤ جی کی یہ بات ہرگز سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میری شکایتیں کرنے والی میری بھلائی کیوں چاہ سکتی تھی؟

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے داؤ جی کے ہاں سے چل دیتا، گھر جا کر ناشتہ کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا کھانا سکول بھیج دیا جاتا اور شام کو سکول بند ہونے پر گھر آکر اپنی لالٹین تیل سے بھرتا اور داؤ جی کے یہاں آجاتا۔ پھر رات کا کھانا بھی مجھے داؤ جی کے گھر پر ہی بھجوا دیا جاتا۔ جن ایام میں منصفی بند ہوتی، داؤ جی سکول کی گراؤنڈ میں آکر بیٹھ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بوچھاڑ رہتی۔ سکول میں جو کچھ پڑھا گیا ہوتا، اس کی تفصیل پوچھتے۔ پھر مجھے میرے گھر تک چھوڑ کر خود سیر کو چلے جاتے۔ ہمارے قصبے میں منصفی کا کام مہینے میں دس دن ہوتا تھا۔ یہ دس دن داؤ جی باقاعدہ کچہری میں گزارتے تھے۔ ایک آدھ عرضی آجاتی تھی تو دو چار روپے کما لیتے ورنہ فارغ اوقات میں وہاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا، اس کی کتر بیونت اور محلے والیوں سے جوڑ توڑ اچھے مالی نتائج پیدا کرتی تھی۔ چونکہ چند سالوں سے گھر کا خرچ اس کی سلائی سے چلتا تھا، اس لیے وہ داؤ جی پر اور بھی حاوی ہو گئی تھی---- ایک دن خلاف معمول داؤ جی کو لینے مَیں منصفی چلا گیا اس وقت کچہری بند ہو گئی تھی اور داؤ جی نانبائی کے چھپر تلے ایک بنچ پر بیٹھے گُڑ کی چائے پی رہے تھے۔ مَیں نے ہولے سے جا کر ان کا بستہ اٹھا لیا اور ان کے گلے میں مَیں نے باہیں ڈال کر کہا۔ ''چلئے آج میں آپ کو لینے آیا ہوں۔'' انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے۔ ایک آنہ جیب سے نکال کر نانبائی کے حوالے کیا اور چپ چاپ میرے ساتھ چل دیے۔ میں نے شرارت سے ناچ کر کہا۔ ''گھر چلئے۔ بے بے کو بتاؤں گا کہ آپ چوری چوری یہاں چائے پیتے ہیں۔''

داؤ جی جیسے شرمندگی ٹالنے کو مسکرائے اور بولے ''اس کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے اور گُڑ کی چائے سے تھکن بھی دور ہو جاتی ہے۔ پھر ایک آنہ میں گلاس بھر کے دیتا ہے۔ تم اپنی بے بے سے نہ کہنا خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔ زیادتی پر اُتر آئے گی۔'' پھر انہوں نے کچھ خوفزدہ ہو کر، کچھ مایوس ہو کر کہا۔ ''اس کی تو فطرت ہی ایسی ہے۔'' اس دن مجھے داؤ جی پر بڑا رحم آیا۔

میراجی ان کے لیے بہت کچھ کرنے کو چاہنے لگا مگر اس وقت میں نے بے بے سے نہ کہنے کا وعدہ کر کے ہی ان کے لئے بہت کچھ کیا۔ جب اس واقعہ کا ذکر میں نے اماں سے کیا تو وہ کبھی میرے ہاتھ اور کبھی نوکر کی معرفت داؤ جی کے ہاں دودھ، پھل اور چینی وغیرہ بھیجنے لگیں مگر اس رسد سے داؤ جی کو کبھی بھی کچھ نصیب نہ ہوا۔ ہاں بے بے کی نگاہوں میں میری قدر بڑھ گئی اور اس نے کسی حد تک مجھ سے رعایتی برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک صبح میں دودھ سے بھرا تا ملوٹ ان کے یہاں لے کر آیا تھا اور بے بے گھر پر نہ تھی، وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ بابا ساون کے جوہڑ میں اشنان کرنے گئی تھی اور گھر میں صرف داؤ جی اور بی بی تھے۔ دودھ دیکھ کر داؤ جی نے کہا۔ ''چلو آج چائے پئیں۔ میں دکان سے گڑ لے کر آتا ہوں۔ تم پانی چولہے پر رکھو۔'' بی بی نے جلدی جلدی چولہا سلگایا۔ میں پتیلی میں پانی ڈال کر لایا اور پھر ہم دونوں وہیں چوکے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ داؤ جی گڑ لے کر آ گئے تو انہوں نے کہا۔ ''تم دونوں اپنے کام پر بیٹھو، چائے میں بناتا ہوں۔'' چنانچہ بی بی مشین چلانے لگی اور میں ڈائریکٹ ان ڈائریکٹ کی مشقیں لکھنے لگا۔ داؤ جی چولہا بھی جھونکے جاتے تھے اور عادت کے مطابق مجھے بھی اونچے اونچے بتاتے جاتے تھے۔ ''گلیلو نے کہا۔ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ گلیلو نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ یہ نہ لکھ دینا کہ سورج کے گرد گھومتی تھی۔'' پانی اُبل رہا تھا۔ داؤ جی خوش ہو رہے تھے۔ اسی خوشی میں جھوم جھوم کر وہ اپنا تازہ بنایا ہوا کبت گا رہے تھے۔ ''او گولو! او گولو!! گلیلو کی بات مت بھولنا، گلیلو کی بات مت بھولنا۔'' انہوں نے چائے کی پتی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چولہے پر ہی تھا اور داؤ جی ایک چھوٹے سے بچے کی طرح پانی کی کُل بُل کُل بُل کے ساتھ گولو گلیلو کیے جا رہے تھے۔ میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کیے جا رہا تھا۔ بی بی مسکرا رہی تھی اور مشین چلائے جاتی تھی اور ہم تینوں اپنے چھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش تھے، گویا سارے محلے بلکہ سارے قصبہ کی خوشیاں بڑے بڑے رنگین پروں والی پریوں کی طرح ہمارے گھر میں اتر آئی ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے اندر داخل ہوئی۔ داؤ جی نے دروازہ کھلنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ فق ہو گیا۔ چمکتی ہوئی پتیلی سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چائے کے چھوٹے چھوٹے چھلاوے ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے پھرتے تھے اور ممنوعہ کھیل رچانے والا بڈھا موقع پر پکڑا گیا تھا۔ بے بے نے آگے بڑھ کر چولہے کی طرف دیکھا اور داؤ جی نے چوکے سے اٹھتے ہوئے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''چائے ہے!''

بے بے نے ایک دوہتڑ داؤ جی کی کمر میں مارا اور کہا۔ ''بڈھے بڑھا تجھے لاج نہیں آتی۔ تجھ پر بہار و بھرے تجھے بم سیٹنے یہ تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں بیوہ گھر میں نہ تھی تو تجھ کو کسی کا ڈر نہ رہا۔ تیرے بھانویں مَیں کل کی مرتی آج مروں۔ تیرا من راضی ہو، تیری آسیں پوری ہوں۔ کس مرنے جوگی نے جنا اور کس لیکھ کی ریکھا نے میرے پلے باندھ دیا ـــ تجھے موت نہیں آتی ـــ اوں ہوں۔ تجھے کیوں آئے گی۔'' اسی فقرے کی گردان کرتے ہوئے بے بے بھیڑنی کی طرح چوکے پر چڑھی کپڑے سے پتیلی پکڑ کر چولہے سے اٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھپاکے داؤ جی کی پنڈلیوں اور پاؤں پر گرے اور وہ ''او تیرا بھلا ہو جائے! او تیرا بھلا ہو جائے!'' کہتے وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور بیٹھک میں گھس گئے۔ ان کے اس فرار بلکہ اندازِ فرار کو دیکھ کر میں اور بی بی ہنسے بنا نہ رہ سکے اور ہماری ہنسی کی آواز ایک ثانیہ کے لیے چاروں دیواروں سے ٹکرائی۔ میں تو خیر بچ گیا لیکن بے بے نے سیدھے جا کر بی بی کو بالوں سے پکڑ لیا اور چیخ کر بولی۔ ''میری سوت! بتا بڈھے سے تیرا کیا ناتا ہے؟ بتا نہیں تو ابھی پران لیتی ہوں۔ تو نے اس کو چائے کی کنجی کیوں دی؟'' بی بی بچاری پھس پھس کر رونے لگی تو میں بھی اٹھ کر اندر بیٹھک میں کھسک آیا۔

داؤ جی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے اور پاؤں سہلا رہے تھے۔ پتہ نہیں انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں گدگدی ہوئی کہ الماری کے اندر منہ کر کے ہنسنے لگا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا اور بولے۔ ''شکر کرو گار کنم کہ گرفتارم بہ مصیبتے نہ کہ بہ معصیتے!'' تھوڑی دیر رُک کر پھر کہا۔ ''میں تو اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں جس کے سر مطہر پر مکے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی۔''

میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے۔ ''آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ حلقہ بگوش گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ وشیون کرے تو لعنت ہے اس کی زندگی پر۔ وہ اپنے محبوب کے طفیل نار جہنم سے بچائے۔ خدائے ابراہیم مجھے جرأت عطا کر، مولائے ایوب مجھے صبر کی نعمت دے۔''

مَیں نے کہا۔ ''داؤ جی آقائے نامدار کون؟''

تو داؤ جی کو یہ سُن کر ذرا تکلیف ہوئی۔ انہوں نے شفقت سے کہا۔ ''جانِ پدر، یوں نہ پوچھا کر۔ میرے استاد حضرت کی روح کو مجھ سے بیزار نہ کر۔ وہ میرا آقا بھی تھے، میرے باپ بھی اور استاد بھی، وہ تیرے دادا استاد ہیں___ دادا استاد___'' اور انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔

آقائے نامدار کا لفظ اور کوتاہ قسمت مجوزہ کی ترکیب میں نے پہلی بار داؤ جی سے سنی۔ یہ واقعہ سنانے میں انہوں نے کتنی ہی دیر لگا دی کیونکہ ایک ایک فقرے بعد فارسی کے بے شمار نعتیہ اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے استاد کی روح کو ثواب پہنچاتے تھے۔

جب یہ واقعہ بیان کر چکے تو مَیں نے ادب سے پوچھا۔ ''داؤ جی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں؟ اپنے آپ کو ان کا نوکر کیوں کہتے ہیں؟''

داؤ جی نے مسکرا کر کہا۔ ''جو طویلے کے ایک خر کو ایسا بنا دے کہ لوگ کہیں یہ منشی چنت رام ہے۔ یہ منشی جی ہیں، وہ مسیحا نہ ہو وہ آقا نہ ہو تو پھر کیا ہوا؟''

میں چارپائی کے کونے سے آہستہ آہستہ پھسل کر بستر پر پہنچ گیا اور چاروں طرف رضائی لپیٹ کر داؤ جی کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکا کر کبھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تھے اور پنڈلیاں سہلاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے وقفوں بعد ذرا سا ہنستے اور پھر خاموش ہو جاتے___ کہنے لگے ''مَیں کیا تھا اور کیا ہو گیا___ حضرت مولانا کی پہلی آواز کیا تھی! میری طرف سر مبارک اٹھا کر فرمایا، چوپال زادے ہمارے پاس آؤ۔ میں لاٹھی ٹیکتا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چھتہ پنھاڑ اور دیگر دیہات کے لڑکے نیم دائرہ بنائے ان کے سامنے بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک دربار لگا تھا اور کسی کو آنکھ اوپر اٹھانے کی ہمت نہ تھی___ میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا، بھئی ہم تم کو ہر روز یہاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں۔ انہیں چرنے چگنے کے لیے چھوڑ کر ہمارے پاس آ جایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو___ پھر حضور نے میری غرض سے بغیر پوچھا، کیا نام ہے تمہارا؟ میں نے گنواروں کی طرح کہا چنتو___ حضرت مسکرائے___ تھوڑا ہنسے بھی___ فرمانے لگے، پورا نام کیا ہے؟ پھر خود ہی بولے چنت رام ہو گا___ میں نے سر ہلا دیا___ حضور کے شاگرد کتاب سے نظریں چرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میرے گلے میں کھدر کا لمبا کرتہ تھا۔ پانجامہ کی بجائے صرف لنگوٹ بندھا تھا۔ پاؤں میں ادھوڑی کے موٹے جوتے اور سر پر سُرخ رنگ کا جانگیہ لپیٹا ہوا تھا۔ بکریاں میری___''

مَیں نے بات کاٹ کر پوچھا۔ ''آپ بکریاں چراتے تھے داؤ جی؟''

''ہاں ہاں۔'' فخر سے بولے۔ ''میں گڈریا تھا اور میرے باپ کی بارہ بکریاں تھیں۔''

حیرانی سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور میں نے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے جلدی سے پوچھا۔ ''اور آپ سکول کے پاس بکریاں چرایا کرتے تھے؟''

داؤ جی نے کرسی چارپائی کے قریب کھینچ لی اور اپنے پاؤں پائے پر رکھ کر بولے۔ ''جانِ پدر! اس زمانے میں تو شہروں میں بھی سکول نہ ہوتے تھے۔ میں گاؤں کی بات کر رہا ہوں۔ آج سے چوہتر برس پہلے بھلا کوئی تمہارے ایم۔ بی ہائی سکول کا نام بھی جانتا تھا؟ وہ تو میرے آقا کو پڑھانے کا شوق تھا۔ اردگرد کے لوگ اپنے لڑکے حرف پڑھنے کو ان کے پاس بھیج دیتے___ ان کا سارا خاندان زیورِ علم سے آراستہ تھا اور دینی نعمتوں سے مالا مال تھا۔ والد ان کے ضلع بھر کے ایک ہی حکیم اور چوٹی کے مبلغ تھے۔ جدِ امجد مہاراجہ کشمیر کے میر منشی۔ گھر میں علم کے دریا بہتے تھے۔ فارسی عربی، جبر و مقابلہ، اقلیدس حکمت اور علم ہیئت ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ حضور کے والد کو دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہوا لیکن آپ کی زبانی ان کی تبحرِ علمی کی سب داستانیں سنیں۔ شیفتہ اور حکیم

مومن خان مومن سے ان کے بڑے مراسم تھے اور خود حضرت مولانا کی تعلیم دِلّی میں مفتی آزردہ مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی۔۔۔"

مجھے داؤ جی کے موضوع سے بھٹک جانے کا ڈر تھا اس لیے میں نے جلدی سے پوچھا۔"پھر آپ نے حضرت مولانا کے پاس پڑھنا شروع کر دیا۔"

"ہاں۔" داؤ جی اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے۔"ان کی باتیں ہی ایسی تھیں۔ان کی نگاہیں ہی ایسی تھیں۔جن کی طرف توجہ فرماتے تھے۔بندے سے مولا کر دیتے تھے۔۔۔میں تو اسی وقت لاٹھی زمین پر ڈال ان کے پاس بیٹھ گیا۔فرمایا اپنے بھائیوں کے پاس بورے پر بیٹھو۔میں نے کہا، جی اٹھارہ برس دھرتی پر بیٹھے گزر گئے، اب کیا فرق پڑتا ہے۔پھر مسکرا دیئے۔اپنے چوبی صندوقچے سے حروفِ ابجد کا ایک مقوا نکالا اور بولے الف، بے، پے بھتے۔۔۔ سبحان اللہ کیا آواز تھی، کس شفقت سے بولے تھے، کس لہجہ سے فرما رہے تھے۔الف، بے، پے، تے" اور داؤ جی ان حرفوں کا ورد کرتے ہوئے اپنے ماضی میں کھو گئے۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ادھر رہٹ تھا اور اس کے ساتھ مچھلیوں کا حوض۔پھر انہوں نے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا۔"اور اس طرف مزارعین کے کوٹھے۔دونوں کے درمیان حضور کا باغیچہ تھا اور سامنے ان کی قدیم عظیم الشان حویلی۔اسی باغیچے میں ان کا مکتب لگتا تھا۔در فیض کھلا تھا جس کا جی چاہے آئے نہ مذہب کی قید نہ مسلک کی پابندی۔۔۔"

میں نے کافی دیر سوچنے کے بعد باادب باملاحظہ قسم کا فقرہ تیار کر کے پوچھا"حضرت مولانا کا اسمِ گرامی شریف کیا تھا؟" تو پہلے انہوں نے میرا فقرہ ٹھیک کیا اور پھر بولے۔"حضرت اسماعیل چشتی رحمتہ اللہ علیہ۔فرماتے تھے کہ ان کے والد ہمیشہ انہیں جانِ جاناں کہہ کر پکارتے تھے۔کبھی جانِ جاناں کی رعایت سے مظہر جانِ جاناں بھی کہہ دیتے تھے۔"

میں ایسی دلچسپ کہانی سننے کا ابھی اور خواہش مند تھا کہ داؤ جی اچانک رک گئے اور بولے۔"سب سڈی ایری سسٹم کیا تھا؟" ان انگریزوں کا بُرا ہو یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آئیں یا ملکہ وکٹوریہ کا فرمان لے کر، سارے معاملے میں کھنڈت ڈال دیتے ہیں۔سوا کے پہاڑے کی طرح میں نے سب سڈی ایری سسٹم کا سارا ڈھانچہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔پھر انہوں نے میز سے گرامر اٹھائی اور بولے۔"باہر جا کر دیکھ کے آ کہ تیری بے بے کا غصہ کم ہوا کہ نہیں۔" میں دوات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے بے کو مشین چلاتے اور بی بی کو چوکا صاف کرتے پایا۔

داؤ جی کی زندگی میں بے بے والا پہلو بڑا ہی کمزور تھا۔جب وہ دیکھتے کہ گھر میں مطلع صاف ہے اور بے بے کے چہرے پر کوئی شکن نہیں ہے تو وہ پکار کر کہتے۔"سب ایک ایک شعر سناؤ۔" پہلے مجھی سے تقاضا ہوتا اور میں چھوٹتے ہی کہتا

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس پر وہ تالی بجاتے اور کہتے۔"اوّلیں شعر نہ سنوں گا، اردو کم سنوں گا اور مسلسل نظم کا ہرگز نہ سنوں گا۔" میں کہتا۔"مجھے سوچنے دیجئے، اتنے میں بی بی سنائے۔"

بی بی بھی میری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی۔

شنیدم کہ شاپور دم درکشید
چو خسرو برانش قلم درکشید

اس پر داؤ جی ایک مرتبہ پھر آرڈر آرڈر پکارتے۔
بی بی قینچی رکھ کر کہتی۔

شورے شد داز خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

داؤ جی شاباش تو ضرور کہہ دیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے کہ"بیٹا یہ شعر تو کئی مرتبہ سُنا چکی ہے۔"

پھر وہ بے بے کی طرف دیکھ کر کہتے۔ ''بھئی آج تمھاری بے بے بھی ایک شعر سنائے گی۔'' مگر بے بے ایک ہی روکھا سا جواب دیتی۔ ''مجھے نہیں آتے شیر بکت۔'' اس پر داؤ جی کہتے ''گھوڑیاں ہی سنا دے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی گا دے۔'' اس پر بے بے کے ہونٹ مسکرانے کو کرتے لیکن وہ مسکرا نہ سکتی اور داؤ جی عین عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان کبھی امی چند کا کبھی میرا نام ٹانک دیتے، پھر کہتے۔ ''مَیں اپنے اس گولو مولو کی شادی پر سرخ پگڑی باندھوں گا۔ برات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چلوں گا اور نکاح نامہ پر شہادت کے دستخط کروں گا۔'' مَیں دستور کے مطابق شرما کر نگاہیں نیچی کر لیتا تو وہ کہتے۔ ''پتہ نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری چھوٹی سی بہو پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہی ہوگی۔ ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے۔ اس نے تو بہت سی چیزیں پکانی سیکھ لی ہوں گی۔ پڑھنے میں بھی ہوشیار ہوگی۔ اس بدھو کو تو یہ یاد نہیں رہتا کہ مادیاں گھوڑی ہوتی ہے یا مرغی۔ وہ تو فر فر سب کچھ سناتی ہوگی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا۔ پہلے اس کو خطاطی کی تعلیم دوں گا۔ پھر خطِ شکستہ سکھاؤں گا۔ مستورات کو خطِ شکستہ نہیں آتا۔ مَیں تو اپنی بہو کو سکھا دوں گا۔۔۔ سن گولو! پھر میں تیرے ہی پاس رہوں گا۔ مَیں اور میری بہو فارسی میں باتیں کریں گے۔ وہ بات بات پر بفرمائید کہے گی اور تو احمقوں کی طرح منہ دیکھا کرے گا۔'' پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے کھلتے خوب کھلے کہتے۔ جان پدر چرا ایں قدر زحمت می کش۔۔۔ خوب۔۔۔ یاد دارم۔۔۔ اور پتہ نہیں کیا کچھ کہتے۔ جان پدر چرا ایں قدر زحمت می کش۔۔۔ خوب۔۔۔ یاد دارم۔۔۔ اور پتہ نہیں کیا کچھ کہتے۔ بچارے داؤ جی! چٹائی پر اپنی چھوٹی سی دنیا بسا کر اس میں فارسی کے فرمان جاری کیے جاتے۔۔۔ ایک دن جب چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے وہ ایسی ہی دنیا بسا چکے تھے تو ہولے سے مجھ کہنے لگے۔ ''جس طرح خدا نے تجھے ایک نیک سیرت بیوی اور مجھے سعادت مند بہو عطا کی ہے، ویسے ہی وہ اپنے فضل سے میرے امی چند کو بھی دے گا۔ اس کے خیالات کچھ مجھے اچھے نہیں لگتے۔ یہ سیوا سنگ یہ مسلم لیگ یہ بیلچہ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور امی چند لاٹھی چلانا گتکا کھیلنا سیکھ رہا ہے۔ میری تو وہ کب مانے گا، ہاں خدائے بزرگ و برتر اس کو ایک نیک مومن سی بیوی دلا دے تو وہ اسے راہِ راست پر لے آئے گی۔''

اس مومن کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور چُپ سا ہو گیا۔ چُپ محض اس لیے ہوا تھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو یقیناً ایسی بات نکلے گی جس سے داؤ جی کو بڑا دکھ ہوگا۔۔۔ میری اور امی چند کی خیر باتیں ہی تھیں لیکن 12 جنوری کو بی بی کی برات سچ مچ آ گئی۔ جیجا جی رام پرتاب کے بارے میں داؤ جی مجھے بہت کچھ بتا چکے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انہوں نے جو استخارہ کیا تھا، اس پر وہ پورا اترا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی داؤ جی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سمدھی فارسی کے استاد تھے اور کبیر پنتھی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بارہ تاریخ کی شام کو جب بی بی وداع ہونے لگی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ بے بے زار و قطار رو رہی ہے۔ امی چند آنسو بہا رہا ہے اور محلے کی عورتیں پھس پھس کر رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور داؤ جی میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں۔ ''آج زمین کچھ میرے پاؤں نہیں پکڑتی۔ میں توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔'' جیجا جی کے باپ بولے۔ ''منشی جی اب ہمیں اجازت دیجئے۔'' تو بی بی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اسے چارپائی پر ڈالا۔ عورتیں ہوا کرنے لگیں اور داؤ جی میرا سہارا لے کر اس کی چارپائی کی طرف چلے۔ انہوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا۔ ''یہ کیا ہوا بیٹا۔ اٹھو! یہ تو تمہاری نئی اور خود مختار زندگی کی پہلی گھڑی ہے۔ اسے یوں منحوس نہ بناؤ۔'' بی بی اسی طرح دھاڑیں مارتے ہوئے داؤ جی سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''قرۃ العین میں تیرا گنہگار ہوں کہ تجھے پڑھا نہ سکا۔ تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کر دے گی اور شاید برخوردار رام پرتاب بھی لیکن مَیں اپنے آپ کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں خطا کار ہوں اور میرا انجل سر تیرے سامنے خم ہے۔'' یہ سن کر بی بی بھی زور زور سے رونے لگی اور داؤ جی کی آنکھوں سے کتنے سارے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ کر زمین پر گرے۔ ان کے سمدھی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''منشی جی آپ فکر نہ کریں، بیٹی کو میں کریما پڑھا دوں گا۔'' داؤ جی ادھر پلٹے اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔ ''کریما تو پڑھ چکی ہے گلستان بوستان بھی ختم کر چکا ہوں لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی۔'' اس پر وہ ہنس کر بولے۔ ''آپ بھی حد کرتے ہیں۔ ساری گلستان تو مَیں نے بھی نہیں پڑھی، جہاں عربی آتی تھی، آگے گزر جاتا تھا۔''

Scanned by CamScanner

—داؤ جی اس طرح ہاتھ جوڑے کتنی دیر خاموش کھڑے رہے۔ بی بی نے گونہ لگی سرخ رنگ کی ریشمی چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے امی چند کے اور پھر میرے سر پر پھیرا کے سکھیوں اور بازوؤں میں ڈیوڑھی کی طرف چل دی۔ داؤ جی میرا سہارا لے کر چلے تو انہوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے بھینچ کر کہا۔ ''لو یہ بھی رو رہا ہے۔ دیکھو یہ ہمارا سہارا بنا پھرتا ہے۔ او گولو— او مردم دیدہ— تجھے کیا ہو گیا— جانِ پدر تو کیوں—؟''

اس پر ان کا گلا رندھ گیا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے۔ برات والے تانگوں اور ٹانگوں پر سوار تھے۔ بی بی رتھ میں جا رہی تھی اور اس کے پیچھے امی چند اور میں اور ہمارے درمیان داؤ جی پیدل چل رہے تھے۔ اگر بی بی کی چیخ ذرا زور سے نکل جاتی تو داؤ جی آگے بڑھ کر رتھ کا پردہ اٹھاتے اور کہتے۔ ''لاحول پڑھو بیٹا، لاحول پڑھو۔''

اور خود آنکھوں پر رکھا ان کی پگڑی کا شملہ بھیگ گیا تھا!

رانو ہمارے محلے کا بڑا ہی کثیف سا انسان تھا۔ بدی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ باڑہ جس کا مَیں نے ذکر کیا ہے، اُسی کا تھا۔ اس میں بیس پچیس بکریں اور دو گائیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام رانو گلی کے بغلی میدان میں بیٹھ کر بیچا کرتا۔ تقریباً سارے محلے والے اسی سے دودھ لیتے تھے اور اس کی شرارتوں کی وجہ سے دبتے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ یونہی شوقیہ لاٹھی زمین پر بجا کر داؤ جی کو ''پنڈتا جے رام جی کی'' کہہ کر سلام کیا کرتا۔ داؤ جی نے اسے کئی دفعہ سمجھایا کہ وہ پنڈت نہیں ہیں، معمولی آدمی ہیں کیونکہ پنڈت ان کے نزدیک پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جا سکتا تھا لیکن رانو نہیں مانتا تھا۔ وہ اپنی مونچھ چبا کر کہتا۔ ''لے بھئی جس کے سر پر بودی (چٹیا) ہو، وہ پنڈت ہی ہوتا ہے''— چوروں یاروں سے اس کی آشنائی تھی۔ شام کو اس کے باڑے میں جُوا بھی ہوتا اور گندی اور فحش بولیوں کا مشاعرہ بھی۔ بی بی کے جانے کے بعد ایک دن جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اس نے شرارت سے ایک آنکھ میچ کر کہا۔ ''مورنی تو چلی گئی بابو! اب تو اس کے گھر میں رہ کر کیا لے گا؟'' میں چپ رہا تو اس نے جاگ والے دودھ میں ڈبہ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''گھر میں گنگا بہتی تھی، سچ بتا غوطہ لگایا کہ نہیں؟'' مجھے اس بات پر غصہ آ گیا اور میں نے تاملوٹ گھما کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس ضرب شدید سے خون وغیرہ تو برآمد نہ ہوا لیکن وہ چکرا کر تخت پر گر پڑا اور میں گھر بھاگ گیا۔ داؤ کو سارا واقعہ سنا کر میں دوڑا دوڑا اپنے گھر گیا اور اباجی سے ساری حکایت بیان کی۔ ان کی بدولت رانو کی تھانہ میں طلبی ہوئی اور حوالدار صاحب نے ہلکی گوشمالی کے بعد اسے سخت تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے رانو داؤ جی پر آتے جاتے طرح طرح کے فقرے کسنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بودی کا اڑایا کرتا تھا اور واقعی داؤ جی کے فاضل سر پر وہ چپٹی سی بودی ذرا اچھی نہ لگتی تھی مگر وہ کہتے تھے۔ ''یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ کر اسے دہی سے دھوتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چمکاتی تھی۔'' گو مَیں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی پگڑی اتارنے کی جسارت نہیں کی لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں دیال چند میموریل ہائی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں پر گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا۔ ''شہر جا کر چوٹی تو نہیں کٹوا دی؟'' میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا ''تم سا سعادت مند بیٹا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے اور ہم سا خوش قسمت استاد بھی خال خال ہو گا جسے تم ایسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہوا ہو۔'' میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا۔ ''حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے۔'' ہنس کر فرمانے لگے۔ ''چنت رام ہمارے پاؤں نہ چھوا کرو۔ بھلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے کہا۔ ''اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر پھاڑ کر بھی آپ کے لیے دوائی نکال لاؤں۔ اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ٹانگوں کے لیے نذر کروں لیکن میرا بس نہیں چلتا—'' خاموش ہو گئے اور نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے۔ ''خدا کو یہی منظور ہے تو ایسے ہی سہی۔ تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں پر میں نے کوئی دس سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے—'' داؤ جی گزرے ایام کی تہہ میں اترتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''میں صبح سویرے حویلی کی ڈیوڑھی میں جا کر آواز دیتا۔ خادم آ گیا۔'' مستورات ایک طرف ہو جاتیں تو حضور صحن سے آواز دے کر مجھے بلاتے اور میں اپنی قسمت کو سراہتا ہاتھ جوڑے جوڑے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھوتا اور حکم کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ دعا دیتے، میرے والدین کی

خیریت پوچھتے، گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے۔ ''لو بھئی چنت رام اب اس گناہوں کی گٹھری کو اٹھالو۔'' میں سبد گل کی طرح انہیں اٹھاتا اور کمر پر لاکر حویلی سے باہر آجاتا۔ کبھی فرماتے ''ہمیں باغ کا چکر دو۔ کبھی حکم ہوتا سیدھے رہٹ کے پاس لے چلو اور کبھی کبھار بڑی نرمی سے کہتے چنت رام تھک نہ جاؤ تو ہمیں مسجد تک لے چلو۔'' میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کروں گا مگر نہیں مانے۔ یہی فرماتے رہے کہ کبھی جی چاہتا ہے اور جب جی چاہتا ہے، تم سے کہہ دیتا ہوں۔ میں انہیں وضو کرانے والے چبوترے پر بٹھا کر ان کے ہلکے ہلکے جوتے اتارتا اور انہیں جھولی میں رکھ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ چبوترے سے حضور خود گھسٹ کر صف کی جانب جاتے تھے۔ مَیں نے صرف ایک مرتبہ انہیں اس طرح جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے بعد جرأت نہ ہوئی۔ ان کے جوتے اتارنے کے بعد دامن میں منہ چھپا لیتا اور پھر اسی وقت سر اٹھاتا جب وہ میرا نام لے کر یاد فرماتے۔ واپسی پر مَیں قصبے کی لمبی لمبی گلیوں کا چکر کاٹ کر حویلی کو لوٹتا تو فرماتے ''ہم جانتے ہیں چنت رام تم ہماری خوشنودی کے لیے قصبہ کی سیر کراتے ہو لیکن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک تو تم پر لدا لدا پھراتا ہوں، دوسرے تمہارا وقت ضائع کرتا ہوں'' اور حضور سے کون کہہ سکتا کہ آقا یہ وقت ہی میری زندگی کا نقطۂ عروج ہے اور یہ تکلیف ہی میری حیات کا مرکز ہے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ لدا لدا پھرتا ہوں اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک ہما ہے جس نے اپنا سایہ محض میرے لیے وقف کر دیا ہے۔

جس دن مَیں نے سکندر نامہ زبانی یاد کر کے انہیں سنایا، اس قدر خوش ہوئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہی نصیب ہو گئی ہو۔ دین و دنیا کی ہر دعا سے مجھے مالا مال کیا۔ دستِ شفقت میرے سر پر پھیرا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر انعام دیا۔ مَیں نے اسے حجرِ اسود جان کر بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا اور سکندر کا افسر سمجھ کر پگڑی میں رکھ لیا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دعائیں دے رہے تھے اور فرما رہے تھے۔ ''جو کام ہم سے نہ ہو سکا، وہ تو نے کر دکھایا۔ تو نیک ہے، خدا نے یہ سعادت تجھے نصیب کی۔ چنت رام تیرا مویشی چوپاں کا پیشہ ہے تو شاہِ بطحا کا پیرو ہے۔ اس لیے خدائے عزوجل تجھے برکت دیتا ہے۔ وہ تجھے اور بھی برکت دے گا۔ تجھے اور کشائش میسر آئے گی---''

داؤ جی یہ باتیں کرتے کرتے سر گھٹنوں پر رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میرا امتحان قریب آرہا تھا اور داؤ جی سخت ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے میرے ہر فارغ وقت پر کوئی نہ کوئی کام پھیلا دیا تھا۔ ایک مضمون سے عہدہ برآ ہوتا تو دوسرے کی کتابیں نکال کر سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینے اُٹھتا تو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلے آتے اور نہیں تو تاریخ کے سن ہی پوچھتے جاتے۔ شام کے وقت سکول پہنچنے کا انہوں نے وطیرہ بنا لیا تھا۔ ایک دن سکول کے بڑے دروازے سے نکلنے کے بجائے بورڈنگ ہاؤس کی راہ کھسک گیا تو انہوں نے جماعت کے کمرے کے سامنے آکر بیٹھنا شروع کر دیا میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بدزبان ہو گیا تھا۔ داؤ کے بچے گویا میرا تکیہ کلام بن گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی یا ان کے سوالات کی سختی بڑھ جاتی تو مَیں انہیں کتے کمینے سے بھی نہ چوکتا۔ ناراض ہو جاتے تو بس اسی قدر کہتے۔ ''دیکھ لے ڈومنی تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیری بیوی بیاہ کر لاؤں گا تو پہلے اسے یہی بتاؤں گا کہ جانِ پدر تیرے بڈھے باپ کو کتا کہتا تھا'' میری گالیوں کے بدلے وہ مجھے ڈومنی کہا کرتے تھے۔ اگر انہیں زیادہ دکھ ہوتا تو منہ چڑھی ڈومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انہیں غصہ آتا تھا، نہ دُکھ ہوتا تھا۔ مجھے میرے اصلی نام سے انہوں نے کبھی نہیں پکارا۔ میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا تو بیٹا آفتاب، برخوردار آفتاب کہہ کر انہیں یاد کرتے تھے لیکن میرے ہر روز نئے نئے نام رکھتے تھے جن میں گولو انہیں بہت مرغوب تھا۔ طنبورا دوسرے درجہ پر مسٹر ہونق اور اخفش اسکوئران سب کے بعد آتے تھے اور ڈومنی صرف غصہ کی حالت میں۔ کبھی کبھی مَیں ان کو بہت دق کرتا، وہ اپنی چٹائی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں۔ مجھے الجبرے کا ایک سوال دے رکھا ہے اور میں سارے جہان کی ابجد کو ضرب دے کر تنگ آچکا ہوں تو مَیں کاپیوں اور کتابوں کے ڈھیر کو پاؤں سے پرے دھکیل کر اُونچے اُونچے گانے لگتا۔

تیرے سامنے بیٹھ کے .. تے دکھ تینوں نیؤں دسنا

داؤ جی حیرانی سے میری طرف دیکھتے تو میں تالیاں بجانے لگتا اور قوالی شروع کر دیتا۔ نیؤں نیؤں نیؤں دسنا تے دکھ تینوں نیؤں دسنا---- دسنا دسنا دسنا دسنا---- تینوں تینوں تینوں تینوں۔ سارے گا مارو نا رو نا رونا سارے گا مارونا رونا تے دکھ تینوں نیوں

دستا۔ وہ عینک کے اوپر مسکراتے۔ میرے پاس آ کر کاپی اٹھاتے۔ صفحہ نکالتے اور میری تالیوں کے درمیان اپنا بڑا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے۔ ''سن بیٹا!'' وہ بڑی محبت سے کہتے۔ ''یہ کوئی مشکل سوال ہے!'' جونہی وہ سوال سمجھانے کے لیے ہاتھ نیچے کرتے، میں پھر تالیاں بجانے لگتا۔ ''دیکھ پھر، مَیں تیرا داؤ نہیں ہوں؟'' وہ بڑے مان سے پوچھتے۔

''نہیں!'' مَیں منہ پھاڑ کر کہتا۔

''تو اور کون ہے؟'' وہ مایوس ہو جاتے۔

''وہ بچی سرکار'' مَیں انگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا۔ ''وہ بچی سرکار، وہ سب کا پالنے والا — بول بکرے سب کا والی کون؟''

وہ میرے پاس سے اُٹھ کر جانے لگتے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا۔ ''داؤ جی خفا ہو گئے کیا؟''

وہ مسکرانے لگتے۔ ''چھوڑ طنبورے! چھوڑ بیٹا میں تو پانی پینے جا رہا تھا — مجھے پانی تو پی آنے دے۔''

مَیں جھوٹ مُوٹ بُرا مان کر کہتا۔ ''لو جی جب مجھے سوال سمجھنا ہوا داؤ جی کو پانی یاد آ گیا۔''

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے، ''اخفش اسکرائر جب تجھے چار ایکس کا مربع نظر آ رہا تھا تُو نے تیسرا فارمولا کیوں نہ لگایا اور اگر ایسا نہ بھی کرتا تو —''

اور اس کے بعد پتہ نہیں داؤ جی کتنے دن تک پانی نہ پیتے۔

فروری کے دوسرے ہفتے کی بات ہے۔ امتحان میں کل ڈیڑھ مہینہ رہ گیا تھا اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ مَیں نے خود اپنی پڑھائی پہلے سے تیز کر دی تھی اور کافی سنجیدہ ہو گیا تھا لیکن جیومیٹری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ داؤ جی نے بہت کوشش کی لیکن کچھ بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انہوں نے کہا۔ کل باون پراپوزیشنیں ہیں، زبانی یاد کر کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انہیں رٹنے میں مصروف ہو گیا لیکن جو پراپوزیشن رات کو یاد کرتا، صبح بھول جاتی۔ میں دلبرداشتہ ہو کر ہمت چھوڑ سی بیٹھا۔ ایک رات داؤ جی مجھ سے جیومیٹری کی شکلیں بنوا کر اور مشقیں سن کر اٹھے تو وہ بھی کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار اٹکا تھا اور انہیں بہت کوفت ہوئی تھی۔ مجھے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی پنسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیڑھ بجے تک لکھ لکھ کر رٹتا لگاتار رہا مگر جب کتاب بند کر کے لکھنے لگتا تو چند فقروں کے بعد اٹک جاتا۔ مجھے داؤ جی کا مایوس چہرہ یاد کر کے اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آ گیا اور میں باہر صحن میں آ کر سیڑھیوں پہ بیٹھ کے سچ مچ رونے لگا۔ گھٹنوں پر سر رکھ کے رو رہا تھا اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اس طرح بیٹھے بیٹھے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تو مَیں نے داؤ جی کی عزت بچانے کے لیے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر نکل جاؤں اور پھر واپس نہ آؤں۔ جب فیصلہ کر چکا اور عملی قدم آگے بڑھانے کے لئے سر اوپر اٹھایا تو داؤ جی کمبل اوڑھے میرے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤ جی نے میرا سر چوم کر کہا۔ ''لے بھائی طنبورے، مَیں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔ تو تو بہت ہی کم ہمت نکلا۔'' پھر انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا اور بیٹھک میں لے گئے۔ بستر میں بٹھا کر انہوں نے میرے چاروں طرف رضائی لپیٹی اور خود پاؤں اوپر کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے کہا اقلیدس چیز ہی ایسی ہے تو اس کے ہاتھوں یوں نالاں ہے۔ میں اس سے اور طرح تنگ ہوا تھا۔ حضرت مولانا کے پاس جبر و مقابلہ اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں، انہیں میں اچھی طرح سے پڑھ کر اپنی کاپیوں پر اُتار چکا تھا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جس میں الجھن ہوتی۔ میں نے یہ جانا کہ ریاضی کا ماہر ہو گیا ہوں لیکن ایک رات میں اپنی کھاٹ پر پڑا متساوی الساقین کے ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ بات الجھ گئی۔ مَیں نے دیا جلا کر شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا۔ جبر و مقابلہ کی رو سے مفروضہ کا جواب ٹھیک آتا تھا لیکن علم ہندسہ سے پایۂ ثبوت کو نہ پہنچتا تھا۔ مَیں ساری رات کاغذ سیاہ کرتا رہا لیکن تیری طرح رویا نہیں۔ علی الصبح مَیں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اپنے دستِ مبارک سے کاغذ پر شکل کھینچ کر سمجھانا شروع کیا لیکن جہاں مجھے الجھن ہوئی تھی۔ وہیں حضرت مولانا کی طبع رسائی کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمانے لگے۔ ''چنت رام، اب ہم تم کو نہیں

پڑھا سکتے۔ جب استاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی اور معلم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔'' میں نے جرأت کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جملہ کہتا ہے تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا لیکن آپ کا ہر حرف اور ہر شوشہ میرے لیے حکمِ ربانی سے کم نہیں، اس لیے خاموش ہوں۔ بھلا آقائے غزنوی کے سامنے ایاز کی کیا مجال! لیکن حضور مجھے دکھ بہت ہوا ہے۔ فرمانے لگے۔ ''تم بے حد جذباتی آدمی ہو۔ بات تو سن لی ہوتی۔'' میں نے سر جھکا کر کہا۔ ''ارشاد۔'' فرمایا ''دلّی میں حکیم ناصر علی سیستانی علم ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں۔ اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتسابِ علم کرو۔ ہم ان کے نام رقعہ لکھ دیں گے۔'' میں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا۔ ''اپنی والدہ سے پوچھ لینا، اگر وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا''۔ والدہ مرحوم سے پوچھنا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پانا انہونی بات تھی۔ چنانچہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی سے کام لیتا کہ گھر کی لپائی تپائی کر رہا ہوں۔ جب فارغ ہونگا تو والدہ سے عرض کروں گا۔ چند ایام بڑے اضطرار کی حالت میں گزرے۔ میں دن رات اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا مگر صحیح جواب برآمد نہ ہوتا۔ اس لاینحل مسئلہ سے طبیعت میں اور انتشار پیدا ہوا۔ میں دلی جانا چاہتا تھا لیکن حضور سے اجازت نہ مل سکتی تھی نہ رقعہ۔ وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں ---- ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں تیری طرح پریشان تھا تو میں نے اپنی والدہ کی پٹاری سے اس کی کل پونجی سے دو روپے چرا لیے اور نصف اس کے لیے چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی روحوں کو مجھ پر مہربان رکھے! واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور ابد تک میرا سر ان دونوں کرم فرماؤں کے سامنے ندامت سے جھکا رہے گا ---- گاؤں سے نکل کر میں حضور کی حویلی کے پیچھے ان کے مسند کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے۔ گھٹنوں کے بل ہو کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا۔ بدقسمت ہوں، بے اجازت جا رہا ہوں لیکن آپ کی دعاؤں کا عمر بھر محتاج رہوں گا۔ میرا قصور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دوں گا۔ اتنا کہہ کر اور لاٹھی کندھے پر رکھ کر وہاں سے چل دیا ---- ''سن رہا ہے؟'' داؤ جی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رضائی کے بیچ خارپشت بنے میں نے آنکھیں جھپکائیں اور ہولے سے کہا

''جی؟''

ہاتھ کر لینے دو۔'' پھر حکم ہوا۔ ''بتاؤ ہندسہ کا کون سا مسئلہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو انہوں نے اسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کُرتہ یوں اوپر کھینچ لیا کہ ان کی کمر برہنہ ہوگئی۔ پھر فرمایا ''بتاؤ اپنی انگلی سے میری کمل پر تساوی الساقین۔'' مجھ پر سکتہ کا عالم طاری تھا، نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی۔ نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحہ کے بعد بولے۔ ''میاں جلدی کرو، نابینا ہوں، کاغذ قلم کچھ نہیں سمجھتا۔'' میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی چکلی کمر پر کانپتے ہوئے انگلی سے تساوی الساقین بنانے لگا۔ جب وہ غیر مرئی شکل بن چکی تو بولے ''اب نقطہ س سے خط ب ج پر عمود گراؤ۔'' ایک تو مَیں گھبرایا ہوا تھا، دوسرے وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یونہی انگل سے میں نے ایک مقام پر انگلی رکھ کر عمود گرانا چاہا تو تیزی سے بولے'' ہے ہے، کیا کرتے ہو۔ یہ نقطہ س ہے کیا؟'' پھر خود ہی بولے۔'' آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے بائیں کندھے سے کوئی چھ انگل نیچے نقطہ س ہے۔ وہاں سے خط کھینچو۔۔۔ ''اللہ اکبر اللہ اکبر۔ کیا علم تھا، کیا آواز تھی اور کیسی تیز فہم تھی۔ وہ بول رہے تھے اور مَیں مبہوت بیٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی لکیریں تساوی الساقین بن کر ان کی کمر پر ابھر آئیں گی۔ پھر داؤجی دلّی کے دنوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا داؤجی؟'' انہوں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''رات بہت گزر چکی ہے، اب تو سو جا، پھر بتاؤں گا۔'' مَیں ضدی بچے کی طرح ان کے پیچھے پڑ گیا تو انہوں نے کہا۔ ''پہلے وعدہ کر کہ آئندہ مایوس نہیں ہوگا اور ان چھوٹی چھوٹی پرابوزیشنوں کو بتاشے سمجھے گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''حلوا سمجھوں گا، آپ فکر نہ کریں۔'' انہوں نے کھڑے کھڑے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''بس مختصر یہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی حضوری میں رہا اور اس بحرِ علم سے چند قطرے حاصل کر کے اپنی کور آنکھوں کو دھویا۔ واپسی پر مَیں سیدھا اپنے آقا کی خدمت میں پہنچا اور ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔'' فرمانے لگے۔ ''چنت رام! اگر ہم میں قوت ہوتو ان پاؤں کو کھینچ لیں۔'' اس پر مَیں رو دیا تو دستِ محبت میرے سر پر پھیر کر کہنے لگے۔ ''ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فرقت بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا۔'' یہ کہتے ہوئے داؤجی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ مجھے اسی طرح گُم صُم چھوڑ کر بیٹھک سے باہر نکل گئے۔

امتحان کی قربت سے میرا خون خشک ہو رہا تھا لیکن جسم پھول رہا تھا۔ داؤجی کو میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی۔ اکثر میرے تھن متھنے ہاتھ پکڑ کر کہتے۔ ''اسپ تازی بن طویلہ، خر نہ بن۔'' مجھے ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گزرتا اور میں احتجاجاً ان سے کلام بند کر دیتا۔ میرے مسلسل مرن برت نے بھی ان پر کوئی اثر نہ کیا اور ان کی فکر اندیشہ کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک صبح سیر کو جانے سے پہلے انہوں نے مجھے آ جگایا اور میری منتوں، خوشامدوں، گالیوں اور جھڑکیوں کے باوجود بستر سے اٹھا، کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا، پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ سردیوں کی صبح کوئی چار کا عمل۔ گلی میں نہ آدم نہ آدم زاد، تاریکی سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور داؤجی مجھے اسی طرح سیر کو لے جا رہے تھے۔ میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے۔'' ابھی گراں خوابی دور نہیں ہوئی، ابھی طنبورہ بڑبڑا رہا ہے۔'' تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کہتے۔'' کوئی سُر نکال طنبورے، کسی آہنگ پر بج، یہ کیا کر رہا ہے؟'' جب ہم بستی سے بہت دور نکل گئے اور صبح کی یخ ہوا نے میری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو داؤجی نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ سرداروں کا رہٹ آیا اور نکل گیا۔ ندی آئی اور پیچھے رہ گئی۔ قبرستان گزر گیا مگر داؤجی تھے کہ کچھ آیتیں سی پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جب تھیہ پر پہنچے تو میری روح فنا ہوگئی۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے وقت بھی نہ گزرتے تھے کیونکہ پرانے زمانے میں یہاں ایک شہر غرق ہوا تھا۔ مرنے والوں کی روحیں اس ٹیلے پر رہتی تھیں اور ہر آنے جانے والوں کا کلیجہ چبا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو داؤجی نے میرے گلے کے گرد مفلر اچھی طرح لپیٹ کر کہا۔ کہ سامنے ان دو کیکروں کے درمیان اپنی پوری رفتار سے دس چکر لگاؤ، پھر سو لمبی سانسیں کھینچو اور چھوڑو، تب میرے پاس آؤ۔ میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ میں تھیہ سے جان بچانے کے لیے سیدھا ان کیکروں کی طرف روانہ ہوگیا۔ پہلے ایک بڑے ڈھیلے پر بیٹھ کر آرام کیا اور ساتھ ہی حساب لگایا کہ چھ چکروں کا وقت گزر چکا ہوگا، اس کے بعد آہستہ آہستہ اونٹ کی طرح کیکروں کے درمیان دوڑنے لگا اور جب دس یعنی چار چکر پورے ہوگئے تو پھر اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا۔ ایک تو درختوں پر عجیب و غریب قسم کے جانور بولنے لگے تھے۔ دوسری میری پسلی میں بلا کا درد

شروع ہوگیا تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ تھیہ پر جا کر داؤ جی سوئے ہوئے کو اٹھاؤں اور گھر لے جا کر خوب خاطر کروں۔ غصہ سے بھرا اور دہشت سے لرزتا میں ٹیلے کے پاس پہنچا۔ داؤ جی تھیہ کی ٹھیکروں پر گھٹنوں کے بل گرے ہوئے دیوانوں کی طرح سر مار رہے تھے اور اونچے اونچے اپنا محبوب شعر گا رہے تھے۔

جفا کم کن کہ فردا روزِ محشر

بہ پیشِ عاشقاں شرمندہ باشی!

کبھی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے اور سر اوپر اٹھا کر انگشت شہادت فضا میں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہوا اور اس سے کہہ رہے ہوں، دیکھ لو، سوچ لو۔ میں تمہیں ــــ میں تمہیں بتا رہا ہوں ــــ سنا رہا ہوں ــــ ایک دھمکی دیئے جاتے تھے۔ پھر تڑپ کر ٹھیکریوں پر گرتے اور جفا کم کن جفا کم کن کہتے ہوئے رونے سے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر زور سے چیخ مار کر بجائے قصبہ کی طرف بھاگنے کے پھر کیکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داؤ جی ضرور اسم اعظم جانتے تھے اور وہ جن قابو کر رہے تھے۔ مَیں نے اپنی آنکھوں سے ایک جن ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل الف لیلہ، باتصویر والا جن تھا۔ جب داؤ جی کا طلسم اس پر نہ چل سکا تو اس نے انہیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے۔ جفا کم کن جفا کم کن مگر وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا ــــ تھوڑی دیر بعد داؤ جی آئے۔ انہوں نے پہلے جیسا چہرا بنا کر کہا۔ ''چل طنبورے'' اور مَیں ڈرتا ڈرتا ان کے پیچھے ہولیا۔ راستہ میں انہوں نے گلے میں لٹکتی ہوئی کھلی پگڑی کے دونوں کونے ہاتھ میں پکڑ لیے اور جھوم جھوم کر گانے لگے

تیرے لے لے وال فرید اتریا تریا جا!

اس جادوگر کے پیچھے چلتے ہوئے مَیں نے ان آنکھوں سے واقعی انہیں دیکھا کہ اس کا سر تبدیل ہوگیا۔ اس کی لمبی لمبی زلفیں کندھوں پر جھولنے لگیں اور اس کا سارا وجود جٹا دھاری ہوگیا ــــ اس کے بعد چاہے کوئی میری بوٹی بوٹی اڑا دیتا، میں ان کے ساتھ سیر کو نہ گیا۔

اس واقعے کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اور اینٹوں کے ٹکڑے آ کر گرنے لگے۔ بے بے نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بچّوں والی کتیا کی طرح داؤ جی سے چمٹ گئی۔ سچ مچ ان سے لپٹ گئی اور انہیں دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ چلّا رہی تھیں۔ ''بڈھے ٹونکی! یہ سب تیرے منتر ہیں۔ یہ سب تیری فارسی ہے۔ تیرا کالا علم ہے جو الٹا ہمارے سر پر آ گیا ہے۔ تیرے پریت میرے گھر میں اینٹیں پھینکتے ہیں، اجاڑ مانگتے ہیں، موت چاہتے ہیں۔'' پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی۔ ''مَیں مر گئی، مَیں جل گئی لوگو۔ اس بڈھے نے میرے امی چند کی جان لینے کا پربندھ کیا ہے۔ مجھ پر جادو کیا ہے۔ میرا انگ انگ توڑ دیا ہے۔'' امی چند تو داؤ جی کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا اور اس کی جان کے دشمن بھلا وہ کیونکر ہو سکتے تھے لیکن جنوں کی خشت باری انہیں کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ جب مَیں نے بھی بے بے کی تائید کی تو داؤ جی نے زندگی میں پہلی بار مجھے جھڑک کر کہا۔ ''تو احمق ہے اور تیری بے بے اُمّ الجاہلین ــــ میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ تو جنوں بھوتوں پر اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا۔ اے وائے کہ تو شعور کے بجائے عورتوں کے اعتقاد کا غلام نکلا۔ افسوس ــــ صد افسوس'' بے بے کو اسی طرح چلّاتے اور داؤ جی کو یوں کراہتے چھوڑ کر میں اوپر کوٹھے پر دھوپ میں جا بیٹھا ــــ اسی دن شام کو جب میں اپنے گھر سے آ رہا تھا تو راستہ میں رانو نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ کانی کر کے پوچھا۔ ''سنا بابو تیرے تو کوئی اینٹ ڈھیلا تو نہیں لگا؟ سنا ہے تمہارے پنڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں۔'' مَیں نے اس کمینے کے منہ لگنا پسند نہ کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہوگیا۔ رات کے وقت داؤ جی مجھ سے جیومیٹری کی پراپوزیشنیں سنتے ہوئے پوچھنے لگے۔ ''بیٹا کیا تم سچ مچ جن بھوت یا پری چڑیل کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑے اور بولے۔ ''واقعی تو بہت بھولا ہے۔ میں نے آج خواہ مخواہ تجھے جھڑک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ جن ہوتے ہیں اور اس طرح اینٹیں پھینک سکتے ہیں۔ ہم نے جو ولی مستری اور پھتے مزدور کو لگا کر برساتی بنوائی ہے، وہ تیرے کسی جن کو کہہ کر بنوا لیتے لیکن یہ بتا کہ جن صرف اینٹیں پھینکنے ہی کا کام کرتے

ہیں کہ چتائی بھی جانتے ہیں؟" مَیں نے جل کر کہا۔ "جتنے مذاق چاہو کر لو مگر جس دن سر پھٹے گا، اس دن پتہ چلے گا داؤ۔" داؤ جی نے کہا۔ "تیرے جن کی پھینکی ہوئی اینٹ سے تو تا قیامت سر نہیں پھٹ سکتا، اس لیے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اینٹ اٹھائی جا سکے گی اور نہ میرے تیرے یا تیری بے بے کے سر میں لگے گی۔"

پھر بولے۔ "سُن! علم طبعی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جا سکتی — سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا؟" مَیں نے چڑ کر کہا۔

ہمارے قصبے میں ہائی سکول ضرور تھا لیکن میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہ تھا۔ امتحان دینے کے لیے ہمیں ضلع جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ صبح آ گئی جب ہماری جماعت امتحان دینے کے لیے ضلع جا رہی تھی اور لاری کے ارد گرد والدین قسم کے لوگوں کا ایک ہجوم تھا اور اس ہجوم سے داؤ جی کیسے پیچھے رہ سکتے تھے اور سب لڑکوں کے گھر والے انہیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے اور داؤ جی سارے سال کی پڑھائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات سے اُچھل کر موسم کے تغیر تبدل پر پہنچ جاتے۔ وہاں سے پلٹتے تو "اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا کہ اپنی وضع سے ہندو معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشہ میں چُور رہتا۔ ایک عورت —"

"جہانگیر۔" مَیں نے جواب دیا۔ "اور وہ عورت؟" "نور جہاں۔" ہم دونوں ایک ساتھ بولے — "صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟" مَیں نے دونوں کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے "مثالیں؟" میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے اور مَیں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا تو گھوم کر کھڑکی کے پاس آ گئے اور پوچھنے لگے۔ بریک ان اور بریک اِن ٹو کو فقروں میں استعمال کرو۔ ان کا استعمال بھی ہو گیا اور موٹر سٹارٹ ہو کر چلی تو اس کے ساتھ ساتھ قدم اٹھا کر بولے۔ "طنبورے مادیاں گھوڑی ماکیاں مرغی — مادیاں گھوڑی — ماکیاں — مرغی — ایک سال بعد خدا خدا کر کے یہ آواز دور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا۔"

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دوسرے دن جغرافیہ کا اس سے بڑھ کر۔ تیسرے دن اتوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی۔ اتوار کی صبح داؤ جی کا کئی صفحہ لمبا خط ملا جس میں الجبرے کے فارمولوں اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ کوئی اور بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں مَیں نے لڑکوں سے جوابات ملائے تو سو میں سے اسی نمبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے منہ سے مسرت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جونہی میں نے برآمدے سے پاؤں باہر رکھا، داؤ جی کھیس کندھے پر ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں چیخ مار کر ان سے لپٹ گیا اور "اسی نمبر! اسی نمبر" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر تلخی سے پوچھا۔ "کون سا سوال غلط ہو گیا؟" میں نے جھوم کر کہا۔ "چار دیواری والا۔" جھلا کر بولے۔ "تو نے کھڑکیاں اور دروازے منفی نہیں کئے ہوں گے۔" مَیں نے ان کی کمر پر ہاتھ ڈال کر پیڑ کی طرح جھلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں جی ہاں — گولی مارو کھڑکیوں کو۔" داؤ جی ڈوبی ہوئی آواز میں بولے۔ "تو نے مجھے برباد کر دیا طنبورے۔ سال کے تین سو پینسٹھ دن میں پکار پکار کر کہتا رہا۔ مسطحات کا سوال آنکھیں کھول کر حل کرنا مگر تُو نے میری بات نہ مانی۔ تُو نے میری بات نہ مانی۔ بیس نمبر ضائع کیے — پورے بیس نمبر۔" اور داؤ جی کا چہرہ دیکھ کر میری اسی فیصدی کامیابی بیس فیصدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ راستہ بھر وہ اپنے آپ سے کہتے رہے۔ "اگر ممتحن دل کا اچھا ہوا تو ایک نمبر وہ ضرور دے گا۔ تیرا باقی حل تو ٹھیک ہے۔" اس پرچے کے بعد داؤ جی امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے۔ وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی اور اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے یہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے پھر آ جاتے اور کمرۂ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

ان کے پھندے میں آنے والا نہ تھا۔ [illegible]

چھوڑیئے، ان سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا، انہوں نے کہا، اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔ میں نے کچھ جواب دیا، فرمایا اس کی ترکیب نحوی کرو۔ حوالداروں کی گائے اندر گھس آئی، میں اسے لکڑی سے باہر نکال رہا ہوں اور داؤجی پوچھ رہے ہیں Cow ناؤن ہے یا ورب۔ اب ہر عقل کا اندھا پانچویں جماعت تک پڑھا، جانتا ہے کہ گائے اسم ہے مگر داؤجی فرما رہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور فعل بھی۔ To cow کا مطلب ہے ڈرانا، دھمکی دینا اور یہ ان دنوں کی باتیں ہیں جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا۔۔۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا جب ہم چند دوست شکار کھیلنے کے لیے نکلے تو مَیں نے ان سے درخواست کی کہ منشفی سے آگے نہ جائیں کیونکہ وہاں داؤجی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار بندوق اور کارتوسوں کے محاورے پوچھنے لگیں گے۔ بازار میں دکھائی دے جاتے تو میں کسی بغلی گلی میں گھس جاتا۔ گھر پر رسماً ملنے جاتا تو بے بے سے زیادہ اور داؤجی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر کہا کرتے ''افسوس آفتاب بیٹے کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے۔'' مَیں شرارتاً کھلکھلا کر ہنسنے لگتا۔

جس دن نتیجہ نکلا اور ابا جی لڈوؤں کی ایک چھوٹی سی ٹوکری لے کر ان کے گھر گئے۔ داؤجی سر جھکائے اپنے حصیر پر بیٹھے تھے۔ ابا جی کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر سے کرسی اٹھا لائے اور اپنے بوریے کے پاس ڈال کر بولے۔ ''ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقسوم کی خوبی سمجھئے۔ میرا خیال تھا کہ اس کی فرسٹ ڈویژن آ جائے گی لیکن نہ آ سکی۔ بنیاد کمزور تھی۔۔۔''

''ایک ہی تو نمبر کم ہے۔'' مَیں نے چہک کر بات کاٹی۔''

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔ ''تو نہیں جانتا، اس ایک نمبر سے میرا ادل دو نیم ہو گیا ہے۔ خیر میں اسے منجانب اللہ خیال کرتا ہوں۔''

پھر ابا جی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ گپیں لڑانے میں مشغول ہو گیا۔

اوّل اوّل کالج سے میں داؤجی کے خطوں کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے قاعدگی سے لکھنے لگا اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

چھٹیوں میں جب گھر آتا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا ویسے ہی داؤجی کو بھی سلام کرتا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹ پتلون اور ٹائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتے۔ کہا کرتے اگر مجھے اٹھانے نہیں دیتا تو خود کرسی لے لے اور میں کرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لائبریری سے جو کتابیں ساتھ لایا کرتا، انہیں دیکھنے کی تمنا ضرور کرتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آ کر کتابیں دیکھ جاتے۔ امی چند بوجوہ کالج چھوڑ کر بینک میں ملازم ہو گیا تھا اور دلی چلا گیا تھا۔ بے بے کی سلائی کا کام بدستور تھا۔ داؤجی بھی منشفی جاتے تھے لیکن کچھ نہ لاتے تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے اور وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔۔۔ کالج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤجی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ آپو ٹاپو کھیلا کرتی تھیں، بنت عم بن گئی تھیں۔ سیکنڈ ائیر کے زمانے کی ہر چھٹی مَیں آپو ٹاپو میں گزارنے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی مختصر مسافت کے سامنے ایبٹ آباد کا طویل سفر زیادہ تسکین دہ اور سہانا بن گیا، انہی ایام میں مَیں نے پہلی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی پیڈ اور ایسے ہی لفافوں کا ایک پیکٹ خریدا تھا اور ان پر نہ ابا جی کو خط لکھے جا سکتے تھے اور نہ ہی داؤجی کو۔۔۔ نہ دسہرے کی چھٹیوں میں داؤجی سے ملاقات ہو سکی، نہ کرسمس کی تعطیلات میں۔ ایسے ہی گزر گیا اور یوں ہی ایام گزرتے رہے۔

--- ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ بلوے ہوئے۔ پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ہر طرف فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں نے ہم سب کو گھر بلوالیا۔ ہمارے لیے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ بنیے ساہوکار گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آزادی مل گئی! ایک دن ہمارے قصبہ میں بھی چند گھروں کو آگ لگی اور دوناکوں پر سخت لڑائی ہوئی۔ تھانے والوں اور ملٹری کے سپائیوں نے کرفیو لگا دیا اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو سکھ قصبہ چھوڑ کر چل دیئے۔ دوپہر کو اماں نے مجھے داؤ جی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس جانی پہچانی گلی میں عجیب و غریب اجنبی صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر یعنی داؤ جی کے گھر کی ڈیوڑھی پر ایک بیل بندھا تھا اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ مَیں نے گھر آ کر بتایا کہ داؤ جی اور بے بے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور اب لوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤ جی ایسے بے وفا نہ تھے! کوئی تیسرے روز غروب آفتاب کے بہت بعد جب مسجد میں نئے پناہ گزینوں کے نام نوٹ کر کے اور کمبل بھجوانے کا وعدہ کر کے اس گلی سے گزرا تو کھلے میدان میں سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ دیکھی۔ مہاجر لڑکے لاٹھیاں پکڑے نعرے لگا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے تماشائیوں کو پھاڑ کر مرکز میں گھسنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا" ساتھ کے گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ جب لوٹا تو اپنے گھر میں گھستا چلا گیا۔"

"کون سے گھر میں؟" بزرگ نے پوچھا۔

"ربتکی مہاجروں کے گھر میں۔" لڑکے نے کہا۔

"پھر؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"پھر کیا؟ انہوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو ہندو نکلا۔"

اتنے میں اس بھیڑ سے کسی نے چلا کر کہا۔ "اوئے رانو جلدی آ۔ اوئے جلدی آ--- تیری سامی--- پنڈت--- تیری سامی۔"

رانو بکریوں کا ریوڑ باڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ انہوں روک کر اور ایک لاٹھی والے لڑکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ جیسے انہوں نے داؤ جی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے ملزم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا۔ "یہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی ہے--- اسے کچھ مت کہو--- یہ تو--- یہ تو" خون میں نہائی ہوئی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور ایک نوجوان گنڈاسی تول کر بولا۔

"بتاؤں تجھے بھی!--- آ گیا بڑا احمایتی بن کر--- تیرے ساتھ کچھ ہُوا نہیں نا۔" اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا" انصار ہو گا شاید۔"

مَیں ڈر کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ رانو کی قیادت میں اس کے دوست داؤ جی کو گھیرے کھڑے تھے اور رانو، داؤ جی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ "اب بول بیٹا اب بول۔" اور داؤ جی خاموش کھڑے تھے۔ ایک لڑکے نے ان کی پگڑی اتار کر کہا۔ "پہلے بودی کاٹو بودی۔" اور رانوں نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داؤ جی کی بودی کاٹ دی، وہی لڑکا پھر بولا۔ "بلا دیں ہے؟" اور رانو نے کہا۔ "جانے دو بڈھا ہے میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا۔" پھر اس نے داؤ جی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کلمہ پڑھ پنڈتا۔" اور داؤ جی آہستہ سے بولے

"کونسا؟"

رانو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا۔

"سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں!"

جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ "چل بکریاں تیرا انتظاری کرتی ہیں۔"

اور ننگے سر داؤ جی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریدا چل رہا ہو!

○○○

الطاف فاطمہ

سون گڑیاں

تب وہ دن بھر کی تھکی ماری دبے پاؤں اس کوٹھڑی کی طرف بڑھتی، جہاں دن بھر اور رات گئے تک کام خدمت میں مصروف رہنے کے بعد آرام کرتی اور پھر ایک بار ادھر ادھر نظر ڈالنے کے بعد کہ آس پاس کوئی جاگتا یا دیکھتا تو نہیں، وہ کوٹھڑی کے کواڑ بند کر لیتی، طاق پر سے ڈبہ اٹھاتی، اور کھول کر کوٹھڑی کے بیچوں بیچ دھر دیتی، اور پھر یکے بعد دیگرے گڑیاں نکل نکل کر اپنے اپنے کار سے لگ جاتیں۔ پہلے سقہ آتا، اور پانی چھڑک جاتا۔ پھر خاکروب آتا، اور جھاڑو لگا جاتا۔ فراش فرش بچھاتا۔ مسند تکیہ لگاتا، محفل سج جاتی، تب سون گڑیاں زرق برق لباسوں میں نمودار ہوتیں، اور رقص وسرود، ناؤنوش کی محفل گرم ہوتی۔ تمام رات یوں گزرتی، اور صبح کا ستارہ ڈوبنے سے پہلے سون گڑیاں بے دم ہو کر گر پڑتیں۔ محفل درہم برہم ہوتی، اور جو جہاں ہوتا، وہیں رہ جاتا۔

تب وہ بی بی سرد آہ بھرتی۔ گڑیوں کو سمیٹ کر ڈبے میں رکھتی اور کہتی:

''جو بی بی تھی، لونڈی بنی، جو لونڈی تھی سو بی بی بنی۔''

تو بس میں یہ کہانی یہیں تک سن پاتا تھا کہ بے سدھ ہو جاتا تھا۔ ہر رات میں نے اس امید پر یہ کہانی سننے کی ضد کی۔ کبھی تو سون گڑیوں کے انجام تک کہانی پہنچے ہی گی، اور ہر رات میں اس بی بی کے اس فقرے تک پہنچتے پہنچتے قصہ کہانی اور پریوں کے اصل دیس یعنی خواب کی دنیا میں پہنچ جاتا۔

اور اب ذہن میں اتنی دیکھی اور اَن دیکھی، سنی اور اَن سنی کہانیاں گڈمڈ ہیں کہ میں خود یہ تمیز نہیں کر پاتا کہ ان میں سے کون سی کہانیاں میں نے سنی ہیں، اور کون سی دیکھی ہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرے اندر اب حقیقتیں بھی کہانی بن کر آتی ہیں، اور اب نہیں کہہ سکتا کہ آگے جو بات میں بیان کروں گا وہ کسی کہانی، کس داستان کا حصہ ہے۔ یہ کہانی اگر مجھے کسی نے نہیں سنائی، تو پھر یہ میرے اندر کہاں سے آئی ہے، اور یہ قصہ میرے اندر کچھ اس انداز میں سر اٹھاتا ہے۔

''وہ کہ اس ویرانے میں دشت نوردی کرتا تھا۔ بھوک لگتی تھی تو کھجور کے چند دانے نوش فرماتا، اور چھاگل سے چند گھونٹ پانی لے کر حلق تر کرتا، اور پھر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتا ہی چلا جاتا کہ ایسے ویرانوں میں آسمان اور بھی نیلا اور پُر اسرار نظر آتا ہے...... پھر یوں ہوا کہ ایک صبح وہ یونہی فرش ریگ پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا کہ پچھم یعنی مغرب کی جانب سے ایک آہنی چڑیا پرواز کرتی ہوئی اس طرف آئی، اور حد نظر کے اس طرف ٹھہر گئی۔ پھر ایک مرد سفید فام گندم گوں بالوں اور کنجی آنکھوں والا اس کی طرف تیز قدموں چلتا ہوا آیا...... اور اس کی پھیلی ہوئی ٹانگ کو اپنی چھڑی سے چھو کر یوں گویا ہوا۔

اے جوانِ رعنا۔ یوں ٹانگ پسار کر بے فکری سے بیٹھا ہے۔ اُٹھ کہ تیری دولت اس ریگ زار کے قلب میں موجیں مار رہی ہے۔ اٹھ کہ تیری جبیں ستارۂ ہوش مندی...... نہیں میں بھولا۔ ستارۂ مراد مندی سے دمک رہی ہے۔ اے حاتم! مژدہ ہو کہ تو دونوں ہاتھوں سے دولت لٹائے گا اور اپنے کاسہ لیسوں کی حرص و آز کا تماشہ کرے گا۔

تب وہ جوان نہایت حقارت سے یوں گویا ہوا کہ تیری تمام باتوں سے جھوٹ اور مکر کی بُو آتی ہے۔ اول تو یہ کہ یہ عاجز عمر کے اس دور کو طے کر چکا ہے، جبکہ اس کو جوانِ رعنا کے لقب سے مخاطب کیا جائے۔ دوم یہ کہ تو نے مجھے حاتم کے نام سے پکارا کہ حاتم نام ایک شخص ہو گزرا ہے۔ بہت پہلے قبیلۂ طے میں کہ اس کی داد و دہش کا چرچا سارے مشرق میں ہے۔ کہاں حاتم طائی، کہاں یہ عاجز و بے نوا، تب وہ سفید فام اس کی حقارت پر بڑے صبر سے مسکرایا، اور گویا ہوا مرد دانا کی بات کو مان۔ چون وچرا سے کام نہ لے۔ تیرے حصے کی دولت اور رعنائی کو ڈھونڈنا میرا کام ہے، اور تیرا کام فقط اس کو دونوں ہاتھوں سے لٹانا اور اس درجہ پھینکنا ہے کہ حاتم طائی کو بھی شرما دے تو مجھے فقط اتنی اجازت دے کہ میں تیری دولت کی تلاش میں کنوؤں میں بانس ڈالوں، اور ان کو اچھی طرح کھنگالوں۔''

روزگاری کے اعداد و شمار کیا ہیں۔
۲۔ آپ کو دھکا دے کر اس دروازے میں داخل کرنے والا کوئی نہ تھا۔
۳۔ عرصے تک بیمار رہنے کی بناء پر آپ کے اعصاب مشتعل یا پھر مضمحل ہو چکے ہیں اور ایسی صورت میں ہم آپ کو ملک وقوم کی خدمت کا اہل نہیں سمجھتے۔
خلاصہ یہ کہ ہمیں افسوس ہے۔
اور واقعہ یہ ہے کہ افسوس تو مجھے بھی تھا کہ اب مجھ میں سوتیلے چچا کی وہ چُبھتی ہوئی نظریں برداشت کرنے کی قوت بھی گھٹتی جا رہی تھی۔ وہ مجھ پر اس لیے ڈالتے تھے کہ میرے دونوں ٹیوشنوں کی مجموعی آمدنی صرف تیس روپے بنتی تھی، اور یہ کہ مکان کا سارا کرایہ ان ہی کو دینا پڑتا تھا۔ ہم نے بجلی کے بل بھی ایک مدت سے ادا نہیں کیے تھے، اور سب سے زیادہ یہ کہ جب ہم ماں بیٹا ان ہی کی چھت تلے بیٹھ کر بغیر بگھری دال سے تندوری روٹیاں کھاتے تھے، تو ان کے وقار کو صدمہ پہنچتا تھا۔ چنانچہ وہ میرے دل سے بہی خواہ تھے، اور یہ ان کی دلی آرزو تھی کہ میرے کھانے میں کم سے کم ڈالڈا گھی ہی شامل ہو۔
تو یہ ٹھیک ہی تھا کہ وہ ان دنوں میری ماں پر بُری طرح گرجتے برستے تھے کہ اپنے ساتھ لڑکے کا دماغ بھی عرش معلّٰی پر پہنچا رہی ہے، اور جو یہ سوچو کہ میرے لڑکے کی برابری کرو، تو میرے لڑکے کی بات اور ہے میں نے ان پر احسان کیا تھا۔ بس احسان ہی سمجھو۔ وہ احسان کی تفصیلات میں جانے سے انکاری تھے۔
تو انہوں نے یہ گرما گرمی جن دنوں دکھائی، ان دنوں شہر میں ایک عجیب و غریب ہوٹل کھلنے کا چرچا تھا، کہ اس کے متعلق جو بھی بات سنی، ایسی کہ یقین نہ آئے۔ ایسے جیسے احمقوں کی خیالی جنت کی بات، اور چچا نے اپنی یا میری اس جنت کا ذکر کئی دن اس طرح لگاتار کیا کہ مجھے ان کی اور اپنی دونوں ہی کی دماغی صحت پر شک ہونے لگا۔ اور پھر ایک دن وہ آیا کہ وہ میری ماں پر پچھلے تمام دنوں سے زیادہ بڑھ چڑھ کر گرجے برسے، اور پھر انہوں نے ان کو دھمکی دی کہ عدم تعاون کی صورت میں ان کا آخری فعل یہ ہوگا کہ وہ ہمارا سامان اٹھا کر گلی میں پھینک دیں گے۔
چنانچہ پھر خشک ہونٹوں، سوکھی آنکھوں اور تھرتھراتے جسم کے ساتھ ماں نے عہد کیا کہ وہ جس بات میں ان کا تعاون مانگتے ہیں، وہ ان کو ملے گا۔ البتہ بات تو پتہ چلے کہ کیا ہے۔
چنانچہ وہ بات یہ پتہ چلی کی بھرتی ہونے کے بعد میں اپنا چھوٹا سا ٹرنک اٹھا کر تیز گام کی تلاش میں اسٹیشن کی جانب روانہ ہوا،

تا کہ بڑے شہر جا کر اس بڑے ہوٹل میں ویٹر اور بٹلر کی باقاعدہ تربیت لینے اور بحیثیت اپرنٹس کام کرنے کے بعد یہاں واپس آ کر اپنے اس معزز عہدے کا چارج سنبھالوں کہ ایک تھرڈ ڈویژن میں پاس گریجویٹ تو اس تنخواہ کا تصور خواب وخیال میں بھی نہیں کر سکتا۔

تب میں نے اس شہر کی جاگتی جگاتی راتوں میں بارہا سون گڑیوں کی کہانی کو نہیں معلوم کہ سنا، دیکھا یا سوچا تھا، اور میرا خیال تھا کہ یہ سون گڑیاں اور ان کا خیال مجھے فقط اسی شہر کی روشن راتوں میں ستاتا ہے، جس کی سڑکیں اور شاہراہیں دن کو نسبتاً خاموش اور چپ چاپ نظر آتی ہیں۔

میں اس نئی زندگی میں خاصا فِٹ ہوگیا تھا، اس لیے کہ اب وہ سیٹ پر سے گھسی ہوئی پتلون میں نے ایک سائل کو دے دی تھی، اور مارکیٹ کی دوکانوں میں بجی رہنے والی کئی پتلونیں اب میری اپنی ملکیت تھیں، اور پھر یہ کہ ٹریننگ اور کام کے دوران ہم کو عجیب وغریب قطع کی اور رنگوں کی یونیفارم پہننے کو ملتی تھیں جن میں ہمارے رنگ وروپ تو خاصے چمک جاتے تھے، لیکن ان کو پہن کر ہم میں سے اکثر کو اپنے اسکول اور کالج کے دنوں میں مسخروں اور احمقوں کے وہ بہروپ اور لباس یاد آ جاتے تھے، جن کو پہن کر ہم کالج اسٹیج پر دندناتے پھرتے تھے، اور ناظرین پر اپنے ٹیلنٹ (TALENT) کی دھاک بٹھایا کرتے۔ چند خردماغ لڑکے ہمارے تربیتی گروپ میں ایسے بھی شامل تھے جو اس رنگارنگ یونیفارم کو نہ پہننے اور محض سفید قمیض پتلون میں سروس کرنے پر مصر ہوئے۔ یہ ایک اچھا خاصا ہنگامہ رہا، تاوقتیکہ ان کے ہاتھ میں برخواستگی کے پروانے نہ تھما دیئے گئے۔ ہم جیسوں نے ان کو حیرت کی نظر سے دیکھا کہ وہ اپنی مارکیٹ سے خریدی پتلونوں کے بنڈل سمیت اس وسیع وعریض شہر کی سڑکوں پر دھکے کھانے روانہ ہو گئے۔

تو چنانچہ ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں چند سو روپوں کے علاوہ کٹ پیس کے کئی اچھے ٹکڑوں اور احمد کے حلوے سمیت پھر اپنے شہر واپس آیا، اور دوسرے دن اپنی والدہ سمیت اس موجودہ فلیٹ یعنی دو کمروں میں منتقل ہو گیا۔

اس فلیٹ کے فرش صاف ہیں، اور اس میں ایک نئے بنے ہوئے نعمت خانے میں کئی طرح کی کھانے کی چیزیں رکھی مل جاتی ہیں۔ دیوار میں جو الماریاں ہیں، اس میں سچ مچ کے کپڑے یعنی میرے اپنے خریدے اور سلوائے ہوئے لباس موجود ہیں۔ مگر اب قصہ یہ ہے کہ اب فرزانہ مجھ سے نہیں ملتی۔ پہلے وہ چچا کے گھر آتی تھی تو میں اس کے ڈر سے اپنے پرانے جوتے اور خستہ کوٹ چھپاتا پھرتا تھا، اور اب تو میرے دو جوڑے جوتے سامنے ہی شو ریک پر رکھے ہوتے ہیں، اور میرا اوورکوٹ سامنے کھونٹی پر ٹنگا ہوا ہے۔

مگر فرزانہ بدستور ناراض ہے۔

وہ مجھے ملتی تو میں اس سے کہتا، آؤ میں تمہیں سون گڑیوں کی کہانی سناؤں۔ مگر یہ کچھ ایسا چلتا پھرتا وقت ہے کہ کون کسی کی سنتا ہے، اور کون سننے کے قابل بات بولتا ہے۔ اور اب تو مجھے اتنی بھی تمیز نہیں کہ کون سی کہانی سنی تھی، کون سی دیکھی تھی اور کون سی خود سوچی تھی۔

زندگی کی رواروی میں ساری کہانیاں گڈمڈ ہو رہی ہیں، اور ہم صبح سے رات تک مختلف شفٹوں کی شکل میں رنگ برنگی مسخری مسخری وردیوں میں بے تحاشا کھانوں سے لبریز ظروف سے لدی پھندی میزوں کے اردگرد منڈلاتے اور کھانے والوں کو چندھیاتے رہتے ہیں جو اس فکر میں رہتے ہیں کہ کس طرح اپنے دس روپے فی کس کو زیادہ سے زیادہ وصول کر لیں۔

ہم یہاں کھانے والوں کو چندھائیں، یا پھر ان کے سامانوں اور مقفل کمروں کے رکھ رکھاؤ کا خیال رکھیں، جو ادھر سوئمنگ پول کے ادھر ادھر رنگ برنگی کرسیوں پر کم لباسی اور بے فکری کے ساتھ دھوپ میں پڑے (TAN) ہو رہے ہیں، یعنی اپنے آپ کو بھورا کر رہے ہیں، مگر کیوں؟ گندم گوں بالوں، کنجی آنکھوں والے سفید فام کس خبط میں مبتلا ہیں؟ میں نے ابھی ابھی سوچا تھا، اور ساتھ ہی میرے ذہن میں وہ کہانی ابھری ہے۔ میں اور میرے ساتھی جو ہر وقت اس خوف میں مبتلا ہیں کہ کبھی کہیں ان میزوں پر آ کر وہ لوگ نہ بیٹھ جائیں جو ہمارے ہم جماعت، ہم پیالہ وہم نوالہ ہوا کرتے تھے، تو پھر اس خیال سے بچنے کے لیے ہم خوب سوچتے ہیں، حتیٰ کہ چیزیں جو ہمیں پکڑائی جاتی ہیں، ہمارے ہاتھوں سے پھسل پھسل جاتی ہیں۔

تو چنانچہ پھر وہ کہانی یوں گڈمڈ ہوئی کہ ان دنوں میں حاتم دوراں کی آمد آمد کا غلغلہ بلند ہوا کہ اس کو کسی مرد دانا نے مژدہ دیا تھا۔ اور دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹانے کی تلقین کی تھی۔ پھر اس کا شکار یہ ٹھہرا کہ سردیاں گرم مشرقی علاقوں کے سیر وشکار میں

ان سون گڑیوں کو دیکھو کہ دن کے اجالے اور شام کے جھٹ پٹے میں بے محابا محفلیں برپا کرتی ہیں اور کسی کو ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کرے کہ کوئی دیکھتا تو نہیں اور یوں میرے ذہن میں ان سنی کہانی ابھرتی کہ مجھے اعتراف ہے کہ دادودہش کے اس سلسلے میں میرا ابھی حصہ رہا۔ اور میری ساری جیبیں بہت گرم رہنے لگیں۔ تب ہم نے ایک اور فلیٹ بدلا، اور میں نے اور میری ماں نے سوتیلے چچا سے یوں ترکِ تعلق کیا کہ مبادا وہ اپنے اس احسان کے بدلے چکانے ہمارے پاس آجائیں، جو انہوں نے آخری مرتبہ وہ ہنگامہ کر کے مجھے یہاں فٹ کروا کر کیا تھا۔

لیکن فرزانہ کا معاملہ قدرے پیچیدہ تھا کہ ہمارے نئے فلیٹ میں پہنچنے کے بعد اس کے رویہ میں نرمی آگئی تھی، اور اس نے بار بار یہ کہنا چھوڑ دیا تھا، ''مگر تمہاری عزت کیا ہے۔''

اب تو کئی بار وہ خود مجھ سے ملنے آئی تھی، مگر قصہ یہ ہے کہ میں نے سون گڑیوں کی کہانی ''چشم دید'' طور پر دیکھی اور ان کی قوتوں اور بالادستی کا نظارہ کیا۔ اب مجھے صبح کا ستارہ ڈوبنے سے پہلے ٹین کی پٹاری کو بند کرتے کرتے......

جو رنڈی تھی، سو بیوی بنی، جو بیوی تھی، وہ باندی بنی۔

کہنے والی خاتون سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ میرا اور میرے تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے والے تمام دوستوں کا فیصلہ یہی تھا کہ اس ڈگری اور ایسی احمق خاتون کہ بیوی سے لونڈی بن جائے، کے مقابلے میں سون گڑیاں بدرجہا بہتر ثابت ہوتی ہیں۔

مگر یہ رموز فرزانہ جیسی لڑکیوں کی سمجھ میں کب آسکتے ہیں کہ صبح صبح کالی نقاب منہ پر ڈال کر اور داہنے ہاتھ میں نوٹس کی کاپی اٹھا کر وہ اپنے مستقبل کے اجالوں کی تلاش میں بسوں کے دھکے اور کنڈکٹروں کی گھرکیاں کھانے گھر سے نکل پڑتی ہیں۔

جبکہ سون گڑیاں۔

خیر سون گڑیوں کی بات اور ہے۔ میں ایسی ہی ایک پٹاری کی تلاش میں ہوں کہ جس میں ایک یا کئی سو گڑیاں بند ہوں۔

OOO

صغریٰ سینے پر یوں ہاتھ باندھے کھڑی تھی گویا نماز پڑھنے والی ہو۔

''وہ بات یہ ہے جی......'' ڈری ہوئی صغریٰ کا یہ تکیہ کلام تھا۔

''کہو کہو......'' داڑھی والے الطاف نے کہا۔ وہ مولوی نہیں تھا، ایک بہت بڑی این جی او میں چیف اکاؤنٹنٹ تھا۔ لیکن اس کی داڑھی دیکھ کر احساس ہوتا کہ وہ عذاب قبر، قہر قیامت اور جہاد نفس سے ڈرنے والا ہے جس کو دیکھتے ہی ہنستی کھیلتی زندگی مشقت کے اسباب میں بدل جاتی ہے۔

''وہ جی بات یہ ہے میں......نوکری تلاش کرنے گئی تھی۔ پڑھی لکھی تو میں ہوں نہیں جو کہیں استانی گری کر لوں۔ بس گھروں میں ہی ہانڈی روٹی صفائی ستھرائی کر سکتی ہوں......''

الطاف صاحب نے ایک ابرو اٹھا کر اپنی لپیٹی لپٹائی بیوی کی طرف دیکھا۔ ایک زمانے میں یہ کافی دیدہ زیب، سلونی سلونی معرکے کی چیز لگا کرتی تھی لیکن اب سکہ ٹوٹی پنسل کی طرح ناکارہ تھی۔ چہرے پر بھوسلے بالوں اور تلکوں نے بھر مار کر رکھی تھی، کانوں میں پڑی چاندی کی میلی ڈنڈیاں، چٹیا سے نکلے ادھڑے خشک بال، میلی میلی آنکھیں اور سوکھے ہونٹ دیکھ کر الطاف کے علاوہ اور کسی کو اس پر پیار نہ آ سکتا تھا۔ الطاف کو معلوم تھا کہ صغریٰ نے اس کے آدرشوں کا ساتھ دے کر، سسرال کی ہر چنٹی کو اپنا کر محنت میں جوانی کھپا کر اتنی بدرنگی خریدی تھی۔ لیکن الطاف کو بھی ان ہی آدرشوں نے جھونجھ کر دیا تھا۔

''رہنے دو، کسی گھر میں کام نہیں کرنا، کوئی ضرورت نہیں......خواہ مخواہ۔''

''بات یہ ہے جی کام ملتا بھی کہاں؟ ایک گھر ملا ہے تین کمروں میں جھاڑو بہارو، ناکیاں، ایک غسل خانہ، صحن، ڈھائی سو روپے دے دیں گی......چلو کچھ تھوڑا بہت......''

صغریٰ نے سوچا پتہ نہیں اب کیوں مسلمان عورتیں بھی غریبی کے ہاتھوں تنگ آ کر جھاڑو بہارو صفائی ستھرائی کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ پہلے تو ایسے نہیں تھا۔

''بس کوئی ضرورت نہیں ایسے کام کی...... میں جو کچھ لاؤں گا اسی میں گزارہ کرو......سلائی کر دیا کرو لوگوں کی......زیادہ سے زیادہ......لیکن سلائی کرنے کسی کے گھر نہیں جانا کبھی......''

''وہ بات یہ ہے جی......'' اچانک وہ چپ ہو گئی۔ بھلا کس منہ سے کہتی کہ گھر کا خرچہ نہیں چلتا اور پھر سلائی میں محنت زیادہ ہے اجرت کم۔ دو رانڈ نندیں، ایک بے روزگار دیور، ایک بیمار ساس، ان کے اپنے دو بچے جو کبھی کبھار روپیہ دو روپیہ بھی مانگ لیتے تھے۔ ان سب کی گئی گزری گزران کیسے چل سکتی تھی۔

''سنو اگر صرف ایک بات پر دھیان رکھو تو میری تنخواہ بہت ہے۔''

''وہ کیا جی؟'' لمبی پلکوں والی بولی۔

صغریٰ کو کچھ سمجھانا، بتانا، سکھلانا الطاف کو برا لگتا تھا۔ یہ ملوک سی پہلے ہی گھر چلانے میں اپنے آپ کو لہولہان کئے دیتی تھی۔ ایسے مرمٹے کو سمجھانا کیا؟

''اگر تھوڑا سا اسراف سے بچ کر چلو تو میری تنخواہ بہت ہے۔ پھر بونس بھی ملنے والا ہے۔''

''وہ بات یہ ہے جی، میں تو کبھی ایک چار آنے بھی......''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے لیکن پرسوں بچے دہی بھلے کھا رہے تھے۔ ابھی سے یہ چٹخاروں کی عادت پڑ گئی تو آگے چل کر رشوتیں لینی آسان ہوں گی......نیب میں پکڑے جائیں گے چسکے والے۔''

الطاف تو یہ بات کہہ کر ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ صغریٰ اندر کوٹھری میں جا گھسی۔ سوچنے کے لئے اسے کچھ وقت درکار تھا۔ اپنی جوان جہان رانڈ نندوں کی طرف نگاہ کرتی تو دونوں نے ابھی بھر جوانی میں قدم رکھا ہی تھا۔ بڑی راشدہ کا شوہر بائی وے پر بس کے حادثے میں فوت ہو گیا۔ اتنی بڑی ایئر کنڈیشنڈ بس لے کر جا رہا تھا کہ موت نے بھالا مار کر گرا دیا۔ سسرال والوں نے منحوس سمجھ کر راشدہ کو نکال باہر کیا۔ سارا جہیز تاوان میں دھر لیا۔ جب دلگیر راشدہ اجاڑ صورت گھر پہنچی تو الطاف نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر صغریٰ سے کہا تھا:

''دیکھ صغریٰ اسے رونے نہ دینا۔ اوپر والا بے نیاز ہے، بے پرواہ ہے لیکن ہمیں حکم ہے کہ ہم اپنے اقربا کے ساتھ سلوک سے پیش آئیں، صلہ رحم کے سلسلے میں جو کچھ مجھ سے بن سکا کروں گا۔ تو اپنا فیصلہ خود کر لے، میرے ساتھ چلنے میں تو یہی کچھ ایثار قربانی......''

راشدہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

''میں کچھ کام کر لوں گی الطاف بھائی، آپ بے فکر رہیں۔ میں...... میں۔'' وہ آگے نہ بول سکی۔ صغریٰ بڑھ کر راشدہ سے لپٹ گئی اور بولی۔

''کام کریں تمہارے دشمن۔ تم تو اس گھر کی رحمت ہو رحمت۔ بات یہ ہے جی، اللہ نے اماں جی کی خدمت کے لئے راشدہ کو بھیج دیا۔ اب مجھے اماں جی کی فکر نہیں رہی۔''

الطاف کی لمبی داڑھی میں کہیں ایک آنسو جذب ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ صغریٰ بات کی پکی اور ارادے کی مضبوط عورت رہی تھی لیکن اسے اتنی مشکل زندگی کے حوالے کرتے ہوئے الطاف کو اندر ہی اندر دکھ ہوتا تھا۔

راشدہ کو بیوہ ہوئے کوئی دو برس گزرے تھے کہ الطاف کی دوسری بہن مکہ شریف میں اپنے شوہر کو سپرد خاک کر کے کواٹروں میں آ پہنچی۔ سسرال والوں نے پوتا رکھ لیا اور بہو کو ایسے لوٹا دیا جیسے ادھار لے گئے تھے۔ جمیلہ اچھے گھرانے میں بیاہی گئی تھی۔ اس کا شوہر بارہ سال سے مکہ مکرمہ سے بس لے کر مسافروں کو مدینہ شریف لے جایا کرتا تھا۔ جونہی مدینہ شریف قریب آتا وہ ٹیپ بدل دیتا اور سواریاں مودب ہو کر بدر علینا، سنتیں۔

جمیلہ باجی کا شوہر اس روز فوت ہوا جب بھائی عرفان ٹیپ بدلنے میں مشغول تھے۔ اچانک دل میں درد ہوا۔ عرفان نے گاڑی ایک طرف لگائی، سینے پر ہاتھ رکھا اور یوں ہی ہاتھ باندھے بڑی سرکار میں پہنچ گیا۔

جمیلہ باجی نیم دیوانگی کی حالت میں گھر پہنچی تھی۔ وہ بار بار ایک ہی بات کرتی۔

''کچھ تو بتائیں الطاف بھائی میرا قصور کیا ہے؟ ایک تو عرفان چلا گیا مجھے چھوڑ کر، دوسرے میرا خورشید مجھ سے چھین لیا۔ یہ بھی کوئی انصاف ہے بھائی جی۔ میرے اللہ نے کیا سوچا ہے میرے متعلق؟ کہاں ہے اس کا انصاف، کہاں ہے اس کا رحم۔''

الطاف اس کی بات کا ایک ہی جواب دیتا رہا۔ ''سنو بجیا۔ انصاف ہم لوگوں کو کرتا ہے، اللہ کو انصاف کے لئے پابند نہیں کر سکتے، تمہارے سسرال والوں کا رویہ ٹھیک نہیں۔ دعا کرو وہ راہ راست پر آ جائیں اور...... اور مجھے توفیق دے کہ میں تمہارے ساتھ انصاف کر سکوں۔''

''میری ساس کہتی ہے کہ وہ امیر ہیں۔ بچے کو انگلش میڈیم اسکول میں پڑھائیں گے۔ اس کا مستقبل بنائیں گے۔ وہ کہتے ہیں میں بچے کو کچھ نہیں دے سکتی۔ بتائیں بھائی جی ماں کے بغیر بچے کا کیا مستقبل، کیا مستقبل؟''

جمیلہ باجی کے آنسوؤں کا اس گھر میں کوئی دارو نہ تھا۔ بس اتنا ہوا کہ اب صغریٰ نے باورچی خانے میں ریڈیو لگانا بند کر دیا۔ ایک سیکنڈ ہینڈ بلیک اینڈ وہائٹ ٹیلی ویژن اماں جی کے کمرے میں تھا۔ دونوں بچے اس کے آگے بیٹھے رہتے۔ جمیلہ باجی کے آنے کے بعد اس پر بھی چادر ڈال کر اسے کفنا دیا گیا۔ صغریٰ اسی سوچ میں تھی کہ اب نوکری نہ کر سکنے کی حالت میں گھر کا خرچ کیسے چلے گا کہ کوٹھری پر دستک ہوئی۔

''بھابھی......''

''آجاؤ۔''

تنویر اندر آ گیا۔

''یہاں کیا کر رہی ہیں؟''

''کچھ نہیں۔''

''رو رہی ہیں؟''

''خدا نہ کرے۔'' صغریٰ بولی۔

''روتو رہی ہیں لیکن خیر اس گھر میں رونے کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟''

تنویر بی۔اے پاس تھا۔ الطاف نے اسے بڑے جتن کر کے تھمبو پرائیویٹ بی۔اے کرایا تھا۔ تنویر شوق کی بلندی اور ہمتوں کی پستی کا شکار تھا۔

''بھابھی......''

''جی تنویر جی......'' بھابھی کے لہجے میں شہد گھلا تھا۔

''میں امیر ہو جاؤں گا؟''

''ان شاء اللہ۔''

''میرے پاس کار ہوگی؟'' تنویر نے پر امید لہجے میں سوال کیا۔

''کیوں نہیں؟''

''ایک کہ دو؟''

''تین۔'' صغریٰ نے جواب دیا۔ ''ایک صاحب بہادر کے لئے، ایک بیگم صاحب کے لئے، تیسری چھوٹی گاڑی بابا لوگ کو اسکول لے جانے کے لئے۔''

''چھوٹی گاڑی کیوں میرے بچوں کے لئے؟'' تنویر نے پوچھا۔

''چلو نہ سہی بڑی جیپ......وہ جس کے پیچھے ٹائر بندھا ہوتا ہے!''

''سو بچیرو......کچھ سیکھ لو، پتہ کر لو دنیا میں کیا ہو رہا ہے بھابھی، لوگ کیسے رہتے ہیں، کیا عیش ہیں ان کے۔''

صغریٰ شرمندہ سی ہو گئی۔ اسے بھلا سیکھنے کے لئے وقت ہی کب ملا۔ نویں جماعت میں تھی تو شادی ہو گئی۔ آگے جو کچھ ہوا اس نے ویسے ہی مت ماردی۔ عقل ٹھکانے نہ رہی تو سیکھنے سکھانے کی نوبت ہی نہ آئی۔

''میری کوٹھی ہوگی؟ ہوگی بھابی؟'' تنویر نے سوال کیا۔

''ضرور ہوگی۔'' صغریٰ نے جواب دیا۔

''کیسے ہوگی؟ میرے پاس تو نوکری بھی نہیں۔''

''اللہ کریم کے آگے کیا مشکل ہے۔ تم خواہ مخواہ مایوس نہ ہو جایا کرو۔''

''تمہارا اللہ میاں سب کچھ کر سکتا ہے بھابھی؟''

''کیوں نہیں۔ وہ کائناتوں کا مالک ہے، ایک کن کہہ کر سارے کام کرتا ہے۔''

تنویر بہت خوبصورت تھا۔ گورا سا، شہد کے رنگ جیسی آنکھیں......

''اچھا تو آپ کے اللہ میاں نے الطاف بھائی کی زندگی کیوں بنائی کولہو کے بیل جیسی......''

''خیری صلا سب کچھ ہے، بہن بھائی، بال بچے، اماں جی......اور کیا چاہئے الطاف جی کو۔''

تنویر ہنس کر بولا۔ ''فٹے منہ ایسے سب کچھ پر۔ دولت کے بغیر زندگی کس کام کی بھابھی۔''

اب صغریٰ کو غصہ آ گیا۔ طیش میں بولی۔ ''کسی جزیرے میں رہتے ہوتے تم، اتنا بڑا محل ہوتا تمہارا، اور تم اکیلے اس میں

ہوتے تو خوش ہوتے؟ رشتے ناطوں کے بغیر کیسی خوشی۔''

تنویر نے چیونگم چباتے ہوئے کہا۔''دولت ہوناں بھابھی، تو یوں رشتے بنتے ہیں یوں۔'' تنویر نے چٹکی بجائی۔

صغریٰ بولی۔''اچھا یہ بتا اگر تو امیر ہو جائے، ڈھیر سارا، نہ تیرے پاس الطاف بھائی ہوں، نہ تجھے ستانے والے احمد اور عبداللہ، نہ باجی جمیلہ نہ راشدہ، تو بتا تو پھر خوش رہے گا، خوش ہو سکے گا؟

تنویر نے پھر چٹکی بجائی۔''یوں، ایک سیکنڈ میں۔ خوش ہی خوش۔ کبھی امریکہ، کبھی یورپ، کبھی آسٹریلیا، آگے پیچھے ملازم، سلامیں ہی سلامیں۔''

''اکیلا؟''

''اکیلا کیوں؟ میری بیگم ساتھ ہوگی۔''

صغریٰ کو کچھ تھوڑا سا دھچکا لگا۔''اور ہمیں بھول جائے گا، ہم سب کو؟''

''لیں بھابھی۔ کہیں کہیں سے بڑے شہروں سے کارڈ بھیجا کروں گا، محبت بھرے۔''

وہ دونوں اس طرح خوابوں میں رہنے کے عادی تھے۔ صغریٰ کے خواب کبھی اس کی زبان پر نہ آئے لیکن بے کار، بے روزگار تنویر اپنے خوابوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا عادی تھا۔ وہ نوکری تلاش کرنے میں کم وقت صرف کرتا اور بھابھی سے اپنے خوابوں کی تعبیر معلوم کرنے میں مشغول رہتا۔

الطاف دفتر جانے سے پہلے اپنے بچوں کو قرآن کا درس دے کر رخصت ہونے کا عادی تھا لیکن اس روز صغریٰ کے چہرے پر کچھ ایسی محرومی تھی کہ وہ سائیکل صاف کئے بغیر ہی گھر سے نکل گیا۔ دونوں بچوں نے دل میں بڑی خوشی منائی۔ وہ اچھے بچوں کی طرح سروں پر ٹوپیاں پہنے ہاتھوں میں سیپارے لئے گھٹنے جوڑے بیٹھے تھے۔ بڑی پھرتی سے اٹھے تو اماں جی نے تکیے سے سر اٹھا کر پوچھا۔''کہاں چلے؟''

''اسکول اماں جی۔''

اماں جی نے دیوار پر لگی کلاک پر نگاہ دوڑائی۔''ابھی سے؟''

''ہاں جی۔'' احمد بولا۔

''ابھی تو گھنٹہ پڑا ہے آٹھ بجنے میں۔ بیٹھ کر سبق پڑھو۔'' دادی بولی۔

''ابا جی نے چھٹی دے دی ہے۔''

''دوہرائی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ باپ نرمی سے پڑھاتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ تم کوشش کرنا چھوڑ دو۔'' دادا جی نے اونچی آواز میں صغریٰ کو بلایا۔ دونوں لڑکے مونڈھوں پر بیٹھ کر ہل ہل کر سیپارہ پڑھنے لگے۔

صغریٰ باورچی خانے میں توا اتار کر بھاگی۔ اس کا خیال تھا کہ اماں جی کو پھر تے آ گئی ہے۔

''وہ بات یہ ہے کہ تیری غفلت اور الطاف کی نرمی ان کو جاہل مطلق بنا دے گی۔ دیکھ لے سارے محلے کی عورتیں بچوں کے لئے کیسی کیسی کوشش کرتی ہیں۔ تجھے سارا دن باورچی خانہ لپیٹے رکھتا ہے۔ ان کو دیکھ...... ان کو، یہ الطاف کا مستقبل ہیں۔ باورچی خانے کے دوزخ میں اپنے آپ کو پھونکتی رہی تو اولاد کے لئے جنت حاصل کر چکی! آوارہ ہو گئے تو مجھے نہ کہنا۔''

صغریٰ نے لمحے بھر کو اس کڑوی کسیلی نصیحت کا برا مانا لیکن وہ بھی جانتی تھی اس کے میکے میں کہیں عین اسی وقت اس کی ماں بھی ایسی ہی جلی کٹی سنا رہی تھی۔ دین دار زندگی گزارتے گزارتے عورتوں کا آخر کو یہی حال ہو جایا کرتا ہے۔ کبھی وہ بھی اسی طرح ابالے کھایا کرے گی، کناروں سے نکلا کرے گی۔

گھنٹی سنتے ہی الطاف چیف ایگزیکٹو کے دفتر کی طرف لپکا۔ الطاف کی عادت تھی کہ وہ اپنی جانب سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ ایسا کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتا جس پر سرزنش ہو۔ مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی وہ دفتر پہنچ جاتا۔ الطاف خوب جانتا تھا کہ وہی انسان عزت کے قابل ہے جو اپنی عزت کا تحفظ کرنا جانتا ہے۔ عزت کے منگتے کو اگر توقیر ذات کی خیرات

"اس بسنت پر ہمیں ایک امریکن ملٹی نیشنل کے کچھ لوگوں کو entertain کرنا ہے۔ وہ لوگ لاہور کی بسنت دیکھنے آ رہے ہیں۔ تفریح میں کسی قسم کی کمی نہ ہو۔ کوئی پندرہ بیس لوگ ہوں گے لیکن ہمیں یادگار پروگرام کرنا ہے۔ شہر کے سوڈیڑھ سو elites کو بھی invite کرنا ہوگا۔"

"جی سر۔"

"سارا انتظام تم کو کرنا ہوگا۔ تمہاری دیانت داری کی وجہ سے ہماری کمپنی چل رہی ہے ورنہ یہ بہروپئے تو اب تک میرا دیوالیہ نکال دیتے۔"

"میں پوری کوشش کروں گا سر۔"

"فائیو اسٹار میں ان کا دو دن کا قیام ہے ملٹی نیشنل والوں کا۔ پتنگیں، بسنت کی رات کا ڈنر، رات کے وقت نائٹ فلائنگ کا پورا انتظام......"

اب الطاف کو آہستہ آہستہ سمجھ آنے لگی کہ کام کی نوعیت کیا تھی۔

"ایسے کرو الطاف کوئی بڑی سی کوٹھی...... یا بہتر ہے کہ حویلی کرائے پر لے لو۔ ہمارا کلچر بھی اس طرح expose ہو۔ کارندوں کی وردیاں، پوسٹرز، پیلا ہی پیلا، بسنت ہی بسنت اور رات کو مجرا۔ دیکھو الطاف، جمیل فتنے سے بچنا۔ یہ سامری بیگم کو پچاس ہزار دے گا اور خود مجھ سے دو لاکھ وصول کرے گا۔ تم کو سامری بیگم سے مل کر معاملہ طے کرنا ہوگا۔ بتا دینا ہوگا اسے کہ جو بھی ویلیں اس کو ملیں گی، اس کی ہوں گی لیکن ہم پچاس ہزار سے ایک پائی زیادہ نہیں دے سکتے۔ ہمارا بجٹ ہی اتنا ہے۔" شیخ ہارون نے سانس لینے کے لئے وقفہ دیا۔

"سر، مجھے ایسے کاموں کا تجربہ نہیں ہے۔ آپ جمیل صاحب کو ہی یہ ذمہ داری دیں۔"

شیخ ہارون نے سنی ان سنی کر دی۔ "اور ہاں دو ڈھائی لاکھ کی شراب بھی چلے گی۔ تم کسی فائیو سٹار میں جا کر انتظام کر لو وہاں لوگوں کے پاس پرمٹ ہوتے ہیں۔ تمہیں دقت پیش نہیں آئے گی۔"

الطاف کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

"اور ہاں سامری بیگم سے پتہ چل جائے گا کوئی بیس بائیس نٹ کھٹ، چنچل، دل پھینک، دیدہ زیب رنگین dates بھی تیار ہوں۔ ان لڑکیوں کے بغیر کوئی رونق نہیں ہوگی بسنت کے فنکشن میں۔ لڑکیوں کے ٹیلی فون نمبرز لینا نہ بھولنا۔ ان امریکنوں کو پتہ چلنا چاہئے کہ ہم جث سٹ ایڈورٹائزنگ کمپنی کے کیا نور ہیں۔ ہم کتنے مہمان نواز، کیسے جیالے لوگ ہیں۔"

"یہ سب تو میرے بس کا نہیں شیخ صاحب۔"

"جب کرو گے تو بس میں آ جائے گا۔"

''جی مجھے صرف اکاؤنٹس کا تجربہ ہے۔ یہ تو......''

''اس کا تجربہ کرو گے تو سیکھو گے ناں؟ میں نے دس لاکھ بسنت کے لئے مختص کر دیا ہے۔ اس allocation کے اندر اندر رہنے گا۔ Haloween کا ڈرا اچھا تھا لیکن بار بی کیو failure تھا، Total Fiasco۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔''

الطاف دو تین قدم بعد مڑا، پھر مؤدب انداز میں واپس آ کر بولا۔ ''سر میں اس کام کا اہل نہیں ہوں۔''

شیخ ہارون نے عینک سے اوپر جھانکی لگا کر کہا۔ ''اور آپ جانتے ہیں میں انکار سننے کا عادی نہیں۔''

الطاف کو پہلی بار ٹھنڈے پسینے کا تجربہ ہوا۔ اس نے ساتھ والی چارپائی پر لیٹی صغریٰ کو اٹھانا چاہا۔ لیکن وہ مردہ تو روح تک سو چکی تھی۔ الطاف احمد نے دل میں سوچا اس بے چاری کو کیا جگاؤں؟ گرہستی مرد اور گرہستن دونوں کی اپنی اپنی صلیب ہے جس پر وہ نہ جانے کتنی بار مصلوب ہوتے رہتے ہیں۔ رزق کا حصول اور رشتے ناطوں کی پاسداری میں دونوں کا کچھ باقی نہیں رہتا۔ اس جینے اور مرنے کے شغل میں یہ دونوں اتنی بار مرتے اور جیتے ہیں کہ آخر میں اپنے آپ کو مظلوم سمجھنے کے علاوہ کوئی تلافی باقی نہیں رہتی۔ قریب ہی احمد اور عبداللہ بڑے بے فکرے ایک دوسرے میں ٹانگیں گھسیڑے آنند وروپی سو رہے تھے۔ الطاف لمحہ بھر کو لرز گیا۔ اسے رزق کی وہ صلیب نظر آ رہی تھی جس پر اس کو مصلوب ہونا تھا۔

الطاف ہمیشہ ماں کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کرتا۔ اس کی دونوں رانڈ بہنیں بھی پاس ہی منڈلاتی رہتیں۔ لیکن آج پہلی بار اسے بھوک نہیں تھی۔

''تیرا، جی اچھا ہے الطاف؟'' بوڑھی کملی ماں نے اپنی غیبی حس سے حال معلوم کر کے پوچھا۔

الطاف یہ سوچ رہا تھا کہ بوڑھی اماں کی دوایاں پھر کہاں سے آئیں گی۔ ''ٹھیک ہے جی لیکن......''

''لیکن کیا؟'' راشدہ نے سوال کیا۔

''کام کچھ زیادہ ہے۔''

الطاف کے دل میں ایک سوچ آئی۔ کہیں جو یہ سنتاپ گھر نہ آئی ہوتیں تو آج وہ کچھ اور فیصلہ کر سکتا تھا۔ باورچی خانے سے سوائے مشق کے اور پر کچھ نہ دے سکا۔ ویسے تو صغریٰ محبت کے علاوہ اور کچھ مانگتی بھی نہ تھی۔ لیکن تھکا ہارا مرد تو اس پر محبت کا مکھن بھی لگانے کا اہل نہیں رہتا۔

الطاف احمد مولوی نہ تھا۔ اس نے ساری عمر کسی کو کوئی نصیحت، تنبیہ، خوف نہ دلایا تھا۔ اپنے آپ کو سیدھا کرنے اور رکھنے میں اسے اتنی محنت کرنی پڑتی کہ اس مجاہدے کے بعد وہ اندر پھٹا ہوا غبارہ بن جاتا۔

آئینے میں اپنی داڑھی پر نظریں جما کر اس نے سوچا۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے اور غالباً ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ اپنے مسلک، اپنے آدرش کی خاطر کبھی کبھی تو تپتی ریت پر تلملانا ہی پڑتا ہے۔ آدرشوں کو عمل میں لانے کی کچھ تو قیمت ادا کرنا ہی ہوتی ہے۔ پھر اس نے ہاتھ میں پکڑے razor کو غور سے دیکھا۔ بھلا میں تو رزق کی صلیب پر مصلوب ہو جاؤں گا لیکن داڑھی کی بے عزتی تو برداشت نہیں کر سکتا۔ داڑھی کے بغیر سامری بیگم کو کیسے پتہ چلے گا کہ میں حافظ قرآن ہوں گا۔ عام طور پر ان لوگوں کو بہت سراہا جاتا۔ ان کی کہانیاں چھپتی ہیں جو بدی کے راستے پر چلتے چلتے نیکی کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ لیکن اچھائی سے محبت کرنے کے باوجود جو بدنصیب بدی کا ساتھ دینے لگتے ہیں ان کی بات کون کرتا ہے؟ الطاف کی نظروں میں وہ سارے کام گھوم گئے جو اسے بسنت کے لئے کرنے تھے۔ صبح بچوں کو درس قرآن دینے کے بعد ایک ہی دن کا تو سفر تھا...... سامری بیگم کا مجرا...... شراب کی فراہمی...... کائٹ فلائنگ کے ہمراہ شوخ و چنچل لڑکیوں کا یک اینڈ ڈراپ...... اس نے قریب رکھے ہوئے استعفیٰ کو پرچی پرچی کر ڈالا۔

ایک ہی دن کی تو بات تھی الطاف صاحب...... پھر داڑھی کی حرمت تو اس نے محفوظ کر ہی لی تھی۔

جوں جوں داڑھی کے بال زمین پر گر رہے تھے اس کے آنسوؤں میں تیزی آ رہی تھی۔ بھلا وہ استعفیٰ کیسے دے سکتا تھا۔ اسے تو رزق کی صلیب پر چڑھنا ہی تھا...... وہ اس گھر کی کفالت سے کیسے منہ موڑ سکتا تھا......؟

OOO

جمیلہ ہاشمی

چراغِ لالہ

آفندی کا خط زمانوں کے بعد آیا تھا وہ امریکہ میں کسی جگہ تھا اور واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے لکھا تھا:

تم اب میری طرف سے ناامید ہو جاؤ کہ میں واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ جب تک میں تمہارے پاس تھا کسی نہ کسی طور پریشان رہتا تھا۔ میری تعلیم ڈگریاں بھلا کس کام کی تھیں۔ ہمیشہ جونیئر سینئر کا جھگڑا۔ ہندوستانی پاکستانی کا جھگڑا شمالی جنوبی کا کھکھیڑا۔ تعلقات اور رسائی کا مقابلہ اور چھپے ہوئے ذرائع کا استعمال کرنے کی اہلیت اور نااہلی۔ آپ باہر کیا کر سکتے ہیں اور اندر کیا کر سکتے ہیں۔ یہ دوہری زندگی بسر کرنے کی ہمت کبھی انسان میں ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔ گورے سہنے کے انداز چند برسوں میں بہت بدل گئے ہیں اور فکر ہر گام پر نئے اور پرانے کی فکر ہوتی رہتی ہے۔ آدمی کی ساری طاقت اس میں صرف ہو جاتی ہے کہ اپنے حقوق کی حفاظت کس طرح سے کرے اور زندگی کس طرح سے بسر کرے۔ میرا خیال ہے تم بھی میرے اس فیصلے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھو گے۔ میں یہاں جس ادارے میں کام کرتا ہوں اس نے میری تنخواہ میں تقریباً پچاس فیصد اضافہ کر دیا ہے اور یہ بہت بڑی ترقی ہے۔ تم کو معلوم ہو کہ تم بھی کسی نہ کسی طور ایسے آدمی ہو جس کی ضرورت ہے اور جس کے بنا گزارہ نہیں ہو سکتا تو یہ اہمیت آدمی کے کام کرنے کی صلاحیت کو بے پناہ جلا بخشتی ہے (میں تم کو یہ سب یوں لکھ رہا ہوں گویا تم کوئی غیر ہو اور یہ سب باتیں جانتے نہیں ہو)

مریم کا کیا حال ہے؟

جانے مجھے کیوں اکثر یوں محسوس ہوا ہے کہ مریم میں عجیب وغریب صلاحیتیں ہیں اور وہ تمہارے باقی بچوں سے مختلف ہے، پتہ نہیں میں نے ایسا کیوں سوچا تھا؟ ہو سکتا ہے میرے یہ خیالات اس کے لئے اس لئے ہوں کہ تم بھی اسے سب سے زیادہ چاہتے ہو اور اس پر فخر کرتے ہوئے لگتے ہو۔ اولاد میں انسان اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈتا ہے اور خاص طور پر مشرق میں جیسے درخت کی شاخیں ہوں۔ پھول کا پھل بنے اور پھل کی مٹھاس آدمی کے اندر اترتی محسوس کرنا چاہے۔ اصل میں زندگی کے ساتھ مشرقی وابستگی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہوتی ہے؟

تم کہو گے یہ میری غیر جذباتیت ہے میں ابھی تک کنوارا ہوں میں نے ان سارے جذبوں کو محسوس نہیں کیا؟ ٹھیک ہے مگر آخر اس میں رکھا کیا ہے؟ ایک گھر اور اس کے اندر تمہارا انتظار کرتی بیوی جس کی آدھی سے زیادہ زندگی انتظار میں گزر جاتی ہے؟ میں آزادی کا قائل ہوں!

تم نے اپنے پچھلے خط میں لکھا میں شاید اب اس آب و ہوا میں رس بس گیا ہوں۔ آپ چاہیں تو یہاں سب کچھ ہے اور چاہیں تو کچھ بھی نہیں۔

بیگم مدحت حسین آج کل یہاں آئی ہوئی ہیں اور ان کی نہایت مہربانی ہے کہ انہوں نے مجھے پہچان لیا کیونکہ تم حیران ہو گے کہ وہ وائٹ ہاؤس کے خاص الخاص مہمانوں میں شمار کی جاتی ہیں اور کسی والئی ریاست سے کم ان کی دیکھ بھال نہیں ہوتی۔ نوجوان خواتین کا ایک اچھا خاصا گروہ ان کے ہمراہ ہے۔ میں نے کسی تقریب کی تصویریں اخبار میں دیکھی تھیں اور وہاں سے پتہ معلوم کر کے ان سے ملنے گیا تھا۔ اتفاق کہہ لیجئے یہ بھی بہت محبت سے ملیں۔ یہاں ان کے طور طریقے اور رنگ اور ہیں۔ نہایت ذہین، بہت تیز اور بڑی تیز لڑکیاں ہیں جو یہاں ان کے ساتھ ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے پہلی بار لگا کہ ہماری خواتین کسی طور بھی امریکی عورتوں سے کم نہیں ہیں۔ نادیہ رحمان کو تو جانتے ہو نا جس نے کلاسیکل ڈانس میں نام پیدا کیا تھا اور جس کے شوہر نے محض اس کے اس شوق سے چڑ کر اسے طلاق دے دی تھی۔ اور عطیہ فیضی جو فیشن ماڈل تھی پھر کسی نواب کی منکوحہ تھی پھر اس نے کسی بڑے فوجی کو پھانسا تھا۔ تیسری بار کسی آرٹسٹ کی بیوی بنی تھی۔ یار یہ سب باتیں ایک طرف مگر تمہیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس میں کوئی کشش ہے سی

بے نیاز ہے آپ

محسوس کرتی ہیں تو مت ذکر کیجئے اس کا۔''

''کیا کہا آپ نے وہ جیسے سوتے میں سے اٹھ کر بیٹھ گئی ہو۔ میں جنس کا ذکر کرتی ہوں میں جو مجسم جنس کے خلاف ہوں۔ مرد عورتوں میں کیا ڈھونڈتے ہیں مجھے سمجھ نہیں آتی۔ عورتیں مردوں میں کیا تلاش کرتی ہیں مجھے پتہ نہیں چلتا میں تو زندگی کو کسی اور ہی زاویے سے دیکھتی ہوں آفندی صاحب۔'' اور مجھے جان چھڑانی مشکل ہوگئی۔

پھر وہ شاعرہ ہے بھئی وہی جو مشاعروں میں ایک ادا سے غزل پڑھتی تھی، بہکی ہوئی نگاہیں اور باہوش ادائیں یہاں مردوں کا ایک پورا حرم ہے ان کا بھی طرح کے لوگ جوان کی شاعری کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انہیں بھی کچھ ایسے لوگ بھی جو شاعری کو بکواس سمجھتے ہیں مگر انہیں بہر حال کام کی چیز جانتے ہیں قدر کرتے ہیں حاضر رہتے ہیں کبھی آہیں بھرتے ہیں اور خود بھی شاعر بنے پھرتے ہیں۔ ایک دن یہاں کا ایک دوست میرے پاس آیا۔ ''بھئی کہیں سے نئے پرانے شاعروں کے شعر چرا کر ایک غزل بنا دو جو نئی بھی لگے، خیالات کے اعتبار سے پرانی روایت میں ہو۔ کتابیں تم جانو یہاں کس کے پاس ہوتی ہیں اور شعر تو مجھے کبھی یاد نہ ہوئے مگر میں نے ایک بڈھے، یہاں کے بہت پرانے رہنے والے سے ایک کتاب ڈھونڈھ نکالی۔ اور اچھی خاصی غزل ترتیب دے دی۔ رفتہ رفتہ مجھے اپنی صلاحیتوں پر خود ہی حیرت ہونے لگی ہے میں تو شعر چرا کر خیالات سامنے رکھ کر اگر شعر بنانے لگوں تو سکوں کی طرح میرا خزانہ کبھی خالی نہ ہو۔ وہ صاحب غزل پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے ان کا کام بہت بن گیا اور جہاں وہ صاحب جاتیں انہیں بھی ساتھ جانا ہوتا۔ دو ایک بار تو اس کام کو کھیل سمجھ کر میں نے کر دیا مگر آخر تا کجے۔ اب وہ دوست خود ہی جوڑ توڑ اور گھڑنے سنوارنے میں لگے رہتے ہیں۔ کیا پتہ کسی دن پورے شاعر ہی بن جائیں۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ آدمی بس یونہی کھیل سمجھ کر ایک کام شروع کرتا ہے جو اس کا پیشہ ٹھہرتا ہے۔

شاعری جو جزو پیغمبری ہے اس کی بات تو الگ ہے مگر جس شاعری سے نہ کسی کو جگانا مقصود ہو اور نہ سلانا وہ تو میرے خیال میں آسان ہونی چاہیئے۔ اپنے سامنے سب کچھ ہے رنگ اور نور، جلوے خوبصورتیاں سب کچھ۔ مگر اس تصویر کے پیچھے کیا ہے یہ جاننے کا کام جوکھم کا ہے۔ کبھی کبھار میں سوچا کرتا ہوں الادل کے گیتوں میں اتنا سوز کیوں ہوتا ہے، اتنی تڑپ جلنے کی ایک کیفیت۔ جب آدمی اندر سے آسودہ حال ہوگا اسے جلنے کی کیا خبر ہوگی۔ مگر شاید میں ذرا پرانا ہوں میرے سامنے اندر کا مسئلہ بھی ہے۔ دوسرے پڑھنے والے تک اسے پہنچانے سمجھانے کا سوال بھی ہے مگر نئی شاعری نئی زندگی اس کے تقاضے اتنے محدود ہیں۔ جب شاعرہ غزل پڑھتی ہے۔ سماں جھومنے کا ہوتا ہے۔ فضا پر ایک کیف کی سی حالت ہوتی ہے اور پھر آدمی سوچتا ہے۔ یہ سب کیا تھا۔ مگر یہاں کے ساتھ یہ بات کوئی خاص نہیں۔ اور پھر میں تو بیگم مدحت حسین کا احسان مند ہوں اس فضا میں وہ قوس قزح کے سارے رنگوں کے ساتھ وارد ہوئی ہیں! ابھی ان کا ارادہ یہاں قیام کا ہے۔

کس قدر شاہانہ ٹھاٹھ سے وہ رہتی ہیں۔ یہاں کے سب سے مہنگے علاقے میں ان کا قیام ہے۔ نینسی بھی ان کے ساتھ

ہے۔

تم شاید اسے نہیں جانتے روشن آنکھیں جو بھوری ہیں اور رنگ گندمی جیسے سنہری فصلوں کا ہوتا ہے ویسی ہی چمک جیسے ہوا کے چلنے پر کھیتوں کے اوپر ڈولتی ہے ہوٹل کی سیڑھیوں پر ایک سے دوسرے کمرے میں لپک جھپک جاتے ہوئے وہ یوں گنگناتی ہے جیسے ہوا اپنے سریلے بےلفظوں کے گیت گاتی ہو۔ ایک عمدہ تراش کا کسی باریک کپڑے کا لبادہ سا پہنے رہتی ہے جس کے پھول اس کے رخساروں کے ہم رنگ ہوتے ہیں بیگم مدحت حسین کہتی ہیں میں نے اسے بیٹی بنایا ہے مگر بیٹیوں بہنوں کے اس جمگھٹے میں وہ خود سب سے زیادہ جوان اور زندہ دل لگتی ہے۔ تمہیں یاد ہوگا آج سے دس پندرہ سال پہلے ایک تصویر بکا کرتی تھی جس میں ایک بجرہ ہوتا تھا جس میں نہایت حسین عورت لیٹی ہوئی۔ اس کے برابر میں قریب قریب نیچے پانی میں تیرتی ہوئی جل پریاں جو کم عمر اور الھڑ لگتی ہیں وہ بھی حسین ہوتی ہیں مگر لیٹی ہوئی پری کا حسن جیسے چودھویں کا چاند ہو مکمل اور گدرایا ہوا۔ جیسے شباب کے آخر میں۔ جیسے سیب پک جائے تو اس پر چمک ہوتی ہے۔ پکار پکار کر اپنے مکمل ہونے کا اعلان کرتی ہوئی۔ بیگم مدحت کو وہ سارے زاویئے آزمانے کے طریقے آتے ہیں۔ جہاں سے کوئی تیر خطا نہیں ہوتا۔ اور شکاری شکار کو زد پر لا کر مارتا ہے۔ پھر وہ کنجوس نہیں ہے بڑی شاہ دلی سے خیرات بانٹتی ہے لینے والے کو تہی دامنی کی شکایت ہو تو ہو۔

اور یہ سارا بہار کا موسم ہمرکاب لئے وہ آج کل یہاں آئی ہیں کہتی ہیں '' کلچرل ڈیلی گیشن کے ہمراہ ہوں۔ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا چاہو تو دھو لو کوئی کام کروانا ہو کسی جگہ بہتر نوکری کی ضرورت ہو غرضیکہ ایسے سارے کام جوڑ کے ہوئے ہوں تم بلا کھٹکے مجھ سے کہہ سکتے ہو میں تمہاری بہی خواہ ہوں۔'' بھلا میں ان سے کیا کہوں مہربانی کا شکریہ۔ ہاں میں ان کے کام آنا چاہتا ہوں خدمت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ میں عطیہ فیضی کی آنکھوں کی بےبسی کم کرنے میں اُن کی مدد کروں۔

تم سے اور بہت سی باتیں پوچھنے کو جی چاہتا ہے مگر میں یہاں پر ایک بھگتی کیرتن کی جماعت بلاناغہ دیکھنے جاتا ہوں۔ مشرق اور مغرب کی سب کھڑکیاں کھلی رکھ کر میں اس ہوا کو محسوس کرنا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی ان کی اور اپنی طاقت بھی آزمانا چاہتا ہوں۔

تمہیں معلوم ہے سرکاری مذہب کسی کو وہ آسودگی اور راحت نہیں بخشتا! اور پھر یہاں کے اکثر لوگ دہریئے ہیں،؟؟؟ ناستک وہ خدا کو مانتے ہی نہیں۔ خدا کو نہ ماننے میں وہ کہتے ہیں ایک راحت ہے۔ بوجھ اتر جاتا ہے جب آدمی یہ سوچے کہ تمہارے ہر قول و فعل کا محاسبہ کیا جائے گا۔ تمہیں جواب دہی کرنا پڑے گی تو وہ سوچتا ہے آخر کیوں؟ وہ اپنے آپ کو آزاد محسوس کرنے کے لئے سب سے پہلے خدا سے باغی ہونا پسند کرتا ہے۔ یہ سارا معاشرہ باغی ہے اور اس سرزمین پر کسے ضرورت ہے کہ اپنی طاقتیں آزمائے اس لئے بھگتی کیرتن سے گانے ناچنے سے شانتی حاصل کرنے کو لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اچھا لگتا ہے لوگ ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کئے دعا مانگ رہے ہیں۔ آپ کے اندر کیا ہے اس سے کسی کو غرض نہیں۔

دعا کرنے کے بعد اگر آپ جیب کترے ہیں تو بھی وہی سکون محسوس کریں گے جو احکام صادر کرنے والا باا ثر آدمی۔ اس تن آسانی کے زمانے میں ان کی ساری ضرورتیں اسی قسم کا مذہب پوری کر سکتا ہے۔ ہمارے یہاں کڑی ریاضت ہے مجاہدہ ہے پوری زندگی ایک ایک لمحہ تم اس طرح گزارو کہ تمہیں اس کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔ لوگ اپنے خدا کو الماری میں بند کر کے رکھنا چاہتے ہیں۔ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والے جس طرح ہر شے زیرنگیں کرنے کے در پے ہیں اسی طرح انہوں نے خدا اور اس کے ساتھ اپنے تعلق کو نہایت بالکل ذاتی مسئلہ بنایا ہے۔

خدا کے ساتھ آدمی کا تعلق اس کا ذاتی مسئلہ ہے یا نہیں سارے مذہب اس کو حل کرنا چاہتے ہیں کوئی اپنے طور پر کوئی کیرتن کی محفلوں میں شریک ہو کر کوئی فری مین بن کر کوئی دہریہ بن کر۔

آدمی پتہ نہیں کیا تلاش کرتا ہے؟

میں تو تم سے یہی سوال کرنے چل پڑا۔ جیسے جیسے آدمی کا فہم وادراک منجھتا اور صیقل ہوتا ہے وہ پوچھتا ہے ہر ایک شے کا آسان حل چاہتا ہے اسے کڑی ریاضت اور محنت کی ایک خاص طرز پسند نہیں آتی جیسے کوئی چیل آسمان کے نیچے اُڑتے اڑتے یکا یک ساتوں آسمانوں کے کل راز جاننا چاہے یا کوئی پتنگا شمع کی حقیقت سے واقف ہونے کی کوشش کرے۔ اور پھر چیل گھبرا کر

بھورے

محمد بھورے ولد محمد بوٹے کے دماغ میں کوئی خلل پیدا ہو گیا ہے۔ یہ سب کا متفقہ فیصلہ تھا مگر مس لال خاں ہاؤس سرجن کا خیال تھا کہ ان کے دماغ میں کوئی خلل نہیں ہے کیونکہ وہ بقائمی ہوش وحواس کام انجام دیتا ہے۔ اگر گھنٹے کی آواز سے اس پر بے چینی طاری ہو جاتی ہے تو یہ کوئی جذباتی معاملہ ہے۔

محمد بھورے سے اس معاملے میں تقریباً سبھی نے پوچھ گچھ کی مگر جواب میں اس نے ہمیشہ دانت نکال دیئے اور اس طرح ہنسا جیسے سب کو چڑا رہا ہو۔ مس لال خاں نے اس معاملے میں بھورے سے بڑی رازداری کے ساتھ معلومات حاصل کرنی چاہئیں مگر وہ ان کی ہمدردی اور خلوص کو بھی بڑی بے اعتنائی سے ٹال کر صرف تنہا رہ گیا۔ آخرکار مس لال خاں کا بھی خیال بدل گیا اور انہیں بھی ماننا پڑا کہ یہ خلل ہے مگر محض لمحاتی، جو گھنٹے کی آواز سے پیدا ہوتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے اس لیے بھورے بے زار سا انسان ہے اور اسے اپنی ملازمت پر موجود رہنا چاہئے۔

محمد بھورے اپنی ملازمت پر موجود رہا مگر یہ کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ یہ ایک کہانی ہے جو بھورے کسی کو نہیں بتانا چاہتا اور وہ اس کہانی کے ایک بڑے ہی مسرت انگیز انجام کا منتظر ہے۔ یہ کہانی اس طرح ہے کہ:

سیتاپور کا مہاجر محمد بھورے اس زنانہ امراض کے اسپتال میں آٹھ سال سے کام کر رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی اسپتال کے اس ٹیلی فون پر لگی ہوئی تھی جو ہاؤس سرجنوں اور ٹریننگ حاصل کرنے والی لڑکیوں کے لئے وقف تھا۔ دوسرا ٹیلی فون جو دوسری طرف تھا، مریض اور ان کے سرپرستوں کے لیئے وقف تھا۔ دونی ڈبے میں ڈال کر جس کا جی چاہے فن کر لے۔ اس دوسری طرف ہر وقت بلڑ سا مچا رہتا۔ اس کے باوجود ٹیلی فون کا چپڑاسی پرائیویٹ کمروں کے مریضوں کو پیغام بھی پہنچا دیتا اور مریض خوش ہو کر اسے انعام بھی دے دیا کرتے۔ اس طرح خاصی آمدنی ہو جاتی مگر بھورے اس آمدنی اور اس ٹیلی فون دونوں سے توبہ کرتا تھا۔ اس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ اس کی ڈیوٹی دوسرے ٹیلی فون پر تبدیل کر دی جائے۔ وہاں پر قریبی لیبر روم سے آتی ہوئی چیخیں صاف سنائی دیتیں۔ سب بدحواس سے نظر آتے مگر یہاں اس طرف بڑی بڑی محرابوں والے برآمدے میں ہر طرف سکون طاری رہتا۔ سامنے وسیع لان کے درختوں پر چڑیاں چہکا کرتیں۔ گرمیوں میں لُو کے گرم جھونکے بھی برآمدے تک آتے آتے ٹھنڈے ہو جاتے۔ سردیوں میں چمکیلی دھوپ گھنٹہ دو گھنٹے برآمدے میں لوٹتی رہتی اور برسات میں جب چھم چھم بارش ہوتی تو کبھی کبھی بوچھار برآمدے کی محرابوں سے داخل ہو کر بھورے کے قدموں کو بھگو جاتی۔ یہاں کے سناٹے کے اور بھی بہت سے فائدے تھے۔ یہاں وہ آزادی سے جواں آیاؤں اور بوڑھی آیاؤں کی لڑکیوں سے عشق لڑا لیتا تھا۔ اتوار اتوار فلموں کے میٹنی شو دیکھنے کی وجہ سے اس کو عشق کرنے کے ہزاروں طریقے معلوم ہو گئے تھے۔ تنخواہ کا آدھا حصہ تحفوں میں خرچ کرنے کے بعد بھی بھورے کی زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی۔ اس کی زندگی میں صرف اس چیز کی کمی تھی کہ اس کی محبوبائیں فلمی ہیروئنوں کی طرح نہ تو اس سے محبت کرتی تھیں اور نہ باوفا تھیں بلکہ ویمپوں کی طرح بے وفا اور ہرجائی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اور بہت سوں سے بھی تحفے وصول کر لیتی ہیں، وہ اپنی محبوباؤں کو جی جان سے بدمعاش سمجھتا تھا۔ اسی لئے اس نے اب تک شادی نہ کی تھی اور نہ اسے شادی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ مہاجر بننے کے بعد شادی کا تصور اس کے ذہن میں دھندلا کر رہ گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب بندر بارش میں بھیگتا ہے تو اسے گھر بنانے کا خیال آتا ہے مگر بھورے انسان تھا اور بارش سے سر بچا سکتا تھا اس لئے اسے گھر بنانے کی کیوں فکر ہوتی۔ ویسے بھورے کو شادی سے نفرت بھی نہ تھی البتہ شادی کرنے کے لئے جس قسم کی پاک دامن اور محبت کرنے والی بی بی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اب تک نظر نہ آئی تھی۔ اس لئے وہ زندگی سے خوش اور مطمئن تھا۔ مقدور بھر عیش کر رہا تھا۔ ملازمت میں بھی کوئی تکلیف نہ تھی سارا دن میلی پرانی آرام کرسی پر پڑا فون ریسیو کرتا یا پھر گایا کرتا۔ جب وہ سیتاپور میں تھا تو راتوں کو اپنی ٹولی کے ساتھ

تھالی بجا کر بارہ ماہے گایا کرتا تھا۔اس کے ساتھی اس کی سپاٹ آواز کی تعریف کرتے تھے۔ یہ وہی تعریف تھی جس نے آج تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ نئے فلمی گانوں سے اسے بڑی نفرت تھی وجہ یہ تھی کہ بڑی کوشش کے باوجود وہ ان ٹیڑے میڑھے فلمی گانوں کی دھن نہ اتار سکا تھا۔ان دھنوں کی نقل کرتے ہوئے اس کی آواز جواب دے جاتی اس لیے اسے اپنے وہی پرانے گانے جی جان سے پیارے تھے۔ سیتاپور چھوڑے دس سال ہوگئے تھے۔مگر وہ ان گیتوں کا ایک آدھ بول ہی بھول سکا تھا۔

لاہور میں بھورے بالکل اکیلا تھا۔ماں باپ سیتاپور ہی میں مر چکے تھے اور خالہ جس نے اسے پالا تھا۔سیتاپور ہی میں وہ گئی تھی۔خالہ نے اس کے صرف ایک خط کا جواب دیا تھا۔اس کے بعد بھورے نے کئی خط لکھے مگر کوئی جواب نہ آیا تو اس نے سمجھ لیا کہ بیچاری بوڑھی مر کھپ گئی ہوگی۔دکھ پالو تو جوان ہو ہو کر ستاتے ہیں مگر پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دو تو فرصت مل جاتی ہے، بھورے بھی کچھ اسی طبیعت کا آدمی تھا لیکن جب سے اس کو یہ محبت کا روگ لگا تو دنیا ہی بدل گئی، آیا ئیں اور اس کالی لوکٹ نرس کی لونڈیا اس کے سامنے منک منک کر تھک گئیں پر بھورے نے ان کو کوئی تحفہ نہ دیا۔ ایسا جیا چاٹ ہوا کہ پھر تفریحاً بھی ان پر محبت کی نظر نہ ڈالی۔رات اس کے کوارٹر میں آنے کا مژدہ سنا کر للچاتیں تو وہ جیسے بہرہ بن جاتا۔اس طرح چار پیسوں کے لئے آخر کون پیچھے پھرتا رہتا۔وہ سب بھی اسے پاگل سمجھ کر چھوڑ گئیں۔

پہلی بار جب اس نے ظہورن کو بے دردی سے دھتکارا تھا تو بظاہر اسے محسوس نہ ہوا تھا مگر جب وہ تھکے تھکے قدم ڈالتی اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو ذرا ہی دیر بعد بھورے کو ایسا لگا کہ ایک پھانس ہے جو دل کے پاس کھٹک رہی ہے۔

بھورے نے جی بہلانے کے لئے الاپنا شروع کیا۔

نہ تم سے دل کو لگاتے نہ غیر کہلاتے
گلوں میں بیٹھتے گلزار کی ہوا کھاتے

ہُوں......ہُوں......ہُوں......ہُوں......ہُوں......ارے ہاں مفت ہوئے بدنام سنوریا تیرے لئے۔ پھر وہ لمبی سانس لے کر میلی پرانی آرام کی کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔آج جنے ساری فون کرنے والیاں کہاں مر گئیں۔اس نے اپنی سیکنڈ ہینڈ گھڑی کی طرف دیکھا۔دس بج گئے ابھی تو کلاسیں بھی نہ ختم ہوئی ہوں گی......تم کو تو مسٹر بھورے یوں ہی جلدی مچی رہتی ہے ابھی وقت ہی کیا ہے۔ وہ پاجیوں کی طرح مسکرایا۔نیچی کرسی پر بیٹھ کر اونچے پر ہاتھ مارنا بھورے کے بس میں نہ تھا مگر نظروں پر کون اونچ نیچ کی چھاپ لگا سکتا ہے۔فون کرنے والیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں مزے لوٹ لیا کرتا۔

فون کرنے والے بہت سے چہرے اس کے سامنے ناچ گئے۔اس نے مسرت سے آنکھیں بند کر کے کرسی پر لیٹنے کے انداز سے پاؤں پھیلا دیئے مگر لمحے بعد پھر وہی اکتاہٹ اور افسردگی اس کے دل میں گھمسان کا رن ڈالنے لگیں۔آج تو کسی خیال سے بھی اسے پہلی جیسی خوشی نہ مل رہی تھی۔وہ پھر گانے لگا۔

ہوائیں کوچے سے ہر طرح کی ترے آئیں
سزائیں دل کے لگانے کی سینکڑوں پائیں

ہاں ہاں......ہوں ہوں......

مفت ہوئے بدنام سنوریا تیرے لئے

تیسرا مصرع بیتے ہوئے برسوں نے ذہن سے نکال پھینکا تھا۔

چلی گئی تو کیا ہو گیا؟ ایسی ایسی بہت پھرتی ہیں۔مسٹر بھورے تم کو کیا کمی ہے؟ مایوسی کے دن میں اس نے مسرت کا جھنڈا لہرانا چاہا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔اس سائڈ پر سالی کیسی خاموشی رہتی ہے۔آج بھورے کو یہ جگہ بُری معلوم ہونے لگی۔اس نے سوچا کہ وہ ادھر ہوتا، اس طرف کے ٹیلی فون پر اس کی ڈیوٹی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ ہر وقت آنے جانے والوں کا شور، عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سالے سارے خیال ویال بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، دماغ میں تو بھُس بھر جاتا ہے۔انسان کی ذات سے نفرت ہو جاتی ہے اور یہ عورت ذات کیسی ڈھیٹ ہوتی ہے۔بچہ جنتے ہوئے کتنا شور مچاتی ہے۔ چیخ چیخ کر کان کھالیتی ہے جنم

جنم کے لئے بچہ پیدا کرنے سے توبہ کرتی ہے اور پھر سال کے اندر پیٹ پھلائے اسی اسپتال میں آتی نظر پڑتی ہے۔ کیسا عجیب سا لگتا ہے۔

اور پھر جانے کہاں سے ایک خیال بھورے کے دماغ میں آ گھسا۔ جو میں نے ظہوریا سے شادی کر لی ہوتی تو ایک دن وہ بھی یہاں آتی۔ میں ساری رات لیبر روم کے دروازے پر کھڑا اس کی چیخیں سنتا رہتا۔ جنے سنتا کہ بھاگ کھڑا ہوتا! چیخوں سے تو دل دُکھتا ہے۔ بھورے نے لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔ جنے کہاں چلی گئی ہو۔ اس عورت ذات کا دل تو دیکھو، اتنی بڑی دنیا بنا دی اور اس کی کوئی عزت نہیں، کیسا دھتکار دیا تم نے بھورے۔

زور سے گھنٹہ بجنے کی آواز آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی اور مریضہ آ گئی ہے پرلی طرف کے گیٹ کا چوکیدار سامنے کے لان سے ہوتا اس کی طرف آ رہا تھا۔ بھورے اچک کر کھڑا ہو گیا۔ ''کتھے سے آ رہے ہو بادشاہو'' اس نے ہنس کر ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے وقت بے وقت کے لئے پنجابی کے تھوڑے سے لفظ سیکھ لئے تھے جو وہ اپنی زبان کے ساتھ ملا کر استعمال کر لیا کرتا۔ ''آؤ دو سوٹے ہو جائیں۔ سگرٹ کے'' بھورے نے جیب سے بگلا سگریٹ کی ڈبیا نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

''یار تیرے تو مزے ہیں، نکھانچ سے بیٹھا رہتا ہے۔'' چوکیدار نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ ''میرے پھاٹک سے ابھی ایک عورت کی لاش گئی ہے۔ بس جی خراب ہو گیا۔ ادھر وہ گئی ادھر دوسری آ گئی بچہ جننے۔''

''ہاں!'' بھورے نے بجھی سی آواز میں کہا، اسے ایک دم خیال آیا کہ جب وہ پیدا ہوا تھا تو اس کی ماں بھی مر گئی تھی۔ یہ بات اس کی خالہ نے اسے بتائی تھی۔

یار یہ عورت ذات کیسی جیالو ہوتی ہے؟'' بھورے نے لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔ ''لوگ تو یونہی بھی اس عورت ذات کے پیٹ میں بچہ ڈال دیتے ہیں۔ کتنا دکھ جھیلتی ہے یہ عورت۔'' بھورے کا جی بھر رہا تھا۔ اسے پھر ظہورن یاد آ رہی تھی۔

''جیالو، اُوئے رہنے دے۔ یہ عورت ذات بچہ نہ پیدا کرے تو جانو اس پر ساری دنیا کا دکھ پھٹ پڑتا ہے اپنی خوشی سے کرتی ہے، پھر اتنی گندی ہوتی ہے یہ عورت ذات۔'' چوکیدار نے نفرت سے شانے سکوڑے اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر سرگوشی کے انداز سے بولا۔ ''بیئر کی بوتل لے آیا ہوں۔ دل کرے تو رات میرے کوارٹر میں آ جا، تجھے بھی چاند ستارے دکھا دوں۔''

بھورے صرف ہنس کر رہ گیا۔ اس وقت اسے چوکیدار کی کوئی بات اچھی نہ لگی تھی۔ اس وقت تو اسے اپنی ماں یاد آ رہی تھی۔ بھلا ماں کس طرح گندی ہو سکتی ہے۔ اور پھر یہ پینے پلانے کی بات۔ اس نے ایک دن پی تو تھی مگر ذرا سی پی کر گھوم گیا تھا۔ اسی وقت مس زیدی آ گئی تھیں۔ وہ کرسی سے بھی نہ کھڑا ہوا اور بیٹھا گا تا رہا تھا۔ ''کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو۔'' مس زیدی نے اسے بڑے زور سے ڈانٹا تھا۔ ''تم کو کیا ہو گیا ہے۔ تمہاری رپورٹ ہوگی۔''

''دارو پلائے دی اپنے یار نے ماپھی دیو مس صاحب۔'' نشے کی حالت میں وہ اردو انگریزی اور پنجابی کے سارے الفاظ بھول گیا تھا اور صرف اپنی مادری زبان یاد رہ گئی تھی۔ مس زیدی کو ایک دم ہنسی آ گئی تھی تو گڑ گڑا کر رونے لگا تھا۔

''آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا تم تو بہت اچھے ہو بھورے۔'' مس زیدی فون کر کے چلی گئیں تو بھورے اس فکر میں دم بخود پڑا رہا تھا کہ کہیں اس کی شکایت نہ ہو جائے مگر مس زیدی نے شکایت کرنے کے بجائے خوب قہقہے لگائے تھے اور سب کو بتایا کہ بھورے پی کر ان کے تیر سیدھے کرا رہا تھا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کو یاد کرتے کرتے بھورے نے تھک کر سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔ اوپر کی سیڑھیوں پر کھٹ کھٹ ہو رہی تھی وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس آواز سے وہ سمجھ جاتا کہ کوئی فون کرنے آ رہا ہے۔ برآمدے کے اوپر والی منزل پر بہت سے کمرے تھے جہاں طالب علم اور ہاؤس سرجن لڑکیاں رہتی تھیں۔ وہ ان سب کے نام اور ہسٹریاں تک جانتا تھا۔ کون کسے فون کرتا ہے۔ کون کس کا دوست ہے۔ کون محبت میں کامیاب ہو گیا ہے اور کون ناکام۔ رات کس نے آنسو بہائے تھے۔ کس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، کون سکون سے سویا تھا۔ کس کا ملنے والا آیا تھا۔ کون سی فلم دیکھی تھی۔ شادی کا کب ارادہ ہے۔

مس لال خاں مسکراتی ہوئی فون کے پاس آئیں تو بھورے کھڑا ہو گیا۔ "ہلو، ناصر بول رہے ہو، ہوں ہوں نہیں بھئی، ہائے میں مرگئی تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ اچھا کل ضرور آنا، خدا حافظ۔"

مس لال خاں کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں آپ ہی آپ مندی جا رہی تھیں

مس لال خاں کے جانے کے بعد بھورے نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ سب یہی کرتے ہیں، سب ایک جیسے ہوتے ہیں بھورے۔ ظہوریا کب آئے گی؟ وہ آئے گی تو وہ اسے سینے سے لگا لے گا...... ارے! وہ اپنے اس خیال پر چونک پڑا۔ بھلا اسے یہ خیال آیا ہی کیوں وہ تو خواہ مخواہ اسے یاد کر رہا ہے۔

رکھی آپا کی لڑکی بڑے ٹھسے سے اس کی طرف آ رہی تھی۔ بھورے نے شوق سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ لجاتی ہوئی اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ بھورے نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

"ابھی بازار نہیں گئے۔ کب لاؤ گے میرا کپڑا؟" وہ اترا رہی تھی۔

بھورے نے اس کے بھرے بھرے جسم پر کئی چٹکیاں لے لیں..... "لا دوں گا ڈیئر۔

برآمدے کے پرلی طرف کوئی آ رہا تھا۔ لڑکی جیسے بڑی مصروفیت کے ساتھ جلدی سے آگے بڑھ گئی اور بھورے کو محسوس ہوا کہ اس کی طبیعت ذرا کھل گئی ہے۔

سکون کی ایک سانس لے کر وہ کرسی پر پھیل کر لیٹ گیا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ کل آپا کی لونڈیا کو کچھ نہ کچھ ضرور لا دے گا۔ اسے اپنی انگلیوں میں چٹکیوں کی لذت محسوس ہو رہی تھی۔

ایک بار پھر گھنٹے کی تیز آواز گونجی تو اتنی مشکل سے پیدا کی ہوئی لذت ایک دم رفو چکر ہو گئی۔ اس کا جی دکھ گیا۔ اسی طرح تو ظہوریا بھی آتی ہوگی۔ اکیلی پڑی رہتی ہوگی اور کوئی دور دور پوچھنے والا نہ ہوتا ہوگا۔

اس کی نظر برآمدے کے اس ستون کی طرف اٹھ گئی جو اس کے ٹیلی فون سے تھوڑی دور تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس وقت بھی ظہورن وہاں لیٹی ہے......

وہ برسات کی ایک دوپہر تھی۔ اس دن ہوا بند تھی اور مارے امس کے جی گھٹا جا رہا تھا۔ بھورے اپنی کرسی پر بیزار پڑا اونگھ رہا تھا۔ اس وقت اسے محسوس ہوا کہ کوئی دبے قدموں اس کے پاس سے گزر گیا ہے۔ اس نے آنکھ کھول دی۔ چوڑی چوڑی نیلی دھاری کی قمیض اور مردانہ سا پاجامہ پہنے جنرل وارڈ کی کوئی مریضہ ستون کے پاس دری کا ٹکڑا بچھا رہی تھی۔ وہ تو سمجھا تھا کہ کوئی اس کی اپنی ہوگی اور ذرا وقت مزے سے گزر جائے گا۔ اس نے بڑی بے اعتنائی سے منہ پھیر کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ جنرل وارڈ کی زچائیں گرمی سے گھبرا کر ادھر آ جاتیں۔ کھلی فضا اور سناٹے میں ذرا دیر غفلت کی نیند سو کر چلی جاتیں۔

بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے آسمان پر اس طرح پھیلے ہوئے ہوتے جیسے راہ میں دھول اڑ رہی ہو۔ سامنے لان میں بڑھی ہوئی گھاس پر ایک بدبد جانے کیا چگ رہا تھا اور بڑے اونچے پر کوئی چیل پر پھیلائے اڑی جا رہی تھی۔ اس وقت بھورے نے اکتا کر آنکھ کھول دی۔ ساری قمیض پسینے سے تر ہو رہی تھی اور وہ عورت بھی اب اٹھ کر برآمدے کے ستون سے سر ٹیکے بیٹھی جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ بادلوں کے دو چار چھوٹے چھوٹے سیاہ ٹکڑے کہیں دور سے سفر کرتے ہوئے سامنے آ گئے تھے۔

عورت ہولے ہولے گانے لگی:

بنوا تلے ڈولا رکھ دے مسافر، آئی ساون کی بہار رے

بھورے نے چونک کر ادھر دیکھا اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ عورت اسے سنانے کے لئے گا رہی ہے۔

اپنے محل میں گڑیاں کھیلت تھی سیاں نے بھیجے کہار رے

عورت کی آواز ذرا سی اونچی ہو گئی مگر اس کا سر اسی طرح برآمدے کے ستون سے لگا ہوا تھا۔ ویسے تو بھورے کو اسپتال میں آ کر بچے پیدا کرنے والی عورتوں سے ذرا دلچسپی نہ تھی مگر آج جانے کیوں اس عورت کا وجود اس کے لئے کشش کا باعث ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ عورت ہوگی مزے دار۔ کرسی سے اچک اچک کر دیکھنے کے باوجود اسے اس کا چہرہ نظر نہ پڑا۔ ستون اس کے

صرف اسے سنانے کے لئے گا رہی ہے۔ اگر اور کوئی نہ بیٹھتا۔

کھنکارنے کی آواز پر عورت یوں چپ ہوگئی جیسے سچ مچ ڈولے میں سوار ہو کر سیاں کے گھر چلی گئی ہو۔ چند منٹ تک وہ یوں ہی سر نیکے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر دری کا ٹکڑا سمیٹ کر کھڑی ہوگی۔

جب وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بھورے کے پاس سے گزرنے لگی تو اس نے بڑی نفرت سے بھورے کی طرف دیکھا اور پھر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ "ارے تو سیتاپور کا بھورے نا ہیں ہے"

"اور تو ظہورن ہے نا؟"

دونوں کی نظروں میں اضطراب تھا۔ عورت نے شرما کر دوپٹہ ماتھے تک کھینچ لیا اور نظریں جھکا لیں۔ بھورے کرسی سے اچھلا اور پھر بیٹھ گیا۔ کلیجے پر چوٹ سی لگی۔

وقت نے پلٹ کر دیکھا۔ بھورے کی خالہ نے ظہورن کی پیدائش پر ٹھیکرے میں پیسہ ڈال کر دیا تھا۔ اس طرح ظہورن ساری برادری کی نظروں میں بھورے کی ہوگئی تھی اور جب ظہورن بارہ سال کی ہوئی تھی تو بھورے کو دیکھ دیکھ کر شرمانے لگی تھی۔ وہ اپنی بھیکتی ہوئی مسوں پر ہاتھ پھیر کر سخت احمقوں کی طرح ہنستا تھا۔ پھر جب ظہورن چودہ پندرہ برس کی ہوگئی تھی تو اپنے ساتھ کھیلنے والی لڑکیوں سے پیغام بھجواتی تھی کہ ظہورن تیرا انتظار کررہی ہے۔ ڈولا لے کر کب آئے گا۔ بھورے محنت مزدوری کر کر کے کوڑی کوڑی بچار ہا تھا کہ گھر آباد کرلے خالہ کے لئے خدمت کرنے کو کوئی آجائے اور پھر یہ کہ ظہورن اسے اچھی بھی لگنے لگی تھی۔ اسی زمانے میں ملک آزاد ہوگیا۔ بھورے لاکھوں کمانے کے لئے لاہور آ گیا اور کئی سال دھکے کھانے کے بعد اسپتال میں نوکر ہوگیا۔ لاہور کی رنگین زندگی اور تنہا شخص۔ ظہورن تو خواب کی طرح یاد رہ گئی تھی اور سیتاپور...... بھلا کیا رکھا تھا۔ سیتاپور میں سارا دن سڑکوں پر دھول اڑا کرتی۔ راہ گیر درختوں تلے گٹھڑیاں ہر ہانے رکھ کر سوتے رہتے اور درختوں پر بیٹھے ہوئے بندر اس تاک میں دیدے گھماتے رہتے کہ کیا اچک لے جائیں۔ بابو لوگوں کے تھوڑے سے بنگلے، پرانی وضع کے دو چار مندر، لڑکیوں کا ایک کالج جہاں رات گئے تک کیرتن کی آواز آتی رہتی۔ بھلا کون یاد رکھتا ہے اس سیتاپور کو؟

مگر اب جبکہ ظہورن اس کے سامنے کھڑی تھی تو اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ظہورن کسی دوسرے کی ہوگئی۔ وہ جسے بھورے کی خالہ نے ایک آنہ ٹھیکرے میں ڈال کر بھورے کے لئے خرید لیا تھا اور اب اُس کے ایک آنے کے بدلے میں اس سے وفاداری نہ پا کر دُکھ سے تلملا اُٹھا تھا۔ اس اسپتال میں آنے کے بھلا کیا مطلب ہیں۔ یہی نہ کہ بچہ پیدا کرنا ہوتا ہے یا پھر کسی زنانے مرض کا علاج۔

"کیسے آنا ہوا اسپتال میں؟" بھورے نے تصدیق چاہی۔

مگر ظہورن کچھ نہ بولی۔ سر جھکائے ساکت کھڑی رہی، پھر نظریں اٹھا کر اور بھورے کو بڑی دُکھی دُکھی نظروں سے دیکھ کر لان کی طرف دیکھنے لگی جہاں ایک پیاسی ٹیٹری شور مچاتی اُڑی جارہی تھی۔

"مینہ برسے گا ٹیٹری چیک رہی ہے۔" ظہورن نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں!" بھورے کو اپنے دُکھ میں اچانک کمی کا احساس ہونے لگا۔ کیا کہتی تھی خالہ۔ ٹکے کی ہنڈیا گئی، کتے کی ذات پہچانی۔

"چاچا چاچی کہاں ہیں؟ سب کیسے ہیں؟ بھورے نے دنیا کی باتیں کرنا شروع کردیں مگر ظہورن کی میلی میلی پیلی آنکھوں میں ایک دم آنسو آ گئے۔ وہ بھورے کے قدموں کے پاس پکے فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ ایسی تھکی اور نڈھال نظر آرہی تھی جیسے کوسوں دور سے چل کر آرہی ہو، بھوکی پیاسی، پیروں میں چھالے...... "اماں آتے ہی ہیضے میں مرگئی۔ دو سال ہوئے کہ بابو بھی

بنوائے تھے وہ اب تک کلیجے سے لگا کر رکھ چھوڑے ہیں۔ کبھی تن کو نہیں لگائے، بابو نے تجھے اس لاہور میں سب جگہ تلاش کیا پر تو نہ ملا۔ بڑے سہروں میں کتنا آدمی بستا ہے پر اماں کو اللہ جنت دے کہا کرتی تھی کہ جی سے ڈھونڈو تو کھدا بھی مل جاتا ہے۔ سچ کہتی تھی اماں، وہ مسکرانے لگی۔

چھوڑو ان باتوں کو اب، پرائی ہو کر ایسی باتیں کیوں کرتی ہے؟'' بھورے جھلّا اُٹھا یہ عورت ذات بھی بڑی چتر باز ہوتی ہے۔ اب نخرے کر رہی ہے۔

''یہ تو کہہ رہا ہے؟'' ظہورن نے جانے کیسی سرشاری سے آنکھیں بند کر لیں۔ ''میں تو جی جان سے تیری ہوں بھورے'' وہ ساری جان سے کانپنے لگی۔ پہلے بیمار چہرے پر ہلکی سی سرخی رینگ گئی اور بھورے نے اپنے سیتاپور میں دیکھا کہ ایک چمپئی رنگ کی لڑکی سرخ اوڑھنی اوڑھے کواڑوں کی اوٹ سے اس کو تاک رہی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لے۔

اس نے پوری آنکھیں کھول کر ظہورن کو دیکھا۔ یہ جی جان کو لے کر کیا کرنا ہے۔ اب ایسی باتیں یاد کرنے سے کیا فائدہ ہو گا...... ''تم اسپتال کیوں آئی ہو؟'' اس نے پھر اچانک سوال کیا۔

ظہورن نے آنکھیں کھول دیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی...... ''دیکھ اب تو بادل گھر کر آ گئے ہیں۔''

''اصلی بات کیوں چھپاتی ہے۔ کہہ دے نا کہ جب میں نہیں ملا تو تیرے باپ نے دوسرے کے ہاتھ پکڑا دیا، ایکٹرسوں والے نخرے نہ مار اب۔'' اسے غصہ آ گیا تھا۔

''واہ رے...... اس نے غرور سے سر اونچا کر لیا...... جھورن ایسی نہیں کہ ایک کے بعد دوسرا کھسم کر لے۔ میری شادی تو تیرے ساتھ ہو چکی تھی۔ تیری کھاطر اپنا دیس چھوڑا، ماں باپ چھوٹے، ماں یہاں نہ آتی تو بچہ کیوں ہوتا، بابو ٹرک تلے کیوں آتا۔'' ...... وہ رو پڑی...... یہ سب تو جبر دستی ہے، بابو کے بعد کون دیتا روٹی، کوٹھیوں میں کام کر کے پیٹ بھرتی تھی، پر بھورے یہ سہری بابو بڑے کھراب ہوتے ہیں۔ ہر سال اس اسپتال میں آ کر کچے بچے جنتی ہوں۔ مر مر کر جیتی ہوں۔ بابو صاحب اپنے کسی بیرے کھانسامے کو میرا شوہر لکھا جاتے ہیں۔ اس باری وہ کھانساماں کہتا تھا کہ جھورن ایسے کب تک چلے گا میرے ساتھ دو بول پڑھا لے۔ تجھے لے کر دور بھاگ جاؤں گا۔ پر میں ایسا کر سکتی تھی؟'' ...... وہ سسکیاں بھرنے لگی اور پھر ڈوبتی ہوئی آواز میں بولنے لگی...... ''اب تو مل گیا ہے بھورے، اب میں کہیں نہ جاؤں گی، دیکھ برتن مانجھ مانجھ کر ہاتھ گھس گئے۔'' اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اس کی ہتھیلیوں میں مشقت کے گھٹے پڑے ہوئے تھے اس نے اپنا سر گھٹنے پر ٹیک لیا اور گھٹی گھٹی سسکیاں بھرنے لگی۔

بھورے چپ چاپ بیٹھا اسے روتے دیکھتا رہا۔ جیسے وہ کوئی راہ چلتا اجنبی تھا۔ ساری لگاوٹ اور حسد رفو چکر ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس ظہورن سے اب اس کا کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ یہاں تو جانے کتنی اس کے پیچھے پھرتی ہیں۔ اس کی کون سی خواہش ہے جو پوری نہیں ہو جاتی۔ اس نے تو یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کوئی ایسی ویسی عورت اس کی بیوی بن جائے مگر اب یہ ظہورن جانے کتنے حرامی بچے جن کرا سے بیتی باتیں یاد دلانے آئی ہے۔

روتے روتے ظہورن نے خود ہی چپ ہو کر آنسو پونچھ لیے۔ شاید وہ انتظار کر رہی ہوگی کہ اب بھورے اسے چپ کرائے گا۔ اب اپنے ریشمی رومال سے آنسو پونچھے گا، اب اسے تسلی دے گا۔

آنسو پونچھ کر وہ اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی اور بھورے اس سے نظریں بچا رہا تھا۔ بھلا ظہورن بھورے کی بیوی بن سکتی تھی! بھورے جس کی اس برآمدے اور ٹیلی فون پر حکمرانی ہے۔ ذرا بھی ظہورن دیکھتی تو، وہ کس شان سے رسیور اُٹھا کر ہلو کہتا ہے اور کتنی لڑکیاں اس کے پیچھے پھرتی ہیں۔

''تو پھر تو اسی خانساماں سے شادی کرلے ظہورن۔'' بھورے نے بڑی ہمدردی سے مشورہ دیا۔ ''میں نے تجھ سے شادی کی تو لوگ کیا کہیں گے۔'' وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''ارے، یہ تو کہہ رہا ہے؟'' اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھورے کو دیکھا اور پھر کھڑی ہوگئی۔ ''جا رے میرا نام جبورن ہے۔

میری سادی جو ہونی تھی سو ہوگئی۔ میں تیری جیسی نہیں ہوں۔ یاد ہ لے لے جو دوسری سادی کروں......'' اس نے بڑے غرور سے سر جھٹکا...... ''جبورن جندگی بھر تیرے نام پر بیٹھی رہے گی اور دوسروں کے بچے اسی اسپتال میں آکر پیدا کرے گی۔ یہ سب کسمت کے کھیل ہیں رے۔''

وہ ایک بار پھر تڑپ کر روئی مگر جلدی سے آنسو پونچھ کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس کا کمزور جسم کانپ رہا تھا...... ''اماں کو اللہ جنت نصیب کرے، کہتی تھی کہ جبورن ڈھونڈے سے تو کھدا بھی مل جاتا ہے۔ جانے لوگ ایسی کہاوتیں کیوں بناتے ہیں اس نے مایوسی سے سر جھکا دیا۔ ایک لمحے تک یوں ہی کھڑی رہی۔ پھر اس نے بھورے کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ اسے اپنا کلیجہ جلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مگر جب وہ کچھ کہنا چاہتا تھا تو ظہورن بڑی تیزی سے اپنے جھانگڑ جیسے جسم کو لہراتی برآمدے کے اس سرے پر جا چکی تھی۔

بھورے دیر تک برآمدے کے اس موڑ کو دیکھتا رہا جہاں ظہورن کھو گئی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو جیسے چونک پڑا۔

''مس زیدی آج چھٹی پر ہیں، جی کہیں گئی ہیں۔ یہاں نہیں ہیں۔'' بھورے نے پہلی بار اپنی ڈیوٹی سے بے ایمانی کی۔

پھر وہ ظہورن کو ٹھکرانے والا پہلا دن یوں ہی اچاٹ اچاٹ سا گزر گیا۔ وہ لاکھ گاتا رہا۔

نہ تم سے دل کو لگاتے، نہ غیر کہلاتے
گلوں میں بیٹھتے، گلزار کی ہوا کھاتے

پھر بھی اس کا دل بجھا بجھا رہا۔ شام ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد وہ جیسے خود بخود کھنچتا ہوا جنرل وارڈ کی طرف چلا گیا۔ آیا نے اسے بتایا کہ اس نام کی عورت تو گھنٹہ پہلے چھٹی لے کر چلی گئی۔

چلی گئی تو کیا ہو گیا؟ وہ بھلا اسے پوچھنے آیا ہی کیوں تھا؟ بھورے نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر واپس ہوتے ہوئے اس نے لہک کر گاناچاہا مگر گا نہ سکا۔ اس پر ایک دم مایوسی کا دورہ سا پڑنے لگا۔ اِدھر اُدھر پھرنے کے بجائے اپنی کوٹھری میں جا کر بے سدھ سا پڑ رہا۔

جب اندھیرا پڑنے لگا تو سیتاپور کی ظہورن سرخ اوڑھنی اوڑھ کر کوٹھری کے ادھ کھلے دروازوں سے تانک جھانک کرنے لگی۔ بھورے بلبلا کر اٹھا اور زنجیر چڑھا کر اپنے حساب ایک بار پھر ظہورن کو دھتکار دیا۔

باہر بڑے زور سے بارش ہو رہی تھی۔ کوئی ہولے ہولے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ بھورے کو یہ بھی وہم لگا۔ اس نے اپنے آپ

کو دو چار موٹی موٹی گالیاں دیں اور کروٹ لے کر منہ چھپالیا۔ وہ یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ کئی دن پہلے اس نے جمادارنی کی سب سے چھوٹی ساتویں بیٹی کو اپنی کوٹھری میں آنے کی دعوت دی تھی اور اب وہ باہر کھڑی اپنے اکلوتے بوسیدہ جوڑے کو نچوڑ نچوڑ کر بیتابی سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ ظالم بارش کا ایک ایک قطرہ روپے کی طرح کھنک کر اسے چڑا رہا تھا۔

بھیگتے بھیگتے تھک کر جب ساتویں بیٹی واپس لوٹ رہی تھی تو مارے دکھ کے رو رو کے بھورے کو کوس رہی تھی...... مرجائے لاش اٹھے، ایک روپیہ دینے کا وعدہ کر کے مکر گیا۔

اور پھر یوں ہوا کہ پہلے دن اور پہلی رات والی کیفیت بھورے کے دل و دماغ پر نقش ہوتی چلی گئی۔ اس نے ظہورن کو جھنجھلا جھنجھلا کر لاکھوں بار دھتکارا۔ جمادارنی کی ساتویں بیٹی کو ایک کے بدلے میں تین روپے دے ڈالے۔ کالی لوکٹ نرس کی لونڈیا کو جمپر کا ایک کپڑا بھی لا دیا۔ فرصت کے وقت خوب لہک لہک کر اپنے محبوب گانے بھی گاتا رہا مگر کہتے ہیں کہ پتھر کا لکھا ہوا نہیں مٹتا۔ ظہورن کی محبت پتھر کی تحریر بنتی گئی...... بھورے میں تیری ہوں، باوہ لے لے جو دوسری سادی کروں، تیرے نام پر بیٹھی رہوں گی اور دوسروں کے بچے اسی اسپتال میں آکر پیدا کرتی رہوں گی۔

پھر...... برسات بیت گئی۔ سردیاں آکر گزر گئیں۔ بہار منہ موڑ گئی اور جب گرمیاں آگئیں تو بھورے نے انگلیوں پر پورے مہینے گنے۔

اس دن جب گیٹ کے چوکیدار نے کسی حاملہ عورت کی آمد پر گھنٹہ بجایا تو بھورے بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ برآمدے کے قریب موڑ کو کاٹ کر وہ ادھر پہنچ گیا جہاں آیائیں پہیوں والے اسٹریچر کو گھسیٹتی ہوئی لاتیں اور مریضہ کو اس پر ڈال کر لے جاتیں۔ دن میں کئی بار گھنٹہ بجتا۔ جانے کون کون آتا مگر ظہورن نہ آئی۔ بھورے نے سوچا، ایسے کاموں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ واپس آکر وہ بڑی امنگ سے گاتا۔

بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر خالق نے گر ملا دیا

مئی جون کی گرمیاں گزر گئیں مگر بھورے کے انتظار میں کوئی فرق نہ آیا۔ مس لال خاں اپنے عاشق سے بے وفائی کر کے، کسی دوسرے سے شادی رچا کر اسپتال چھوڑ گئی تھیں۔ مس زیدی کو دوسرے اسپتال میں زیادہ بہتر جگہ مل گئی تھی۔ بہت سی پرانی لڑکیاں چلی گئیں، بہت سی نئی آگئیں۔ جنرل وارڈ کی بھنگن کی سب سے چھوٹی ساتویں بیٹی جانے کس کے ساتھ بھاگ گئی تھی مگر بھورے کو ان باتوں سے کوئی مطلب نہ تھا۔ اس نے جانے کتنی بہت سی چیزیں ظہورن کے لئے کوٹھری میں جمع کر رکھی تھیں۔ جن میں ایک سرخ جوڑا بھی تھا۔

آج بادل چھا رہے تھے۔ پیاسی ٹیٹری چیختی ہوئی اڑی جا رہی تھی۔ ظہورن دری کا ٹکڑا اٹھائے بھورے کے سامنے سے گزر کر ستون کے پاس جا رہی تھی۔ بھورے نے آنکھیں ملیں...... کب آئے گی ظہوریا؟ کب آئے گی...... اس نے ایک بار پھر انگلیوں پر دن گنے۔ پورے بارہ مہینے ہو رہے تھے۔

بھلا بھورے کو کیسے معلوم ہوتا کہ ایک مہینے پہلے سرخ کھدر کی چادر سے منہ چھپائے جو عورت تانگے پر آئی تھی اور جسے آیاؤں نے بڑی مشکل سے لا کر اسٹریچر پر ڈالا تھا، وہ ظہورن تھی، جس نے اپنا نام تمیزن لکھایا تھا اور جو خون کی انتہا کی کمی کی وجہ سے مر گئی تھی اور صاحب کا نامزد شوہر ظہورن کی لاش کو طالب علم لڑکیوں کے لئے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

پورے بارہ مہینے۔ بھورے نے سوچا کہ اب وہ ضرور آتی ہوگی...... آج نہیں تو کل آجائے گی۔ اس نے بڑے سکون سے پاؤں پھیلا دیئے اور لہک کر گانے لگا۔

بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر خالق نے گر ملا دیا

ooo

رضیہ فصیح احمد

تیرھواں آدمی

یقین آنے والی بات نہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک زمانے میں اس شہرِ گمنام کی بسوں میں ایک آدمی بھی کھڑا نہ ہوتا تھا۔ سب بیٹھ کر سفر کرتے تھے۔ مسافروں میں کبھی دنگا فساد نہ ہوا تھا۔ مسافروں اور کنڈکٹروں میں کبھی تو تو میں میں نہ ہوئی تھی۔ مسافروں، ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں کا رشتہ ایسا تھا جیسا ایک اچھے شہر میں شہریوں کا ہونا چاہیئے۔

مگر پھر یہ ہوا کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے اس شہر میں رفتہ رفتہ بسیں کم ہوتی گئیں، مسافر بڑھنے لگے اور سواریوں کی کمی کا مسئلہ شروع ہوا۔ لوگ دفتروں سے دس پندرہ منٹ لیٹ ہونے لگے تو تشویش کا آغاز ہوا۔ شہریوں کی زبانوں پر عام شکایات، اخباروں میں خطوط اور محکمے کے نام آنے والی عرضیوں کے بعد ایک بلند سطح کی کانفرنس بٹھائی گئی جس میں بسوں کی کمی اور مسافروں کی تکالیف کا مسئلہ سامنے لایا گیا عام خیال تھا کہ ضرورت واقعی ہے، مسئلہ سنگین ہے اور اس کا فوری حل ہر حال میں دریافت ہونا چاہئے۔ چنانچہ کئی سو بسوں کی درآمد کی تجویز فوری طور پر منظور ہونے والی تھی کہ ایک ماہرِ حسابیات جو آدھے زمین سے اوپر اور آدھے زمین کے اندر تھے، بول اٹھے۔

''صاحب! اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔''

''فرمایئے۔'' صاحبِ صدر نے کہا۔

''جناب والا! حساب کی رو سے اتنے لوگ بسوں میں سفر کرتے ہیں اور بسیں اتنی ہیں۔ چنانچہ اگر ہر بس میں فقط آٹھ آدمیوں کو کھڑے ہونے کی اجازت دی جائے تو بات بن سکتی ہے۔ ہر پندرہ منٹ بعد ایک بس چلتی ہے اور ہر بس میں آٹھ آدمی زیادہ سفر کر سکتے ہوں تو حساب کی رو سے کوئی بھی آدمی بس سٹینڈ پر انتظار نہ کرے گا اور اس طرح ہمارا...... زرِ مبادلہ...... قیمتی زرِ مبادلہ جو کسی پیداواری قوت میں اضافہ کرنے والی مشین پر خرچ کیا جا سکتا ہے بچ جائے گا...... یہ میری چھوٹی سی ذاتی رائے ہے۔'' واہ واہ تو آپ پہلے کیوں نہ بولے۔ اس میں تو کچھ جان نظر آتی ہے۔ صاحب کرسی نے کہا:

ہر ایسی تجویز جس میں زرِ مبادلہ بچتا یا صرف اس کی ذات پر خرچ ہوتا ہو حکومت کے ہر افسر کو بڑی جاندار نظر آتی ہے۔

جب اس تجویز کو دوبارہ صاحب کرسی نے اپنے الفاظ میں کمیٹی کے سامنے پیش کیا تو جن لوگوں کو یہ پہلے مُردہ نظر آتی تھی انہیں بھی اس میں جان پڑتی نظر آئی اور تھوڑی ہی دیر کی بحث و تمحیص کے بعد مردہ زندہ ہو گیا۔ سب نے اس تجویز پر صاد کر دیا۔ زرِ مبادلہ کی بچت کی فوری خوشی میں بھاری چائے پی گئی اور ضروری کارروائی کے بعد یہ حکمنامہ جاری کر دیا گیا کہ بحکمِ سرکار شہرِ گمنام کی ہر بس میں آٹھ آدمیوں کو کھڑے ہونے کی اجازت ہے۔ کنڈکٹر کا فرض ہے کہ وہ آٹھ سے زیادہ آدمی بس میں کھڑے نہ ہونے دے کہ وہ امنِ عامہ کے لئے خطرہ اور حادثے کا سبب ہو سکتے ہیں۔

دوسرا دن وہ پہلا تاریخی دن تھا جس میں شہرِ گمنام میں لوگ بسوں میں کھڑے ہوئے اور جب کنڈکٹر نے گنا وہ آٹھ سے زیادہ تھے۔ نو...... دس...... گیارہ بارہ۔ اور جب کنڈکٹر نے آخری آدمی سے اترنے کی درخواست کی تو کوئی بھی نہ اترا۔ کسی نے کہا کہ وہ پہلے چڑھا تھا آخری آدمی کوئی اور تھا۔ کسی نے کہا وہ بوڑھا اور کمزور ہے اس لئے اسے پہلے جانے کی اجازت ہونی چاہئے۔ نوجوان نے جواب میں کہا تو کیا وہ اپنی جوانی کی سزا بھگتے اور بس سٹینڈ پر کھڑا کھڑا بوڑھا ہو جائے۔ پہلے ہی دن آخری آدمی کی تلاش نہ ہو سکی نہ یہ طے پا سکا کہ کس عمر اور سائز کا بچہ آٹھواں آدمی شمار کیا جا سکے گا۔ یہ وہ پہلا دن تھا جب بوڑھوں نے جوانوں کے سر سے شفقت کا ہاتھ اٹھایا اور جوانوں کے دلوں میں بوڑھوں کا لحاظ ختم ہوا۔ مسافروں کی آنکھوں سے ایک دوسرے کی مروت اٹھ گئی۔

اس دن تقریباً ہر اخبار میں بسوں میں کھڑے ہونے والوں کی تصویریں شائع ہوئیں اور یہ خبر چھپی کہ شہرِ گمنام میں ہر جگہ

اپنا نذرانہ وہ باہر ہی سے لے لیتا ہے اور حکومت سے اس کی تنخواہ ماہ بماہ آج بھی مل رہی ہے اب شہر گمنام میں نئی بسوں کی درآمد کا سوال کبھی نہیں اٹھتا۔ جب اٹھتا ہے یہی سوال اٹھتا ہے کہ آیا مسافروں کو بس کی چھت، اس کے بریک، ونڈ اسکرین / سٹیرنگ وہیل پر بیٹھنے یا کھڑے ہونے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

OOO

سلیم اختر

ماں بیٹا

''کیا کہا؟ پندرہ پیسے فی حرف؟''

''ہاں۔'' اس لڑکے نے بیزاری سے جواب دیا، لڑکے نے ایک میلی بنیان اور گندی نیکر پہن رکھی تھی۔ اگست کا حبس اس کے میلے جسم پر لکیریں بناتا بہہ رہا تھا وہ ہاتھ میں چھینی پکڑے منتظر تھا کہ یہ جائے تو وہ کام میں لگے۔ سامنے نقلی سنگِ مرمر کی سل دھری تھی۔

''میرے خیال میں تمہیں غلطی لگی ہے۔'' اس نے پُر امید لہجہ میں کہا۔ ''پندرہ پیسے فی لفظ ہوگا۔''

لڑکا سمجھ گیا تھا کہ یہ کام اور اس کا خرچ اس گاہک کی اوقات سے زیادہ ہے لہٰذا اس نے جواب دینے کی ضرورت بھی نہ محسوس کی اور سل کو سیدھی کر کے بیٹھ گیا۔

حبس سے بوجھل ہوا اس کے بدن میں جیسے بیزاری کی چنگاریاں بھر رہی ہو، وہ بڑی مشکل سے دفتر سے ایک گھنٹہ کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فٹافٹ بات طے ہو جائے گی مگر یہ بد بو دار لڑکا نہایت نامعقول تھا اس کے ریٹ بھی نامعقول تھے اور اس کا رویہ ریٹ سے بھی زیادہ۔

''دکان کا مالک کہاں ہے؟'' اب اسے لڑکے پر غصہ آ رہا تھا جو اس کے وجود سے یوں لاتعلق تھا گویا وہ ایک معزز گاہک کے برعکس مسجد کی تعمیر کے لئے چندہ مانگنے آیا تھا۔

''مالک گیا ہے۔'' وہ اسی غصہ دلانے والی لاپرواہی سے بولا۔

''پندرہ پیسے لفظ نہیں لگا نے؟''

لڑکے نے جواب دینے کی ضرورت بھی نہ محسوس کی تو یہ دل ہی دل میں اسے گالیاں نکالتا ہوا چلا۔ یوں محسوس ہوا گویا سب نے اسے لوٹنے کا ایکا کر رکھا ہے۔ پندرہ پیسے فی حرف سے کم تو کسی نے کیا بتانا تھا، سترہ۔ بیس بلکہ پچیس پیسے تک جانے والے بھی تھے۔ البتہ سب اس لڑکے ایسے بدتمیز نہ تھے۔ آٹھ دس دکانیں گھوم جانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ آج بات نہ بنے گی۔ اس کی جیب میں پیسے تھوڑے تھے اور حبس بہت زیادہ۔ سرکاری عمارتوں کے سنگِ بنیاد، بن کھلے مرجھا گئے غنچے۔ باعصمت بیویاں، مکانوں کی منزل کے نشان، مسجد کا نام، شبیہ سب پتھر کی سل بنے ان دکانوں میں موجود تھے۔ ملگجے سنگِ مرمر پر سیاہ چمکیلے حروف۔ آیات اور کلمات۔ حسرت ناک اشعار دل کا درد۔ غم کی پکار۔ محبت کا اظہار سب کچھ پندرہ پیسے فی حرف کے حساب سے پتھر بن چکا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا پتھروں کے یہ سوداگر اسے لوٹنے کو ہی بیٹھے ہیں۔ دس انچ چوڑے بارہ انچ لمبے نقلی سنگِ مرمر کی سلیٹ پندرہ بیس اور بعض صورتوں میں ۲۵ روپوں تک گئی تھی اور ان پر مستزاد پندرہ پیسے فی حرف۔ یہ تو گورکنوں اور لٹھا بیچنے والوں سے بھی بڑھ گئے تھے۔ دفتر واپس آ کر اس نے بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ مرقد۔ نفیسہ خاتون زوجہ کرم الدین۔ تاریخ انتقال ۱۵ر جولائی ۱۹۷۱ء، عمر ۴۵ برس، آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے۔ غمگسار بیٹا عبداللہ خان عفی عنہ۔ یہ سب لکھ کر جب ان کے حروف کا ٹوٹل کیا اور انہیں پندرہ پیسوں سے ضرب دے کر سو پر تقسیم کر کے نتیجہ روپوں کے خرچ کی صورت میں نکالا تو سینہ سے بے اختیار ٹھنڈی سانس نکل گئی۔

عبداللہ خان کے لئے ۱۵ر جولائی ۱۹۷۱ء تک اس دنیا میں صرف دو ہی پیارے تھے۔ ایک ماں اور دوسری بیوی۔ مگر ۱۵ر جولائی کے بعد صرف بیوی رہ گئی۔ بیوی واقعی اسے بے حد پیاری تھی۔ ماں کے انتقال سے پہلے تو خیر وہ تھی ہی لیکن ماں کے انتقال کے بعد بیوی نے جس طرح اس کی دلجوئی کی اس نے اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کا وفادار شوہر بنا دیا تھا۔ عبداللہ کا باپ بچپن میں مر گیا تھا۔ دو بیٹیاں، ایک بیٹا اور دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان، یہ اثاثہ مرحوم نے چھوڑا تھا۔ نفیسہ خاتون چاہتی تو۔

پڑھایا لکھایا دونوں پڑھ کر استانیاں بن گئیں ... بڑا فرمانبردار بیٹا تھا۔ اس کی زندگی کا سیارہ صرف ایک نور پر ...
سسرال سدھاریں تو ماں بیٹا اکیلے رہ گئے۔ عبداللہ اپنی ماں کا بڑا فرمانبردار بیٹا تھا۔ اس کی زندگی کا سیارہ صرف ایک نور پر گردش
کرتا تھا اور وہ تھا ماں۔ دفتر سے گھر آتا تو ماں کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹاتا۔ اتوار کو فرش دھوتا۔ کپڑے دھوتا۔ الغرض سلائی کڑھائی
کے علاوہ وہ گھر کے ہر کام میں طاق تھا۔ ماں کو اچھے اچھے کپڑے لا کر دیتا۔

''ارے پگلے! یہ اتنے بڑے بڑے سرخ پھولوں والا سوٹ پہن کر میں کیا کروں گی؟''

''ماں دیکھنا تو سہی یہ کتنا اچھا لگے گا۔''

وہ ہنس کر کہتی۔ ''یہ میری عمر ہے ایسے رنگ پہننے کی بھلا؟''

''ارے ماں آج کل تو لڑکے یہ رنگ پہن رہے ہیں۔ اب تو وہ بات ہی ختم ہوگئی کہ کون سا رنگ پہنے اور کون سا رنگ نہ
پہنے۔ اب تو سب مرد، عورتیں لال نیلے پیلے رنگوں میں پھرتے ہیں۔''

''پھر بھی۔ میری عمر میں یہ اچھا نہیں لگتا۔''

''عمر کی کیا بات ہے ماں، تمہاری چھب تو لڑکیوں سے بڑھ کر ہے۔''

بیٹے کی یہ تعریف بیوہ میں بیوی بیدار کر دیتی۔ اسے مرحوم خاوند یاد آ جاتا جو اس طرح اس کے لئے شوخ رنگوں کی کپڑے
لاتا تھا۔ وہ غریب سہی مگر محبت کرنے میں بڑا دریا دل تھا۔ بیٹا عادتوں اور صورتوں میں باپ بنتا جا رہا تھا اور کبھی کبھی تو وہ اسے دیکھ
کر اچانک چونک سی جاتی۔ خاص طور سے اس وقت جب اسے بیٹے کی نظریں اپنے تعاقب میں محسوس ہوتیں۔ ''تم یوں گھور گھور
کے کیا دیکھ رہے ہو؟''

''ماں تم اچھی جو لگتی ہو۔''

یہ اچانک تعریف چہرے پر سرخی لے آتی۔ ''ہشت شیطان!''

''سچ ماں!'' وہ اٹھلا کر بولتا۔ ''یہ نیلا سوٹ تو بہت ہی جچ رہا ہے۔''

وہ اس تعریف سے خوش بھی ہوتی اور چڑتی بھی۔ ''یہ تو ہر وقت کپڑوں کو کیوں دیکھتا رہتا ہے۔ تو نے تو کپڑے بدلنے محال
کر دیئے ہیں۔''

''واہ بھئی اچھی رہی۔ ایک تو کپڑوں کی تعریف کرو اور دوسرے باتیں سنو۔ اچھا تو اس نیلے سوٹ میں بہت بُری لگ رہی
ہو۔ اسے اتار کر دوسرا بدل لو۔''

''کون سا؟'' وہ جیسے بے خیالی میں پوچھتی۔

''وہی جس کی پیلی زمین پر لال اور سبز پھول ہیں۔'' وہ آنکھیں نچا کر جواب دیتا۔ وہ ہنس کر کہتی۔ ''تجھ سے نپٹنا بہت مشکل
ہے۔''

وہ ماں کی محبت میں یوں ملفوف تھا کہ اسے کبھی یہ بھی دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ محلے کی کتنی لڑکیاں جوان ہیں یا
برادری میں کیسی کیسی ٹھسہ دار موجود ہیں۔ اس جیسا شریف کماؤ اور تابعدار تو جوان کئی ماؤں کی آنکھوں کا تارا بن جاتا ہے۔ چنانچہ
محلے کی بوڑھیاں اس کی مثالیں دیتیں اور بزرگ رشتہ دار واری صدقے جاتے۔ مگر عبداللہ خان ان باتوں سے بے نیاز تھا۔
نظریں جھکائے گلی میں سے گزرتا اور صدقِ دل سے سب کو ماں بہن سمجھتا۔ اس نے کبھی شادی کی ضرورت محسوس نہ کی کہ اس نے
کبھی خود کو جوان محسوس نہ کیا۔

''چھوڑو ماں یہ کیا ہر وقت شادی شادی کرتی ہو۔''

''شادی نہ کرو گے تو پھر کیا کرو گے؟''

''کیا مطلب پھر کیا کرو گے۔ ماں! آخر اب میں کیا کر رہا ہوں۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''تو پھر۔''

''اب جوان ہوا اور اچھے رشتے مل رہے ہیں۔کل کلاں یہ بیاہی گئیں تو میں کہاں سے لڑکیاں لاؤں گی۔

وہ ہنستا ماں لڑکیاں جب چاہو لے لو۔اس ملک میں بڑی لڑکیوں کی اکثریت ہے اور اچھے لڑکوں کا کال ہے۔''

وہ اس کے ایک دھپ لگاتی۔''اس اچھے لڑکے کی بُوتھی تو دیکھو۔''

''ایسی خاص بُری بھی نہیں۔''

کبھی تو بات یوں مذاق میں ٹلتی اور کبھی یوں رخ مڑتا۔

''آخر تمہیں اعتراض کیا ہے۔''وہ سنجیدگی سے پوچھتی۔

وہ کسی شاگرد کو سمجھانے کے انداز میں جواب دیتا۔''ماں اب گھر میں کتنا امن اور سکون ہے کیوں اپنے ہاتھوں سے سینہ کا کانٹا بوتی ہو۔''

''کیا مطلب تیرا؟''

مطلب صاف ہے! کبھی ساس بہو کی بنی ہے کیا؟ پھر بے کار میں چخ چخ پالنے کا فائدہ۔''

''بہو سے وہ ساسیں تنگ ہوتی ہیں جو اسے اپنا دشمن سمجھتی ہیں لیکن اگر میں اسے محبت اور پیار دوں گی تو وہ کیوں مجھ سے نفرت کرے گی۔''

اس لئے کہ یہ رشتہ ہی نفرت کا ہے۔''

''کیسے''

''بہو تو یہ سمجھتی ہے کہ گھر میں دو ٹیمیں ہیں۔ایک اس کی اور دوسری ساس کی۔ان دونوں میں لڑائی یعنی خاوند جیتنے کے لئے میچ ہو رہا ہے۔''

''کیا بے تکی بات کی تُو نے۔''

''ماں یہ بے تکی بات نہیں۔بہت بڑی حقیقت ہے۔''

حقیقت تو واقعی یہی تھی لیکن اس وقت تک جب تک اس نے شگفتہ کو نہ دیکھا۔شگفتہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو صرف پیار کرنے اور پھر بچے پیدا کرنے کے لئے بنی ہیں۔چوڑے شانے، بھرے بھرے کولہے اور بھری بھری چھاتیاں جن سے دودھ چھلکنے کا احساس ہو۔چنانچہ عبداللہ کو بھی اور کچھ نہ سوجھی اور یوں اس کے سہرے کی صورت میں بالآخر ماں کی آرزوؤں کے پھول کھل اٹھے۔

بے دھیان کھڑے کسی شخص کو اٹھا کر تالاب میں پھینک دیا جائے تو حیرت زدہ وہ ڈبکیاں کھاتا ہے لیکن جلد ہی سنبھل کر تیرنا شروع کر دیتا ہے اور پھر اس سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔کچھ ایسا ہی تجربہ شگفتہ سے شادی بنی۔شگفتہ کی محبت بھی اس کے لئے ایک ایسا ہی تالاب ثابت ہوئی۔نیم گرم پانی کا تالاب جس کی وسعت نامعلوم۔عبداللہ خان نے جب اپنے خوف اور حیرت پر غلبہ پالیا تو وہ ایسا تیراک ثابت ہوا کہ غوطے لگاتا نہ تھکتا۔

ماں، بیٹا، بہو کی ازلی تکون کے تینوں زاویے کیسے درست تھے، محلّہ والیاں اس راز کو نہ سمجھ پائیں۔بجز اس کے کہ نفیسہ بڑی خوش قسمت تھی۔پہلے تابعدار بیٹا ملا اور پھر تابعدار بہو۔ساس اور بہو دونوں دن بھر کے کام میں جتی رہتیں۔شگفتہ کے جہیز نے خالی گھر کو بھر دیا۔یوں محسوس ہوتا گویا ساس بہو میں عبداللہ کی محبت اور توجہ حاصل کرنے کے لئے ایک غیر مرئی مقابلہ جاری تھا۔ اگر اس مقابلہ نے گھر میں کسی قسم کا تناؤ پیدا کیا تو عبداللہ کو اس کا احساس نہ ہو سکا۔نہ اسے ترازو لے کر بندر بانٹ کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان دونوں نے کبھی ایک دوسرے کی شکایت نہ کی۔لیکن اب عبداللہ کو بیوی کے سامنے ماں کو شوخ رنگ کے کپڑوں میں دیکھ کر شرم سی محسوس ہوتی۔ادھر ماں تھی کہ روز بروز زیادہ سے زیادہ سنورنے بننے میں لگی رہتی۔شگفتہ سالن پکا کر فارغ ہوتی

تو وہ اٹھ کر بہت سا گھی ڈال کر حلوہ بنا لیتی۔ عبداللہ دونوں چیزیں کھاتا اور وفاداری بشرطِ استواری کے اصول پر دونوں کی تعریف کرتا۔

فضا میں دو رنگین غبارے بلند سے بلند تر ہونے کی جستجو میں تھے لیکن ایک کی گیس نے تو بہر حال ختم ہونا ہی تھا۔

''ماں یہ تم ہر وقت سرخ جوڑا کیوں پہنے پھرتی ہو؟'' بات منہ سے نکالنے کے بعد عبداللہ کو احساس ہوا کہ اسے یہ نہ کہنا چاہئے تھا۔ دراصل دونوں میں رنگوں کے اس میچ سے وہ اکتا چکا تھا۔ ماں کا چہرہ سرخ ہوا، پھر زرد اور سیاہ۔ وہ خاموشی سے کمرہ میں گئی اور بیوگی کے ابتدائی ایام کے میلے کپڑے پہن لئے۔ یہ اس نے خاوند کی یاد میں سنبھال رکھے تھے لیکن وقت انہیں آہستہ آہستہ نئے کپڑوں کی تہوں کے نیچے کرتا گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ ان کے وجود کو فراموش کر بیٹھی۔ لیکن زندگی کا سفر آج اسے پھر ان کپڑوں کے پاس لے آیا تھا۔ اس کی زندگی کی قوس اپنے دائرہ کی تکمیل کر چکی تھی۔

شگفتہ کو اس نے قبر پختہ کرانے اور کتبہ کے خرچ کا تخمینہ بتایا تو وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ ماں کے کفن دفن، قلوں ہر جمعرات کے ختم اور ایسے ہی دیگر مذہبی اخراجات پر خاصا خرچ آ چکا تھا۔ ادھر کئی رشتہ دار دسویں تک گھر میں رہے۔ ماں تو عبداللہ کی مری تھی۔ رشتہ داروں کو تو اچھا کھانا چاہئے تھا۔ جب نقدی ختم ہو کر پرائز بانڈ بیچنے کی نوبت آئی تو شگفتہ نے بولنا شروع کیا اور ابھی چالیسویں کا سب سے بڑا خرچ باقی تھا۔ برادری کے لئے دیگیں مولوی صاحب کے لئے جوڑا۔ قبر پر بیٹھ کر تلاوت کرنے والوں کے لئے پیسے اور اسی طرح کے لمبے چوڑے اخراجات۔

ماں کو علاقہ کے چھوٹے قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ یہ شاملات کی زمین تھی جو پہلے جوہڑ ہوتی تھی پھر گوجر اپنی زمینیں بیچ کر زیادہ بہتر علاقوں میں چلے گئے تو یہ جوہڑ خشک ہو گیا اور پھر کسی نے وہاں پہلی قبر بنا دی اور یوں چالیس پچاس قبروں کا چھوٹا سا قبرستان بن گیا۔ لیکن قبریں بنانے والوں نے جوہڑ کا نشیب پُر کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ چنانچہ ہر بارش میں پانی جمع ہو جاتا اس لئے وہاں صرف پختہ قبر ہی بچ سکتی تھی اور اسی لئے عبداللہ اب تین چار سو کا اور خرچ کرنے کو تیار تھا۔

''دیکھیں یوں کرتے ہیں۔'' شگفتہ نے صلاح دی۔ ''چالیسواں ہو لے پھر دو تین ماہ میں پیسے بچا کر قبر پکی بنوا لیں گے۔''

لیکن یہ معاملہ ٹلتا گیا۔ تین ماہ بعد اس کی سالی کی شادی آ گئی وہاں خاصہ خرچ ہو گیا، پھر اس کے سالے کو قرض کی ضرورت پڑ گئی۔ اسے پیسے دینے پڑے، پھر شگفتہ بیمار ہو گئی۔ پھر سال بعد اسے دوبئی جانے کا موقعہ مل گیا۔ اس سلسلہ میں خاصا قرضہ لیا جسے اس کی بھیجی ہوئی رقم سے شگفتہ نے اتارا۔ پھر شگفتہ نے پیسے جمع کر کے اور پہلا مکان بیچ کر ایک نیا مکان خرید لیا اور جب وہ کئی سال بعد بہت کچھ کما کر لوٹا تو اسے نشیب میں ماں کی کچی قبر کا خیال آیا۔ جب وہ اپنے پہلے محلّہ میں واپس آیا تو وہ جگہ پہچانی نہ جاتی تھی۔ کسی وزیر کے رشتہ دار نے قبرستان پر دکانیں تعمیر کر دی تھیں۔ جہاں سودا لینے والوں کی خوب بھیڑ تھی۔ ماں کی قبر کا نام و نشان تک باقی نہ تھا۔

○○○

صادق حسین

برگد کا پیڑ

گاؤں کے میدان میں، کچے راستے کے پاس، برگد کا پیڑ یُوں کھڑا ہے جیسے کوئی عہد ساز مفکّر، حکمت کے سرمائے تلے جھکا، ماحول کا جائزہ لے رہا ہو۔ وقت نے اس کی جٹاؤں میں ان گنت لمحات گوندھ ڈالے ہیں۔ گرمیوں کی آمد سے پہلے اُس کے دور اندیش پتے اپنے اندر پانی جمع کر لیتے ہیں۔ سردیوں میں ہر پتے کی ڈنڈی پر برگدیوں کے جوڑے کی نمود اعلان کرتی ہے کہ یگانگت فطرت کا حسن نکھارتی ہے۔ برسوں کی جگر سوز سے اُس کے تنے میں گھاؤ آ گیا ہے۔ اس کے پتے ضرب کھا کر آنسوؤں کے سفید قطرے بہاتے ہیں تو اُس کی چوٹی صدا دیتی ہے: ''شانتی! شانتی!! آؤ یہ دُکھ ہم آپس میں بانٹ لیں۔''

گاؤں میں مشہور ہے کہ برگد کا پیڑ کلام کرتا ہے۔ بزرگ فرماتے ہیں کہ برگد کا پیڑ نہیں بلکہ اُسے دیکھ کر خود گاؤں کے باسیوں کی یادداشت بولتی ہے۔

گاؤں کا نامی پہلوان کچے راستے سے گزرتا ہے تو برگد کا پیڑ کہتا ہے: ''اے کمہار کے فرزند! بچپن میں تُو میرے چھتر کے نیچے، ننگے پاؤں، سات سمندر، کھیلا کرتا تھا۔ طاقت کے نشے میں تو کیوں اپنے آباؤ اجداد کے آوے اور چاک توڑ رہا ہے؟''

پہلوان سینہ تان کر جواب دیتا ہے: ''میں جو اُس وقت تھا اب نہیں ہوں، میرا حال میرے ماضی پر حاوی ہے۔''

تحصیلدار، گھوڑے پر سوار، شہر سے گاؤں آتا ہے تو برگد کے پیڑ سے آواز آتی ہے: اے تیلی کے بیٹے! لڑکپن میں تو میری چھاؤں میں 'چور منڈلی' کھیلا کرتا تھا مجھے تیرے پیوند لگے کپڑے یاد ہیں۔ اب تیری پگڑی کا شملہ بہت اونچا ہو گیا ہے۔

تحصیلدار گرجتا ہے: ''میں اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ کر رہا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔ میں اس تحصیل کا مالک ہوں۔ میں اگر چاہوں تو تجھے آرے سے کٹوا ڈالوں اور تیرا نام و نشان مٹ جائے، پھر مجھے اپنا بچپن یاد نہ آئے۔''

پیڑ کے زرد پتے جھڑ کر زمین پر بکھر جاتے ہیں تو مسجد کا امام آگاہ کرتا ہے: ''کل جو پتے سبز تھے آج انہیں پامال ہوتے دیکھ کر عبرت پکڑو۔''

علاقے کا بدنام ڈاکو دل ہی دل میں سوچتا ہے کہ یہ باتیں ہم برسوں سے سُن رہے ہیں مگر زرد پتے جھڑتے ہیں تو ان کی جگہ نئے پتے نکل آتے ہیں۔ پیڑ جُوں کا توں کھڑا ہے اور پیڑ اس کا مددگار ہے، تاریک راتوں میں اُسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اُس نے ڈاکہ زنی کے کامیاب منصوبے بنائے۔ زرد پتے تو اُن کسانوں کی طرح ہیں جو سر جھکائے کھیتوں میں ہل چلاتے، بیج بوتے اور انتیوں سے فصلیں کاٹتے ہیں۔ وہ تو جیتے جی مر جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اُن کا اُگایا ہوا اناج تھوک کا بیوپاری اَودلے پَونے خرید لیتا ہے۔ تھوک کے بیوپاری کے پاس ایک لمبی موٹر کار ہے۔ اُس کے خاندان کے افراد ایسے کپڑے پہنتے ہیں کہ انسان دیکھا کرے۔ ڈاکو نے تہیّہ کر لیا ہے کہ وہ اُس وقت تک منصوبے بناتا اور اُنہیں عملی جامہ پہناتا رہے گا جب تک تھوک کے بیوپاری کی لمبی موٹر کار کے حصے بخرے نہیں ہو جاتے۔

گاؤں کا نوجوان دیوانہ بار بار کہتا ہے کہ وہ خزاں کا گلا گھونٹ دے گا اس لیے کہ اس موسم میں اُس کی بانسری کے سینے میں نغموں کے چشمے منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بہار میں جب وہ بانسری بجاتا ہے تو سبز پتے جُھوم جُھوم اُٹھتے ہیں، کونپلیں رقص کرتی، جٹائیں دھمال مچاتی اور چھال تھرکتی ہے۔ عالمِ استغراق میں برگد کا پیڑ آنکھیں نیم وا کر کے سرگوشی کرتا ہے: ''دیوانے! بانسری کی لَے تیز کر دے، مایا کی کالی گھٹائیں گاؤں پر منڈلا رہی ہیں۔''

ننگ دھڑنگ، شور مچاتے بچے دیوانے کا تعاقب کرتے ہیں تو وہ دوڑ کر برگد کے پیڑ کے پاس چلا جاتا ہے اور اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پیڑ بانہیں پھیلا کر کہہ رہا ہو: ''دیوانے! میں تیرا دُکھ جانتا ہوں، دیکھ میرے سینے میں بھی گھاؤ ہے۔ یہ میرے وجود کو کھوکھلا کر دے گا۔ میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں، جب میں ٹوٹ کر گر پڑوں گا۔ وہ دن میری تکمیل کا دن ہو گا۔ اُس روز

مہذب ہیں۔

دن کی روشنی میں چمگادڑیں، برگد کے پیڑ کی ٹہنیوں سے لٹکی رہتیں اور رات کے اندھیرے میں اُڑ جاتی ہیں۔

گاؤں کے شاعر کو دیکھ کر برگد کے پیڑ سے صدا نکلتی ہے: ''تو جانتا ہے کہ دو ٹانگوں والی چمگادڑوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ تو اپنے گیتوں کی آگ سے چمگادڑوں کو جلا کر راکھ کر دے۔''

شاعر جواب دیتا ہے: ''میں تو خود اپنی آگ میں جل رہا ہوں۔ یہ روشنی بڑی اذیت ناک ہے۔''

برگد کے پیڑ کی گھمبیر آواز سنائی دیتی ہے: ''یہ آگ ہی تو زندگی کا راز ہے۔ یہ روشنی اذیت ناک نہیں، مقصدِ حیات ہے۔''

گاؤں کا ایک بزرگ جلال الدین، فجر کی نماز پڑھ کر میدان میں ٹہلتا ہے۔ برگد کا پیڑ گواہ ہے کہ برسوں پہلے جلال دین نے ایک دوشیزہ ـــــ کرم جان کو اپنی محبت کا یقین دلا کر جھوٹ بولا تھا۔ ایک تاریک رات میں، برگد کے پیڑ کے نیچے جلال دین نے قول دیا ایک دن جلال دین اچانک روپوش ہو گیا۔ کرم جان اپنے ماہیے کی جُدائی میں ڈھولک پر گیت گاتی۔ اس کی آواز میں دُکھ میں ڈوب کر اُبھرتی تو پیڑوں میں بیٹھے پنچھی پر سمیٹ کر گم ہو جاتے۔ گلہریاں پُھدکنا بھول کر دم بخود ہو جاتیں اور آنگنوں میں کنواریاں، کام کاج چھوڑ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتیں۔

کرم جان، انتظار کرتے کرتے، حُسن، جوانی اور گیتوں سے بچھڑ گئی۔ یوں جیسے کوئی حسین لمحہ وقت سے جُدا ہو کر درد کی راہوں میں بھٹک رہا ہو۔

نٹ کھٹ، منہ پھٹ، گاؤں کے بچے، کرم جان کے پیچھے بھاگتے۔ پگلی! پگلی! کی آوازیں پتھراؤ کرتیں۔ کرم جان ہانپتی کانپتی، آنکھوں کے ڈھیلے گھماتی، دوڑ کر برگد کے گھاؤ میں چھپ جاتی اور پیڑ کا جی چاہتا کہ کرم جان کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُس کے سارے دُکھ اپنے اندر جذب کر لے۔

مدت کے بعد جلال دین شہر سے لوٹ کر گاؤں آیا تو اُس کے ساتھ اس کی شہری بیوی تھی جس نے اُٹھی ایڑی کی جوتی پہن رکھی تھی۔ سر پر مصنوعی بالوں کا اینڈوا تھا۔ رخساروں پر رُوج اور پاؤڈر کی بہتات تھی اور ہونٹوں پر لپ سٹک کی چیخ پکار۔ جلال دین کو جب پتہ چلا کہ کرم جان مر چکی ہے، تو کلیجہ پاش پاش ہو گیا۔ اب جلال دین گاؤں میں جلال شاہ کے نام سے پکارا جاتا

ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ جلال شاہ کے چہرے پر نور برستا ہے۔ وہ دم کرتا اور تعویذ لکھتا ہے۔اس کے مریدوں کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

باراتیں برگد کے پیڑ کے نیچے پڑاؤ ڈالتی ہیں۔ براتی پٹیاں درست کر کے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہیں۔ ڈھول کی دھمک گونجتی ہے۔شہنائیاں بجتی ہیں۔ ڈولہا سہرا باندھ کر گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ برات چڑھتی ہے۔ برگد کے پیڑ کی چوٹی، دولہا کو آنک کر، جنبش کرتی ہے۔کبھی اثبات میں، کبھی نفی میں اور کبھی گومگو کے عالم میں۔

گاؤں کی بیٹی، ڈولی میں اُکڑوں بیٹھ، جانی پہچانی راہوں، پگڈنڈیوں، کھیتوں کھلیانوں سے جدا ہو کر ایک اجنبی دنیا کا رُخ کرتی ہے تو برگد کا پیڑ مراقبے میں چلا جاتا ہے۔تب آواز آتی ہے:" گاؤں کی بیٹی ایک بہن بھی تھی اب وہ بیوی کا رُوپ دھار لے گی۔ جب وہ ماں بن جائے گی تو اس کا وجود فطرت کی دلکشی میں جذب ہو کر نہال ہو جائے گا۔"

نور کے تڑکے، نیلوں بنوں کے اُس پار، کھیتوں میں تیتر بولتے ہیں تو اُونگھتے بچے چونک پڑتے ہیں۔ برگد کے پیڑ کے دھیان میں کھیت آتے ہیں تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔اس نے جب زندگی کا پہلا سانس لیا تو فطرت نے اس کے کان میں کہا تھا:" زمین کا مالک خدا ہے مگر انسان کہتے ہیں کہ کھیتوں کے مالک خود انسان ہیں۔" گاؤں والے تو زمین کے چپے چپے کی خاطر کٹ مرتے ہیں۔ برگد کا پیڑ اکثر سوچتا ہے کہ کھیت کسی کے بھی نہیں اور سب کے سب ہیں۔اناج کسی کا بھی نہیں اور سب کا ہے مگر تھوک کا بیوپاری کسی کو سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتا۔

ڈگڈگی کی آواز سن کر گاؤں کے بچے برگد کے پیڑ کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں۔ ڈوری سے بندھی، سُرخ رنگ کا گھاگھرا پہنے بندریا، توت کی چھڑی کے اشارے پر ناچتی ہے۔ بندریا نچانے والا، ڈوری کو جھٹکتا، کھینچتا، ڈھیل دیتا اور گیت گاتا ہے۔ کچے راستے پر گاڑیاں رُک جاتی ہیں۔ گاڑی بان، نسوار کی چٹکی منہ کے گوشے میں دبا، بندریا کے ناچ کے مزے اڑاتے ہیں۔ یہ تماشا دیکھ کر گاؤں کا شاعر آنسو بہاتا اور تنہائی میں برگد کے پیڑ سے کہتا ہے!" بندریا نچانے والا، ڈگڈگی، بندریا، چھڑی کے ان تین عناصر کو تم سمجھتے ہو یا میں۔"

گرمیوں میں بھینسیں، جوہڑ کے گدلے پانی سے نکل کر برگد کے پیڑ کی چھاؤں میں چلی جاتی ہیں۔ایک بے چینی کی حالت میں دُم ہلاتی، کان پھڑپھڑاتی، پاؤں دھب دھب زمین پر مارتی ہیں مگر اُن کے جسموں سے چمٹی جونکیں ٹس سے مَس نہیں ہوتیں۔گاؤں کا مدرس کہتا ہے کہ جونکیں کسی کی دشمن نہیں، خُون چوسنا ان کی فطرت ہے۔

بہار کے موسم میں گاؤں کے نوجوان کھڑتالیں بجا بجا، ہی کھیلتے ہیں۔لڑکیاں گیت گاتی ہیں۔لہلہاتے کھیتوں کی خوشبو فضا میں مچلتی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر گاؤں کا شاعر برگد کے پیڑ سے ہمکلام ہوتا ہے:" یہ لمحات جا کر واپس نہیں آئیں گے، میں اِن ساعتوں کے بانکپن سے شعروں کی محفل سجاؤں گا۔"

گاؤں کے میدان میں، کچے راستے کے پاس برگد کا پیڑ یُوں کھڑا ہے جیسے کوئی عہد ساز مفکر حکمت کے سرمائے تلے جھکا، ماحول کا جائزہ لے رہا ہو،

گاؤں میں مشہور ہے کہ برگد کا پیڑ کلام کرتا ہے۔ بزرگ فرماتے ہیں کہ برگد کا پیڑ نہیں بلکہ اُسے دیکھ کر گاؤں کے باسیوں کی یادداشت بولتی ہے۔

ooo

فرخندہ لودھی

میگی

اواخر اپریل کی چمکدار دوپہر تھی۔

امین تھوڑی دیر کے لئے دفتر سے اٹھ آیا تھا۔ کھانے کا وقت ہونے کے باعث بازار میں چہل پہل کم تھی، سڑک پر لوگ نہیں تھے۔ شور تھا۔ جتنے ہوٹل اور ریستوران تھے۔ سب کے ریڈیو سیٹ مختلف سٹیشنوں کے پروگرام سنا رہے تھے۔ پھر دھوپ کی ہر لحظہ بڑھتی تمازت۔ وہ بازار کے اس سرے سے اس سرے تک، بغیر کسی مقصد کے، چلتا رہا۔

یوں ہی بے کار...... ایک ہوٹل میں گھس گیا۔ کھانے پر لوگ اس طرح ٹوٹے پڑے تھے گویا دنیا میں اس سے اہم کام کوئی نہیں۔ مگر وہ ویٹر کو اپنے پیچھے چلاتا چھوڑ کر فوراً باہر آ گیا۔

پنواڑی کی دکان کے بڑے آئینے میں اس نے اپنی صورت کو غور سے دیکھا...... پٹ سن جیسی پیلی چمک دار مونچھیں اور آنکھوں کی چھدری پلکیں چہرے پر بیزاری...... امین مڑنے ہی کو تھا کہ پنواڑی نے آواز دی۔

''صاحب! گلوری۔''

اچھا خاصا، لگا ہوا گاہک، مڑا جاتا تھا، امین رک گیا۔

''چلو۔ دے دو۔''

وہ حسب معمول مسکرا نہیں رہا تھا۔ اس نے منہ کھول دیا جیسے کوئی کڑوی کسیلی دوا کھانے پر مجبور ہو۔ بوڑھے پنواڑی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ روک لیا۔

'دیکھئے صاحب! یوں نہیں۔ مسکرا کے کھایئے۔''

یگانگت اور لہجے کے الھڑ پن کو سن کر امین ہنسی نہ روک سکا۔

''ہاں...... یوں۔''

پنواڑی نے نفاست سے گلوری امین کے منہ میں رکھ دی اور اس کی بھوری آنکھوں میں جھانکا۔

''کیا بات ہے صاحب! جی تو اچھا ہے۔''

پنواڑی کے رویے میں ہمدردی تھی۔ امین کو اداس دیکھ کر اس کا دل ہول گیا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں بڑے میاں۔ شکریہ...... تم مجھے ہمیشہ بڑے فن کار نظر آتے ہو نہ معلوم کیوں!''

امین نے ادھر کی بات ادھر جوڑی۔ وہ موضوع بدلنا چاہتا تھا۔

''تم ہمیشہ زیادہ پیسے لیتے ہو۔ پان کے دام لیتے ہو یا فن کے؟'' امین بڑے میاں کو پیسے دیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ اسے پنواڑی کے پان کھلانے کی یہ ادا ہمیشہ عجیب لگی اور اچھی بھی اس ادا کی اصل کہاں ہے؟ وہ ہمیشہ سوچتا۔

''ارے واہ بابو! فن کی قیمت کون دے سکتا ہے؟ یہ اصلی مال ہوتا ہے۔ اس کے بھاؤ اس زمانے میں نہیں لگتے۔''

بڑے میاں صافی سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اترا رہے تھے۔ امین نے جیب سے سگرٹ نکالی۔ سلگتے ہوئے رسے کے سرے سے سلگائی اور چل دیا۔

رولدو پنواڑی شہر کا سب سے عجیب پان سگرٹ والا تھا۔ وہ پان کے پتے کے ساتھ اپنا مخصوص مشرقی فلسفہ بگھارتا۔ پرانے گاہک کے ساتھ کھل کر باتیں کرتا۔ نئی روشنی کے بابو لوگ دل لگی کے لئے اس کے پاس رکنا اور باتیں سننا پسند کرتے تھے۔ وہ پان میں تازہ مکھن کی انگلی لگا کر گلوری بناتا تھا اور اس کی گفتگو مکھن سے کہیں زیادہ نرم اور طراوت بخش ہوتی......'' میاں! مکھن خشکی دور کرتا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ سب کچھ رخصت ہو جائے گا۔ سارے لوگ ہر شے میں ملاوٹ کرنے لگے ہیں...... اور پھر پان......

کے نتیجے کے طور پر جو کچھ ہمیں حاصل ہوتا ہے اس سے ہماری تخلیق کی حس کو تسکین ملتی ہے اور ہم علم اور جدیدیت سے ہمکنار ہو کر اپنی ذات سے قطعی مطمئن ہوں نہ ہوں ہمیں کو نہ تسلی ضرور ہو جاتی ہے کہ ہم نے کچھ تو کیا جو اس سے پہلے نہیں تھا اور رولدو بھی تو پان میں مکھن لگاتا ہے۔ یہ اور اس قسم کی معقول وجوہات سن کر رولدو لاجواب ہو گیا تھا اور امین کی قدر کرنے لگا تھا۔ اب وہ اکثر فارغ وقت میں تبادلۂ خیالات کرتے۔

آج امین کا دل کام میں نہ لگا اور پنواڑی سے دو باتیں کرنے کو بھی نہ چاہا۔ وہ اداس تھا۔ بس اس کے حواس پر چھوٹے بڑے گلابی ہاتھ چھائے ہوئے تھے جو یکایک چھوٹے جاتے تھے، اندراج کے رجسٹر کے صفحوں پر چاندی کا نازک لاکٹ تڑپتا رہا اور کام ادھورا چھوڑ کر چلا آیا...... اس کا ذہن بُری طرح گڈمڈ ہو رہا تھا وہ جا رہی تھی۔

میگی جا رہی تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مہینے کی آخری تاریخیں...... جیب میں کوئی پیسہ نہ تھا...... اور وہ تھا اور کئی مہینوں کا ساتھی دفعتہً چھوٹ رہا تھا۔

میگ! میگ! محبت کرنا گناہ تو نہیں۔ کسی بھی شریعت میں کسی قانون میں۔ پھر تم کیوں جا رہی ہو؟...... اچانک...... یوں...... اس طرح...... امین پان چباتا، سوچتا جا رہا تھا...... پھر وہ واپس ہوا اور بنک سے سو روپے ایڈوانس لے کر سونا بازار کی طرف چلا گیا۔

اسے میگی کو کوئی نہ کوئی تحفہ تو دینا تھا...... اس سے پہلے دیئے گئے تمام تحفوں سے بڑھیا۔

ستمبر کی کسی تاریخ کو بڑے بازار میں گزرتے ہوئے، اس سے میگی کی ملاقات ہوئی تھی...... ایسے ہی اچانک جیسے وہ اب جا رہی تھی...... اپنا بوریا بستر کمر پر لادے چھوٹے سے قد کی اجنبی لڑکی...... سرمہ بیچنے والے کو سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی...... اکیلی۔

سرمے والا، میم صاحب میم صاحب کی رٹ لگائے جاتا تھا۔ امین اپنی ٹیبل کا کام بھگتا کر ذرا ٹانگیں سیدھی کرنے کی غرض سے بازار میں چلا آیا۔ شام کو نوجوان کلرک طبقے کی طرح تھکی ہوئی آنکھوں کو سینکنے۔ وہ اکثر بڑے بازار میں اس سرے سے اُس سرے تک گھوما کرتا۔ لیکن اس وقت دوپہر تھی۔ میگی کو ان پڑھ دکاندار کے ساتھ الجھتے دیکھ کر امین کی رگِ حمیت بھڑکی۔ اسے انگریزی آتی تھی۔ اگرچہ وہ بی۔ اے تک کم گو اور شرمیلا طالب علم رہا تھا۔ بہرکیف وہ کوشش تو کر سکتا تھا۔ امین اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر جھینپتا ہوا آگے بڑھا۔ میگی دھات کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی چمکدار سرمے دانیاں ہاتھوں میں پکڑے کھڑی تھی اور سرمے والے کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ سلائیاں تم رکھ لو اور نچلے حصے مجھے دو۔ میں گلدان بناؤں گی۔ اتنی لمبی بات میگی کو کہنی آتی تھی نہ سرمے والے کے پلے پڑتی تھی۔ ہاں وہ آٹھ گنا دام لینے کی فکر میں تھا اور کہہ رہا تھا۔

''میم صاحب، مال بہت گڈ، بہت اچھا...... آپ کو ولیت میں نہ ملے گا۔'' پردیسی گاہک چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے میں مصروف تھا کہ امین نے اپنی خدمات پیش کیں اور سودا سستے داموں طے ہو گیا۔ میگی نے تشکر آمیز انداز سے امین کو دیکھا۔ وہ مسکرایا اور سر کی جنبش سے اپنے کارنامے کی داد وصول کی...... اجنبیت کی دیوار سے پہلی اینٹ کھسک گئی۔

میگی نے اسے بتایا کہ وہ سیاح ہے اور اس بڑے شہر میں نو وارد تو امین اس کو اس کی قیام گاہ تک پہنچانے پر بھی آمادہ ہو گیا۔ میگی سے تھیلا اور کھانے کا ڈبہ پکڑ کر وہ اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا فخر محسوس کر رہا تھا...... اسے خیال گزرا کہ انگریزی بولنے سے کتراتا اس کا COMPLEX تھا۔ جو میگی سے گفتگو کے دوران کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔

منزل تک پہنچتے وہ ایک دوسرے کو اس حد تک جان چکے تھے جتنا دو باتونی ہم سفر اجنبی، طویل سفر کے بعد جان جاتے ہیں اور کسی ایسی انجانی ضرورت کو ذہن میں رکھ کر پتے بھی بدل لیتے ہیں۔

میگی، شوقیہ سیاحت کرنے والی پارٹی کی رکن تھی۔ امین کو یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہوئی۔ راستے میں ایک آدھ بار امین

تانگہ وغیرہ لینے کے لئے رُکا۔ مگر میگی نے یہ کہہ کر روک دیا کہ وہ جگہیں دیکھنے آئی ہے روندنے نہیں۔
اور امین کے لئے یہی غنیمت تھا کہ وہ ایک گوری نسل کی اجنبی لڑکی کے ساتھ شانہ بشانہ چلتے ہوئے بولے جاتا تھا...... اور کم مائیگی کا احساس قطعاً نہ تھا۔
امین دو چار روز کے بعد میگی سے ملاقات کرنے گیا۔ وہ خندہ پیشانی سے ملی۔ شام کے وقت سڑک پر ٹہلتے ہوئے میگی نے اس کی غلط فہمی دور کر دی کہ وہ انگریز ہرگز نہیں بلکہ ویلش ہے۔ اور ویلش اپنے آپ کو انگریز کہلوانے میں دکھ محسوس کرتے ہیں اور وہ انگریزوں سے ایسے ہی نفرت کرتے ہیں جیسے کوئی محکوم قوم اپنے حاکم سے...... وہ زخم جو انگریزوں نے سینکڑوں سال پہلے ویلش قوم کی آزادی سلب کر کے ان کی قوم کے دل پر لگایا تھا آج بھی ہرا ہے۔
میگی کو اگر کوئی انگریز کہتا تو وہ ناک سکوڑ کر اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کرتی۔
پاکستان میں ورود کے بعد امین پہلا شخص تھا جس پر وہ پورا اعتماد کر سکی...... یہ بھوری آنکھوں اور سنہری بالوں والا نوجوان دل سے اداس اور تھکا ہوا سا ہے۔ اور یہ اپنے ملک کے ایک طبقہ کا نمائندہ ہے۔ چند ملاقاتوں کے بعد میگی اس نتیجہ پر پہنچی تھی...... اب وہ ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی نہ تھے۔
امین کی معیت میں میگی شہر اور اس کے گردونواح کے قابلِ ذکر مقامات دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی خاص طور پر جدید شہر کی شان بان دیکھتے ہوئے چیخ چیخ کر اپنے آپ کو سمجھا رہی تھی کہ پاکستان دنیا کا امیر ترین ملک ہے۔ زیورات اور زرق برق لباس میں لپٹی ہوئی...... یہاں کی ہر عورت رانی ہے...... وہ جس کا ذکر کہانیوں میں سنا تھا اور تخیل نے اس کی تجسیم کی تھی اب وہ اسے چھو کر دیکھ سکتی تھی۔ باتیں کر سکتی تھی۔
میگی عجیب فطرت کی سیاح تھی۔ تصویریں لیتی نہ نوٹ...... بس گھومے جاتی اور خوش ہوتی رہتی۔ سیاحت کے بارے میں اس کا اپنا ذاتی نظریہ تھا کہ وہ واقعات اور مقامات جو نہایت حسین اور اثر انگیز ہوتے ہیں ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتے...... پھر وہ اپنی خوشی کے لئے دنیا دیکھنے نکلی ہے۔ کتاب دیکھنے کے لئے نہیں۔
یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ میگی زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھی...... سادہ سا، سچا دل...... عام انسانوں کے سے طور اطوار۔ بس وہ انسان تھی۔
اس سیلانی لڑکی سے مل کر خود امین کو یوں لگتا جیسے اس نے ساری دنیا دیکھ لی ہے...... انسان سب جگہ ایک سے ہوتے ہیں...... فرق حیوانوں میں ہوتا ہوگا...... میگی کا بھی یہی خیال تھا۔
رفتہ رفتہ امین کے لاشعور میں مبہم سا خیال جاگزیں ہو رہا تھا کہ اس لڑکی نے دیس دیس، بستی بستی جو خاک چھانی ہے تو اس سے ملنے کے لئے تو نہیں! میگی روشن دماغ قوم کی بیٹی ہے تو کیا؟ محبت کی کہانی کہیں پرانی نہیں۔
میگی کے پیار کا نشہ امین کو ہولے ہولے چڑھا تھا۔ ایسے ہی جیسے بے جان رسی پر کوئی سرسبز بیل چڑھتی چلی جائے اور رسی کا وجود برگ و گل کے نیچے دب جائے۔
اس نشے کا اندازہ امین کو اس وقت ہوا جب میگی نے موسم بدلتے ہی یکبارگی اعلان کر دیا کہ وہ جا رہی ہے۔ اس کی اگلی منزل تاج محل ہے۔ سری نگر ہے...... وہ انڈیا جائے گی...... امین کی محبت کا تاج محل ٹوٹ کر ڈھیر ہو گیا۔
تاج محل محض ایک مزار ہے۔ جس میں ماضی کی ایک خوبصورت کہانی دفن ہے۔ کیا دل محبت کا مزار نہیں بن سکتا۔ کیا اس میں حسین لمحے کی لاش سنبھالے رکھنے کی گنجائش نہیں...... میگی کے فیصلے کے کئی دن بعد وہ اتنا ہی سوچ سکا۔ کیا ہوا جو وہ یوں چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اور یہ بھی دکھ کی بات نہیں کہ دیس کی کسی لڑکی نے اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا...... امین شکل وصورت اور آمدنی کے لحاظ سے معمولی تھا۔ امین کے لئے یہ بات بڑی حیران کن تھی کہ وہ ایک پردیسی عورت کو دل دے بیٹھا...... کالے کوسوں سے آنے والا رنگ رنگیلا پنچھی...... میگی...... جس کی آنکھوں میں خلوص دیکھ کر وہ دیوانہ وار چیخ اٹھا تھا۔
میں تمہارے لئے کوئی تشبیہ نہیں تراش سکتا۔ تم اتنی زندہ ہو کہ کسی بے جان چیز کا نام لینا تمہاری توہین ہوگا...... ہاں میں یہ

کی آنکھیں نیلی تھیں...... آغاز سرما کی بھوری نیلی شام قلعے کے کھنڈرات کی اوٹ میں اتر آئی تھی...... اداسی، تنہائی، فاصلہ، نیلگوں گہرا...... شعلہ، سمندر اور آسمان...... امین سوچ رہا تھا۔

''یا پھر یہ ایک اصل کا پَرتو ہے کہ ہر اتھاہ میں جھلکتا ہے۔''

''میگ......''

امین نے سکوت کے سمندر میں کنکری پھینکی۔ انگوٹھے کی پور کو میگی کے ہونٹوں پر نرمی سے پھیرا اور چپ رہا۔

میگی نے دنیا دیکھی تھی اس ٹھہراؤ کی تہ میں متلاطم لہروں کو جانتی تھی جو ابا دھیرے سے مسکرائی اور اپنا چھوٹا سا ہاتھ امین کی طرف بڑھایا۔

''میگ! میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میگ!''

شروع شروع میں وہ میگی کو اس کے پورے نام مارگریٹ پارسین کہہ کر پکارتا تھا دوستی ہوئی تو میگی کہنے لگا اور اب میگ میگ کہے جاتا تھا۔ سچی محبت کے اظہار کے الفاظ کبھی استعمال شدہ نہیں ہوتے۔ نئے لفظوں سے کہانی نئی بن جاتی ہے جس کی ''تھیم'' کبھی نئی نہیں ہوتی۔

اس شام وہ دیر تک بازاروں میں پھرتے رہے۔ میگی نے بہت سی چیزیں خریدیں جو خالص مشرقی تھیں وہ امین کو بتاتی رہی کہ جب وہ گھر واپس جائے گی تو ان کی ماں ان سب چیزوں کو دیواروں اور کارنس پر سجائے گی اور تمام قصبہ نمائش دیکھنے آئے گا۔ وہ ہمیشہ ملک ملک کے تحائف لے کر گھر لوٹتی ہے البتہ وہ جرمنی سے کچھ نہ لا سکی تھی۔ یہ جرمنی میں اقتصادی اور سیاسی بحران کے دن تھے...... اور ترکی میں کسٹم ڈیوٹی پر کھڑے نوجوان آفیسر نے اسے آنکھ ماری تھی اور گذرتے ہوئے کندھے پر چٹکی کاٹ کر گیا تھا۔ اور یروشلم میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو جاسوسی کے شبہ میں دھر لیا گیا تھا اور وہ رات بھر سردی میں ٹھٹھرا کئے تھے۔ کیونکہ ان کے بستر تلاشی کی غرض سے چھین لئے گئے تھے...... یہ اور اس قسم کے بہت سے واقعات سنا کر وہ امین کو خواب میں جھنجھوڑتی رہی۔

میگی کی اقامت گاہ تک پہنچتے پہنچتے پورنماشی کا چاند افق سے کئی سیڑھیاں اونچا چڑھ آیا تھا۔

چودھویں کا چاند ہو۔
امین نے بے خیالی میں ٹیون گنگنائی۔
......رخصت ہونے سے پہلے میگی نے اصرار کر کے پورا گانا سنا۔ وہ امین کے خلوص کا تجزیہ نہ کر پائی تھی۔ مشرقی مرد کے اظہار محبت کی دھیمی دھیمی سوختہ جاں آنچ جو راکھ نہیں کرتی، لگاتی ہے......اس نے اس آنچ میں اپنے آپ کو پگھلتا ہوا محسوس کیا۔
رات کو اپنے بستر پر لیٹی ہوئی وہ اپنے ہاں کے مردوں کا مقابلہ امین سے کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہاں آغوش محبت یوں ہولے ہولے کھلتی ہے جیسے کوئی غنچہ کھلتا ہو۔
''غنچہ''
اچھی تشبیہ ہے۔ وہ آپ ہی آپ مسکرائی۔ امین کی یاد اور بدن کی باس اُس کے حواس پر مسلط تھی۔
تھوڑی دیر پہلے امین سے سنے ہوئے گانے کے بول کیا ایک لفظ بھی اس کے حافظے میں نہیں تھا۔ ہاں لے اچھی تھی اور پورے چاند کا ذکر تھا اور جوشِ جنوں میں امین نے اس کا منہ اونچا کر کے کہا تھا......تم بھی پورے چاند جتنی حسین ہو...... یہ سن کر میگی اترانے کی بجائے زوردار قہقہہ لگا کر ہنسی۔
"God Forbid How Rediculous" پورے چاند جتنا گول اور چپٹا چہرہ......
امین کو غصہ آ گیا۔ اور اس نے میگی کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔
''الو کی پٹھی......''
پھر ترجمہ کیا۔ میگی کھل اُٹھی۔
''ہاں یہ اچھی تشبیہ ہے۔''
اب کے امین کو اس کی بے وقوفی پر ہنسی آئی۔ میگی اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چیخی۔
''ہاں ہاں۔ ہم اہلِ مغرب الو کو دانائی اور دور اندیشی کی علامت سمجھتے ہیں۔''
پھر وہ دونوں بغلگیر ہو کر قہقہے لگاتے رہے اور یوں ایک فاصلہ اور بُعد جو باتوں سے اچانک پیدا ہو چلا تھا۔ کم سے کم ہو گیا۔
تاریخی مقامات کی سیر کے بعد میگی امین کو بار بار کہتی تھی کہ تمہاری قوم بلاشبہ عظیم...... چھوٹی اینٹوں سے لے کر بلند میناروں تک۔ سب تمہاری عظمت رفتہ کی گواہی دیتے ہیں اور یہ سب کچھ پختہ ہیں۔
امین کے ذہن پر میگی تمام گفتگو میں سے صرف ایک بات چسپاں ہو کر رہ گئی۔
''عظیم قوم تھی۔''
پل بھر کی ساری رواداری اور محبت جو وہ سات سمندر پار کی حواسے رکھتا تھا۔ دب کر رہ گئے اور وہ چلا کر بولا۔
''ہم اب بھی بیٹے نہیں......تاریخ کو نئے رنگ سے دہراتے ہیں......یہ اور بات ہے کہ ہم نے اس حقیقت کو اب محسوس کیا کہ یہ دنیا فانی اور آنی جانی ہے...... پکی عمارتیں بنانا فضول ہے......خالص ذاتی گھروں کی بات دوسری ہے۔ ان میں بیوی بچوں کو دن رات رہنا ہوتا ہے......ان کی آسائش کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔
وہ بولتا چلا گیا۔ میگی نے ایک جھرجھری لی اور امین کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوئی۔ مگر اب وہ خاموش تھا۔ گویا اس کے پاس باتیں ختم ہو گئیں۔ سارے دلائل ہاتھ سے جاتے رہے۔ میگی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ امین نے اس پر آنکھیں رکھ دیں......
پیپل کے پتوں کے پیچھے پہلی تاریخوں کا پہلا چاند پٹ پٹ تکے جاتا تھا...... وہ کالی جینز میں پھنسی ہوئی ٹانگیں پیارے ہاتھوں کے سہارے لان پر بیٹھی تھی۔ اس کے گلے میں لٹکتے ہوئے چاندی کے لاکٹ کی چین کو چاند کی چور کرنیں چمکا رہی تھیں۔
تمہارے دیس میں حسن ہے۔ ہر طرف بکھرا ہوا۔ پریشان۔ یہ بکھراؤ دیکھنے والے کو مدہوش کر دیتا ہے۔ نہ معلوم مجھے ایسا کیوں لگتا ہو، کہ تم سب مدہوش ہو......امین!''
امین پھیکی طنزیہ ہنسی ہنسا۔

یہ لاکٹ اس کے پہلے یار کی نشانی ہوگا...... وہ سوچ رہا تھا۔

امین تم نے ٹنی سن کی Lot Us Eaters پڑھی ہے۔ پس تم "لوٹس ایٹر" ہو......"

امین کے اعصاب کھنچ گئے۔ اسے تاؤ آ رہا تھا...... وہ اس کے جذبات مجروح کرنے کے موڈ میں کیوں تھی...... خلوص معیشت اور سیاست سے کہیں بلند تر چیز ہے...... یہ اپنی اور اس کی ذات کے بارے میں کیوں نہیں سوچتی اس کے متعلق کیوں نہیں کہتی۔ عورت باہمی رشتے اور ذات سے الگ ہو کر سوچنے لگے تو وبال جان بن جاتی ہے۔

امین چڑ کر میگی کی باتوں کا جواب دیتا تھا...... میگی نے آخری چٹکی لی۔

"محبت کے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں ہوتی۔ مگر اس کی بقا ذہنی پختگی چاہتی ہے۔"

امین بے نیازی سے بیٹھا درختوں کے پیچھے چاند کو ہولے ہولے اترتے دیکھ رہا تھا۔ فضا خاموش تھی۔ شہر کے بڑے گھڑیال نے دس بجائے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

امین، میگی سے ناراض ہرگز نہ تھا۔ بس اسے شکایت تھی تو اتنی کہ وہ اس کی ذات سے آگے بڑھ کر کیوں سوچتی ہے۔ امین نے اپنے یہاں کی عورتوں کا صرف ایک مرکزِ خیال دیکھا تھا...... مرد...... خواہ شوہر ہو یا محبوب...... بہت کیا تو تصوف میں پناہیں لینے لگیں۔ وہ اپنے آپ کو بہر طور پھنسائے رکھتی ہیں۔ آب و ہوا کا اثر ہے یا مٹی کا؟ وہ اس چکر سے نکلنا پسند نہیں کرتیں۔

ڈوبتے چاند کی دھندلی چاندنی میں وہ میگی کی آنکھوں میں نہ جھانک سکا اور بظاہر ترش لہجے میں بولا۔

"میگ! ہم دوستی سے سوا ہیں...... جانتی ہو!"

وہ میگی پر جھکا اور میگی نے اپنی پیشانی اس کے ہونٹوں کے قریب کر دی...... کسی گنجان درخت میں پرندوں کے پر پھڑپھڑانے کی آواز آئی...... امین چل دیا۔

قیام گاہ کے باغ کی چوڑی سڑک پر اسے خوشبو نے گھیر لیا جو میگی کے بالوں کی نہیں تھی...... چاند کی کرنوں کے ساتھ کھلنے والے مردا کے سپید پھولوں کی تھی...... قیام گاہ سے ملحق گرجا گھر کے قبرستان میں الو بول رہا تھا۔ امین کو چڑیلوں، بھتوں اور آوارہ روحوں کے خیال کے ساتھ میگی کی بات یاد آئی۔ اس نے لاحول پڑھتے ہوئے ایک بار پھر وہی گالی دی......

"الو کی پٹھی......"

دوسرے روز میگی بنک میں آئی تو امین کا چہرہ روٹھے ہوئے بچے کی طرح سوجا ہوا تھا۔ میگی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر کر لوگوں کے ساتھ انہماک سے گفتگو کرنے لگا...... میگی نے آہستہ آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پکارا......

دفتر آتے ہی میگی کو ٹیلی فون کرنا امین کا معمول تھا۔ صبح نہ ہو سکا تو دوپہر کو۔ بنک کے اوقاتِ کار ختم ہونے تک تین چار بار ضرور ٹیلی فون پر بات کرتا...... مگر آج...... میگی یہی معلوم کرنے آئی تھی۔

امین نے مڑ کر اپنے پیچھے کھڑی میگی کو دیکھا اور کوشش کے باوجود مسکراہٹ کو نہ دبا سکا۔ کھسیانی ہنسی، چہرے پر پھیلی آنکھوں میں ندامت اور اعترافِ جرم بن کر تیری...... پھر ایک ادھورے قہقہے کے ساتھ اڑ گئی۔

چند ثانیے کے بعد وہ بڑے بازار میں گھوم رہے تھے۔ میگی نے امین کے کندھے کو تھپتھپایا اور کہا۔

"تمہیں دوستی رکھنے کا سلیقہ آتا ہے...... اور ہاں آج مجھے وہی چاند والا گانا۔ رومن رسم الخط میں لکھ دو نا! میں اسے رٹنے کی کوشش کروں گی۔" وہ نہایت سنجیدہ نظر آتی تھی۔

میرے جذبات کی سنجیدگی کو کب سمجھو گی میگ! وہ بڑبڑایا۔

میگی چلتے چلتے لڑکھڑا گئی اور اس نے اپنا سارا بوجھ امین پر ڈال دیا۔

کافی ہاؤس میں بیٹھی وہ دلچسپی سے ہر طرف دیکھ رہی تھی اور چپ تھی۔ پاکستانی گڑیاں اور ماڈل پیکٹوں میں بند میز کے ایک کونے پر رکھے تھے۔

''امین! یہ خوشی کی بات نہیں کہ دنیا کے تمام انسان ایک کنبے کی صورت اختیار کیے جاتے ہیں؟...... تہذیبی اور تمدنی انفرادیت غیر پختہ ذہن کی باتیں ہیں...... بچوں کی سی۔''

میگی اپنے طور پر اپنی سوچ سے مسرور اور مسحور امین کی آنکھوں میں تصدیق اور تسلیم و رضا تلاش کر رہی تھی...... وہ کچھ توقف کے بعد بولا کہ اس نے اس قسم کی باتوں کے متعلق کبھی غور نہیں کیا۔

بنک کاری نے سوچنے کی صلاحیت سلب کر لی تھی۔ امین اب صرف اس قدر جانتا تھا کہ اس رقم پر اتنا سود لگے گا اور اس آسامی کو اس حد تک قرضہ دیا جا سکتا ہے...... اور معیارِ زندگی بلند کرنے کے لئے صرف روپیہ چاہئے۔ بوند جتنے وقت میں دولت کی رو پہلی نہر نکلے تو زندگی۔ ورنہ کتے کا سا جینا مقدر...... تجربے نے اسے یہ سب کچھ سکھا دیا تھا۔ مگر وہ ٹیکٹکس نہیں جانتا تھا جو کاروباری زندگی میں نہایت ضروری ہوتے ہیں۔

سامنے کی میز پر ادیب اور شاعر نما دو شخص کسی زبردست سیاسی، سماجی الجھن میں تھے اور زور زور سے بول رہے تھے۔ وہ بار بار خالی پیالوں کو بجاتے اور بیرے کو بلاتے۔ کبھی ماچس کے لئے کبھی دو عدد سگرٹ اور گلاس بھر پانی کے لئے...... پر اُن کی بحث کسی نتیجے پر پہنچتی تو کوئی بات بھی تھی...... اچانک ان میں ایک گھونسا ہوا میں اچھال کر چیخا۔

میں برٹرینڈ رسل کے خیالات کی پرزور حمایت کرتا ہوں۔ خدا کی قسم! اگر خدا نہ ہوتا تو وہ خدا ہوتا۔'' (نعوذ باللہ)

''لعنت ہو تم پر......''

دوسرے نے بھی اتنی بلند آواز سے جواب دیا۔

قریب تھا کہ وہ برتن اٹھا کر ایک دوسرے کے سر میں دے مارتے لیکن ریسٹوران کے ماحول سے مرعوب پیچ و تاب کھاتے بیٹھے رہے۔ میگی کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ امین نے اسے تسلی دی اور سمجھایا کہ وہ لڑ ہرگز نہیں رہے۔ ادب پیدا کر رہے ہیں...... نیا ادب مشاہدے مطالعے اور ذہنی اپچ سے زیادہ بحث و تمحیص کا مرہون ہے۔

میگی ہلکے ہلکے قہقہے لگاتی، مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں دیکھا کی۔ یہ بہت تیزی سے سوچنے والی عورت تھی۔ اتنا تیز کہ امین اکثر پیچھے رہ جاتا اور وہ ایسی باتیں کہہ جاتی جن کے متعلق وہ کئی دن بعد سوچتا اور جھنجھلاتا۔

کافی ہاؤس سے نکل کر سڑک پر چلتے ہوئے وہ امین کو بتانے لگی کہ پوری دنیا Teen Agrer Problem سے دوچار ہے۔ کوئی ذہنی طور پر، کوئی مادی پر۔

امین نے میگی کو پنواڑی کی دکان سے پان کھلوایا۔ پتے کو چبا کر میگی کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ جیسے اس نے کچھ دریافت کر لیا ہو...... نیا اور انوکھا...... اس تجربے کے ادراک سے اس کی روح مسرور تھی...... امین کا ہاتھ بھینچتے ہوئے وہ زور سے چلائی۔

''یہ مشرقی ہے۔ خالص مشرقی...... اور وہ خوشبو''

گو پان کا ذائقہ اس کے لئے کڑوا تھا۔

اس کے بعد وہ جب بھی اس طرف سے گزرتے میگی، رولدو کے ہاتھ سے پان ضرور کھاتی...... رولدو دونوں کو اپنی طرف آتا دیکھتا تو گلوری پہلے ہی سے تیار کر لیتا۔ میم صاحب کے منہ میں گلوری رکھنے کے بعد وہ سرخرو ہو کر اعتماد بھرے انداز سے دیکھتا اور نہایت سلیقے سے بڑ ہانکتا جیسے کسی ملک کا سفیر اپنے قومی کلچرل شو کے لئے تماشائیوں کے سامنے اطلاعات سے بھرپور تقریر کرے میگی کے پلے کچھ بھی نہ پڑتا اور وہ رولدو کو خوش کرنے کے لئے ہوں ہاں کرتی رہتی...... رولدو کے من میں کئی بار یہ سکیم آئی کہ وہ میگی سے سرٹیفکیٹ لے کر دکان میں لگائے جس میں لکھا ہو۔

''وہ میم صاحب ہوتے ہوئے بھی بڑے میاں سے متاثر ہوئی ہے اور خاص طور پر اُن کے پان سے۔ قوام کی تو بات ہی کیا؟ اور ان کا پان کھلانے کا انداز...... واللہ! دنیا دیکھی، کہیں نہیں دیکھا'' رولدو نے امین کے سامنے اپنی تجویز پیش کی مگر امین نے اتنا کہا۔

''اس سے کیا ہوتا ہے......''

اور چل دیا۔ اسے کیا معلوم اس سرٹیفکیٹ سے کاروبار کتنا چمک اٹھے گا۔ یہ سرٹیفکیٹ ذرا شیشے میں جڑوا کر دیوار پر ٹانگ دیا جائے تو دیکھو ساری ماڈرن سوسائٹی ادھر کھینچی چلی آئے اور ایک بار پھر وہ زمانہ لوٹ آئے کہ عطر بیز شاموں میں پان کی خوشبوئیں مہکتی پھرے جیسے دلی کے چاندنی چوک کی کنواریاں۔ جن کی موجودگی اور چڑھتے جوبن کے احساس سے اہلِ دل سرشار رہتے تھے۔ اک باس چڑھی رہتی تھی اک آس بندھی رہتی تھی۔

کام کہنے کہانے اور بیچ بچاؤ کرنے سے چلتا ہے۔ نہیں تو پیسے چڑھادو۔ چٹکیوں میں چھوڑ پلک جھپکنے تک میں کام چلالو۔ پر امین یار تو بات ہی موڑ گئے......اس سے کیا ہوتا ہے؟'' یہ کوئی جواب تھا۔ رولدد کو انگریزی آتی ہوتی تو وہ خود ہی میگی سے بات کر لیتا۔

ایک روز رولدد اشاروں کنایوں میں مافی الضمیر بیان کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ میگی نے امین سے تفصیل سنی تو وہ بڑے زور سے ہنسی اور ٹوٹی ہوئی اردو میں کہا۔

''پان والا! تم بچہ......ٹمن ایجر بچہ بائے''

بڑے میاں بڑی معصومیت کے ساتھ مسکراتے ہوئے میگی کی طرف تکے جاتے تھے......میگی کو انتہائی پیار آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بڑھ کر رولدد کے جھریوں بھرے گال چوم لے۔

آنکھوں کی زبان کتنی سادہ ہے......میگی نے سوچا اور خوشی کی ہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔

اور تم کتنے پیارے بوڑھے ہو۔ تمام دنیا کے بوڑھے اور بچے ایک سے ہوتے ہیں۔ جوانی کو جانے کیا ہو جاتا ہے؟ اس کے بے شمار رنگ ہیں اور اس کے آہنگ کو بقا نہیں......''

میگی نے اپنا ہاتھ امین کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بڑے میاں کو شب بخیر کہتے ہوئے وہ چل دیئے۔ امین اس کے ساتھ گھسٹتا ہوا جا رہا تھا......میگی کا ہاتھ خنک تھا اور لرزاں۔ اس کی شفاف آنکھوں میں موٹروں کی روشنیاں جھلملاتی تھیں اور لبوں پر پان کی لالی تھی۔

''ہمارے ملک کا سنجیدہ تجربہ کار طبقہ چھوکرے چھوکریوں کے مسائل سے پریشان ہے اور تم سب ابھی اس عمر میں ہو۔ اس عمر میں جی ایک ایک خواہش کے احیا کے لئے تڑپتا ہے......اجتماعی شعور سے نابلد انفرادی مسرتوں کا متلاشی ذہن......''

وہ بولتی گئی امین نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ الگ الگ چل رہے تھے......

''امین! میں لنڈن میں سال بھر تک Probation Officer کے طور پر کام کرتی رہی ہوں......اس مسئلے کا مطالعہ میں نے خوب کیا ہے......امین......امین......تم بھی کچھ بولو''

اس نے امین کو جھنجھوڑا۔

میں کیا بولوں! میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ میں تمہارے ساتھ صرف تمہاری باتیں کر سکتا ہوں......وہ تم سننا پسند نہیں کرتیں خالص اورینٹل اور اوریجنل باتیں میں کہاں سے لاؤں! ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ اور......اور......''

امین کو مایوسی اور کم مائیگی کے احساس نے دبا لیا۔ میگی نے پیار سے اس کا ہاتھ دوبارہ پکڑ لیا......اب وہ دونوں خاموش تھے۔

امین باتیں کرتے کرتے یاس اور ناامیدی کے اندھیرے میں غرق ہو جاتا ہے ایسے موقعے پر میگی کے دل میں ایک خاص قسم کا جذبہ ابھرتا کہ وہ اس تھکے ہوئے بھاری سر کو اپنے سینے پر رکھ لے......بالکل ایسے ہی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو دکھ میں دیکھ کر کرب اور الجھن محسوس کرے۔ وہ الجھ سی جاتی۔ امین کی بھوری آنکھوں میں جھانکتی......خلوص، محبت اور یگانگی کی رو سی چلتی وقت ان کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ اور سینکڑوں صدیوں کا تہذیبی بُعد سمٹ کر سانسوں کی رو سے بھی کم رہ جاتا۔

میں بستی بستی گھومتی چلی آئی ہوں۔ امین! شائد تمہارے لئے''
میکی رک رک کر کہتی
''تم کبھی نہ جانا......''
امین کہتا۔
''اچھا......''
میکی لفظ اچھا بخوبی ادا کر لیتی تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی ادائیگی میں ایک ذائقہ محسوس کرتی ہے جو ناقابلِ بیان ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ پاکستان میں رہنے کی صورت میں وہ یہاں کی زبان پر کچھ ریسرچ کرے گی۔ اس مقصد کے لئے میکی نے پڑھے لکھے لوگوں سے مشورے بھی کئے لوگ مدد کے لئے فوراً آمادہ ہوگئے؟...... بالآخر تان نوٹی تو یہاں کہ ہماری لسانیات کا مکمل علم حاصل کرنے کے لئے ولایت جانا پڑے گا...... تو میکی ایک ہی بار اُکھڑ گئی۔
سردیوں کا موسم بھی بیت گیا۔ سرد ممالک سے آئے ہوئے سیاح موسمی پنچھیوں کی طرح گھروں کو لوٹ رہے تھے یا پھر ان علاقوں کا رُخ کر رہے تھے۔ جہاں کی آب و ہوا سازگار ہو۔ میکی کو امین کے خلوص اور محبت نے باندھ رکھا تھا۔ امین کا خیال تھا کہ میکی اگر یہ موسم گرما جھیل گئی تو وہ اسے شادی کا پیغام دے دے گا۔ یوں جلد بازی کرنا ویسے بھی اوچھا پن ہے۔
میکی کی وجہ سے امین سب کی نظروں میں آ گیا تھا اب بنک کے مینجر صاحب اس کے ساتھ بے تکلفی سے ملتے۔ دو ایک بار تو انہوں نے امین کو میکی کے ساتھ ہوٹل میں مدعو بھی کیا۔ اس کے شریکِ کار اس سے حسد کرتے۔ کبھی میکی دفتر کے اوقات میں امین سے ملنے آتی تو دفتر کے مصروفِ کار عملے میں جو مخصوص بھنبھناہٹ ہوتی ہے۔ دم توڑ دیتی پھر کوئی فقرہ جڑتا۔ میکی کہاں سمجھ سکتی تھی۔ ہاں وہ نگاہوں کی زبان سمجھتی تھی۔
جب کوئی آنکھ جھوٹ بولتی تو میکی کو نہایت غصہ آتا۔ وہ اس جھوٹ کو تربیت اور ماحول پر محمول کرتی۔ امین بھی کبھی کبھی دل کی بات چھپا جاتا۔ لیکن جھوٹ اس کے چہرے پر صبحِ کاذب کی طرح ابھرتا۔ عارضی اور دھندلا ایسی کیفیت اس وقت طاری ہوتی جب وہ میکی کی طرف پورے خلوص سے مائل ہوتا...... ایک سوال آنکھوں میں ابھرتا...... وہ چپ رہتا اور میکی تڑپ کر رہ جاتی۔
تم کچھ پوچھنے والے تھے۔'' ایک روز میکی نے پوچھ ہی لیا۔
''ہاں میں ہر روز پوچھنا چاہتا ہوں۔''
اس نے میکی کے سینے پر لٹکتے ہوئے دل کی شکل کے لاکٹ کو چھیڑا۔ رقابت کی آنچ اس وقت تیز تھی اور میکی کی طرف سے بدظنی کا گمان پختہ تر۔ میکی کتنی بری تھی کہ پہلے محبوب کی نشانی کو سینے سے لگائے ایک اور رومان لڑا رہی تھی...... جوانی کے موسم میں مذہب اور خدا سے کہیں زیادہ محبوب کی لونگی رہتی ہے۔ میکی کے بتانے کے باوجود کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ کو چھوڑ چکی ہے اگرچہ اس کے دیس میں وہ اب بھی اس کی راہ دیکھ رہا ہوگا۔ کیونکہ اس نے قول دے رکھا تھا کہ جب تک میکی شادی نہیں کر لیتی وہ اس کی طرف سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ امین کا یقین اکثر ڈانواں ڈول ہوتا رہتا۔
کل ہی جب اس نے اپنی واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو امین چپ چاپ لوٹ آیا۔ میکی اپنی طرف سے بڑا فلسفیانہ فقرہ کہہ کر سبکدوش ہو رہی تھی۔
''میں مشرق میں روشنی کی تلاش میں آئی تھی کہ سورج ادھر سے نکلتا ہے مگر تم سب روشنی کے لیے مغرب کو منہ اٹھائے ہوئے ہو۔'' امین نے اس کے نظریئے اور فلسفے پر کڑھنے کے بعد ایک ہی رقیبانہ فیصلہ کیا کہ پہلے عاشق نے تو اسے چاندی کا ذلیل ساتحفہ دیا لیکن وہ اسے سونے کا دے گا...... پاکستانی دوست کا ہاتھ کسی صورت میں تو بالا رہے...... اسی مقصد کیلئے وہ تیز چلتا، سونا بازار کو جا رہا تھا...... رولد دپنواڑی کی باتوں اور آئینے نے دل میں خواہ مخواہ مزید ہل چل پیدا کر دی تھی۔ امین کا جی شام کے دھندلکے میں پہلے تارے کی مانند تنہا اور لرزاں تھا۔
بعد میں میکی نے انڈیا جانے کے بجائے اپنے وطن واپس جانے کا پروگرام بنا لیا...... روانگی سے چند روز قبل وہ بے حد

مصروف رہی۔ ملناملانا۔الوداعی پارٹیاں...... پاکستان میں قیام کی آخری شام امین نے اپنے لئے وقف کرنا چاہی۔

''کل ملوگی؟'' امین نے پوچھا۔

''نہیں.....کل سنڈے ہے اور میں پاکستان میں آخری نماز پڑھنا چاہتی ہوں۔''

''اور شام کو......''

''شام کو آرام کروں گی۔''

میگی کے لہجے میں عزم کی جھلک تھی۔ جدا ہوتے وقت امین اسے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ میں تمہیں تحفہ دینا چاہتا ہوں......ایک خاص تقریب کے ساتھ......اسے غصہ تھا۔ ناکامی۔ ندامت، رقابت اور دل کا خلا۔ راستہ بھر وہ سوچا کیا۔

گرجا جانا بہت ضروری تھا...... مذہب کیا ہے، ایک تربیت کا نام اور محبت۔ فطری جذبہ...... ہاں فطرت کو تربیت کے تابع رہنا چاہئے......لیکن میگ کو مجھ سے محبت کیا تھی؟...... جانے کیا تھا......فطرت......فطری جذبہ کچھ بھی نہیں۔ اور میگی کبھی بھی نہیں......اور میگی کبھی کچھ فیصلہ کرتی ہے۔ کبھی کچھ......کمینی ہے۔

اوائل جون کی صبح نہایت چمکیلی تھی۔ اونچی دیواروں اور درختوں پر پیلی دھوپ پھیلی تھی۔ گرم ہوا کے جھکڑ سویرے ہی سے چل رہے تھے۔ امین دفتر جانے کے بجائے نہادھو کر میگی سے ملنے گیا تو پتہ چلا کہ وہ کسی کے ہاں صبح کے ناشتے پر مدعو ہے اور وہاں سے آتے ہی ہوائی اڈے پر چلی جائے گی۔ وہ نوکر کے پاس ایک نوٹ چھوڑ گئی تھی کہ امین ہوائی اڈے پر ذرا جلدی پہنچ جائے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ وہ جل کر رہ گیا...... یہ صبح وہ اس کے ساتھ بھی تو گذار سکتی تھی۔ اس قماش کی عورتیں دولت مندوں کو ترجیح دیتی ہیں۔ یہ بات تھی تو میگی اس مرد کا اتنی نفرت سے کیوں ذکر کر رہی تھی جو ایک شام کو اس کے پیچھے پیچھے ہاسٹل میں پہنچ گیا تھا۔ چوکیدار نے سوچا تھا کہ میم صاحب کا کوئی ملنے والا ہوگا۔ اس لئے روکا نہیں......روشنی میں اجنبی کا چہرہ بغور دیکھ کر وہ ٹھٹکی تو مرد سینکڑوں روپوں کے نوٹ اس کے سامنے گنتے ہوئے شستہ انگریزی میں کہنے لگا۔

تمہیں پاکستان کی چیزیں پسند ہیں۔ تمہیں پاکستانی لوگ پسند ہیں...... میں تمہیں نئے نئے لباس اور زیورات سے لاددوں گا۔ میرے ساتھ چلو۔ بھوکے کلرکوں کے ساتھ کیوں پھرتی ہو۔''

میگی غصے اور نفرت سے چیخی...... چوکیدار کے چوکنا ہونے سے پہلے اجنبی اپنی راہ لے چکا تھا۔

اور نئے سال کی بے تکلف پارٹی میں ڈھلتی عمر کے مرد نے میگی کے ساتھ ناچتے ہوئے ایک ثانیے میں پرپوزل دے ڈالا۔

''میں تمہیں مہارانی بنا کر رکھوں گا۔

میگی تھک کر بیٹھ گئی۔ وہ نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لئے ناچ رہی تھی اور لوگ اسے نئی زندگی کا پیغام دے رہے تھے ایسی اونچی سطح کی پارٹیاں میگ نے اپنے ملک میں کہاں دیکھی ہوں گی۔ اسی لئے ہر بات آ کر امین کو اور اپنی ہمجولیوں کو سناتی اور کہتی اگر میرا باپ یہاں آ کر دیکھے تو وہ مجھے پہچان نہ سکے۔ اسے کیا معلوم کہ اس کی بیٹی یہاں آ کر اونچی سوسائٹی کی خاتون بن گئی ہے۔

اصل میں وہ یہاں کی گلیوں اور عوام دیکھنے آئی تھی۔ مگر پلکوں پر بٹھالی گئی۔ وہ انسان تھی آنسو تو نہ تھی کہ پلکوں کی بالکونیوں سے اتر کر نیچے چلی جاتی۔ جہاں زندگی اندھی اور لولی لنگڑی ہے۔ امین نے بھی اندرونِ شہر دکھانے کی جسارت نہ کی۔ مبادا وہ دل برداشتہ ہو جائے۔ مگر اب وہ جا رہی تھی......وہ چاہتا تھا اس کے بارے میں کم سے کم سوچے۔

سہ پہر کو ہوائی جہاز کی روانگی تھی اور ابھی دن کا ایک بجا تھا۔ ٹیلی فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ ریزیڈنس پر واپس آ چکی ہے۔ امین بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پہنچا۔ میگی کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

''میگ تم سچ مچ جا رہی ہو۔''

''ہاں''

''تم تو سری نگر جا رہی تھیں''

''پھر سہی......''

''میگ.......!!!''

میگی نظریں نہ ملاتی تھی اور لوگوں سے ملے ہوئے چھوٹے چھوٹے تحائف بن کھولے، بن دیکھے پرس میں بھر رہی تھی......

امین نے جیب میں پڑی ہوئی ڈبیا کو انگلیوں سے کئی بار چھوا۔

میگ میں تمہیں یاد آؤں گا۔''

''اوہ......''

وہ تھکن کا بہانہ کر کے بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور رنگت سرخ ہو رہی تھی۔ میگی کا چھوٹا سا گلابی ہاتھ امین کے ہاتھوں میں چھپ گیا۔ امین نے اسے قریب تر کر لیا۔

باہر کھڑکی کے پاس کھڑا چپڑاسی کہہ رہا تھا۔

''دیر ہو چلی مس صاحب! ٹیکسی آ گئی......''

میگی نے عجلت سے اپنی تصویر امین کی طرف بڑھائی۔ اس پر پتے اور دستخطوں کے علاوہ لکھا تھا۔

''امین کے لئے......محبت کے ساتھ''

امین ایک بار پھر مسکرا دیا۔

ہوائی اڈے پر میگی کے ملنے والوں میں سے کوئی بھی نہ پہنچا تھا۔ وہ کونے میں پڑے ایک صوفے پر بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ رہے تھے۔ زندگی میں بعض ایسے مقام بھی آتے ہیں جب بھرے ہوئے پیالے سے کچھ نہیں چھلکتا......کوئی شکوہ کوئی شکایت۔

ضبط ایک مہر۔

ایک بوجھ......کہ جس کے نیچے دب کر سب کچھ دم توڑ دیتا ہے۔

ویٹنگ روم میں بڑی رونق تھی......اناؤنسر کی آواز پر کوئی توجہ نہ دیتا تھا۔ کراچی جانے والے مسافر جہاز تک پہنچ جائیں۔''

میگی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب وہ پریشان نہ تھی۔ امین نے عجلت سے ڈبیا کھول کر سونے کا سادہ چھلا نکالا جو عیسائی دولہا نکاح کے بعد اپنی دلہن کو پہناتا ہے۔ وہ میگی کے ہاتھ بڑھانے کا منتظر تھا۔ میگی کی رنگت پھیکی پڑ گئی......امین نے بڑھ کر اس کا بایاں ہاتھ پکڑ لیا اور چھنگلیا کے ساتھ والی انگلی میں پہنانے لگا تو میگی نے ہاتھ کھینچ لیا۔

''نہیں......''

''اس سے زیادہ کی خواہش نہ کروں گا۔''

''میں اس انگلی میں نہیں پہنوں گی......''

امین کے دل پر ایک قیامت گزر گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح بکنے لگا۔

''مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔ میں پہلے ہی جانتا تھا......یہ لاکٹ......میگی تم......'' قریب تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے کہ میگی نے لاکٹ کی ڈبیا کھولی اور امین کی ہتھیلی پر الٹ دی......اس میں مٹی کی ایک ڈلی تھی اور گھاس کی چند پتیاں۔

''میں جا رہی ہوں......وہاں جا کر بھر لوں گی۔ یہ تم لے لو......یہ میرے دیس کی مٹی ہے اور میرے دیس کی گھاس۔ میرے محبوب''

امین نے دیکھا کہ وہ تیزی سے مسافروں کے گزرنے کے خاص راستے کی طرف لپک رہی ہے......اچانک وہ مڑی اور امین کو ہاتھ ہلا کر سلام کیا......مگر امین شش و پنج میں تھا کہ وہ اس لڑکی کو الوداع کہے یا گالی دے......!

پھر اس کا سر اپنے آپ جھک گیا۔ جیسے وہ سجدہ کر رہا ہو۔

ooo

[illegible] چپکے [illegible] سے شام کر دیں۔'' پھر وہ چہلیں کرتے اور چوکڑیاں بھرتے باغیچے کے ایک کنج سے دوسرے کنج کی سمت لپکنے اور لڑھکنے لگے۔ ان کی اُچھل کود سے پھولوں کی لہلہاتی شاخیں جھوم جھوم گئیں اور ان کے سواگت کے لیے بار بار آگے جھک کر پیچھے کو ہٹنے لگیں۔ تب یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بچوں اور پھولوں میں تمام قدریں مشرک ہوں۔ شرمانے لجانے سے لے کر حسنِ فطرت کی نمائندگی تک ان میں کوئی غیریت اور حدِ فاصل نہ ہو۔

وہ بھی کیا سہانے دن تھے۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ باغوں کے ہرے ہرے پیڑوں پر نیا بُور آیا تھا۔ ہر طرف کلیاں چٹک رہی تھیں۔ پھول مسکرا رہے تھے۔ پرندے اپنی اپنی لَے میں چہچہا رہے تھے اور اردگرد خوشیوں اور خوشبوؤں کا ایک رقصِ ناتمام جاری تھا۔ میرے دل میں بھی عزم و عمل کی ایک ننھی سی قندیل روشن تھی۔ دست و بازو میں اتنی توانائی تھی کہ میں اپنے باغیچے ہی کو نہیں بلکہ دوسروں کے باغ باغیچوں کو بھی سنوار اور نکھار سکتا تھا۔ خونِ جگر سے ان کی آبیاری کر سکتا تھا اور انہیں ایک آسیب زدہ تاریک بیابان سے ہنستے مہکتے گلستانوں میں تبدیل کر سکتا تھا، مگر نہ جانے کیسے اور کس مرحلے پر میرے دل میں خوبصورتی سے پیار کرنے والا اور ہمہ وقت فروزاں رہنے والا حسین جذبہ بجھ سا گیا۔ ایک بار میری آنکھ کیا جھپکی کہ جیسے ایک عہد بیت گیا۔ پھر مجھے یونہی آنکھیں موندے اونگھتے رہنے کا روگ سا لگ گیا۔

اب میں کتنے ہی برسوں سے آنکھیں جھپکائے خواب اور بیداری کے سنگم پر جھول رہا ہوں۔ بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے اونگھتا رہتا ہوں، جیسے کوئی افیونی افیون کی پینک میں نیستی اور ہستی کے مابین معلق ہو۔

میں ایک باغباں تھا مگر تلائی کے دوران میں نے بیکار جڑی بوٹیوں کو تلف کرنا نہیں چاہا۔ میرے اسی ذرا سے تساہل سے زمین کو قوتِ نمو جو پھولوں کی نشوونما میں مدد دے سکتی تھی، بیکار طفیلی پودوں کی نذر ہونے لگی پھر میری کاہلی پر ماتم کرنے کے لیے باغیچے کے عین وسط میں تھوہر کے ایک پودے نے ناگ پھنی کی طرح سر اٹھایا پھر تھوہر کی فوج ظفر موج برابر اُگنے اور نشوونما پانے لگی جس نے آہستہ آہستہ باغیچے کی ساری کیاریوں کو اپنے فولادی شکنجے اور زہریلے محاصرے میں لے لیا۔

اس لمحے مجھے بچوں نے کہا تھا۔ ''مالی بابا! دیر نہ کرو اپنی کھرپی یا درانتی سنبھالو اور تھوہر کو باغیچے پر غالب آنے سے روک دو۔''

''نہیں ننھے منے پیارے فرشتو!'' میں نے انہیں ٹوک دیا۔ ''تھوہر بھی تو خدا کی ایک نباتاتی مخلوق ہے۔ یہ بھی ایک اکھڑ سا جنگلی پھول ہی تو ہے۔ بظاہر بھدا سا ہے مگر دیکھو تو سر پر سجا! تاج پہنے پھولوں کے درمیان کتنا بھلا لگتا ہے۔ یہ تو بھیڑ بکریوں کا داخلہ روکنے کے لئے بھی ایک حفاظتی پشتے کا کام دیتا ہے۔''

اس وقت سچ مچ میری سوچوں کے نخلستان جھلس کر رہ گئے تھے اور میری ساری خود آگاہی اور خود اعتمادی ریت کی فصیل بن کر ڈھ گئی تھی۔ ایک بے بنیاد سے گمان اور بے معلوم سے خوف نے میرے آگے پیچھے دیواریں سی اٹھا دی تھیں۔ اسی لئے میں اور بھی تھکن اور کسلمندی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ میرے گرانڈیل اعضا کی ساری توانائی ایک دہشت زدہ فضا میں سلب ہو کر رہ گئی۔

میں کہ ایک باغیچے کا غریب رکھوالا تھا۔ بے انداز عزم اور حوصلے کا نشان تھا۔ قوت و توانائی کا ایک سرچشمہ تھا۔ مگر آج میرے بچے بھی یوں درماندہ و خستہ اور پامال دیکھ کر منہ میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ ایک پوری نسل کا ماتم کرنے لگتے ہیں۔ میرے بے بضاعتی اور بے اعتمادی پر وہ ششدر ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ان کی حیرت زدہ صورتیں ایک مجسم سوال کا روپ دھار لیتی ہیں۔

''مالی بابا! آپ تو کبھی ایسے بے عمل، بے یقیں اور بے حس نہ تھے۔ آپ کو آخر ہو کیا گیا ہے؟ ایک پُر اسراری چپ اور

سنگدلانہ بے تعلقی نے تو آپ کی رہی سہی زندگی کی رمق بھی چھین لی ہے۔''

ہاں، میں انہیں کیا جواب دے سکتا ہوں؟ میں اپنی احمقانہ سوچوں کا ماتم کروں یا اسے گلستان کی تقدیر کہوں۔ مگر نہیں تقدیر تو شاید تدبیر کے اشاروں کی منتظر رہا کرتی ہے۔ کہتے ہیں دنیا میں جب بھی کہیں پھول اگانے والے ہاتھ کپکپانے یا سرہانے کا کام دینے لگتے ہیں تو باغوں میں چنبیلی اور گلاب کھلنے کی بجائے طفیلی جھاڑ جھنکار اور تھوہر اُگنے لگتے ہیں۔ پھر باغ کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے اور ایک ویرانی اور جانگسل سکوت سا چھا جاتا ہے۔

میرے بچے جو اسی باغ میں ہنستے کھیلتے جوان ہوئے ہیں اس بات پر اکثر کڑھتے ہیں کہ اب درختوں کی پھنگوں پر بیٹھے پرندوں کی چہکار سنائی نہیں دیتی۔ جیسے وہ اصلی نہ ہوں، حنوط شدہ پرندے ہوں، جنہیں ڈوریوں کے سہارے ٹہنیوں سے باندھ دیا گیا ہو۔

ایک روز تو غضب ہو گیا۔ وہ کہنے لگے۔

''بابا! یہ قبرستان ایسی ویرانی اور اداسی تو ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔ یہاں تو ہر طرف ٹُنڈ مُنڈ پیڑوں اور منڈھیروں پر اُلّو بیٹھے ہوئے ملتے ہیں۔ شکستہ کیاریوں پر ٹوٹی ہوئی قبروں کا گمان ہوتا ہے۔ مٹیالی روشوں پر دُھول سی اُڑتی ہے۔ توبہ اللہ۔ یہاں کس قدر حبس ہے۔ یہاں سے تو ہمیشہ کے لئے چلے جانے کو جی چاہتا ہے۔''

کچھ سائنسی مذاق رکھنے والا ایک دوسرا بچہ کہنے لگا۔

''شائد اس زمین کی مٹی میں کسی کیمیائی جزو کی کمی واقع ہو گئی ہے۔ یا پھر اس کی تہوں میں کہیں زہریلا مواد جمع ہو گیا ہے جس نے زمین کی شریانوں میں اتر کر اخوت و محبت کے سارے رشتے کاٹ دیئے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس گلستاں کو پرانے وقتوں کے ایک بیاباں میں تبدیل کر دیا ہے۔'' میں اپنے بیٹوں کی باتیں، کھردرے حقائق سے عبارت باتیں، خجالت آمیز سکون کے ساتھ سنتا ہوں اور سر جھکا لیتا ہوں۔

درست ہے کہ گلستاں کے اکثر پھول، تھوہر کے قلب نما پتوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ تیز نوکیلے اور زہریلے کناروں والے خاردار پتے...... جو کسی کوڑھی کے جسم کی طرح اندر اور باہر سے زہریلے مواد سے لبریز ہوں، ان پھولوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے کملائے ہوئے زرد چہرے، غمگیں اور متفکر صورتیں میری نظروں تلے گھوم گھوم جاتی ہیں اور میں سوچنے لگتا ہوں۔ میرے گلستاں سے بہار اب کترا کر کیوں گزرنے لگی ہے۔ اب ہر سمت کانٹے ہی کانٹے کیوں ہیں۔ زہریلی نفرتوں اور بغض و عناد کی دلدل میں انسانیت کا زخمی ڈھانچا دُور دُور تک دھنس گیا ہے۔ ہر سمت موہوم سی عفونت ہے جیسے کہیں کوئی مردہ جانور گل سڑ رہا ہو۔ ہر طرف اڑتی ہوئی دھول ہے اور پھولوں کی نازک پنکھڑیوں پر چھا جانے والے تھوہر کے پھن ہیں، شاید یہ میرے گلستاں کا مقدر نہیں۔

میں تو اپنے من کو ٹٹولتا ہوں تو سارا قصور مجھے اپنا ہی نظر آتا ہے۔ یہ سب یقیناً میری اپنی ہی کج فہمی کا کیا دھرا ہے۔ جب اس پھلواری میں تھوہر کے پہلے ناگ نے پھن اٹھایا تو میں نے اسے اکھیڑ پھینکنے کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں سمجھی۔ پھر دوسرے اور تیسرے ناگ نے پھن پھیلا دیئے جن کی جڑیں زمین میں دور دور تک پھیلتی چلی گئیں پھر شاخوں کی صلیبوں پر لٹکے پھولوں کی چِتاں ریزہ ریزہ ہو کر خاک میں ملنے لگیں۔ پھول اپنی ہی چتا کی آگ میں سلگنے جھلنے لگے اور ان کی جلی ہوئی پتیوں کی باس دھرتی کے دوسرے کنارے تک پھیل گئی۔

ابھی کل ہی میرے بچے پوچھ رہے تھے۔ ''بابا ہمارے اردگرد اتنا گھمبیر اندھیارا اور اندھیرا کیوں ہے۔ ہم اپنے اور پرائے کی نظر میں اتنے ہیٹے کیوں ہیں؟ ہم اپنے سائے تک سے خوفزدہ کیوں رہتے ہیں، ہم مالک ہوتے ہوئے اتنے بے بس سے کیوں ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہری ہری روشوں اور گھنے پیڑوں کے ساتھ ساتھ یہاں کی ہر چیز گروی رکھ دی گئی ہو۔''

یہ سچ ہے کہ میں پرانی نسل کا نمائندہ ہوں اور اپنے نوخیز بچوں کی جوان سوچوں سے کبھی کبھی بڑا خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔ انہیں مطمئن کرنے کے لئے میرے پاس کوئی دلیل اور منطق نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ خود ہی میرے بالوں کی اداس چاندنی اور ہاتھوں کی کپکپاہٹ میں اپنے سوالوں کے جواب پا لیتے ہیں۔ وہ میری سوچوں کی نقاہت اور ہاتھوں کے رعشہ کا سبب جانتے ہیں۔ اسی

کے تھوہر کے پر اسرار قصے اور اس سے نجات کی بابت کچھ پوچھتے ہیں تو میں بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ سجدے میں چلا جاتا ہوں تبھی در بند پا کر رقت بھری دعاؤں کے در کھول لیتا ہوں

''یا مالک! اپنے حبیب کے صدقے...... میری اس پھلواری کو بلائے ناگہانی سے نجات دے۔ یا خدا یہاں تھوہر نہ اگنے دے تاکہ گلاب مصلوب نہ ہوں۔''

گھڑی دو گھڑی کے لئے جب میں سجدے سے سر اٹھاتا ہوں تو اپنی الہامی کتب سے مقدس آیات کا ورد کرتے ہوئے اپنے اجاڑ در و بام پر پھونکتا ہوں کہ کسی طرح یہ بلائے زمینی ٹل جائے۔ دھرتی کے سرطان سے اسے شفا مل جائے اور وہ صدیوں پرانے ایک بیاباں سے عہدِ نو کے ایک گلستاں میں بدل جائے۔ میں مستقبل سے مایوس قطعاً نہیں ہوں، پھر بھی میں کتنا مضمحل اور تھکا تھکا سا لگتا ہوں میری سوچوں کو جب بے بسی کے اس بھنور سے نکلنے کا کوئی رستہ نہیں ملتا تو میرا دل لہو کے آنسو رونے لگتا ہے۔ اب تو ان خزاں زدہ لمحوں میں بے برگ و بار شاخوں کے درمیان رینگتا ہوا سناٹا میری روح تک کو ڈسنے چلا آتا ہے...... میں سوچتا ہوں کیا یہ یخ بستہ سناٹا ہمیشہ رہے گا؟ کیا تھوہر کے تیز نوکیلے سرے پھولوں کے سینے میں یونہی چھلنی کرتے رہیں گے؟ اور مہکتے گلاب یونہی شاخوں پر مصلوب ہوتے رہیں گے؟

میں اپنی سوچوں کے صحراؤں میں دیر تک بھٹکتا رہتا ہوں۔ مگر ہر طرف بے جان سہاروں کے سراب ملتے ہیں۔ کہیں امید کا نخلستان نظر نہیں آتا تو میں تھک ہار کر نقلِ مکانی کی تدبیریں کرنے لگتا ہوں اور یہ بھول جاتا ہوں کہ تھوہر اور گلاب کا وجود تو قدرتی ہے۔ یہ اندھیرے سے اجالے کی طرح ازلی ہے۔ ان کی جنگ ابدی ہے زمین پر جب بھی کہیں بھی کسی باغباں کی آنکھ جھپکتی ہے اور وہ اپنی کھرپی کا اور فوارے کا استعمال بھول جاتا ہے اور درانتی کو سرہانے رکھ کر سو جاتا ہے تو دھرتی پر طفیلی گھاس پھوس اور تھوہر یلغار سی کر دیتے ہیں۔

آج ہی سورج طلوع ہونے پر جب میری آنکھ کھلی تو میرے سرہانے سے میری درانتی غائب تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا، میرے نوعمر بچے کے ہاتھوں میں درانتی کے دندانے کہکشاں کی مانند دمک رہے تھے سورج کی روشنی میں چمکتی درانتی اپنے بچے کے ہاتھوں میں لہراتی دیکھ کر میرے برسوں کی بجھی بجھی آنکھوں میں پہلی بار ایک چمک لہرا اٹھی مگر کون جانے اس کا دل مایوسی کی تاریک گپھاؤں میں ابھی مقید ہے یا ایک نئے عزم اور یقین سے منور ہو چکا ہے۔

جانے وہ اس درانتی سے اپنا ہی گلا کاٹ لے گا یا تھوہر کو اس کی جڑوں سمیت اکھیڑ کر دھرتی پر لاکھوں گلاب اگائے گا۔

کون جانے...... کون جانے۔

OOO

مسعود مفتی

انصاف

تھوڑی دیر میں مقدمے کا فیصلہ سنایا جانا تھا۔
ملزم ہتھکڑی میں دونوں ہاتھ جکڑے ہوئے امید و بیم کی حالت میں خاموش تھا۔ اس کا باپ، ماں اور چند دوسرے رشتہ دار ذرا فاصلے پر تھے۔ عدالت کے باہر گاؤں کے چند اور لوگ بھی منتظر تھے۔
جج عدالت سے ملحقہ کمرے میں سر پکڑے سوچ رہا تھا...... مقدمے کی فائل اس کے سامنے پڑی تھی۔

یہ عجیب مقدمہ تھا۔
ملزم پچیس سالہ نوجوان تھا، اور کراچی میں سرکاری ملازم تھا۔ اس کے خلاف الزام یہ تھا کہ اس نے اپنے ایک سالہ بچے کو قتل کر دیا تھا۔ وہ قتل سے انکاری تھا۔ مگر باقی تمام حالات تسلیم کرتا تھا جو استغاثہ کی کہانی میں پیش کیے گئے تھے۔
دو سال پہلے اس کی شادی اپنی چچازاد بہن سے ہوئی اور بڑے عجیب حالات میں...... بیوی کی ماں چند سال پہلے مر گئی تھی۔ ماں کی نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے لڑکی بہک گئی۔ کالج آتے جاتے کسی کے ساتھ تعلقات ہو گئے۔ اور باپ کو تب پتہ چلا، جب حاملہ ہو چکی تھی۔ اس نے علاج وغیرہ کرانے کی کوشش کی مگر فائدہ نہ ہوا...... لڑکی نے انتہائی سختی کے باوجود اپنے آشنا کا نام نہ بتایا۔ تب وہ اپنے چھوٹے بھائی کے پاس آیا، جو ملزم کا باپ تھا۔
بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو باپ کی طرح پالا تھا۔ کیونکہ چھوٹے کے بچپن میں ہی والدین کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کی ساری تعلیم و تربیت بڑے بھائی نے کی تھی۔ ملازمت دلائی اور شادی کرائی۔ وہ بھی اسے بالکل باپ کی طرح سمجھتا تھا۔
بڑے بھائی نے چھوٹے کے پاؤں پکڑ لیے۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور سارا واقعہ کہہ سنایا۔ خاندان کی عزت، گھر کی عزت، بڑے بھائی کی عزت...... چھوٹا گڑبڑا اٹھا، بھتیجی پر غصہ آیا، بڑے بھائی پر ترس آیا، اور اپنی ساری عمر کی احسان مندی اس کے دل و دماغ میں سمٹ آئی۔
سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ ملزم چند دنوں میں چھٹی پر آ رہا ہے اس کی شادی چچازاد بہن سے کر دی جائے۔
شادی پوری دھوم دھام سے ہوئی۔
اگلی صبح تک ملزم کو پتہ چل چکا تھا کہ اس کی بیوی حاملہ ہے۔ اس کے احتجاج پر والدین اور چچا نے ساری بات سمجھائی۔ مگر وہ سخت ناراضگی کی حالت میں بیوی کو چھوڑ کر کراچی چلا گیا...... بزرگوں نے سوچا، خود ہی کچھ دن بعد سمجھ جائے گا۔
چار ماہ بعد اسے اطلاع دی گئی کہ اس کی بیوی کے ہاں لڑکا ہوا ہے...... اس نے چھپانے کی کوشش کی۔ مگر دفتر میں کسی کو اپنے رشتہ دار کی معرفت پتہ چلا۔ اور بات ہر طرف پھیل گئی۔ اس سے اٹھتے بیٹھتے مذاق ہونے لگا۔ اور اس نے احساسِ کمتری میں سب لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔
باپ اور چچا نے کئی دفعہ کوشش کی کہ وہ اپنی بیوی کو بسا لے، مگر وہ نہ مانا۔ کئی دوسرے رشتہ داروں نے بھی کوشش کی۔ مگر وہ طلاق پر بضد رہا۔
آخر بیوی نے اسے پے در پے خطوط لکھنے شروع کیے۔ ماضی کی معافی چاہی۔ زندگی بھر خدمت کا یقین دلایا۔ طلاق کی حالت میں بھیانک مستقبل کا نقشہ کھینچا کہ طوائف بننے کے سوا چارہ نہیں ہوگا۔ بیوی نہ رہی تو کیا، چچازاد کا رشتہ تو رہے گا، اور جس کی چچازاد طوائف ہو، اس کی کیا عزت ہوگی۔
بالآخر وہ دل میں فیصلہ کر کے گھر آیا۔ دو چار دن گھر میں ٹھہرا، پھر سسرال گیا، تاکہ بیوی کو لے آئے، وہاں اس کی خوب آؤ بھگت کی گئی اور چچا نے از سرِ نو لڑکی کو رخصت کیا۔ اور انہیں بس پر چڑھانے خود آیا۔

بس نے اسی میل کا فاصلہ طے کر کے پانچ گھنٹے بعد گھر پہنچنا تھا۔ مگر وہ راستے ہی میں اتر گئے۔ کیونکہ وہ بیوی کو چند عزیزوں سے ملوانا چاہتا تھا۔ بچے کو گود میں لئے وہ بیوی کے ساتھ ساتھ کھیت میں پگڈنڈی پر چل رہا تھا...... ایک جگہ وہ پیشاب کرنے رکا، اور بیوی آگے چلتی گئی۔

اس نے بچے کو پگڈنڈی پر لٹایا۔ ایک اینٹ نیچے رکھی، اور دوسری سے دو تین بھر پور ہاتھ مار کر اس کی پسلیاں توڑ دیں......

پھر وہ اطمینان سے بیوی کے پاس گیا، اور کہنے لگا آج سے ہم نئی زندگی شروع کریں گے، ماضی ختم مستقبل شروع، تم طوائف نہ بنو گی۔ میں لوگوں کی ہنسی کا نشانہ نہ بنوں گا۔

اور وہ بس میں بیٹھ کر گھر پہنچ گئے۔

پیچھے گاؤں والوں نے کھیت کے اوپر کوؤں کا جمگھٹا دیکھا، تو فصل میں جھانکا...... وہاں بچے کی لاش تھی...... ملزم کی بیوی نے بھی ایک خط پولیس کو لکھ دیا۔ دونوں شہادتیں مل گئیں۔ ملزم گرفتار ہوا، اور مقدمہ شروع ہو گیا۔

ملزم سارے واقعات کو تسلیم کرتا تھا، سوائے قتل کے، مگر بچے کے قتل یا گمشدگی کے متعلق کوئی جواز نہ دے سکتا تھا...... کسی قسم کے شک کی کوئی گنجائش نہ بچی تھی کہ اس نے قتل کیا ہے۔ اور جرم مکمل طور پر ثابت ہو چکا تھا۔

اس مقدمہ میں شہادتیں بھی عجیب طرح کی تھیں۔

بیوی نے ملزم کے خلاف شہادت دی تھی، اور قتل کی ساری تفصیلات بتائیں۔ اسے بچے کے مرنے کا بہت افسوس تھا۔ جو ''کسی'' کی نشانی تھی۔ ''کسی'' کا نام بتانے سے اس نے صاف انکار کر دیا۔ صرف اتنا کہا کہ میری خاندانی روایات اور ہماری معاشرتی اقدار مجھے اس شخص سے شادی کی اجازت نہیں دیتیں، تو میں کیوں اس کا نام اچھالوں۔ خصوصاً جبکہ میں اس سے پیار کرتی ہوں۔

ملزم کی ماں عدالت میں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی کہ خدا کے لئے مجھ سے میرے بیٹے کے خلاف شہادت نہ لو، میں کس طرح خود پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں ڈالوں۔

ملزم کا چچا اس کے خلاف پیش ہوا۔

ملزم کا باپ کبھی بیٹے کی حمایت پر اُتر آتا، اور کبھی بھائی کی...... شہادت کے دوران اسے دو دفعہ اعصابی تشنج کا دورہ پڑا۔

باقی رشتہ دار بٹے ہوئے تھے، اپنی اپنی برادری کی مصلحتوں کی بنا پر۔

جج ایک انتہائی شریف اور ذہین انسان تھا۔ وہ کئی دنوں سے اس مقدمے میں الجھا ہوا تھا۔ وہ انصاف کرنا چاہتا تھا مگر جو چیز اسے ایک دفعہ انصاف لگتی، وہ دوسری نظر میں ظلم لگتی۔ ایک سالہ بچے کے قتل کو وہ بہت بڑا سانحہ مانتا تھا...... مگر اس سانحہ کا ذمہ دار کون تھا؟

ملزم بے قصور لگتا تھا...... وہ حالات کی زد میں آ گیا تھا۔ ایسے حالات جو اس کے اپنے پیدا کردہ نہ تھے۔ شادی اس کی مرضی کے بغیر ہوئی۔ بیوی کی حالت کا اسے علم نہ تھا۔ اگر وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتا تو دنیا اسے بے غیرت کہتی۔ طعنے اس کے چاروں طرف گھومتے اور وہ زمانے بھر میں نکو بن جاتا...... اگر وہ طلاق دینا چاہتا، تو اسکے والدین سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ چچا اور دوسرے عزیزوں کا دباؤ اس کے علاوہ تھا۔ اس کی طبیعت میں سرکشی اور بغاوت نہ تھی، یہ طبیعت بھی خدا کی ودیعت کردہ تھی، اور اس کی اپنی بنائی ہوئی نہ تھی۔ اس لئے وہ یہاں بھی بے بس تھا...... آخری صورت بچے کے قتل کی تھی۔ لیکن اس طرح وہ قانون کی گرفت میں آ جاتا۔ گویا ملزم کے لئے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن، والا معاملہ تھا...... وہ سزا کا نہیں، بلکہ ہمدردی اور ترس کا مستحق تھا۔

تو پھر اس سانحے کی ذمہ داری لڑکی پر تھی؟...... جس نے پہلے بداخلاقی کی، اور بعد میں اپنے شوہر کے خلاف شہادت دی۔ مگر اس سارے ڈرامے میں لڑکی کا اپنا دخل کتنا تھا؟...... اس کی ماں مر گئی تھی۔ ماں کی موت اس کے اپنے اختیار سے باہر تھی۔ مگر نتیجہ اسے بھگتنا پڑا کیونکہ اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے والا کوئی نہ رہا۔ فطرت منہ زور جوانی بن کر اس پر چھائی ہوئی تھی......

تھی...... اور پیار بھی ایسا، کہ اس نے اس کا نام چھپانے کے لئے ہر اذیت برداشت کی۔ اور اپنے ... دی...... ہمارا، بلکہ ساری دنیا کا ادب ایسے پیار کو آسمان پر چڑھاتا ہے۔ شاعر اس کے قصیدے گاتے ہیں اور ناولوں اور فلموں کے قاری ایسی ہیروئن کے لئے اپنے دل میں گہری ہمدردی رکھتے ہیں۔ جو کسی سے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے، مگر رسم ورواج کی وجہ سے شادی نہ کر سکتی ہو۔ ہم سب کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوتی ہیں لیکن جو چیز دلوں میں جائز سمجھی جاتی ہے، اسے کھل کر جائز کیوں نہیں کہا جاتا!

تو کیا لڑکی واقعی قصوروار تھی؟...... جج کا جواب نفی میں تھا۔

تو پھر کیا ملزم کا باپ قصوروار تھا؟ جس نے جانتے بوجھتے ہوئے بچے کو آگ میں جھونکا۔ اس کا سودا ایسے کیا جیسے کسی میز یا کرسی کا کرتے ہیں...... اس کے احساسات، جذبات، امنگوں اور اخلاقی ضابطے کا کوئی خیال نہ کیا۔ وہ یقیناً اس ڈرامے میں سب سے گھناؤنا کردار ہے...... مگر جب اسے دوسری طرف سے دیکھتا تو یہ بات غلط نظر آتی۔ وہ اسی جذبے کے تحت کام کر رہا تھا۔ جس پر ہمیشہ تحسین ہوتی ہے۔ احسان مندی کا جذبہ۔ وہ اپنے بڑے بھائی کا باپ کی طرح احسان مند تھا۔ وہ اسے مصیبت میں دیکھ کر یہ نہ بھول سکا کہ اس نے اس کے لئے کتنی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ خود فاقے کر کے اسے پڑھایا ہے، اور اپنے سے بہتر عہدے تک پہنچایا ہے...... وہ کیسے اتنا احسان فراموش بن سکتا تھا...... اس کا جذبہ یقیناً قابلِ داد تھا۔

تو کیا چچا قصوروار تھا؟ جس نے اپنی لڑکی کا عیب چھپانے کے لئے اپنے بھتیجے کو قربانی پر چڑھا دیا، جو خود غرضی کا مرقع تھا، اور اپنے فائدے کی خاطر دوسرے کا نقصان بھول گیا...... لیکن وہ بھی کیا کرتا! وہ باپ تھا۔ یہ اس کی اپنی ذات کا معاملہ نہ تھا، ایک لڑکی کی زندگی کا سوال تھا، جسے اس وقت دھتکارنا لازمی تباہی کا باعث بنتا۔ ابھی وہ ایک دفعہ بھٹکی تھی۔ پھر مستقل بہک جاتی۔ کون شخص یہ پسند کرے گا کہ اپنے ہاتھوں اپنی لڑکی کو رنڈی کے کوٹھے پر بٹھا دے۔

تو پھر کوئی بھی قصوروار نہ تھا؟...... سب اپنی اپنی جگہ قابلِ ترس تھے...... حالات کے تراشیدہ...... مجبور اور بے بس...... اس طوفان کے زبردست ریلے میں ڈبکیاں کھانے والے تنکے، جس کے پانی نہ معلوم کہاں کہاں سے آ کر اکٹھے ہوئے تھے، کوئی بوند آسمان سے گری...... کوئی نالی گلی میں چھلکی، کوئی برف چوٹی پر پگھلی اور کوئی سوتا زمین سے پھوٹا...... یہ سب مل کر حالات کا ریلہ بنے، جس میں بچہ بہہ گیا......

مگر اس میں بچے کا کیا قصور تھا؟...... وہ بالکل ایسا ہی بچہ تھا، جیسا کسی سہاگن کا!...... چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، دبی دبی گلکاریاں، معصوم مسکراہٹ...... وہ جینے کا حق لے کر آیا تھا۔ اسے ان اقدار کا علم نہ تھا، جن کی وجہ سے اس کی ہستی قابلِ قبول نہ تھی...... اگر وہ حرام تھا، تو یہ بھی قصور دوسروں کا تھا۔ اس کا اپنا کوئی دخل نہ تھا...... وہ کیوں مارا جائے؟

سوچ سوچ کر جج کا سر گھوم جاتا، اور وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکتا۔ اگر وہ ملزم کو بری کرتا ہے، تو یہ منصبی بددیانتی ہے کہ ایک ثابت شدہ قاتل کو چھوڑتا ہے...... اگر اسے سزا دیتا ہے تو اس کا اپنا ضمیر مطمئن نہیں ہوتا، کہ وہ ایک بے بس اور مجبور نوجوان لڑکے کو اس لئے سزا دیتا ہے کہ اس نے سوسائٹی کے مقرر کردہ غیرت کے معیار کو اپنایا تھا...... جو سوسائٹی اصول شکنی پر سزا دینے کا حق رکھتی ہے، اسے اصول پرستی پر تحسین بھی تو کہنی چاہئے......!

وقت گزرتا گیا...... اور جج سوچتا رہا......

فیصلے کا دن آن پہنچا۔

جب وہ عدالت میں آن کر بیٹھا، تو مکمل سکوت تھا...... فقط ملزم کے دل کی دھڑکن تیز تھی۔

جج کافی دیر خاموش بیٹھا رہا، پھر بولا......

''حضرات! میں یہ مقدمہ دوسرے جج کو منتقل کرتا ہوں، اس کا فیصلہ وہ سنائے گا۔''

اور خود قلم لے کر لکھنے لگا......

موجود ہیں۔ اقدار کی آمریت انسانی فطرت کی [illegible]
گورکھ، افراد کے باہمی ٹکراؤ سے نکلنے والی چنگاریاں، خودغرضی اور خود فراموشی، یاس اور امید، سکون اور ہیجان، محبت اور نفرت...... یہ زندگی ہے۔ اس کی تہہ در تہہ سرنگوں میں کہیں بگولے ہیں تو کہیں نسیم سحر۔ کہیں مدہر موسیقی ہے تو کہیں گڑگڑاتے زلزلے۔ کہیں چمک ہے تو کہیں ظلمت۔ زندگی کی چال بے ڈھنگی، اس کے انداز نرالے اس کی گرفت مضبوط اور اس کا وار بھرپور ہوتا ہے۔ اس کے پہلوی فتنے آتش بازی کے اناروں کی طرح ہر دم نئے رنگ اور نئے انداز میں پھوٹتے ہیں۔

''یہ زندگی خدا کا مذاق ہے...... انسان کے ہاتھوں انسان کی گت بنتے دیکھ کر یزداں ہنستا ہے اور اس میں اور گورکھ ڈالتا ہے۔ ایسی زندگی کے بارے میں انصاف ناممکن ہے...... انصاف محض ایک واہمہ اور تصور ہے، جو اس زندگی میں کہیں بھی ممکن نہیں۔

''میں یقیناً قانون کے مطابق فیصلہ دے سکتا ہوں۔ مگر دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں جو اس الجھی ہوئی پیچیدہ زندگی کے سب پہلوؤں پر حاوی ہو، اور صحیح انصاف کر سکے...... اس لئے میں اپنے آپ کو مزید دھوکا نہیں دینا چاہتا کہ میں انصاف کر سکتا ہوں۔''

''یہ فائل کسی اور جج کے سپرد کی جائے۔ کیونکہ میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے رہا ہوں۔ جو علیحدہ ارسال کیا جائے گا۔ میں اپنی زندگی ان لوگوں کی وکالت کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں، جو قانون کی نظر میں مجرم ہوں۔ مگر دراصل زندگی کے ہاتھوں مظلوم ہوں...... میرا اجہاد، قانون اور زندگی، دونوں کے خلاف ہے۔''

OOO

نسیم درّانی

گلشن کا کاروبار

اور پھر جب یوسف نے ایک دن کراچی جانے کا اعلان کر ہی دیا تو جاننے والوں کو یوں لگا گویا اس کے خوابوں کے آتش فشاں نے لاوا اگل دیا ہو۔ کراچی جانے کے خیال نے ایک عرصے سے اس کے دل میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے کراچی کا تصور اس کے ذہن میں چھایا رہتا۔ بات بے بات کراچی کا ذکر چھیڑ دینا اس کا معمول تھا۔ سو جب اس نے یہ اعلان کیا تو کسی کو بھی حیرت نہیں ہوئی۔

کراچی اس کے خوابوں اور تمناؤں کا آتش فشاں تھا۔ وہ اس شہر کا اس وقت بھی عاشق تھا جب اس نے اس کو دیکھا بھی نہ تھا۔ لیکن گذشتہ سال جب وہ ایک ضروری کام سے کراچی آیا تھا تو اس کا عشق جنون کی حد کو پہنچ گیا۔ یہاں کی رنگینیاں، گہما گہمی رونق اور دولت کی ریل پیل دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں دولت کمانے کا اسے حد درجہ جنون تھا۔ لیکن کراچی میں بہتی ہوئی دولت دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اب تک وہ گاؤں میں جھک ہی مارتا رہا ہے۔ اور جب وہ یہاں سے واپس گیا تو اس ارادے سے کہ واپس یہیں آنا ہے وہ گاؤں تو واپس آیا لیکن ایک اجنبی کی طرح، گاؤں کا پرسکون ماحول، کچی پگڈنڈیاں ہرے بھرے کھیت، گھنے درخت، نہروں میں بہتا ہوا ٹھنڈا شفاف پانی، گیتوں کی تانیں گھنے درختوں کے نیچے، گولیاں کھیلتے ہوئے بچے کبڈی کھیلتے ہوئے نوجوان یہ سب اس کو غیر لگتے۔ نہایت کم مایہ اور بے قیمت، رہ رہ کر کراچی کا خیال اس کے دل پر کچوکے لگاتا۔ گاؤں کی سادہ زندگی کے روزمرہ کے کاموں سے اس کی دلچسپی کم ہوگئی اور وہ اب صرف خواب دیکھتا اور کراچی جا کر تجارت کرنے اور ڈھیری دولت کمانے کے منصوبے بنایا کرتا۔

اس کی معقول وجہ بھی تھی کہ وہ کراچی کی دولت کو ایسی کان سمجھتا تھا جہاں ہر شخص کو دولت سمیٹنے کی آزادی تھی۔ اس کے کئی دوست احباب اور واقف کار ایسے تھے جو کراچی گئے تو دنیا سے جانے والوں کی طرح خالی ہاتھ گئے مگر جب واپس آئے تو دونوں ہاتھوں سے سونا اچھالتے ہوئے ایک سے ایک نئی چیز لائے ایک سے ایک کپڑا پہنتے پھر جیرے اور شیرو کی مثالیں تو اس کے شوق کو اور مہمیز لگاتیں۔ گاؤں کے سب سے آوارہ اور لفنگے لڑکے تھے دونوں پھر ایک دن کراچی بھاگ گئے۔ واپس آئے تو دونوں کار میں آئے تھے اب ان کے کئی ٹرک چل رہے تھے۔ اور گاؤں میں سب سے اونچی اور اچھی حویلی ان ہی کی تھی۔ اور شمال کی جانب دو کوس پر جو چوک تھا وہاں اب فیضو مسلی کا طوطی بول رہا تھا۔ فیضو مسلی کے نام ۲۵ ہزار روپے کا نعامی بونڈ میں انعام نکلنے کو وہ کراچی جانے ہی کا کرشمہ سمجھتا تھا۔ پھر فیضو مسلی نے اس انعامی رقم کو کاروبار میں لگا کر دوگنا تگنا اور پنجگنا کر لیا تھا اور اسی گاؤں میں جہاں در در کے ٹکڑوں سے پلا تھا۔ اب اس کا طوطی بول رہا تھا۔

یہ وہ تمام باتیں تھیں جن کی بنا پر کراچی کے بارے میں یوسف یوں محسوس کرتا جیسے کراچی کوئی شہر نہیں دولت کا ایسا باغ ہے جہاں روپیہ درختوں سے پھلوں کی مانند پیدا ہوتا ہے...... یا کبھی اسے یوں لگتا جیسے کراچی ایک شہر نہیں الٰہ دین کے چراغ کا دیو ہے۔

''کیا چاہئے؟''

''دولت''

''اور۔''

''کوٹھی''

''اور''

''کار''

''اور کچھ''

''بنک بیلنس''

''بس''

''ایک بیوی بھی''

''ہاہاہا......!!! سب حاضر ہو جائے گا۔ سب حاضر ہے۔''

سو یہ تھا کراچی کے بارے میں یوسف کا تصور۔ کاروباری ذہنیت اس نے ورثے میں پائی تھی اور میٹرک کرنے کے بعد اب وہ بھی بھائیوں کی طرح باپ کے کاروبار میں شریک ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس کے باپ کا کاروبار خاصا پھیلا ہوا تھا۔ لیکن یوسف نے کراچی اور اس کی مناسبت سے کاروبار کا جو معیار اپنے ذہن میں قائم کیا تھا یہ اس سے کہیں زیادہ پست تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس کا معیار اسے بار بار کراچی جانے پر اُکساتا تا کہ وہاں جا کر اپنا کاروبار کرے اور دولت کا ڈھیر لگا دے لیکن اس کے ارادے میں سب سے بڑی رکاوٹ خود یوسف کا باپ اور اس کا کاروبار تھا۔ جس میں ایک چوتھائی کا وہ خود بھی شریک تھا۔

اور پھر یوں ہوا کہ اچانک یوسف کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے انتقال کے بعد بھائیوں میں کچھ عرصے تو اتفاق رہا۔ پھر ان کے درمیان تقسیم نے اپنا کا نثار کھ دیا۔ کاروبار اور جائیداد کا بٹوارہ ہوا۔ اور وہ اپنے حصے کے نقد روپے لے کر علیحدہ ہو گیا۔

اس دن اس کے چہرے پر بہت عرصے بعد مسرت اور شادابی کی لہریں رقصاں تھیں اور اسی دن اس کے خوابوں کا آتش فشاں بھی پھٹ پڑا اور اس نے گاؤں چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔

بھائیوں سے تو اس کی پہلے ہی ٹھنی ہوتی تھی لہٰذا ان کی جانب سے تو کوئی ردعمل نہ ہوا البتہ اس کی ماں بہت مغموم ہوئی پر وہ یوسف کی ضد سے واقف تھی۔ لہٰذا کچھ نہ بولی۔ لیکن اپنا آخری فریضہ پورا کرنا مناسب سمجھا اور برادری کی حسین لڑکی سے یوسف کے باپ نے اپنی زندگی میں نسبت ٹھہرادی تھی۔ شادی کر دی۔

اور پھر یوسف ایک ہفتہ کی بیاہی بیوی زبیدہ کو ساتھ لے کر کراچی آ گیا۔ چند روز ایک ہوٹل میں گزارنے کے بعد ناظم آباد میں دو کمروں کا ایک مکان کرایہ پر لیا۔ گھر کے کام کاج کے لئے ایک بوڑھی ملازمہ رکھی۔ گاؤں کی کھلی فضا میں پلی بڑھی زبیدہ کو کراچی کا یہ تنگ اور نیم تاریک مکان پسند نہیں آیا لیکن یوسف نے اس مکان کو گوارہ اور غنیمت جان کر زبیدہ کو جلد ہی کسی اور مکان میں میں منتقل ہو جانے کی تسلی دی۔

گھر کا انتظام کرنے کے بعد یوسف نے کاروبار شروع کرنے کی طرف توجہ دی۔ کراچی میں وہ ایسا کاروبار چاہتا تھا جس کے خواب وہ برسوں سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ ایسا کاروبار جس میں راتوں رات سونے اور چاندی کے ڈھیر لگ جائیں۔ اس سلسلے میں اس کی ملاقات مختلف لوگوں سے ہوئی مختلف مشورے اسے دیئے گئے مگر کسی تجویز پر اس کا دل نہیں ٹھکا ان کاموں میں جب وہ منافع کی شرح کا حساب کرتا تو یہ شرح اس کے خیال میں اس شرح سے بہت کم ہوتی جس کے اس نے خواب دیکھے تھے۔

بہرحال اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اس لئے وہ وحید کے مشورے پر خلیج فارس کی ریاستوں کو سبزی پھل وغیرہ بھیجنے کے کاروبار میں اس کا شریک ہو گیا۔ ایک ماہ بعد وحید نے دس ہزار کا نقصان بتایا جس میں سے پانچ ہزار اس کے حصے آئے۔ دولت کمانے کے شوق میں پہلے مرحلے میں پانچ ہزار کی یہ چوٹ خاصی بڑی تھی۔ اس نے اس کاروبار سے توبہ کی اور عاقل سے ملاقات کی جو اسے اس سے پہلے پیٹرول پمپ لگانے کا مشورہ دے چکا تھا۔ پیٹرول پمپ کے لئے زمین خریدی گئی۔ رقم کی ادائیگی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی عاقل غائب ہو گیا۔ پتہ چلا جو زمین اس نے خریدی تھی اس پر پہلے ہی دو پارٹیوں میں سودے بازی ہو رہی تھی۔

ایک دن اسے پتہ چلا کہ شیرا اور جیرا کراچی آئے ہوئے ہیں۔ یوسف نے ان کا پتہ چلایا اور ان سے ملاقات کی اپنا مدعا بیان کیا۔ شیرا اور جیرے نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور اسے دولت کمانے کا راز بتایا اور اپنا شریک کر لیا۔ ایک ہفتے بعد ان سے ملاقات ہوئی۔ یوسف نے ان سے منافع کی رقم مانگی تو انہوں نے بتایا کہ ان کا ٹرک معہ چرس اور افیون کے پکڑا گیا ہے اس سلسلے میں انہوں نے ایک اخبار بھی دکھایا۔ جس میں ایک ٹرک کے پکڑے جانے کی خبر درج تھی۔

یہ نقصانات اٹھانے کے بعد اس نے اپنی پونجی کا جائزہ لیا تو اسے معلوم ہوا کہ اب اس کے پاس صرف پانچ ہزار روپے باقی

ہیں۔ یہ دن یوسف کے لئے انتہائی پریشان کن تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے ایسے ہی تشویشناک ایام میں اس کی ملاقات فضل سے ہوگئی۔ فضل ۴۰۔۴۵ سال کا ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ شکل وصورت سے بڑا ہی بد ہیبت نظر آتا، پر گفتگو کچھ اس طرح لچھے دار کرتا کہ انسان سے ایک لمحے کے لئے اس کی شکل وصورت محو ہو جاتی اس کا کراچی میں اپنا کاروبار تھا کیا کرتا تھا، کہاں تھا، یہ شاید کسی کو علم نہ تھا۔ لیکن ہر نئے کاروباری آدمی سے پارٹنرشپ یا کمیشن کا خواہش مند رہتا۔

پھر یوسف اور فضل کے منصوبے زیر غور آئے۔ فضل نے چند ہی روز میں یوسف کو اس طرح شیشے میں اتار لیا کہ یوسف اس کے خلوص پر ایمان لے آیا۔ فضل نے جب یوسف کا زیادہ سے زیادہ اور جلد سے جلد دولت کمانے کا عندیہ پایا تو اس نے ایک بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ اور فوراً ہی یوسف کے سامنے ایک نیا منصوبہ پیش کر دیا۔ یوسف ایک لمحہ کو تو سناٹے میں آ گیا مگر فضل کی لچھے دار باتیں پھوار کی طرح اس کے ذہن اور دل کو شرابور کرتی رہیں۔ اور وہ اس سناٹے اور سکتے کی کیفیت سے لوٹ آیا۔

''مگر بھائی فضل......''

''اگر مگر کچھ نہیں۔ تم جلد سے جلد روپیہ کمانا چاہتے ہو۔ میں نے تمہیں اس کا گُر بتایا ہے میں ایک بات بتاؤں میاں یوسف، میرا یہ پروگرام معمولی نوعیت کا نہیں۔ اس میں آدمی راتوں رات امیر بن جاتا ہے۔ صرف ذرا سے گُر کی بات ہوتی ہے۔''

''بھائی فضل یہ تو سوچ کہ یہ کاروبار۔''

تم تو احمق ہو...... نرے دیہاتی...... فضل جانتا تھا کہ یہ دو لفظ یوسف کے لئے تازیانے سے کم نہیں۔ پھر اس نے خالص کاروباری انداز میں کہا۔ جوا، سڑک پر کھیلا جائے یا گھر میں کھیلا جائے تو جرم ہے۔ کلب میں کھیلا جائے تو فیشن ہے شراب برسر عام پی جائے یا غریب آدمی پیئے تو انتہائی رکیک حرکت ہے۔ شراب خانوں میں پی جائے یا امیر آدمی پیئے تو وہ ترقی پسندی ہوتی ہے۔ بوس وکنار بر سرِ عام کیا جائے تو قابل دست اندازی پولیس ہے۔ چھپ کر کیا جائے تو راحت قلب وجگر ہے۔ یہ ہیں اس دنیا کے اصول جس میں اب تم آئے ہو۔''

فضل کی باتیں یوسف کے جی کو تو لگتی تھیں پھر اس کا منصوبہ اپنی جگہ مکمل تھا۔ اس نے تصور میں دیکھا کہ اس نے نوٹ بنانے کی مشین لگائی ہے اور اس میں دھڑا دھڑ مختلف قسم کے نوٹ چھپ رہے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک عجیب قسم کا خوف بھی تھا۔ بالکل اس طرح جیسے نوٹ میں واٹر مارک اور چاندی کا تار ہوتا ہے۔

اس روز یوسف تمام رات جاگتا رہا اور سگریٹ پھونک پھونک کر فضل کے نئے منصوبے پر غور کرتا رہا۔ اس منصوبے میں نقصان کا کوئی احتمال نہ تھا۔ اور منافع سامنے کی بات تھی۔ ایسا تھا گویا کاروبار نہیں بلکہ لکشمی دیویاں پال لی ہوں۔

زبیدہ سے اس کی بے چینی چھپی نہ رہی۔ زبیدہ نے اس سے بار بار پوچھا مگر اس نے ہر مرتبہ کچھ نہ کچھ بہانہ بنا کر اسے ٹال دیا۔ آخر بڑی دیر اس کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اس نے فضل کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسری صبح یوسف اپنے بستر سے بڑا ہی خوش وخرم اٹھا اور جلدی جلدی تیار ہونے لگا تا کہ فضل کو جا کر اپنے فیصلے سے آگاہ کر سکے۔ اس نے مشینیں لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس کے بعد منصوبے کی دیگر تفصیلات پر غور وخوض شروع ہوا۔ فضل اس کاروبار میں پندرہ فیصد منافع کا حق دار ٹھہرا۔ پھر اس منصوبے پر عمل درآمد شروع ہوا۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں پانچ کمروں کی ایک کوٹھی کرائے پر لی گئی۔ ہر کمرے کے ساتھ باتھ، خوبصورت لان، گیراج اور سرونٹ کوارٹر اور کرایہ بھی معقول۔ پھر فضل کے مشورے سے کوٹھی کی دیکھ بھال کے لئے پچھتر پچھتر روپے کے دو ملازم اور ساٹھ روپے پر ایک بڑھیا رکھی گئی۔

ابتدائی انتظامات مکمل ہو گئے۔ اب صرف مشینوں کی درآمد باقی تھی۔ سو یوسف نے ایک دن زبیدہ سے ہفتے بھر کی مہلت لی۔ زبیدہ ان عورتوں میں سے تھی جو شوہر کی رضا میں راضی رہتی ہیں پھر یوسف تو کاروبار کے سلسلے میں باہر جا رہا تھا تو وہ کیونکر اس کے پیر کی بیڑی بن سکتی تھی۔

سو یوسف فضل کے ساتھ چلا گیا۔

ایک ایک کر کے دن گزرتے رہے۔
آٹھویں دن یوسف نہیں آیا بلکہ اس کا خط آیا جس میں اس نے کاروباری مصروفیات کا ذکر کیا تھا اور پانچ چھ دن بعد آنے کے لئے لکھا۔
غرض سولہویں دن فضل اور یوسف پھر اس کوٹھی میں نظر آ رہے تھے۔ بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ ان کے ساتھ تین مشینیں تھی۔ مگر یوسف کچھ پریشان سا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا گویا کوئی چیز اندر ہی اندر اسے مضطرب کر رہی ہے۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اور وہ وہاں سے سیدھا اپنے گھر پہنچا۔
زبیدہ اس کی منتظر تھی دونوں بڑی گرمجوشی سے ملے اور رات گئے مختلف قسم کی باتیں کرتے رہے۔ ان باتوں میں نئی کامیابیوں، نئی امیدوں اور نئی آسائشوں کی ہلکی ہلکی مسرتیں گھلی ہوئی تھیں۔
کاروبار شروع ہوا۔ فضل کے تجربے نے قدم قدم پر یوسف کی رہنمائی کی۔ فضل کے کہنے کے مطابق اب اس کا کام صرف روپے گننا رہ گیا تھا۔ پھر فضل نے اس کارخانے میں کئی دوسرے لوازمات کا اضافہ کیا۔ ایک کمرہ بار کے طور پر مخصوص کرلیا گیا۔ اس اضافے سے بھی کارخانے کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہوا۔ دن گزرتے رہے۔ یوسف نوٹ گنتا رہا۔ ایک ماہ بعد ہی یوسف کو احساس ہوا گویا DEMAND کے مقابلے میں SUPPLY بہت کم ہے۔ اس کا کاروبار عام کاروبار تو تھا نہیں، جو معاشیات کے اس کلیہ کا تابع ہوتا کہ DEMAND زیادہ ہو اور SUPPLY کم تو قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اس کاروبار کی نوعیت تو یہ تھی کہ SUPPLY جتنی زیادہ ہوگی نفع اتنا ہی زیادہ ہوگا۔
یوسف نے اس مسئلے پر فضل سے گفتگو کی اور اسے اپنا ہم خیال پایا طے ہوا کہ SUPPLY میں سو فیصد اضافے کے لئے تین مشینیں اور درآمد کی جائیں۔
فضل کو مشینوں کے لئے گئے ہوئے تین ہفتے سے اوپر ہو گئے تھے اور اس نے خط میں لکھا تھا کہ اب تک دو نگوں کا سودا پٹ سکا ہے تیسرا دو تین دن میں طے ہو جائے گا۔ رقم پر جھگڑا ہے بہر حال ایک ہفتے کے اندر اندر ضرور پہنچ جاؤں گا۔
مگر یوسف کی پریشانی کا سبب یہ نہ تھا کہ فضل کی واپسی میں دیر ہو رہی تھی۔ پریشانی کی بات تو یہ تھی کہ تینوں مشینیں سات دن سے ٹھپ ہو گئی تھی۔ ان میں مختلف نوعیت کی پیچیدہ اور پوشیدہ خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس نے بہت کوشش کی کہ یہ خرابیاں جلد از جلد دور ہو جائیں۔ مگر بے سود۔
آمدنی ختم ہو چکی تھی۔ جو رقم تھی وہ فضل لے کر گیا ہوا تھا جو کچھ اس کے پاس تھا اس میں سو روپے یومیہ کے حساب سے تو علاقے والوں کو جا رہی تھی پھر اوپر کے اخراجات علیحدہ۔ ان تمام مصیبتوں نے یوسف کے گھر اور کارخانے کا ایک ساتھ راستہ دیکھ لیا تھا۔ ان تمام الجھنوں اور پریشانیوں نے یوسف کو پاگل بنا دیا۔ رات گئے گھر لوٹتا۔ گھر کے کاموں سے اسے اب ذرا دلچسپی نہ تھی۔ زبیدہ نے کئی بار محبوبانہ انداز میں شکائتیں بھی کیں لیکن وہ ہمیشہ ٹال جاتا۔ نیا شہر، نیا کاروبار اور تنہا ہونے کا عذر پیش کر دیتا اور زبیدہ چپ ہو جاتی۔
اور اب اسے نئی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ چار ہزار کی رقم کی بات تھی، یہ رقم معمولی نہ تھی۔ سیٹھ ولی بھائی عبدالکریم سے اس نے دو ہزار روپیہ ایڈوانس بھی اسی امید پر لے لیا تھا کہ فضل اپنے وعدے کے مطابق ایک ہفتے کے اندر آ جائے گا۔ اور اس رقم سے اس نے کوٹھی کا کرایہ اور نوکروں کی تنخواہیں ادا کر دی تھیں۔ لیکن فضل نے لکھا تھا کہ اسے کم از کم ایک ہفتہ اور لگے گا۔ اور سیٹھ ولی بھائی عبدالکریم نے آج اسے فون پر بتایا تھا کہ وہ چار پانچ روز بعد فارن جانے والا ہے۔ اس موقع پر اگر فضل ہوتا تو وہ صورت حال شاید سنبھال بھی لیتا لیکن یوسف جو اس میدان میں اناڑی اور ناتجربہ کار تھا، اس کے لئے اس نئی صورت حال سے نمٹنا آسان کام نہ تھا۔
تینوں مشینیں قدرے بہتر ہو گئی تھیں اور کام آہستہ آہستہ معمول پر واپس آ رہا تھا۔ لیکن سیٹھ ولی بھائی والا معاملہ دگر تھا۔ ان کو سیکنڈ ہینڈ مال درکار نہیں تھا۔ نیا ایک دم فسٹ کلاس مال کی ضرورت تھی۔ وہ کیا کرے کیا نہ کرے؟

چار ہزار روپے کی رقم...... اسے یوں لگ رہا تھا اگر یہ رقم اس کے ہاتھ سے نکل گئی تو وہ کبھی اس نقصان کو پورا نہیں کر سکے گا۔

اور آج پھر سیٹھ ولی بھائی کا فون آیا تھا۔

''اجن ابھی تم لفڑے بازی نہیں کرو۔''

''سیٹھ صاحب فارن سے واپسی پر''

''نئیں نئیں بابا۔ چھوڑو۔ ابھی ہمارا ایڈوانس ہمارے کو واپس کرو۔''

اس نے سیٹھ ولی بھائی سے وعدہ کرلیا اور پھر اسی روز ٹرنک کال پر فضل سے رابطہ قائم کیا۔ تمام صورتِ حال سے اسے آگاہ کیا اور ہدایت دی کہ وہ دونوں نگوں کو لے کر فوراً ہوائی جہاز سے کراچی پہنچے۔ تیسرے نگ کی خریداری کے لئے بعد میں دیکھا جائے گا۔ فضل نے اسے یقین دلایا اور یوسف کو قدرے اطمینان ہوگیا۔

اس رات یوسف گھر آیا تو زبیدہ جاگ رہی تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ زبیدہ نے اتنی اتنی رات تک خود جاگتے رہنے اور اس کے انتظار کی کوفت اٹھانے کی شکایت کی تو یوسف پھر حسب عادت ہوں ہاں کر کے رہ گیا۔ زبیدہ چڑ سی گئی اور تب اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔ یوسف اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ اس محلے کے لوگ اور مکان کی مالکن بہت خراب ہیں۔'' پھر اس نے بتایا کہ مکان کی مالکن کا اس سے خوب جھگڑا ہوا ہے۔

مگر کیوں ہوا ہے۔ تمہارا جھگڑا۔ یوسف نے پوچھا۔

ہوتا کیا اس کمینی نے الزام لگایا تھا مجھ پر، یوسف تو خود بتا۔ تیرے بنا مجھے یہ گھر کیا کاٹ کھانے کو نہیں دوڑتا ہوگا؟ گلی میں بچے کھیلتے پھرتے ہیں میں کھڑکی سے یا دروازے میں کھڑے ہو کر انہیں دیکھتی ہوں اور یوں دل بہلاتی ہوں تو کیا بُرا کرتی ہوں اور اس بدذات نے مائی سے نہ معلوم کیا الٹی سیدھی باتیں جڑ دی ہیں۔ کمینی حرافہ...... یوسف اب میں یہاں نہیں رہوں گی۔''

یوسف نے ایک دم چونک کر زبیدہ کی طرف دیکھا۔

یہ چہرہ اتنی بار دیکھا ہوا تھا۔ یہ چہرہ اس کی اپنی بیوی زبیدہ کا چہرہ تھا۔ لیکن آج یہ چہرہ اسے بہت عجیب سا لگا۔ پھول کی طرح تروتازہ خوبصورت حسین اور لازوال حسن کا شاہکار۔

تو یہ زبیدہ ہے۔ اس نے سوچا۔ اس نے آج تک زبیدہ کو ان نظروں سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے سامنے زبیدہ کا چہرہ تھا۔ وہ اس چہرے کا موازنہ کر رہا تھا۔ سو میں ہزاروں میں لاکھوں میں ایک تھا۔ وہ چہرہ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں۔

''ارے یوسف کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ تم ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔ بس ٹھیک ہے تمہیں بلاوجہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

یوسف اب بھی کچھ نہ بولا۔ وہ زبیدہ کا چہرہ تکتا رہا۔

''اچھا میں ذرا ابھی آتا ہوں۔''

یوسف ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

''مگر اس وقت کہاں جا رہے ہو۔''

''فضل کو فون کر آؤں کہ ہوائی جہاز سے نہ آئے۔ بلاوجہ اتنے پیسے فالتو خرچ ہوں گے۔''

اور میں نے جو کہا اس کا کوئی جواب نہیں دیا تم نے۔'' زبیدہ نے کہا۔

یوسف نے ایک بار پھر زبیدہ کا اوپر سے نیچے تک بھرپور جائزہ لیا۔ اور پھر پریشان پریشان سی زبیدہ کو بڑے ہی پیار سے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

''ہاں کل سے اب تم یہاں نہیں رہوگی۔ ہم سوسائٹی چلے جائیں گے۔''

○○○

سبزی ترکاری کی بڑی بڑی کیاریوں میں پانی کی نالیاں ...
دیکھا اور زور سے بولا۔ ''ہاں اب بڈھا مر رہا ہے نا...... پہلے تو برسوں کوئی نہ آتا۔ اب موٹروں پر موٹریں بھر بھر کر آ رہی ہیں، جسے
نخرے جو کرنا ہیں...... ہا آ...... یہ آل اولاد بھی بڑی بے ایمان چیز ہے۔''
کالے رنگ کی بڑی سی کار دھول میں آئی۔ ہچکولے کھاتی قریب سے گزری تو خانو اور اس کے بابا نے ماتھے پر ہتھیلی سامنے کر کے اپنے حساب بے حد اپٹوڈیٹ سلام کیا۔
''سنا ہے شہر میں مالک کے سب بچے ننگے سر پھرتے ہیں اور بیبیاں برقع بھی نہیں اوڑھتیں۔'' فانو نے للچا کر موٹر کو دیکھا جس میں پہلے آنے والی موٹروں کی طرح شیشوں پر رنگین پردے چنے ہوئے تھے۔
اب موٹر اس کائی زدہ حویلی کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی جس کا طرز تعمیر اس سارے ماحول میں بڑا اجنبی سا لگتا تھا۔
''او جی آخر کو بڑے پوتے بھی پہنچ ہی گئے۔'' بوڑھے ریٹائرڈ فوجی رمضان علی نے کھاٹ پر سے اٹھ کر سلیوٹ مارا اور پھر اباؤٹ ٹرن ہو گیا تاکہ موٹر میں آنیوالی بیبیاں زنان خانے کی ڈیوڑھی میں داخل ہو جائیں۔ رمضان علی بہ یک وقت اس حویلی والے کی زمینوں کا منتظم بھی تھا اور حویلی کا چوکیدار بھی۔ جب وہ موٹر کے دروازے بند ہونے کی آواز کے ساتھ مڑا تو دیکھا جمیل میاں اپنا ڈاکٹروں والا بیگ اٹھائے سیدھے ڈیوڑھی کی طرف جا رہے ہیں۔
''پہلے ادھر آ جاؤ بیٹا۔'' مردانہ بیٹھک سے اباجان کی رعب دار آواز ابھری تو وہ بادل ناخواستہ ادھر ہی مڑ گئے۔
اونچے کٹاؤ دار محرابی برآمدے سے گزر کر وہ لمبے سے سہ درے کمرے میں داخل ہوئے جس کے ہرے رنگ کے دانے دار شیشوں سے مزین دروازے بند تھے اور کمرے میں ٹھنڈا اداس اندھیرا تھا جو دھوپ سے آئے ہوئے جمیل کی نظروں میں کچھ زیادہ ہی گہرا تھا درمیان میں اونچی نقشیں آبنوسی میز تھی۔ وہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے سنبھلے اور پھر اپنا بیگ اسی پر رکھ دیا۔ مگر اس کے ہینڈل پر سے ہاتھ نہ اٹھایا۔
کمرے میں ڈاکٹر جمیل کے ابا کے علاوہ دونوں چچا، پھوپھا اور کئی پھوپھی زاد اور چچازاد موجود تھے۔ وہ سب الگ الگ شہروں سے آئے تھے، اس لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر ملے اور سلام دعا کی۔
''راستہ بہت خراب ہو گیا پچھلی برسات میں۔ ہم تو بہت پریشان ہوئے۔ تمہاری موٹر کے ٹائر تو پنکچر نہیں ہوئے جمیل میاں......؟'' پھوپھا نے پوچھا۔
''جی نہیں تو کیا حال ہے دادا میاں کا؟'' جمیل نے سوال کیا۔
سب کے چہروں پر مایوسی کا سایہ لہرا گیا۔
''جمیل بیٹا تم پہلے منہ ہاتھ دھو لو اور چائے پی لو۔'' بڑے چچا نے بڑی شفقت سے کہا۔
''جی میں تو پہلے دادا میاں کو دیکھ آؤں...... اجازت ہے؟'' جمیل نے بیگ ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔
''یہ ڈاکٹر صاحب ابھی تو اُن کے پاس سے اُٹھ کر ادھر آئے ہیں۔'' جمیل کے ابا نے اطمینان دلانا چاہا تو جمیل نے اتنے بہت سے چہروں میں ان ڈاکٹر صاحب کا چہرہ تلاش کرنا شروع کیا اور وہ کونے میں چھپر کھٹ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا نظر آ گیا...... مطمئن، پرسکون چائے کے ہر گھونٹ پر اپنی سفید مونچھیں سنوارتا چہرہ۔

''جب دادامیاں کا حال اتنا خراب ہے تو پھر ڈاکٹر کو ہر وقت ان کے پاس ہونا چاہئے۔'' جمیل نے کہنا شروع کیا مگر بات تیزی سے کٹ گئی۔

''جی جناب...... آپ نہیں سمجھتے کچھ۔ میں بیس سال سے ان کا علاج کر رہا ہوں۔ وہ اس وقت۔ میرا مطلب ہے کہ وہ اپنی حالت کو خوب سمجھ رہے ہیں۔ اس لئے اپنے پاس ڈاکٹر کی موجودگی پسند نہیں کرتے۔'' قصباتی ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ اور گردن کے اشارے کے اضافے کے ساتھ جمیل کو بات سمجھانا چاہی۔

''میں سمجھ گیا ڈاکٹر صاحب!'' جمیل اپنا بیگ لے کر کمرے سے نکلنے لگے۔

''او ہو بیٹے تم بات نہیں سمجھے۔ ڈاکٹر صاحب صحیح سمجھتے ہیں۔ ٹھہرو۔'' جمیل کے ابا اپنی ہلکی سی جھکی کمر کو تان کر آگے بڑھے اور اپنے فرض شناس بیٹے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر برآمدے میں نکل آئے۔ ''بیٹا اب میں لڑکوں بالوں کے سامنے کیا کہوں تم سے۔'' جمیل کے ابا نے کھسر پھسر کی۔ ''دیکھو اس وقت اگر تمہارے دادا میاں کے پاس ڈاکٹر صاحب بیٹھے رہیں تو تمہاری دادی پردے کی وجہ سے ان کے پاس سے ہٹ جائیں گی اور تم جانو جو ایک عمر ایک دوسرے سے چوبیس گھنٹے کو بھی جدا نہ ہوئے ہوں۔ وہ آخری وقت میں یہ کیسے برداشت کریں گے کہ اماں جان ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں۔ تم نئے زمانے کے لوگ ان کی محبت کو کیا سمجھو گے ارے آج صبح سے تو ان کی آنکھیں بس تمہاری دادی پر ہی جمی ہیں جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں اور نہ کہہ سکتے ہوں۔ میں ابھی سب کو ان کے کمرے میں جانے سے منع کر آیا ہوں......'' اور یہ سب کہتے کہتے جمیل کے ابا کی آواز بھرا گئی۔

''جی۔ جی میں سمجھ گیا ابا جان۔ میں تو بس ایک منٹ کو انہیں دیکھوں گا شاید کوئی نیا علاج سمجھ میں آ جائے۔ میرے سامنے سے تو دادی کو نہیں ہٹنا پڑے گا۔ بس ایک نظر دیکھ آؤں...... جمیل نے سر جھکا کر درخواست کی۔

''اچھا جاؤ بیٹا......'' اور ابا نے جمیل کا کندھا چھوڑ کر بیٹھک کا رخ کیا۔

آنگن میں باورچی خانے کی دیوار کے باہر تنور گرم تھا۔ تازہ خمیری روٹیوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ جمیل کی نظر مائی رانی پر گئی جو سر پر دوپٹے کو پگڑی کی طرح لپیٹے سینکی ہوئی روٹیاں سلاخوں کی مدد سے اکھیڑ کر ٹوکری میں جمع کر رہی تھی۔

''سلام مائی رانی۔'' جمیل نے زور سے کھنکھار کر آواز لگائی تا کہ زنان خانے میں بھری ہوئی چچیوں پھوپھیوں کے علاوہ ان کی بیٹیاں، نواسیاں اور پوتیاں تک خبردار ہو جائیں اور سر ڈھک لیں۔ جمیل کو اس وقت بھی اپنی دادی کی یہ بات یاد تھی کہ حویلی میں آؤ تو یہاں کے طور طریقے برتو ورنہ گھر میں کام کرنے والی عورتیں بھی باہر جا کر باتیں بناتی ہیں۔

مائی رانی کی بختو نے جلدی سے گھونگھٹ نکال لیا اور مائی رانی تو جیسے تنور میں اوندھتے اوندھتے بچی۔ جمیل نے دیکھا بڑے برآمدے میں سوائے چند بچوں کے کوئی نہ تھا...... وہ آگے بڑھے تو پیچھے سے مائی سلاخیں پھینک ان کے پیچھے دوڑی اور آٹے سے بھرے ہاتھ بے اختیار جمیل کے کندھوں پر پھیرنے لگی۔ ''صدقے پتر تو آ گیا۔ اب مالک کی دوا دارو ٹھیک طرح ہوگی...... مالک بڑے کمرے میں......'' مائی رانی نے بڑی رقت کے ساتھ کہا اور فوراً ہی تنور کی طرف لوٹ گئی کیونکہ اس نے روٹی جلنے کی بو سونگھ لی تھی۔

مائی رانی کے ہاتھ تنور اور آٹے سے الجھ رہے تھے مگر ذہن اپنے مالک کے گرد بھنبیری کی طرح چکرا رہا تھا اسے یاد نہ تھا کہ اس سے پہلے کبھی اتنی بڑی تعداد میں مالک کی آل اولاد حویلی میں اکٹھا ہوئی ہو۔ کوئی پچاس ساٹھ سال ہوئے ہوں گے جب مالک نے اس علاقے میں مربعے خریدے اور یہ حویلی بنوائی۔

کبھی ایک دن اس کے خاوند نے کہا تھا۔ ''نیک بخت مالک ہے تو باہر کا لیکن لگتا نیک ہے! اس کے بال بچے آ رہے ہیں۔ حویلی میں چل کر روٹی پانی کا بندوبست کر دے......'' اور پھر پندرہ سال کی رانی نے موٹی موٹی روٹیاں پکاتے ہوئے گھونگھٹ کی اوٹ سے دیکھا تھا کہ لمبے سفید برقعے اور ایک بیٹے اور بیٹی کے ساتھ مالکن نئی حویلی میں داخل ہوئی اور جب مالکن نے برقع اتارا تو یوں لگا جیسے آنگن میں چاند اتر آیا ہو۔ عجیب عجیب سی خوشبو فضا میں پھیل گئی تھی۔ اس دن سے رانی نے مائی رانی بننے تک اسی باورچی خانے میں کیسے کیسے عجیب ناموں کے کھانے پکانے سیکھے...... خدا نے مالک اور مالکن کی اولاد میں برکت دی۔ زمین میں

برکت دی...... پھر ایک ایک کر کے سب حویلی سے چلے گئے مگر مالک اور مالکن کہیں نہ گئے۔ سوائے نذر نیاز کے موقعوں کے برسوں سے شاید ہی کبھی تنور گرم کرنا پڑا ہو۔ مائی رانی کتنے بہت سے دنوں سے دونوں وقت توے پر چار چھ پھلکے پکا لیتی جو مالک اور مالکن کے لئے بہت ہوتے۔ آہستہ آہستہ پھلکوں کی تعداد کم ہوتی گئی اور اب پچھلے جمعے سے وہ چند پھلکے بھی نہ پکے۔ مالک بیمار ہے تو پھلکوں کی کیا ضرورت ہے؟ مالکن کہتی ہیں۔ اللہ جانے مالک کے لئے جو یخنی بنتی ہے۔ اس میں سے مالکن دو گھونٹ پیتی بھی ہیں یا نہیں۔ ان آٹھ دنوں میں مالکن کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔ پھر بھی کیسا رکھ رکھاؤ ہے مالکن کا...... گھر میں بچے آتے ہیں اس لئے روز فجر کے وقت ہی بتا دیتی ہے کہ آج یہ پکا لو۔ مالک کے بیمار پڑتے ہی درخت میں جھولا ڈلوا دیا کہ ننھے بچے بہلے رہیں گے ورنہ اپنی ماؤں کو تنگ کریں گے...... جانے انہیں کیسے معلوم ہوا کہ مالک کی اس بیماری پر ساری آل اولاد اکٹھا ضرور ہو گی۔ اور آج!...... آج تو سب سے عجیب بات ہوئی۔ سویرے ہی بولیں۔ ''رانی آج آٹا زیادہ گوندھنا ہے۔ ہا آ۔ اللہ نے مالک کا دل کیسے پہنچے ہوئے فقیروں جیسا بنایا ہے...... ورنہ کبھی نے کہا تھا کہ جمیل میاں نہیں آسکیں گے۔ انہیں فرصت کہاں اپنے مریضوں سے اور اب وہ آ گئے اتنے دور سے......

مائی رانی نے کراچی شہر کی دوری کا اندازہ کرنے کے لئے آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں تو حویلی کی چمنی پر ایک چیل کو بیٹھے دیکھا۔ ''شوہ...... شوہ......'' مائی رانی نے گرم سلاخ لہرا کر چیل کو دھمکایا...... مگر وہ نہ اُڑی۔

''ارے اس منحوس چیل کے دیدے پھوٹ گئے ہیں۔ ابھی ذرا دیر پہلے تو صدقے کا کالا بکرا بوٹی بوٹی ہو کر تمہارے پیٹوں میں چلا گیا اور اب کس فکر میں ہو...... شوہ......'' مائی رانی بڑبڑا کر چیل کو قائل کرنے لگی۔

''اماں روٹی تنور سے نکال۔ کیا اب کوئلہ بنائے گی۔'' بختو نے آٹے کے پیڑے بناتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔

مائی رانی چابی کے کھلونے کی طرح جھک جھک کر تیزی سے تنور سے روٹیاں برآمد کرتی ہوئی بڑبڑائی۔ ''بختو تو ہی اٹھ کر اڑا دے اس کم بخت کو۔ اسی کمرے تلے تو مالک پڑا ہے...... مجھے تو وہم ہوتا ہے...... مالک کے بال بچے اس وقت کی روٹی تو کھا لیں۔ پھر تو اللہ کی مرضی...... آخر ہم نے ان کا نمک کھایا ہے۔''

مائی رانی نے اپنی بھکتی ہوئی آنکھیں اپنے گھٹنوں پر پونچھیں اور پانی میں ہاتھ بھگو کر دھیا دھپ تنور میں روٹیوں کی نئی کھیپ جڑنا شروع کر دی مگر بختو آٹے کے پیڑے بنانے میں اتنی مصروف تھی کہ اس منحوس چیل کو صرف گھورنے پر اکتفا کر سکی جو ابھی تک چمنی پر اڈا جمائے تھی۔

''میرے بیاہ پر بھی کچھ تو دیا تھا مالکن نے...... آج تک نہیں سنا کسی زمیندار نے اپنے کمیوں کو بیاہ پر سونا بھی دیا ہو۔ کیسے بھاری کنگن تھے...... اُن پر کام بھی ایسا تھا کہ دور دور کے گاؤں والے دیکھنے آئے تھے وہ کنگھن۔'' بختو ٹھنڈی سانس بھر کر دھیرے دھیرے کہنے لگی۔

''ہاں تو تو کنگن لے کر سسرال چلی گئی تھی۔ ادھر پرلے مربعوں والے رانا صاحب مالک سے جھگڑنے آئے تھے، موٹر میں بیٹھ کر۔ بولے تم کمیوں کی عادت بگاڑ رہے ہو۔ تم پشتنی جاگیردار ہوتے تو ایسا نہ کرتے آج سونا دو گے کل یہ حویلی مانگنے آجائیں گے...... ارے کیا کیا بتاؤں......''

''ارے اماں ہزار دفعہ یہ قصہ سنا چکی ہو۔ ابھی چھوڑ بھی۔'' بختو آہستہ سے بولی

''اچھا تو لے یہ نہیں سنا ہو گا تو نے...... رانا صاحب کی بات مالکن کے کان میں پڑی تو سجدے میں گر کر روتی تھیں اور کہتیں۔ ''اللہ نے سب کو بنایا، کوئی اونچا نہیں، کوئی نیچا نہیں۔ کوئی اچھا نہیں کوئی بُرا نہیں'' مائی رانی نے اپنے حساب کنگنوں کے سلسلے میں ایک اور انکشاف کیا۔

''چھوڑ اماں اب وہ کنگن ہی کہاں رہ گئے میرے پاس بیچ کھائے اس کے باپ نے۔'' بختو نے اپنے ہاتھ ہلا کر آٹے کی مڑوڑیاں چھیڑاتے ہوئے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کی طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھا جو صحن میں بکھرے ہوئے سوکھے زرد پتے اکٹھا کر رہا تھا۔ اسی لمحے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ننھے کا کُرتہ گھٹنوں سے اٹھ کر بادباں کی طرح اس کے جھکے ہوئے سر

پرتن گیا۔ اسے اپنے انہماک میں اپنے نچلے دھڑ کی برہنگی کا احساس بھی نہ ہوا مگر بختو دوڑی، ننھے کا کُرتہ قابو میں کیا اور ان بچوں کی طرف دیکھا جو برآمدے میں تختوں کے چوکے پر بیٹھے ننھے پر ہنس رہے تھے۔

''کچھا کہاں پھینک آیا۔'' بختو نے زور سے کہا اور ہولے سے اپنے بیٹے کی پیٹھ پر ایک دھپ لگائی۔ اس کے بعد اس کے کرتے کے دونوں دامن ملا کر گرہ لگا دی...... بختو کو حویلی میں آئے بچوں کی وجہ سے جھینپ ہو رہی تھی ورنہ مالکن تو لڑکے ذات کے ننگے کھلے کی پروا بھی نہ کرتیں مگر ہاں جب وہ اپنی نوزائیدہ بچی کو لے کر مالکن کو سلام کرنے آئی تھی تو انہوں نے دو پوتڑے سی کر دیئے تھے اور کہا تھا۔ ''اے، بختو بیٹی! لڑکی ذات کی شرم تو رکھا کرو۔''

مگر اس ننگے اور ڈھکے کے قصے سے بختو کا بیٹا پریشان نہ تھا اور نہ اس کچھے کی اس کو پروا تھی جو اس نے کبھی پہنا بھی نہ تھا وہ تو سوکھے زرد پتوں کی تازہ بوچھاڑ سے پریشان تھا جو ہوا کے رخ پر آنگن میں لوٹتے پوٹتے حویلی کے بڑے برآمدے کا رخ کر رہے تھے۔ اور ساری محنت چوپٹ ہو چکی تھی...... اس گھر میں کام کرنے والے سبھی لوگ جانتے تھے کہ جہاں مالکن کو آنگن میں لگے دونوں درختوں سے محبت ہے وہیں سوکھے پتوں سے حد بھر نفرت ہے۔

اُدھر جمیل کے اعصاب آگ میں گرے خشک پتے کی طرح چرمرا رہے تھے کیونکہ وہ ابھی تک دادا کے کمرے میں نہ پہنچ سکے تھے۔ وہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس لئے اپنی بڑی چچی کے حکم پر انہیں ملے ہوئے کمرے میں خاندان کی بیبیوں کے سامنے بیٹھنا پڑ رہا تھا۔

''اے جمیل بیٹے تم آ ہی گئے۔ آخر ڈاکٹر پر اپنے خاندان والوں کا بھی فرض ہوتا ہے، بڑی چچی نے جیسے وہ تار یاد دلایا جو انہوں نے اپنے میاں کی بیماری پر راولپنڈی سے بھیجا تھا...... اور جس کے جواب میں جمیل صرف ٹیلی فون پر اپنے بڑے چچا کا حال احوال پوچھ کر رہ گئے تھے...... جمیل کا جی چاہا اٹھ کر باہر ٹہلنے لگے جب تک دادا کے کمرے کا دروازہ کھلے۔ مگر بڑی چچی یہاں صرف جمیل کو طعنہ دینے تو آئی نہ تھیں۔ ان کی بیٹھی ابھی زچہ خانے میں تھی مگر وہ اپنی بے ضرری ساس اور انصاف پسند سسر کے پاس اس موقع پر جیسے کھنچی چلی آئی تھیں۔ ''اللہ میاں جمیل کے ہاتھوں ان کے دادا کو شفا دے گا۔'' بڑی چچی نے مہندی سے رنگے بالوں پر دوپٹہ جماتے ہوئے کہا۔

''موت تو بھر حق ہے بھابی۔ ہاں انسان اپنی سی کوشش کرتا ہے۔'' بڑی پھوپی نے اپنا سفید بالوں والا سر جھکا کر لمبی سانس لی۔

''اور پھر دیکھئے ابا جان تو گھنٹوں اسی آنگن میں اماں جان کے ساتھ واک (WALK) کرتے نہ تھکتے تھے اس عمر میں، اور اب جیسے سارا دھڑ بیکار ہو گیا...... جمیل کی چھوٹی پھوپی جو جمیل کی ہم عمر تھیں اس الیے پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں...... وہ ایک دور دراز کے ضلع کے گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں اور انسپکٹریس کے دورے کی خبر گرم تھی مگر وہ اپنی فرشتے جیسی اماں جان کو آنے والے صدمے میں تنہا کیسے چھوڑ سکتی تھیں۔

''ارے چھوٹی پھوپی آپ تو پڑھی لکھی ہیں جی کو سنبھالئے۔'' جمیل کی بیوی نے چھوٹی پھوپی کو گلے لگا لیا مگر چھوٹی اس ہمدردی پر اور بھی آنسو بہانے لگیں۔

''ہائے میری اماں کا کیا ہوگا۔ وہ ابا کے بغیر کیسے جئیں گی اکیلی۔'' وہ ڈھیرے ڈھیرے فریاد کرنے لگیں۔

''ہا آ...... ساری زندگی ہم نے تو یہی دیکھا کہ ہماری اماں جان نے اس گھر میں داخل ہونے کے بعد باہر قدم نہ نکالا۔ خاندان میں کسی کے بیاہ کا موقع آتا تو اپنے ہاتھ سے لکھ بھیجتیں۔ جی چاہے تو اس حویلی میں برات اتار دیا یہاں سے بارات لے جاؤ۔ تمہیں اختیار ہے۔ اب میں کہاں گھر سے نکلوں کسی کے گھر زچگی ہونے والی ہوتی تو لکھتیں آنا چاہو تو یہیں آ جاؤ۔ تمہیں کوئی فکر نہ کرنا پڑے گی...... اب بھئی جس کا جیسا جی چاہے کرلے۔ نہ کبھی کسی سے کوئی گلہ نہ شکوہ......'' جمیل کی بڑی پھوپی بولیں۔

''مگر سب کا حق بھی تو پہنچا دیتی ہیں یہیں بیٹھے بیٹھے۔ شادیوں پر اپنے ہاتھ سے سئے ٹکے جوڑے۔ پیدائش پر ننھے ننھے کرتے ٹوپیاں۔'' جمیل کی چھوٹی چچی نے یاد دلایا۔

ارے دنیا کہتی ہے ساس سسر جان پر سوار رہتے ہیں۔ بھئی ہمارے ساس سسر نے تو ہمارے گھر میں جھانکا بھی نہیں اور جو ہم یہاں کبھی آتے تو ہمیں مہمان بنا کر بٹھا دیا جاتا۔ اللہ صحت دے میرے سسر کو ہم جانے لگتے تو چاول گندم کی بوریاں ساتھ کر دیتے...... ہم سے تو کبھی کچھ مانگا نہیں نہیں حالانکہ ماں باپ کا اپنے بیٹوں پر بڑا حق ہوتا ہے۔'' جمیل کی بڑی چچی نے یوں کہا جیسے اپنے گناہوں کی تلافی کر رہی ہوں۔

میں نے کئی بار کہا اماں جان لاہور چلئے۔ اتنا بڑا شہر ہے۔ اتنا خوبصورت، روشنیوں سے جگمگاتا۔ دیکھ کر حیران رہ جائیں گی آپ...... تو ہنس کر یہی کہتیں ہاں بڑا اچھا ہوگا۔ اپنا اور میرا رنگ روپ دیکھو۔ نہ بابا میں تو یہاں کی کھلی ہوا سے نہ جاؤں گی۔''

بڑی پھوپی نے بولنا شروع کیا تو چھوٹی پھوپی دوپٹے سے آنکھیں اور ناک پونچھتے ہوئے بول پڑیں...... ''اور میں ضد کرتی کہ چل کر میرا اسکول دیکھئے کیسی بادشاہت کرتی ہوں۔ تو ہمیشہ جواب ملتا۔ اللہ مبارک کرے تمہارے باوا کو کس پر چھوڑ کر جاؤں۔ اور جب ابا جان کو ساتھ لے چلنے کی بات ہوتی تو کہہ دیتیں یہاں کا خیال کون کرے گا؟ ایک دفعہ میں نے بگڑ کر کہا تھا۔ آپ دونوں تو سارس کا جوڑا ہیں...... اس پر اماں خوب ہنسی تھیں...... اور اب......'' چھوٹی پھوپی اپنی دکھی ماں کی ہنسی یاد کر کے پھر سسکیاں بھرنے لگیں کیوں کہ سارس کے جوڑے کی کہانی کسے نہیں معلوم۔ کہتے ہیں ایک مر جائے تو دوسرا بھی بے کھائے پئے یوں ہی کھڑے کھڑے مر جاتا ہے۔

جمیل کے اندر بیزاری کا جوالا مکھی کھول رہا تھا۔ وہ اپنے دادا دادی کی محبت کا احترام کرتے تھے۔ انہیں تو ہمیشہ سے یہ بات معلوم تھی کہ دادا دادی تو اپنے بچوں کے رشتے ناطوں کے لئے بھی گاؤں سے نہیں نکلے۔ بیٹے تعلیم کے لئے باہر نکلے۔ نوکریاں کیں اور وہیں میل ملاقاتوں میں رشتے ناطے طے ہو گئے۔ اس کے بعد بیٹیاں اپنی بھابیوں کے ذریعے بیاہی گئیں...... اب وہ ان داستانوں کو سننے تو اتنی دور سے یہاں نہیں آئے تھے۔ وہ ڈاکٹر تھے اور اس وقت تو جلد سے جلد مریض کو دیکھنا چاہتے تھے اور ان کی نظریں دادا والے کمرے کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

پھر وہ پراسرار دروازہ کھٹ سے کھل گیا اور جمیل اپنا بیگ اٹھائے تیزی سے اس کمرے میں چلے گئے۔

سب بہوؤں اور بیٹیوں نے دیکھا کہ حویلی کی مالکن ہاتھ میں بیڈ پین (BED PAN) لئے نکلیں اور دور کونے میں بنی دیوار کی اوٹ میں چلی گئیں۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ ان کے ہاتھ سے برتن لے لیتا کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ شوہر کی خدمت میں وہ کسی کو شمہ برابر حصے دار نہ بنائیں گی۔ ان کا نیلا دوپٹہ، سفید کرتہ اور گلابی پاجامہ ہوا کے تیز جھونکوں میں پیچھے کی طرف اڑ رہا تھا۔

اگر جمیل کی بیٹی نعیمہ سلطان عرف نومی انہیں یوں ہوا کے مقابل جاتے دیکھتی تو شاید اب سے پانچ سال پہلے کی طرح چلّا اٹھتی۔ ''آپ پری ہیں۔ آپ پری ہیں۔'' مگر وہ بے چاری تو اس وقت چھوٹے کمرے میں سارے کنبے کے بچوں کو بہلائے رکھنے کی ڈیوٹی انجام دے رہی تھی۔ اور درحقیقت خود کو بہلا رہی تھی۔ اس نے بچوں کے کھلونوں میں سے اٹھا کر وہ سستی سی مشین۔؟؟؟ اپنی آنکھ سے لگا رکھی تھی جس کے اندر شیشے کے چند معمولی ٹکڑے ہوتے ہیں مگر جو دیکھنے والے کی نظروں کے سامنے رنگوں کی بڑی خوبصورت ترتیب پیش کرتے ہیں، جو ذرا سی حرکت سے بدلتی جاتی ہے۔ اس سے پانچ سال پہلے وہ یہاں اپنے ڈیڈی اور ممی کے ساتھ آئی تھی تو آٹھ سال کی تھی۔ ڈیڈی مزید تعلیم کے لئے لندن جانے والے تھے۔ اچانک چھوٹے دادا کا خط آیا کہ جانے سے پہلے حویلی ضرور جاؤ اور خاندان کی سب سے بزرگ ہستیوں کی دعائیں لے کر سمندر پار کا ارادہ کرو...... اس زمانے میں نومی کے ڈیڈی کے پاس ممی کے جہیز والی کار تھی اور وہ اب اتنی قابل اعتبار نہ تھی کہ اس پر لمبا سفر کیا جاتا۔ اس لئے ریل، بس اور پھر تانگے کا سفر کر کے وہ حویلی تک پہنچے تھے۔ اس کی ممی بے چاری مانگے کے برقعے میں بولائی جا رہی تھیں اور ڈیڈی کبھی ہنستے کبھی جھنجھلاتے۔ اس کے ذہن میں یہ سب باتیں دھندلا سی گئی تھیں مگر وہ اس حویلی میں رہنے والی اپنی پردادی کو بھی نہ بھول سکی۔ اسے یاد تھا پہلے تو انہوں نے نومی کو خوب چوما تھا اور پھر فراک میں اس کی ننگی ٹانگیں دیکھ کر جھٹ اپنی بقچی سنبھال کر بیٹھ گئی تھیں۔ نومی کے دیکھتے دیکھتے چھوٹی سی شلوار اور ننھا سا دوپٹہ تیار ہو گیا۔ یہ کپڑے پہن کر وہ کس قدر خوش ہوئی تھی اور اپنی پردادی سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔ جواب میں وہ انہیں خوش کرنا چاہتی تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے خوش کرے...... اس کے

پاس ایک چھوٹا سا ٹرانسسٹر تھا۔ مگر ڈیڈی نے راستے میں ہی سختی سے منع کیا تھا کہ حویلی میں اسے ہاتھ نہ لگائے کہیں گانا وانا لگ گیا تو دادا دادی سخت ناراض ہوں گے۔ یہ سن کر نومی نے اپنے ڈیڈی پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔

''کیا وہ فلم بھی نہیں دیکھتے؟''

''نہیں۔''

''کیا ٹی۔ وی بھی نہیں؟''

''نہیں۔''

''اوہ۔ پھر وہ کیا کرتے ہیں ڈیڈی۔ بور ہوتے ہوں گے نا!''

تب ڈیڈی نے اسے ایک دم ڈانٹ دیا تھا اور کہا تھا کہ خبروں کے وقت وہ خود ٹرانسسٹر آن کریں گے مگر نومی تو اپنی اتنی پیاری سی پردادی کو خوش کرنا چاہتی تھی ''سرپرائز'' دینا چاہتی تھی۔ ڈیڈی باہر اپنے دادا کے پاس تھے اور ممی سفر کی تکان اتارنے کو سو رہی تھیں۔ نومی نے ممی کے سوٹ کیس سے اپنا ٹرانسسٹر نکال لیا اور گاؤ تکیے کے نیچے چھپا کر مدھم سی آواز میں لگا دیا تھا۔ پھر خود پردادی کی گود میں سر رکھ کر انہیں دیکھنے لگی...... اور پھر اس نے تعجب سے دیکھا...... راگ نے ان کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی۔ ان کے ہاتھ میں چھالیہ اور سروتہ جوں کے توں رہ گئے۔ اور پھر چند لمحے بعد وہ بولا کر تیزی سے آنگن میں نکل آئی تھیں۔

''سنو بیٹا...... کہیں ریکارڈ باجہ بج رہا ہے۔'' انہوں نے جیسے خواب میں کہا اور آسمان پر درخت کی پھنگوں پر اُس بے حد لَے میں بجائے جانے والے باجے کو تلاش کرنا شروع کر دیا...... تب نومی نے کھلکھلا کر وہ باجہ گاؤ تکیے کے نیچے سے نکال کر اپنی پردادی کو دکھا دیا تھا اور اُن کی بڑی بڑی بادامی آنکھیں ایک دم خوف سے اور بڑی ہو گئیں۔ ''بیٹا اس شیطانی چرخے کو چھپا دو...... اس حویلی میں کیوں لائیں؟ تمہارے دادا کو معلوم ہوا تو ناراض ہوں گے......''

اور نومی کو اپنے پردادا ایک دم بُرے لگنے لگے تھے۔ اسے تو بس اپنی پردادی لندن میں بھی یاد آتی رہیں۔ اور اب وہ دوسری بار یہاں اپنے پردادا کی بیماری کی خبر پا کر آئی تھی...... اس اولڈ فیشن جوڑے کی عجیب و غریب محبت کے سلسلے میں سب لوگ باتیں کر رہے تھے...... مگر نومی کو صرف اپنی پردادی کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش تھی جو ابھی تک پوری نہ ہوئی تھی۔

جب نومی چھوٹے کمرے سے بچوں کے غول میں نکلی تو تختوں کے چوکے پر زرد رنگ کا چھپا ہوا دسترخوان پھیلا ہوا تھا اور مائی رانی چینی کی گہری گہری پھولدار پلیٹیں رکھ رہی تھی...... باورچی خانے سے مرغی کے قورمے کی خوشبو اڑ رہی تھی اور پتیلے پر چمچہ بار بار بج اٹھتا تھا۔ بچے خالی پلیٹوں کے گرد جمع ہو گئے مگر مائی رانی کھانا لانے کے بجائے رک رک کر ڈر ڈر کر کہہ رہی تھی۔ کہ ''آج فجر کو میری آنکھ کھلی تو دیکھا ہمیشہ کی طرح مالک اور مالکن نماز پڑھ رہے ہیں...... ایک ہی محراب تلے...... مائی رانی نے ہاتھ سے پانچ محرابوں والے برآمدے کی درمیانی محراب کی طرف اشارہ کیا۔ سب نے دہل کر اس محراب کی طرف دیکھا...... پھر وہ ادھر آئی تو کوئی نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں مالکن کمرے سے نکلیں اور آج کے کھانے کی تیاری کا حکم دے کر چلی گئیں...... مائی رانی ایک دم رونے لگی۔

''میں نے تو عمر بھر دیکھا۔ مالک اور مالکن نے سدا ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا...... سدا اکٹھا اس آنگن میں ٹہلے مگر نماز کی چوکی تو الگ الگ تھی...... ارے میری آنکھیں اندھی ہو جائیں آج فجر کو میں نے یہ کیا دیکھا...... ارے میری مالکن کیسے جئے گی مالک کے بغیر......'' اور پھر مائی رانی نے بی بیوں کے چہرے پر غم کے گہرے بادل دیکھ کر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ ''ارے میری تو مت ماری گئی۔ مردانے میں کھانا گیا نہیں اور یہاں دسترخوان بچھا دیا...... مالکن کو پتہ چلا تو کیا کہیں گی۔''

بی بیوں نے بڑے خوف سے برآمدے کی اس درمیانی محراب کو دیکھا جہاں آج فجر کے وقت مائی رانی کی آنکھوں نے مالک اور مالکن کو اکٹھا نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ اکٹھا نماز پڑھنے کے پیچھے کیا اشارہ ہے اسے سمجھنے کی کوشش ہونے لگی اور چھوٹی پھوپی

نے تو بس رونا شروع کر دیا۔

نومی اس سارے مسئلے سے بور ہو کر آنگن میں نکل آئی۔ اس نے آنگن میں لگے ہوئے ان دونوں اونچے اونچے درختوں کو چھوا جن کی ننگی ننگی شاخیں بچے کھچے پتوں کو جھنک رہی تھیں اور جن میں سے ایک پر آج بھی جھولا پڑا ہوا تھا...... اس جھولے پر شاید اس حویلی سے تعلق رکھنے والے ہر شخص نے اپنے بچپن میں پینگیں بڑھائی ہوں گی۔ نومی جب اس سے پہلے یہاں آئی تھی تو اس جھولے پر بیٹھی تھی مگر اسکول میں جھولے سے گرنے کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے جھولے سے ڈر گئی تھی اس لئے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ دوپہر کے اس سناٹے میں پردادی نے نومی سے بڑی رسانیت سے پوچھا تھا...... ارے بیٹا پینگ نہیں بڑھاتیں؟''

''نہیں......'' نومی اپنے خوف کا اظہار ان پر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''لو میں تمہیں سکھاؤں۔'' تب وہ جھولے میں بیٹھ گئی تھیں۔ انہوں نے اتنے لمبے لمبے پینگ بڑھائے کہ ان کا نیلا دوپٹہ، سفید کرتہ اور گلابی پاجامہ ہوا میں پرندوں کے پروں کی طرح پھیلنے اور سمٹنے لگا۔ ان کی بڑی بڑی بادامی آنکھیں چمک رہی تھیں، گلابی رنگ پر سرخی کی چھوٹ تھی اور بے دانتوں کا منہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔

''پردادای آپ پری ہیں۔ آپ سچ مچ پری ہیں۔ میں آپ کو پری کی تصویر دکھاؤں۔ میری کتاب میں ہے......'' نومی خوشی سے چلانے لگی تو انہوں نے زمین پر پاؤں رگڑ کر جھولا ایک دم روک لیا تھا اور کہا تھا۔ ''بیٹا کسی سے کہنا مت کہ بڑی دادی جھولا جھول رہی تھیں۔''

اس بات کو پانچ سال گزر گئے یہ راز نومی کے دل میں تھا۔

درخت پر سے چند سوکھے پتے ٹوٹ کر نومی کے ارد گرد پھیل گئے۔ مگر نومی کے ذہن میں تو پانچ سال پہلے والی پردادی کی باتیں نرم نرم کونپلوں کی طرح پھوٹی پڑ رہی تھیں...... اسے حویلی میں آئے گھنٹہ بھر ہوا تھا اور وہ اب تک اپنی پریوں جیسی پردادی کو دیکھ بھی نہ سکی تھی۔ وہ جھولے پر بیٹھ گئی اور بچوں والی دوربین سے جی بہلانے لگی...... پھر اس نے دیکھا مائی رانی برآمدے کی اسی پراسرار محراب سے گزر کر کھانے کا تھال اندر کمرے کی طرف لے جا رہی ہے جس کے تلے آج فجر کو پردادا اور پردادی نے اکٹھا نماز پڑھی تھی۔ جبکہ دادا آٹھ دن سے بستر سے اُٹھ بھی نہیں سکے تھے...... پھر نومی نے دیکھا اس کے ڈیڈی اپنا بیگ اٹھائے اسی محراب سے گذر کر ڈیوڑھی کی طرف جا رہے ہیں ان کا سر جھکا ہوا ہے اور خاندان کی ساری عورتیں منہ لٹکائے دسترخوان کے گرد جمع ہیں۔

''نومی تم یہاں ہو؟ کھانے پر چلو۔ پھر جانے کب کھانا ملے گا۔ تمہارے پردادا کی حالت خراب ہے......'' ممی اپنے بغیر آستینوں کے بلاوز کو ساری سے خوب اچھی طرح چھپا کر سر ڈھکے اس کے پاس آگئیں۔

''اونہوں۔ میں نہیں کھاؤں گی وہاں...... نومی نے دھیرے سے کہا۔

کیوں نہیں کھاؤ گی۔ بعد میں بھوکی مرو گی۔'' ممی نے اس کا بازو پکڑا۔

''نہیں ممی میں باورچی خانے میں بیٹھ کر کھالوں گی۔ مجھے سب کے ساتھ کھاتے شرم آتی ہے...... نومی نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

اچھا تو جاؤ بختو سے کھانا لے لو۔'' اور ممی کھانے پر چلی گئیں۔

نومی نے فرمانبردار بچوں کی طرح اٹھ کر باورچی خانے میں جھانکا۔ وہاں اس وقت کوئی نہ تھا اور پھر وہ ایک دم اس کمرے کی طرف دبے پاؤں چلی گئی جس میں اس کی پریوں جیسی دادی ابھی تک چھپی ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ سے دروازے کا پٹ کھولا اور اندر چلی گئی۔

دھوپ سے آ کر اسے اندھیرے کمرے میں کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ پھر اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھا تو اسے مونڈھے پر بیٹھی ہوئی پردادی کی تنی ہوئی پشت نظر آئی۔ ان کا نازک سفید ہاتھ دادا کے کالے ماتھے پر رکھا اور زیادہ سفید نظر آ رہا تھا۔ پردادی گنگنا کر سورۃ یٰسین کی تلاوت کر رہی تھیں۔ پردادا اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہے تھے اور ان کی آنکھیں دادی پر جمی ہوئی تھیں۔

...... جاتے ہو...... بار بار بتاتی ہوں...... کفن تو ہم دونوں کے، آب زم زم میں دھلے موجود ہیں...... سنا تم نے؟ آب زم زم میں دھلے کفن رکھے ہیں...... اطمینان رکھو...... سنا تم نے؟ پردادی نے ان کے کان کے پاس جھک کر زور سے کہا۔ ان کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

پھر نومی نے دیکھا پردادا کی آنکھیں ایک دم زیادہ پھیل گئیں۔ انہوں نے نفی کے لئے اپنا سر تکیے پر مسلسل ہلانا شروع کر دیا۔

''تم اطمینان رکھو...... سنا تم نے......'' پردادی نے پھر اطمینان دلایا اور وہ رونے لگیں۔

نومی کا جی چاہا کہ وہ ان سے لپٹ جائے مگر پردادا ایسے ہی ٹوٹے ٹوٹے لفظوں میں بول رہے تھے۔ ''تم نے سب کچھ تو دیا مجھے۔ یہ حویلی زمین بچے......''

''میں بھی تمہاری تھی...... یہ بھی تو گنو......'' پردادی نے ایک دم پرسکون آواز میں ان کے کان کے قریب جھک کر کہا۔

''میں نے تمہارے لئے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا...... دنیا سے منہ چھپا کر رہا...... اپنے ماں باپ، بہن بھائی...... سب چھوڑ دیئے دادا کی لال لال زبان ہونٹوں پر عجیب انداز سے حرکت کر رہی تھی۔

''میں نے بھی تمہارے لئے دنیا چھوڑی...... دولت...... شہرت...... کہو...... کہو کیا تمہارے دل میں ہے...... بولو......'' پردادی کی سسکیوں میں ٹوٹتی آواز نومی بڑی حیرانی سے سن رہی تھی۔

اب انہوں نے پردادا کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ ان کی تھرتھرائی کلائیوں میں شیشے کی چوڑیاں آپ ہی آپ کھنک رہی تھیں۔

''میرا کفن جمیل سے منگوانا۔ اپنے پیسے سے خریدا مجھے نہ دینا۔ میری عاقبت خراب نہ ہو مہ پارہ جان۔ مہ پارہ جا...... آن......'' پردادا آنکھیں بند کر کے اسی انداز سے بڑبڑا رہے تھے۔

اور گھبرائی ہوئی نومی کے ہاتھ سے بچوں والی دوربین کچھ اس رخ سے زمین پر گری کی اس کے اندر قید رنگا رنگ چوڑیوں کے ٹکڑے بکھر گئے مگر نہ پردادا چونکے نہ پردادی۔

نومی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور جو بات سمجھ میں آئی وہ اتنی تھی کہ اس کی پریوں جیسی پردادی چکرا کر زمین پر خشک پتے کی طرح گر گئیں...... اس کے بعد چیخیں مارتی ہوئی نومی اپنی پردادی سے لپٹ گئی۔

سب آئے تو نومی کے پردادا نیند کے انجکشن کی وجہ سے غافل سو رہے تھے اور نومی کی پردادی مر چکی تھی۔

ooo

نے ریستوران میں کم ہوتے ہوئے گاہکوں اور بیشتر خالی میزوں اور کرسیوں پر نگاہ ڈالی اور جواباً کہا "اس معاشرے کے مسائل ایک چکنے گولے کی طرح ہیں جو تمہارے ہاتھ میں آتے آتے پھسل جاتا ہے، لڑھک جاتا ہے اور لڑھکتا ہی چلا جا رہا ہے۔ ہر شخص جھپٹ رہا ہے مگر...... مگر"

انور نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا اور اس طرح آنکھیں بند کئے کئے جواب دیا جیسے وہ مہاتما گوتم بدھ ہو اور اپنے اندر کی روشنی کو پا گیا ہو اور اس روشنی کی لکیر کو باہر لے کر برآمد ہو رہا ہو "سنو، ہم سب حرام خور، بدمعاش کمینے اور ذلیل ہیں۔"

خالد نے کہا، ہم بدنفس خبیث اور انتہائی اوچھے ہیں۔"

انور بولا "ہاں...... اور جب میں یہ بات کہہ رہا ہوں تو یقین کرو کہ میرا مطلب یہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں آئی ایم میٹلنگ وہاٹ آئی مین" یعنی میں کہ انور ہوں، ایک کمینہ بدمعاش چور اور خبیث انسان ہوں، آئی مسٹ کنفس فرسٹ آف آل وو مائی سیلف، مجھے اپنی کمینگی دوسرے کے کندھے پر نہیں ڈالنا چاہئے۔"

خالد نے کہا "ایگزیکٹلی، ہیر لائز دا پوائنٹ"

انور نے پھر کسی شانت مہاتما کے مانند کہا، ایکسکیوز می، لٹ می فنش مائی پوائنٹ۔"

خالد بولا، یس یس پلیز کیری آن......"

انور نے کہا۔ ہماری کمینگی یہ ہے کہ ہم خواہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں، اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتے...... یقیناً اس کے اسباب ہیں، اسباب معاشرتی عمرانی تاریخی بھی کچھ ہو سکتے ہیں۔"

خالد بولا، "صرف اقتصادی...... اور صرف اقتصادی۔"

انور نے کہا "ہاں ہاں اقتصادی بھی مگر کیا ہم خود ایک سبب نہیں ہیں؟ مثلاً میں ایک استاد ہوں۔ قوم مجھ سے سوال کرتی ہے کہ اس ملک کا ہر شہری ہر طالب علم پر بتیس بتیس روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ اس خرچ کے عوض قوم کو صفر کے برابر بھی فائدہ نہیں ہو رہا ہے میں آسانی سے یہ کہہ دیتا ہوں کہ صاحب پہلے تو ہر جماعت میں بیس پچیس طالب علم ہوتے تھے اب نوے ایک سو دس ایک سو بیس بیس ہوتے ہیں استاد اپنے شاگردوں کے چہرے بھی نہیں پہچانتا کہ طالب علم رخصت ہو جاتا ہے وہ جماعتوں کے بجائے کینٹینوں ریستورینٹوں اور یونین کے دفتروں میں جو کچھ سیکھتا ہے وہی لے کر معاشرے میں گھس جاتا ہے اور دیمک کی طرح اس معاشرے کو چاٹنا شروع کر دیتا ہے مگر یہ کیوں نہیں کہتا کہ میں خود جماعتوں میں نہیں جاتا اور دوستوں میں بیٹھ کر گپیں ہانکتا ہوں۔ سیاست بگھارتا ہوں افسران کی جوتیاں سیدھی کرتا ہوں۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوں۔"

خالد نے کہا یہی بنیادی بات ہے کہ ہم ایک غلط نظام میں جکڑے ہوئے ہیں ہمارا کوئی فعل ارادی اور اختیاری نہیں رہا ہے، جبری مصلحتوں کا شکار ہیں۔ ہم ڈرتے ہیں ہم سچی بات جانتے ہوئے بھی منافقت کرتے ہیں۔ ریاکاری سے کام لیتے ہیں دراصل معاشرہ بہت سے تہہ در تہہ حلقوں میں بٹا ہوا ہے اور ہر ہر حلقے میں ہزار ہا مگر مچھ منہ کھولے بیٹھے ہیں اور مگر مچھ کے منہ سے بچ نکلنے کی فکر نے ہم کو ڈرپوک مصلحت بین اور منافق بنا دیا ہے، ہم سچی بات جانتے پہچانتے ہوئے بھی کہہ نہیں سکتے کیونکہ ہم افراد سے ڈرتے ہیں کہ افراد درندے ہیں اور انسان ترقی معکوس کے عمل میں مبتلا ہے تاریخ اپنی ابتدا کو دہرا رہی ہے کہ جب انسان انسان کی درندگی سے خائف تھا کیونکہ معاشرے میں جمہوری عمل نہیں تھا اب بھی معاشرے میں جمہوری عمل نہیں ہے۔ ہم شخصیت

پرست ہیں اور شخصیتوں سے ڈرتے ہیں، ہم اصول پرست نہیں ہیں اور نہ اصولوں کا احترام کرتے ہیں اور......اور خیر چھوڑو۔ شائد میں نے تقریر کرڈالی، کیا خیال ہے؟''

انور نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، ''غالباً ہم دونوں تقریریں کرنے لگے ہیں، آؤ چائے کی طرف متوجہ ہوں۔ ریستوران کی اس منزل میں سناٹا ہو گیا تھا صرف انور اور خالد موجود رہ گئے تھے مگر اس منزل کے نیچے سے موسیقی کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں اور اکا دکا جوڑے اب بھی نچلی منزل میں اتر کر چلے جا رہے تھے۔ جہاں رقص و سرود کا بازار گرم تھا اوپر کی منزل کی طرف بھی لوگ اکا دکا چلے آ رہے تھے مگر رات بھیگ چلی تھی مگر نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ چلے ہی آ رہے تھے بیچ کی اس منزل میں بھی ویٹر نے صرف چند بتیاں جلتی چھوڑ دیں تھیں بقیہ حصے میں اندھیرا کر دیا تھا۔ سڑک بھی اب نظر نہیں آ رہی تھی۔ بڑی بڑی شیشے کی دیواروں پر پردے کھینچ دیئے گئے تھے انور چائے بنانے میں اور خالد پاؤں کے پنجوں سے فرش پر تھپکیاں دینے میں مصروف تھا۔ معاً خالد نے کہا۔ ''یوں لگتا ہے کہ یہ فرش لکڑی کا نہیں ربڑ کا بنا ہوا ہے؟''

انور نے پوچھا، وہ کیسے؟''

کیوں کہ ٹھک ٹھک کی آواز نہیں آتی۔ پنجے دھنس جاتے ہیں مخملیں قالین میں''

''ذرا اس مقام سے کہ جہاں تمہارے پاؤں زمین پر نہ ہوں'' انور نے راکھ دان میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا معاً دونوں کی نظریں انھیں ایک دوسرے کی نگاہوں سے ٹکرائیں اور دونوں کے مابین جیسے کسی بے آواز بات کا تبادلہ ہوا، پھر دونوں خود بخود مسکرا دیئے۔ خالد نے کہا، ''سچ پوچھو تو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''کس سے'' انور نے پوچھا

اپنے آپ سے۔ اس نے چائے کے کپ کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا، ''میں جو اپنے آپ پر منکشف ہو چکا ہوں۔ دھیرے دھیرے دھوپ بن کر شہر میں پھیلتا جا رہا ہوں...... اپنی برہنگی سے ڈر رہا ہوں۔ لوگ مجھے دیکھتے ہی اپنی نگاہوں کی کمندیں پھینک کر میرے اندر اتر جاتے ہیں ان کی نگاہوں میں سورج کی تیز کرنوں کی سی شدت اور حدت ہے اور اس تمازت کی آگہی سے میرا سارا وجود لرز جاتا ہے۔''

انور نے کہا، ''پھر بھی لوگ کتنے بے حس ہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان افہام و تفہیم کی ایک بے آواز زبان موجود ہے ہم اس دور میں قطعاً ناگفتہ نہیں ہیں پھر بھی میرے مخالف فرد یعنی میرے مخاطب پر ردعمل کیوں نہیں ہوتا۔

خالد بولا۔ ''ہوتا ہے مگر منافقت کے دبیز پردے کے پیچھے۔''

دونوں نے اپنے اپنے کپ اٹھائے اور لبوں سے لگا کر چسکیاں لینا شروع کر دیں۔ معاً انور نے کہا۔ ''تم نے سامنے بھی دیکھا''

کیوں، کیا ہے سامنے، شیشے کی دیوار پر پردہ پڑا ہوا ہے اور بس''

''مگر پردے کے پیچھے کیا ہے۔''

''شیشے کی دیوار اور اس کے پیچھے سڑک

نہیں دیوار اور پردے کے درمیان کوئی ہے۔''

''ہوگا کوئی ویٹر وغیرہ شاید پردے کی سلوٹیں درست کرنے گیا ہو۔

''ہرگز نہیں اس کا چہرہ بہت ڈراؤنا ہے کئی بار وہ ہمیں دیکھ چکا ہے۔''

''تمہارا واہمہ ہوگا شاید تم اونگھ گئے ہو گے۔''

''قطعاً نہیں جناب میں پوری طرح ہوشیار ہوں اور دیر سے یہی تماشہ دیکھ رہا ہوں۔''

مگر کون ہو سکتا ہے وہ اور ہمیں کیوں چھپ چھپ کر دیکھ رہا ہے، ہم تو شہر کے کوئی اہم آدمی بھی نہیں ہیں، میرا مطلب ہے کہ ہم سیاسی آدمی تو ہیں نہیں۔''

ع ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟''
'' کچھ بھی ہو۔ وہاں ضرور کوئی چھپا بیٹھا ہے اور ہمیں تک رہا ہے۔''
یار تکنے دو، چھوڑو، کسی اور موضوع پر بات کرو۔''
مگر یہ ہے کون؟''
'' وہم، بس کہہ دیا وہم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟''
ہاں یہ ہمارے اندر کے اندیشے بھی ہو سکتے ہیں جو کوئی نہ کوئی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ خیر چھوڑو اور بتاؤ کیا سوچ رہے ہو؟''
یار میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ملک میں پہلے ہی بہت بے روزگاری ہے، اب جو بیرون ملک گئے ہوئے لوگ لوٹ لوٹ کر آ رہے ہیں تو ملک کا اور کیا بنے گا۔ بے روزگاری اور کتنے بڑے پیمانے پر بڑھے گی اور پھر......''
'' پھر وہی مسائل مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا، یہ مسائل سیاستدانوں کے لئے چھوڑ دو۔ ہم سیاستدان نہیں ہیں۔''
'' مگر ہم اس ملک کے دانشور تو ہیں۔''
'' بقلم خود''
'' کیا مطلب؟''
'' مطلب یہ کہ ہم کو آپ کو دانشور مانتا ہی کون ہے؟
بیوروکریسی نے سیاستدانوں اور دانشوروں کو اپنے دام میں ایسا الجھایا کہ سیاست بھی انہی کی چلتی ہے اور دانشوری بھی، یہ بادشاہ گر لوگ ہیں ان سے ڈرو۔''
اور دونوں بظاہر ڈر کر جلدی جلدی چائے ختم کرنے لگے۔ پھر انور نے کہا۔
'' سنو باہر چلنے سے پہلے ذرا بال روم پر ایک اچٹتی سی نگاہ نہ ڈال لیں۔''
خالد نے یوں شانے اچکائے جیسے کہہ رہا ہو کوئی مضائقہ نہیں، چنانچہ دونوں کے دونوں کاؤنٹر پر بل دے کر نیچے پہنچ گئے جہاں کسی تیز موسیقی کی لے پر رقص ہو رہا تھا اور نوجوان جسم لہرا رہے تھے خوشبوؤں کی لپٹیں اڑ رہی تھیں رنگ برنگے لباس اپنی بہار دکھا رہے تھے اور شوخ جذبات کے تیز اور تند دھاروں پر نوجوان بہہ رہے تھے۔ یہاں کسی کو ملکی قومی یا بین الاقوامی مسائل کی قطعاً کوئی فکر نہ تھی چہروں پر کوئی تردد نہ تھا اور نہ چہروں پر کل کی فکر کے سائے تھے ہر چہرہ ہشاش بشاش ہر جسم خوشیوں میں ڈوبا ہوا ہر ہر جسم کے ایک ایک اعضاء سے طمانیت اور آسودگی ابلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی ایک خوبصورت نوجوان لڑکی لہراتی بل کھاتی موج آب کی طرح بہتی ہوئی آئی اور کسی سبک رو کشتی کی طرح انور کو اپنے بازوؤں میں لئے ہوئے چلی گئی، دوسری طرف سے ایک موٹی مگر خوبصورت ادھیڑ عمر کی عورت کسی ڈبل ڈیکر بس کی مانند ڈولتی ہوئی آئی اور خالد کو کسی بکرے کی مانند کولی میں بھر کر لے گئی۔ ادلتے بدلتے روشنی کے زاویوں موسیقی کی تیز دھنوں اور اُڑتی ہوئی خوشبوؤں کی پلٹوں میں جسم لٹو کی طرح گھوم رہے تھے۔ بھنگی کی طرح ناچ رہے تھے اور مدہوش سے ہوتے جا رہے تھے بے سدھ اور مگن تھوڑی دیر کے بعد رقص کا جیسے ہی ایک راؤنڈ مکمل ہوا انور اور خالد اس بھیڑ بھڑکے سے نکلے اور چپکے سے باہر نکل کر کھلی ہوا میں آ گئے۔ سڑک پر سناٹا تھا ٹریفک نہ ہونے کے برابر دور درختوں کے جھنڈ سے پیلا پیلا چاند ابھر رہا تھا جو بے حد مضمحل اور پژمردہ سا دکھائی دیتا تھا۔ انور بولا'' تو یہ لڑکی تھی کہ قیامت، یوں لگتا تھا کہ ویلکنو کو ریشم سے ڈھک دیا گیا ہو، اف میرے اللہ کیا یہ ہمارے ہی ملک کے لوگ ہیں، جنہیں اپنے جسم کے آگے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔''
میرے حصے میں ولائتی مگر قیمتی کا سمیکس کا پوٹ آیا تھا۔ مگر کیا کہوں مجھے چکر گھنی بنا دیا ظالم نے وہ مضبوط گرفت تھی اس کے ہاتھوں کی، میری کمر کے چاروں طرف کہ جیسے مجھے شکنجے میں کس دیا ہو۔''
اور ڈیئر خالد، یہ ہمارے ہی ملک کے کسی طبقے کی نیک بیبیاں ہیں۔''
مگر یہ طبقہ ہے کون ہے۔ ہمارے ملک کی ننانوے فیصد بیبیاں کھیتوں اور کھلیانوں میں مشقت کرتی ہیں گھروں میں بچوں

کو سنبھالتی ہیں شوہروں بھائیوں اور بہنوں کی نگہداشت کرتی ہیں۔ اکا دکا فیکٹریوں دفتروں اسکولوں کالجوں اور اسپتالوں وغیرہ میں بھی کام کرتی ہیں کچھ سیاست میں حصہ لیتی ہیں اور سوشل اداروں میں سر کھپاتی ہیں۔ مگر یہ بیبیاں کون ہیں؟''

یہ وہی ہیں کہ جن کے شوہر بیٹے اور بھائی دولت تو اس غریب ملک سے بٹورتے ہیں اور یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں پانی کی طرح بہاتے ہیں سامان تعیش خریدتے اور عیش کرتے ہیں سارے کالے دھندے چلاتے ہیں سیاستدانوں کو جب چاہتے ہیں خرید لیتے ہیں اور اپنی مرضی کا قانون بنوا کر اپنے حقوق کا تحفظ کرا لیتے ہیں اور جن کے پاس وقت اور روپے پیسے کی فراوانی ہوتی ہے چنانچہ جسم کی آسودگی اور طمانیت ان کا بھی اور ان کی عورتوں کا بھی واحد مسئلہ ہوتا ہے......اور یہی وہ طبقہ ہے جو محنت کشوں کا استحصال کرتا ہے اور اور......''

''اور ہمارے ہنرمندوں اور دانشوروں کی وہ ٹولیاں جو ان کے پیدا کردہ حالات اور مسائل سے دل برداشتہ ہو ہو کر باہر چلی جاتی ہیں ان سے ہمارا ملک اور بھی غریب ہو جاتا ہے، یہی نہیں یہ تو اس مہذب دنیا کے بردہ فروش ہیں، سستے داموں پر مزدوروں کو دوسرے ملکوں میں درآمد کر کے زرمبادلہ کماتے ہیں اور یہ پیسہ بھی ملک میں نہیں آنے پاتا، بالا ہی بالا یورپ کے بینکوں میں جمع ہو جاتا ہے۔''

''یار میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ کینیڈا چلا جاؤں۔''

''کیوں آخر تم کو کیا ہو گیا ہے۔ اچھے بھلے تو یہاں ہو۔''

''ٹورنٹو میں اپنا بھائی صبیح ہے نا، وہ مجھے ویزا بھجوا دے گا، اسپانسر کر دے گا، مزے سے جا رہیں گے، نے غم زدہ نے غم کالا...... کسی قسم کا کوئی ٹینشن تو نہیں ہوگا۔''

ٹینشن وہاں بھی ہوگا۔''

''وہ کیسے''

''کالے اور سفید کا ٹینشن''

''پھر بھی یار یہ تو نہیں ہوگا جو یہاں ہے۔''

''ٹھیک ہے یہاں حالات اچھے نہیں، مگر ہے تو یہ اپنا ہی ملک۔''

''دیکھو، یہ سڑک جس پر ہم تم کھڑے ہیں پتہ ہے اس سڑک پر میں کب سے چل رہا ہوں...... پورے چالیس سال سے، یعنی جب سے میں نے چلنا سیکھا اور یہ سڑک میری ہمزاد اور دمساز ہے۔''

''یار اس سڑک سے بھلا ان باتوں کا کیا رشتہ''

''ہے رشتہ''

''وہ کیسے''

وہ ایسے کہ چالیس سال سے مسلسل میں اس پر پیدل چل رہا ہوں، جبکہ کتنے پیدل چلنے والے گاڑیوں پر چلنے لگے جہازوں پر اڑنے لگے سینکڑوں ایسے ہیں کہ سال میں کتنی ہی گاڑیاں بدل دیتے ہیں اور اس سڑک پر دندناتے پھرتے ہیں اور میں ہوں کہ اسی طرح چالیس سال سے رینگ رہا ہوں اور دس بیس سال تک اس پر گھسٹتے گھسٹتے میں قبر میں پہنچ جاؤں گا اور مجھے گاڑی نصیب نہیں ہوگی۔''

یہ بھلا کیا بات ہوئی گاڑی کونسا بڑا مسئلہ ہے جس کی خاطر تم وطن چھوڑ دو گے۔''

''مسئلہ تھا نہیں بنا دیا گیا ہے۔ معاشرے میں عزت کا نشان ہے......اور پھر ذرا سوچو میں ایک کوالیفائڈ آدمی ہوں، دانشور ہوں، کچھ کتابوں کا مصنف بھی ہوں، مگر میری عزت؟

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

کروں۔

اچانک دونوں پر خاموشی نے حملہ کر دیا جیسے وہ اپنے اندر ڈوب گئے ہوں، جیسے وہ اپنے باطنی وجود سے مخاطب ہوں اور ایک دوسرے کی رفاقت سے تھک گئے ہوں۔ انور نے معاً موضوع بدلنے اور خاموشی کے بوجھ کو اتارنے کے لئے خالد سے کہا۔

''چاند کیسے چپ چاپ سفر کر رہا ہے اور ازل سے اب تک سفر ہی کی حالت میں ہے۔''

''کیوں وہ تنہا ہے۔''

''ہم سب اپنے اندر تنہا ہیں۔''

''یہ ہم کیوں تنہا رہ گئے ہیں...... کیا ہر معاشرہ کا انسان اسی طرح تنہائی کے زہر کو پی رہا ہے۔''

نہیں جب معاشرے کے تانے بانے ٹوٹ جاتے ہیں اور معاشرے کے سفر کی مقصدیت ختم ہو جاتی ہے کچھ اجارہ دار لوگوں کے اشارے پر معاشرے کے اقدار حرکت کرنے لگتے ہیں اور معاشرے کا رس نچوڑ کر اپنا گلاس بھر لیتے ہیں تو باقی افرادِ معاشرہ کے حصے میں صرف پھوک رہ جاتا ہے اور معاشرے کے حرکات میں Involve نہیں ہو پاتے تو تنہا رہ جاتے ہیں اور جب معاشرے کے افراد تنہا رہنے لگتے ہیں تو زندگی بے مقصد فضول اور بے معنی نظر آنے لگتی ہے۔''

''تو یہ ہپیز وغیرہ بھی۔

ہاں ہاں اپنے معاشرے کی رو سے کٹے ہوئے ہیں یہ لوگ، یہ بیمار ہیں یہ کہا جاتا ہے نا لیکن حقیقتاً بیمار نہیں ہیں۔ ان کا معاشرہ بیمار ہے یہ تو اس معاشرے کا ناسور ہیں۔''

تم ٹھیک کہتے ہو۔ شائد ہمیں ماہرین عمرانیات کی خدمات حاصل کر کے اپنے معاشرے کا علاج ڈھونڈنا چاہئے۔

''علاج تو ڈھونڈا جا چکا ہے، ہر زمانے میں ڈھونڈا گیا اور پایا گیا، مگر اس پر عملدر آمد کہاں ہوتا ہے۔ کیا میں علاج ڈھونڈنے والے موسیٰ کا نام لوں، ابراہیم کا نام لوں گوتم اور سقراط کا نام لوں، محمدؐ کا نام لوں، حسینؑ کا نام لوں اور...... اور ہاں کتنے سراج الدولہ۔ ٹیپو۔ لکشمی بائی۔ حضرت محل اور بخت خان ہوئے ہیں۔ ہماری تاریخ میں''

اور ہر ایک کا راستہ روکا ہے فرعون نے نمرود نے ابوجہل و یزید اور صادق و جعفر نے''

''ہنھ''

''تو وہ آدمی؟''

''کون؟''

''وہی جو ریسٹوران میں پردے کے پیچھے نظر آیا تھا،

کون تھا وہ؟''

''اف بھئی''

''سوچنا پڑے گا، بہت گمبھیر مسئلہ ہے۔''

تاریخ کے موڑ پر ہوں نہ ہوں البتہ اپنے راستے کے اہم موڑ پر ضرور کھڑے ہوئے ہیں۔''

دونوں نے غور کیا تو وہ باتیں کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں سے دو راستے مختلف سمت میں مڑتے تھے ایک شمال میں ایک جنوب میں اور رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی، دونوں نے گھڑیوں پر نظر ڈالی مصافحہ کیا اور ایک دوسرے سے رخصت ہو کر مختلف سمتوں میں چل پڑے، کچھ ہی دیر کے بعد ایک نے معاً مڑ کر پیچھے دیکھا اور ٹھہر گیا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ دوسرا مخالف سمت کے کھلار میں اتر کر دور جا چکا ہو گا تو وہ مڑا اور ایک اور سمت میں چلنا شروع کیا۔ درختوں کے کنجوں میں اسے ایک سایہ سا نظر آیا، اس نے اس سائے کا تعاقب کیا لیکن دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ کہ اسے پیروں کی چاپ سنائی نہ دے۔ پھر اس

نے دیکھا کہ سایہ حرکت کرتا ہوا سڑک پر واپس آ گیا اُس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے اور پھر لمبا لمبا سڑک پر لیٹ گیا اور سسک سسک کر رونے لگا۔ رونے والے تک پہنچ کر اُس نے اس کا چہرہ اٹھایا اور حیرت سے کہا، تم۔"

وہ بولا ہاں یہ میں ہوں، میں ابھی تک واپس نہیں گیا تھا، سڑک کی چھاتی کے نیچے اس کے دھڑکتے ہوئے دل کی کراہیں سن رہا تھا۔ بہت زخم ہیں۔ صدیوں اور قرنوں سے زخم سہ رہی ہے بیچاری۔ مگر۔ مگر تم تو واپس چلے گئے تھے۔

"میں میں" وہ ہکلایا۔ "دراصل میں سمجھا کہ وہ جو سایہ ریستوران میں نظر آیا تھا۔ کہیں تم وہ ہی تو نہیں ہو۔"

OOO

آپ نے کار خریدنی ہے؟

ایاز : جی نہیں۔

لطیف: کسی بچے کو تعلیم کے لیے باہر بھیجنا ہے۔

ایاز : جی نہیں۔

لطیف: کوئی پلاٹ وغیرہ خریدنا ہے۔

ایاز : جی نہیں۔

لطیف: کیا کہیں بیرون ملک سیٹل ہونا ہے۔

ایاز : جی نہیں

لطیف: آپ کو ملنے والی رقم اتنی ہے کہ اس سے آپ ایسے کئی کام کر سکتے ہیں۔

ایاز : ڈاکٹر صاحب ایک لاکھ روپے میں اتنے کام کیسے ہو سکتے ہیں۔

لطیف: ارے بابا۔ ایک لاکھ روپے نہیں ایک لاکھ ریال ہیں اور میرا قیاس ہے کہ شیخ ابوحمدون اس رقم میں اضافہ بھی کر سکتا ہے بشرطیکہ آپ ذرا اڑ جائیں۔

ایاز : ڈاکٹر صاحب میں ضرورت مند تو ہوں لیکن لالچی نہیں ہوں، میرے لیے یہ بہت کافی ہیں۔

لطیف: پھر تو آپ صابر، قانع اور نیک آدمی ہیں، لیکن مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ کو اتنی بھاری رقم کی ضرورت کیوں پڑ گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کوئی بھاری قرض اتارنا ہے۔

ایاز : جی نہیں قرض تو نہیں دینا البتہ ایک فرض پورا کرنا ہے۔

لطیف: کون سا فرض؟

ایاز : بیٹی کی شادی۔

یہ سن کر ڈاکٹر لطیف خاموش ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس بات نے اس کو بے چین اور مضطرب کر دیا ہے اور یہ سن کر ایک شدید جذباتی صدمہ پہنچا ہے۔

لطیف: ایاز صاحب، بیٹی کی شادی، ان تین لفظوں میں آپ کی پوری سرگزشت آ گئی ہے۔

ایاز : بہت کم نکتہ رس اور ذہین ایسے ہوتے ہیں جیسے آپ ہیں۔
لطیف : اور بہت کم مظلوم اور بے کس ایسے ہوں گے جیسے آپ ہیں اس نے میرے دل میں شگاف ڈال دیا ہے۔
ایاز : آپ مخلص اور دردمند انسان ہیں۔
لطیف : میرا قیاس ہے کہ یہ ناروا اور سنگدلانہ بوجھ لڑکے والوں نے آپ پر ڈالا ہوگا۔
ایاز : ہاں، کچھ قصہ کہانی اس قسم کی ہے
لطیف : اور دباؤ بھی شاید لڑکے کی ماں کی طرف سے ہوگا۔
ایاز : جی ہاں، آپ کا قیاس بھی درست ہے، اچھا مجھے اجازت دیں کہ میں نماز پڑھ لوں۔
لطیف : نماز تو میں بھی پڑھتا ہوں لیکن ابھی تو دس بجے ہیں ابھی کون سی نماز کا ٹائم ہے۔
ایاز : میں چاشت کی نفل نماز قدرے شوق سے پڑھتا ہوں یہ اسی کا وقت ہے۔

پھر ایاز تو نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گیا اور ڈاکٹر لطیف اس کے بارے میں مختلف سوچوں میں کھو گیا۔ جو کچھ ایاز اپنی بیٹی کے لیے کر رہا ہے وہ ایک ظلم ہے اور جبر ہے یہ خوف خدا اور یاد خدا سے غافل ہونے کے ہی تو نتیجے ہیں۔ بے چارہ کتنی محرومی سے دوچار ہونے والا ہے، غالباً اس کے پاس اور کوئی چارہ کار بھی نہیں ہے، جو کچھ کر رہا ہے۔ امر جبوری طوعاً کرہاً کر رہا ہے ورنہ کوئی بھی معقول آدمی ایسا خطرہ مول نہیں لیتا۔ معلوم نہیں وہ کیسے لوگ ہیں جنہوں نے اس کو اتنا لاچار کر دیا ہے۔

وہ کیسے لوگ ہیں؟ ڈاکٹر لطیف اپنے خیالوں ہی خیالوں میں ان کا تجزیہ کرنے لگا۔

بے حس ہیں، نمائش پرست ہیں، جھوٹی نمائش کے دل دادہ ہیں، خود غرض ہیں، کمینے ہیں، لالچی ہیں، شقی القلب ہیں، عاقبت سے بے فکر ہیں، خوف خدا اور یاد خدا سے لاپرواہی ہیں، بگلہ بھگت ہیں، ایثار خیر خواہی اور برادارانہ سوز دروں سے تہی دست ہیں۔ اللہ کی مار کو نہیں جانتے بس معاشرہ میں ایک نمائشی قطب مینار بننا چاہتے ہیں۔ اگر خود ان پر ایسا وقت پڑ جائے تو یا تو پاگل ہو جائیں یا زہر پھانک لیں۔ اللہ کرے ان پر ایسا وقت پڑے۔ ایسے وقت میں کہ جب ایاز کی دستگیری کرنی چاہیے۔ یہ اس کے ہاتھ پاؤں توڑ رہے ہیں، جب اس کو کچھ دینا چاہیے، اس کو لوٹ کھسوٹ رہے ہیں۔ اپنے ایک شہتیر کے لیے اس سے پورا جنگل کٹوا رہے ہیں۔ اتنے ناسمجھ ہیں کہ یہ تک نہیں سمجھتے کہ جو لڑکی اس پس منظر کے ساتھ ان کے گھر دلہن بن کر آئے گی وہ اپنے باپ کی توہین کا بدلہ لینے کا سوچ لے کر آئے گی۔ ساس بہو کی باہم کشیدگی تو ایک عالمی شہرت چیز ہے اور یہ لڑکی تو اپنی ساس کے لیے ایک زخمی چیتا اور چڑیل بن کر آئے گی، اس کی ساس اور سسر کو شاید اس وقت یہ دکھائی نہیں دے رہا کہ وہ اپنے لیے میٹھا زہر خرید رہے ہیں۔ ان منطقی نتائج اور منفی نتائج سے وہ نہیں بچ پائیں گے۔

پھر ایاز نماز سے فارغ ہو کر آ گیا تو ڈاکٹر نے اس سے پھر باتیں شروع کیں۔

ڈاکٹر لطیف: ایاز صاحب آپ ایک خونخوار تجربے سے دوچار ہیں۔
ایاز : جی ہاں ہوں تو سہی، باقی اللہ خیر کرے۔
لطیف : لیکن یہ حکم لڑکے کی ماں کا ہے یا باپ کا۔
ایاز : یہ اس کی والدہ کے مطالبات ہیں کہ ہم عزت دار لوگ ہیں، ہمیں لوگوں کو منہ دکھانا ہے، اس لیے جہیز میں کم از کم رنگین ٹی وی، وی سی آر، قالین، کپڑے دھونے کی مشین، سلائی مشین اور ایسی ہی اشیاء کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ان کی قیمت بھی کوئی پون لاکھ کے قریب بنتی ہے۔ اب بتایئے میں کیا کروں۔
لطیف : اس رشتے سے انکار کر دیا ہوتا۔
ایاز : یہ بھی سوچا تھا لیکن متبادل رشتے بھی ایسے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ پھر لڑکے کی ماں نے ایک ڈراوا یہ بھی دیا ہوا تھا کہ اگر اس رشتے کو توڑا اور کسی نئی جگہ کیا تو وہاں جا کر لڑکی کے بارے میں کہہ آئے گی کہ وہ ایک بدکار لڑکی ہے۔
لطیف : وہ اتنی گھٹیا اور پست اور سنگ دل عورت ہے۔

ایاز : بس ڈاکٹر صاحب کچھ نہ پوچھیے پوری ہلاکو خانم ہے۔
لطیف: میرا قیاس ہے کہ یہ شادی ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور کوئی خوشگوار شادی نہیں ہوگی۔
ایاز : میرا قیاس بھی یہی ہے وہ ہلاکو خانم تو میری بیٹی کو جینے نہیں دے گی اس لیے میں نے اپنے داماد کو لکھ دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے ہمراہ لے جائے گا۔
لطیف: وہ کہاں ہے اور کرتا کیا ہے؟
ایاز : وہ امریکہ میں ہے اور اتفاق سے ڈاکٹر ہے۔
لطیف: وہ تو اپنی ماں جیسا نہیں ہے۔
ایاز : جی نہیں، وہ بہت نیک اور سلجھا ہوا آدمی ہے اگر اس کو ان باتوں کا علم ہو جائے تو وہ بگڑ جائے گا۔
لطیف: تو پھر اس کو آپ نے خط نہیں لکھا۔
ایاز : وہ ہلاکو خانم اس کا ایڈریس نہیں دیتی اور جو دیتی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ امریکہ کا ایڈریس نہیں ہے۔
لطیف: اور وہ جو آپ نے اسے لکھا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر جائے، وہ کس پتے پر لکھا تھا۔
ایاز : وہ اسی پتے پر جو اس کی ماں نے دیا تھا۔
لطیف: اس کا جواب آیا یا نہیں۔
ایاز : جی ابھی تک تو نہیں آیا۔
لطیف: اگر آپ کی بیٹی کو امریکہ جانا ہے تو پھر اتنا جہیز کس لیے ہے؟
ایاز : آپ کی بات درست ہے وہ ہلاکو خانم ان سے اپنا گھر سجانا چاہتی ہے۔
لطیف: اس کے بیٹے نے گھر کے لیے کچھ نہیں دیا؟
ایاز : جی نہیں، اس نے پیسے بہت دیے ہیں لیکن اس کنجوس خانم نے سب بینک میں جمع کرا دیے ہیں اور اپنی غریبی کا ڈھول پیٹتی رہتی ہے۔
لطیف: اچھا ایاز صاحب میں نے اپنے وارڈ کا چکر لگانا اور ابھی آپ سے باتیں بھی بہت کرنی ہیں، آج شام آپ کھانا میرے ہاں کھائیے۔ آٹھ بجے میں گاڑی بھیج دوں گا۔
ایاز : آپ یہ تکلف نہ کریں۔ آپ تو اکیلے رہتے ہیں۔
لطیف: رہتا تو میں اکیلا ہوں لیکن پرسوں سے والدہ آئی ہوئی ہیں۔ بہر حال آپ آجایئے گا۔
ایاز : جی بہتر جیسے آپ کی مرضی۔

شام کے وقت ڈاکٹر لطیف اپنے گھر میں اپنی والدہ سے باتیں کرتا ہوا اس کو بتا رہا تھا کہ ان دنوں پاکستان سے ایک قسمت کا مارا ہوا اس کے پاس آیا ہوا ہے، اس نے اپنی بیٹی کی شادی کرنی ہے لڑکے والوں نے اس سے اتنا جہیز طلب کیا ہے کہ جو اس کی توفیق سے باہر ہے اس لیے وہ قسمت کا مارا اس بات پر مجبور ہو گیا ہے کہ وہ اپنا ایک گردہ فروخت کر دے، اس کے گردے کا خریدار یہاں کا ایک کروڑ پتی آدمی شیخ ابو حمدون ہے، مجھے اس غریب آدمی پر بہت ترس آ رہا ہے معلوم نہیں وہ لڑکے والے اس قدر سنگ دل کیوں ہیں کہ وہ ان کی خواہشات کے لیے اپنے آپ کو ایک شدید خطرے میں ڈال رہا ہے، اس کا اپنا ایک گردہ خراب ہے زیادہ سے زیادہ تین برس چل سکے گا، پھر اس کا اللہ ہی حافظ ہے البتہ دوسرا گردہ اس کا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور یہی وہ فروخت کر رہا ہے۔ شیخ ابو حمدون کا ایک سیکریٹری پاکستانی ہے اسی نے یہ بات اس کو بتائی ہے اس لیے وہ یہاں آیا ہوا ہے، میں نے ہی اس کے مختلف ٹیسٹ کیے ہیں اور مجھے ایک اندرونی وحشت نے گھیرا ہوا ہے کہ کیا ہم سب اتنے ذلیل اور بے کس ہو گئے ہیں کہ جہیز کے لیے گردے تک فروخت کرنے لگے ہیں اگر اس کے معاملے میں لڑکے والے انسان بن جائیں تو اس غریب کو گردہ فروخت نہ کرنا پڑے۔ اگر یہ بات پھیل گئی تو اس میں لڑکے والوں کے لیے بڑی ذلت ہوگی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ لڑکے

نشے کا غلام ہو اور اس کے لیے اپنا گردہ فروخت کر رہا ہو۔ نشے کے غلام تو اپنے نشے کے لیے اپنے بیوی بچے دیتے ہیں۔ جواری بھی ایسا ہی کرتے ہیں مجھے تو تیرا یہ بدقسمت اور مظلوم کوئی بہروپیا لگتا ہے۔

عین اس وقت وہ بہروپیا اندر داخل ہوا جسے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا ملازم اندر لے آیا تھا۔ اس کو دیکھ کر ڈاکٹر لطیف نے کہا:

آیئے آیئے ایاز صاحب بسم اللہ میں آپ ہی کے بارے میں باتیں کر رہا ہوں۔

یہی ہیں ایاز صاحب جنہیں لڑکے والوں نے گردہ فروشی پر مجبور کر دیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایاز نے کہا:

ڈاکٹر صاحب یہ کٹنی عورت یہاں کیا کر رہی ہے اسی نے تو جہیز کے لیے مجھ کو گردہ فروشی کے لیے مجبور کر دیا ہے۔

ooo

افسر آذر

اُجلا انسان، میلی رُوحیں

اس نے ایک مرتبہ پھر انسانوں کے اس سیلاب کو دیکھا جو سڑک پر مسلسل اُمڈ رہا تھا۔
ہر شخص کے چہرے پر اس کو آسودگی اور اطمینان کی لہریں نظر آئیں...... ہر شخص کے چہرے پر، جن میں شام کے اخبار بیچنے والے لڑکے تھے، فٹ پاتھ پر معمولی اشیاء بیچنے والے دکاندار تھے، وہ بوڑھا تھا جس کے چہرے کے نقوش بڑھاپے کی جھریوں نے چھپالئے تھے اور جو اپنی گدلائی ہوئی آنکھوں کے سامنے پان سگریٹ کا چھوٹا سا خوانچہ لئے بیٹھا تھا۔ وہ ٹوٹا پھوٹا بھکاری تھا جو اپنے بدن کو زمین پر گھسیٹ گھسیٹ کر آگے بڑھاتا تھا۔ وہ پاگل عورت تھی جو سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کو گالیاں دے رہی تھی۔ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس وہ جوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں، جن کے دل و دماغ میں ہر روز نئی محبتوں کے جوالا مکھی پھٹے رہتے تھے اور ہر روز ایک نئی محبت کی تلاش میں رہتے ہوئے ان کی روحوں میں بے چینی اور اضطراب کروٹیں لیتے رہتے تھے۔
اور جب اس کا یہ احساس کہ ہر شخص آسودہ اور مطمئن ہے، شدید تر ہوتا گیا تو ایک دم اسے اپنے وجود کا خیال آیا اور پھر صرف تنہائی کا احساس ہی اس کے ذہن پر باقی رہ گیا...... دنیا میں وہی اکیلا ایسا ہے جس کو یہ آسودگی اور اطمینان میسر نہیں۔ پتھر کے بنچ پر بیٹھے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے آس پاس نظریں دوڑائیں لیکن اطمینان اور آسودگی کی لہر نے جو ہر شخص کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اسے پھر شدید احساسِ تنہائی میں مبتلا کر دیا۔
لیکن سب سے بڑی مصیبت تو اس کے لئے شرافت اور پاکیزگی کے وہ تاثرات تھے جو اس کو لوگوں کے چہروں پر نظر آ رہے تھے!
وہ صرف ایک آدمی چاہتا تھا۔ صرف ایک! جس کے چہرے پر شرافت اور پاکیزگی کی علامات نہ ہوں۔ لیکن اس کے سامنے تو معصوم، پاکباز اور فرشتہ صفت لوگوں کا گروہ تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ زمین کو چھوڑ کر جہاں ہر طرف دھوکہ ریا اور کمینگی پائی جاتی ہے، فرشتوں کی دنیا میں نکل آیا ہے جہاں روحوں میں نفاست اور پاکیزگی...... ہوئی تھی۔ اس خیال کے ساتھ اس کو پھر احساسِ تنہائی نے آدبوچا۔ فرشتوں کی آسمانی دنیا میں ایک زمینی انسان کا وجود۔ غلاظت سے بھری ہوئی روح کے ساتھ اس کا اپنا وجود۔
پھر اس کی آنکھوں میں ایک سیاہ دھبہ جم گیا۔ جس میں اس کا اپنا وجود مقید تھا۔ اس کے چاروں طرف دوڑتی بھاگتی زندگی کے مختلف روپ تھے۔ ہر شخص کا اپنا ایک جاذبِ نظر رنگ تھا۔ ہر شے خوبصورت رنگوں کے حسین امتزاج کا مظہر تھی۔ اس رنگ برنگی قوسِ قزح کے حسین اور دلپذیر رنگوں کی دنیا میں ایک سیاہ دھبہ اکیلا اور تنہا اس رنگ برنگے ماحول کے درمیان بے چارگی سے بے حس و حرکت مہمان ناپسندیدہ کی طرح پڑا ہوا۔ پھر اچانک وہ رنگوں کی اس دنیا سے نکل آیا۔
انتہائی غلیظ، انتہائی مکروہ میل کی چادر میں لپٹا ہوا ننگا جسم لئے ایک ہٹا کٹا فقیر ایک آنکھ سے اندھا کریہہ آواز میں بھیک مانگ رہا تھا۔ "اللہ ہی دے گا۔" لیکن اس کریہہ آواز میں بھی اس کو عجیب سی پاکیزگی کا احساس ہوا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں سے اٹھا اور وہ اکنی جس کو بڑی دیر مٹھی میں مسلنے کی وجہ سے اس کے ہاتھ پسیج گئے تھے۔ اس فقیر کو دے دی۔
یہ اکنی اس کو کسی شخص نے بھکاری سمجھ کر دی تھی۔ جس کے چہرے پر بڑے بڑے بال بکھرے ہوئے تھے۔ گلے میں سُرخ رومال بدن پر گہرے رنگوں کی چار خانے کی قمیض، کھلا ہوا گریبان جس میں سے پیلے رنگ کا بنیان جھانک رہا تھا جس پر کیوپڈ کی تصویر چھپی تھی۔ اور ٹانگوں میں گہرے نیلے رنگوں کی پتلون جس کے پائنچے چڑھے ہوئے تھے۔
نہ معلوم فٹ پاتھ سے وہ کیا چیز خرید رہا تھا۔ اس نے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس کی نظر تو دس دس کے نوٹوں پر جم کر رہ گئی تھی جو اس نے پتلون کی ایک جیب سے نکالے تھے اور جس میں سے ایک نوٹ دکاندار کو دیا تھا۔ یہ شخص اس کے معیار پر پورا

اترا تھا۔ اس دکان سے جب وہ ایک بنڈل بغل میں دبا کر آگے بڑھا تو اس کے قدم لاشعوری طور پر اس کے پیچھے اٹھنے لگے۔
اس شخص کی چال میں لاابالی پن تھا جب کبھی کوئی لڑکی سامنے سے آتی تو وہ ہونٹوں کو سکیڑ کر سیٹی بجاتا۔ اور جب لڑکی اس کے قریب سے گزر جاتی تو وہ دو ایک مرتبہ پیچھے مڑ مڑ کر شاید اپنی سیٹی کے اثر کو دیکھتا۔ لیکن ہر مرتبہ اس کو مایوسی ہوئی کسی بھی لڑکی نے اس کی ہمت افزائی نہیں کی تھی۔ اس کی سیٹی کی آواز کو کسی نے بھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔
''یہی ٹھیک ہے۔'' اس نے دل میں سوچا۔ وہ ایسے ہی شخص کی تلاش میں تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس شخص نے ایک جوان پٹھان لڑکی کو جو ہر راہ گیر سے پیسے مانگتی تھی ایک روپیہ دیا تھا اور کچھ دیر تک اس سے نہ معلوم کیا کیا باتیں کرتا رہا تھا اور اتنی دیر تک وہ اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔
یہ شخص اس معیار پر پورا اترا تھا جو اس نے اپنے نزدیک کسی بدمعاش کے لئے قائم کیا تھا اس کی چال اس کے اطوار، عادات، لباس اور وہ عامیانہ پن جو اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا۔ ''یہی ٹھیک ہے۔'' اس نے پھر اپنے دل میں سوچا اور تیزی سے بڑھ کر اپنے اور اس کے درمیان فاصلے کو طے کر لیا۔
''بابو'' اس نے کہا۔ وہ شخص ٹھہر گیا۔ ''بابو......'' اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ اس جملہ کو نہ دہرا سکا جو اس نے بڑی مشکل سے تلاش کیا تھا۔ ''بابو...... میری بیوی ہے......'' اور پھر سوچنے لگا۔ باوجود لاکھ کوشش کے وہ ایک جملہ، وہ چند الفاظ اس کے منہ سے نہ نکل سکے جو اس نے بڑی محنت سے منتخب کئے تھے پھر وہ خجالت سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔
اس شخص نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسیاں اور بھوک سمٹ آئی تھیں اور شاید اسی احساس سے اس شخص نے اس کے ہاتھ پر ایک آنہ رکھ دیا اور آگے بڑھ گیا۔
''ایک آنہ۔ بیوی کی قیمت، مگر وہ تو...... وہ تو'' اس نے بے ربطگی سے سوچا۔ ''تو یہ بھی شریف نکلا۔'' اور گہری سرد سانس ہوا میں بکھر گئی۔
یہی ایک آنہ تھا جو اس غلیظ میلے کچیلے فقیر کو دے چکا تھا۔ ''اللہ ہی دے گا......'' کی صدا بھاگتی دوڑتی ہوئی دنیا کی پُرشور آواز میں معدوم ہو گئی تھی۔ آدمیوں سے پُر، اس پُرشور ماحول میں بھی اس کو تنہائی کا احساس تھا۔ تنہائی، اکیلا پن، سناٹا جو اس کے گرد پھیل گیا تھا۔ سناٹا جس میں اس کو کوئی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔
بہرحال مطلوبہ آدمی، باوجود کوشش کے ابھی تک اس کو نہ ملا تھا۔ طویل تلاش اور جستجو میں ناکام ہونے کے بعد پانچ بجے سے وہ پتھر کی اسی بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوپہر کی تمام دھوپ اس کے سر پر گزری تھی۔ اور جب اس کے پیروں نے بالکل ہی جواب دے دیا۔ اور پیٹ میں دوزخ کے دہانے کھل گئے تو وہ لڑکھڑا کر اسی بنچ پر گر گیا تھا۔ حالانکہ اس وقت بنچ پر دھوپ تھی اور چند ہی قدم کے فاصلے پر دوسری بنچ پیڑ کے سائے میں خالی پڑی تھی! لیکن اس کی ٹانگوں کی قوت ختم ہو چکی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر اسی تپتی ہوئی بنچ پر تپش کی وجہ سے دو تین مرتبہ پہلو بدل کر ساکن ہو گیا تھا۔
اور اب ہر طرح بجلی کی روشنی تھی سورج نہ معلوم کب کا ڈوب چکا تھا اور سڑک پر چراغاں ہو رہا تھا۔
پھر اس کو یاد آیا ابھی اسے آدمی تلاش کرنا ہے۔ ابھی تو اس کو وہ جملہ کہنا ہے جو وہ اس شریف آدمی سے نہ کہہ سکا تھا، جس نے اس کو ایک آنہ دیا تھا۔ یہ جملہ اس نے کتنی تحقیق و تجسس کے بعد معلوم کیا تھا جس کا انتخاب کرنے میں اس کو کتنی مصیبت محسوس ہوئی تھی۔ پھر اچانک یہ جملہ اس کے ذہن میں یوں اتر گیا گویا وحی۔ اور پھر اس کو نروان حاصل ہوا۔ لیکن اس نروان نے اس کی روح کو شکستی نہ دی۔ بلکہ اس کے دل کی تاریکیوں اور ذہن کے گوشوں میں جالوں کا جھمگھٹا ہو گیا۔
دوسرا مرحلہ اور بھی کربناک تھا۔
اس جملہ کو کسی اور شخص سے کہنے کے لئے خود کو تیار کرنے تک وہ کتنی روحانی اور ذہنی اذیتوں اور تکلیفوں سے گزرا تھا وہ خود ہی جان سکتا تھا۔ اس کی روح اس کا دماغ اس کا وجود، اس کے تصورات جھلس رہے تھے اور اب وہ ساکن و ساکت اور خاموش بیٹھا تھا...... مضطرب اور بے چین انسانوں کے اس سیلاب سے علیحدہ جو چاروں طرف سے امڈ رہا تھا۔ آج دنیا میں سب شریف تھے،

سب فرشتے تھے۔ جن کی روح گناہوں سے پاک تھی۔ جن کے چہروں پر تقدس اور پاکیزگی کی ضیاء تھی۔ اور آنکھوں میں عظمت و وقار کا جلال اور وہ خود کیا تھا! ذلیل، مکروہ اور گناہ گار نہ اس کی روح میں پاکیزگی تھی نہ جسم میں کوئی احساس تصور میں نہ تخیل میں۔

پھر اس نے اس پہلو پر دوسرے زاویوں سے سوچنا شروع کیا۔

یہی تو فرشتے ہیں۔ یہی تو وہ پاکباز ہیں جنہوں نے آج اس حد تک مجبور کر دیا ہے۔ ہونہہ سب کمینے ہیں۔ سب شریف بنتے ہیں...... سب۔ اور پھر اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک غلیظ گالی ان فرشتہ صورت انسانوں کے لئے نکلی لیکن نہ معلوم کیوں اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی۔

لیکن اس طور سوچنے کے باوجود بھی اس کو کسی آدمی کا انتخاب کرنا آسان نہ ہوا۔ ہر شخص جو اس کے قریب کھڑا ہوتا یا گزرتا تو وہ اس کو بہت غور سے دیکھتا اور مایوس ہو جاتا اور جب کوئی دوسرا آدمی اس کی نظر کے اس انداز کو تعجب اور حیرانی سے دیکھتا تو وہ خجل اور شرمندہ سا ہو جاتا۔

''تو سالا یہ بھی شریف ہے!'' وہ سوچتا اور پھر کسی دوسرے آدمی کو تاکنے لگتا۔ اس کے انداز میں کسی فاحشہ کی نظروں کا سا انداز تھا۔ ایک حریصانہ جذبہ۔ جو ابھی تک محض جذبہ ہی تھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر صبح سے گزری ہوئی باتیں دل میں دہرائیں جن کو وہ کئی مرتبہ دل میں دہرا چکا تھا۔ اور ہر مرتبہ اس نے روح کے لئے ایک نیا جہنم پایا تھا...... ہر مرتبہ اس کے ذہن پر زہریلے بچھو یلغار کرتے۔ بھوک کے باوجود اس کا چہرہ آگ میں جھلس رہا تھا۔ سرخ ہو رہا تھا، پھر یہ سرخی مدہم پڑتی گئی۔ ایک تاریک سایہ اس کے چہرے پر پھیل گیا جس طرح جلتے ہوئے انگاروں پر بتدریج راکھ کی تہہ جم جاتی ہے۔

پھر اس نے اپنے پیٹ سے آواز اٹھتی محسوس کی۔ آج پیٹ بھی باتیں کر رہا تھا اس نے قمیض کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنے پیٹ کو سہلایا جو کمرے سے لگ چکا تھا، مگر وہ خاموش نہ ہوا۔ بھوکے بچے کی طرح بلکتا ہی رہا۔ چیختا ہی رہا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا بلکتے ہوئے بچے کی چیخیں اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں۔

شہر کی بارونق سڑک پر فٹ پاتھ کے کنارے وہ کھڑا ہوا تھا کہ کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا ایک دوست جو مل میں اس کے ساتھ کام کرتا تھا کھڑا تھا۔ اور اچانک وہ ماضی میں کھو گیا۔ جب طویل بیماری کے بعد وہ مل میں کام پر گیا تو اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ منیجر نے کہا تھا کہ تمہاری صحت اس قابل نہیں کہ ہم تمہیں دوبارہ کام پر رکھ سکیں۔ اس نے بہت منت سماجت کی تھی۔ بہت کچھ یقین دلایا تھا کہ وہ کام کر سکتا ہے۔ لیکن کان بہرے ہو چکے تھے پھر وہ وہیں بیٹھ گیا تھا...... اور جب ملازمت اور اچھی کارکردگی کا سرٹیفکیٹ اسے دیا گیا تو وہ چونکا۔ اس نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن احساس کی شدت سے زبان گنگ ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا۔ اب وہ بے کار ہو گیا ہے، اب وہ بے کار ہو گیا ہے، پھر اس کی صحت ہر جگہ آڑے آئی۔ وہ صرف ایک ہی کام کر سکتا تھا۔ مختلف ملوں میں اس نے اسی کام کے لئے کوشش کی لیکن اس صحت کو کیا کرتا جو طویل بیماری نے اس سے چھین لی تھی۔ اس کھال کو کیا کرتا جو ہڈیوں سے چمٹ گئی تھی۔ ان پسلیوں کو کیا کرتا جو اس پتنگ کے کانپ ٹھڈے معلوم ہوتے تھے جس کا کاغذ گل گیا ہو، ان آنکھوں کو کیا کرتا جو سیاہ حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں، ان گالوں کو کیا کرتا جن میں اتنے گہرے گڑھے تھے کہ ہر طرف ایک ایک انڈا آسانی سے سما سکتا تھا، ان نسوں کو کیا کرتا جن میں بجائے خون کے محض سانس کی وجہ سے دھڑکن معلوم ہوتی تھی! جب کہ مل خون چاہتی ہے، گوشت چاہتی ہے، محض ہڈیاں، محض سانس محض کانپ ٹھڈے تو وہ کچرا ہیں جو روزانہ بھنگی جھاڑو سے جمع کر کے باہر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیتا ہے۔

اس کا دوست کہہ رہا تھا۔ ''یار اب تو کھانسی نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ ہر دم کھوں کھوں۔ منیجر نے کہا ہے کہ اسپتال جا کر دکھاؤں۔ وہ نہیں چاہتا کہ ٹی۔ بی کے جراثیم دوسرے مزدوروں میں پھیلیں۔ مگر تم یہ بتاؤ کہ یہ جراثیم مجھ میں کیسے داخل ہوئے۔ میں تو مل میں سب سے زیادہ صحت مند تھا۔ ان سے کہو کہ مل میں وہ مشینیں لگائیں جو روئی کے اڑتے ہوئے ریشوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں تو کان پر جوں نہیں رینگتی۔ بھیا روئی کا ریشہ تو پہننے کیلئے ہوتا ہے! کھانے کے لئے نہیں اور جب تم انہیں سانس کے

... سے وہ یوں مزے لے لے کر بیان کرتے ... کی بھوک کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔
اس نے سمجھا تھا کہ ایسے لوگ اس کو آسانی سے مل جائیں گے لیکن اب تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ ایسے لوگ تو غائب ہی ہو گئے تھے۔ گویا کوئی لذیذ چیز کھا رہے ہوں۔ اس ماحول کی اسی فضا کو سوچ کر اپنی اس بے چارگی پر وہ اس وقت رونا چاہتا تھا، لیکن معدے کی آگ نے آنسوؤں کے سوتوں کو خشک کر دیا تھا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے سر کو جھٹکا۔ نفی کے انداز میں سر کو ہلایا۔ ''نہیں نہیں! میں یہ نہیں کر سکتا۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں یہ نہیں کر سکوں گا۔'' سر کو تیزی سے جھٹکنے کی وجہ سے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ بچہ زور زور سے چیخنے لگا۔ وہ ایک مرتبہ پھر دوزخ میں جل رہا تھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا سڑک میں گم ہو گیا۔ ایک آدمی کی تلاش میں جس سے وہ یہ کہہ سکے۔

''صاحب مال چاہئے ایک دم فسٹ کلاس۔'' یہ جملہ وہ شریف آدمی سے نہ کہہ سکا تھا۔

پھر رات کے سائے گہرے ہو گئے۔ سڑکیں خاموش ہو گئیں۔ انسانوں کا سیلاب کہیں گم ہو گیا۔ آسمان سے تیزی سے شبنم گرنے لگی اس خنک نمی میں اس کو یوں محسوس ہوا گویا تارے اور بھی نکھر گئے ہیں۔ ان کی روشنی اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ حالات تبدیل ہونے کے ساتھ ماحول کتنی تیزی سے بدل جاتا ہے۔ اس نے سوچا فضا میں اس کو آسودگی اور اطمینان کی لہروں کی آوازیں ابھرتی محسوس ہوئیں۔ اس کا دل مطمئن تھا، ذہن آسودہ اور روح پر نور کی بارشیں ہو رہی تھیں۔

جب وہ اپنے مکان میں داخل ہوا تو کمرے میں پیلی پیلی اُداس سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

''دروازہ بند کرو۔'' اس نے بیوی سے کہا۔

''کیوں کوئی اور نہیں ہے؟'' بیوی نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

اس کے سر پر گویا ایک ہتھوڑا پڑا۔ ''نہیں کوئی اور نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا اس کی بیوی دروازہ بند کرنے چلی گئی اور وہ ایک مرتبہ پھر صبح کی باتیں دل میں دہراتا رہا۔ صبح جب وہ دونوں اٹھے تھے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر انہیں معلوم ہوا کہ رات بھر بھوک کی شدت سے وہ نہیں سو سکے ہیں۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھی۔ باوجود لاکھ کوشش کے اس کو نوکری نہیں ملی تھی۔ باوجود لاکھ خوشامد کے اس کو قرض نہ ملا تھا۔ دکان سے سودا ادھار نہ ملا تھا۔ تو مجبور ہو کر اس نے بیوی کے سامنے ایک نہایت گھناؤنی تدبیر رکھی تھی اس کی بیوی نے بھی کوئی مخالفت نہ کی۔ شاید وہ بھی اسی پہلو پر سوچ رہی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا۔

''لیکن آدمی؟''

''وہ میں لایا کروں گا۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل آیا تھا۔

اس کی بیوی دروازہ بند کر چکی تھی۔ اس نے تیزی سے کہا، ''خدا نے ہمیں بچا لیا۔'' مجھے نوکری مل گئی ہے لو یہ کھانا میں نے بھی ابھی تک نہیں کھایا۔ بھلا میں تمہارے بغیر کھا سکتا تھا! پھر اس نے بیوی کو زور سے بھینچ لیا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ آہستگی سے اس کے ہاتھ اپنے جسم سے علیحدہ کر دیئے۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی! ایسی مردنی جو فاقہ کی زردی سے بالکل علیحدہ تھی۔ وہ پلنگ پر گر پڑی اور سسکیوں اور آہوں کے درمیان اٹکتے ہوئے ہذیانی انداز میں کہا۔

''مگر...... مگر...... ہم نہیں بچ سکے۔ میں نے کھانے کا انتظام کر لیا تھا۔''

اس کو اچانک یوں محسوس ہوا گویا وہ پھر پستیوں میں گرا ہے۔ سیاہ دھبے نے پھیل کر اس کے وجود کو ڈھانپ لیا۔ ایک گمبھیر احساسِ تنہائی۔ وہی کرب و اذیت۔

ooo

... انسان ہیں اور ایک ہی سمت میں بڑی مضحکہ خیز ... چلے جا رہے ہیں۔ وہ تیز چلنے سے بھی زیادہ تیز ہیں مگر دوڑ نہیں رہے۔ ان کے کپڑے اُڑ اُڑ کر دیوانہ وار ان سے لپٹ رہے ہیں۔ قریب سے دیکھنے پر ان کے چہرے لاشوں کی طرح زرد نظر آتے ہیں۔ ان کے بکھرے، الجھے، بے ترتیب بال کسی پرندے کے اجاڑ گھونسلے کی طرح ہیں اور پنجوں کی صورت اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے چہروں کے نقوش اس طرح تڑے مڑے ہیں جیسے کسی ایسے دبیز شیشے میں سے دکھائی دے رہے ہوں جس کی ساخت میں نقص کی وجہ سے لہریں سی پڑ گئی ہوں۔ ان کے چہروں کی جلد پگھلی ہوئی موم سے بنی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو کسی نے بے ترتیبی سے انڈیل دی ہو اور جو ابھی پوری طرح جمی نہ ہو۔ ان کی رفتار کی شدت سے اس جمتی ہوئی موم میں ہلکی ہلکی لہریں آہستہ آہستہ بنتی اور دھیرے دھیرے بگڑتی رہتی ہیں جس کی بدولت ان کے مائع چہروں پر ہونٹ، ناک، کان، گال اور چہرے کا ہر رشتہ مستقلاً تغیر پذیر رہتا ہے۔

انسانوں کے اس بہتے ہوئے ریلے میں آگے پیچھے اِدھر اُدھر کچھ لوگ بکھرے ہوئے ہیں جنھوں نے بہت لمبے لمبے بانس اٹھائے ہوئے ہیں۔ کچھ بانس تو اتنے اونچے ہیں کہ ضرب کے کئی نشانوں سے بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان بانسوں کے اوپر نقلی چوکیدار بندھے تیز ہوا میں جھولتے رہتے ہیں اور بانس اٹھانے والے پوری طاقت سے انہیں اوندھے منہ گرنے سے بچائے رکھتے ہیں۔ ہر پتلے کے کم از کم دو چہرے ہیں۔ کئی پتلے تو ایسے ہیں جن کے آٹھ آٹھ دس دس چہرے ہیں اور ہر چہرے پر ایک الگ تاثر طاری ہے۔ ان سب پتلوں کا ایک چہرہ جو تقریباً سب میں مشترک ہے، بڑا خوفناک ہے۔ گہرے جامنی رنگ کی جلد، غیض و غضب میں ابلی پڑی آنکھیں، چھاتی تک لٹکتی ہوئی خون ٹپکاتی سرخ زبان، اوپر کے کھلے ہوئے جبڑے میں دو لمبے لمبے دانت جو خنجر کی طرح خم کھاتے ہوئے زبان پہ آ کے ٹکے ہوئے ہیں۔ شانوں تک لمبی لٹیں اور ہر لٹ کے آخر میں زبان نکالے ایک سانپ۔ ان نقلی چوکیداروں کے کاٹھ کے پتلے پتلے سیدھے پھیلے ہوئے بازوؤں پر الفتی نما قمیض پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں لیکن چہروں پر وہی ایک تاثر منجمد رہتا ہے۔ ہر بانس اٹھانے والا اپنا نقلی چوکیدار دوسروں سے بلند رکھنے کی فکر میں بازو کو پورا بلدن کئے پنجوں کے بل چلتا ہے۔ یہ بانس والے نقلی چوکیدار لئے جس طرف بھی نکل جاتے ہیں لوگ سہم کر تھر تھر کانپتے جھک جاتے ہیں۔ جہاں یہ دیکھتے ہیں کہ کسی گروہ پہ خوف و ہراس کا مطلوبہ اثر پیدا نہیں ہو سکا تو ایک ہاتھ سے بانس کو سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے جیب کی گہرائیوں میں سے نقلی چوکیدار کی جامنی رنگ والی تصویر نکال کے اپنے چہروں پر گھڑی بھر کے لئے چپکا لیتے ہیں۔ جب لوگوں کی خوف سے گھگھی بندھ جاتی ہے تو جیب سے دوسری تصویر نکال کر چہرے پر لگا لیتے ہیں جس میں نقلی چوکیدار کا کدو کی طرح گنجا سر ہے اور ٹماٹر کی طرح سرخ گال ہنستے ہنستے لپٹنا چاہتے ہیں۔ سنہرے ستون جہاں جہاں ضرب کے نشانات بناتے ہیں وہاں سنہری کھوپڑیوں والے لوگ کہنیوں کے سہارے لیٹے ہیں اور الجھے بے ترتیب بالوں کے بغیر انڈے کی طرح صاف

... ہاتھوں کی پشت سے اسے پہرے سے سامنے
سے ہٹا دیتے ہیں۔ نیچے ہجوم بہتا رہتا ہے۔

تیس پینتیس برس کا ایک مرد پُل کے کنارے کنارے لگے ہوئے لوہے کے جنگلے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہے۔ کنارے کے ساتھ ہی اتھاہ تاریکیاں اور گھپ اندھیرے ہیں۔ اتنا روشن اتنا منور پل جس کے موٹے موٹے سنہرے ستون آسمانوں کو چیرتے ہوئے اجالے پھیلاتے چلے جاتے ہیں لیکن کناروں سے باہر ایک ننھی سی کرن بھی نہیں پہنچا سکا۔ شاید روشنی مجبور ہے کہ جب تک کسی مادی چیز سے نہ ٹکرائے کوئی تاثر پیدا نہیں کر سکتی اس کے چہرے کی جلد نہ تو پگھلی ہوئی موم کی طرح ہے اور نہ ہی اس کے نقوش تڑے مڑے ہیں۔ لیکن اس کی پوری شخصیت پہ ایک گھمبیر تا طاری ہے جیسے پوری توجہ اور تن دہی سے کوئی نہایت ادق مسئلہ سمجھنے اور حل کرنے کو کوشش کر رہا ہو۔ اس سے سو گز آگے ایک عورت اسی طرح جنگلے سے ٹیک لگائے کھڑی ہے۔ پھر ایک مرد کھڑا ہے پھر ایک عورت کھڑی ہے۔ پورے پل پہ ایک انتہا سے دوسری انتہا تک اسی طرح مرد اور عورتیں کھڑی ہیں۔ پل پہ انسانوں کا سیلاب اپنی دُھن میں چلا جا رہا ہے۔ جنگلے سے ٹیک لگائے کھڑے لوگوں میں دفعتاً ایک ہی لَے اور ایک ہی تال میں حرکت پیدا ہوتی ہے جیسے وہ کسی بیلے کے کردار ہوں اور ایک ہی ڈانس نمبر ناچ رہے ہوں۔ ہاتھوں کی ایک متفقہ حرکت سے وہ سب بکھرے ہوئے الجھے ہوئے بے ترتیب بالوں کے پٹوں کو ٹوپیوں کی مانند اتار کر زمین پہ رکھ دیتے ہیں جیسے وہ بال کبھی ان کے جسموں کا حصہ ہی نہ تھے دوسری متفقہ حرکت کرتے ہیں اور قمیصیں اتار کے جنگلے پہ رکھ دیتے ہیں۔ پھر ہر کوئی کہنی تک اپنا دائیاں بازو جما کے رکھتا ہے۔ ایک لمبی گہری سانس بھرتا ہے اور متوازی بار پہ جمناسٹک کے انداز میں جنگلہ پھلانگ کے اتھاہ تاریکیوں اور گھپ اندھیروں میں کود جاتا ہے۔ کوئی شڑاپ کی آواز نہیں آتی کوئی چھینٹے نہیں ابھرتے۔ کوئی بلبلہ پیدا نہیں ہوتا۔ لوگ مجنونانہ چال میں پل پر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جنگلے کے ساتھ فوراً ہی اور لوگ ٹیک لگا کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر وہی ایک لَے اٹھتی ہے۔ پھر وہی ایک تال ابھرتی ہے۔ نقلی چوکیدار بانسوں پر پھدکتے رہتے ہیں۔ سنہرے سر سوچتے رہتے ہیں۔

پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے ایک جوان ایک بڑی پیاری سی معصوم صورت پانچ سالہ بچی کا بازو مضبوطی سے پکڑے چلا جا رہا ہے۔ بچی کے کندھے پہ بستہ لٹک رہا ہے اس کے چہرے کی جلد صاف ہے اور نقوش اپنی اپنی جگہ پہ قائم ہیں۔ وہ اس کے تیز رفتار قدموں سے قدم ملائے رکھنے کی کوشش میں بھاگی چلی جا رہی ہے اس کے ننھے ننھے پاؤں اس تیز رفتاری کی تاب نہ لاتے ہوئے رپٹ جاتے ہیں تو وہ اپنے باپ کے ہاتھ کے سہارے جھولتی ہوئی بہت دور تک چلی جاتی ہے۔ باپ دفعتہً بچی کا ہاتھ چھوڑ کر جنگلے کی طرف چل پڑتا ہے۔ یکدم اس کے چہرے کی جلد صاف ہو جاتی ہے اور نقوش معمول پر آ جاتے ہیں۔

"ابا ابا تم کہاں جا رہے ہو؟"

"جنگلے کے پار"

"اچھا! کب واپس آؤ گے؟"

"کبھی نہیں۔ کیا تمہیں میری ضرورت ہو گی؟"

"نہیں نہیں۔ یہاں کون کس کے لئے ضروری ہے۔"

"نقلی چوکیداروں کے آگے جھکنا نہ بھولنا وہ ہم سب کے لئے بہت ضروری ہیں۔"

"اچھا"

ایک پھولے گالوں اور عمدہ لباس والا راہگیر چھڑی گھماتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی بہت تیزی سے چکر کھا رہی ہے۔ اس کے بالوں کے پف سے دو تین انچ اوپر گول ٹوپی اتنی رفتار سے گھوم رہی ہے کہ پہلی نظر میں ساکت معلوم ہوتی ہے۔ اس گھومتی ہوئی چوٹی کے کنارے اسے اگر کسی کا ہاتھ چھو جائے تو کٹ کے دور جا پڑے۔ وہ پکار کے کہتا ہے۔ "کودو۔ کودو۔ یہ

تمہارے بغیر کسی یتیم خانے میں زیادہ آرام سے رہ سکتی ہے۔ بڑا آیا۔" پھر ہنستا ہوا داد طلب نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ اس کی بات پہ پاس والے کئی منہ اور بچی کا منہ ہنسنے کے انداز میں کھلتے ہیں۔ چڑیوں کے بونٹ چوگا لینے کے لئے منہ کھولتے ہیں تو ان کے منہ ان کے جسموں کی مناسبت سے کئی گنا بڑے نظر آتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کا گہرا منہ اور معدہ ایک ہیں بلکہ ان کی پوری شخصیت ایک پیٹ نظر آتی ہے۔ اس طرح بہت گہرے غاروں جیسے منہ پوری گہرائی تک بالکل سیاہ ہیں۔ گویا کناروں سے باہر پھیلی ہوئی تاریکی پیٹ بھر کے پھانک گئے ہوں اور ان کی پوری شخصیتیں محض پیٹ ہوں۔ ان کے کھلے منہ اور بند آنکھیں کافی دیر تک ہنسنے کے پوز پہ قائم رہتے ہیں۔ مگر کوئی آواز نہیں ابھرتی اور پھر مگر مچھ کے جبڑوں کی طرح کھٹاک سے بند ہوجاتے ہیں۔ ایک لے، ایک تال۔ چیونٹیوں کی طرح پھیلے ہوئے لوگ اپنی رفتار پر چلتے رہتے ہیں۔ بچی کے چہرے کے نقوش وہی مائع صورت اور اس کے ننھے پاؤں وہی مجنونانہ چال اختیار کرلیتے ہیں۔ ایک بڑی موٹی بوڑھی سی عورت بھاری بوجھ تلے دبے خچر کی طرح ہانپتی ہوئی چلی جارہی ہے۔ اس کا دایاں بازو کندھے سے غائب ہے۔ اور اس کے بائیں ہاتھ میں چھوٹی سی چھڑی ہے اور دو جوان عورتوں کو آگے لگائے بھیڑوں کی طرح ہانک رہی ہے۔ وہ تینوں جب بچی کے قریب پہنچتی ہیں تو موٹی عورت پھولی سانس سنبھالتے ہوئے پوچھتی ہے۔ "ارے تم اکیلی ہو۔ تمہارا رکھوالا کدھر ہے؟" پل پہ بچے اور جوان عورتیں بغیر رکھوالوں کے نہیں گھوما کرتے۔"

میرا تو کوئی رکھوالا نہیں۔ ایک باپ تھا وہ بغیر کچھ پیچھے چھوڑے اُدھر کود گیا (بناوٹی سی رونی شکل بناتی ہے) ہائے اگر وہ پیچھے بہت سا مال چھوڑ جاتا تو کتنا مزا آتا۔ (تصور میں محسوس کرتی ہے جیسے واقعی بہت سے مال کی وارث بن گئی ہو، اور ایک چمکدار سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے)

"پیچھے اگر مال نہیں چھوڑا گیا تو کیا ہوا۔ تمہارا آخر کوئی باپ تو تھا۔ اب تمہیں نقلی چوکیدار آنکھیں تو نہیں دکھا سکتے۔ لوگ تمہارا مذاق تو نہیں اڑا سکتے۔ ان بیچاروں کا تو کوئی باپ ہی نہیں تھا۔ ہر وقت نقلی چوکیداروں سے چھپتی پھرتی ہیں کیوں لڑکیو!"

دونوں جوان عورتیں جس طرح خاموش کھڑی تھیں کھڑی رہتی ہیں۔ صرف ان کے ماتھوں پر لہریں ذرا گہری ہوجاتی ہیں اور پگھلی موم جیسی جلد میں دھنسی دو دو روشن آنکھیں بے قراری سے ایک مرتبہ ادھر ادھر گھومتی ہیں کہ کوئی بانس والا تو قریب نہیں ہے۔

"میرا باپ کہہ گیا تھا نقلی چوکیداروں کا احترام کرنا۔ میں دو دن سے ٹماٹر جیسے گالوں والے سے کھانا مانگ رہی ہوں۔ وہ اپنے سفید سفید دانت نکوسے آنکھوں موندے ہنستا رہا ہے۔ یہ نقلی چوکیدار کیا کرسکتے ہیں؟"

"ہش......ہش......ش۔ آہستہ بولو۔ کوئی سن لے گا تو آفت آجائے گی۔ یہ نقلی چوکیدار ہم جیسوں کے لئے مصیبت کھڑی کرسکتے ہیں، کھانا نہیں دے سکتے۔"

"دو جوان عورتوں میں سے ایک دفعتہً پل کے جنگلے کی جانب چل پڑتی ہے۔ دوسری پوچھتی ہے "اری! کیوں!"

وہ مڑ کے جواب دیتی ہے "تمہیں نہیں معلوم...... مجھے پرانا آتشک ہے۔"

"اچھا اچھا...... لیکن سنو احتیاط کرنا، کہیں ادھر دوسری طرف کی مخلوق کو بیمار نہ کردینا۔" سب منہ خاموش سیاہ ہنسی کے لئے کھلتے ہیں۔

بچی کی توسیں ابھر آتی ہیں۔ کولہے گول اور گداز ہوجاتے ہیں۔ موٹی عورت ایک تھیلے میں سے ڈگڈگی نکال کے اس کے سر پر بجانا شروع کردیتی ہے اور ہانک لگاتی ہے...... "دیکھو دیکھو۔ تازہ ککڑی کی مانند نرم و نازک۔"

بچی اپنے سر پر تیزی سے ڈگڈگی بجاتے ہوئے ہاتھ کو گردن اونچی کرکے دیکھتی ہے جیسے چڑیا پانی پی رہی ہو۔ جوان عورت اسے بتاتی ہے۔" یہ ڈگڈگی تو اب یونہی ہر روز بجتی رہے گی۔ گھبراؤ نہیں کچھ ایسی مشکل نہیں۔ ہر عورت کے لئے یہ ایک بہت سیدھا سادھا سا کام ہے جیسے سانس لینا، باتیں کرنا۔"

لوگ حلقہ بنا کے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ان میں سے کئی آدمی بار بار چونک کے ادھر ادھر دیکھتے ہیں موٹی عورت ان کی

دونوں پلڑوں میں برابر کا سونا ڈال رکھا ہے۔"

جوان عورت پکی پر پڑنے والی حریصانہ نظروں کو اپنے ہونٹوں پہ زہر خند پھیلائے بڑے حسد سے تک رہی ہے۔ توند جیب میں ہاتھ ڈالتی ہے۔ ضرب کے سنگھاسن پہ لیٹا ہوا ایک سنہری کھوپڑی والا چند پرچیاں نیچے ان حلقہ بنائے کھڑے لوگوں پہ پھینکتا ہے۔ ہوا میں لہراتی ڈولتی پرچیاں ان پر برف کے گالوں کی طرح گرتی ہیں۔ ایک پرچی موٹی عورت کے پاؤں میں آکر گرتی ہے۔ وہ لحظہ بھر کے لئے ڈگڈگی روک کے پرچی اٹھاتی ہے اس پر لکھا ہوتا ہے "بری بات"۔ وہ گردن اٹھا کے سنہری کھوپڑی والے کی جانب دیکھتی ہے۔ پھر اپنے تھرتھراتے پیٹ پر سے کپڑا اٹھا کے دانتوں میں پکڑ لیتی ہے اور اس پہ زور زور سے ہاتھ مارتی ہے۔ پھر پھونک مار کے پرچی سنہرے سر والے کی جانب اڑا دیتی ہے۔ اس کی نقل میں سب لوگ پرچیاں پھونک مار کے اسی جانب کو اڑا دیتے ہیں۔ تمام کی تمام پرچیاں واپس سنہری کھوپڑی والے کے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ وہ نیچے دیکھنا بند کر کے پھر خلاؤں میں گھورنا شروع کر دیتا ہے۔ مجمع مجنونانہ انداز میں چلتار بنتا ہے۔ نقلی چوکیدار اپنے اپنے بانسوں پر پھدکتے رہتے ہیں۔ ڈگڈگی بجتی رہتی ہے۔ ہانک لگتی رہتی ہے۔

ایک دھماکے کی آواز ہوتی ہے اور ایک شخص کی کھوپڑی میں سے بھاپ کئی سوفٹ بلند فوارہ شوں شاں کا بے پناہ شور مچاتا ہوا اُبل پڑتا ہے۔ اس کی گردن میں تناؤ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بھاپ کے بادل اس کی کھوپڑی کے سوراخ میں سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے اُمڈ اُمڈ کے نکلے چلے آ رہے ہیں۔ اس کی گردن تنتے تنتے اب اس قدر تن چکی ہے کہ اس کی ٹھوڑی اس کے سینے میں گڑ گئی ہے اس کے نتھنوں اور منہ سے شعلے نکل رہے ہیں۔ ادھر ادھر کے لوگوں کو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ وہ حیرت زدہ بھاپ کے پھیلتے ہوئے بادل کو دیکھ رہے ہیں جس میں پہلے دھواں اگلتی چمنیاں نمودار ہوتی ہیں پھر کوٹھیوں جنگلوں کی قطاریں پھر رنگا رنگ کاریں، پھر ایک چہرہ، نسوانی چہرہ، ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ، سرخ ساڑھی کا پلو سر پر جمائے شرماتا لجاتا ہوا پیارا پیارا چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ شخص اس قدر شدت سے لرزتا ہے جس طرح طیارہ رن وے پر دوڑ شروع کرنے سے پہلے ایک بر لرزتا ہے۔ کچھ من چلے بڑے بڑے پتھر لا کے اس کی راہ میں ڈال دیتے ہیں۔ کچھ لکڑی کی کیلیوں سے اس کی راہ میں بند مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کئی بانس والے اس کے ارگرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کے چہروں پر ہر قسم کے خوفناک نقلی چوکیداروں کی تصویریں چپکی ہوئی ہیں۔ لوگ دہشت زدہ ہو کے جھک جاتے ہیں۔ یہ حملہ آور جنگی سور کی طرح آگے بڑھ کے ان کے چہروں سے تصویریں نوچ کے اپنے جسم پر چپکا لیتا ہے اور اپنی پشت، بازوؤں، ٹانگوں پر جہاں جگہ ملتی ہے چپکاتا چلا جاتا ہے۔ لوگ دہشت زدہ جھکے رہتے ہیں۔ بانس والے اپنی دال گلتی نہ دیکھ کر کھسیانی ہنسی ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور پھر ٹماٹر جیسے گالوں والے نقلی چوکیدار کی تصویریں نکال کر اپنے چہروں پر چپکاتے ہوئے اس کی راہ چھوڑ کے ادھر ادھر کھسک جاتے ہیں۔ راستے کے پتھر لڑھکتے ہوئے دور جا گرتے ہیں اور بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ اپنی ناک کی سیدھ میں ایک دم چھوٹ پڑتا ہے۔ سینکڑوں آدمی اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ ہزاروں آدمی اس کے پاؤں تلے کچلے جاتے ہیں۔ کئی باپ اپنی بچیوں کے ہاتھ چھوڑ کے جنگلے کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک لے، ایک تال۔ بے پناہ ہجوم کلبلاتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

پُل پر ان گنت مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ مردوں کا بایاں بازو عورتوں کے دائیں بازو کے ساتھ اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ دونوں بازو ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کے ایک ہی بازو کا تصور پیش کرتے ہیں۔ ان جوڑوں میں کئی عورتیں مردوں کو اور کئی مرد عورتوں کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے لئے جا رہے ہیں۔ گھسٹنے والا ساتھی واویلا مچا رہا ہے۔ اپنے

اجاڑ گھونسلے جیسے بال نوچتا ہے۔ ہر کسی کو مخاطب کر کے اپنی داستانِ درد سنانا چاہتا ہے مگر ان کی آہ و فغاں پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ جوڑوں کی اس قابلِ رحم حالت کے باوجود نئے جوڑوں کے جھنڈ کے جھنڈ بانس والوں کے پاس جاتے ہیں۔ مرد دائیں ہاتھ سے اور عورت بائیں ہاتھ سے بانس کو تھام کر اپنا اپنا دوسرا بازو بانس والے کی جانب بڑھا دیتے ہیں۔ بانس والا پہلے جیب سے ایک ایسے نقلی چوکیدار کی تصویر نکال کے منہ پہ چپکا تا ہے جس کے کان گدھے کی طرح لمبے ہیں اور چہرہ دہکتی ہوئی آگ کی طرح سرخ ہے۔ اس کے چہرے پہ شرارت بھری مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہے۔ آنکھ مارنے کے انداز میں ایک آنکھ اس طرح میچی ہوئی ہے جیسے شیطان نے فرشتوں کی طرف دیکھ کے اس وقت میچی ہو گی جب آدم نے حوا کے کہنے پر گندم کا پہلا دانہ چکھا تھا۔ دو زانو جوڑوں کے بازوؤں کو بانس والا رسی بٹنے کے طریق پہ بٹتا ہے۔ جب وہ بٹ کر یک جان ہو جاتے ہیں تو انہیں چھوڑ دیتا ہے۔ چہرے سے تصویر اتار کر جیب میں ڈالتا ہوا اپنی راہ لیتا ہے اور جوڑا ہجوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ پل بھر کے لئے تالی بجاتے ہیں اور چل دیتے ہیں کچھ جوڑے ایک دوسرے سے بیزار منہ دوسری طرف پھیرے چپ چاپ چلے جاتے ہیں۔ کوئی اچھل کود نہیں کرتے۔ کوئی ہنگامہ نہیں مچاتے لیکن ہر ساتھی دوسری جنس کے گزرنے والوں میں سے کسی کسی کو ہاتھ کی اوٹ بنا کر اپنے ساتھی سے منہ چھپاتے ہوئے ایک آدھ مچلتی ہوئی مسکراہٹ پھینک کے اس کا دل للچاتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ ایک مرد کی پیٹھ پر ایک بہت بڑا مٹکا بندھا ہوا ہے۔ وہ اس قدر بوجھل ہے کہ اس کی پتلی پتلی ٹانگیں اس کے بوجھ تلے مستقل کانپتی رہتی ہیں اور ہر ہر قدم پہ اس کے پاؤں لڑکھڑا جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ بندھی ہوئی عورت بھی اس کی لڑکھڑاہٹ کے ساتھ طوفان میں پھنسی کشتی کی طرح ڈولتی ہے۔ عورت کی پیٹھ پہ دو بچیاں سوار ہیں۔ وہ فارغ ہاتھ سے انہیں بھی سنبھالنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ ڈولتے ڈولتے عورت اس سے کہتی ہے۔ ''مٹکا اتار دو، یہ بوجھ بہت بھاری ہے۔ کون زیادہ دیر تک مٹکے کو اٹھائے پھر سکتا ہے۔ خود بھی گرو گے اور ہمیں بھی گرا دو گے۔''

وہ بھڑک کے کہتا ہے ''کیوں نہیں اٹھا سکتا؟'' پھر وہ بدن کو ایک جھٹکا دیتا ہے اور مٹکے میں سے کچھ پانی اس کے سر پر آن گرتا ہے جس سے اس کے پٹوں کی صورت میں اٹھتے ہوئے بال گیلے ہو کے اس کے سر کے ساتھ چپک جاتے ہیں اور اس کے چہرے پر ایک احمقانہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے اور اپنے گرد و پیش سے لاتعلق ہو کر یونہی سامنے گھورنا شروع کر دیتا ہے اور لڑکھڑاہٹ شدید تر ہو جاتی ہے۔ عورت کی چیخ و پکار کوئی نہیں سنتا۔ جب وہ ذرا سنبھلتا ہے تو عورت کہتی ہے۔ ''تم تو اس کے بوجھ تلے دب کے ادھر کود جاؤ گے۔ لیکن ہماری کتنی بدنامی ہو گی۔ خدا کے لئے یہ مٹکا اتار دو۔''

''یعنی میں کچھ نہیں ہوں؟ میری ہستی کوئی چیز نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو صرف اتنی کہ یہ تمہارے لئے کتنی نیک نامی اور کتنی بدنامی کا باعث بنتی ہے؟''

''اور نہیں تو کیا تم سمجھتے ہو کہ کوئی ہستی دوسروں کے لئے اس سے زیادہ معنی بھی رکھتی ہے۔ اگر نقلی چوکیداروں کا خوف نہ ہوتا اور جگ ہنسائی کا ڈر نہ ہوتا تو میں کبھی کی بازو چھوڑ چکی ہوتی۔ حالانکہ ہم ایک دوسرے کے لئے قطعی اجنبی ہیں، اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ کیوں ڈولتی پھرتی ہوں۔''

''مجھے یقین تھا کہ تم ایک نہ ایک دن اس ازلی سچائی کو ضرور پا لو گی۔ میں یہ سب کچھ اپنی زبان سے کہہ کے تمہیں رنجیدہ نہ کرنا چاہتا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ زندگی میں پہلی بار ہم کسی بات پر متفق تو ہوئے ہیں۔ افوہ میں کتنا تنہا ہوں۔ اتنا تنہا کہ میرے کانوں میں خاموشیاں شائیں شائیں کرتی ہیں۔ ہم اتنے تنہا کیوں نہ ہوں؟ ہم ایک دوسرے سے قطعی اجنبی کیوں نہ رہیں؟ جب کہ ہماری روحیں اور جسم آپس میں اجنبی ہیں اور ایک دوسرے سے قطعی الگ الگ ہیں۔ ان کی ابتدا مختلف، ان کی انتہا مختلف۔ ہم سب تنہا ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ ہم سب کیوں اپنے اپنے مٹکے نہیں اٹھا لیتے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم تنہائی کی چبھن تو ذرا کند ہو جاتی ہے۔ آؤ ہم الگ الگ ہو جائیں۔ اگر چہ ہم دونوں کو اپنی بقایا عمروں کے لئے ایک ایک بازو سے محروم ہونا پڑے گا۔ لیکن قیمت کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ زور لگاؤ۔''

دونوں خوب زور لگاتے ہیں۔ کئی بانسوں والے نقلی چوکیداروں کے چہرے لگا کے ان کے ارد گرد موجود ہوتے ہیں۔ لوگ

دور کھڑے ہنستے رہتے ہیں مگر وہ ان سب سے بے پرواہ زور لگاتے رہتے ہیں اور آخر الگ ہو جاتے ہیں لیکن ان کا ایک ایک بازو کندھے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اکھڑ جاتا ہے۔ مرد زور سے مٹکا ہلاتا ہے اس کا تمام بدن پانی میں شرابور ہو جاتا ہے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کچھ دور جاتا ہے اور پھر جنگلے کی جانب مڑ جاتا ہے عورت دونوں بچیوں کو کھڑا کر کے ان کے سر پر ڈگڈگی بجانا شروع کر دیتی ہے اور ہانک لگاتی ہے" تازہ ککڑیوں کی مانند نرم و نازک۔"

ہجوم چلاتا رہتا ہے۔ نقلی چوکیدار بانسوں پر پھدکتے رہتے ہیں۔ سنہرے سر سوچتے رہتے ہیں۔ ڈگڈگی بجتی رہتی ہے اور ہانک لگتی رہتی ہے۔" تازہ ککڑیوں کی مانند نرم و نازک...... تازہ ککڑیوں کی مانند نرم و نازک۔"

OOO

حسرت کاسگنجوی

دھوکا

ایسا تو بہت دنوں سے ہو رہا تھا۔

چوہدری کرم علی سوچتے تو سوچتے ہی چلے جاتے تھے ایک حد ایسی آتی جہاں مایوسی کے جذبات دل و دماغ پر چھانے لگے تھے اور بے وزنی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی دل آہستہ آہستہ ڈوبنے لگتا بالکل غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرح۔ دل کے ڈوبنے کی ایک الگ ہی کیفیت ہوتی تھی کچھ بیزاری سی، کچھ غنودگی سی۔ چیزیں اپنے منفی پہلو کے ساتھ سامنے آنے لگتیں تو ان کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑنے لگتے تھے اور ذہن خواب کی حالت میں سوچنے لگتا۔

آج پھر کرم علی پر دل کے ڈوبنے کی کیفیت طاری ہوئی تھی۔

کیا کریں! کوئی بات ہی سمجھ میں نہیں آتی جتنے منصوبے بناتا ہوں سب کے سب آہستہ آہستہ ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ راہیں محدود اور مسدود ہوتی چلی جاتی ہیں۔ روشنی کا ایک دیا بھی نظر نہیں آتا زندگی سے مسلسل بیزاری۔ دل میں مسلسل ایک جلن، رونے کو دل چاہتا ہے لیکن رویا نہیں جاتا۔ کبھی کوئی بات کہنا بھی چاہتا ہوں لیکن کس سے کہوں مجھے تو ہر چہرہ میری طرح سوالی نظر آتا ہے۔ کون میری بات سنے گا؟ کون میرے مسئلے پر توجہ دے گا؟ عجیب زمانہ ہے کوئی کسی کی بات سننے کے لئے تیار نہیں یہ بے تعلقی، بے رخی، افراتفری، نفسانفسی شاید پہلے کبھی نہیں تھی۔ زندگی اب تو محض ایک وہم و گمان بن کر رہ گئی ہے۔

اب ہوگا کیا؟ وہ پھر سوچنے لگے بیٹی کی شادی کی عمر نکلتی جا رہی ہے۔ میں اتنا مجبور ہوں کہ اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں تین تین بچوں کی مائیں بن گئی ہیں۔ وہ اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ بار بار مسکراتی ہیں اور پھر مسکرائے ہی چلی جاتی ہیں یہ بات نہیں کہ چوہدری کو ان کا مسکرانا برا لگتا تھا بات یہ تھی کہ وہ ان مسکراہٹوں کو اپنی بیٹی کے حوالے سے دیکھتے تھے۔ شبنم کے چہرے سے مسکراہٹ جیسے مفقود ہو چکی تھی۔ معصومیت کی بجائے اس کے چہرے پر سختی سی آ گئی تھی۔ ہر وقت سنجیدہ چہرہ تنی ہوئی بھوئیں، تلخی اور سختی جیسے وہ ہر وقت اپنے دفتر میں بیٹھی ہے۔ مسکراہٹ اور خوشی کے تصور سے قطعی نا آشنا۔ وہ ضدی بھی ہو گئی تھی خواہ مخواہ ہر بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتی ہے۔ دوسروں کی بات نظر انداز کر دیتی ہے اس کی باتوں میں ایک تحکمانہ پہلو ہوتا تھا ہاں ماں باپ کے آگے اس کی نگاہیں خود بخود جھک جاتی تھیں۔ سنجیدگی اور احترام کے ساتھ وہ کچھ افسردہ سی ہو جاتی یہ روز کا معمول بن گیا تھا۔

آج کل کے تعلیم یافتہ طبقے کو سامنے رکھا جائے تو اس کی عمر اتنی زیادہ نہیں تھی کوئی تیس سال کی ہو گی وہ کیمسٹری میں فرسٹ کلاس فرسٹ ایم ایس سی تھی اس سال دواؤں کی ایک کمپنی میں اسے نوکری مل گئی تھی ترقی کرتے کرتے وہ چیف ڈگسٹ ہو گئی تھی۔ تنخواہ اچھی خاصی تھی۔ دفتر سے گاڑی ملی ہوئی تھی وہ سونے کی کوشش کرتے لیکن ان کی آنکھوں کے سامنے بیٹی کی شکل آ جاتی اور وہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ چودھرائن!'' وہ زور زور سے آوازیں دینے لگتے اور جب چودھرائن قریب آ جاتیں تو وہ ان کی طرف دیکھ کر کچھ بڑبڑاتے اور ہونقوں کی طرح دیکھتے وہ بہت کچھ کہنا چاہتے ایک چودھرائن ہی تو تھیں جو ان کی بات سکون سے سنتی تھیں اور تسلی دیتی تھیں۔ ان کا زیادہ وقت وظائف کے پڑھنے میں گزرتا تھا۔

پھر اسی قسم کی باتیں بار بار ہوئیں۔ چودھری کرم علی پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے بڑی عزت کمائی تھی کچھ پیسہ بھی پاس تھا۔ مکان کیا اچھی خاصی حویلی تھی۔ سوا ایکڑ زمین بھی تھی۔ شہر والے ان کا بڑا احترام کرتے تھے لیکن اب تو مسئلہ ہی کچھ اور تھا یہ بات تو ایسی تھی کہ وہ کسی کے سامنے ذکر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بھلا سوچو تو وہ اپنی بیٹی کے بارے میں گفتگو کا آغاز کس طرح کرتے۔ ان کے رشتہ داروں کی اپنی دنیا تھی وہ کرم علی سے ناراض تھے ان کے ایک رشتہ دار نے کہا تھا ان کا لڑکا لیتھ مشین پر مستری ہے کچھ دنوں کے بعد اپنا کارخانہ کھول لے گا وارے نیارے ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے رشتے دار نے کہا تھا چودھری تو

نے بہت غلط کام کیا۔ ہماری قوم میں لڑکیاں بس اتنا پڑھتی ہیں کہ خط پڑھ لیں تو نے کسی کی نہ سنی۔ پڑھا پڑھا کر بیٹی کو پہاڑ پر بٹھا دیا ہے برادری میں تو کوئی ہے نہیں اس کے معیار کا برادری سے باہر دیکھو۔ پھر ہمارے ہاں بیٹیوں کو نوکری کون کراتا ہے تو نے یہ بھی دیکھا یا۔ پھر آہستہ سے کہا بیٹا میرا ہے تو مزدور لیکن دیہاڑی اچھی ملتی ہے تیری بٹی کو سکھی رکھے گا۔ کپڑے لتے اور کھانے پینے کی کبھی کمی نہ ہونے دے گا۔ چودھری کرم علی یہ ساری باتیں سنتا ضرور تھا لیکن اس کے سارے بدن میں آگ لگ جاتی تھی وہ تڑپنے لگتا تھا وہ کوئی جواب دیتا تو اور بھی الجھ جاتا۔ خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتا تھا۔ اب بتاؤ ایسے رشتے داروں کا کیا فائدہ جو نہ علم کی قدر کر سکیں نہ معیار کے بارے میں سوچ سکیں۔

یوں چودھری کرم علی کو کوئی غم نہ تھا سوائے اپنی بٹی کے غم کے۔ بیٹی کا کوئی مناسب رشتہ نہیں آتا تھا۔ کئی کئی مہینے گزر جاتے گھر میں رشتے ناتے کی کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی شبنم نے اپنی زندگی کا اپنے معیار کے مطابق ایک روٹین بنالیا تھا اس پر وہ کار بند رہتی تھی۔ کبھی شادی کے بارے میں انہیں خیال آتا بھی تو وہ اس بات سے دل کو تسلی دے لیتی اس کی کئی سہیلیاں ایسی تھیں جو اس کی ہم جماعت بھی رہی تھیں ان کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ مختلف قسم کی نوکریوں میں مصروف تھیں آخر وہ بھی زندگی گزار رہی ہیں۔ لیکن چودھری کرم علی کے لئے یہ بات تسلی کی نہیں تھی وہ اس انداز سے سوچنے کے عادی نہیں تھے خیالات کے جھکولوں میں وہ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے تھے۔ ان کے بڑے بڑے ارمان تھے تمنا ئیں تھیں۔ ان کے لئے یہ مسئلہ بڑی الجھن کا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دوسروں سے اس کا بار بار ذکر کرنا مناسب نہیں ہے۔ وہ اس سلسلے میں چپ رہنے میں ہی عافیت سمجھتے تھے۔

ایک دن ایک دیہاتی سا شخص ان کے گھر آیا وہ اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ چودھری اسے نہیں جانتے تھے بہرحال چوہدری نے اسے بڑی عزت واحترام کے ساتھ بٹھایا۔ معلوم ہوا وہ ساتھ والے گاؤں کا چودھری ناصر علی ہے اور اپنے بیٹے کے رشتے کے سلسلے میں آیا ہے کرم علی نے اسے سر سے پیر تک نگاہ بچا کر کئی دفعہ دیکھا۔ نگاہوں میں تولا اس کی گفتگو اور رکھ رکھاؤ سے اندازہ لگایا نظر گھما پھرا کر دیکھا۔ بات کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ شبنم کی صحت اچھی تھی ہاں رنگ روپ کی بات الگ تھی۔ چودھری صاحب اس سلسلے میں خود کو تسکین دینے کے لئے دل ہی دل میں کہتے تھے جو رنگ روپ ہمارا ہے وہی بیٹی کا ہے وہ ہماری ہی تو بیٹی ہے اگر اس کی واجبی شکل صورت ہونا کوئی غلطی ہے تو وہ اس کی نہیں میری ہے اور اس کی سزا مجھے ملنی چاہئے۔

رشتوں کا جیسے کال پڑ گیا تھا اور جو لوگ آتے بھی تھے تو وہ چوہدری صاحب کی فلسفیانہ اور شریفانہ بات سنتے ہی نہیں تھے۔ اگر سن بھی لیتے تو کہتے چوہدری صاحب آپ کہاں ہیں اب آپ کا زمانہ نہیں رہا۔ دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے ہم نے بھی کبھی نہیں سوچا کہ لڑکی کا رنگ روپ کیسا ہے یہاں ماں باپ نے ہاں کر دی بس وہ پتھر کی لکیر تھی لیکن آج کل اولاد نے تو پر پرزے نکال لیے ہیں۔ وہ بڈی بوٹی نہیں دیکھتے وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ لڑکی دیکھنے سے آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں یا نہیں وہ جب آئے تو چراغوں کی روشنی گل ہوتی ہے یا نہیں۔

ایک محترمہ آئیں شبنم کو دیکھ کر انہوں نے ڈرامائی انداز اختیار کیا ناک بھوں سکیڑتے ہوئے بولیں میں تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ گھر میں چراغ جلانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ شبنم بلبلا اٹھی۔ انسانیت کی اس سے بڑی توہین اور کیا ہو سکتی تھی۔ سر سے پیر تک اس کے آگ لگ گئی یہ گائے بھینس کا سودا نہیں تھا ایک انسان کے بارے میں سنجیدہ گفتگو تھی۔ شبنم تو شبنم کوئی بھی ایسی بات سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ چودھرائن نے بھی بڑی شدت کے ساتھ اس توہین کو محسوس کیا۔ ایک تو گھر پر آیا ہوا مہمان اور وہ بھی رشتے کے سلسلے میں۔ صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئیں پھر بھی بولیں بہن کبھی آپ نے آئینہ نہیں دیکھا ہوگا؟ شبنم کے چہرے کی کیفیت بدل رہی تھی اس جواب پر اس کا جی چاہا کہ بڑھ کر ماں کا منہ چوم لے۔ اس میں حرارت سی آگئی۔ اس عورت کو میری توہین کرنے کی جرأت کیسے ہوئی ایک انتقامی ساجذبہ ابھرا۔ اس کا منہ سرخ ہو گیا وہ بڑی مشکل سے اتنا کہہ سکی وہ سامنے دروازہ کھلا ہوا ہے۔ بات تو چودھرائن نے بھی کھری کی تھی پھر بھی وہ بیٹی کی اس جسارت پر ہکا بکا رہ گئیں۔

چودھری کرم علی نے جب یہ داستان سنی تو ان کی آنکھیں بھیگ گئیں وہ بڑی دیر تک پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدتے

رہے۔ان کے دل میں ایک طوفان سا اٹھا ہوا تھا یہ ایک میری بیٹی ہی کا مسئلہ نہیں ہے یہ آج کا ایک عام مسئلہ ہے وہ سوچ کی گہرائیوں میں ڈوب گئے مرزا جی کی بیٹی پینتیس سال کی ہوگئی۔ان کے ہاں کوئی رشتہ شروع سے ہی نہیں آیا منشی جی کی بیٹی کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہے اور اب اس کے سر میں چاندی جھانکنے لگی ہے۔خان صاحب کی بیٹی نے تو شادی کا خیال ہی ذہن سے نکال دیا ہے اس نے اپنی تعلیم کی طرف توجہ دی اور اب بیسویں گریڈ میں پروفیسر ہے۔ظفر صاحب تو اس مسئلے پر سوچ کر مر گئے۔ان کی ایک بیٹی ایک دفتر میں افسر ہے دوسری بیٹی ڈاکٹر ہے۔یہ ساری باتیں ایسی تھیں جو چودھری کرم علی کے لئے ڈھارس تھیں اور وہ سوچنے لگتے تھے کہ وہ تنہا نہیں ہیں ان کے ساتھ اور بھی لوگ ہیں۔پھر خیال آتا اور لوگوں کی بات اور لوگ جانتے ہوں گے میرے لئے تو یہ مسئلہ عذاب ہے۔عذاب۔دل بیٹھنے لگتا ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے میں نے کوئی جرم کیا ہے اور دنیا مجھے دیکھ کر قہقہے لگا رہی ہے۔میں کیا کرسکتا ہوں۔یہ سوچتے سوچتے وہ اداس ہوجاتے۔لو بلڈ پریشر کی گولیاں کھانے لگتے۔

آپ کو میرے بارے میں کس نے بتایا۔چودھری نے یوں ہی پوچھ لیا۔

بتاتا کون آپ تو مشہور آدمی ہیں سب لوگ آپ کو جانتے ہیں آپ شریف آدمی ہیں یہ سوچ کر چلا آیا۔

''ٹھیک ہے۔مہربانی آپ کی لیکن بتایئے آپ کا بیٹا کیا کرتا ہے؟''

''کیا کرے گا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔پانچ سوا یکڑ زمین ہے۔زمین کی دیکھ بھال کرے گا۔''

''اس کی تعلیم وتربیت کے بارے میں بتائیں؟''

''ہاں......وہ بڑے فخر کے ساتھ بولے۔بہت پڑھ گیا ہے میٹرک کرلیا ہے اب کیا کرے گا زیادہ پڑھ کر۔بس کافی ہے۔''

چودھری کرم علی چپ ہوگئے۔گم سم سوچنے لگے۔دن پہ دن گزرتے چلے جارہے ہیں۔رشتے آتے ہی نہیں اگر منع کردیا تو کفران نعمت کے مترادف ہوگا۔جب رشتہ آیا ہے تو کچھ نہ کچھ سوچنا ضرور چاہئے۔اب بالکل ان پڑھ بھی نہیں ہے میٹرک پاس تو ہے۔زمین آباد کرلے گا تو بہت ہے ان کا دل کچھ نرم پڑنے لگا۔انہیں محسوس ہوا ممکن ہے ان کے مسئلے کے حل کا وقت آگیا ہے ان کے چہرے کی کیفیت کچھ بدلی۔پھر ان کا چہرہ آہستہ آہستہ پیلا پڑنے لگا۔شبنم نے اگر انکار کردیا تو کیا ہوگا۔وہ کیا اس رشتے کو منظور کرلے گی؟ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے کوئی غلط فیصلہ ہوگیا تو یہ میری زندگی کی بات ہے۔ساری زندگی عذاب میں گزرے گی شبنم کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کروں گا۔اس کشمکش میں بڑی دیر ہوگئی کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا۔پھر کرم علی اندر گھر میں گئے۔چودھرائن کو پوری تفصیل بتائی۔چودھرائن بھی چپ ہوگئیں۔شبنم شاید اس رشتے کو پسند نہ کرے۔چودھری کرم علی نے یہ بات سنی اور افسردہ ہوگئے پھر بولے۔

زندگی کا کیا بھروسہ،سوچتا ہوں اپنی زندگی میں ہی اس کے ہاتھ پیلے کردوں لیکن کوئی ڈھنگ کا رشتہ ہی نہیں ملتا یوں بیٹی کو بھاڑ میں تو جھونکا نہیں جاسکتا۔۔۔۔لیکن انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔آخر کیا کروں۔اگر عمر ڈھل گئی تو زندگی کی ساری امنگیں ختم ہوجائیں گی کرم علی نے سر کو جھٹک دیا یہ عذاب کی صورت نہیں تو کیا ہے؟ میں ناصر علی کو منع کردوں واپس کردوں۔

بات یہ ہے ناصر علی کرم علی بولے

''ہاں''

یہ رشتے ناتے تو خدا کے ہاں طے ہوتے ہیں ہم لوگ صرف کوشش اور جدوجہد کرتے ہیں۔ہمارے زمانے میں تو بڑی بوڑی دیکھتے تھے شرافت دیکھتے تھے۔بات اگر سمجھ میں آجاتی تھی تو ٹھیک ورنہ...... ٹھیک ہے چوہدری کرم علی لیکن ایک بات میری بھی سن لے،ناصر کا لہجہ خالص دیہاتی تھا وہ ایسے بے تکلفی سے باتیں کررہا تھا جیسے وہ کرم علی کو برسوں سے جانتا ہو۔

رشتے ہیں ہزار،میں تو تمہاری شرافت سن کر آگیا تھا۔خوب سوچ سمجھ لو لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ وقت سوچ بچار میں ضائع کیا جائے اور پھر آج کل کے لڑکے ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں۔جذباتی ہیں انہیں روکنا بڑا مشکل کام ہے۔ہاں تم سوچ لو میرا گھربار بھی دیکھ لو لیکن فیصلہ تمہیں بہت جلدی کرنا ہے میں عید کے چاند پر شادی کرنا چاہتا ہوں۔پتہ آسان ہے کسی سے بھی پوچھو گے تو وہ بتادے گا سب سے اونچی حویلی ہے میری۔

ناصر علی رخصت ہوئے تو چودھری کرم علی پھر سوچنے لگے پھر چودھرائن کو آواز دے کر بلایا۔ پھر اپنی بات دہرائی۔ بار بار چودھری کے کہنے پر چودھرائن نے کہا خدا کرے شبنم مان جائے لوگ کچھ برے نہیں لگتے چلو یوں کرتے ہیں پرسوں جمعہ ہے ہم دونوں ناصر علی کے گاؤں چلتے ہیں ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے بعد میں شبنم سے بات کرلیں گے۔ اور جب چودھری اور چودھرائن ناصر علی کے گاؤں پہنچے تو دیکھا ان کی حویلی سب سے اونچی تھی۔

ناصر علی بہت خوش ہوا۔ خاطر مدارت بھی خوب کی۔ چودھرائن عورتوں میں چلی گئیں نا جانے کیوں عورتیں باتیں کرتے کرتے کیوں ایک دم چپ ہو جاتی تھیں پھر سنجیدہ ہو جاتیں جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں لیکن کہہ نہیں پاتیں چودھری کرم علی اتنا خوش تھے کہ انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ اگر ناصر علی نے پھر بات چھیڑی تو وہ اس دفعہ ضرور ہاں کہہ دیں گے۔ پھر خیال آیا اگر شبنم نے انکار کر دیا تو بڑی بدنامی ہوگی پھر خود ہی دل کو سمجھایا شبنم ایسا نہیں کرے گی ہمت کرنے کی ضرورت ہے ورنہ ساری زندگی ایسا ہی رہے گا۔

دوپہر کا وقت ہو گیا۔ کرم علی پڑوس کی مسجد میں چلے گئے یہاں وہ بالکل نئے آدمی تھے ان کا کسی سے بھی تعارف نہیں ہوا تھا۔ نماز کے بعد کرم علی گھر آنے کی بجائے گاؤں کا جائزہ لینے کے لئے گھومنے لگے ایک برگد کے پیڑ کے نیچے چند لوگ باتیں کر رہے تھے حقہ رکھا ہوا تھا سب ایک ایک کرکے کش لگا رہے تھے۔ کرم علی بھی اسلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا۔

وہاں کسی نے ناصر علی کا نام لیا تو کرم علی کے کان کھڑے ہوئے

ناصر علی اچھا نہیں کر رہا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص نے کہا

ناصر علی ایسا ہے تو نہیں نہ جانے اس نے شہر کے کرم علی میں کیا دیکھا ہے؟ دوسرے آدمی نے کہا

اس دفعہ کرم علی اور بھی چوکنا ہو گیا اور نہایت غور کے ساتھ ان کی باتیں سننے لگا

ناصر علی کہہ رہا تھا کہ کرم علی بے حد سیدھا سادا آدمی ہے پھر اس کی بیٹی بہت زیادہ تنخواہ لیتی ہے۔

ہوگی! لیکن کہتے ہیں صورت شکل کی واجبی سی ہے اور عمر بھی کوئی تیس سال کی ہے"

واجبی کیا مطلب؟

بس ایسا ہے جیسے ہم اور تم۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے ہے تو دولت مند.....

ظاہر ہے۔

لیکن ناصر علی دین محمد کو کیا جواب دے گا اس کی لڑکی سے جو بات چل رہی ہے؟

ناصر علی جیسے آدمی کے لئے یہ کام مشکل نہیں

"مثلاً پہلا آدمی نے بہت آہستہ سے رازداری کے ساتھ پوچھا

دوسرے آدمی نے بتایا۔ کہنا نہیں۔ ناصر علی نے لڑکے سے کہا ہے کرم علی بے حد ضرورت مند ہے سیدھا سادا ہے جو کچھ سمیٹ سکتے ہو سمیٹ لینا اگر لڑکی تمہیں پسند نہ آئے تو دین محمد کی لڑکی کہیں گئی نہیں ہے۔"

چودھری کرم علی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پھر اس کا خون کھولنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا دل بیٹھنے لگا لیکن اس دفعہ دل میں بھی کرب ناک ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

ooo

حسن منظر

چمگادڑیں

مئی کی رات تھی جو نیپلز میں زیادہ سرد نہیں ہونی چاہیے تھی۔

ہم دونوں اور بچے دن بھر گھوم گھوم کر تھک گئے تھے اس لیے اندھیرا ہونے سے پہلے ہی اپنے ہوٹل آ گئے تھے۔ بچے کمرے میں آتے ہی مع موزوں، جوتوں اور گرم کپڑوں کے اپنے بستر پر گرے اور لیٹتے ہی غافل ہو گئے۔ ہمارا بھی ارادہ جلد سو جانے کا تھا لیکن نیند اتنی ہم پر حاوی نہیں تھی۔

چائے پی کر میری بیوی گھر خط لکھنے بیٹھ گئی۔ میں اُن البمز اور تصویروں کو دیکھ رہا تھا جو ٹورسٹس کے لیے تیار کیے جاتے تھے اور پر دیکھنے کی جگہ پر بکتے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ میری اپنی لی ہوئی تصویریں بھی تھیں جن کی پشت پر میں جگہ کا نام اور تاریخ لکھتا جا رہا تھا اور جن میں بیوی بچے شامل تھے، ان کے نام بھی۔

خط لکھتے لکھتے بیوی...... کیوں کہ ایک اکیلی وہی عورت تھی اس لیے اس کے لیے بجائے بار بار میری بیوی کہنے کے بیوی کہنا کافی ہوگا...... دم بھر کو رُکی اور کھڑکی تک گئی۔ وہاں کچھ دیر تک کھڑی سڑک کے پاس اس طرف دیکھتی رہی جدھر Meusitieri کا پیلا اور سفید بورڈ ایک لوہے کے پائپ پر کھڑا تھا اور اس کے برابر میں Credito Italiano کی عمارت تھی۔

میں نے اسے دیکھا اور اپنی لی ہوئی تصویروں کو سیکوئنس سے جمانے لگا۔

بیوی ایک خط ختم کر کے دوسرا لکھ رہی تھی۔ دوبارہ اس نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ انگلیاں چٹخائیں اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس دفعہ وہ زیادہ دیر وہاں کھڑی رہی اور مرجھائی ہوئی سی وہاں سے لوٹی۔

جب تیسری بار اس نے یہ حرکت کی اور فکرمندی سے وہاں سے لوٹی تو میں نے کہا، ''یہ کیا تم بار بار کھڑکی پر جاتی ہو۔ لگتا ہے دال میں کچھ کالا ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے ہنس کر کہا، ''ہے تو سہی۔''

''اگر اسی طرح کرتی رہیں تو کوئی اٹیلین ڈینڈی (Dandy) بیلوں کے سہارے چڑھ کر ابھی ہمارے کمرے میں آ دھمکے گا۔''

ہماری شادی اتنی پرانی نہیں ہوئی تھی کہ آپس میں ایک دوسرے پر مصنوعی شک شبہ کے چھینٹے نہ اڑاتے ہوں۔ شادی کے ایک سال بعد جب وہ کہیں گئی تھی اور اس کا مختصر سا انتظار مجھے کھل رہا تھا، میں وہ کتاب لے کر لیٹ گیا تھا جو وہ پڑھ رہی تھی۔ اس کے آنے پر میں اس کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ پھر میں نے چونک کر کہا، ''ارے یہ اس میں کیسا پرچہ ہے!''

اس نے میری بات میں دلچسپی نہیں لی اور بولی، ''ہوگا کوئی، نشان کے لیے رکھ دیا ہوگا۔''

میں نے وہ پرچہ کھولا اور پڑھنے لگا اور بولا، ''تمھارے نام خط ہے۔''

وہ چونکی۔

میں نے پڑھنا شروع کیا، ''ڈیئر...... امید ہے ٹھیک ہوگی۔ میں تو تمھیں ہر دم یاد کیا کرتا ہوں، کبھی تم بھی مجھے یاد کرتی ہو؟''

اس کا جسم تن گیا اور اس نے میرے ہاتھ سے پرچہ لینا چاہا۔ خط اسی کے نام تھا لیکن بغیر لفافے کے اور نیچے ایک نام تھا جو شادی کے فوراً بعد کے دنوں میں اور بہت سے ناموں کے ساتھ میں نے اس کے منہ سے سنا تھا۔ ہماری ساتھ کی نبیلہ گاتی اچھا تھی۔ ٹونی ماؤتھ اورگن بجاتا تھا، سعیدہ اشرف پوزیشن لیتی تھی، یوسف گاجر لڑکیوں کے آگے پیچھے پھرا کرتا تھا اور اس کے لیے نوین کہتی تھی، ہمارے بچوں کا ماموں ہے، اور مارگریٹ معاشقے لڑانے میں ماہر تھے، یہ نام بھی انہی میں سے ایک کا تھا، ''تمھارا

ج۔خ۔"
اس کا جسم کا تناؤ ختم ہو گیا اور ایک جھپٹے میں خط میرے ہاتھ سے لے گئی۔ پھر اس نے کرسی پر بیٹھ کر بڑی معصومیت سے پوچھا "ج۔خ کون؟"
میں نے کہا، "اتنی جلدی بھول گئیں بے چارے کو۔"
اس نے کہا "ایسی باتیں کرتے تمھیں شرم نہیں آتی۔"
میں نے کہا، "شرم کیوں آئے۔ مجھے تو فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ایسی لڑکی سے شادی کی ہے جس کے میرے سوا اور بھی دعوے دار تھے۔ کسی گری پڑی سے شادی نہیں کی ہے۔"
شادی کے بعد کا وہ دورا بھی ختم نہیں ہوا تھا۔
ایک بار پھر وہ کھڑکی کے پاس پٹ کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ میں نے تھوڑی اونچی آواز سے کہا، "کون ہے؟"
اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا، ہونٹوں پر انگلی رکھی اور مجھے وہاں آنے کا اشارہ کیا۔ سڑک خاموش تھی۔ دونوں رُخ کچھ بونے سے پیلے درخت کھڑے تھے۔ کریدیتوا تالیہ نو اسی بلڈنگ میں گراؤنڈ فلور پر تھا جس میں اوپر تین منزلیں تھیں اور ہر ایک میں کھڑکیوں میں سے روشنی نظر آ رہی تھی لیکن پردے کھنچے ہونے کی وجہ سے مردہ سی تھی۔ بلڈنگ کا ایک رُخ ہمارے ہوٹل کے سامنے تھا۔ دوسرا وہ رُخ جو چوڑی سڑک پر تھا اور جہاں زیبرا کراسنگ تھی اور ٹریفک لائٹ نصب تھی۔
عین Meusillieri کے پاس ایک عورت کھڑی تھی۔ اس کا کوٹ سلیٹی رنگ کا تھا، رات ٹھنڈی تھی اور وہ شفاف اسٹوکنگز پہنے ہوئی تھی جو سردی کو کیا روکتے ہوں گے۔ دیکھا جائے تو پیر گھٹنوں تک ننگے تھے۔ جوتے سفید رنگ کے تھے۔ شاید خود کو گرمی پہنچانے کے لیے وہ سگریٹ پی رہی تھی۔
ہم کھڑکی سے ہٹ آئے۔ بیوی نے کہا، "دو گھنٹے سے میں اس بے چاری کو دیکھ رہی ہوں۔ آہستہ آہستہ چل کر پاستا کوفی شوپ اور کنفیکشنری تک جاتی ہے اور واپس آ جاتی ہے۔"
ہم صوفے پر بیٹھ کر اس کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا "زیادہ عمر کی کوئی کنواری سی عورت لگتی ہے۔ لڑکی کہنا غلط ہوگا۔ شاید نائٹ واکر ہے۔"
بیوی نے میری طرف مجروح نظروں سے دیکھا اور کہا، "ہو سکتا ہے جس کا انتظار کر رہی ہے نہ آیا ہو۔ کوئی سیلر یا بوئے فرینڈ۔"
میں نے کہا، اتنی دیر عاشقی میں کوئی نہیں لگاتا، نہ آنے والا، نہ انتظار کرنے والا۔"
اس نے کہا "والی۔"
میں نے بھی ہنس کر کہا، "والی۔"
عورت تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ بیوی نے کہا "پیسے ہوتے تو کوئی شاپ ہی میں چلی جاتی۔" پھر اس نے اچانک کہا "جائیے اسے بلا لائیے۔"
میں ہکا بکا رہ گیا۔
"کس لیے؟"
"بس اس سے بات کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ اتنی سخت سردی ہے۔ اسے کوفی پلاؤں گی۔"
جب میں اس پر راضی نہیں ہوا تو وہ بولی، "آپ نہیں جائیں گے تو میں جا رہی ہوں۔ آخر کو وہ بھی عورت ہے، میری ہم جنس۔"
میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا نہیں۔ وہ اپنا کوٹ پہن چکی تھی اور سر اسکارف سے ڈھک رہی تھی۔ میں نے دروازے کے پاس پہنچ کر کہا، "تم جاتو۔ اگر اس نے مجھے پھنسالیا تو تم ذمے دار ہوگی۔ مجھے کچھ مت کہنا۔ مجھ میں مردوں والی کمزوری ہے۔"

اس نے سینے کے سامنے ہاتھ لا کر انگلیوں سے مجھ سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔
میں کمرے سے باہر نکلا۔ تیسری منزل تک سیڑھیاں ہی کتنی ہوتی ہیں۔ میں نے لفٹ نہیں لی اور جب سڑک پار کر کے بس اسٹوپ کے پاس پہنچ کر اوپر اپنے کمرے کی طرف نظر دوڑائی تو دیکھا بیوی کھڑکی کے پٹ سے لگی کھڑی تھی۔ مجھے اس پر ہمیشہ تعجب ہوا ہے گھریلو عورتیں ان بغیر شوہر، جنس کے کام میں آنے والی، عورتوں میں کتنی دلچسپی رکھتی ہیں۔ ہمارے یہاں ایک زمانہ تھا جب ایسی عورتوں سے گھر کی عورتیں پردہ کرتی تھیں لیکن استعجاب جب بھی رکھتی تھیں کہ اندر سے کیسی ہوتی ہیں۔
میرا خیال ہے، جن جن ملکوں میں عورتیں جنگیں لڑتی تھیں، کھیت جوتتی تھیں اور مرد گھر میں بچوں کو کھلاتے تھے، کھانا پکاتے تھے وہاں اگر ایسے بازاری مرد تھے جو ایک محدود علاقے میں رکھے جاتے اور راتوں کو سڑکوں پر ان اسٹریٹ واکرز کی طرح گھومتے تو گھریلو مردوں کو بھی ان میں دلچسپی ہوتی کہ ان کی روح کیسی ہوتی ہے، باتیں کیسی کرتے ہیں، کیا کھاتے ہیں، کیا پیتے اور پہنتے ہیں اور اپنی بیویوں سے کن چیزوں کی فرمائش کرتے ہیں۔
اس قسم کی عورت سے بات کرنے کا میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ مجھے پاس آتے دیکھ کر وہ رک گئی اور غالباً اس نے کہا "Good Evening Sgnore"۔
میں نے بھی کہا "Good Evening Sgnore"۔
پھر میں نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالتے ہوئے کہا "سمندر کی ہوا چل رہی ہے، بڑی ٹھنڈی رات ہے۔"
اس نے کہا "Is it، کوئی خاص ٹھنڈی نہیں۔ آپ کسی گرم ملک کے لگتے ہیں۔"
تمام پورٹس میں سمندر کے نزدیک بسنے والوں اور سیلرز کی طرح اس کی زبان بھی مختلف زبانوں کا بھان متی کا کنبہ تھا۔ وہ اپنا مطلب دنیا کے ہر شخص کو سمجھا سکتی تھی۔ چند ہی لمحوں میں بڑی آسانی سے میں بھی وہی عالمی زبان بول رہا تھا۔
میں نے اسے سگریٹ دی، ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبائی، پہلے اس کا پھر اپنا سگریٹ سلگایا اور پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہاں وہ سایہ جوں کا توں تھا۔
کچھ دیر اس کے ساتھ ساتھ میں بھی Banca Nazionale Del Lovre کے نیچے پاستا کوفی شوپ کے سامنے سے چل کر Meusilieri کے بورڈ تک گیا اور واپس پلٹا۔ یہ میں نہیں کہوں گا میں صرف ڈر رہا تھا، اندر سے ایک جوان اٹالین سفید عورت کے ساتھ ٹہلنے میں خوشی بھی محسوس کر رہا تھا۔ سڑک کے کنارے پر کچھ کاریں کھڑی تھیں جو تقریباً سب کی سب اٹلی کی تھیں۔ چھوٹی بڑی لیکن ایک ہی خاندان کی۔
میں نے اس سے کہا، "ایک گھنٹے کے لیے میرے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں چل سکتی ہو؟"
اس نے کہا "Si" اور بغیر حساب لگائے کہا، "ایک گھنٹہ یا ایک رات سب کے چارجز ایک ہی ہیں...... اور پیشگی۔"
میں نے کہا "کتنے؟"
اس نے ایک معمولی سی رقم بتائی اور ایک بار پھر اس نے کہا، "ایک گھنٹہ یا ایک رات، یہ تم پر ہے۔"
میں نے جیب سے پرس نکال کر نوٹ گنے جو انتہائی غلیظ تھے اور جنھیں سیلوفین سے جوڑا گیا تھا۔ وہ رقم بمشکل اتنی تھی کہ اس میں بیوی اور میں ایک وقت کا معمولی کھانا کسی درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں کھا سکتے تھے۔ پھر میں نے اس سے کہا "This way please"۔
اس نے کہا "سینور" اور میرے ساتھ ساتھ چل پڑی۔ میں نے نیچے سے ایک فتح مندانہ نظر بیوی پر ڈالی۔ جب ہم ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں پہنچے تو وہ خود بخود ادھر مڑ گئی جدھر لفٹ تھی۔ کچھ لوگ ادھر ادھر میزوں پر بیٹھے تھے۔ انھوں نے ہمیں بغیر دلچسپی کے دیکھا اور پینے اور اپنی باتوں میں مصروف رہے۔ میں نے خود کو پرُسکون محسوس کیا اور لفٹ کے اسٹارٹ ہو جانے پر میں نے اس سے کہا۔
"اوپر میری بیوی بھی ہوگی۔"

''ازاٹ؟''(?Is it)اس کی بھنویں اوپر کو اٹھیں۔ پھر اس نے کہا''ڈزنوٹ میٹر''(Does not matter)۔اس سے کیا فرق پڑتا ہے جب تم ادا کررہے ہو۔''

بیوی نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور بیٹھنے کو کہا۔ کچھ دیر تک نہ بیوی کی سمجھ میں آ رہا تھا کیا کہے، نہ میری۔ عورت صوفے پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے ہاتھ پیٹ کے نچلے حصے پر رکھ لیے تھے اور شکل سے لگ رہا تھا بہت تھکی ہوئی ہے۔ اسے میں صرف 'عورت' کہوں گا 'وہ عورت' نہیں کیوں کہ وہاں کوئی اور بے نام عورت نہیں تھی۔ بیوی تھی، عورت، میں اور سوئے ہوئے بچے۔ بیوی نے مجھ سے روم سروس کو بیل دینے کے لیے کہا اور جب ویٹر آیا تو اس نے کہا۔

''کوئی فورتھری۔'' عورت سے پوچھا''چکن سیں دوچز ول بی اول رائٹ؟''

عورت نے کہا"Gracias Signora"

"A big plate of sandwiches" بیوی نے کہا۔

ویٹر''سی سنورا'' کہہ کر چلا گیا۔

لگتا تھا عورت کا دماغ ماؤف ہے۔ پتہ نہیں اس انوکھی سچویشن پر یا سردی کی رات میں تنہا دو گھنٹے سڑک کے ایک ٹکڑے پر پہرہ دینے کی وجہ سے جس طرح کسی اہم جگہ کے سامنے سپاہی جولا ہے کی نلکی کی طرح ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر چلتے رہتے ہیں اور کسی آنے والے کو چیلنج بھی کرتے ہیں،"Halt, Who comes there"۔

روم میں ایک رات جب میں اکیلا گھومنے کو نکلا تھا کیوں کہ بیوی تھکی ہوئی تھی، ایک عورت نے مجھے عربی میں چیلنج تو کیا تھا، ''ہیلوحبیبی'' اور پھر فوراً"Helo Love" پر آ گئی۔

یہ بھی صرف اتنا ہی کسی راہ گیر کو روکنے کے لیے کہتی ہوگی اور اس کے گزرے چلے جانے پر پھر پہرہ دینے لگتی ہوگی۔

میں نے کہا ہے اس کا دماغ ماؤف سا لگتا تھا لیکن وہ گھبرائی ہوئی نہیں لگتی تھی۔ وہ جہاں بھی لے جائی جاتی ہوگی یہ سوچ کر نہیں جاتی ہوگی وہاں کیا دیکھنے کو ملے گا، جگہ کیسی ہوگی، لے جانے والا کیسا ثابت ہوگا۔ صفائی ستھرائی، جسم کی باکچین، شائستگی، بے تہذیبی اس کاروبار میں کوئی مقام نہیں رکھتے ہیں۔ وہ میرے ساتھ اس طرح چل پڑی تھی جیسے میں کسی حمال سے سامان اٹھا کر ساتھ ساتھ آنے کو کہوں اور وہ خاموشی سے چل پڑے۔''اس سے کیا فرق پڑتا ہے جب تم ادا کررہے ہو'' میں سب کچھ آ گیا تھا۔

جب کوفی آ گئی تو بیوی نے پہلی پیالی بنا کر اس کی طرف بڑھائی۔ عورت نے کچھ ایسی بات کہی جس کا مطلب ہوگا پہلے تم۔

بیوی نے انگلش میں کہا''نو یو نیک فرسٹ یو آر دی گیسٹ۔''

''گیسٹ؟ وات از دیت؟''

میں نے کہا''جس طرح کوئی کسی سے ملنے جائے تو وہ اس کا گیسٹ ہوگا۔''

اس نے پیالی لے کر کہا''اوآئی سی۔ تھینک یو سنورا۔''

پھر بیوی نے اس کے سامنے سینڈوچز کی پلیٹ پیش کی۔ اس دفعہ اس نے تکلف سے کام لیا اور سینڈوچ اٹھا اٹھا کر شائستگی سے کھانے لگی۔

شرما حضوری میں ہم دونوں نے بھی ایک ایک سینڈوچ اٹھا لیا اور اس کو بار بار، ایک اور، ایک اور کا اشارہ کرتے رہے۔

بیوی نے کہا''رات ٹھنڈی ہے۔ تمھیں وائن کی خواہش ہوگی، لیکن ہم دونوں پیتے نہیں ہیں۔ تمھارے لیے منگوائیں؟''

اب اس کے چہرے پر گلابی رنگ لوٹ آیا تھا اور اتنی زیادہ عمر کی بھی نہیں لگ رہی تھی۔

اس نے کہا''نو۔ نو''

ٹشو پیپر سے ہونٹ پونچھ کر وہ ڈھیلی ڈھالی ہو کر صوفے کی پشت سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ اب اس میں وہ تشنج نہیں تھا اور ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان وہ کیوں تھی، لگتا تھا اس میں اسے دلچسپی نہیں ہے۔

'بازاری عورت سے زیادہ مظلوم ہستی دنیا میں نہیں ہے' یہ بات میں نے بیوی سے ہزار بار کی تھی اور اپنے ملک میں جب

کی آب و ہوا ہے، ایسے پتّل دنیا میں کہیں نہیں ہوتے ہیں۔ میں نے کہا "ہم سنتے تھے روم ایک دن میں نہیں بنا تھا (اس کی بھنویں اوپر کو اٹھیں) اور اسے دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں اگر محاورے کو یوں بھی کر لیا جائے کہ ایک صدی میں نہیں بنا تھا تو بھی درست ہوگا۔"

وہ ہماری موم کو پگھلانے والی باتیں بغیر کسی تاثر کے سنتی رہی۔ "روم، ناپولی، وسوویس۔"

ایک بار اس نے تعجب سے کہا "تم نے سارا ملک دیکھا ہے؟"

بیوی نے کہا "تھوڑا سا۔ اور تم نے؟"

"تھوڑا سا" اس نے بھی بیوی کی زبان میں کہا۔

ہم اس کے بارے میں کوئی سوال جان بوجھ کر نہیں کر رہے تھے کہ اسے تکلیف ہوگی ورنہ میرا تو شنیدہ تجربہ تھا اس بازار میں جس کی وہ جنس تھی، ہر جانے والے کو توقع ہوتی ہے جو خرچہ اس نے اپنے مقصد کے لیے کیا ہے، اس میں اس عورت کی کہانی بھی لبھاؤ میں ہاتھ آ جائے۔ یہ بھی ایک عجیب لذت کوشی ہے۔ لگتا ہے کہانی سن کر خریدار اسے بازار سے اٹھا کر گھر کی دنیا میں پہنچا دے گا۔

وہ اٹھی اور بیڈ تک چل کر گئی جس پر بچے سو رہے تھے۔ کچھ دیر انھیں غور سے دیکھتی رہی۔ پھر ایک کے ہونٹوں پر آہستہ سے اس نے اشارے کی انگلی رکھی اور اسے چوما، پھر دوسرے کے ساتھ یہی کیا۔ بیوی اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"یہ بیٹا ہے۔"

"آئی نو۔ Figlio"

"یہ بیٹی ہے۔"

"آئی نو۔ Figila" اس نے سر ہلا کر کہا۔

پھر اس نے وہیں ایک طرف پڑے ہوئے پون شو Poncho کو اٹھایا جو بیوی ان دنوں بن رہی تھی اور جس میں بننے کی تیلیاں آخری گھروں میں آ کر رک گئی تھیں۔

عورت نے کہا "یورز؟"

بیوی نے بیٹی کی طرف اشارہ کر کے کہا "ہر۔"

ایک دم اس کا چہرہ جیتا جاگتا چہرہ بن گیا۔ میں ہمیشہ کی طرح جب دو عورتیں، عورتوں کے شوق کی باتیں کر رہی ہوں۔ ان سے الگ تھلگ صوفے پر بیٹھا تھا۔ ان باتوں کو میں بیوی سے عورتوں کی سی باتیں کہتا ہوں اور وہ کہتی ہے تو کیا پھر مردوں کی سی باتیں کریں۔

پھر اس نے ایک ایک کر کے دونوں کے نام پوچھے۔

بیوی نے پوچھا "تمھارا نام؟"

"سلواتا۔"

وہ آ کر پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

اب کچھ ذاتی باتیں شروع ہوئی تھیں اور مجھے امید تھی ہم اس کے دل کی تھاہ لے سکیں گے کہ اسے اٹلی اور ویٹیکن سے کچھ عقیدت تھی یا نہیں۔ کیا وہ بھی اپنے ملک کے ماضی پر فخر کرتی تھی۔ لیکن زبان سے ناواقفیت کی بنا پر ہماری گفتگو میں خاموشی کے

وقفے طویل ہوتے گئے۔ ظاہر ہے ایسے موضوعات کے لیے اس کی جنس فروخت کی زبان نہیں بنی تھی۔

بالآخر اس نے مجھ سے پوچھا "میں جاسکتی ہوں؟" یہ کہہ کر اس نے اپنا لمبا کوٹ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

بیوی نے کہا "جانے کی جلدی کیا ہے۔ ہم دیر سے سوتے ہیں۔ کہاں جاؤ گی؟" آخری بات بے ارادہ تھی۔

اس نے کہا "ہوم۔"

ہوم کیا ہے یہ پوچھنے کی ہم دونوں کی ہمت نہیں ہوئی۔

بیوی نے کہا "ایک اور کپ کوفی؟"

اس نے کہا "نو تھینک یو۔"

پھر بیوی نے جیسے خود کلامی میں کہا "رات کو اندھیرے میں سڑکوں پر اکیلے کھڑے رہنے میں تو ڈر ہوتا ہوگا۔"

اس نے کہا "پاؤرا؟" (Paura)

"اندھیرے کا ڈر۔" بیوی نے کہا۔

اس نے ہنس کر کہا "چمگادڑیں اندھیرے میں نہیں ڈرتی ہیں۔ میں چمگادڑ ہوں۔ ہم چمگادڑیں ہیں۔"

بیوی جھٹکا کھا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ ہمیشہ سے چمگادڑ سے ڈرتی ہے۔ جیسے ہر چمگادڑ ویمپائر ہو۔

میں نے کوٹ پہننے میں اس کی مدد کی۔ بیوی اسے چھوڑنے کو لینڈنگ تک گئی۔ اس اندھیرے نے سمندر میں وہ اسے واپس بھیج رہی تھی۔

میں اس کے ساتھ سڑک تک گیا جہاں اسے ہم نے ٹہلتے دیکھا تھا۔

میں نے اسے آخری سگریٹ پیش کیا۔ کش لے کر اس نے "تھنک یو" کہا۔

گڈ نائٹ کہہ کر میں جب کمرے میں پہنچا تو توقع کے مطابق میں نے دیکھا بیوی کھڑکی پر کھڑی ہے۔ اتنی دیر وہ اسے اور مجھے دیکھتی رہی تھی۔

میں نے کہا "تم میری نگرانی کر رہی تھیں لیکن یاد رکھو بہت سے برس کسی نے میری نگرانی نہیں کی تھی۔ ان آوارہ گردی میں گزارے ہوئے سالوں کا تم کیا کرو گی؟"

اس نے سڑک پر آخری نظر ڈال کر کہا "گنی۔"

وہ جذبات کے رکے رہنے سے میرے سامنے تھک کر بیٹھ گئی۔ میں سوچ رہا تھا جو ٹورسٹ اپنی سیاحی کے مقام کی طوائفوں اور گرے پڑے لوگوں کو نہیں دیکھ سکا ہے، اس نے اس ملک کا کچھ بھی نہیں دیکھا۔ بیوی مرے مرے قدموں سے چل کر بچوں کے بیڈ تک گئی اور پون شو اٹھاتے ہوئے ایک دم اچھل پڑی۔ وہاں پون شو کے نیچے سے جھانکتے ہوئے نوٹوں کو اس نے نکالتے ہوئے کہا "یہ۔ یہ۔ یہ......"

ہم بے وجہ تیزی سے کھڑکی پر پہنچے اور نظروں سے اسے اندھیرے میں ڈھونڈا جو زیادہ گہرا ہو چکا تھا لیکن وہ سلطنت رومہ میں گم ہو چکی تھی۔

OOO

ذکاء الرحمن

موجود کی ایک بلا ل رات

پھیلی ہوئی ان گنت اور بکھری ہوئی بےانت اور پڑی ہوئی لاتعداد روحیتی اشیا میں سے ایک روحیتی شے ہوں، اور بے نشان ہوئے بغیر بے نام ہوں اور ایک ہوئے بغیر کئی ہوئی اور کئی ہوئے بغیر ایک ہوں، اور میں اَن گنت اور بے اَنت اور لاتعداد اور بےنشاں بے نام اور ایک اور کئی، آفاق کی منزل سے لُٹ کر نکلی ہوئی، تلاش میں نکلی ہوئی ہوں۔

کوئی چہرہ نبی جیسا، یا کوئی لمحہ نزول جیسا، یا کوئی نزول کپکپاہٹ جیسا، یا کوئی کپکپاہٹ کالی چادر میں لپٹی ہوئی جیسی، یا کوئی زمین یثرب جیسی، یا کوئی جنگ بدر جیسی، یا کوئی مدد انصار جیسی، یا کوئی وحی اقرار جیسی یا کوئی نعرہ منصور جیسا، یا کوئی خدا خدا جیسا، یا کوئی مقابل ابلیس جیسا، یا کوئی خیال انسان جیسا، یا کوئی غلام آقاؤں جیسا یا کوئی بسر جہانداروں جیسا، یا کوئی سرمایہ مائیگی جیسا، یا کوئی افلاس قارون جیسا، یا کوئی طبقہ سب طبقوں جیسا، یا سب طبقے ایک طبقے جیسے یا کوئی سابق اول جیسا، یا کوئی اوّل سابق جیسا۔

آفاق کی منزل سے لُٹ کر نکلی ہوئی تلاش میں نکلی ہوئی ہوں۔

تلاش میں نکلی ہوئی ایک روحیتی شے ہوں۔

مجھے میری تلاش کا حاصل دو...... مجھے میری تلاش کا حاصل دو...... مجھے میری تلاش کا حاصل دو......

تم جمع کے صیغے اور تم تثنیہ کے صیغے اور تم واحد کے صیغے، تم میری صدا سن کر خاموش ہو؟ تم میری صدا سن کر کیوں خاموش ہو؟......تم جمع کے صیغے اور تم تثنیہ کے صیغے اور تم واحد کے صیغے......تو لو! تم خاموش رہو، میں اب احد کے صیغے میں صدا لگا رہی ہوں:

مجھے میری تلاش کا حاصل دے...... مجھے میری تلاش کا حاصل دے...... مجھے میری تلاش کا حاصل دے......

آفاق کی منزل سے لُٹ کر نکلی ہوئی، تلاش میں نکلی ہوئی ہوں۔

تلاش میں نکلی ہوئی ایک روحیتی شے ہوں......ان گنت اور بےانت اور لاتعداد اور بےنشان بے نام اور ایک اور کئی......

احد کا صیغہ، اپنے احد کے صیغے میں بھیجتا ہے مجھ کو اور وہ احد کا صیغہ غار کے بےکواڑ دروازے پر مجھ سے کہتا ہے: تلاش کا حاصل چاہتے ہو تو روح کے بدن میں آؤ، اور ان گنتی سے گنتی میں آؤ اور بےانت سے انت میں آؤ اور لاتعداد سے تعداد میں آؤ، اور بےنشان سے نشان میں آؤ اور بے نام سے نام میں آؤ۔ اور موضوع سے معروض میں آؤ اور بے وحی کتاب لکھو تو اس وحی لگن سے لکھو کہ بیٹی کا مرنا بھول جاؤ اور پیش قدمی کرو تو اس یقین سے کرو کہ جنگل کے جنگل اور پہاڑ کے پہاڑ اور دریا کے دریا اور دلدلیں تمہارے لئے چھ ہزار میل لمبا راستہ تراشتی چلی جائیں اور اپنے آفاق کی جنگ لڑو تو اس بے مایہ شاعری سے لڑو جو آواز سے تیز اڑنے والے جیٹ طیاروں کو مار گراتی ہے اور انسانی محبت کی ریاضی کے تحفظ کے لئے کھڑے ہو تو یوں کھڑے ہو کہ تمہارا اسی سالہ بڑھاپا پسِ دیوارِ زنداں بھی انسانی محبت کی ریاضی کا عدد چیختا رہے......تم سینوں میں سجا ہوا دکھ ہو، اور روحوں میں اترا ہوا غم ہو، اور آنکھوں میں رچا ہوا کرب ہو...... یہی تمہارے نام ہیں اور یہی تمہارا نام ہے...... جاؤ اب اپنی تلاش کا حاصل تلاش کرو۔

میں اپنے یہ نام لے کر اور اپنا یہ نام لے کر چل پڑتی ہوں۔

لاموجود اور موجود کی چیکنگ پوسٹ پر میری چیکنگ ہوتی ہے اور پھر پاسپورٹ دینے والا مجھے یہ پاسپورٹ دیتا ہے کہ اس روحیتی شے کے سینے میں حوصلہ ہے اور جگو ے میں سکت ہے، لہٰذا اس روحیتی شے کو تذکیر کا جسم پہنا کر جانے دیا جائے......اس کو جانے دیا جائے کہ یہ عشق کے الوہی صفر سے جلاوطن کیا ہوا عدد نہیں ہے اور یہ لا انتہا کی لامتناہی ریاضی سے واقف ہے جس

میں ایک عذاب عشق دو ثواب عشق کے برابر ہوتا ہے اور دو ثواب عشق تین ثواب عشق کے مساوی ہوتے ہیں اینڈ سو آن اینڈ سو فورتھ...... اس کو جانے دیا جائے کہ یہ جب لاموجود سے موجود میں داخل ہوگا تو موجود کی گلیوں میں گریباں چاک نکلے گا...... گریباں چاک نکلے گا اور کبھی کنارے وجود پر اترنے والے چاند سے باتیں کرے گا اور کبھی دشت کے غزالوں سے ویرانوں میں کھوئے ہوؤں کا پتہ پوچھے گا، اور کبھی مکاں کو ایک ٹھوکر سے زماں کردے گا۔ اور کبھی زماں کو چوم کر لازماں بنالے گا اور کبھی انا کی دار پر اپنا لہو اپنے چہرے پر ملے گا اور کبھی انکسار کی خاک پر ابوذر کی شباہت دے گا...... اس کو جانے دیا جائے...... اس کو جانے دیا جائے......

پس میں اپنا نام اور اپنا پاسپورٹ لے کر موجود کی معروضی حدود میں داخل ہو جاتا ہوں اور بے شک کہ موجود کی معروضی حدود ایک دبیز پرتوں والی اور گہری گہرائیوں والی رات کی پُرہول لپیٹ میں ہیں اور اس دبیز پرتوں والی اور گہری گہرائیوں والی رات کی پُرہول لپیٹ پر فلوریسنٹ ٹیوبز کی گوری لائٹس حکمران ہیں...... میں موجود کی شب وار اور معروضی حدود کے نورزم ڈپارٹمنٹ کے بک اسٹور سے ایک سیاحتی کتابچہ خریدتا ہوں اور سائیٹ سی انگ پر روانہ ہو جاتا ہوں۔
سمندر شہر کی یہ کولتار، چوڑی سڑک جس کے فٹ پاتھ پر میں چل رہا ہوں ٹریفک سے بھری ہوئی ہے اور یہ سارا ٹریفک شب رنگ انسانوں پر مشتمل ہے اور فلوریسنٹ ٹیوبز کے روبوز ان شب رنگ انسانوں کو مشینوں کی طرح ڈرائیو کر رہے ہیں...... شب رنگ انسانوں کے سر، ان فلوریسنٹ ٹیوبز کے روبوز کے اسٹیئرنگ وہیلز ہیں اور بازو گیئرز ہیں اور آنکھیں ہیڈ لائٹس ہیں اور ٹانگیں پہیئے ہیں، اور سینے نمبر پلیٹس ہیں...... فلوریسنٹ ٹیوبز کے روبوز، ان شب رنگ انسانی مشینوں پر سوار اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹل سٹورز کی طرف اور اپنے اپنے مینوفیکچرنگ پلانٹس کی طرف اور اپنے اپنے ایڈمنسٹریٹو آفسز کی طرف جارہے ہیں...... اور یہ ایک بے ستارہ رات ہے اور بے چاندرات ہے...... اور میں اس بے ستارہ اور بے چاندرات میں، سمندر شہر کی اس کولتار، چوڑی سڑک پر چلتا ہوا، اُس آڈیٹوریم کی طرف جارہا تھا، جہاں سیاحتی کتابچے کی معلومات کے مطابق ایک کلچرل شو، ہر لحہ جاری رہتا ہے۔
آڈیٹوریم کا کلچرل شو ایک ڈانس ڈرامے پر مشتمل ہے:
دھم دھمادم، دھم...... دھم دھمادم، دھم...... شب رنگ انسانوں کا ایک گروہ، ڈھول کی ست رفتار تال پر کاہلی رقص کرتا ہوا سٹیج پر آتا ہے اور شب رنگ انسانوں کے اس گروہ کا ہر فرد اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو روٹی کے لقمے کی صورت لپیٹ کر اپنے منہ کی طرف لے جارہا ہے۔ اچانک تیز آواز اور تیز رفتار موسیقی کا طوفان آتا ہے اور اسٹیج کا مغربی گوشہ فلوریسنٹ لائٹس سے جگمگا اٹھتا ہے اور پھر فلوریسنٹ لائٹس کی کچھ ٹیوبز تیز آواز اور تیز رفتار موسیقی کی دُھن پر ہنگامہ پرور ناچ ناچتی ہوئی نمودار ہوتی ہیں اور ان ٹیوبز کے سروں پر روٹیوں کا ڈھیر ہے...... شب رنگ انسانوں کا گروہ، وحشی چیخوں کے ساتھ روٹیوں کی طرف لپکتا ہے لیکن اپنے سروں پر روٹیوں کا ڈھیر اٹھائے فلوریسنٹ لائٹس کی ٹیوبز ہنگامہ پرور ناچ ناچتی ہوئی شب رنگ انسانوں کے گروہ سے اس طرح گریزاں رہتی ہیں کہ شب رنگ انسان، ان کے سروں سے روٹیاں اٹھانے میں ناکام رہتے ہیں......
ابھی یہ ڈانس اور ڈرامہ آگے چلے گا لیکن میری دلچسپی ختم ہو چکی ہے اور اس ڈرامے کا اختتام میری سمجھ میں آچکا ہے...... بے شک کہ سمندر شہر کی کولتار، چوڑی سڑک کا منظر، اس ڈانس ڈرامے کا منظر، اس ڈانس ڈرامے کا اختتام تھا...... آڈیٹوریم سے باہر آجاتا ہوں، اور دوبارہ بے ستارہ اور بے چاندرات میں چلنے لگتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ اس رات سے باہر نکل جاؤں، لیکن اب یہ ناممکن ہے...... بے ستارہ اور بے چاندرات مجھ سے کہتی ہے کہ اب یہ ناممکن ہے اس لئے کہ تم مجھ میں منظر منظر اور چہرہ چہرہ تقسیم ہو چکے ہو:
وہ جو وحی لگن سے بے وحی کتاب لکھ رہا ہے، وہ بھی تم ہو...... اور وہ جنگلوں اور پہاڑوں اور دریاؤں میں چھ ہزار میل لمبا راستہ تراش رہا ہے، وہ بھی تم ہو...... اور وہ جو اپنی بے مایہ شاعری سے اپنے وقار کی جنگ لڑ رہا ہے، وہ بھی تم ہو...... اور وہ جو پسِ دیوارِ زنداں اپنے اسی سالہ بڑھاپے کے ساتھ انسانی محبت کی ریاضی کا عدد چیخ رہا ہے وہ بھی تم ہو...... اور جو کنارِ وجود پر اترنے

والے چاند سے باتیں کر رہا ہے، وہ بھی تم ہو...... اور وہ جو دشت کے غزالوں سے کھوئے ہوؤں کا پتہ پوچھ رہا ہے، وہ بھی تم ہو...... اور جو اَنا کی دار پر اپنی خدائی کا اعلان کر کے لہولہو ہو رہا ہے، وہ بھی تم ہو...... اور وہ جو انکسار کی خاک پر فقر کی گلیم پہنے بیٹھا ہے، وہ بھی تم ہو...... اور وہ جو فلوریسنٹ ٹیوبز سے مشینوں کی طرح ڈرائیو ہو رہے ہیں، وہ بھی تم ہو۔

یہ بھی میں، اور وہ بھی میں۔ ادھر بھی میں، اُدھر بھی میں...... میں خود سے کیسے نکل سکتا ہوں اور اگر نکل بھی جاؤں تو کہاں جاؤں گا...... اور اگر کہیں چلا بھی جاؤں تو کیا کروں گا......؟...... میں کہ بزنس ایڈمنسٹریشن اور چارڈا اکاؤنٹینسی سے واقف ہوں۔

اب صرف ایک ہی چارۂ کار باقی رہ گیا ہے کہ اس بے ستارہ اور بے چاند رات میں منظر منظر اور چہرہ چہرہ تقسیم شدہ خود کو جمع کروں اور اس جمع کمائی سے فلوریسنٹ لائٹس کے انگاروں پر لیٹی ہوئی اس رات کو آزاد کرواؤں تا کہ اس کے حلق سے سچائی کے اعلان کا مترنم چاند طلوع ہو اور اس کے کالے بالوں میں ستارے اُتر آئیں...... ایک ستارہ نبی کے چہرے جیسا، اور وہ ایک ستارہ لمحۂ نزول کی کپکپاہٹ جیسا، اور ایک ستارہ یثرب کی زمین جیسا اور ایک ستارہ غلام آقاؤں جیسا اور ایک ستارہ خاک بسر جہانداروں جیسا اور ایک ستارہ سب ستاروں جیسا اور سب ستارے ایک ستارے جیسے......

OOO

بیچوں بیچ پڑے پردے کے اس طرف لڑکیاں تھیں اور اُس طرف لڑکے اور سامنے سے مولانا اپنی نشست پر آگے جھک کر میز پر کہنیاں رکھے، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ملائے، اپنی عینک کے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتے، پردے کے اس طرف بھی مخاطب تھے اور اُس طرف بھی، مولانا رک رک کر اپنی بھاری پر شفقت آواز میں ایک ایک نکتہ کی وضاحت کر رہے تھے۔ وہ ایک آیت پڑھتے۔ اس کا لفظی ترجمہ کرتے۔ پھر واپس پلٹتے۔ آیت کے ایک ایک لفظ کو علیحدہ علیحدہ کر کے وضاحت کرتے ہوئے تشریح و تفسیر تک پہنچتے، مثالیں دیتے اس طرح کہ آہستہ آہستہ ہمیں بھی اپنے ساتھ گفتگو میں شریک کر کے تھیٹر کے ماحول میں مباحثہ کی فضا پیدا کر دیتے۔ آج تیسرا دن تھا اور پہلے دن کی جھجک نے ختم ہو کر اپنی جگہ خود اعتمادی کو دے دی تھی۔ اور اسی خود اعتمادی نے لڑکیوں کو زبان دے کر اپنی نوع، اس کی حیثیت اس کی مشکلات، اس کے مقام و منصب کے بارے میں بحث میں الجھا دیا تھا۔ پردے کے اس پار بیشتر لڑکے خاموش تھے صرف ابرار اور افتخار اسی جوش اور توجہ سے بحث میں حصہ لے رہے تھے جو لڑکیوں کے درمیان تھا۔ ماحول ایسا نہ تھا کہ میری توجہ کسی اور طرف بھٹک جاتی۔ مگر میری آنکھیں عادتاً "پردے" کے اُس سوراخ کی طرف گئیں جہاں سے پردے کے اُس طرف کا نظارہ ہو سکتا تھا۔ امتیاز اپنی جگہ پر تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پہلو بدلا اور اس کا چہرہ تمام کا تمام میری طرف ہو گیا۔ مولانا کی آواز کہیں دور چلی گئی اور چاروں طرف ایک دھند سی پھیل گئی سارے چہرے معدوم ہو گئے، ساری آوازیں نابود ہو گئیں۔ اور اس دھند میں سے جھانکتا ہوا۔ امتیاز کا چہرہ اپنی گرم، سنہری سیال آنکھوں سے میری اور نگراں تھا۔ اسی لمحے جیسے امتیاز نے بھی اتفاقاً یا عادتاً یا میرے تصور کی حرارت سے جل کر اُسی سوراخ کی طرف دیکھا۔ پھر مسکرایا۔ شاید اس نے میری آنکھ کو اس سوراخ میں ٹنکا پایا۔ دھیمی مسکراہٹ، مگر اُسی دم مولانا کی آواز غیر معمولی طور پر بلند ہوئی۔ "ہر عورت کو ویسا ہی مرد ملے گا جیسی وہ خود ہوگی۔ اور ہر مرد کے لیے وہی عورت لکھی گئی ہے جیسا کہ وہ ہے۔" مولانا کی آواز کی سختی اور ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالنے سے لفظ لفظ کی ادائیگی کے انداز نے میری اس دنیا کی ساری خوابناک دھند ایک پل میں اڑا دی۔ وژن مٹ گیا اور میں نے سنبھل کر مولانا کی طرف دیکھا۔ یہ ان کا انداز تھا۔ وہ جب کسی کو متوجہ نہ پاتے تو اچانک اپنا لہجہ بدل دیتے۔ اور جو نکتہ وہ بیان کر رہے ہوتے اسے اپنی پاٹ دار آواز میں دوبارہ سہ بارہ دہراتے اور غیر متوجہ تک اپنا پیغام پہنچا دیتے جو غیر متعلق کو محسوس نہ ہوتا۔ میں نے لمحہ بھر مولانا کی آنکھوں میں دیکھ کر نظریں جھکا کر افسوس کا اظہار کیا۔ اسی دم حامدہ کی لرزتی ہوئی، کانپتی مظلوم آواز ابھری "یہ آپ نے کیا کہا مولانا۔ میں تو ایسی نہیں جیسا وہ۔ خدا گواہ میں تو اس جیسی نہیں۔ خدا نے اپنا وعدہ مجھ سے کیوں نہ نبھایا؟؟" ہم سب نے یک لخت مڑ کر حامدہ کی طرف دیکھا۔ اتنے بہت سے لوگوں کو اپنی طرف نگراں پا کر وہ اچانک چپ ہو گئی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے منہ کو چھپا کر ڈیسک پر جھک گئی۔ مولانا چپ چاپ، لمحہ بھر تک اس کے ابھرتے دبتے شانوں کو دیکھا کیے پھر کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کر دو قدم ادھر کو چلے، رکے اور مڑ کر دوسری طرف چلنے لگے۔ پھر مُڑے اور آہستہ آہستہ چلتے دو سیڑھیاں چڑھ کر حامدہ کے پاس آ کر رکے۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ پھر ان کے گھٹے ہوئے بند گلے میں سے صرف ایک لفظ نکلا "بچے" اور پھر دو سیڑھیاں اتر کر آہستہ آہستہ چلے۔ تھیٹر سے باہر نکل گئے۔ میں نے دائیں ہاتھ کی کھڑکی سے انہیں جاتے دیکھا۔ دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے، سر جھکائے، زمین کی اور دیکھتے وہ آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ جب وہ میری نگاہ سے اوجھل ہوئے تو میں نے حامدہ کی طرف دیکھا، وہ اپنے بیگ سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں خشک کر رہی تھی۔ چند ایک لڑکیاں اس کے پاس کھڑی تھیں، کچھ

آہستہ آہستہ چلتی دروازے کی طرف جا رہی تھیں۔ میں نے پھر پردے کے سوراخ میں آنکھ جمائی۔ امتیاز دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھے کرسی کی پشت سے ٹکا ٹانگیں پھیلائے دراز تھا۔ کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورتا ہوا "ہر مرد کو اسی جیسی عورت ملے گی اور ہر عورت کو اسی جیسا مرد۔" تو امتیاز سن لو کہ تم میرے لیے ہو اور میں تمہارے لیے یہ پیشن گوئی تھی۔۔۔ میں نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ خود کو بتایا، اُسے بتایا پھر ڈیسک پر پڑی اپنی چیزیں سمیٹیں اور حامدہ کے پاس جانے کے ارادے سے اٹھی مگر پورا تھیٹر خالی ہو چکا تھا۔

حامدہ کی داستان سے سب لوگ واقف تھے۔ وہ اس کا خاوند واقعی انتہائی نیچ آدمی ہوگا کہ اس جیسی عورت کو سستی عورتوں کی خواہش میں ٹھکرا دیا۔ یا شاید اس کے چہرے کے تقدس پوتر تا کے سامنے وہ خود کو اپنے کارناموں کی روشنی میں جب دیکھتا ہو تو اور بھی سیاہ اور گھناؤنا پاتا ہو اور اس احساس سے نجات کے لیے اس نے حامدہ سے نجات چاہی ہے۔ پہلے تو وہ کبھی کبھار گھر آجاتا تھا مگر پھر جب دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے کردار کی سیاہی اور گھناؤنے پن کے احساس کی شدت سے نجات پانے کی کوششوں میں اس کے کارناموں کی سیاہی میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو اس نے گھر آنا بند کر دیا۔ کبھی کبھار بھولا بھٹکا وہ گھر آتا تو اسے ململ کے سفید دوپٹے میں لپٹے، جانماز پر بیٹھے دیکھتا اور ہزار آئینے اس کے مقابل آجاتے جن میں وہ اپنی شامیں، اپنی راتیں، اپنی بزم آرائیاں قطار اندر قطار گذرتے دیکھتا۔ اس کی جھنجھلاہٹ میں اور اضافہ ہوتا اور وہ اس پر برس جاتا۔ سفید دوپٹہ اوڑھنے کو وہ کہتا کہ وہ تو اس کی موت کی خواہاں ہے جانماز پر بیٹھنے کو وہ ڈھونگ رچانے کا نام دیتا۔ یا شاید اپنے گذشتہ گناہوں کی توبہ مانگ رہی ہو۔ گذشتہ گناہوں پر وہ غیر معمولی دباؤ دیتا اور چمکدار، بدطینت آنکھوں سے اسے گھورتا، مگر اس کے معمول میں، اس کی خدمت گزاری میں، اس کی اطاعت میں، اس کی بے زبانی میں فرق نہ آتا۔ وہ اور بھی جھلا جاتا۔ ایک شب آخر کار اس نے حل تلاش کر لیا۔ گھر آنے پر اُسے کہا "دو صورتیں تمہارے سامنے ہیں یا اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤ یا طلاق لے لو۔" دوسری بات سے دنیا کی ہر عورت بچنا چاہتی ہے۔ سو وہ بھی اس سے بچنے کی خاطر اپنے ماں باپ کی ڈیوڑھی میں اتر آئی۔ ایک امید۔۔۔ امید موہوم ہی سہی کہ شاید وہ کبھی اُسے واپس بُلا لے۔ مگر پانچ سال گذر چکے تھے اور ہمارے ساتھ اسے ایم اے کا دوسرا سال تھا۔ ایک بیاہتا جس کا خاوند ہو مگر پھر بھی اس کا نہ ہو۔ ایک گھر ہو جس کے دروازے اس پر بند کئے جا چکے ہوں۔ ایک بچہ ہو جسے دیکھنے کی اجازت نہ ہو۔ اس کے چہرے پر حزن کی لکیریں جامد نہ ہو جائیں تو کیا ہو۔۔۔؟؟

مگر امتیاز میرے لیے نہ تھا۔ میں اس کی عورت نہ تھی۔ دوسرے دن یونیورسٹی آئی تو معلوم ہوا کہ کل جب وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے باندھے، کرسی کی پشت سے ٹکا۔ ٹانگیں پھیلائے دراز تھا اور کھلی آنکھوں سے چھت کو گھور رہا تھا تو وہ کیا سوچ رہا تھا۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں یہ خبر عام ہو چکی تھی کہ کل شام امتیاز حامدہ سے ملنے لڑکیوں کے ہوسٹل گیا تھا۔ اور مکمل ڈیڑھ گھنٹہ کی ملاقات کے بعد جب حامدہ واپس اپنے کمرے میں آئی تو اس کا سفید ململ کا دوپٹہ پیشانی پر ڈھلک آیا تھا۔ اور جھکی پلکوں میں چھپی اس کی آنکھیں سرخ اور متورم تھیں جیسے بہت روئی ہو۔ اور عارفہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے امتیاز کو دونوں ہاتھ پشت پر باندھے، سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتے لڑکیوں کے ہوسٹل کے گیٹ سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ میرے جی میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ اس روز امتیاز کلاس میں نہ تھا۔ دوسرے دن سنا کل شام وہ پھر حامدہ سے ملا۔ اور آج شام بھی امتیاز کلاس سے غائب تھا۔ حامدہ کی آنکھوں کے پپوٹے رو رو کر سوج چکے تھے اور دوپٹہ پیشانی سے جدا نہ ہوتا تھا۔ رات کو وہ دیر تک جائے نماز پر بیٹھی نظر آتی۔ چار روز تک یونہی ہوتا رہا۔ پھر سنا حامدہ نے اپنے میاں سے طلاق کا مطالبہ کر دیا اور مہینہ کے آخر تک وہ دونوں رشتہ ازدواج میں بند چکے تھے۔ دونوں کو اکھٹے کمرے میں داخل ہوتے۔ یونیورسٹی سے اکھٹے واپس جاتے دیکھ کر بھی میرے اندر کوئی احساس پیدا نہ ہوتا۔ بس ایک چپ، گھنی تاریک چُپ۔ مولانا نے اس شادی پر ہمارے سامنے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ مگر یہ نکاح۔ سنا کہ انہیں نے پڑھایا تھا۔ میں اب مولانا کے ہلتے ہونٹوں کو دیکھا کرتی، کبھی کبھار یہ خیال ایک کوندے کی طرح لپک جاتا کہ انہیں، انہیں ہونٹوں نے وہ بول ادا کئے ہوں گے جو اتنے زندہ اتنے پائیدار اور اتنے پہلودار ہیں جو کسی کے لیے زندگی کے سارے در کھول دیتے ہیں۔ مگر سارے در بند کر دیتے ہیں۔ اب آوازیں۔۔۔ محض آوازیں رہ گئی تھیں۔ اپنا مفہوم ادا نہ کرتی تھیں اور

... سے سلام کیا تو انہوں نے
پھر میری آنکھوں میں لمحہ بھر لگ کر دیکھا، پھر سر جھکا کر میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور اپنی گھمبیر، بوجھل آواز میں ''بچے'' کہا اور آگے بڑھ گئے میں وہاں کھڑی رہ گئی۔ چاروں اور جیسے ایک خلا اور اس میں میری تنہا ذات۔ تنہا تنہا۔ تنہائی کی یہ کیفیت ابھی تک میرے لے اجنبی رہی تھی۔ میرے گلے میں کیا ہو گیا تھا بھلا؟؟

امتیاز نے اس سلسلہ میں مجھ سے کوئی بات نہ کی تھی اس کا رویہ میرے ساتھ انتہائی مہذب اور شائستہ تھا اور اسی تہذیب وتمیز اور شائستگی سے اس نے میرے اور اپنے درمیان اجنبیت کی ایک مضبوط دیوار تیار کر دی تھی۔ وہ سر راہے کہیں بھی ملتا سلام کرتا۔ حال احوال پوچھتا اور آگے بڑھ جاتا۔ ایک دن جب مولوی بشارت علی چوتھا پرچہ پڑھا رہے تھے، اچانک ہی کہیں سے بھاگتے دوڑتے بادل آئے اور پورے آسمان پر چھا گئے اور ایسی دھواں دار بارش ہوئی کہ کہیں دیکھی نہ سنی۔ مولوی صاحب ہمیں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ میں روبیا کے پاس رک گئی۔ وہ دن نہ معلوم کیسا تھا۔ شام کو گھر جاتے ہوئے ریگل سے اپنی بس تبدیل کرنے کے لیے میں یونیورسٹی بس سے اتر رہی تھی کہ سامنے امتیاز کھڑا نظر پڑا۔ لمحہ بھر کی تاخیر کے بعد وہ فوراً بڑھ کر آگے آیا۔

''یونیورسٹی سے اب آ رہی ہو کیا؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ہاں'' میں نے مختصراً کہا۔ پھر جانے کیا سوچ کر کہا۔ ''چلو امتیاز گھر تک چلتے ہیں؟ امی پرسوں ہی تمہارا ذکر کر رہی تھیں۔'' اور لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر ہی اُس نے کہا۔ ''نہیں بھئی نفیس پھر کبھی سہی۔ میری بیوی بیمار ہے اور مجھے گھر جلدی پہنچنا ہے۔'' اور اس کی اس بات پر مجھے خیال آیا کہ ہاں آج تو واقعی حامدہ اور امتیاز دونوں ہی کہیں نظر نہ آئے تھے۔ میں نے چاہا کہ رسماً ہی سہی میں کچھ پوچھوں۔ مگر میرا جی نہ مانا تو میں نے کہا۔ ''اچھا پھر خدا حافظ''۔۔۔ اور اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھتی آگے نکل گئی حالانکہ یہیں سے مجھے بس لینا تھی کوئی آدھا فرلانگ ہی چلی ہوں گی کہ ایک کار تیزی سے میرے پاس سے گذری۔ تھوڑی دور پہ جا کے ایک دم رکی پھر پیچھے کی طرف رینگتی میرے پاس آ رکی یہ ابراہیم تھا۔ اس نے اگلا دروازہ کھولا۔ میں ایک لفظ کہے بغیر اس میں سوار ہو گئی۔ اور بیٹھتے بیٹھتے ایک ذرا سا سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ امتیاز دیکھ رہا تھا۔ میں نے فوراً اپنا چہرہ ابراہیم کی طرف کر لیا اور کوئی بات کر کے زور سے ہنسی کیا بات ہے۔ یہ اب مجھے یاد نہیں۔ مگر وہ ہنسی کیا ہنسی تھی۔؟؟

''ابراہیم'' بے حد مدھم بوجھل آواز میں میں نے اسے مخاطب کیا۔ اُس کے شانے پر سے پھسلتا میرا ہاتھ اُس کی پٹی پر جا رکا کار میں چھائے اندھیرے میں میں نے اپنا سر اس کے شانے پر سے اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ ''ابراہیم'' پھر وہی بوجھل، بھاری مدھم آواز۔۔۔ ''بس نفی'' جیسے وہ بند گلے سے بدقت بول رہا ہو۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور لب کھول دیے۔ اس کا گرم سانس میرے رخساروں سے ٹکرایا پھر مجھے کوئی یاد نہیں۔ صرف من کے سناٹے میں گونجتی ایک چیخ۔ ابراہیم۔۔۔ ابراہیم اس درد کو نوچ کر پھینک دو۔ دل سے کہیں دور میرے دھڑکتے درد کو نوچ کر پھینک دو کچھ بھی کرو، مگر کہیں سے مجھے میرا اپنا آپ دلا دو۔۔۔

ابرہیم سے میر اس ریگل والی ملاقات پر پندرہ دن پڑ چکے تھے کہ ایک دن صبح ہی صبح امتیاز نے آ لیا۔ ''بی بی۔ تم سے ایک بات کر سکتا ہوں؟؟'' میں نے لمحہ بھر اس کے آنکھوں میں اتر کر یہ جاننا چاہا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ صاف شفاف ہر قسم کے جذبات سے عاری دو آنکھوں نے جواباً میری آنکھوں میں دیکھا۔ لیس۔ وائی ناٹ!!'' میں نے کہا۔ ''تو میں کب تم سے تمہارے چند منٹ لے سکتا ہوں؟'' اس نے اپنے اونچے، سیدھے قد میں کھڑے کھڑے مجھ سے مطالبہ کیا۔ ''ابھی ابھی کیوں نہیں؟؟'' میں نے کہا۔ ''نہیں ابھی نہیں تم آج روبیا کے پاس رُک جاؤ۔ میں شام کو تم سے بات کروں گا۔'' اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ آگے نکل گیا۔۔۔ میں نے اپنے شانوں کو حرکت دی۔ پھر لا اُبالی انداز سے پرس جھلاتی آہستہ آہستہ چلتی ڈیپارٹمنٹ کی طرف

جلدی کہیں دور سے ابراہیم دیکھتا آیا۔ "امتیاز کیا کہہ رہا تھا؟؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں ویسے ہی پرس جھلاتی آگے آگے چلتی رہی۔

"شام پھر پکچر چل رہی ہو نا۔۔۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں ابراہیم صاحب۔۔۔ آج شام تو نہیں۔" میں نے ویسے ہی سیدھے سیدھے راستے پر آگے کی طرف چلتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"مگر بھئی یہ تو ہم نے کل ہی طے کرلیا تھا۔" اس نے پھر کہا۔

"تو خان ابراہیم کسی دوسری لڑکی کو لے جاؤ۔ تمہارے لیے کیا مشکل ہے۔" ابراہیم نے پھر کچھ نہ کہا اور میرے ساتھ چلتا مجھے میرے ڈیپارٹمنٹ تک پہنچا کر اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف چلا گیا۔

(۲)

یہ بات اسی طرح لکھی گئی تھی۔ یہ مقدر تھا۔

میرے ہر کام میں میرے ارادے کو دخل تھا کیونکہ میرے ہر کام میں میرے ارادے کا شمول بھی لکھا تھا۔ جو ہوا میری خواہش سے ہوا کہ ہر کام کو اپنی خواہش سے کرنا بھی مقدر تھا۔ مگر شاید ہم اپنی لحاتی خواہشوں کے حصول کے بعد جب پچھتانا نہیں چاہتے تو اسے تقدیر کا نام دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں......لیکن میرے اندر تلخی کا کوئی احساس نہیں۔ دل میں کوئی پچھتاوا نہیں۔ ہر بات ٹھیک ٹھیک اور اپنی جگہ درست۔ مگر شاید یوں ہی ہوتا ہو۔

لڑکیوں کے ہوسٹل کے ویٹنگ روم میں تمہارے انتظار میں بیٹھے ہوئے یہ مجھے پچیسواں منٹ شروع ہوا ہے۔ اور ان گذشتہ چوبیس منٹوں میں میں نے تمہارے متعلق کچھ بھی نہیں سوچا۔ خود پر میری گرفت مضبوط ہے مگر وقت پھر بھی معکوس بہہ رہا ہے۔ میں نے کہا نا کہ پچھتاوا نہیں، تلخی نہیں۔ بے قراری نہیں۔ ایک سکون ہے۔ بس ایک سکوت ہے۔ لمبی چپ۔ مگر تم نے وقت کی بالا دستی کے خلاف شکوے کا جو ڈھنگ اپنایا ہے نفیس وہ مجھے پسند نہیں۔ اب بھی"۔ امتیاز نے پانچویں ختم ہوتے سگریٹ سے چھٹا سگریٹ جلا کر ایش ٹرے میں مسل دیا۔ پچیس منٹ ختم ہو چکے ہیں نفیس بیگم۔" وہ اپنے آپ میں مسکرایا۔

"تقدیر کی بالا دستی اگر تم بھی چپ چاپ مان لیتیں تو سکھی ہوتیں۔ جس طرح اب میں ہوں۔ اس وقت تم روبیا کے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی ہو۔ میں جانتا ہوں لیکن اگر چپ چاپ ویٹنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلی آ ؤ تو اس خلفشار سے بچ جاؤ۔ تم سوچ رہی ہو کہ یوں مجھے منتظر رکھ کر تم مجھے تمہارے بارے میں سوچنے اور میرے فعل کی حماقت کا ادراک کرنے کا موقع دے رہی ہو تو تمہارا خیال غلط ہے بانو۔ بہتر ہو کہ اب تم چپکے سے چلی ہی آ ؤ۔" امتیاز نے ایک بار پھر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ اسی دم دروازہ کھلا۔ یہ نفیس تھی۔

"جی۔ تو بتایئے امتیاز صاحب کیا بات تھی جو آپ صرف شام ہی کو مجھے بتا سکتے تھے۔" نفیس نے بڑے لاابالی انداز میں جھٹک کر رخساروں کو چھوتے ہوئے بالوں کو جھولا جھلایا پھر انہیں کان کے پیچھے کرتی امتیاز کے قریب سے گذر کر آگے بڑھ کر دیوان پر جا بیٹھی۔

نفیس بیٹھی۔ تب وہ اپنی جگہ سے اٹھا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور تیز۔ پر اعتماد قدموں سے چلتا ہو نفیس کے سر پر آ کھڑا ہوا، دراز قد۔ سرخی مائل، براؤن سر، سنہری سیال آنکھیں، دمکتا کندن کا رنگ گورا............تھا نفیس بڑی دلچسپی سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی۔" امتیاز میاں۔ تمہارا یہ رنگ دراصل میرا رنگ ہونا چاہئے تھا، یہ بال۔ یہ سنہری آنکھیں بھی اگر میری ہوتیں تو کیا برا تھا۔ مگر میرے خیال میں میری آنکھیں بھی کچھ۔ ایسی بری تو نہیں"۔ شرارت سے آنکھوں کو میچ کر وہ کچھ راز دارانہ لہجہ میں بولی۔ پھر خود ہی زور سے ہنس دی۔

امتیاز نے چند ثانئے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ (تم سمجھتی ہو کہ میں سمجھتا نہیں۔) مگر پھر وہ سنبھل گیا: "نفیس ہر جگہ جہاں چند اچھے لوگ ہوتے ہیں، چند برے بھی ضرور ہوتے ہیں۔ ڈیپارٹمنٹ میں کچھ لوگ تمہارے بارے میں بات کر رہے

...... مجھے تکلیف ہوئی ہے۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اضافہ کیا۔

(یوں تو بہر حال ہونا ہی تھا۔) نفیس چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ (مجھے معلوم ہے کہ تم جانتے ہو تمہاری بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ اور اگر ہے۔ تو وہ تم بھی جانتے ہو۔) وہ خاموش رہی۔

امتیاز کچھ دیر نفیس کے سامنے کھڑا رہا پھر مڑا اور کمر کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھ کر آہستہ آہستہ چلتا کھڑکی کے پاس جا رکا تو نفیس کو اس کا انداز کچھ معذرت آمیز محسوس ہوا۔ وہ اپنے اندر کے من میں ہولے سے مسکرانے سی لگی۔ امتیاز مڑا تو اُسے نفیس کے چہرے پر بڑا اطمینان، سکون نظر آیا۔

''نفیس مجھے افسوس ہے۔ نہ میں کچھ کہہ سکتا ہوں نہ تم سمجھ سکتی ہو۔'' اُس کی آواز افسردہ تھی، نفیس اب بھی خاموش رہی۔

''تم کچھ بولتی کیوں نہیں ہو۔'' اُس کی خاموشی امتیاز کے لیے بہت IRRITATING تھی۔ ''میاں کیا یہی کچھ کہنے کو تم نے مجھے روکا تھا۔'' نفیس نے دونوں بھنویں اٹھا کر اپنی آنکھوں کو پورا کھولتے ہوئے کہا۔ پھر دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ کر انگڑائی لی۔

''خواہ مخواہ ہی تم نے میری شام برباد کی۔ اچھا بھلا میرا ابراہیم کے ساتھ پروگرام تھا۔'' وہ دیوان پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی قمیض کا دامن نیچے کی طرف کھینچا۔ امتیاز پھر آہستہ چلتا نفیس کی طرف آیا۔ مگر اس تک کا آدھا راستہ طے کرنے کے بعد کمرے کے عین بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔ ''بس تم یہیں تک آ سکتے تھے'' نفیس کا لہجہ مضحکہ اڑانے والا تھا۔ امتیاز چڑ گیا۔ اضطراری طور پر اس نے دائیں پاؤں کی ایڑی فرش پر بجھائی۔ اور کچھ کہنے کو لب کھولے، اسی لحہ نفیس نے اپنے کھلے گلے کی قمیض کو بائیں کندھے کی طرف کھینچ کر اپنا کندھا عریاں کیا۔ اور بڑے پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے گول شانے کی سفیدی میں چمکتے دمکتے نیلے داغ پر اپنے لب رکھ کر ترچھی نگاہوں سے امتیاز کی طرف دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مکمل سپردگی۔ دھماکے کی آواز پر چونک کر اُس نے آنکھیں کھولیں۔ امتیاز جا چکا تھا اور زور سے بند کیے گئے دروازے کی آواز سے کمرہ دھڑک رہا تھا، نفیس نے بھاگ کر بند کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکا کر باہر دیکھا۔ امتیاز لمبے لمبے قدم لیتا لڑکیوں کے ہوسٹل کے گیٹ سے نکل رہا تھا۔ وہ کسی المیہ کی ہیروئن کے انداز میں آہستہ سے مڑی۔ اسی دم پہلو کا دروازہ ہولے سے کھول کر روبیا نے جھانکا۔ لحہ بھر مکمل اجنبیت سے وہ روبیا کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر سر پیچھے پھینک کر ہنسنے پر آئی تو ہنستی چلی گئی۔

دوسرے دن وہ یونیورسٹی سے غائب تھی اور ابراہیم بھی۔ یہ دن انہوں نے چھانگا مانگا کے جنگلات میں گذارا۔ دو دن بعد وہ اس کے ہمراہ نور جہاں کے مزار کی طرف دیکھی گئی۔ ایک شب جب وہ ابراہیم کے ساتھ کیپٹل سے باہر آ رہی تھی تو امتیاز سامنے جاتا نظر پڑا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو نفیس بڑی پہچان سے مسکرائی اور پھر ابراہیم کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ اکتا گئی۔ شاید ابراہیم بھی۔ اور دوسرے دن وہ قربان علی کے ساتھ لائبریری میں بیٹھی ملی۔ قربان علی اپنی ہی سمجھ میں نہ آنے والی کی کوئی تقریر اس کے سامنے دہرا رہا تھا اور وہ چپ بیٹھی تھی خالی چہرہ لیے آنکھوں میں ایک چپ لیے۔ ہفتہ دس دن بعد وہ فرخ کے ساتھ مال پر ٹہل رہی تھی پھر کچھ دن وہ تنہا پھرتی رہی، متحرک، بے چین نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی، تیز تیز چلتی وہ اپنی جان پہچان کے لوگوں کے پاس سے مکمل اجنبیوں کی مانند گذر جاتی اور اسے احساس تک نہ ہوتا کہ کچھ لوگ پاس ہی کھڑے بھی تھے؟؟ انہیں دنوں پنڈی سے روبیا کا منگیتر اُس سے ملنے آیا تو یہ اُن دونوں کے ساتھ گھومتی پھری۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے، ہنستے بولتے تو یہ چپ چاپ بیٹھی مسکراتی رہتی، پر سکون اور مطمئن باتیں کرتے کرتے وہ اچانک چپ ہو کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھنے لگتے تو وہ نظریں چرا جاتی ہفتہ بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ روبیا چپ بیٹھی دونوں کا منہ تکا کرتی اور وہ دونوں نہ ختم ہونے والی باتوں کے سلسلوں میں الجھتے رہتے۔ بے معنی باتیں، لایعنی بحثیں، ادھر اُدھر کے قصے، نفیس کا ایک ہاتھ اگر اسے نظر نہ آتا تو وہ جان لیتی کہ میز کے نیچے، وہ ہاتھ اس کے منگیتر کی ران پر پھسل رہا ہوگا کبھی جب وہ اپنے پیر پر مردانہ جوتے کا دباؤ محسوس کرتی تو ویسے ہی بند چہرہ لیے بیٹھی رہتی کہ اسے معلوم تھا کہ یہ پیر غلطی سے اس طرف آ گیا ہے اور فوراً ہی ہٹا لیا جائے گا۔ اب نفیس نے کلاس میں بھی باقاعدگی

کے ساتھ آنا شروع کر دیا تھا۔ پنسل کی نوک کو چباتی وہ بڑے دھیان سے مولانا کا لیکچر سنا کرتی۔ گا ہے گا ہے کوئی نکتہ نوٹ کرتی۔ کبھی کبھار مولانا کی گردش کرتی نگاہیں اُس کی آنکھوں میں گڑ جاتیں۔ وہ سیدھی، صاف نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے لمحہ بھر کے لیے لیکچر کی روانی تھم جاتی۔ اس مبہم خاموشی کا احساس جاگنے سے پہلے ہی وہ نگاہیں کسی اور طرف پھیر لیتے۔ اور وہ سوچتی رہ جاتی کہ اس ایک نظر کا مفہوم کیا تھا؟ اُسے وہ ایک صبح یاد آ جاتی جب مولانا نے اُسے پردے کے سوراخ میں سے اُس پار جھانکتے دیکھا تھا۔ وہ سر جھٹک کر ہولے سے مسکراتی اور نگاہیں جھکا لیتی آنکھیں اٹھاتی تو مولانا کی نگاہیں پھر کہیں آس پاس ہی ہوتیں۔۔۔ روبیا کا منگیتر اچانک ہی پنڈی چلا گیا۔ دو دن بعد روبیا نے بھی چھٹی کی درخواست دی اور اپنے گھر کو روانہ ہو گئی۔ ہفتہ بھر کے بعد خبر آئی کہ دونوں کی شادی ہو گئی۔ نفیس تک یہ خبر پہنچی تو سر جھٹک جھٹک کر خوب ہی ہنسی۔

(۳)

باغ کی نیچی دیوار پر میں ٹانگیں باہر کی طرف لٹکائے بیٹھی تھی۔ اپنے آپ میں گُم کچھ بھی نہ سوچتی ہوئی۔ خاموش سڑک پر اکا دُکا راہگیر میرے لیے محض دھبے تھے۔ رات کی سیاہی میں اُبھرتے ہوئے دھبے، سفید، سیاہ، خاکستری۔ تاریک۔ برسات کی اس تنہا اور تاریک رات میں گرتی نمی مجھے اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی مجھے یہاں بیٹھے نصف گھنٹے سے زائد وقت گذر چکا تھا۔ مگر پوری رات بھی گذر سکتی تھی۔ خاموش اور تنہا سڑک پر سے نظریں اٹھا کر میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ شبنمی تاریکی میں ننگے کتنے ہی ستارے مجھے ہاتھ بھر کے فاصلے پر جگمگاتے نظر آئے۔ میرا جی چاہا اک ذرا سا ہاتھ اٹھا کر انہیں چھو لوں۔ انگلیوں کی پوروں سے، صرف چھو لوں، نمی سے بوجھل ہوا کا ایک گہرا گھونٹ بھر کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی دم سڑک پر بہت سے تیز قہقہے بکھر گئے۔ آنکھیں کھولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ میرے بھائی تھے۔ اپنی شام باہر گذارنے کے بعد گھر کی طرف آتے ہوئے۔ پھر تیز تیز باتیں کرتے، بھاری قدموں سے چلتے وہ سڑک سے اتر کر گھر کی سڑک پر آ گئے۔ ویسے ہی آپس میں مصروف میرے قریب سے گذرتے اندر چلے گئے۔ میں نے اندر کی طرف جاتے ان دو سائیوں کی طرف مڑ کر دیکھا (اگر جو تمہیں معلوم ہوا!!! اگر جو تم جانتے ہوئے میرے بھائی!!) پھر وہی خاموشی۔ گھنیری گھنی خاموشی اور تاریکی اور اس تاریکی میں گرتے ستاروں کے آنسو۔ کتنی ہی دیر اور گذری۔ اندر کے کمروں کی بتیاں ایک ایک کر کے بجھیں۔ غلام علی اندر سے نکل کر آہستہ آہستہ چلتا سرونٹ کوارٹرز کی طرف گیا۔ تھوڑی دیر بعد زیتون بھی چلی جائے گی۔ کیا معلوم میرے کمرے کا دروازہ بھی کسی نے بند کر دیا ہو۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔ میں نے سوچا، مگر بیٹھی رہی، یہ کاہلی نہیں تھی۔ تھکاوٹ نہیں رہی۔ کچھ اور ہی قسم کا احساس تھا بے نام قسم کا۔ ایسا کہ میں تب بھی نہ چونکی جب دیوار کے برابر میرے قریب ہی ایک سایہ اُبھرا اور دھیمی آواز سے کہا ''نفیس۔ کیا یہ تم ہو؟؟''

میں نے بے اعتباری سے سائے کی طرف دیکھا۔ نہیں۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ مگر نہیں ہر بات ممکن ہے میرے ذہن نے ہم کلامی کی۔ خیالات میرے ذہن میں ابھرتے، تیرتے گذرتے چلے گئے۔ یہ مولانا تھے۔

''جی۔ یہ میں ہوں! نفیس! آپ چند قدم آگے چلیں تو گیٹ آپ کو ملے گا۔ آپ آیئے میں اندر کا دروازہ کھولتی ہوں بیٹھیے ؟'' میں نے ویسے ہی بیٹھے خوابیدہ آواز میں ہر قسم کے جوش، جذبہ، ولولہ سے عاری آواز میں کہا اور اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہ کی۔

''نہیں۔ صرف تم سے بات کرنے آیا ہوں۔''

میں خاموش رہی۔

''اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں صبح تمہاری طرف اپنی والدہ کو بھیج دوں۔؟'' میں نے ایک بار پھر اپنی خوابیدہ حالت سے جاگ کر بے اعتباری سے اپنے برابر کھڑے سائے کی طرف دیکھا اور رات کے پہلے پہر کی شبنمی تاریکی میں چھپا وہ وجود میری آنکھوں میں روشن ہوا۔ سفید کھدر کے کرتے پاجامے۔ خشخشی سیاہ داڑھی، موٹے شیشوں کی نظر کی عینک لگائے چالیس پچاس سال کے دُبلے پتلے سنجیدہ چہرے میں چھپے مولانا تھیٹر میں ڈائس پر عین بیچوں بیچ اس طرح بیٹھے نظر آئے کہ پردے کے اس طرف بیٹھے لڑکے بھی نظر میں رہیں اور اُس طرف بیٹھی لڑکیاں بھی اور تھیٹر کی سب سے اوپر کی سیڑھی پر لگی بنچ کے انتہائی دائیں

کونے میں NON CHAKANT انداز میں بیٹھی ہیں۔ اچانک سڑک پر ایک عمر رسیدہ ٹرک کھڑکھڑاتا ہوا گذرتا، میرے وژن کو درہم برہم کر گیا۔ اس کی بیمار روشنی میں مولانا کے وجود کی آؤٹ لائن واضح ہوئی۔ اس مدھم دھیمی روشنی میں میں نے ان کی طرف دیکھا۔ موٹے شیشوں کی نظر کی عینک سے آر پار چھنتی نظروں میں میری نظریں اُلجھ گئیں۔ ٹرک گذر گیا۔ چاروں طرف پھر وہی تاریکی، سیاہی، سناٹا میں نے آہستہ آہستہ سے ہاتھ آگے بڑھا کر بڑی ہی نرم دلی سے مولانا کے بازو کو چھوا۔

''مولانا آپ بہت غلط دروازے پر آئے ہیں۔ آپ کا راستہ۔ یہ راستہ نہیں۔''

مولانا خاموش رہے لمحے، ساکت۔ بانجھ۔ خالی

''ہر مرد کو اسی جیسی عورت ملے گی اور ہر عورت کو اسی جیسا مرد''۔ میرے اندر کے نونے، ریزہ ریزہ ہوتے من سے گہری، پرسکون آواز ابھری۔

''بہت دنوں کی بات ہے مولانا۔ ان دنوں کی جب ہم سورۃ نساء کی تشریح کر رہے تھے تو آپ نے کہی تھی۔''

انہوں نے اب بھی کچھ نہ کہا۔ میں نے قیامت کی بے صبری سے اپنا سر جھٹکا۔

''نفیس۔''

''مگر مولانا کیا آپ کو یاد نہیں۔'' میں نے بات کٹ کر تکرار کی۔

''یاد ہے۔'' انہوں نے اپنے اسی ٹھہرے ہوئے گھمبیر لہجے میں کہا '' اُس صداقت میں کسے شبہ ہے۔'' انہوں نے پورے یقین اور وثوق سے اپنی بات مکمل کی اک مدھم سی اُمید ایک موہوم سی آس نے میرے اندر زیست کی تھکن کے احساس کی گرد کو اک ذرا سا جھاڑ دیا تھا۔ ہر شے کے نین خاتمے پر زندگی کی طرف بلاتی ہوئی اس آواز نے میری آواز میں حرارت پیدا کر دی تھی۔ مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مولانا کی آواز کا یقین ان کے لہجہ کا اعتماد ایک سوئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ ہلکی سی حرارت میرے اندر سے معدوم ہو گئی۔

''تو آپ پھر ایسی خواہش نہ رکھیے'' مضمحل تھکے ہوئے لہجے ہیں، میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ایک ہاتھ کہیں اندھیرے سے نکل کر میرے سر پر آ کر ٹھہر گیا۔ میرے کان، گہرے گھمبیر پرسکون لہجے میں ادا کیے گئے۔ '' بچے'' کو سننے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ ایک لمحہ دو لمحے میں ساکت بیٹھی رہی۔ منتظر! پھر وہ ہاتھ جیسے کہیں اندھیرے سے ابھرا تھا ویسے ہی پھسلتا میرے شانے کو چھوتا غائب ہو گیا۔ میرا جی چاہا میں آسمان کی طرف منہ اٹھا کر زور زور سے رونا شروع کر دوں۔ مگر اس کی بجائے میری ہنسی کی چھوٹی سی آواز اس تاریک سناٹے میں گونجی۔

چند لمحات خاموشی طاری رہی۔ پھر وہ سایہ آہستہ آہستہ چلتا دور ہوتا گیا۔ میں نے دیوار سے نیچے کو لٹکتی، بے جان، سن ٹانگیں اٹھا کر دیوار پر رکھیں (میرے من، میرے من، تیرے اندر کتنی تنہائی ہے، تاریکی ہے، اے میرے من!! کتنی اداسی ہے۔ ویرانی ہے حیرانی ہے۔ اکیلا پن ہے اے من!!) میں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ستاروں سے مزین تاریک آسمان تاحدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔ اور قطرہ قطرہ گرتے شبنم کو قطرے۔ ڈرپ ڈرپ ستاروں کے آنسو۔ (اے میرے من۔ ایسی تنہائی۔ ایسا اکیلا پن!!)

(۴)

دوسری صبح مولانا کی والدہ اور بہنیں آئیں۔ اور چار دن کے بعد یہ رشتہ لڑکی کی رضامندی، معلوم کرنے کے بعد منظور کر لیا گیا۔

OOO

شکیلہ رفیق

قطار میں کھڑا آدمی

"دائیں پنڈلی ذرا زور سے"

غنودگی میں ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ ہی ہاتھی جیسا جسم بائیں جانب لڑھک گیا۔ ادھر شہنشاہ نے دائیں پنڈلی پر گرفت مضبوط کر لی پھر اسے زور زور سے دبانے لگا بالکل یوں جیسے باطن کا سارا غصہ اس مُگدر پر اتار رہا ہو، مگر دوسری جانب صرف خوف ناک خراٹے تھے۔

اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جب سے آنکھ کھلی ہے تب سے ہی وہ اس گھر میں ہے۔ وہ بچہ ہی تھا جب اسے اس گھر میں ملازمت ملی تھی اور اب تو اس بات کو کئی برس بیت گئے تھے۔ جب صاحب جوان تھا اور جوانی سے اسے پیر دبوانے یا بالخصوص پنڈلیاں مسلوانے کا بڑا چسکا تھا۔ رات کا پہلا پہر ہوتے ہی۔ اس کی بھدی اور زوردار آواز کمرے کی دیواروں کو ہلا دیتی۔

"شہنشاہ"

"جی صاحب جی"

"چلو آجاؤ"

اس، چلو کا مطلب یہ ہوتا کہ بقیہ کام اب غیر ضروری قرار دے دیے جائیں اور آج کی تاریخ کا سب سے اہم کام یعنی اس کے پیر دبانے شروع کر دیے جائیں۔

شہنشاہ بھی سارے کام چھوڑ کر یوں بھاگتا جیسے ایک منٹ کی بھی دیر ہوئی تو پھانسی چڑھ جائے گا۔

عموماً وہ نیچے قالین پر بیٹھ کر ہی صاحب کے پیر دباتا تھا لیکن کبھی کبھی جب صاحب اپنی ڈھائی من کا وجود دوسری جانب لڑھکا لیتا تب وہ شہنشاہ کے سیاہ ہاتھوں کی گرفت سے دور ہو جاتا۔ صاحب کو دوبارہ اس طرف کھسکنا اتنا ہی ناگوار محسوس ہوتا تھا جتنا شہنشاہ کو اس کے پیر دبانا۔

"شہنشاہ!"

"جی صاحب"

"اوپر بیٹھ جاؤ"

"ہیں جی؟"

"ادھر.......... کونے پر آجاؤ بیڈ کے اوپر.......... اور اب بائیں پنڈلی مسلو"

وہ گینڈے جیسی گردن کو ذرا سا اٹھا کر ابرو سے بیڈ کے دائیں کونے کی جانب اشارہ کرتا۔

"اچھا جی"

شہنشاہ آہستہ سے اٹھتا اور اس سے بھی زیادہ آہستگی سے بیڈ کے کونے پر بیٹھ جاتا پھر صاحب کی پنڈلی ہاتھوں میں پکڑ کر اسے مسلنے لگتا۔ جب کبھی یہ صورت حال پیش آتی تھی یکا یک ہی وہ اندر سے آگ کا آدمی بن جاتا۔ ایسی آگ جو خود اس کے ہی وجود کو جھلسا دیتی۔ نرم نرم فوم کے گدے پر اپنی سخت ہڈیوں والے جسم کو ٹکاتے ہی وہ جانے کیوں شدید احساس کمتری کا شکار ہو جاتا اور اس کے روئیں روئیں سے جیسے چنگاریاں سی نکلنے لگتیں۔

کیوں؟ آخر کیوں؟ ہم دونوں ایک ہی مذہب اور ایک خدا کے ماننے والے ہیں۔ ایک ہی ملک میں رہتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں انسان ہیں۔ پھر کیوں؟ مجھ میں اور اس آدمی میں اتنا فرق ہے۔ یہ کس بنا پر اس نرم گدیلے پر سوتا ہے۔ اور میں.......... لکڑی کے اس لوہے جیسے تخت کا حق دار ہوں.......... آخر کیوں؟

پھر جوں جوں محرومی کے اس احساس میں اضافہ ہوتا وہ مزید قوت اپنے ہاتھوں میں سمو لیتا۔

''ارے ارے! کیا بوٹیاں نوچ ڈالے گا''

صاحب کے اوندھے منہ کی آواز جیسے پاتال سے آتی محسوس ہوتی۔

''ہیں جی''

''ابے گدھے...... پولے ہاتھوں سے دبا......... سمجھا........ ایسے نہیں کہ میرا گوشت ہی نوچ لے''

(جی تو یہی چاہتا ہے کہ تیرا سارا گوشت نوچ کر چیل کوؤں کو کھلا دوں)

''ابے کچھ سمجھا بھی یا نہیں؟ گاؤدی!''

''سمجھ گیا جی''

اس کی مری ہوئی آواز آئی اور پھر مرے ہوئے ہی انداز میں پیر دبائے جانے لگتے۔

جب وہ گھر جاتا تو سارا غصہ گھر والوں پر اتارتا'' آخر کیا حق پہنچتا ہے اسے کہ وہ مجھے کتوں کی طرح دھتکارے''

''وہ تیرا مالک ہے بیٹا'' ماں سمجھانے والے انداز میں کہتی اور باپ بیڑی سلگا لیتا۔

''کس نے بنایا ہے اسے میرا مالک؟''

''اللہ کے کاموں میں بندے کا دخل نہیں ہوتا بیٹے''

''اللہ کے کام؟'' وہ دانت پیستا'' اللہ کو بیچ میں کیوں گھسیٹتی ہے ماں اس نے تو سب انسانوں کو ایک جیسا بنایا تھا......... وہ تو اب بھی سب کو برابر کہتا ہے۔

''...... یہ...... انسان...... ؟ یہ......؟'' اس کا پورا وجود کڑوا ہو جاتا'' بڑا چھوٹا بنانے والی یہ دنیا ہے...... روپیہ ہے...... دولت ہے...... جس نے میرے ہی جیسے ایک آدمی کو فوم کے قیمتی گدے پر سلایا ہے اور مجھے اس منحوس تخت پر''

وہ تخت کے پائے پر مکا مارتا جس پر اس کی دو چھوٹی بہنیں اور ایک بھائی سمٹے، سکڑے محو خواب ہوتے'' اس لوہے کے بستر پر...... آخر کیوں؟ کیوں اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے ہاتھی جیسے پاؤں دباؤں...... بولو؟''

اب ماں کوئی جواب نہ دیتی اور چپ چاپ اس کا بستر لینے اسٹور میں چلی جاتی۔ پھر وہ ایک دھاری دار دری اور ایک تکیے پر مشتمل اس کا بستر لیے اندر سے برآمد ہوتی اور اسے تخت پر بچھا کر خاموشی سے اپنی چار پائی پر لیٹ جاتی''

ہر دسویں پندرہویں دن اسے اسی قسم کا دورہ پڑتا۔ وہ دولت مندوں اور بالخصوص اپنے مالک کو منہ بھر بھر کر کوستا ماں پہلے تو اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کرتی پھر بعد میں یوں ہی چپ ہو جایا کرتی۔ جانتی جو تھی اس بحث کا کچھ حاصل نہیں۔ پھر خدا کا شکر کرتی کہ تینوں چھوٹے بچے اپنی تقدیر پر قادر تھے۔

مگر...... شہنشاہ کی سوچ ان سب سے قطعاً مختلف راہ پر گامزن تھی۔ اس کے تئیں یہ بحث بے کار نہیں بلکہ اس کا کچھ نہ کچھ حاصل ضرور ہونا چاہیے۔ کم سنی کے باوجود اس کا ذہن روز و شب اسی فکر میں الجھا رہتا کہ کس طرح وہ اپنے مالک جیسا سیٹھ بن سکتا ہے، دولت میں کھیل سکتا ہے۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ مالک سے بھی زیادہ قیمتی بیڈ کے فوم کے نرم و ملائم گدے پر لیٹ کر اونچے اونچے خراٹے لے۔

شاید انہی سوچوں کا اور خواہشات کا نتیجہ تھا کہ دس پندرہ روز میں کسی ایک روز جب ماں اس کے تخت پر دھاری دار دری کھول کر بچھاتی تب اس کا وجود گولیوں سے بھری بندوق بن جاتا اور چیخ اٹھتا۔

''نفرت ہے......... نفرت ہے مجھے اس لوہے کے بستر سے......... نہیں سوؤں گا میں اس پر ہنھ نام شہنشاہ اور بستر......... فقیر سے بھی بدتر.........''

باپ کی دکھ بری نگاہوں سے پوچھتا'' پھر کہاں سوئے گا بیٹے؟''

''اس پر......... اس جیسے بیڈ پر جو اس ہاتھی کے پاس ہے''

''تو اس پر سو نہیں سکتا بلکہ ہم میں سے کوئی نہیں میرے بچے''
''کیوں.........؟'' بندوق سے گولی زن سے باہر آتی۔
''کیوں کہ ہم ویسا بستر نہیں خرید سکتے''
''کیوں نہیں خرید سکتے؟'' ایک اور گولی، اب ماں بولتی.......... ''اس لیے کہ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہی''
''کیوں نہیں ہیں؟'' اب گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی۔ ماں اندر کا لاوا دبا کر نرمی سے بولتی۔
''اس لیے کہ ہم.......... غریب ہیں''
''آخر کیوں غریب ہیں ہم؟'' .... گولیوں کی بوچھاڑ میں ہنوز کوئی کمی نہ ہوتی۔ اب ماں بھی جھنجھلا جاتی ''بس ہیں.......... اس لیے کہ ہماری قسمت میں غریب ہونا لکھا تھا.......... یہی نصیب ہیں ہمارے.......... بس! اب تو چیخ چیخ سارا گھر سر پر نہیں اٹھائے گا نا''
''قسمت.......... ہنھ.......... نصیب.......... بلا وجہ کی باتیں ہیں.......... کیسی قسمت.......... کس کے نصیب.......... قسمت تو انسان خود بناتا ہے، اور نصیب ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے.......... رہی بلا وجہ کی بات۔ تو میں بلا وجہ نہیں بلکہ بہت معقول وجہ سے چیخ رہا ہوں''
''کیا مل جائے گا اس چیخ پکار سے؟'' باپ نے پوچھا۔
''میں اپنی، تمہاری.......... اس سارے گھر کا کایا پلٹ دوں گا''
''چیخ چیخ کر؟''
''ارے ابا بغیر چیخے چلائے تو ماں بھی بچے کو دودھ نہیں پلاتی'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا تو ماں بڑبڑانے لگی۔
''چار لفظ کیا پڑھ گیا ہے.......... کیسا بڑھ بڑھ کے بولنے لگ گیا ہے، دیکھو تو ذرا'' اس نے شوہر کی جانب یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو۔ اب کیا ہوگا اس سر پھرے کا انجام؟ کہ اس کی آواز آئی عجیب گمبھیر سی آواز۔
''تم چار لفظوں کی بات کرتی ہو ماں! میرے تو اب کچھ اور ارادے ہیں''
''کیا؟''
''چار سے کہیں زیادہ ہزاروں، لکھاؤں لفظ پڑھوں۔ محنت مشقت کر کے دن رات ایک کر دوں اور پھر.......... '' اس کی آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے'' اس ہاتھی سے کہیں زیادہ قیمتی گدا خرید کر اس پر سو جاؤں.......... پورے بیڈ پر بچوں کی طرح لوٹیں لگاؤں.......... ہاہا''
''یہ بستر تو اس کی جان کا روگ بن گیا ہے'' ماں جیسے اپنے آپ سے بولی۔
اس نے بڑبڑاہٹ کا جواب بھی دینا بھی ضروری جانا'' مالک اور اس کا وہ نرم بستر میری آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے ماں! جب تک میں اس سے زیادہ قیمتی بستر پر نہ لیٹ لوں گا مجھے چین کی نیند ایسے ہی حرام ہے جیسے اسے بے چینی کی''
''ٹھیک ہے.......... ٹھیک ہے.......... ضرور خرید لینا مگر، اللہ کے واسطے ایسی باتیں نہ کر.......... نہ کیا کر میرے بچے!''
ماں نے کہا پھر قبل اس کے کہ اس کے ترکش سے کوئی اور تیر نکلتا جلدی سے بولی'' شکر ہے آج تو نے اچھی باتیں کی ہیں''
''وہ کون سی؟''
''یہی پڑھنے لکھنے اور محنت کرنے والی، بس ایسے ہی سوچا کرے گا تو ایک نہ ایک دن ضرور بڑا آدمی بن جائے گا''
''پتہ نہیں تمہارے ذہن میں بڑے آدمی کا تصور کیا ہے'' اس نے زہر خند ہو کر کہا۔ بہر حال ایسا ایک نہ ایک روز ہوگا ضرور .... پھر بھائی بہنوں کے فرض کے ساتھ تمہیں اور ابا کو بھی سکھ پہنچاؤں گا۔''
''انشاءاللہ'' ماں صدق دل سے بولی۔ وہ ہنس دیا بڑی عجیب سی ہنسی۔

... کو سے چھپا کر کتابوں میں ہی رہے گا۔

اس کا مالک جمعرات کی رات شہر سے دور ساحل سمندر پر گزارتا تھا اور پھر جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی شب اس کی واپسی ہوتی تھی۔ اس طرح جمعہ کا روز اس کی چھٹی کا روز ہوتا تھا۔ اس نے اس روز کرسیاں بننے کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے بہت جلد یہ کام سیکھ لیا اور اب ہر جمعہ کو وہ کرسیاں بننے نکل جایا کرتا تھا۔

گو کہ اس کی تعلیم و آمدنی، دونوں کا سلسلہ بہت سست رفتاری سے جاری تھا۔ لیکن اس صورت حال نے نہ تو اسے پریشان کیا تھا نہ ہی بد دل۔ اس کے برعکس اس کا سفر دل جمعی و مستقل مزاجی کے ساتھ نرم گدے کی جانب جاری تھا۔

کم سنی سے ہی دولت مندوں کی غلامی کے سبب وہ اپنی اصل عمر سے کہیں بڑا اور سمجھ دار ہو گیا تھا۔ اسی لیے سوچتا تھا کہ ان کاموں میں جلد بازی کی بجائے آہستہ روی ہی مناسب ہے۔ سو اس کا سفر عقل مندی و آہستہ روی کے ساتھ جاری تھا وقت جو کسی کے بس میں نہیں آتا۔ اس نے اس کا ایک کونا اپنی مٹھی میں تھام لیا تھا۔ نویں اور دسویں کا امتحان ایک ساتھ دے کر اس نے ایک سال کا وقت بچا لیا تھا۔ ادھر استادوں کی حوصلہ افزائی نے اسے نئی امنگیں اور ولولے کچھ یوں عطا کئے کہ وہ ایک دم ہی صبا رفتار ہو گیا۔ اب اس نے باتھی کی ملازمت بھی چھوڑ دی تھی۔

وقت گزرتا تو اپنی رفتار سے ہی ہے مگر لوگ اپنی اپنی سوچ اور کارکردگی کے مطابق اسے نہ جانے کیا کیا نام دے دیتے ہیں وقت تو پر لگا کر اڑ گیا۔ وقت تو جیسے تھم کر رہ گیا ہے۔ کیا آناً فاناً وقت گزرا ہے۔ وقت کیسی سست رفتاری سے گزر رہا ہے وغیرہ وغیرہ اور رہ گیا وقت۔ تو وہ بے چارہ تو اپنی مقررہ رفتار سے گزرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرتا۔ سو یہاں بھی یہی ہوا۔ شہنشاہ جو پہلے صرف نام کا شہنشاہ تھا۔ اب حقیقتاً شہنشاہ بننے کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ اپنی پڑھائی، شب و روز کی محنت اور قطار میں سب سے آگے تک پہنچ جانے کی لگن۔ آج اسے اس مقام پر لے آئی تھی جس کے خواب اس کی کم سن آنکھوں نے ملازمت کے دوران بارہا دیکھے تھے۔

نہ جانے بچپن کا وہ شعوری احساس تھا یا اپنی کم مائیگی کا دکھ کہ شہنشاہ کوئی کام بھی کر رہا ہوتا اس کے ذہن میں مالک کا وہ نرم اور گدگدا بستر سدا ہی کیڑے کی مانند کلبلایا کرتا۔ وہ کرسیاں بن رہا ہوتا کہ اچانک .... بید کے ننھے ننھے سوراخوں سے موٹی اور بدنما پنڈلیاں جھانکنے لگتیں۔ نگاہوں کے سامنے کتاب کھلی ہوتی، اس میں لکھی ہوئی تحریر اچانک کہیں غائب ہو جاتی اور پھر .... صفحے پر ایک بیڈ کی تصویر بن جاتی۔ جس کے فوم گدے پر باتھی بے سدھ پڑا ہوتا اور وہ ....؟ وہ سر جھکائے اس کی پنڈلیاں مسل رہا ہوتا وہ جھنجھلا کر کتاب پٹخ دیتا۔ وقت تو گزر گیا تھا مگر اس کے ذہن سے وہ خیال ہنوز چپکا ہوا تھا، آکٹوپس کی مانند اسے جکڑے ہوئے تھا۔

ماضی کا وہ لاشعوری احساس اب شعور میں بھی رچ بس گیا تھا۔ شاید اسی لیے تعلیم کی تکمیل کے بعد جب اس نے اپنے ذاتی کاروبار کے بارے میں سوچا تب شعور میں رچے بسے بیڈ کا پایہ ناگ کے پھن کی طرح پھنکار کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا عین اسی لمحے اس نے فرنیچر کی تجارت کا فیصلہ کر لیا۔

جس روز دکان کا افتتاح ہوا وہ جیسے نشے میں جھومتا گھر پہنچا ''ماں .... او ماں ....!''

ماں .... جس کی رفتار کے ساتھ آواز بھی دھیمی ہو چکی تھی۔ آ رہی ہوں۔ کہتی ہوئی کوشش کر کے تیز قدموں اس تک پہنچی۔

''ماں ....! آج میرا، تمہارا، ابا کا بلکہ ہم سب کا خواب پورا ہو گیا ہے۔ برسوں پرانا خواب ..؟...... میں بڑا آدمی بن گیا ہوں ماں! بڑا آدمی .... ہاہاہا''

وہ بچوں کی مانند قہقہے لگا رہا تھا اور اس کا چہرہ بھی اس وقت بچوں کی طرح معصوم نظر آ رہا تھا.......... ماں نے خوش ہو کر کہا
''میرا بچہ.......... میرا لعل.......... تو اس سے بھی بڑا آدمی بنے''
یہ سن کر دونوں چھوٹی بہنیں، جو شور سن کر کمرے سے نکل آئی تھیں، ہم آواز ہوئیں...... ''آمین''...... وہ بے حد مسرور ہو کر ایڑیوں پر گھوم گیا.......... ''اب میں ایک بہت بڑا گھر بناؤں گا۔ اس میں سب کے علاوہ علیحدہ علیحدہ کمرے ہوں گے جن میں اعلیٰ معیار کی لکڑی کے بنے ہوئے بیڈ ہوں گے جن پر عمدہ قسم کے فوم کے گدے ہوں گے اور''
اور......
جیسے کسی نے ماں کے چہرے کا سارا خون یک مشت نچوڑ لیا ہو۔ اس نے لرزتے کانپتے لبوں سے درمیان ہی میں ٹوک دیا.......... ''شہنشاہ!!''
''ہاں ماں؟''.......... اس نے استعجاب سے اسے دیکھا۔
وہ چند ساعت اس کا گلنار چہرہ دیکھتی رہی؟ پھر بجھی ہوئی آواز میں بولی ''تو.......... اب تک اس بات کو نہیں بھولا......؟''
شہنشاہ کی شکل یکا یک پگھلی ہوئی موم بتی کی طرح ہوگئی اس بات کو میں کیسے بھول سکتا ہوں ماں؟ بچپن سے لے کر آج تک وہ مجھے ناگ کی طرح ڈستا رہا ہے۔ تب ہی تو.......... اب جا کر میں نے اس زہر کو تریاق کیا ہے۔ پھر بھی تم سمجھتی تھیں کہ میں اسے بھول چکا ہوں گا۔ نہیں ماں.......... گزرے ہوئے پچیس برسوں کے طویل عرصے کے کسی لمحے بھی میں اس بات کو نہیں بھول پایا۔ اور اس وقت تک نہ بھولوں گا جب تک کہ اس قیمتی بیڈ پر لیٹ نہ لوں.......... اس وقت تک نہیں''
اس کے انداز میں مسرت، دکھ، آس، یقین اور بے یقینی کا ملا جلا امتزاج تھا۔ ماں نے اسے لپٹا لیا۔
''چل اب بھول جا اس بات کو.......... اللہ نے تجھے اتنا دے دیا ہے کہ اب تو اپنی ہر خواہش پوری کر سکتا ہے پھر اب کیا غم.......... اس کا شکر ادا کر''
''واہ ماں!.......... یہ بھی خوب کہی تم نے! سب کچھ تو میں نے اپنے زور بازو سے حاصل کیا ہے اور شکر اللہ کا ادا کروں!.......... ''اس کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا۔
''توبہ کر شہنشاہ.......... جب تک اس کی رضا شامل نہ ہو انسان تنکے کے برابر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا.......... بہت بری بات ہے توبہ کر..........''
''اس نے تو ہمیں غریب پیدا کیا تھا اور شاید ساری زندگی غریب ہی رکھتا۔ وہ تو میرے ارادے کے مضبوط خنجر کا کمال ہے جس نے غریبی کی تمام زنجیریں کاٹ ڈالیں ورنہ.......... اپنا آسمان والا تو کفن بھی شاید چندے کا دیتا.......... ہنھ!''
''کیا کفر بک رہا ہے.......... توبہ کر'' ماں سہم کر بولی۔
''چھوڑو ماں کیا رکھا ہے ان باتوں میں''
مگر ماں کو مسلسل سنجیدگی سے اس بات پر مصر پا کر اس نے گال تھپک کر کہا۔
''توبہ.......... نہ صرف میری بلکہ میرے باپ کی بھی توبہ''
''شاباش! آئندہ بھی کبھی ایسی کوئی بات نہ کرنا'' سادہ دل عورت نے مطمئن ہو کر تنبیہ کی.......... اور وہ مسکرا دیا۔
ابتدا میں دوکان بھی چھوٹی تھی اور فرنیچر بھی اوسط درجے کا۔ مگر جلد ہی اس کی کٹھنائیاں اور سلجھی ہوئی منصوبہ بندی رنگ لائی اور دوکان صدر کے علاقے سے ہٹ کر کلفٹن کے معیاری علاقے میں منتقل ہوگئی۔ اب شہنشاہ فرنیچر مارٹ کے نام سے اس کا شمار فرنیچروں کی معروف دوکانوں میں ہونے لگا۔
بھائی بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے چلا گیا۔ بہنوں کی شادیاں ہوگئیں۔ اس دوران اس کی دوکان کی شہر میں دو شاخیں اور کھل گئی تھیں۔
اس نے اپنی منزل پا لی تھی۔ اپنی مرضی کے ہر شے حاصل کر لی تھی لیکن عمر کا آدھا حصہ گنوا کر وہ اڑتیس سال سے تجاوز کر گیا

چت لیٹ گیا اور اطمینان سے پینٹ کی بنی ہوئی چھت کو تکتا رہا۔ پھر اس نے دائیں سمت کروٹ لی۔ ......
پھر بائیں جانب......... سامنے ایک خوبصورت پینٹنگ تھی مگر وہ نرم و گداز بستر میں گم تھا۔ بائیں کروٹ لیے ابھی اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک وہ اوندھا ہو گیا اور پھر......... تو نہ جانے اسے کیا ہو گیا یا تو اس نے ننھے بچے کا روپ دھار لیا تھا یا پھر وہ پاگل ہو گیا تھا......... لمبے چوڑے بستر پر اس نے ادھر ادھر پھدکنا شروع کر دیا۔ کبھی بیڈ کے ایک کونے پر چلا جاتا کبھی دوسرے، کبھی اچک کر درمیان میں بندر کی طرح بیٹھ جاتا۔ پھر اچانک اس نے قلابازیاں کھانی شروع کر دیں۔

نہ جانے کتنی ہی دیر وہ ایسی عجیب و غریب اور احمقانہ حرکتیں کرتا رہا۔ آخر جب تھکن نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تب وہ ہانپتا ہوا لمبا ہو کر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ مگر تھکی ہوئی سانسوں کے باوجود وہ آسودگی کے دریا میں ڈوبا ہوا تھا......... آج کی رات کیسی چمکیلی ہے......... کتنی روشن! جیسے کوئی گھپ اندھیرے میں روشنی کی لکیر کھینچتا دور چلا جائے اور فضا صدیوں تک خوشگوار و روشن رہے۔ وہ چمکتی آنکھوں سے سوچ رہا تھا۔

اور وہ اسی روشنی میں نہا رہا تھا، چمک سے اس کی آنکھیں چندھیائی جا رہی تھیں۔ اپنے اس خواب کی تکمیل کے لیے اسے کتنی تگ و دو کرنی پڑی تھی۔ وہ زندگی کی اڑتیسویں سیڑھی پر کھڑا تھا۔ خوشی اس سے سنبھالی نہ جا رہی تھی اور شاید یہی بے انتہا خوشی، سبب تھی ان حرکات کی جو ابھی کچھ دیر قبل اس نے بچوں کی مانند کی تھیں۔ سرور کے عالم میں اس نے اسی بار پھر لڑھکنیاں کھانی شروع کر دیں۔ زندگی کے تیز رفتار اونٹ کی نکیل اب اس کے ہاتھوں میں تھی اور اپنی مرضی کے مطابق اسے موڑ لیتا تھا۔

ہر رات جب وہ بستر پر لیٹتا وہی تمام حرکتیں دہراتا۔ ایک روز قلابازی کھاتے ہوئے اس کی پشت کے درمیانی حصے میں زور دار چمک سی ہوئی......... ''اف!.........'' اس کے لبوں سے چیخ نکلی پھر ایک دم ہی وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس عمل سے اسے فوری طور پر آرام ملا۔ پھر چند منٹ بعد درد ختم ہو گیا......... ''اس عمر میں ایسی بے تکی حرکتیں اور کیا رنگ دکھائیں گی.........''
اس نے سوچا۔ پھر وہ سیدھا لیٹا تو بالکل معمول کے مطابق تھا۔ اس نے خود ہی مرض کی تشخیص کی پھر اپنے ہی علاج سے مطمئن بھی ہو گیا۔

اپنے مالک کی طرح اس نے بھی ایک ملازم رکھ لیا تھا جو دن رات اسی کے یہاں رہتا تھا اور رات کو پیروں میں درد نہ ہونے کے باوجود اس سے پیر دبواتا تھا.........

پنڈلیاں مسلواتا تھا

پر.........

وہ اس تسکین سے محروم تھا جو اس کے تئیں سیٹھ اسے پیر دبوا کر حاصل کرتا تھا بلکہ بلا سبب پیر دبوانے سے ان میں عجیب قسم کا کھنچاؤ اور اینٹھن سی ہونے لگتی تھی۔ جس سے الجھ کر وہ کہہ اٹھتا۔

''بس......... ٹھیک ہے''

''جی.........؟''

''جاؤ سو رہو''

لڑکا اٹھ کر چلا جاتا اور وہ کروٹیں بدلتا رہتا۔ پیروں میں تو نہیں، البتہ اس کی پیٹھ میں کبھی کبھی درد ہو جاتا تھا ایک ایسی ہی رات جب وہ ملازم لڑکے سے زبردستی پیر دبوا رہا تھا کہ اچانک ہی اس کی پشت کے درمیانی حصے میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی اور وہ تڑپ کر بولا......... ''اف.........!!''

''کیا ہوا صاحب جی؟''

''ماں کو کہو ڈاکٹر کو فون کریں..........''

ملازم اس کے پاؤں چھوڑ کر گھبرا کر باہر بھاگا۔

جتنی دیر ڈاکٹر شہنشاہ کا معائنہ کرتا رہا۔ ماں باپ کے فکر مند چہرے سوالیہ نشان بنے رہے۔

''فی الحال سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا.......... فوری آرام کے لیے بہر حال دوا دیے دیتا ہوں'' خاصی دیر کے معائنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔ تو باپ نے گھبرا کر پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ صبح ان کو ہاسپٹل لے کر آ ئیے وہاں ایکسرے اور دیگر چیک اپ کے بعد ہی صحیح صورت حال سامنے آئے گی۔ ویسے فکر کی کوئی بات نہیں ہے''

''ڈاکٹر صاحب؟'' ماں کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔

''میں نے کہا نا فکر کی کوئی بات نہیں ہے.......... جو دوا میں دے رہا ہوں اس سے فوری آرام آ جائے گا۔ باقی ایکسرے وغیرہ کے بعد جو ٹریٹمنٹ ہوگا۔ اس سے درد یوں غائب ہو جائے گا''.......... ڈاکٹر نے چٹکی بجائی شاید ماں کو مطمئن کرنے کے لیے اور وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہا۔ باپ کے چہرے پر بھی اطمینان کا سایہ لہرایا۔

ڈاکٹر چلا گیا۔ شہنشاہ کو بھی نیند آ گئی تھی۔ مگر وہ دونوں جاگ رہے تھے۔ ملازم کو انہوں نے سونے کے لیے بھیج دیا تھا۔

''تم جا کر سو جاؤ۔ میں ہوں یہاں'' کچھ دیر بعد ماں نے خاوند سے دھیمی آواز سے کہا

''اور تم..........؟'' گویا وہ جانے پر رضامند تھا۔ ضعیفی اس سے زیادہ کی متحمل ہو بھی نہ سکتی تھی۔

''میں ابھی یہی رہوں گی''

ماں کی مامتا کے آگے ضعیفی تو کیا سب کچھ شکست خوردہ ہو جاتا ہے۔ قدرے ہچکچاہٹ کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا ماں اپنی جائے نماز وہیں لے آئی اور پڑھ پڑھ کر اس پر پھونکنے لگی۔

اگلے روز اسپتال میں اس کے ایکسرے ہوئے، ٹیسٹ وغیرہ کے بعد معلوم ہوا کہ مسلسل کام، فکر اور بالخصوص جھک کر کام کرنے سے ریڑھ کی ہڈی میں قدرے گڑ بڑ ہے۔ ڈاکٹر نے دواؤں کے ساتھ اسے چند ورزشیں بتاتے ہوئے کہا.......... ''فکر مند ہونے کی کوئی بات نہیں آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے'' جی.......... '' وہ قطعاً فکر مند نہ تھا۔

''بس آپ فوم پر سونا فوراً چھوڑ دیں.......... اور تخت پر سویا کریں''

OOO

عرش صدیقی

ہم نشینی کا عذاب

میرا گھر بہت مختصر ہے۔ اس میں صرف ایک کمرہ ہے۔ کمرے کی ایک کھڑکی ہے اور ایک دروازہ میں دوسرے دروازے سے ڈرتا ہوں اور کھڑکی پر جان دیتا ہوں۔ شروع میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہے لیکن اب میں جان گیا ہوں، مجھے اس علم سے فائدہ ہوا یا نقصان میں طے نہیں کرسکتا ہاں کبھی کبھی دل کہتا ہے کہ میں اس علم سے بے بہرہ رہتا تو اچھا تھا۔ مجھے یہ علم اسد اور آصف کی تنقید سے حاصل ہوا ہے۔ میرے یہ دوست میری بھلائی کے خواہاں ہیں اس لیے اس علم کو میرے لیے باعث سکون ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہے ہاں اب مجھے یہ ضرور معلوم ہوگیا ہے کہ کمرے میں آ کر میں یہ کیوں محسوس کرتا ہوں کہ بچہ ماں کی گود میں آ دبکا ہے یا چوزہ مرغی کے پروں میں چھپ گیا ہے۔

میں دروازے سے کمرے میں داخل ہوکر جب دروازہ بند کرتا ہوں تو دل ہی دل میں اسے کہتا ہوں۔

''اے دروازے، میرے محسن، میں تیرا ممنون ہوں۔''

کئی بار میں نے یہ بھی کہا ہے۔

''ماں، تیری گود میں سکون ہی سکون ہے۔''

یہی دروازہ مجھے کمرے سے باہر جانے پر بھی مجبور کرتا ہے اس لیے میں دروازے کے لیے احساسِ ممنونیت رکھنے کے باوجود اس سے خوفزدہ رہتا ہوں لیکن کھڑکی کے لیے میں متضاد احساسات نہیں رکھتا، اس سے تو میں صرف محبت کرتا ہوں۔

اسد کہتا ہے کہ میں کم حوصلہ ہوں اور زندگی سے کٹا ہوا ہوں اس لیے الگ تھلگ رہتا ہوں۔ مگر یہ کیوں ہے کہ کمرے میں آ کر مجھے اپنا رشتہ باہر کی دنیا سے بڑا استوار معلوم ہوتا ہے۔ مجھے تو اس رشتے کا احساس ہی کمرے میں داخل ہونے کے بعد ہوتا ہے اور میں باہر کی دنیا کو صرف اسی وقت دیکھ سکتا ہوں جب میں اپنے کمرے میں ہوتا ہوں تو سہا سہا صرف اپنے بارے میں خوف کی سوچ سوچتا رہتا ہوں کمرے سے باہر یوں لگتا ہے جیسے بیرونی دنیا کا دباؤ مجھے اپنے ہی اندر دھکیل دیتا ہے اور کمرے میں آ کر میں آزاد ہو جاتا ہوں۔

دروازہ عرف عام میں بابِ آزادی کہلاتا ہے لیکن میں دروازے سے ڈرتا ہوں اور باہر کی دنیا سے بھاگ کر اپنے کمرہ میں آ جاتا ہوں تو کیا میں آزادی سے ڈرتا ہوں؟— میں تو مسلسل آزادی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں اور باہر سے اندر کی طرف آزادی کی تلاش ہی میں رجوع کرتا ہوں جب میں اپنے اردگرد گھٹن محسوس کرتا ہوں تو میں اپنے اندر چھپ کر بیٹھ جاتا ہوں اور خود کو آزاد محسوس کرنے لگتا ہوں۔ اسد کمرے کو قید خانے سے تشبیہ دیتا ہے۔ اور باہر کی آزاد فضاؤں کا عاشق ہے لیکن میرے لیے باہر کی دنیا کے ضابطے اور پابندیوں کے جال اور افراتفری کا عالم وجہ آزار ہیں میں تو بالکل آزاد رہنا چاہتا ہوں اور اسی لیے عشق کا قائل نہیں ہوں کیونکہ جیسا کہ کسی نے کہا ہے عشق اپنی بقا کے لیے متعلقہ فرد کی آزادی کو اپنی خوراک بناتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔

اسد میرا دوست ہے لیکن نہ میں نے اس کے لیے اپنی آزادی کو ختم کیا ہے نہ اس نے میری خاطر اپنی عادات کو چھوڑا ہے، ہماری دوستی ایک دوسرے کی آزادی کی ضامن ہے۔ ہماری دوستی کی بنیاد مشترک خصوصیات پر نہیں بلکہ متضاد عادات پر ہے۔ وہ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا ہے اور میں گھر پر گزارتا ہوں۔ وہ میرا بچپن کا ساتھی ہے۔ ہم تمام تضادات اور اختلافات کے باوجود دوست ہیں اور یہ دوستی اس وقت تک قائم رہے گی جب تک ہماری طبیعتوں کا تضاد قائم ہے۔ اسے سینما دیکھنا، ٹینس کھیلنا، سیر کرنا اور دوسری ایسی دلچسپیوں میں مصروف رہنا پسند ہے جبکہ میں اس کی ہنگامہ پسند طبیعت سے بے زار ہو جاتا ہوں۔ مجھے تنہائی پسند ہے اور میں شطرنج کھیلتا ہوں۔ جب وہ آدھی رات کو صرف سونے کے لیے گھر آتا ہے تو میں اس کی آمد پر خوش ہوتا ہوں اور جب وہ دفتر سے واپس آ کر فوراً ہی ٹینس کھیلنے چلا جاتا ہے تو مجھے اور زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ اگر وہ بھی میری ہی طرح ہر وقت کمرے میں

رہنے لگے تو میرے لیے ناقابل برداشت ہو جائے۔ اس کی تنقید سے پہلے میں اپنے آپ میں مگن رہتا تھا لیکن اب اس نے مجھے اپنی دریافت پر مامور کر دیا ہے اور اب دوسری مجبوریوں میں ایک مجبوری یہ بھی ہے کہ بیٹھا خود کو تلاش کرتا رہوں''۔۔ لیکن کیا واقعی میں گم ہو گیا ہوں؟ اور کیا فرد خود کو دریافت کر سکتا ہے؟''

''آنکھوں والو میں گم ہو گیا ہوں۔ کیا تم نے مجھے کہیں دیکھا ہے؟ میں اپنی تلاش میں نکلا ہوں۔ میری مدد کرو'' یہ باتیں بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں لیکن میں نے ایسی باتیں کی ہیں۔

اپنی گمشدگی کا احساس مجھے گھر سے باہر رہ کر ہی ہوتا ہے۔ کمرے میں یہ احساس نہیں ہوتا، کمرے میں بیٹھے ہوئے تو یوں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے خود کو ہی نہیں پوری دنیا کو پالیا ہے۔ یہ کمرہ جیسے کسی روح کا ہاتھ ہے جو مجھے اشیا کے ڈھیر سے جس میں میں گم ہو جاتا ہوں ڈھونڈ نکالتا ہے۔

میرا یہ کمرہ اوپر کی منزل میں ہے۔ نیچے دو کانیں ہیں۔ یہ مختصر سی عمارت سڑک کے عین کنارے پر واقع ہے۔ پختہ سڑک کا یہ آخری سرا ہے۔ دائیں جانب یہ سڑک شہر کو جاتی ہے لیکن آگے بائیں جانب اور سامنے کھیت ہی کھیت ہیں۔ ہاں سامنے دائیں ہاتھ چھدری سی آبادی ہے۔ کھڑکی سے یہ سارا منظر اچھی طرح دکھائی دیتا ہے۔ باہر کی دنیا کی وہ وسعتیں ہنگامے اور تبدیلیاں جو گھر سے باہر میرے لیے باعث عذاب ہیں کھڑکی سے بڑی دلکش معلوم ہوتی ہیں اور باہر کی دنیا بڑی متنوع نظر آتی ہے۔ کھڑکی میں ہر وقت کوئی نہ کوئی دلکش تصویر آویزاں دکھائی دیتی ہے۔ یہ کھڑکی آزادی اور مسرت کی دنیا اور مسرت کی دنیا کا صدر دروازہ ہے۔ بادل کا ایک ٹکڑا بھی سامنے سے گزرتا ہے تو مجھ سے سرگوشی کر کے جاتا ہے۔ میں اس سے موسموں کی آوازیں سنتا ہوں اور ان کے رنگ دیکھتا ہوں۔ یہ کھڑکی ایک اسٹیج ہے یا پھر سینما کا پردہ جس پر ہر وقت زندگی کا کوئی نہ کوئی کھیل کوئی نہ کوئی ڈرامہ ہوتا رہتا ہے اسد کو ان میں سے کوئی چیز بھی نظر نہیں آتی۔ ''مجھے یقین ہے تم غلطی پر ہو بلکہ تمہارے دماغ میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔'' وہ مجھے کہتا ہے۔ میں اس لیے چپ رہتا ہوں کہ میرے پاس یقین کی وہ دولت نہیں جو اس کو میسر ہے۔ عین ممکن ہے اس کی رائے درست ہی ہو۔ وہ کہتا ہے، میں زندگی میں ڈوبنے کا حوصلہ نہیں رکھتا اور زندگی کو محسوس کرتے اور جاننے کے لیے اس میں ڈوبنا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے میں زندگی کو نظر انداز کر کے زندگی کا عکس دیکھتا ہوں۔ مجھے شے نہیں شے کا تصور عزیز ہے۔ لیکن سمندر یا دریا کا نظارہ اس میں ڈوب کر تو نہیں ہو سکتا!

کیا میں واقعی زندگی سے کٹ گیا ہوں؟ کیا انسان جیتے جی زندگی سے کٹ سکتا ہے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ جو کچھ بھی ہے اور جس صورت میں بھی ہے وہ سب زندہ اور زندگی سے مربوط ہے؟

زندگی کے سمندر کے سامنے ایک قطرہ ہوں اور اگر دنیا صحرا ہے تو میں ایک ذرہ ریگ ہوں میں قطرے کو سمندر سے اور ذرے کو ریگستان سے الگ رکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ جب تک قطرہ سمندر سے اور ذرہ ریگستان سے الگ ہے اس کی اپنی ہستی کا طلسمات قائم ہے۔ سمندر قطرے کو کھا جاتا ہے اور صحرا ذرے کو۔ یہ صورت حال احساس کے لیے عذاب کی صورتِ حال ہے۔ اسی لیے میں ہجوم سے ڈرتا ہوں۔ لیکن ڈرتا تو میں اسد سے بھی ہوں۔ اسد میں ہجوم کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ اس میں اتنی قوت ہے کہ اگر میں اسے اپنے بہت زیادہ قریب آنے دوں تو وہ مجھے کھا جائے گا جیسے سمندر قطرے کو کھا جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا ایسا ہوتا ہے لیکن میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مٹنا نہیں چاہتا۔ میں ہونے کا احساس رکھتا ہوں اور میں اس احساس کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے کائنات کا وجود میرے اپنے وجود سے ہے۔ میں نہیں ہوں تو کچھ نہیں ہے باوجود اس حقیقت کے کہ قطرہ ختم ہو جاتا ہے اور سمندر قائم رہتا ہے۔

میں ایک عجیب اور پیچیدہ صورت حال کا اسیر ضرور ہوں۔ لیکن یہ اسیری ہی میری بقا کی ضامن ہے۔ مچھلی پانی میں اسیر ہے لیکن یہ اسیری ہی اس کی زندگی ہے۔ اسی لیے مجھے اپنی صورت حال کا دکھ نہیں ہے۔ میں ایک چھوٹی سی مچھلی ہوں اور یہ کمرہ میرا بحر اوقیانوس ہے۔

ہونے اور نہ ہونے کا مسئلہ مجھے پہلے پریشان نہیں کرتا تھا لیکن اب کرتا ہے شے بھی نظر آئی ہے اور اب ممکن بھی شے بھی ہے

عکس قائم رہتا ہے۔ وہ کبھی نہیں مٹتا۔ اگر عکس خواب کی طرح ہے تو یہ بھی یقین سے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ شے بھی عکس نہیں ہے یا خواب نہیں ہے؟ شاید میری زندگی بھی ایک خواب ہے میں کوئی خواب ہی دیکھ رہا ہوں، طویل اور مسلسل اور جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ اشیا نہیں بلکہ اشیا کے عکس علامتیں اور اشارے ہیں۔۔۔ یا شاید خواب ہی نہیں دیکھ رہا، اسد دیکھ رہا ہے یا آصف دیکھ رہا ہے یا کوئی اور چوتھی ہستی یہ خواب دیکھ رہی ہے اور یہ ہستی چوتھی نہیں بلکہ پہلی ہے اور ہم سب اس ہستی کے خواب کے بہت سے کرداروں میں سے چند کردار ہیں۔

میری زبان سے اس قسم کی باتیں سن کر اسد مجھے یوں دیکھتا ہے۔ جیسے کوئی غبی شاگرد اپنے فلسفی استاد کو دیکھتا ہے۔ وہ مجھے کنوئیں کا مینڈک کہتا ہے میں احتجاج کرتا ہوں تو وہ مجھے بتاتا ہے کہ کنوئیں کا مینڈک نہیں جانتا کہ وہ کنوئیں کا مینڈک ہے۔ وہ مجھے یہ بھی سمجھاتا ہے کہ گاؤں کے گندے جوہڑ کی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں سمجھتی ہیں کہ یہ جوہڑ ہی ساری دنیا ہے۔ سامنے سبزے کا سمندر لہراتا ہے تو میں نہ صرف سوچتا بلکہ بعض اوقات اسد یا آصف سے پوچھتا ہوں۔

اسے دیکھیں یا اس میں ڈوب جائیں

اسد کہتا ہے ''تم نہیں ڈوب سکتے۔ تم ڈوبنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔'' اصل میں وہ میری بات نہیں سمجھتا میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسے دیکھنا ہی بہتر ہے اس دیکھنے کو ڈوبنا کہہ لیں تو ٹھیک ہے لیکن وہ ڈوبنے کے یہ معنی نہیں لیتا۔

اور سامنے ایک مکان کے صحن میں جو سنہری رنگت والی ایک جوان لڑکی کام کرتی نظر آتی ہے وہ اسد کو کیوں اچھی نہیں لگتی ہے۔ میں اس میں بہت دلچسپی لیتا ہوں اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہوں پھر اسد کیوں کہتا ہے کہ میں زندگی سے کٹا ہوا ہوں؟

یہ لڑکی کون ہے اس کا کیا نام ہے۔ میں یہ نہیں جانتا اور نہ مجھے یہ جاننے کی ضرورت ہے۔ میں اسے دیکھتا ہوں اور دیکھنے کے لیے نام جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ سونے کی طرح دمکتی ہے اس لیے میں اسے سونا کہنے لگا ہوں۔ اسد اور آصف کہتے ہیں کہ میں اس سے عشق کرتا ہوں۔ لیکن یہ غلط ہے میں اس سے عشق نہیں کر سکتا میں کسی سے عشق نہیں کر سکتا، میں آزاد رہنا چاہتا ہوں، زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ عشق میں مکمل غلامی ہے اور مکمل موت۔ عشق میں آدمی کے امر ہونے والی باتیں سب سے رومانی جھوٹ ہیں۔۔۔ ہاں یہ درست ہے کہ عشق آگ ہے اور عشق کرنے والا اس میں جل کر ختم ہو جاتا ہے۔ باقی نہیں رہتا۔۔۔ نہ ہونے یا باقی نہ رہنے کا احساس کرب انگیز ہے۔ ہوتے ہوئے نہ ہونے کا احساس کیوں کر دل میں جگہ پا سکتا ہے!

سونا بہت توانا اور صحت مند ہے۔ وہ گھر کے سب کام کرتی ہے۔ گائیں بھینسیں اس کی نگہداشت سے زندہ ہیں۔ وہ کپڑے دھوتی ہے۔ صحن کی صفائی کرتی ہے اور بڑی بڑی بدوضع چار پائیوں کو دھوپ میں ڈال کر ایک وزنی لٹھ سے خوب پیٹتی ہے، پیٹتی ہے اور ہنستی جاتی ہے۔ دھوپ میں اس کے جسم کے عریاں حصے سونے کی طرح دمکتے ہیں۔ آصف اس کی صحت کا مداح ہے لیکن اسد کچھ نہیں کہتا صرف مسکراتا ہے اور یہ مسکراہٹ مجھے بڑی بے معنی سی مضحکہ خیز سی بے موقع سی معلوم ہوتی ہے۔

ایک رات سونا میرے خواب میں آئی۔ وہ تنہا نہیں تھی اس کے ساتھ اس کا وزنی لٹھ بھی تھا اور صبح کو میں یہ سوچتا ہوا بیدار ہوا کہ کیا خواب یا کسی کے خواب کا کوئی کردار بھی خواب دیکھ سکتا ہے۔

اسد اور آصف مجھ پر بہت ہنسے اور کہتے رہے کہ عشق میں تیزی آ رہی ہے۔

ایک روز بارش ہوئی تھی۔ سونا کے گھر کا صحن کیچڑ سے بھر گیا تھا۔ ایک گائے کچھ یوں پھسلی تھی کہ اسے اٹھنا محال تھا۔ اس وقت یا تو کوئی مرد گھر پر نہیں تھا یا پھر سب کو سونا کی قوت پر اعتماد تھا کیونکہ سونا آستینیں چڑھائے پائنچے اُڑسے گائے کے پیٹ تلے ہاتھ دیے اوپر کو زور لگا رہی تھی اور پھر چند لمحوں بعد گائے اپنے پاؤں پر کھڑی احساس ممنونیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسد اور آصف کو یوں داد طلب نظروں سے دیکھا جیسے یہ کارنمایاں خود میں نے سرانجام دیا ہو؟

(میں نے ایسا کیوں محسوس کیا؟)

اسد کے مضبوط بازوؤں کے توانا پٹھے پھڑ پھڑانے لگے اور وہ آستینیں چڑھا کر ہاتھ اپنے بازوؤں کے پٹھوں پر پھیرنے لگا۔

اور وہ دن کتنا عجیب تھا جب عین دوپہر کے وقت سونا میرے کمرے میں چلی آئی تھی۔ میں اس کی جرأت پر حیران رہ گیا تھا۔ یوں بھی ہو سکتا ہے یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

وہ بے تکلفی سے چارپائی پر بیٹھ گئی، مجھے اس کی موجودگی سے خوف آنے لگا باوجود اس کے کہ جتنی دیر وہ کمری میں رہی کمرہ گندم کی سوندھی سوندھی پرکشش خوشبو سے مہکتا رہا میں گندم کی سحر سے واقف تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اپنے کمرے کی جنت سے نکال دیا جاؤں۔ میں چاہتا کہ سونا فوراً واپس چلی جائے۔

ابھی میں گفتگو کے لیے الفاظ ہی تلاش کر رہا تھا کہ باہر سے ایسے آواز آئی جیسے کوئی بچہ کتے کی نقل کر رہا ہو۔ اس کی آواز سن کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جاتے جاتے تیزی سے کہہ گئی۔

''پھر آؤں گی۔۔۔ دودھ ہمارے ہاں سے بندھوالو۔''

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ پھر آئے لیکن میں نے اسد سے کہہ کر دودھ اس کے ہاں سے بندھوالیا۔

اس واقعہ نے آصف کو پریشان کر دیا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ میں خطرے میں نہ کودوں اور نہ بھولوں کہ سونا چار پانچ پہلوان قسم کے بھائی ہیں۔

اسد مسکراتا ہوا اپنے بازوؤں کے پٹھوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اور پھر ایک اٹھا کہ دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے سے نکلتے ہوئے کہتا گیا۔

''سونا پھر آئے تو اسے یہیں روک لینا۔''

چند روز بعد اسد آصف کے ساتھ کوئی فلم دیکھنے گیا تھا کہ سونا شام کو آگئی۔ شام کے دھندلکے رات کی تاریکی میں بدل رہے تھے۔ کمرے میں بجلی کا بلب روشن تھا۔ میں آرام کرسی میں دھنسا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ باہر آسمان پر ستاروں میں روشنی آگئی تھی۔

سونا کچھ دیر مضطرب سی نظر آرہی تھی۔ اس نے آتے ہی میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا ''اٹھو، چلو!''

''چلوں؟ کہاں؟؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''ادھر کھیتوں میں، اونچی اونچی گھاس میں۔ وہاں صرف ہم دونوں ہوں گے۔'' اس نے میرا بازو زور سے کھینچا اور میں کرسی میں اس کی طرف تھوڑا سا لڑھک گیا۔

باہر دھندلکوں میں ڈوبے ہوئے کھیتوں کی سبز کشش کا زور ٹوٹ گیا تھا لیکن یہ لڑکی چاہتی تھی کہ میں اس کے ساتھ مل کر اس منظر میں ڈوب جاؤں جو میں ہر روز کھڑکی سے دیکھتا ہوں موت کا فرشتہ اگر فرشتہ ہے تو یقیناً خوبصورت ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ موت کا فرشتہ سونا کی طرح خوبصورت ہوگا لیکن میں مرنا نہیں چاہتا تھا میں نے کہا ''کمرہ زیادہ اچھی اور محفوظ جگہ ہے۔ وہاں پر تو ابھی اندھیرا گھپ ہونے والا ہے۔ وہاں تو ہمیں ایک دوسرے کا وجود بھی نظر نہیں آئے گا۔''

''جیسے تمہاری مرضی''۔ اس نے کہا۔ ''دروازہ کھڑکی بند کر دو۔ تم اس کھڑکی سے روز مجھے ستاتے ہو، مجھ پر جادو کرتے ہوئے مجھے بلاتے ہو۔ میں آگئی ہوں جادوگرسیاں۔ اس ستانے کا پورا بدلوں گی۔''

میں سمجھتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی پھر بھی میں نے خود سے پوچھا۔ ''یہ کیا چاہتی ہے؟ کیا عشق ایسا ہوتا؟''

وہ مجھے غلط سمجھتی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آرہی تھی۔

میں حوصلہ مجتمع کر رہا تھا تاکہ اسے کہہ سکوں کہ وہ فوراً واپس چلی جائے لیکن میں کچھ دیر تک کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے خاموش اور پریشان دیکھ کر اس نے کہا۔ ''کیا بات ہے بابو کھوئے کھوئے کیوں ہو؟''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔'' میرے منہ سے سچی بات نکل گئی۔

''ایسے گبرو جوان ہو کر ڈرتے ہو؟! کس سے ڈرتے ہو؟ تمہیں شرم نہیں آتی کیا؟ مجھے دیکھو، میں کسی سے نہیں ڈرتی، عورت ہوں پھر بھی نہیں ڈرتی۔ بھائیوں کا تھوڑا سا ڈر ہے سو وہ سب شہر گئے ہیں کل لوٹیں گے۔ تم بھی آج اکیلے ہو بابو۔۔۔اس دن کی بڑی راہ دیکھی ہے!''

میرے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا پھر بھی اسے کہنا چاہتا تھا۔ ''میں نے تمہیں کبھی نہیں ستایا، کیا کسی کو دیکھنا ستانا ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں کبھی نہیں بلایا۔ آخر تم مجھ سے کیا بدلہ لو گی؟ تم چاہتی ہو کہ مجھے ادھر کھیتوں میں لے جا کر بالکل نہتا کر دو، مجھے ختم کر دو۔ مجھے کھا جاؤ۔ تم نے مجھے سیاں کہا ہے لیکن یہ کیسا عشق ہے؟ تم نے گندم کے بہت سے دانے کھا لیے ہیں لیکن میرے بدن کا تمہارے بدن پر کوئی قرضہ نہیں (اے حوا میں تیرا آدم نہیں ہوں) اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں نہ دیکھوں تو نہیں دیکھوں گا میں تمہارا بندۂ بے دام نہیں ہوں۔۔۔میں تو تمہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتا وہ تو کوئی اور سونا ہے جسے میں صحن میں کام کرتے دیکھتا ہوں، میں تمہیں نہیں دیکھتا۔ تمہیں تو میں نے آج پہلی بار دیکھا ہے۔ تم کیسی عورت ہو۔ تم سے زیادہ تو مجھے شرم آتی ہے۔ تمہارا حسن کہاں گیا؟ تم اتنے بدصورت کیسے ہو گئی ہو؟'' میں یہ سب کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن صرف اتنا کہہ سکا۔ ''میں تم سے ڈرتا ہوں!''

''بابو مذاق کرتے ہو!'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

''نہیں مذاق نہیں کرتا۔ میں نے بولنے کا عزم کر لیا تھا۔ ''سنو اگر میں بجلی کے اس بلب کو وہاں سے اتار کر تمہاری گود میں رکھ دوں اور تمہیں اس چارپائی سے اٹھا کر چارپائی کو تمہارے سر پر بٹھا دوں تو تم کیا کہو گی؟''

میں نے انتظار کیا کہ وہ کچھ جواب دے لیکن وہ انگلی دانتوں میں دبا کر ہنستی رہی بالکل بے وقوف کی طرح۔ اور میں نے طے کیا کہ اسے بات صاف صاف سمجھائے دیتا ہوں۔ اشارے کنائے وہ نہیں سمجھے گی۔ ''دیکھو، ہر چیز اپنی جگہ پر جچتی ہے۔ تمہاری جگہ تمہارا گھر ہے۔ تم اپنے گھر کے صحن میں کام کرتی بہت اچھی لگتی ہو۔ اس سے آگے کبھی نہیں بڑھا۔ کیونکہ میری بھی ایک جگہ ہے اور مجھے وہیں رہنا چاہیئے۔ میں تمہیں دیکھتا ضرور ہوں لیکن بلاتا نہیں۔ جو چیزیں مجھے اچھی لگتی ہیں وہ سب اس کمرے سے باہر ہیں۔ تم گھر جاؤ اور پھر کبھی گھر سے یوں اپنا آپ لٹانے کے لیے نہ نکلنا۔۔۔''

میں ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے چہرے کا بدلا ہوا تاثر دیکھ کر چپ ہو گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے کی نرمی ختم ہو گئی تھی۔ زخمی شیر کی طرح وہ مجھے نظروں ہی نظروں میں تول رہی تھی۔ شرم اور غصے سے اسے بولنا مشکل ہو گیا تھا۔ یا شاید یہ شرم نہیں شرمندگی تھی۔ میرے لیے اس کا غصہ اور شرمندگی ناقابل برداشت تھے۔

پھر میں نے ایک جرأت مندانہ اقدام کیا۔

میں نے اسے اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ میں نے اس کے جسم کے زمین پر گرنے کی آواز سنی لیکن وہ نہ چیخی نہ چلائی۔ اب مجھ میں یہ ہمت نہیں تھی کہ میں کرسی سے اٹھ کر کھڑکی سے جھانکوں اور دیکھوں کہ نیچے سڑک پر پڑی وہ کیسی نظر آ رہی ہے۔ میں اٹھنے کی ہمت پیدا کر رہا تھا کہ ان الفاظ نے مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔

''تم۔۔۔تم مرد ہو؟۔۔۔ کیسے مرد ہو تم؟ تم ذلیل ہو کمینے ہو۔''

اس وقت میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ میں نے جس بلا کو اپنے قریب سے اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا وہ اب بھی اپنی جگہ پر ہی میرے اس قدر قریب کیسے موجود تھی اور یہ کیسے ہو گیا تھا کہ اس کے جسم پر خراش تھی نہ لباس پر مٹی۔ تو کیا اسے بالکل کوئی چوٹ نہیں آئی تھی اور وہ پھر بھاگ کر زینے سے اوپر چڑھ آئی تھی؟ میں نے طے کیا کہ میں اسے اٹھا کر پھر باہر پھینک دوں گا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا اور میں تو کھڑکی سے کافی ادھر شروع سے ہی کرسی میں دھنسا بیٹھا تھا میں تو ایک لمحے کے لیے بھی یہاں سے نہیں اٹھا تھا۔۔۔اور پھر میں صورت حال کو سمجھ گیا۔ اور مجھے کتنی ہی ایسی چیزوں کا خیال آیا جنہیں میں اپنے کمرے سے اور زندگی سے نکال دیا تھا لیکن وہ وہیں اپنی پرانی نشستوں میں موجود تھیں۔

اس کی آواز نفرت کی آواز تھی۔

اب وہ فوراً نیچے اتر آگئی اور میں کرسی میں اور زیادہ دھنس گیا جیسے طوفان کی لہریں کسی بے ہوش جسم کو کنارے پر ڈال جاتی ہیں۔

آصف بہت پریشان تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اب میری زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں یا تو سونا سے شادی کرنے کی کوشش کروں یا بدل لوں۔

اسد فوراً غصے میں آ گیا "تم نے اسے کیوں جانے دیا؟ میں نے کہا تھا وہ پھر آئے تو اسے یہیں روک لینا! تم تو بڑے بد نصیب ہو تم نے گھر آئی لکشمی کو ٹھکرایا ہے جو تم سے ضرور بدلہ لے گی ۔۔۔ تم کچھ نہیں سمجھتے ہو ۔ اس نے تم پر ٹھیک شک کیا۔ تم واقعی مرد نہیں۔"

"اسد آج تمہاری باتیں نا قابل برداشت ہیں۔" میں نے بڑے عذاب کے ساتھ کہا۔

"تم مجھے دکھ پہنچا رہے ہو۔"]

"میں پوچھتا ہوں کہ یہ چھپ چھپ کر ایک نوجوان اور صحت مند لڑکی کو دیکھنا کیا معنی رکھتا ہے؟"

"تم مجھے جانتے ہو۔ میں جس طرح اس لڑکی سے اور دلکش چیزوں کو دیکھتا ہوں اسی طرح اس لڑکی کو بھی دیکھتا رہا ہوں۔ مین نے اسے کبھی نہیں بلایا۔ میں نے کبھی کوئی خواہش نہیں کی۔"

"تم کیوں خواہش نہیں کرتے؟ تم اسے شرافت کہتے ہو لیکن تم نے دیکھ لیا کہ سونا تمہیں کیا سمجھتی ہے۔ تمہیں سونا سے وہی سلوک کرنا چاہیئے تھا جو ایک زندہ اور جوان مرد کو ایک ایسی ہی عورت سے کرنا چاہیئے۔"

"تم نہیں سمجھتے ۔۔۔ میرا اپنا مزاج ہے اپنا کردار ہے۔ میں اپنے وجود کو صرف اس مزاج اور کردار کے واسطے ہی جانتا ہوں۔ ایسا نہ ہو تو میں ہونے کے احساس سے بھی محروم ہو جاؤں۔"

"یہ ہونے کا احساس کیا ہوتا ہے؟ تمہیں تمہارے فلسفے نے بے جان کر دیا ہے۔"

"یہی سہی لیکن اسد ذرا نرم آواز میں مجھے یہ تو سمجھا دو کہ میری ناکامی یا غلطی پر تم اتنے ناراض کیوں ہو؟" میں نے بڑے دکھ سے پوچھا۔

"میں ۔۔۔ میں اس لیے ناراض ہوں کہ تم اپنے ساتھ ہی ہمیں بھی لے ڈوبو گے۔"

میرا جی چاہا کہ اس کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں تا کہ وہ اس خارج میں ڈوب جائے جس میں ڈوبنے کو وہ زندگی کہتا ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا جیسے اسد میرے سامنے کھڑا الباس نہیں بدل رہا بلکہ میرے سر پر سوار ہے۔ میں اس تکلیف دہ بوجھ کو گرانے کے لیے اٹھا۔ لیکن وہ بنیائن اور نیکر پہن چکا تھا۔ پھر وہ ریکٹ اٹھا کر کمرے سے باہر چلا گیا ۔۔۔ اور میں سوچنے لگا کہ کیا میں کیا واقعی غلطی پر ہوں!

دو تین دن ماحول میں کھچاؤ رہا پھر حالات معمول پر آئے۔ اسد کا غصہ ختم ہو گیا اور سونا چہرے اور شخصیت کا پرانا دلکش تاثر بھی لوٹ آیا قریب سے وہ جتنی کرب انگیز تھی فاصلے سے اتنی ہی دلآویز معلوم ہوتی ہے فاصلوں کو میری روح سے ربط خاص ہے فاصلے کم ہوتے ہیں تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ قرب میں فنا ہے اور وصل میں موت۔ مجھے تو ایسے ہی لگتا ہے ۔۔۔ اس وقت بھی سونا کھڑکی سے صاف نظر آ رہی ہے۔ میں اسے دیکھنے پر مجبور ہوں۔ وہ کتنی دلکش ہے۔

اب میں اکثر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیتا ہوں۔ دروازہ اب بھی بند ہے، لیکن باہر کی دنیا پھر بھی دلکش ہے۔

گویا میں ڈرتا ہوں؟ کس سے ڈرتا ہوں؟ کیوں ڈرتا ہوں؟

کیا واقعی میں کوئی نفسیاتی مریض ہوں؟

(۲)

نیچے سڑک پر لوگ پولیس کا انتظار کر رہے تھے اور آصف اوپر صادق کے کمرے کے دروازے سے لگا صادق کے ہاتھ کی یہ تحریر پڑھ رہا تھا۔ یہ اوراق اسے صادق کی قمیض کی جیب سے ملے تھے۔ صادق نے اپنے بارے میں سب کچھ ان اوراق میں لکھ

دیا تھا اس نے وہ مختصر سا خط بھی پڑھا جو صادق نے کسی ماہر نفسیات کے لیے لکھا تھا اور ان اوراق سے منسلک تھا۔ اس خط میں ماہر نفسیات سے مشورے کی درخواست کی گئی تھی۔

ایک دن پہلے وہ کمرے کے اندر بہت دیر تک صادق کے پاس بیٹھا تھا۔ صادق اس روز کچھ اداس تھا، سونا بھی دو دن سے نظر نہیں آئی تھی۔

''تم اداس ہو۔۔۔ سونا کی غیر حاضری سے پریشان ہو۔'' آصف نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ صادق سونا سے عشق کرتا ہے۔ اور ان کی شادی ہونی چاہیے۔

''ہاں۔ یہ درست ہے۔۔۔ اور اس کمبخت اسد کو بھی انہی دنوں رخصت پر جانا تھا۔۔۔ آج تو میں واقعی تنہائی کے احساس سے پریشان ہو گیا ہوں''

''تم اداس کیوں ہو؟''

''جانتے ہو تو مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔''

''تو پھر مان جاؤ کہ تمہیں سونا سے عشق ہے۔ تم اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہو۔''

''یہ درست ہے کہ میں اسے دیکھنے کے لیے بے چین ہوں لیکن مجھے اس سے عشق نہیں ہے۔''

''تم نہیں جانتے کہ تمہیں اس سے عشق ہے۔۔۔ لیکن میں جانتا ہوں تم اسے حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟''

سونا سمندر کی وہ لہر ہے جو مجھ سے ایسے کنارہ نشین کے سر سے گزر کر واپس چلی جائے گی اور میں ساحل پر پڑا دم توڑ دوں گا۔ طوفان کی وہ بڑی بڑی لہریں جو فاصلے سے خوبصورت نظر آتی ہیں، قریب ہوں تو موت بن جاتی ہیں۔ ہر شے کو اپنے مقام پر رہنا چاہیے۔ مجھے زندگی عزیز ہے اور میں دنیا کو دیکھنا چاہتا ہوں تو میں کنارے پر لہروں سے اتنی دور ضرور رہوں گا جہاں تک یہ لہریں پہنچ نہ سکیں۔ سورج اپنی تابانی اور خوبصورتی کا تاثر فاصلے کے ذریعے ہی دیتا ہے۔ اس کے قرب میں موت ہے، جہنم ہے۔ اور اپنی ذات میں ہر شخص سورج ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں چیزوں کو دیکھنے کی بجائے ان میں ڈوب جاؤں اور مر جاؤں یا پھر مستقل عذاب میں مبتلا ہوں جاؤں اور ہونے کے احساس سے بھی محروم ہو جاؤں۔''

''تم نے ٹینی سن کی نظم لیڈی آف شیلاٹ پڑھی ہے؟''

''ہاں دسویں جماعت کے نصاب میں شامل تھی۔''

''تم اس دورت کے المیئے کو سمجھتے ہو۔''

''شاید!''

''خیر، مجھ سے سنو، اس کا المیہ یہ تھا کہ وہ حقیقت کی بجائے عکس اور شے کی بجائے شے کی تصویر کو اہمیت دیتی تھی اور جب اس کا تصادم حقیقت کی دنیا سے ہوا تو وہ اس کا مقابلہ نہ کر سکی۔''

''لیکن میری صورت حال اس سے مختلف ہے۔ جو قیدی میں آزاد ہوں۔''

''تم بھی قید ہو اور تمہاری صورت حال بھی اس کی صورت حال سے مختلف نہیں ہے۔۔۔ میں تمہارے انجام سے بھی ڈرتا ہوں۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ تم آہستہ آہستہ حقیقت کی دنیا میں آ جاؤ تا کہ ایسا نہ ہو کہ جس روز حقیقت سے اچانک تمہارا سامنا ہو اور تمہارے تصور کا وہ آئینہ چکنا چور ہو جائے جس میں تم زندگی کا عکس دیکھتے ہو تو تم اس صدمے کو برداشت نہ کر سکو۔۔۔ اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا؟ کیا تم قائم رہ سکو گے؟۔۔۔ پھر تم حواس سے محروم بھی ہو سکتے ہو اور خودکشی بھی کر سکتے ہو۔۔۔ لیڈی آف شیلاٹ بھی مر گئی تھی۔۔۔ تم جیسے لوگ اکثر خودکشی کر لیتے ہیں۔ لیکن تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ تمہیں خود کو تھوڑا سا بدل لینا چاہیے۔ اور یہ سوچنا چاہیے کہ اگر پانی بھی حلق میں پھنسنے لگے تو اسے نیچے کون سی چیز اتارے گی۔ تمہیں ایک عام آدمی بن جانا چاہیے اور خوف اور نفرت کو دماغ سے نکال کر اسے سب کی محبت سے معمور کر لینا چاہیئے۔''

''تم سمجھتے ہو میرے اندر نفرت بھری ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں دنیا کو فاصلے سے ضرور دیکھتا ہوں لیکن اس سے نفرت

نہیں کرتا۔ میں اپنے انفرادی مزاج کے تابع ضرور ہوں۔ اس لیے فاصلے سے چیزوں اور لوگوں کو چاہتا ہوں۔ قریب ہو کر سب کچھ گڈ مڈ ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی چیز الگ حیثیت کی مالک نہیں رہتی۔ مجھے اس صورت حال سے خوف آتا ہے۔ جب میں اپنی انفرادیت کے ساتھ الگ پیدا ہوا اور اپنی الگ قبر میں جاؤں گا۔ تو میں کیوں نہ زندگی میں بھی اپنی الگ حیثیت کو مکمل طور سے قائم رکھوں۔ وہ قرب موت سے مختلف کیسے ہے جو فرد کی الگ حیثیت کو ختم کر دیتا ہے۔''

''اگر تمہیں تنہا کسی دوسرے سہارے پر بھیج دیا جائے یا اگر اس دنیا میں صرف تم اکیلے رہ جاؤ تو تم بہت خوش رہو گے!''

نہیں ایسا ممکن نہیں ہے۔۔۔ میں خالی دنیا میں نہیں رہ سکتا۔ میں زندگی میں اس طرح نہیں ڈوب سکتا جیسے بعض لوگ ڈوب جاتے ہیں لیکن اس کا مطلب زندگی سے نفرت نہیں ہے۔ سمندر خوبصورت ہے اور اگر سمندر نہ ہو تو وہ کنارا یا ساحل کہاں سے آئے گا جس پر کھڑے ہو کر سمندر کو دیکھا اور اس میں ڈوبنے کی خواہش کا اظہار کیا جاتا ہے۔''

''تم جتنی سمجھ کی باتیں کرتے ہو عملی طور پر اتنی سمجھ کا ثبوت نہیں دیتے۔''

''میری کچھ مجبوریاں ہیں۔''

''ان پر قابو پانے کی کوشش کرو۔''

''یہ تو صرف ایک حد تک ہی ممکن ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی کسی ایک مجبوری پر قابو پالیا ہے۔ لیکن عین اس وقت ہم اُسی یا کسی اور انجانی مجبوری کے تابع ہو کر عمل کر رہے ہوتے ہیں۔''

''آدمی مجبور محض نہیں ہے۔''

''لیکن فرد ایک خاص صورت حال کا اسیر ضرور ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی اسیری کی صورت حال کو قبول کرنے ہی میں اپنی آزادی کو یقینی سمجھتا ہے۔ میری ماں گاؤں میں رہتی ہے۔ جب بھی وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہوتی ہے اللہ کے نام پر صرف ایک پیسہ دینے کی منت مانتی ہے۔ اور جب پریشانی رفع ہو جاتی ہے تو کبھی پانچ پیسے سے کبھی پانچ آنے اور کبھی پانچ روپے خیرات کرتی ہے۔ میں نے ایک بار اسے سمجھانا چاہا کہ یہ باتیں فضول ہیں لیکن وہ ڈر گئی اور سمجھی میں پاگل ہو گیا ہوں یا کافر۔ اس نے فوراً منت مانی کہ اگر بچے کا دماغ ٹھیک ہو جائے تو میں ایک پیسہ فقیر کو دوں گی۔'' میں خود ماں کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا اور میں نے طے کیا کہ آئندہ ایسی بات نہ کہوں گا۔ ماں سمجھتی ہے کہ اس کی منت نے مجھے بچالیا اس نے پانچ سو روپے فقیروں میں بانٹے اور شکرانے کے نفل پڑھے۔ اگر میں زبردستی اس کو اس صورت حال سے کھینچ نکالنے کی کوشش کرتا جس کی بظاہر وہ اسیر ہے لیکن اس کے لیے حوصلے اور زندگی کا ایک ذریعہ ہے تو یہ صدمہ برداشت نہ کر سکتی جب سب کو مر جانا ہے اور اپنے اپنے راستے سے بالآخر جنت میں داخل ہو جانا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کوئی کیا سوچتا ہے اور کیسے رہتا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ مجھے سونا سے عشق نہیں ہے۔ آخر ہم پہاڑ کی چوٹی سے وادی کا نظارہ بھی کرتے ہیں اور جہاز کے عرشے پر کھڑے ہو کر سمندر کی لہروں اور دھندلے آبی افق اور سمندری پرندوں کو دیکھنا بھی تو پسند کرتے ہیں۔ ہم ڈرامے اور فلمیں بھی دیکھتے ہیں، کتابیں بھی تو پڑھتے ہیں۔۔۔ بس اسی طرح میں سونا کو بھی دیکھتا ہوں۔

یہ گفتگو دیر تک جاری رہی۔ آصف جب اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا تو قدرے مطمئن تھا۔ اب اس کا خیال تھا کہ صادق کسی غلط راستہ پر نہیں ہے اور اسے روکنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے یہ بھی طے کیا کہ وہ ان مسائل پر اکثر صادق سے گفتگو کیا کرے گا۔ اسے امید تھی کہ اس کا اچھا نتیجہ برآمد ہوگا۔

اگلے دن آصف دفتر میں تھا کہ دوپہر کے قریب صادق کے کمرے کی نیچے کی دوکان کے مالک نے اسے بلوا بھیجا ''فوراً آیئے، زبردست حادثہ ہو گیا ہے۔''

آصف پریشانی کے عالم میں وہاں پہنچا۔ صادق کے کمرے کی کھلی کھڑکی کے نیچے کچھ لوگ جمع تھے جو آصف کو دیکھ کر ایک طرف ہو گئے۔

آصف آگے بڑھا اور کچھ دیر کے لیے پتھر کا بن گیا۔ اس کے کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں آنے لگیں اور اسے یوں

لگا جیسے وہ کسی پرانی داستان کا ایک کردار ہے جو جادو سے پتھر کا بن گیا ہے۔لیکن زندہ ہے اور سن سکتا ہے اور دیکھ سکتا ہے لیکن بول نہیں سکتا۔

لوگوں نے اسے بتایا کہ صادق کھڑکی سے گر کر مر گیا ہے وہ چونکہ گرتے ہی مر گیا تھا اس لیے کسی نے اس کی لاش کو نہیں چھیڑا تھا۔

حقیقت کی سحر شکن قوت نے آصف کو لاش پر جھکا دیا اس نے محسوس کیا کہ وہ پتھر کا نہیں ہے اور کسی داستان کا کردار نہیں ہے۔ بلکہ زندہ ہے اور اپنے دوست صادق کی لاش پر جھکا ہوا ہے۔اس نے صادق کی مٹھی میں ایک کاغذ کا پرزہ دیکھا۔اس نے اس پرزے کو اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکالا اور پڑھنے لگا۔

پیارے صادق

شاید تم سمجھو گے کہ میں نے تمہیں دھوکا دیا اور تمہارا حق چھینا۔لیکن ایسا نہیں ہے۔۔دراصل تم اور سونا ایک دوسرے کی ضد ہو۔سونا کو خیال پرست فلسفی یا شاعر کی نہیں بلکہ ایک قوی مرد کی ضرورت تھی۔وہ تمہارے صحت مند جسم سے دھوکا کھا گئی تھی۔اب وہ میرے پاس ہے یعنی حقدار کو مل گیا ہے ۔ہم دونوں خوش ہیں۔ہم نے شادی کر لی ہے۔تم اس سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتے تھے اس لیے کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔افسوس یہ ہے کہ اس موقعہ پر دوستوں کو جمع نہ کر سکا۔مجبور تھا کیونکہ سونا کے بھائی برابر فساد پر آمادہ ہیں لیکن میں سب سے نبٹ لوں گا۔

میں نے سونا کو بتا دیا ہے کہ یہ تمہارا دیا ہوا ہے۔اسے بھی پسند ہے اور اس نے یہ نام خوشی سے اپنا لیا ہے۔ میں نے لمبی چھٹی لے لی ہے۔تم سے ملنے کو جی بہت چاہتا ہے لیکن ابھی حالات اجازت نہیں دیتے کہ تمہارے پاس آؤں خطرات سے نکل آؤں تو سب کو بلاؤں گا۔

تمہاری بھابی سلام کہتی ہیں۔

تمہارا اپنا

اسد

آصف نے نظریں کھڑکی کی طرف اٹھائیں اور اُسے پچھلے روز کی ملاقات یاد آئی۔

''اُسے میں نے مارا ہے۔ میں ہی اس کا قاتل ہوں!'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔''میں نے ہی اسے کہا تھا کہ تم جیسے لوگ اکثر خودکشی کر لیتے ہیں۔ میں نے ہی یہ خوفناک خیال اس کے ذہن میں داخل کیا۔۔اوہ!''

آنکھوں میں دھند لیے وہ ایک بار پھر لاش پر جھکا۔لاشعوری طور پر وہ سمجھ رہا تھا کہ لاش کی تلاشی ضرور لینا چاہیے۔لاش کی قمیض کی جیب سے اسے چند اوراق ملے۔یہ صادق کی تحریر تھی۔ان اوراق کو ہاتھ میں لے کر وہ عمارت کے عقبی حصے کی طرف چل دیا جہاں زینہ تھا۔وہ زینہ چڑھ گیا اور صادق کے کمرے کے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

اس نے دروازے کو دھکیلا دروازہ اندر سے بند تھا۔

''کھولو۔''اس نے بے قابو ہو کر کہا۔

''کھولو۔'' چاروں طرف سے آواز آئی۔

اس نے آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں۔وہ آسمان سے شکوہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے اور آسمان کے درمیان ایک زندہ پیکر حائل تھا۔یہ اسد تھا جو چھت سے ذرا اوپر فضا میں معلق تھا اور مسکرا رہا تھا۔اس کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں اور وہ ہاتھ اپنے توانا بازوؤں کے مضبوط پٹھوں پر پھیر رہا تھا۔

''ظالمو۔۔اِدھر آؤ۔۔ سنو۔۔دیکھو تم نے کیا کیا!'' آصف نے روتے ہوئے کہا۔

اسد مسکراتا رہا۔

''آرام سے نیچے اتر آؤ ورنہ گر جاؤ گے۔۔۔اتنی بلندی سے گر کر بچ نہ سکو گے دیکھو صادق تو کھڑکی سے گر کر مر گیا ہے۔''اسد مسکراتا رہا۔

آصف نے رومال سے اچھی طرح آنکھوں کو صاف کیا اور پھر غور سے دیکھا۔اسد وہاں موجود نہیں تھا۔صرف بادل کا ایک آوارہ ٹکڑا ہوا میں معلق تھا۔

وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ان اوراق کو پڑھنے لگا جو اسے صادق کی جیب سے ملے تھے۔

''میرا گھر بہت مختصر ہے۔اس میں صرف ایک کمرہ ہے۔کمرے کی ایک کھڑکی ہے۔اور ایک دروازہ۔میں دروازے سے ڈرتا ہوں اور کھڑکی پر جان دیتا ہوں......''

ooo

...زرد پہاڑ کی طرف کھینچنے لگا اور ہجوم چوک پر رُکا کھڑا تھا کیونکہ لال بتی
اس کا راستہ روکے ہوئے تھی۔

ناگاہ زرد پہاڑ کی چوٹی سے ایک ندا آئی "یا اخی! یا اخی!"

سڑک کے پار سے ایک لمبا سائرن ہوا۔ سبز بتی جلی اور ہجوم بے تاب ہو کر چوک کو عبور کرنے لگا۔ تب دو دھارے اچانک مل گئے۔ زرد پہاڑ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دھوپ میں ڈھلے ہوئے زرد پتھروں کے سوا اب کچھ نظر نہ آتا تھا۔

"دیکھتے نہیں آپ؟ لال سگنل ہو گیا ہے۔"

وہ اس تہدید پر عین چوراہے میں رُک گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سڑک کے پار کا منظر دیکھا۔ اونچی اونچی چھتوں والی ہیبت ناک عمارتوں نے ہجوم کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ گڑڑ...... گڑڑ...... مشینوں کے گھومتے ہوئے پہیوں کی آواز اس کے کانوں میں آئی تو اس نے کہا اگر میں نے چوک عبور نہ کیا تو پھاٹک بند ہو جائے گا اور میں ادھر رہ جاؤں گا۔"

"جب سبز سگنل ہوا، آپ فٹ پاتھ پر کھڑے رہے اور لال سگنل پر آپ نے چوک کو عبور کرنا چاہا۔ اپنی جان کی پرواہ نہیں تو کم از کم ٹریفک میں تو خلل نہ ڈالئے۔"

"یہ کوئی پاگل ہے۔"

"شکل تو ایسا معلوم نہیں ہوتا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خلا میں گھور رہا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی نظر نہ آنے والی چیز کو دیکھ رہا ہے۔"

"رات بھر جاگا ہو گا۔ اب عین چوراہے میں اسے نیند آ گئی ہو گی۔"

"جی نہیں۔ وہ جاگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کی نظریں دور اُفق پر لگی تھیں۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کم از کم مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا جسم اس دنیا میں ہو۔"

اس کی روح اس دنیا میں نہ ہو۔"

وہ ایک بیمار سی لڑکی تھی۔ وہ چوک سے اس طرف اسے فٹ پاتھ پر اکثر نظر آیا کرتی تھی۔ وہ ہجوم سے الگ تھلگ نظر آتی۔ وہ سر جھکا کر کھڑی رہتی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھا سا بریف کیس ہوتا۔ ہجوم کا ہر شخص اس پر ایک نظر ضرور ڈالتا تھا۔ وہ ان نظروں سے یوں بچتی جیسے یہ زہر میں بجھے ہوئے تیر ہوں۔ پر دیکھنے والا بھی مجبور تھا۔ اس کے زرد زرد چہرے پر ایسی کیفیت تھی جو ہر نظر کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ایک جستجو، ایک جائزے کے لئے کیونکہ یہ چہرہ ہزاروں میں سے منفرد تھا اور چہروں کے ہجوم میں کوئی کوئی چہرہ ایسا ابھرتا ہے جو تجسس بھری نظروں کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔

پھر ایک دن جب لمحے کا دھارا دو حصوں میں بٹنے والا تھا وہ فٹ پاتھ پر اس کے قریب آ کر رُک گئی۔ چوک پر ہجوم بے تاب کھڑا تھا۔ لمحہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ زرد پہاڑ فضا کا سینہ چیر کر اُبھرا۔ اس کی برد یوار آسمان سے لگ گئی۔

اتنے میں ایک آواز اس پہاڑ کی طرف سے آئی "یا اخی! یا اخی!"

ہر ایک نے یہی سمجھا کہ "کوہِ ندا" سے اس کی طلبی ہوئی ہے۔ چوک کی سبز بتی روشن ہوئی تو ہجوم زرد پہاڑ کی سر بفلک

بتی روشن ہوگئی۔اس نے ایک قدم بڑھانا چاہا تو زرد چہرے والی بیماری لڑکی نے کہا،"رک جایئے۔"

"وہ رک گیا۔"

"معاف کیجئے۔ابھی سبز بتی روشن ہوگی۔پھر ہم دونوں چوک کو عبور کریں گے۔"

اس لڑکی نے جھکی جھکی آنکھیں اٹھا کر اس کے چہرے کا اڑتا سا جائزہ لیا۔

یہ خواب آلود بیماری آنکھیں تھیں۔پر ان سے ہمدردی اور شفقت کی جو پھوار برسی تھی اس نے اس کی روح کو دھو کر صاف و منزہ کر دیا تھا۔

ان دونوں نے پہلو بہ پہلو چوک کو عبور کیا۔اس نقطے پر جہاں ان کے رستے جدا ہوتے تھے،اس نے پوچھنا چاہا۔"کیا آپ بھی زرد پہاڑ سے آنے والی ندا کو سنتی ہیں۔کیا آپ کو زرد پہاڑ کا راز معلوم ہے؟"

پھر اس نے سوچا۔"مجھے یہ راز اپنے طور پر معلوم ہونا چاہئے۔"

وہ لڑکی خاموشی سے اپنی راہ پر چلی گئی۔

"یہ لڑکی کون ہے یار؟"

"مجھے تو معلوم نہیں۔"

"فٹ پاتھ پر چلتی ہے تو کسی کو نہیں دیکھتی۔"

"بیمار بیماری معلوم ہوتی ہے۔"

"مجھے حسنِ بیمار میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے۔وہ بڑی بڑی آنکھیں کتنی اداس ہیں؟ یہی ان کی کشش کا راز ہے۔"

"پھر کرو پیچھا اس کا! کبھی تو اسے دفتر سے دیر ہوگی یا گھر جانے کی جلدی ہوگی۔کار پر لفٹ کی پیش کش کر دینا۔"

"نہیں......وہ بدک جائے گی۔یوں وہ کسی فیکٹری میں ٹائپسٹ ہوگی۔کبھی پتہ چل ہی جائے گا۔وہ اس کے ساتھ دوسرا کون تھا؟

"کل والا فلسفی......پہچان نہیں سکے تم؟"

"کبھی کسی ٹریفک کے حادثے کا شکار ہو جائے گا۔"

"تمہیں اس سے کیا؟"

"ہاں مجھے اس سے کیا؟"

"بٹی جاگ رہی ہو؟"

"جی ہاں! ابا جان۔"

"آج چھت پر لے چلو گی مجھے؟"

"آپ بیمار ہیں۔اتنی سیڑھیاں چڑھ کر آپ تھک جائیں گے۔"

"مدت سے میں نے کوہِ ندا کو آفتاب کی سرخ کرنوں سے جنم لیتے نہیں دیکھا۔"

"کوہِ ندا؟"اس کی کنواری آنکھیں جن میں بیماری کی زردی جھلملا رہی تھی،حیران ہوگئیں۔

"کوہِ ندا وہ ہے جس کے قلعے کی ہر دیوار آسمان سے لگ رہی ہے اور اس سے خود بخود آواز آتی ہے۔کچھ لوگ اسے"دن کا زرد پہاڑ" کہتے ہیں۔میں وقت کا حاتم ہوں پر ابھی تک اس کا راز نہیں پا سکا۔"

"ابا جان! یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟"

"زرد پہاڑ سے کبھی کبھار کسی کی طلبی ہوتی ہے۔آواز سب سنتے ہیں۔پر ہم اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔وہ اکیلا اس پہاڑ کی

چوٹی پر پہنچ کر غائب ہو جاتا ہے۔ اُدھر کا حال کسی معلوم نہیں بیٹی! مجھے چھت پر لے چلو گی؟ شاید وقت کے اس حاتم کو آج کو وِندا سے بلاوا آ جائے۔''

بیمار جوانی نے بڑھاپے کا ہاتھ پکڑا کیونکہ وہی اس کا واحد سہارا تھی۔ بیمار آنکھوں کے کنول شبنم سے لبریز تھے۔ چھت پر صبح کا دھندلا اُجالا تھا۔ مشرق کا دامن لرزا۔ ایک آتشیں تیر چلا اور مشرق کے دامن میں آگ لگ گئی۔ تب سورج نکلا۔ بڑھاپے کے ہونٹ کانپے'' مجھے نیچے لے چلو بیٹی! ابھی میری طلبی نہیں ہوئی۔''

بیمار جوانی بڑھاپے کا ہاتھ پکڑ کر اسے نیچے اتار لائی۔

''بیٹی! تو جب شام کو آتی ہے تو تھک کر چور ہوتی ہے۔ پھر بھی تجھے کھانا پکانا پڑتا ہے۔ چھوٹے بھائیوں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے۔ تیری تنخواہ سے دو وقت کی روٹی مشکل سے چلتی ہے۔ تو میرے بڑھاپے کو کب تک سہارا دیتی رہے گی...... مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ اپنی تنخواہ کا وہ حصہ جو تم میرے بیمار بڑھاپے کی نذر کر دیتی ہو اسے اپنے پر صرف کرو۔''

''نہیں ابا۔''

''آپ ٹھہر رُکی ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''جی رش بہت زیادہ تھا۔ میں نے چاہا کہ ہجوم گذر جائے تو چوک عبور کروں۔''

''کو وِندا سے آنے والی آواز کو آپ نے بھی سنا؟''

''کو وِندا۔''

''وہ لڑکی حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگی۔

''جی ہاں!'' دن کا زرد پہاڑ۔ وہ ابھی افق کے کناروں سے ابھرا تھا۔''

''دن کا زرد پہاڑ؟'' لڑکی نے حیرت سے دوہرا کر پوچھا۔

''میں اس لیے اسے ہر روز ابھرتا ہوا دیکھتا ہوں۔''

آپ نے وہ آواز سنی؟

میں ہر روز وہ آواز سنتا ہوں۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ وہ آواز اس کے لئے ہے۔ جبھی تو سارا ہجوم اس کی طرف لپک اٹھتا ہے۔ اب کون جانے کہ اتنے بڑے شہر میں وہ آواز کس کے لئے تھی اور کس کے لئے آئی تھی اور کون اس کی چوٹی پر پہنچ کر دوسری طرف گیا تھا۔ ہجوم اس پہاڑ کے تلے پہنچتا ہے تو پہاڑ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔''

''اور آپ؟''

''میں نے جب بھی آواز سنی، لال بتی نے میرا راستہ روک لیا۔ ایک دن آئے گا کہ میں لال بتی کی پرواہ نہیں کروں گا۔ اُدھر کی طلب دھیرے دھیرے میرے خون میں رچ بس رہی ہے۔''

''وہ پہاڑ مجھے تو نظر نہیں آتا۔''

''آپ اسے ہر روز دیکھتی ہیں پر وہ آپ کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔''

''میں نہیں سمجھی۔''

''میں بھی نہیں جانتا۔ ایک لمحہ دو دھاروں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک دھارا کو وِندا سے الٹی سمت میں چلتا ہے۔ دوسرا اس کی سمت سے بہتا ہے، وہ لمحہ آئے گا تو......''

ایک کاران کے قریب آ کر فٹ پاتھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

''خاتون! آپ کس فلسفی سے الجھ گئیں؟'' ایک انتہائی مہذب آواز نے کہا۔

''آپ کون ہیں؟''

میں راہ گیر ہوں۔ اس فلسفی کو روز فٹ پاتھ پر دیکھتا ہوں۔ یہ دوسروں کو گمراہ کرتا ہے۔

''ابا جان! زرد پہاڑ نے اس طرف لیا ہے؟'' اس نے اچانک سوال کیا۔
''میں اس راز سے واقف نہیں ہوں بیٹی!''
''اس دن آپ کہہ رہے تھے کہ آپ وقت کے حاتم ہیں۔''
''ہاں! میں وقت کا حاتم ہوں۔ ہر شخص وقت کا حاتم ہے پر جب تک اس کی ذات دگر کی کوہِ ندا سے طلبی نہ ہو، وہ اس کے راز سے واقف نہیں ہو سکتا۔''
''وہ ذات دگر کون سی ہے؟''
''مجھے اس کا شعور نہیں ہے۔''
''کسی کو اس کا شعور ہوا؟''
کہتے ہیں کہ یمن کے ایک شہزادے حاتم کو ہوا۔ وہ کوہِ ندا کی تلاش میں اُس کے دامن تک پہنچا تو اُسے اپنی ذات دِگر مل گئی۔ داستانوں میں یوں آیا ہے، غرض چھ مہینے حاتم کو اُس شہر میں گذر گئے اور اس عرصے میں اس طرح سے پندرہ آدمی اُس پہاڑ کی طرف گئے اور پھر نہ پھرے۔ اتفاقاً ایک شخص حاتم نامی وہاں تھا، حاتم میں اور اس میں نہایت دوستی تھی اور محبت از بس کہ ہو گئی تھی۔ اس ڈھب سے وہ دونوں دن رات ایک جگہ رہتے تھے......''
''پھر کیا ہوا؟''
اس حاتم کو جو اس کی ذات دگر تھا، کوہِ ندا کے قلعے سے بلاوا آیا۔ وہ چوٹی کی طرف لپکا۔ تب حاتم اپنے جی میں کہنے لگا کہ یہ بھی اس طرف چلا جائے گا، افسوس ہے کہ مجھ کو اس سے محبت والفت بہت سی ہو گئی تھی، اب یہ بھی جدا ہوتا ہے، میں اس کو ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ اس بات کو ٹھہرا کر کمر کس کر باندھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پہاڑ کی طرف دوڑا۔ دونوں گرتے پڑتے پہاڑ کے اوپر جا پہنچے۔''
اس کے باپ نے رُک کر اس پر نظر ڈالی بیمار لڑکی کی آنکھوں کے کنول حیرت کی جھیل میں ڈوب ڈوب کر اُبھر رہے تھے۔
''پھر کیا ہوا؟'' لڑکی نے پوچھا۔
بوڑھے باپ کو اس کی آواز بڑی پُراسراری محسوس ہوئی۔ کسی انجانے سفر پر روانہ ہونے والے مسافر کی آواز جس کی نظروں کے سامنے عجائبات کی کوئی کھڑکی ذرا سی وا ہو گئی ہو۔
''جوں ہی وہ نزدیک قلعے کے گئے، ایک کھڑکی دکھائی دی۔ یہ دونوں لپٹے لپٹائے اس کے اندر چلے گئے۔ لوگوں کی نظروں سے غائب ہوئے۔ کھڑکی سے آگے، محلۂ خوشاں تھا، ایک سبزہ زار نظر پڑا کہ گویا فرشِ زمردی چار طرف بچھا ہے۔ پر

تھوڑی سی زمین اس میں خالی تھی۔ وہ جوان اس پر پاؤں رکھنے لگا۔ پاؤں رکھتے ہی چھت گر پڑا۔ زمین ترق گئی۔ وہ جوان اس میں سما گیا۔ دوں ہی وہ جگہ سبز ہوگئی۔"

''حاتم کی ذاتِ دگر کو سبزہ زار میں جگہ مل گی تو حاتم کا کیا بنا؟''لڑکی نے پوچھا۔

اب اس کی آواز میں فلسفۂ زندگی کے آسمان سے نازل ہونے والی ایک ننھی منی کرن لرز رہی تھی۔ بوڑھا باپ بولا'' حاتم وہاں سے چل کر ایک پہاڑ بلند عظیم الشان کے نیچے جا پہنچا۔ جس پتھر کو اٹھا کر دیکھا، اس کے نیچے لہو ہی پایا۔ بارہ دن کے بعد اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا۔ ایک میدان کفِ دست دکھائی دیا کہ وہاں کی خاک اور جانور، چرندے پرندے بیر بہوٹی سے لال ہو رہے ہیں۔ چھ کوس اور چلا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک دریا لہو کا لہریں لے رہا ہے گھبرایا کہ اس دریا سے کیونکہ پار ہوں گا۔''

''اس نے دریا پار کرلیا؟''لڑکی نے پوچھا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ ذاتِ دگر کی راہنمائی سے محروم ہو کر انسان پھر زرد پہاڑ کے اس طرف آ جاتا ہے۔ اس طرف جہاں کفِ دست میدان ہیں۔ لہو کے دریا لہریں لیتے ہیں، سراغ راہ نہیں ملتا۔ آب و دانے کا نشان بھی نہیں پایا جاتا۔ کوئی سایہ دار درخت بھی نہیں کہ جس کی چھاؤں تلے انسان چند لمحوں کے لئے ستا لے۔''

لڑکی کے زرد چہرے پر امید کی جو کرن ٹمٹماتی تھی بجھ گئی۔

بیٹی! جب کو ندا سے طلبی ہوگی تو میں سبزہ زار کی تمنا میں چوٹی کو عبور کر جاؤں گا۔ پھر وہ راز میرے ساتھ دفن ہو جائے گا کیونکہ اس وقت میں میں نہ رہوں گا۔ البتہ میں زرد پہاڑ کے اس طرف کے راز سے پورا پورا آگاہ ہوں۔''

''اس طرف کا راز کیا ہے؟''

اس طرف مشینوں کا شور ہے۔ پسینوں کی باس ہے۔ خوانخوار بیماریوں کا تعفن ہے۔ سڑے ہوئے جسم اور مضمحل اعضاء ہیں، باسی ہونٹ اور مسلے ہوئے پھول ہیں۔ کرم خوردہ لاشیں......''

''اباجان!''وہ انگلیوں میں انگلیاں دے کر چیخی......

''میں بڑا ظالم ہوں۔ میں نے زرد پہاڑ کے راز سے تجھے کیوں آگاہ کیا؟ میر. کرم خوردہ بڑھاپا جوانی پر رحم کیوں نہ کھا سکا؟ میں نے کیا کیا؟ میں نے وقت کا حاتم بن کر کو ندا کے اسرار سے پردہ کیوں اٹھایا۔ اس انجانی منزل کی طرف ہر ایک کو اپنے اپنے شعور کے مطابق خود بڑھنا چاہئے تھا۔''

اور دوسرے دن جب پو پھٹی اور صبح ہوئی تو اس بیمار لڑکی کے سامنے زرد پہاڑ سینہ تانے آ کھڑا ہوا، اس کے کنول نین صبح کی اداس شبنم کی بجائے زرد دھوپ کے کوڑیالے خوف سے لبریز ہوگئے۔

''بیٹی! میں محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے بلاوا آنے والا ہے۔''

''ایسا نہ کہئے اباجان!''

ہجوم زرد پہاڑ سے آنی والی ندا کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ دونوں فٹ پاتھ پر اکٹھے ہوگئے۔

''آیئے! چوک کو عبور کر جائیں۔''لڑکی نے کہا۔

ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے چونکی ہوئی آواز میں کہا''ٹھہریئے۔''

وہ ٹھہر گئی۔

اس نے پوچھا'' آپ کی آنکھوں کی وہ پیاری سی اُداسی کیا ہوئی؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''میں نے ابھی ابھی آپ کی آنکھوں میں خوف کے کوڑیالے سانپ کو کنڈلی مارے بیٹھا ہوا دیکھا تھا۔ کیا میرا واہمہ تھا؟''

''نہیں۔''

''تو گویا آپ نے بھی زرد پہاڑ کا نظارہ کرلیا ہے؟''

اس لڑکی کے لب بات کرنے کے لئے کھلے ہی تھے کہ ندا آئی "یا اخی! یا اخی۔"
ہجوم زرد پہاڑ کی طرف لپکا لڑکی کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔
اس نے سہم کر نوجوان کا ہاتھ تھام لیا اور پوچھا "یہ ندا کس کے لئے تھی؟"
"میں نہیں جانتا۔ اتنے بڑے ہجوم میں سے مَیں اسے کیسے پہچان سکوں؟"
"میں نے اس ندا کی کپکپاہٹ میں ایک ہیولے کو دیکھا وہ ہجوم میں کھڑا تھا۔ جب ندا آئی تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ زرد پہاڑ کی طرف لپکا۔ وہ کون تھا؟"
"میں نے اسے نہیں دیکھا۔ کوئی وقت کا حاتم ہو گا۔"
"اب میں اسے پہچان گئی ہوں۔"
"وہ کون تھا؟"
"وہی جو مدتوں سے زرد پہاڑ کی چوٹی کے اس طرف جانے کے لئے بے تاب تھا۔ آج صبح صبح اس نے مجھ سے کہا تھا، بیٹی! میں محسوس کر رہا ہوں۔ آج مجھے کو ندا سے بلاوا آنے والا ہے۔"
"پھر تو یہ ندا اُسی کیلئے تھی؟"
جی ہاں! آج میں چوک کو عبور نہیں کروں گی۔ آپ جایئے!"
وہ لڑکی فٹ پاتھ پر مڑ گئی۔ لال بتی کے بعد ہری بتی ہوئی۔ اسے چوراہے کو عبور کرنے کا اذن مل گیا تھا لیکن اس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔
وہ لڑکی کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔
"خاتون! آپ بہت پریشان ہیں۔"
وہ خاموش رہی۔
"آپ بہت جلدی میں ہیں۔ رک جایئے۔"
"نہیں۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔
"مجھے خدمت کا موقع دیجئے۔ دیکھئے! میری کار حاضر ہے۔ دھوپ تیز ہے اور آپ کا گھر یہاں سے دور ہے۔"
"دور تو ہے......" اس کے جلتے ہوئے تلوؤں سے آواز آئی۔
"پھر آیئے نا میری کار میں۔ میں آپ کو گھر تک پہنچا دوں۔"
"ذرا رک جایئے۔" ایک آواز نے اسے دور سے پکارا۔
"اس فلسفی کی بات نہ سنیے خاتونِ مکرم۔ یہ آپ کو باتوں میں الجھائے گا۔ یہ آپ کو منزل پر نہیں پہنچنے دے گا۔ آپ تھکی ہوئی ہیں۔ فٹ پاتھ تپ رہا ہے۔ آپ کے تلوے جل رہے ہیں۔"
"ذرا رک جایئے۔ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ اس سفر میں آپ کو ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ ابھی ابھی ایک لق و دق میدان آئے گا جہاں نہ سبزہ ہے نہ سایہ۔ پھر لہو کا لہریں لیتا ہوا دریا۔" نوجوان بولا۔
"میری کار بہت تیز رفتار ہے۔ میں اسے سو میل کی سپیڈ پر بھی چلا سکتا ہوں۔ ایک منٹ کے اندر اندر......"
لڑکی فٹ پاتھ پر رُک گئی۔
"آپ کی کار لہو کے دریا کو عبور کرے گی۔" لڑکی نے بڑے سکون سے پوچھا۔
"جی!......کیا کہا آپ نے؟"
"زرد پہاڑ کی چوٹی سے اس طرف لہو کا دریا ہے۔"
"میں کسی زرد پہاڑ سے آگاہ نہیں ہوں۔"

میں نے ٹھیک کہا تھا نا! ابھی اسے زرد پہاڑ کا نظارہ نصیب نہیں ہوا۔"

"چپ رہو۔ فلسفی کہیں کے۔ اس لڑکی کو بہکا رہے ہو۔ خاتون! اس کے فریب میں نہ آیئے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ بہت دکھی ہیں۔ میں دوسروں کے دکھوں کو فوراً پہچان لیتا ہوں۔ مجھ پر اعتماد کیجئے میں آپ کو سکھ دے سکتا ہوں۔"

"لیکن لہو کا دریا؟"

لہو کا دریا؟ کون سا لہو کا دریا؟ آپ پر اس فلسفی کا جادو چل گیا ہے۔ یہاں کوئی لہو کا دریا نہیں۔ میرے گھر تک جو سڑک جاتی ہے وہ سیدھی اور صاف ہے۔ اس کے دونوں طرف یوکلپٹس کا سایہ ہے۔ میرے پاس ایئر کنڈیشنڈ کوٹھی ہے۔ لان بڑا سرسبز ہے۔ میرے ڈرائنگ روم میں بڑی خوب صورت تصویریں ہیں۔ ہر تھکا ہوا مسافر، ہر دکھی روح یہاں آ کر آرام و سکون سے آشنا ہو جاتی ہے۔"

"لیکن میری منزل زرد پہاڑ سے اس طرف ہے۔ وہاں لہو کا دریا لہریں لیتا ہے۔ کیا آپ میرا وہاں تک ساتھ دیں گے؟"

"میں...... نہیں تو...... پاگل لڑکی! تو نے میرا بڑا وقت ضائع کیا۔ یہ پہلی بار ہے کہ میں نے اپنی ہمدردیوں کو یوں پامال ہوتے دیکھا ہے۔ جاؤ لہو کے دریا میں ڈوب مرو۔ میں...... میں......" اس نے غصہ میں آ کر کار سٹارٹ کی تو وہ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

اور لڑکی کی اداس اور خوف زدہ آنکھیں دیے کی طرح ٹمٹما گئیں۔ تب اداس آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا جو وقت کا حاتم تھا اور کوندا کا راز پانے کیلئے اس کا ساتھ دینے کو تیار تھا۔ کوندا جہاں سے ابھی وقت کے حاتم کا بلاوا آیا تھا اور زرد پہاڑ کی چوٹی کو عبور کر گیا تھا۔ کوندا سے اس طرف سبزہ زار تھا جس کے ایک خالی قطعے میں وہ سما گیا تھا اور اس پر زمردیں سبزہ اُگ آیا تھا اور اُس کے آگے لہو کا دریا...... لڑکی کانپ گئی۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ تھام لینا چاہا تھا کہ لمحہ دو دھاروں میں بٹ گیا۔

زرد پہاڑ فضا کا سینہ چیر کر بلند ہوا۔

وہ رک گیا۔ اس نے کہا، "ہم آج سے اپنا سفر شروع کر دیں گے۔ انجانی منزل کی طرف۔ آپ میرا ساتھ دیں گی نا؟"

لڑکی نے چند لمحوں تک کوئی جواب نہ دیا تو اس نے یاس بھری آواز میں کہا "یہ سفر ہر ایک کو اکیلے میں طے کرنا ہوتا ہے۔"

"نہیں......" لڑکی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"نہیں......" اس نے لڑکی کی بات کو دہرایا۔

"یہ سفر اکیلے میں طے نہیں ہو گا۔ اس کے لئے ذاتِ دگر کی رہنمائی درکار ہے۔"

"ذاتِ دگر" اس نے لڑکی کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

اداس چہرہ آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہوا۔ زرد دھوپ کا اسرار گہرا ہو گیا۔ پھر اسے یوں لگا جیسے وہ فٹ پاتھ پر اکیلا ہو اور لڑکی کا سراپا اس کی روح میں سما گیا ہو۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے زرد پہاڑ کے دامن میں کھڑے تھے!

ooo

اصلیت

عوام ایکسپریس لاہور ریلوے اسٹیشن کی پلیٹ فارم کو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی خیر باد کہہ رہی تھی۔

میرے سامنے والی برتھ پر وہی اکلوتا ادھیڑ عمر مسافر اونگھ سا رہا تھا جو میرے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد آیا تھا۔ برتھ کا باقی حصہ جوں کا توں خالی تھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا میرے ساتھ ورنہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کمپارٹمنٹ میں ایک سیٹ بھی خالی رہی ہو۔ ممکن ہے کسی نے ریزرو کروائی ہو اور وہ اگلے کسی اسٹیشن پر بیٹھے۔ ویسے کمپارٹمنٹ خالی تو نہیں بھرا ہوا ہی تھا لیکن کھچا کھچ والی بات نہیں تھی جیسا ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ کسی کسی کو تو بیٹھنے کی جگہ پر بھی تنگی سے بیٹھنا پڑتا تھا۔ اور وہ بھی فرش پر۔ لیٹرین جانے میں بھی بڑی دقت ہوتی تھی۔ بس ایک جگہ جمے بیٹھے رہو۔ اس کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ میں جو پہلے ہی طرح طرح کے وسوسوں میں جکڑا ہوا تھا تشویش کی چادر اوڑھے سہما سہما بیٹھا تھا۔

سفر خواہ بس کا ہو یا ٹرین کا۔ دوران سفر میں ہمیشہ کم سن بچی کی طرح کسی انجانی خوشی کے کھلونے سے کھیلتا رہتا ہوں۔ ریل کے ڈبے، انجن، پٹڑیاں، اسٹیشن کا سارا ماحول ایک سوندھی سی خوشبو بکھیر دیتا ہے۔ میرے اندر اس کے لمس سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ الفاظ کہاں سے لاؤں۔ بس اندر سرخوشی کی لہریں سی نفوذ کرنے لگتی ہیں۔ اس امر کا تجزیہ کرنے کی میں نے کتنی ہی بار کوشش کی پر کسی فیصلے تک نہیں پہنچ سکا۔ بعض جذبے اور احساسات بیان سے بالاتر ہوتے ہیں۔ صرف محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ الفاظ قاصر ہیں ان کے اظہار کے لیے۔

اس بار تو میں خاصا بے کل ہو رہا تھا۔ وہم اور ڈر نے بری طرح دبوچا ہوا تھا۔ لیاقت پور کے اسٹیشن پر ٹرین کا ایکسیڈنٹ۔ تباہ کن۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ اور میں ٹھہرا اسد اکا وہمی۔ بڑے تذبذب کے بعد خود کو اس سفر کے لیے آمادہ کر سکا تھا۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ کام اتنا ضروری تھا کہ ٹالا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

اس وقت بھی میرے مضطرب خیالات آپس میں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے تھے۔ لیاقت پور والی ٹرین کے ڈبوں کی مانند میں طرح طرح کے دلائل سے خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن لیاقت پور کا اسٹیشن بار بار میرے سامنے خطرے کا سگنل بن کر ابھر رہا تھا۔

جیسے ہی گاڑی ساہیوال اسٹیشن پر رکی، میں نے پلیٹ فارم پر مسافروں کی چہل پہل دیکھی تو قدرے اطمینان ہوا۔ ایک خوبرو عورت اپنے تین بچوں کے ساتھ ایک ادا کے ساتھ سامنے والی برتھ پر آن بیٹھی۔ درمیانہ قد۔ سڈول جسم۔ سرخ و سفید گداز پاؤں میں اونچی ایڑی کے براؤن چپل۔ کریم کلی کی کاٹن کی شلوار۔ اسی رنگ کا دوپٹہ۔ سنہری مائل بال۔ بھولا بھالا چہرہ۔ سر سے پاؤں تک سادگی اور نفاست کا پرکشش نمونہ۔

ادھیڑ عمر مسافر ساہیوال پر اتر گیا تھا۔ اسی لیے ساری برتھ اب اس عورت کے قبضے میں ہو گئی۔ شاید اس نے بک کرائی ہو گی۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس عورت کی گفتگو اور طریقوں نے مجھے بتا دیا کہ وہ ایک پڑھی لکھی عورت ہے۔ سلیقہ شعار، بااخلاق اور مہذب۔ اس کے سامان سے بھی اس کے حسن ذوق اور مرتبے کا پتہ چل رہا تھا۔ اس کے پاکیزہ اور معصوم حسن نے مسحور سا کر دیا میری توجہ اس طرف سے ہٹتی ہی نہ تھی۔ خطرے کے سگنل سے دھیان ہٹانے کے لیے یوں بھی مجھے اس وقت راہِ فرار کی ضرورت تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے گردن خمیدہ کر لی۔ کتنی من موہنی تھی اس کی یہ ادا۔

ناشتے دان سے کھانا نکالنے کے بعد مجھ سے پہلی بار ہم کلام ہوئی ''کھانا کھائیں گے آپ'' اس کے لہجے کا جل ترنگ

میرے روئیں روئیں میں جادوگری سی کر گیا۔

''جی نہیں ۔شکریہ۔''

''کھا لیجئے تھوڑا سا''اس نے اصرار کیا۔شاید وہ بتانا چاہ رہی ہو کہ اس کی یہ دعوت محض رسمی نہیں تھی۔

''بسم اللہ کیجئے ۔ مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔''

تھوڑی دیر بعد میں اوپر والی برتھ پر چلا گیا۔بستر بچھا کر سوچا کہ کھانے سے بھی فارغ ہو لینا ہی چاہیے۔لیٹنے سے غنودگی طاری ہونے لگتی ہے تو اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔میں نے روٹیوں کا رومال کھول لیا۔بھنے ہوئے قیمے میں مسالہ خاصا چٹ پٹا تھا۔ایک ہی روٹی کھائی تھی کہ پانی کی ضرورت پڑ گئی۔نیچے پانی کا صرف ایک ہی چھوٹا سا نقشین گھڑا تھا جو وہ عورت اپنے ساتھ لائی تھی۔کتنی باذوق تھی وہ۔کمپارٹمنٹ کے اس حصے میں کسی بھی مسافر نے اس قسم کی زحمت نہیں کی تھی۔اور میں تو گلاس تک لانا بھول گیا تھا۔اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ نیچے اتر کر اس عورت سے مانگ لوں۔یہ ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس نے بے خیالی میں اوپر دیکھا میری طرف۔نہ جانے کیسے میری طلب کا اندازہ لگا لیا تھا اس نے۔اس کی ذہانت کی کس طرح داد دوں۔

بولی''پانی چاہیے آپ کو''

''جی ہاں''

اس نے اٹھ کر اپنے گلاس میں پانی بھرا اور احتیاط سے میری طرف بڑھا دیا۔

''شکریہ......زحمت ہوئی آپ کو''

''کوئی بات نہیں''اس کا چہرہ تبسم کی رعنائی سے گلابی ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے اس کا نام بھی معلوم ہو گیا۔کوئی بات کرتے ہوئے اس کی ماں نے اسے شائستہ کہہ کر مخاطب کیا۔شائستہ کتنا عمدہ نام ہے۔میں نے سوچا۔اس عورت کا یہی نام ہونا چاہیے۔ایک فلسفی قسم کے دوست سے میں نے سن رکھا تھا کہ نام کا انسان کی شخصیت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

میں اس بات کو نہیں مانتا تھا۔لیکن اس وقت تو مثال میرے سامنے موجود تھی۔تو کیا میرے فلسفی دوست کی منطق درست ہے۔یا یہ محض اتفاق ہے۔میں نے اس ادھیڑ بن کو جلد ہی ادھورا چھوڑ دیا کہ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

گلاس واپس کرتے ہوئے میں نے شائستہ کا مزید شکریہ ادا کیا۔پھر میں لیٹ گیا۔سگریٹ سلگایا اور ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔تھوڑی تھوڑی دیر بعد دزدیدہ نظروں سے شائستہ کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔دیکھتا کب تھا نگاہیں خود بخود ادھر کا رخ کر لیتی تھیں۔جب تک جاگتا رہا میرا یہ دلچسپ شغل جاری رہا۔حتیٰ کہ نیند کا خمار آنکھوں میں رچنے لگا پھر میں سو گیا۔

دوران سفر صبح کو میں دیر سے اٹھتا ہوں۔برتھ ہمیشہ اوپر کی ریزرو کرواتا ہوں۔اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک جی چاہے لیٹ اور سو سکتا ہوں۔ناشتہ تو صبح سویرے ہی کر لیا تھا۔ٹائلٹ سے فارغ ہو کر دوبارہ برتھ پر دراز ہو گیا۔رات دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے کچھ دیر مزید سو کر نیند پوری کرنا چاہتا تھا۔سو جلد ہی نیند کے ساگر میں ڈوب گیا۔

صبح نو بجے کے بعد میں برتھ سے نیچے اترا۔منہ ہاتھ دھویا۔سر کے بال درست کیے۔اور نیچے سیٹ پر آن بیٹھا۔سارے مسافر جوں کے توں موجود تھے۔کوئی مسافر اترا تھا نہ کوئی نیا مسافر آیا تھا۔البتہ میرے برابر بیٹھے دو مسافروں نے اپنا اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔

میں بظاہر کھڑکی سے باہر کے مناظر میں کھویا ہوا تھا لیکن میرا دھیان شائستہ کی طرف ہی تھا۔بار بار چور نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔کتنی شاداب اور نکھری نکھری لگ رہی تھی وہ۔کتنی صفات ہیں اس عورت میں۔میں نے سوچا۔نفاست،شائستگی اور دل پر دھاک بٹھانے والی حسین شخصیت۔

حیدرآباد اسٹیشن پر میرے ساتھ والے دونوں مسافر چلے گئے۔ان کی جگہ ایک بوڑھے سے آدمی اور ایک جوان لڑکی نے لے لی۔لڑکی سیاہ برقع پہنے ہوئے تھی۔اس کا اپنا رنگ بھی سانولا تھا اور اس کی گود میں بچہ ہمک رہا تھا وہ بھی سانولا ہی تھا۔دوسرا

بچہ تین چار برس کا ہوگا اس کا ناک نقشہ اور رنگ اپنے شیر خوار بھائی سے ملتا جلتا تھا۔ یہ بچہ بوڑھے کے کولھے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ بوڑھے کا رنگ بھی سانولا ہی تھا۔ اس کی خش خشی داڑھی میں زیادہ بال سفید تھے اور کہیں کہیں پان کی پیک سے رنگی ہوئی تھی۔ بدنما پاؤں میں ربر کے چپل تھے۔

میرے لیے بوڑھے کی قربت نے ایک بدمزگی سی پیدا کر دی تھی۔ اس کا اپنے برابر بیٹھنا اچھا نہیں لگا مجھے۔

ٹرین فراٹے بھر رہی تھی۔ حیدر آباد سے چلی تھی تو آدھا گھنٹہ لیٹ تھی۔ شاید انجن ڈرائیور اس تاخیر کو پورا کر رہا تھا۔

''یہ تمہاری بیٹی ہے'' شائستہ کی ماں نے بوڑھے سے دریافت کیا۔

''ہاں سسرال سے آ رہی ہے''

''جی۔ کل شام مل سے فارغ ہو کر سیدھا اسے لینے چلا گیا تھا۔''

''تم مل میں کام کرتے ہو۔''

''جی ہاں''

''اس کا آدمی کیا کرتا ہے حیدر آباد میں''

''دودھ کا کاروبار''

بوڑھے کی جواں سال بیٹی سمٹی سمٹائی۔ لجائی لجائی سی بیٹھی تھی۔ وہ اتنی کم عمر لگتی تھی کہ معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ دو بچوں کی ماں ہے۔

تھوڑی دیر بعد شائستہ کی ماں اوپر والی برتھ پر لیٹ گئی۔ آنکھوں پر کلائی رکھ کر وہ جیسے سونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

''نانا۔ پیاس لگی ہے'' بچے نے بوڑھے کا پچکا ہوا سا گال اپنے ننھے ہاتھ سے تھپتھپایا۔ بوڑھے نے پہلے تو یوں ہی ادھر ادھر دیکھا پھر جیسے نظروں ہی نظروں میں شائستہ سے گلاس مانگا۔ شائستہ جان بوجھ کر انجان بنی رہی۔ اس نے ایک ڈبہ کھولا اور بسکٹ اپنے بچوں میں بانٹنے لگی۔

''نانا۔ پانی''

''اچھا بیٹے ابھی پلاتا ہوں۔''

بوڑھا اب مجبور ہو گیا تھا۔ ہچکچاتے ہوئے دھیمی آواز میں شائستہ سے مخاطب ہوا۔ ''ذرا گلاس دے دیجئے اپنا۔ بچے کو بہت پیاس لگی ہے۔''

شائستہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایسے بنی رہی جیسے اس نے بوڑھے کی بات سنی ہی نہ ہو۔ پھر اس نے رخ بدلا اور کھڑکی سے جھانکنے لگی۔

دوسری بار گلاس مانگنے کی ہمت ہی نہ ہوئی بوڑھے کو۔ چپ ہو گیا۔

لیکن بچہ کیسے چپ ہوتا۔ وہ تو گویا پیاس کے صحرا میں مچل رہا تھا جب بھی وہ پیاس کا اظہار کرتا بوڑھا وہی جملہ دہرا دیتا ''اچھا بیٹے ابھی پلاتا ہوں''

شائستہ نے رنگین پلاسٹک کی کنڈیا میں سے ایک رسالہ نکال لیا۔ پہلے ورق گردانی کی پھر باقاعدہ پڑھنے لگی۔ میں بدستور خاموشی سے تماشائی بنا بیٹھا تھا گویا بوڑھے اور اس کے کمسن نواسے کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا وہ ٹھیک تھا۔ وہ لوگ اسی رویے کے مستحق تھے۔

بچے نے ایک بار پھر پانی کی طلب کا زور سے اظہار کیا تو بوڑھا اسے لے کر کمپارٹمنٹ کے دوسرے حصے کی طرف چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کی بیٹی نے پوچھا ''پانی مل گیا ابا''

''ہاں بیٹی۔ پلا دیا۔ بلکہ پیٹ بھر کر پلا دیا'' بوڑھے نے کچھ اسی طمانیت سے کہا جیسے اس کی بے کلی کی پیاس بھی بجھ گئی تھی۔

ذرا سی دیر میں ٹافیاں اور میٹھی گولیاں بیچنے والا ادھر آیا تو بوڑھے نے ایک چھوٹا پیکٹ خرید لیا۔

حصے کی۔

تب یکا یک شائستہ نے جو بظاہر مطالعے میں محو معلوم ہوتی تھی اس کی طرف پہلو بدلا "رہنے دو بابا ہمارے بچے یہ گولیاں نہیں کھاتے۔"

"لینے دو بیٹی۔ منع مت کرو۔ یہ بھی تو معصوم بچے ہیں۔" بوڑھے کا چہرہ جذبات کے تموج سے دمک رہا تھا "جیسے میرا یہ نواسہ"

اور شائستہ کو نہ جانے کیا ہوا۔ لبوں میں کوئی جنبش ہی نہ ہوئی اور نہ آنکھوں میں سرزنش کا ذرا سا بھی شائبہ۔

"ہاں ہاں۔ لے لو بچو۔ خوشی سی۔ کوئی حرج نہیں ہے" بوڑھے کے لہجے میں مٹھاس گھلی ہوئی تھی۔ پیار سے ایک ایک گولی تینوں بچوں کے ہاتھوں میں تھما دی اس نے فوراً۔

شائستہ پھر بھی چپ رہی۔ گویا کچھ بولنے، کچھ کرنے پر دسترس نہ رہی ہو اس کی۔

بوڑھے کا چہرہ پرنور تھا۔ ایک سچی کھری مسکراہٹ کی رم جھم میں بھیگا ہوا۔

○○○

نصیب کی صلیب

ثریا جس گھر میں بیاہی گئی تھی وہاں سب افراد پڑھے لکھے تھے اُس کی گود میں بیٹیاں ہوتیں یا بیٹے پلتے عام جاہل گھرانوں کی طرح اُس پر نحوست کا الزام نہ لگ سکتا تھا.......... پھر سلیم تو بیوی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اُس کی عزت بھی بہت کرتا تھا گو کہ جب کبھی وہ بھی اپنی مردانی فطرت کا مظاہرہ کرنے پر آتا تو بلاوجہ محض اپنی مردانیت کی تسکین کے لیے اُس کے دل و دماغ کو روئی کی طرح دُھن کر رکھ دیتا تھا۔تب وہ سارا دن اپنی انا کی دُھنی ہوئی روئی سمیٹتی پھرتی تھی۔

پچھلے سات سالوں میں پانچ عدد بیٹوں کے بعد آج اُس کی گود میں ایک خوبصورت کلی نے جنم لیا تھا۔سلیم سمیت سب ہی خوش تھے وہ بھی خوش تھی یا کم از کم سب گھر والوں کو خوش ہونے کا تاثر دینے میں ضرور کامیاب ہو چکی تھی لیکن اندر ہی اندر جس آگ میں وہ بھسم ہو رہی تھی اُس کی تپش سے کوئی واقف نہ تھا......تنہائی میں بیٹھے بیٹھے جب وہ اپنی تمام تر پچھلی ازدواجی زندگی پر نظر ڈالتی تو کتنی ہی دیر مارے رنج و غم کے سانس لینا بھول جاتی تھی......اُس نے محض عورت ہونے کی وجہ سے جو جو سزا جس جس رنگ میں کاٹی تھی وہ اپنی بیٹی کو، اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو اُن حالات کے سپرد کر دینے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔وہ سوچنے لگی۔

ہوسکتا ہے حالات مختلف ہوتے اگر وہ غیروں میں نہ بیاہی ہوتی.......... یہاں تو وہ ہر رات نیند میں دہل کر اُٹھ بیٹھتی...... اُسے اچانک ڈر لگنے لگتا تھا......بتی جلا کر وہ تمام کمرے کا جائزہ لیتی اُسے دیر تک سمجھ نہ آتی تھی کہ وہ کہاں ہے؟......اور اگر اجنبی جگہ پر ہے تو کیوں ہے؟.......... اُسے لگتا تھا یہاں Deputation پر آئی ہوئی ہے۔سارا ماحول عجیب و غریب تھا۔گھر درا غیر معاون، نامانوس اور رُوح تک کو پیس ڈالنے والا بوجھل بوجھل! یہ گھر یقیناً وہ گھر نہ تھا جہاں وہ پلی بڑھی تھی۔نہ وہ کوچے تھے جہاں وہ کھیلا کرتی تھی۔جن میں اُڑنے والے تنکے تک اُسے جوہر دو گوہر لگا کرتے تھے.......... نہ ہی قریب کہیں اُسے اپنے خون خاندان کی مہک محسوس ہوتی تھی .... نہ وہ افراد خانہ موجود تھے، جن کی شفقتوں کی مضبوط فصیل میں وہ مضبوط و محفوظ تھی..........! وہ یہاں مکمل طور پر اکیلی تھی.......... کُلی طور پر تنہا تھی...... کبھی وہ بیمار ہو جاتی تو اُس کا شوہر بڑبڑاتا ہوا دوسرے کمرے میں سونے چلے جاتا تھا...... اُسے دیر تک نیند نہیں آتی تھی......اکیلی پڑی روتی اور جاگتی رہتی تھی...... اردگرد کے کمروں میں سے کوئی پلٹ کر نہ پوچھتا کہ تمہیں کیا تکلیف ہے؟ کیوں سِسک رہی ہو؟......احساس کی جس کچی سُولی پر تم ٹنگی ہو آؤ تمہیں Relax کر دیں...... تم سے تمہارا حالِ دل پوچھ کر تمہیں ہلکا کر دیں...... مگر......!

پھر ایک رات اُسے خیال آیا کہ آئندہ وہ اپنی الہامی کتاب کو سرہانے والی الماری میں رکھ کر سویا کرے گی یوں وہ ہر رات خود کو کلام پاک کی پناہ میں دے دیتی تھی...... اُسے تنہا لمحوں سے، حالات سے، واقعات سے اور لوگوں سے ڈر لگنے لگا تھا۔!

وہ اکثر سوچتی کونج کی طرح وہ اپنی ڈار سے بچھڑ گئی ہے......اور پھر المیہ یہ کہ جس ساتھی کے پَر سے پَر ملا کر اُڑ رہی ہے وہ بھی اپنی جھوٹی انا کی تسکین اور چھوٹی اہمیت کو بڑا ثابت کرنے کے لیے بار بار اپنے پَر کا سہارا سمیٹ لیتا ہے۔وہ اچھلتی ہوئی اجنبی فضاؤں میں ڈولنے لگتی ہے۔ہانپنے لگتی ہے...... چکرانے لگتی ہے۔تو کیا اُسے تھک کر گر جانے اور گر کر مر جانے تک اسی ڈانواں ڈول ہوا میں بے آسرا رہنا ہوگا؟ وہ خود سے کہتی:۔

غیر فضاؤں کی اجنبی اور بے مروت مٹی اُسے کیسے سنبھال پائے گی؟...... کب تک سنبھال پائے گی؟ کتنے بڑے بڑے غم تھے....یہاں دوہرے دوہرے دُکھ.... تہرے تہرے صدمے..... عزیزوں سے بچھڑنے کا غم.....ساتھی کی کمینہ خصلت کا صدمہ.....برف جیسا ٹھنڈا ٹھار ماحول.....یہ سب دکھ اُسے گھونٹ گھونٹ کے پی رہے تھے......

کیا سب عورتوں کو ایسے ہی کچے دکھ پیتے رہتے ہوں گے؟ ایسے ہی گوڑھے غم اُنہیں بھی کھاتے ہوں گے؟ یقیناً ایسا ہی ہوتا ہوگا کیونکہ پچھلے دنوں اُس کی ایک سسرالی عزیزہ نے جتنی عجیب و غریب باتیں بتائی تھیں اُن کو سن کر اُسے بہت سی اَنہونی باتوں

کے ہونے پر اعتبار آ گیا تھا......!

آسیہ نے اُسے بتایا تھا:-

ثریا جی کیا پوچھتی ہو۔عورت کتنی بے بس چیز ہے..... میں تو کہتی ہوں اگر میں ایک صدی تک ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر، ایک ہی بات، ایک ہی سانس میں کہتی رہوں کہ عورت کس قدر بے بس و مجبور ہے تو تب بھی شاید اِس لفظ کے معنی کس کو سمجھا نہ پاؤں گی۔

مجھے دیکھو۔۔۔ مجھے سنو۔۔۔ ایک چھوٹی سی بات ہے۔۔۔ بہت معمولی سی۔۔۔ کہ میں اپنے شوہر سے عمر میں تین ماہ بڑی ہوں۔۔۔ بس اِسی فرق نے مجھے زندگی اور موت کے ایک نقطے پر لٹکایا ہوا ہے۔۔۔ شوہر نے طعنے مار مار کر میرے کلیجے میں سوراخ کر دیے ہیں۔۔۔ وہ ہر روز مجھے اپنے دفتر کی عورتوں سے فون کرواتا ہے کہ وہ میرے ساتھ خوش نہیں ہے۔۔۔ میں اُس سے بڑی ہوں۔۔۔ اُس کو مجھ سے ممتا کی خوشبو آتی ہے اور یہ کہ وہ اِسی وجہ سے دوسری عورتوں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے اور۔۔۔ اور۔۔۔! یہ کہہ کر وہ خوبصورت پری جیسی لڑکی بلک بلک کر رونے لگی۔۔۔ تقدیر کے اِس کھیل میں اس کا شوہر شرعاً اُس کا خون پی رہا تھا!

ثریا یہ سن کر گم سم رہ گئی۔۔۔ اُس کے ساتھ بھی ایسا ہی المیہ تھا۔۔۔ وہ آسیہ کو سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی مگر شوہر کے ڈر سے کہہ نہ سکی صرف سوچ کر رہ گئی۔

کیا عورت اتنی بدقسمت چیز ہے کہ شوہر سے عمر میں چھوٹی ہو تب بھی مورد الزام؟۔۔۔ بڑی ہو تب بھی سُولی پر۔۔؟

میرا شوہر مجھ سے پندرہ سال بڑا ہے۔۔۔ میرا خیال تھا کہ وہ بچوں کی طرح میری پرواہ کرے گا۔۔۔ مجھے دیکھ دیکھ کر نہال ہوا کرے گا۔۔۔ میری ہر خواہش کی تکمیل پر مر مٹے گا مگر ثریا کے صدمے کی انتہا نہ رہتی جب وہ ہر روز اُسے قریب بُلا کر کہتا۔

بند کرو یہ بار سنگھار۔۔۔ تمہاری عمر اَب ان چونچلوں کی نہیں رہی۔۔۔! کبھی کہتا۔ یہ کیا ہر وقت لپ سٹک لگائے رکھتی ہو۔ یاد رکھو کسی روز میں تمہارے ہونٹ کاٹ دوں گا۔۔۔!

وہ آسیہ کو بتانا چاہتی تھی کہ حُسن سے زیادہ میری کم عمری میرا مان تھی۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ میری یہی خوبی ہی میری زندگی اجیرن کر کے رکھ دے گی؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میری شادی ہوئی تھی تو میرا دولہا اُس روز بھی اپنی قلموں پر رنگ لگا کر آیا تھا۔۔۔ میری سب سہیلیاں میرا مذاق اڑا رہی تھیں۔

آہا۔۔۔ دُولہا خضاب شدہ ہے۔ دُولہا حساب شُدہ ہے۔

دوسری نے آہستہ سے اُس کے کان میں کہا تھا۔

ثریا بیگم مجھے ذرا رُومال پکڑانا۔۔۔ بہانے سے صاف کر آؤں بھائی صاحب کے گالوں سے روغن اُتر رہا ہے۔۔۔ یعنی کہ بلیک گولڈ ضائع ہو رہا ہے۔ لیکن وہ خوش تھی۔ شرما رہی تھی۔ راضی بہ تقدیر تھی!

شادی کے تین چار سال تک تو وہ اُس کی نوخیز جوانی اور بار سنگھار کو برداشت کرتا رہا شاید اُس میں اُس کے بچی کچھی جوانی کے جراثیم باقی تھے۔۔۔ کچھ کچھ ہمت بچ گئی تھی لیکن جونہی اس کے بالوں پر تیزی سے برف گرنے لگی وہ یخ بستہ ہوتا چلا گیا۔ اپنی یخ بستگی پر خود وہ برہم اور چڑ چڑا رہنے لگا۔۔۔ وہ کبھی اچھا لباس پہنتی تو دھاڑنے لگتا:

مت پہنو ایسے کپڑے۔۔۔ بہو کے لیے رکھ دو۔۔۔ تمہیں کچھ نہیں جچتا اب۔۔۔ اور وہ جو ابھی خود بہو تھی۔۔۔ بمشکل تیس سال کی تھی نصف صدی پہلے ساس بن جانے کے طعنے سے چکنا چور ہو جاتی۔۔۔ سہم جاتی۔۔۔!

کبھی وہ کہتا:

اپنی مانگ دیکھی ہے تم نے۔۔۔؟ کیوں اِس میں چمک بھر رکھی ہے؟ عنقریب اِس میں سے اصلی چاندی کے فوارے چُھوٹیں گے۔۔۔ پونچھ ڈالو اِسے۔۔۔! ایک روز وہ ایسے ہی تیروں سے زخمی ہو کر پڑی کراہ رہی تھی کہ اُس کی دوست نازیہ آ گئی۔۔۔ وہ اُس سے لپٹ گئی۔۔۔ دیر تک دل کی بھڑاس نکالتی رہی اور سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔

تب وہ حیران رہ گئی۔۔۔ نازیہ اُسے تسلی دینے کے بجائے جس پڑی بے وقوف لڑکی۔۔۔ یہی تو تمہاری جیت اور اس کی شکست ہے۔۔۔ وہ تمہیں ایسا طعنہ دے کر بلواسطہ طور پر اپنی نفسیاتی تسلی کا سامان کرتا رہتا ہے یہ اُس کا تمہیں کم عمر اور خوبصورت تسلیم کر لینے کا اعتراف ہی تو ہے۔۔۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ وہ تم سے خائف ہے۔۔۔ تم سے متاثر ہے جو چیز ہر لمحہ کسی کے ذہن پر سوار ہے وہ بار بار اُسی کا ہی ذکر کرے گا ناں۔۔۔ یہ اُس کا کمزور ترین نفسیاتی حربہ ہے۔۔۔! رہ گئی یہ بات کہ تم واقعی بوڑھی ہوگئی ہو یا نہیں۔۔۔!

تو سنو اس بات کو پلے باندھ لو کہ بُوڑھاپا کسی کیفیت یا تاثر کا نام نہیں ہے جس کا بار بار اظہار کر کے اُسے مدمقابل پر طاری کیا جاسکتا ہو بلکہ بوڑھاپا تو عُمر ہے۔۔۔ چہرہ۔۔۔ وقت ہے۔۔۔ آئینہ ہے۔۔۔ جس میں سب کو سب کچھ صاف نظر آ جاتا ہے۔۔۔ اگر تمہارے بال سیاہ ہیں۔۔۔ جلد روشن اور کھچی ہوئی ہے۔۔۔ لوگ تمہاری طرف کھینچتے ہیں تو تم بوڑھی نہیں ہو چاہے تمہاری عمر ایک صدی بھی ہے۔۔۔ اس کے برعکس اگر کسی کے مزاج میں بوڑھوں جیسی تلخی اور چڑ چڑاپن آگیا ہے۔۔ چہرے کی رنگت نیالی ہوگئی ہے۔۔ جلد بے جان اور بے اثر ہے۔۔۔ قوتِ برداشت میں کمی آگئی ہے تو وہ انسان بوڑھا ہے چاہے وہ پچیس سال کا ہی کیوں نہ ہو۔۔۔!

یہ تمہارے شوہر کی محبت کا ایک پہلو ہی تو ہے کہ وہ تمام وقت اپنی توجہ تمہاری طرف لگائے رکھتا ہے اور۔۔۔!

اور ثریا نے چیخ کر کہا:۔

چُپ ہو جاؤ خدا کے لیے۔۔۔ اُس نے یہ سب کچھ کہہ کہہ کر میری روح کو کچا چبالیا ہے اور تم ہو کہ فلسفہ چھانٹ رہی ہے۔۔ ایک روز میرے سینے میں شدید درد اٹھا۔۔۔ میں نے کہا مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو تو معلوم ہے اُس ابلیس نے کیا کہا تھا؟

یہ تو بوڑھاپے کا درد ہے ثریا بیگم۔۔۔ اور بوڑھاپے کی دوا ابھی ایجاد نہیں ہوئی۔۔۔!

مجھے بتاؤ نازیہ کبھی کسی شوہر نے اپنی نوجوان اور خوبصورت بیوی کو یُوں بھی چھلنی کیا ہوگا؟۔۔۔ اے کاش میری گود میں یہ بچی نہ ہوتی۔۔۔ کیا اس کو بھی یہ سب کچھ سہنا پڑے گا؟

نازیہ اُسے تسلی دینے لگی:۔

نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔۔۔ خدا کے لیے تم ماتم بند کرو۔۔۔ خدا اتنا ظالم ہرگز نہیں ہے۔۔۔ وہ اتنے بڑے صدمے کو تمہارے لیے نہیں دہرائے گا۔۔۔!

مگر ثریا کو تفکرات نے گھیر لیا وہ سوچنے لگی:۔

بخدا۔۔۔ بخدا میں تو اپنی بچی کے لیے اُس کے شوہر کی عمر کے لمحے تک گن گن کر لوں گی۔ میں۔ مَیں تو دونوں کے وجود کے تولے، ماشے رتی کا وزن کراؤں گی تاکہ وہ میری بیٹی کو چھوٹی ہونے کا طعنہ نہ مارے بڑی ہونے کا تیر نہ لگائے۔۔۔ میرا شوہر مجھ سے جھولی بھر سال بڑا ہے لیکن اُلٹا مجھے ہی اُلٹی چھری سے ذبح کرتا رہتا ہے۔۔۔ کرتا رہا ہے۔۔۔ جانتی ہوں اگر میری بچی کا شوہر اُس سے درجنوں سال بھی بڑا ہوگا۔۔۔ تب بھی وہ یہ بات تسلیم نہیں کرے گا۔۔۔ حالانکہ دو جُڑواں بچوں میں سے جو شخص ایک منٹ بھی پہلے پیدا ہوتا ہے تو بڑا کہلاتا ہے اور اگر۔۔۔ اگر۔۔۔ وہ یہ بات نہ کرے۔۔۔ یہ طعنہ اُسے نہ بھی دے پھر بھی اُس کے پاس مرد ہونے کی جو سہولت موجود ہے وہ اُس سے ضرور فائدہ اٹھائے گا۔ ستم کی کوئی نئی قسم وضع کر لے گا کیونکہ وہ جانتا ہے عورت کا نصیب یہی کچھ ہے۔ جس کی صلیب پر وہ تمام عمر مصلوب رہے گی۔۔۔ چار مضبوط رشتوں کے چار سنہری نوکیلے کیل اُس کے دونوں ہاتھوں پاؤں میں گڑے رہیں گے اور وہ گردن جھکائے لٹکتی رہے گی۔

OOO

منصور قیصر

نئی بشارت کا نوحہ

جب تیسرا درویش بھی اپنا خواب سنا چکا تو چاروں کچھ دیر کے لئے پھر پتھر کی مورتیاں بن گئے۔ البتہ ان کی آنکھوں میں سرخ روشنی چمک رہی تھی۔ پھر انہوں نے پلکیں جھپک کر غیر ارادی طور پر پہلے زمین کی طرف اور پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ رات کے سیاہ اندھیرے منجمد ہو چکے تھے۔ آسماں سے لرزاں ستاروں کے خیمے ابھی گڑے ہوئے تھے۔ نیلگوں ہوا نے سانس روک رکھی تھی اور پُر اسرار فضا کو جیسے کسی نے حنوط کر دیا تھا۔

چوتھے درویش کے ہونٹوں میں پھڑ پھڑاہٹ ہوئی اور وہ گویا ہوا۔ ''دوستو! کیا بات ہے؟ تمہارے خوابوں کی کرچیوں سے سکوتِ شب زخمی نہیں ہوا۔ رات کی آنکھوں میں پو پھٹنے کے کوئی آثار بھی نہیں ہیں اور ہمارے لئے یہ بھی مشکل ہے کہ ہم خاموشی کی چادریں اوڑھ کر صبح صادق کا انتظار کریں۔

پہلا درویش بولا۔ ''ابھی تو تمہاری باری باقی ہے۔ میں دم توڑتے ہوئے الاؤ میں خشک لکڑیاں ڈالتا ہوں۔ تم اپنے خوشبودار خوابوں کی گٹھڑی کھولو!''

چوتھا درویش ایک لمبی آہ بھر کر بولا۔ ''مگر المیہ یہ ہے کہ میرے خوابوں کی خوشبو کو دیمک چاٹ چکی ہے لہٰذا میں نے خوابوں کے دریچے بند کر دیئے ہیں۔ آخر ہم کب تک خوش کن خوابوں کی بیساکھیوں کے سہارے زندہ رہیں گے۔ ایک نہ ایک دن تو ہمیں سچائی کا زہراب پینا ہی ہے۔''

دوسرے نے ذرا طنزاً مسکرا کر کہا۔ ''اچھے درویش ہو کہ تم نے وجدان کے دریچے بند کر رکھے ہیں۔ آخر تم بھی اس بات کا اعتراف کیوں نہیں کرتے کہ ہمارے ہاتھوں میں اپنے آپ کو سرزنش کرنے کے لئے جو چابک تھے وہ ہم نے دوسروں پر برسانے شروع کر دیئے ہیں۔''

پہلا درویش بولا۔ ''اگر پانچواں بھی ہمارے ساتھ رہتا تو یہ طویل اکتا دینے والی اجنبی رات ہم اپنی خواب کہانیوں کی درانتیوں سے کاٹ دیتے۔ میری سمجھ میں تو ابھی تک نہیں آیا کہ وہ ہم سے روٹھ کر کیوں چلا گیا''

دوسرے درویش نے پہلے کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''پانچواں درویش ہم سے صرف اس لئے روٹھ کر چلا گیا کہ مرشد نے خرقوں کا جو تر کہ چھوڑا تھا وہ ہم چاروں نے آپس میں ہی بانٹ لیا۔ جب پانچویں نے اپنا حصہ طلب کیا تو ہم نے اسے ایسا خرقہ پیش کیا جو پانی کو جذب نہیں کر سکتا تھا۔

تیسرا درویش جو بہت دیر سے پتھرایا ہوا تھا، بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''چھوڑو کیا قصہ لے بیٹھے ہو؟ جو بچھڑ گیا سو بچھڑ گیا۔ تمہیں کئی بار مرشد کا قول یاد دلا چکا ہوں کہ ماضی دفن ہونے والے لمحوں کی قبریں مت کھودو کہ لا ریب یوں محض تعفن پھیلتا ہے اور پھر یہ کہ پانچواں تو اب خود ہی اپنا مرشد بن گیا ہے۔''

دوسرے نے کچھ سبکی محسوس کی اور گویا ہوا۔ ''دوستو! ہم نے مرشد کے خرقے پہن کر کون سا تیر مار لیا ہے؟ سلوک توکل، قناعت اور شناخت کی کون سی منزل طے کر لی ہے؟ آخر ہم مرشد کے نام کو کب تک پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرتے رہیں گے۔''

پہلا درویش، جس نے دم توڑتے ہوئے الاؤ میں چوبِ خشک سے نئی روح پھونک دی تھی، جھنجھلا کر بولا۔ بھائیو! کن بکھیڑوں میں پڑ گئے ہو۔ کیوں اختلافات کے فیتوں کو چنگاری دکھا رہے ہو۔ یہ سچ ہے کہ اپنی کوتاہیوں کا احساس کرنا خود شناسی کی پہلی منزل ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ سیاہ اندھیروں سے ڈسنے والی رات کی ابھی پہلی منزل ہی گزر رہی ہے۔ ہمیں پو پھٹنے تک بیدار رہنا ہوگا۔ یہ بھی مت بھولو کہ ہم میں سے جس کی آنکھ بھی لگ گئی اسے تاک میں بیٹھا ہوا بھیڑیا پھاڑ جائے گا۔''

بھیڑیا کا نام سن کر چاروں پھر کچھ دیر کے لئے پتھر کی مورتیاں بن گئے۔ جب خاموشی کو اکتاہٹ کا زنگ لگنے لگا تو چوتھے

ہوتے ہوئے بھی تم تاک میں بیٹھے ہوئے بھیڑیئے سے ڈر گئے حالانکہ ہم سب کے اندر خوف کا ایک ایک بھیڑیا چھپا بیٹھا ہے جو منافقت کا گوشت کھاتا رہتا ہے۔''

اس کی بات سن کر تینوں نے گردنیں اپنے گریبانوں میں ڈال لیں، چوتھا بولا۔ ''اچھا اب دوزانو ہو کر بیٹھ جاؤ میں تمہیں اپنا ایک ایسا ادھورا خواب سنانے لگا ہوں جو میں عنقریب دیکھنے والا ہوں۔''

پہلے نے دوزانو بیٹھتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔ ''تو کیا تم نے ابھی تک خواب نہیں دیکھا؟''

''نہیں۔'' چوتھا بولا۔ ''خواب ابھی تک مجھے دیکھ رہا ہے۔'' پھر وہ گویا ہوا۔ ''صاحبو! خواب کچھ یوں ہے کہ میں مرشد کے حکم پر ایک بستی میں داخل ہوتا ہوں کہ اہل بستی کے دلوں میں اللہ کی محبت کی پنیری لگاؤں کہ کیا دیکھتا ہوں کہ بستی والے، کیا چھوٹے کیا بڑے، اپنے اپنے مکانوں سے نکل کر بستی سے باہر ایک وسیع میدان میں جمع ہو رہے ہیں ان سب نے اپنے کندھوں پر پھاوڑے، بیلچے اور کدالیں اٹھا رکھی ہیں۔ وہ یوں خاموش ہیں جیسے کسی نے ان کے لبوں کو سی دیا ہو۔ صرف ان کی آنکھوں سے تاسف کا تیزاب ٹپک رہا ہے۔ اس ہجوم میں سے ایک شخص پر میری نظر پڑتی ہے جو مجھے سب سے زیادہ بزرگ معلوم ہوتا ہے۔ پوچھتا ہوں ''اے بزرگ! تم اپنے ان رچے بسے مکانوں کو چھوڑ کر اس میدان میں کیوں جمع ہو رہے ہو؟'' بوڑھا تعجب سے میری جانب دیکھتے ہوئے جواب دیتا ہے ''اجنبی دکھائی دیتے ہو ورنہ یہ سوال نہ کرتے۔'' میں اثبات میں سر ہلا کر کہتا ہوں۔ ''آپ نے درست فرمایا۔ مجھے تو مرشد نے بھیجا ہے کہ میں بستی والوں کے دلوں میں اللہ کی محبت کی پنیری لگاؤں۔'' بوڑھا بڑے سپاٹ لہجے میں میری طرف دیکھے بغیر کہتا ہے۔ ''یہ پنیری تو ہم نے تین دہائی پہلے اپنے دلوں میں لگائی تھی مگر وہ پودے تناور درخت نہ بن سکے کیونکہ ہمارے دلوں کو سیم اور تھور لگ گئی ہے۔'' میں پھر اپنا سوال دہراتا ہوں۔ ''مگر مکانوں کو کیوں چھوڑ رہے ہو؟'' بوڑھا ذرا جھنجھلا کر بولتا ہے۔ ''تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ مکانوں کی بنیادوں میں ریت بھر گئی ہے یہ کسی وقت بھی ہم پر گر سکتے ہیں۔'' صاحبو! پھر میں دیکھتا ہوں کہ تمام بستی والے، کیا چھوٹے کیا بڑے ہنستے کھیلتے ناچتے گاتے اور ایک دوسرے سے چہلیں کرتے اس میدان میں اپنی قبریں کھودنے لگتے ہیں۔ کسی کے چہرے پر کوئی ملال نہیں، جیسے وہ اسی دن کا انتظار کر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتا ہوں کہ وہاں محض تماشائی بن کر کھڑے رہنا بڑا معیوب نظر آتا تھا۔ دوسروں کی طرح میں بھی اپنے لئے بڑی کشادہ قبر کھود لیتا ہوں پھر دیکھتا ہوں کہ ہر ایک کیا چھوٹا کیا بڑا، اپنی گردنوں میں لٹکی ہوئی سنگ مرمر کی لوحیں اتارتا ہے جو انہوں نے اپنی قمیصوں کے اندر چھپا رکھی تھیں۔ ان لوحوں پر ہر ایک کا نام، اس کی عمر اور اس کی ماں کا نام بڑے خوشنما طریقے سے کندہ تھا۔ ہاں یاد آیا۔ ہر لوح پر اس بستی کا نام بھی لکھا تھا۔ وہ بوڑھا شہادت کی انگلی اٹھا کر میری گردن کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ میں اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھتا ہوں وہاں لوح کی بجائے ایک طوق لٹک رہا ہے جس پر سیاہی مائل خون کی پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ ان سب کی دیکھا دیکھی میں بھی اپنی قبر پر وہ طوق نصب کر دیتا ہوں۔ دوستو! پھر میں کیا دیکھتا ہوں کہ بستی کے سب لوگ کیا بڑے کیا چھوٹے نہایت فخر سے ایک دوسرے کو اپنی اپنی قبر پر نصب شدہ لوح دکھاتے ہیں وہ انتہائی پُر انبساط لہجے میں بلند آہنگ سے آپس میں باتیں بھی کر رہے ہیں لیکن میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا۔ یہ بات نہیں کہ وہ کوئی غیر زبان بول رہے تھے۔ میں ان کی زبان کو اچھی طرح فہمید کرتا ہوں مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں تک پہنچتے ہی اپنا مفہوم کھو دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے خشک پتوں پر ریت گر رہی ہو۔ جب دن کے اجالے مرجھا جاتے ہیں اور نیند میں جھولتا ہوا سورج دور سمندر کی گود میں سر رکھ کر سو جاتا ہے تو تمام بستی والے کیا چھوٹے کیا بڑے خوشی خوشی ایک دوسرے کو الوداع کہتے ہوئے اپنی اپنی قبر میں گھس جاتے ہیں۔ میں بھی ان کے نقشِ قدم پر چلتا ہوں۔ پھر میں کیا دیکھتا ہوں کہ نئے سورج کی آنکھ سے گرم دھوپ بہہ رہی ہے۔ تمام بستی والے کیا چھوٹے کیا بڑے کھانے پینے اور آسائش کی دیگر چیزیں اٹھائے بڑی شاہراہ پر جمع ہو گئے ہیں۔ وہاں شاید کوئی کارواں سرائے ہے۔ تھوڑی دیر بعد شاہراہ کے دونوں اطراف سے قافلے آنا شروع ہو

جاتے ہیں۔ قافلے والے ان سے اشیائے خورد ونوش خریدتے اور معاوضے میں رنگارنگ کی نقدی اور بدیسی چیزیں دیتے ہیں۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض قافلے والے اس کارواں سرائے کے باہر اپنے خیمے گاڑ دیتے ہیں اور بستی والوں کی جوان اور خوبصورت عورتوں کو خیموں میں لے جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد پر نچی مرغیوں کی طرح انہیں باہر پھینک دیتے ہیں۔ البتہ ان کی چادروں میں ان گنت تحائف بھرتے ہوتے ہیں۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ شام ڈھلتے ہی سب بستی والے کیا بڑے کیا چھوٹے، پھر قبروں کے پاس لوٹ آتے ہیں مگر وہ اپنی اپنی قبر کو تلاش نہیں کر سکتے جیسے انہیں اپنی چیزوں کی پہچان نہ رہی ہو...... قبر میں اتر کر دیکھتا ہے وہ اسے قبول نہیں کرتی۔ اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ پھر کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہر کوئی دوسرے سے پوچھتا ہے کہ میری قبر کون سی ہے۔ کوئی بھی اپنے نام کی لوح نہیں پڑھ سکتا۔ ہر کوئی سارے دن کی مشقت سے تھکا ماندا اور جھنجھلایا ہوا ہے جیسے نیند کی لمبی لمبی زبانیں اسے چاٹ رہی ہوں۔ پھر وہ سب میرے گرد ہالہ بنا لیتے ہیں اور پوچھنے لگتے ہیں کہ "تمہاری قبر کہاں ہے؟" میں انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہوں۔ "وہ ہے جس پر لوح کی بجائے ایسا طوق نصب ہے جس پر سیاہی مائل خون کی پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔" پھر وہ بے قرار ہو کر پوچھنے لگتے ہیں "ہمارے نام کیا ہیں؟ کیا ہمارے کوئی نام بھی تھے؟" میں جواب دیتا ہوں "لاریب تمہارے نام تھے کہ تم نے اپنی لوحوں پر کندہ کیے تھے تاہم مجھے معلوم نہیں کہ تمہارے نام کیا ہیں کہ میں نے تم سے تمہارے نام نہیں پوچھے تھے۔ ممکن ہے اب تم سب کا ایک ہی اسم ہو۔ کوئی اسم اعظم۔" پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ سب کے سب مایوس ہو گئے ہیں اور قبروں کے سرہانے ٹیک لگا کر کھلے آسمان تلے بیٹھ کر ایک دوسرے سے اپنا نام پوچھ رہے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟" پہلے درویش نے یوں مضطرب ہو کر پوچھا جیسے وہ کہانی کا نقطۂ عروج معلوم کرنا چاہتا ہو۔

چوتھے درویش نے مشرق کی طرف نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔ "پھر کیا ہونا تھا۔ جب فجر کو کانوں میں آواز پڑتی ہے کہ آؤ فلاح کی طرف...... تو میری آنکھ کھل جاتی ہے اور یوں خواب ادھورا رہ جاتا ہے۔"

پھر چاروں درویشوں نے اسم اعظم کی تختیوں کو خرقوں سے باہر نکال کر گردنوں میں نمایاں طور پر لٹکا دیا۔ لیکن اندھیرے کی وجہ سے انہیں یہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ ان تختیوں پر اس اعظم مٹ چکا تھا اور وہاں سیاہی مائل خون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔

OOO

زرد ستارہ

ڈیلفی ہمارے یونان کے سفر کا آخری پڑاؤ تھا۔ ہم نے اس کی تاریخی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے وہاں کے لیے دو دن مختص کر رکھے تھے۔ ڈیلفی کی شہرت کا سبب اس کا مندر ہے۔ جہاں پر زمانہ قدیم میں دیوتاؤں سے استخارہ کیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہاں پر اس زمانے میں پائے جانے والے زمینی شگاف کے عین اوپر تین سروں والا پتھیوں اژدھا بیٹھا تھا۔ اس طرح کہ اس کے پاؤں زمینی دراڑ کے دونوں طرف رکھے ہوئے تھے۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کا دیوتاؤں کے ساتھ پاتال میں رابطہ تھا اور استخارہ کرنے والوں کو جواب اسی کے واسطہ سے ملتا تھا البتہ اس کو سمجھنے کی استطاعت صرف مندر کے پروہت رکھتے تھے۔ انہی کے ذریعے سائل اپنا استخارہ دیوتاؤں تک پہنچاتے تھے اور جواب نظم کی صورت میں پاتے تھے جو اکثر ذومعنی ہوا کرتی تھیں۔ ان جوابات کی روشنی میں جنگیں لڑی جاتی تھیں یا ان کا خاتمہ ہوتا تھا۔ شاہی خاندانوں کی رشتہ داریاں قائم ہوتیں یا ٹوٹتی تھیں۔ جنگی قیدیوں کی موت و حیات کا فیصلہ ہوتا تھا اور دوسرے لاتعداد معاملات ہاتف غیبی کے مشورہ سے طے پاتے تھے۔

رات ہم نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بسر کی جو جرنیلی سڑک کے کنارے واقعہ تھا۔ جب ہم شام کو وہاں پہنچے تو یہ سڑک خاصی ویران نظر آتی تھی مگر ساری رات آنکھ نہ لگ سکی۔ کیونکہ ٹرک ہمارے بستر کے عین نیچے سے گزرتے رہے۔ ٹرکوں کی آمد کا اعلان ایک زلزلے کی صورت میں ہوتا تھا۔ پوری عمارت لرزنے لگتی۔ کمرے میں دھری ہر شے کانپتی، تھرکتی اور گڑگڑاتی تھی۔ ہمیں اس رات سے پہلے علم نہ تھا کہ یونان میں اس قدر بے تحاشا ٹرک پائے جاتے ہیں اور وہ سارے کے سارے رات کے وقت ڈیلفی کی جرنیلی سڑک پر دندناتے ہوئے گزرتے ہیں۔

صبح سویرے ہم نے کھنڈرات کا رُخ کیا۔ سب سے پہلے میوزیم آتا ہے، جہاں پر اپولون کے مندر سے ملنے والا وہ پتھر دھرا ہے جسے یونان قدیم زمانے میں دنیا کی ناف قرار دیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ زیوس نے دو بازوؤں کو مشرق اور مغرب کی سمتوں میں بھیجا تھا۔ جو دنیا کے گرد چکر لگانے کے بعد عین اس جگہ پر آن کر ملے تھے۔ اس طرح یہ گویا دنیا کا مرکز ٹھہرتا تھا۔ اپنی اپنی قوموں یا ملکوں کو اہمیت دینے کا مرض بہت عام ہے۔ چینی بھی اپنے ملک کو دنیا کی مرکزی سلطنت قرار دیتے تھے۔ میوزیم سے آگے مذہبی عمارات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جن کے اختتام پر اپولون کے مندر کے کھنڈرات آتے ہیں۔ مندر کے پہلو میں تھیٹر پایا جاتا ہے جو اتنی صدیاں گزرنے کے بعد بھی اچھی حالت میں ہے اور یونانی تہذیب کے خوبصورت ترین تھیٹروں میں سے گنا جاتا ہے۔ اس میں پانچ ہزار تماشائیوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ تھیٹر سے کچھ اونچائی پر سٹیڈیم آتا ہے جس کا میدان ۱۷۸ میٹر لمبا اور ۲۸ میٹر چوڑا تھا۔ سات ہزار تماشائیوں کے بیٹھنے کا انتظام بارہ قطاروں میں بنی ہوئی سیٹوں پر تھا۔ یہاں پر مقابلے کے کھیل کھیلے جاتے تھے اور کھلاڑی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے یونانی تہذیب میں مقابلہ انسانوں کے درمیان ہوتا تھا اور محض ایک کھیل کا رنگ رکھتا تھا۔ جب کہ رومیوں نے انسانوں کو درندوں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اور اگر مقابلہ انسانوں کے مابین بھی ہوتا تو مقصد ایک دوسرے کو جان سے مارنا ہوتا تھا۔

کھنڈرات میں گھومتے ہوئے دوپہر ہوگئی۔ سورج کی حدت کے سبب ایک ایک قدم کا اٹھانا دوبھر لگنے لگا۔ ہوٹل واپس جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ گرمی کی شدت کے اوقات گزارنے کے لیے کھنڈرات سے باہر درختوں کے نیچے جا کر بیٹھنے کا پروگرام بنا پہلو میں ایک چشمہ ہے۔ اس کے ٹھنڈے پانی میں ساتھ لائے ہوئے انگوروں کو دھویا، منہ ہاتھ صاف کیے اور لنچ پیکٹ نکال کر ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں جا بیٹھے۔

ہماری دیکھا دیکھی ایک بوڑھے امریکن اور اس کی قدرے جوان بیوی نے بھی ہمارے پاس آ کر دھوپ سے پناہ لی۔

بوڑھے کو چلنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے اس کی بیوی نے اُسے سہارا دینے کے لیے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔ جب وہ ہمارے پاس پہنچے تو دونوں پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔ مجھے جس چیز سے قدرے حیرت ہوئی وہ یہ تھی کہ بوڑھے نے بغل میں کوٹ دبا رکھا تھا، جیسے اُسے اپنے آپ کو سرد ہواؤں سے بچانے کی فکر لگی ہوئی تھی۔

ہمیں آپس میں جرمن بولتے ہوئے سُن کر بوڑھے نے جرمن میں اپنا اور اپنی بیوی کا تعارف کروایا۔ اس نے اپنا ڈک بتایا اور بیوی کا پیگی۔ وہ ٹیکساس میں رہتے تھے۔ البتہ اس کی پیدائش جرمنی کی تھی۔ مگر اس ملک کو چھوڑے ہوئے اسے ایک عمر بیت چکی تھی۔

آدھ پون گھنٹے میں ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو چکے تھے۔ میں نے مذاق کے رنگ میں ڈک سے پوچھا کہ کیا اُسے اپولون کے مندر میں برف باری کا خطرہ تھا۔ جو وہ کوٹ کو بغل میں دبائے پھرتا تھا۔

''موسم بدلتے کتنی دیر لگتی ہے'' ڈک نے جواب دیا۔ پھر خود بھی ہمارے قہقہے میں شامل ہو گیا۔

''نہیں، یہ بات نہیں ہے، پیگی نے لقمہ دیا۔'' ڈک اس کوٹ کے بغیر کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھتا۔

میری بیوی نے انہیں بتایا کہ میں بھی اپنے بعض پسندیدہ کوٹوں، نکٹائیوں اور جوتوں کو سالہا سال تک پہنے پھرتا ہوں۔ اُسے تنگ آ کر یہ چیزیں غائب کرنی پڑتی ہیں کبھی وہ انہیں ریڈ کراس کو دے دیا کرتی ہے، کبھی چپکے سے کوڑے کرکٹ کے بکس میں ڈال دیتی ہے۔ پھر جب مجھے ان چیزوں کی یاد آتی ہے تو سارے گھر کو سر پر اٹھا لیتا ہوں۔ ایک ایک الماری اور ہر کمرے میں انہیں ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ اس تلاش میں وہ میرے ساتھ شامل ہو جایا کرتی ہے تاکہ مجھے پتہ نہ چل جائے کہ میری محبوبہ چیزوں کو غائب کرنے میں اس کا ہاتھ تھا۔ مگر بعض چیزیں اتنی بھاری بھرکم ہوتی ہیں کہ وہ انہیں اس قدر آسانی کے ساتھ تلف نہیں کر سکتی۔ مثلاً ہمارے گھر میں ایک رائیٹنگ ٹیبل ہے۔ جس کا ہمارے پاس کوئی مصرف نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں اپنے آپ کو اس سے جدا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہوں۔

ڈک کا خیال تھا کہ وہ رائیٹنگ ٹیبل شاید کسی خاص بناوٹ کا نمونہ تھا یا کسی اور تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔

اس کی بات سن کر ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے کیونکہ اس میز میں کوئی ایسی خوبی موجود نہیں تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ میز اس صدی کی تیسری دہائی میں بنائے جانے والے ہزاروں میزوں میں سے ایک تھا، بغیر کسی قسم کی خاص خوبی کے مجھے اسے حاصل کرنے کے لیے بیس مارک ادا کرنے پڑتے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ جب ہم نے شادی کی تو ہمارے پاس کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ اس وقت ہم دونوں یونیورسٹی کے ہوسٹل میں رہتے تھے ہمیں بہت سی دوڑ دھوپ کے بعد ایک فلیٹ تو مل گیا تھا۔ مگر اس کے لیے فرنیچر خریدنے کے لیے ہمارے پاس پیسے بالکل نہیں تھے۔ چنانچہ ہم نے اخبار میں اشتہار دیا کہ طالب علموں کا نو بیاہتا جوڑا کم قیمت پر استعمال شدہ فرنیچر خریدنے کا خواہشمند تھا۔

ایک روز کے اندر اندر ہماری ضرورت کے تمام فرنیچر کی پیش کشیں آ گئیں۔ اکثر لوگوں نے ہمیں کرسیاں، میز اور الماریاں مفت دینے کا وعدہ کیا۔ شرط صرف اتنی تھی کہ سامان ان کے گھروں سے جا کر اٹھا لیا جائے۔ البتہ رائیٹنگ ٹیبل کے لیے مجھے بیس مارک ادا کرنے پڑتے تھے۔

اب ڈک اور پیگی کی باری تھی قہقہہ لگانے کی۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ میں رائیٹنگ ٹیبل کو اس لیے چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا کیونکہ مجھے اس کے لیے بیس مارک ادا کرنے پڑتے تھے۔

میں نے انہیں بتایا کہ اصل مقصد یہ تھا کہ جب دو برسوں کے بعد ہم نے نقل مکانی کی تو تقریباً سارے فرنیچر کو پہلے فلیٹ میں ہی چھوڑ کر آئے تھے البتہ رائیٹنگ ٹیبل میں سے اپنے کاغذات نکالنے کی غرض سے جب میں نے تمام دراز باہر نکالے تو درمیانی دراز کے نیچے پڑا ہوا ایک خط ملا جسے اُس میز کے کسی سابق مالک نے اپنے بیٹے کے نام لکھا تھا۔ جو جرمنی سے ہجرت کر کے کسی دوسرے ملک میں چلا گیا تھا کہ باپ کے پاس یا تو بیٹے کا پتہ نہ تھا جس پر اُسے بھجوا سکتا، یا باپ کو سپرد ڈاک کرنے کی مہلت نہ ملی تھی۔

میں اُسے خط دے سکوں گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ رائیٹنگ ٹیبل کو اپنے باپ کی نشانی کے طور پر حاصل کرنا چاہیے۔''
ڈک کو یقین نہ آتا تھا کہ میں اس قدر جذباتی انسان ہوں۔ اس کا کہنا تھا کہ میں دیکھنے میں قطعاً ایسا نہیں لگتا تھا۔ اُسے خط کا مضمون جاننے کا شوق تھا۔

میں نے بتایا کہ وہ خط عام قسم کا خط نہ تھا جیسے باپ اپنے بیٹوں کو لکھا کرتے ہیں لکھنے والے کو یقین نہ تھا کہ اس کا خط کبھی اس کے بیٹے تک پہنچے گا۔ خط افراتفری کے عالم میں لکھا گیا تھا۔ کیونکہ سخت خطرہ درپیش تھا۔ اس کی دوکان لوٹی جا چکی تھی اور مکان پر بھی حملہ ہو چکا تھا۔ انہیں کھانے پینے کا سامان حاصل کرنے میں بے پناہ دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ شہر کے یہودیوں کی عبادت گاہ کو جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا۔ خط میں تفصیل کے ساتھ ۹ نومبر ۱۹۳۸ء کی ''بلورین رات'' کے حالات لکھے تھے۔ اس رات نازی پارٹی کے ایما پر جرمنی بھر میں یہودیوں کی دکانیں لوٹی گئیں تھیں اور ان کے گھروں پر پتھر پھینکے گئے تھے۔ اُس نے لکھا تھا کہ یہودیوں پر جینا حرام کر دیا گیا تھا۔ ان کے قدیمی دوستوں نے ان سے منہ پھیر لیا تھا بلکہ وہ ان کی جائیداد پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے۔ اس نے سنا تھا کہ یہودی خاندانوں کو راتوں رات ٹرکوں میں لاد کر لے جایا جا رہا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کو کسی دور دراز کے علاقے میں لے جا کر آباد کیا جائے گا۔ مگر اُسے یقین تھا کہ ان میں سے کوئی زندہ نہ بچے گا۔ اُسے صرف اس بات کی خوشی تھی کہ اس کا بیٹا گابریل وقت پر جرمنی سے نکل گیا تھا۔

''مجھے اس بات کا علم نہیں'' میں نے کہا ''اس خط کے لکھنے کے بعد زین شیون پر کیا بیتی۔ کیا وہ اپنی جوہری کی دکان کو بیچ سکا یا نہیں، جس کا ذکر اس نے خط میں کیا تھا۔ خط کو اس نے اپنی دوکان کے لیٹر پیڈ پر لکھا تھا۔ اس وجہ سے مجھے اس کے نام کا علم ہو سکا۔''

میں نے اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے ڈک کی طرف دیکھا۔ اُس نے اپنا رخ دوسری طرف پھیر رکھا تھا اور کہیں دور افق کی جانب گھور رہا تھا۔

''زین شیون کی باقی کہانی میں تمہیں سناتا ہوں'' ڈک نے میری طرف تکتے ہوئے کہا۔ ''اُسے اور اس کی بیوی کو نازی پارٹی کے کارندے جنوری ۱۹۳۹ء کی ایک سرد رات میں آن کر لے گئے تھے۔ انہیں بوخن والڈ کے کانسنٹریشن کیمپ میں لے جایا گیا۔ جہاں پر انہوں نے اپنی زندگی کے آخری چار برس فاقے اور بیماری کے عالم میں گزارے۔ ان کا خاتمہ گیس چیمبرز میں ہوا۔

''کیا تم گابریل ہو'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''ہاں، میں ہی زین شیون کا بیٹا ہوں''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا پاسپورٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس کا نام سچ مچ گابریل زین شیون تھا اور اس کی پیدائش ہمبرگ کی تھی۔ عین اس شہر کی جس میں ہم رہتے تھے۔ اور جہاں پر بیس مارک میں کسی نے وہ رائیٹنگ ٹیبل میرے پاس بیچا تھا۔

گابریل نے اپنا کوٹ، جسے وہ بغل میں اٹھائے ہوئے تھا۔ کھول کر ہمارے سامنے پھیلا دیا۔ اس کی بائیں جیب میں زرد رنگ کا چھ کونوں والا یہودیوں کا ستارہ ٹانکا ہوا تھا۔ جو تمام یہودیوں کو نازی پارٹی کے حکم پر لگانا پڑتا تھا۔

''اب تم سمجھ سکو گے کہ میں اس کوٹ کو کیوں اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھتا ہوں۔ گابریل نے کہا۔

اس نے بتایا کہ جب جرمنی میں نازی پارٹی کی حکومت بنی اور یہودیوں پر کھلم کھلا حملے ہونے لگے اور انہیں طرح طرح سے امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ تو اس کے باپ نے اُسے ہدایت کی تھی کہ اپنے جملہ ضروری کاغذات اور کچھ نقدی کو وہ ہر وقت اپنے کوٹ کی جیبوں میں رکھا کرے۔ تاکہ جوں ہی حالات نازک ہونے لگیں وہ بغیر ایک منٹ کو ضائع کرنے کے ملک کو خیر باد کہہ سکے۔

''میرے ماں باپ میرے ساتھ چلنے کو تیار نہ ہوئے کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ بڈھے پیڑوں کو دوسری جگہ نہیں لگایا جا سکتا۔'' یہ کہتے ہوئے گابریل نے کوٹ کی جیب میں سے اپنا اس زمانے کا شناختی کارڈ نکال کر دکھایا۔

''مگر آج تک کوٹ کو اٹھائے پھرنے میں کیا راز ہے؟'' میں نے جاننا چاہا۔

''میں آج بھی اپنے تمام ضروری کاغذات اور کچھ نقدی کو اس کی جیبوں میں رکھتا ہوں۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر ایک منٹ بھی ضائع کیے بغیر ملک کو خیرآباد کہہ سکوں۔''

ooo

نگہت مرزا

توشہ

فضا میں چھائے مکمل سناٹے کو چیرتا ہوا اس کا قہقہہ ابھرا تو چنار کے سرخ پتوں میں چھپی اکلوتی فاختہ نے سہم کر اپنے پر پھڑ پھڑائے اور اڑان بھر کر نزدیکی چھت پر جا بیٹھی۔ یہ قہقہہ کچھ عجیب سا تھا۔ اس میں خوشی کی رمق نہ تھی۔ دل خراش چیخوں کی مانند یہ قہقہہ جیسے کسی اندرونی کرب کا غماز تھا۔ ندا نے گردن پیچھے موڑ کر اس کے ماخذ کو دیکھنا چاہا۔ وہ رومانہ تھی اور غالباً بگ باس کے آفس کی طرف جا رہی تھی۔

اندر غیبت کا بازار گرم تھا اور سب حسب استطاعت اپنا اپنا دامن اس کارِ خیر سے بھر رہے تھے۔

''تم نے کبھی غور سے اس کے قہقہوں کو سنا ہے؟ باخدا ایسا لگتا ہے جیسے کسی اندرونی کرب سے دوچار ہو۔'' ماریہ بیگم ہمدردی سے بولیں۔

''تم انہیں قہقہے کہتی ہو؟'' مریم نے مصنوعی حیرت سے ابرو اٹھا کر پوچھا ''بھئی مجھے ان میں دل خراش چیخیں سنائی دیتی ہیں۔''

''بے چاری۔ دوسری بار مات کھا گئی۔'' مسز حیدر اپنی سخت، پاٹ دار آواز میں گویا ہوئیں۔

''دوسری بار؟....... کیا مطلب؟؟''

توشی اپنا کام چھوڑ کر ان کے پہلو سے آ لگی۔ اسے نئے نئے سکینڈل سننے اور نہیں ہوا دینے سے عشق تھا۔

''ارے....... تمہیں نہیں پتہ؟؟ یاسر سے اس کی سیکنڈ میرج ہے۔'' مسز حیدر، توشی کی لاعلمی سے کچھ الجھ کر بولیں۔

''اچھا!...... مجھے واقعی نہیں پتہ تھا۔''

''اور کیا۔ پہلی شادی بقول خود اس کے، ارینجڈ تھی، ماں باپ کی مرضی کی شادی......''

''اسے کیوں چھوڑ دیا؟'' توشی اپنی معلومات میں اضافے پر مصر تھی۔

''لو اس نے تھوڑی چھوڑا۔ میاں کو وہ پسند نہ آ سکی۔ بس دو ماہ میں گھر واپس آ گئی۔''

''ممکن ہے اس کے میاں کو اس کا یوں قہقہے لگانا ناپسند ہو۔''

''تمہارا مطلب ان دل خراش چیخوں سے ہے؟'' مسز حیدر طنزیہ مسکراہٹ سے بولیں۔ ''نہیں۔ تب تو اس کی یہ عادت نہیں تھی۔ میں اسے برسوں سے جانتی ہوں۔ کالج میں مجھ سے ایک دو برس سینئر تھی۔''

کیا تب بھی اس کی یہی خصوصیات تھیں؟ میرا مطلب ہے دوسروں سے حسد کرنا اور مفت میں خواہ مخواہ ان کی ٹانگ کھینچنا۔'' رابعہ تعجب سے بولی۔

''سچی بات تو یہ ہے رابعہ کہ میں ابھی تک اسے سمجھ نہیں سکی۔ حالانکہ میں نے بی اے سائیکالوجی پڑھی ہے اور کافی حد تک مردم شناس ہوں مگر اس کے کردار کی ہر پرت دوسری سے اتنی مختلف ہے کہ اس کی شخصیت کا اصل سرا ہاتھ ہی نہیں لگتا۔'' ماریہ بیگم بے چارگی سے بولی۔ وہ گذشتہ چار برس سے رومانہ کی ہم نوالہ و ہم پیالہ تھیں۔

''ہماری زبان میں ایسے لوگوں کو میسنا کہتے ہیں۔'' رابعہ ہنس کر بولی۔

''ہاں...... پر کبھی کبھی مجھے اس پر ترس بھی آتا ہے۔'' ماریہ بیگم نے افسردگی سے کہا۔

''خدایا...... تم کبھی بھی اس کے سامنے یہ کلمہ زبان سے مت نکالنا ورنہ وہ تمہاری سات پشتوں کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دے گی۔'' مسز حیدر اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر یوں بولیں جیسے چھوٹے بچوں کو ڈرایا جا رہا ہو۔

''اطمینان رکھو! میں اس کی بدزبانی کے بہت قصے سن چکی ہوں۔'' ماریہ بیگم انہیں یقین دلانے کی خاطر جلدی سے بول

انھیں۔

''مسز حیدر! ابھی آپ بات کر رہی تھیں۔ کیا دوسرے والے سے بھی اس کا نباہ نہیں ہو سکا؟'' تو شی سکینڈل کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر گھبرا رہی تھی۔

''دوسرے والے کو اس نے خوب پھانسا تھا۔ والدین تو اس پر راضی نہیں تھے۔ کہاں وہ گھاگ، عیار قسم کا آوارہ گرد، جس کے آگے پیچھے کا کچھ پتہ نہ تھا اور کہاں یہ...... اور کچھ ہو نہ ہو خاندان تو ٹھیک ٹھاک ہے ان کا۔ اس کے بھائی وائی پہلے تو بہت ناراض ہوئے مگر آخر اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔'' مسز حیدر نے مکمل تفصیل پیش کر دی۔

''یہ کوئی نئی بات نہیں پسند کی شادیوں کا اکثر برا انجام ہوتا ہے۔''

''کیوں؟ کیا اس سے بھی علیحدگی ہو گئی؟'' تو شی نے کہانی مکمل کرنے کی خاطر پوچھا۔

''نہیں، ابھی تو نہیں...... '' مسز حیدر کا لہجہ خاصا افسردہ ہو گیا۔ (جیسے ابھی کیوں نہیں)۔'' حالات ویسے کچھ ٹھیک نہیں جا رہے۔ سنا ہے روزانہ جھگڑا ہوتا ہے۔''

''طبیعت جھگڑالو ہو تو لڑنے کے بہانے بہت......''

''اصل میں جس سے اس نے دوسری شادی کی ہے وہ خاصی پکی عمر کا آدمی ہے۔ اس عمر میں شادی ایک ضرورت ہو جاتی ہے۔ کہ جب گھر جاؤ کھانا گرم ملے، صبح گھر سے نکلو تو کپڑے دھلے ہوئے استری شدہ ملیں۔ مگر اس بیچاری کو گھر داری کا سلیقہ کہاں''

''گھر داری کا سلیقہ نہ سہی جناب، پر اسے اور تو بہت سے سلیقے آتے ہیں۔ مثلاً بڑوں کو الو بنا کر اپنا کام نکالنا۔ جس سلیقے اور ہوشیاری سے وہ یہ کام کرتی ہے۔ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''مگر میری جان! کے دن؟ بڑے ہمیشہ بڑے نہیں رہتے۔''

''بدھو ہو تم تو؟ ارے بھئی بڑے بلا سے بدلتے رہیں، ان کی ''کرسی'' تو سلامت رہتی ہے نا۔ اور ایسے لوگ کرسی کے پجاری ہوتے ہیں۔ اوپر، ان کی بلا سے، کوئی گدھا ہی کیوں نہ سوار ہو۔''

''دیکھو تو میں سال بھر سے اس کے ساتھ کام کر رہی ہوں مگر محترمہ کے اس رخ سے ابھی تک نا آشنا تھی۔'' ندا نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

''بی بی! ہمارے ساتھ رہو گی تو بڑے بڑوں کے چہروں پر سے نقاب ہٹا ہوا پاؤ گی۔ ارے ہم تو یہیں کے رہنے والے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے نسلی شجروں سے واقف ہیں۔ رتی رتی حال جانتے ہیں۔'' جاننے کے زعم میں مسز حیدر نے گردن اور اکڑا لی۔

''میرے خیال میں نہ جاننا بہتر رہتا ہے، مسز حیدر'' ان کی اکڑی ہوئی گردن اور باہر کو نکلے ہوئے سینے سے الجھ کر ندا بول اٹھی۔

''اے لو۔ اور سنو! یہ خود استاد ہو کر جہالت کی طرف داری کر رہی ہیں۔'' مسز حیدر صحیح مداری تھیں۔ مجمع کی نبض شناسی، موقعے کی مناسبت سے بات بدلنے والی۔

''جہالت کا ذکر کہاں سے آ گیا۔ آپ تو لوگوں کے شجر ہائے نسب کی بات کر رہی تھیں۔ اس پر میں نے کہا تھا کہ بے خبر رہنا بہتر ہے'' ندا مزید الجھ گئی۔

''ارے ہے! میں کیوں دوسروں کے شجرے اچھالوں۔ اللہ بخشے میری نانی کہا کرتی تھیں، کیچڑ میں پاؤں ڈالنے سے چھینٹیں پڑتی ہیں۔ ہم نے تو ساری زندگی کیچڑ سے بچ کر گزاری ہے۔''

''ماشاءاللہ! ماشاءاللہ...... '' دو تین دبی دبی آوازیں ابھریں۔

مسز حیدر نے گود میں رکھی ہوئی کاپی اٹھا کر تپائی پر رکھ دی اور دامن جھاڑنے لگیں جیسے آلودگی ہٹا رہی ہوں۔ جس کے ذہن

میں کیچڑ بھرا ہوا سے ہر جگہ غلاظت نظر آئے گی۔ ندا نے سوچا اور اٹھ کر باہر چلی گئی۔
''دیکھو تو کیسی میسنی ہے۔'' فرخندہ نے مسز حیدر کو خوش کرنے کی خاطر کہا۔ آخر کو وہ اکثر ان سے چائے پیا کرتی تھی۔ حساب تو چکانا تھا۔ جیب سے نہ سہی زبان سے سہی۔
''کوئی ایسی ویسی! ارے اس کو بھی اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ پورا جاسوس ہے یہ۔ ساری ادھر کی خبریں ادھر پہنچاتی ہیں اور صورت دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے، ابھی ماں کے پیٹ سے نکلی ہو۔''
زبردست قہقہہ پڑا۔
''چلو دفع کرو۔ مٹی ڈالو۔ ہم کیوں اپنی عاقبت خراب کریں۔'' مسز حیدر نے بڑے اہتمام سے سر پر دوپٹہ جمایا اور پرس کھول کر تسبیح نکالی۔ ان کی دیکھا دیکھی سب نے اپنے اپنے پرسوں میں سے تسبیحیں اور پنج سورے نکالیے اور ہل ہل کر تلاوت کرنے لگیں......!

ooo

وقار بن الٰہی

کس کس کو روؤں

میں اس کہانی کو یہاں سے شروع کرتا ہوں۔۔

کہتے ہیں مدتوں پہلے ایک تھا بادشاہ۔۔ میرا اور آپ کا اللہ بادشاہ۔۔ چونکہ وہ پرانے زمانے کا بادشاہ تھا اس لیے اسے گھڑ سواری کا بہت شوق تھا۔ پرانے زمانے کا تھا اسی لیے آج کا ہوتا تو بھولے سے بھی گھوڑوں کا نام نہیں لیتا۔ جب سواری کے لیے اور بہت سے چیزیں وافر مقدار میں موجود ہوں تو گھوڑوں کی بھلا کیا ضرورت۔ آج تو گھوڑے صرف پالنے کے لیے یا پھر مربے وغیرہ کھلانے کے لیے ہی رہ گئے ہیں۔ گھوڑے بھی سدھائے ہوتے تھے۔ (آج کے انسان کی طرح نہیں، جس کا سدھانا ناممکن ہے کہ وہ ساری تربیت ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے) اور مالک کے اتنے وفادار کہ کوئی سائنس دان بھی کیا ہوگا۔ اس زمانے میں اتنا ہی امن وسکون ہوتا تھا جتنا کہ آج قتل وغارت گری۔ چنانچہ بادشاہ گھوڑے پر اکیلا ہی میلوں نکل جاتا اور اسے کوئی پوچھتا نہ ہی ٹوکتا۔ حفاظت کرنے والے یا تو چین کی نیند سوتے یا کہتے ہیں بانسری بجایا کرتے تھے۔ بادشاہ اپنا گھوم گھام کر واپس آجاتا اگر جی چاہتا تو اپنی مرضی اور چاہت سے کسی مقام پر قیام بھی کر لیتا۔ نگاہیں اور دل گرمانے کو سامان اپنے آپ ہی فراہم ہو جاتا تھا سے عموماً ان خرخشوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ رہے رموز سلطنت تو اول تو ہوتے ہیں کون سے تھے اور اگر تھے بھی تو دیکھنے والے کیا دیکھ لیا کرتے تھے۔ فائلوں کا رواج تھا نہ ہی اس پر سونے کی کسی کو توفیق ہوتی تھی۔ سکے تو رائج تھے لیکن انہیں خرید وفروخت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، فائلیں چلانے کے لیے نہیں۔

جی تو بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ بادشاہ کو گھڑ سواری کا بہت شوق تھا اور وہ اکثر گھوڑے پر سوار گھومنے پھرنے کو نکل جایا کرتا تھا۔ اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے یا کسی طرف بھی مجال ہے جو کسی ایجنسی وغیرہ کا کوئی پرندہ پر بھی مار سکتا ہو۔ بادشاہ رعایا سے اور رعایا بادشاہ سے بس خوش ہی خوش تھی سوا ایجنسی یا ایجنسی والے نے وہاں کیا کرنا تھا۔ بارش چونکہ ایک مدت سے نہیں برسی تھی۔ اس لیے گھوڑے کی ٹاپوں سے گرد اڑ رہی تھی۔ چنانچہ وجہ کا تو علم نہ ہو سکا لیکن ہوا یہ کہ بادشاہ کا گھوڑا جونہی ایک ٹیلے پر چڑھنے کے بعد ہموار زمین پر آیا تو سامنے سے آتی ہوئی تین عورتوں کو دیکھ کر ایسا بدکا کہ بادشاہ اگرچابک دستی کا مظاہرہ نہ کرتا تو وہ اسے گرا کر ایسا بھاگتا کہ کوئی اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکتا۔ (یہ عین وقت پر بھاگ نکلنے کا مرض گھوڑوں میں نہ جانے کہاں سے در آیا ہے) بھاگا تو وہ نہیں البتہ بھر کر اکڑ اور الف ہو گیا۔ گھوڑے کے اکڑ کر سیدھا ہونے کو الف ہی کہتے ہیں۔ حالانکہ ب کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ حیرانی کی بات تو یہی تھی کہ عورتوں کی عمریں قد کاٹھ کا ڈیل ڈول لباس وغیرہ دیکھ کر بادشاہ کو بدکنا چاہیے تھا لیکن یہاں گھوڑے نے پہل کر لی۔ عورتیں جو اپنے سروں پر مٹکے نما گھڑے رکھے شہر کو جا رہی تھیں ڈر گئیں اور ایسی ڈریں کہ ان کے سروں پر اٹھائے ہوئے مٹکے پاؤں میں گر کر نہ صرف چور ہو گئے بلکہ ان میں لبالب بھرا ہوا دودھ بھی گھوڑے، بادشاہ اور عورتوں کے قدموں میں بکھر کر خشک زمین کو سیراب کرنے لگا۔

داستانوں میں اب تک تو یہی پڑھتے آتے ہیں کو ایسی صورت حال میں عورتیں (مرد شاذ و نادر ہی) پہلے ہنستی تھیں اور پھر انہیں رونے کا دورہ پڑتا تھا۔ لیکن یہاں معاملہ تو ڑا سا مختلف ہو گیا کہ عورتیں جو بادشاہ کے کروفر، گھوڑے اور لباس کو دیکھ کر سمجھ گئی تھیں کہ ان کے سامنے کون ہے ان میں سے دو تو منہ ڈھانپ کر زور زور سے رونے لگیں اور تیسری عورت نے کھلکھلا کر ہنسنا شروع کر دیا۔ بادشاہ گھوڑے سے اتر آیا۔ رونے والی خواتین کے پاس گیا انہیں دلاسا دینے اور ان کا نقصان پورا کرنے کے وعدے کا اظہار کر رہا تھا کہ عورتیں رونا دھونا بھول کر بادشاہ کو دعائیں دینے اور اس کی حکومت اور انصاف پسندی کے گن گانے لگیں۔ اس زمانے میں بادشاہ جو وعدہ کرتے تھے پورا بھی ہوتا تھا، آج کی طرح نہیں کہ قاتلوں تک کو پکڑنے کے وعدے ضرور کرتے ہیں لیکن مجال ہے جو پکڑا ایک آدھ بھی جاتا ہو۔ اس کے بعد وہ ہنسنے والی عورت کو حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بی بی رونے والیوں کا رونا تو میری سمجھ میں آتا ہے ان کا نقصان ہوا ہے اس لیے رو رہی ہیں لیکن نقصان تو تمہارا بھی ہوا ہے، تم کیوں ہنس رہی ہو؟''

بی بی بڑے اطمینان سے بادشاہ کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہیں زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی (عجیب زمانہ تھا کہ بادشاہ سے کوئی ڈرتا تھا نہ خوفیا تا تھا) اور بادشاہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی

''اگر برا نہ مانو تو بات شروع کروں؟'' بادشاہ بالکل فارغ تھا، اسے بھلا کسی میٹنگ یا سیمی نار اور ورکشاپ میں تھوڑی جانا تھا، نہ ہی کوئی باتھ روم بنے تھے کہ چھپ جاتا مصروفیت کا بہانہ بناتا اور چپ چاپ کھسک جاتا پھر ابھی بھلے مانسوں نے کافی وغیرہ بھی ایجاد نہیں کی تھی کہ اسی کا مگ اپنے سامنے دھر کر ڈوب جاتا؟ اسے کام تھا ہی کون سا اور اگر ہوتا بھی تو اپنی بادشاہی میں کام کرتا ہی کون ہے۔ جو وہ فکر مند ہوتا؟ اس نے اطمینان سے گھوڑے کو پچکارا اس کی لگا میں ساتھ ہی اایک درخت پر باندھ دیں۔ ادھر اُدھر دیکھا اور عورت سے تھوڑے فاصلے پر پڑے ایک پتھر کو پھونکیں مار کر صاف کیا اور اسی پر بیٹھ گیا۔

''تم اپنی بات شروع کرو۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''بات ذرا لمبی ہے کہیں اکتا تو نہیں جاؤ گے؟؟''

''ارے نہیں تم شروع تو کرو۔''

''بات یہ ہے بادشاہ سلامت کہ میں ایک سوداگر کی بیوی تھی۔ اس سے شادی سے پہلے میرے حسن کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سنا یہی ہے کہ سوداگر نے مجھے حاصل کرنے کے لیے اپنے راستے کا ہر پتھر نہایت بے دردی سے ہٹایا تھا۔ مجھ سے شادی کے بعد تو وہ بالکل بدل گیا تھا۔ لگتا تھا موم کا باوا ہے اسی لیے میرے پاس اوپر والے کا دیا وہ سب کچھ تھا جو کامیاب سوداگروں کی بیویوں کے پاس ہوتا ہے۔ وہ مال صرف لانے کا ہی نہیں بلکہ لے جانے کا بھی قائل تھا۔ اس لیے میں ریشم و کم خواب پہنتی اور کھانے کو دنیا کی ہر نعمت میرے دستر خوان پر موجود ہوتی۔ رہنے کو ایک پورا محل میرے پاس تھا۔ وجہ غالباً یہی تھی کہ لالچ میرے شوہر کے پاس پھٹکتی بھی نہیں تھی۔ اسے تجارت میں نقصان ہوتا یا فائدہ وہ ہر حال میں خوش رہنے والا اور بھگوان کا شکر بجالانے والا شخص بن چکا تھا۔ پرماتما نے ہمیں اولاد کی نعمت سے بھی نواز رکھا تھا۔ بچے کی عمر یہی کوئی چھ سات برس تھی کہ۔۔۔''

بادشاہ نے پہلو بدلا، کھنکار کر گلا صاف کیا، سر پھیر کر گھوڑے کی طرف دیکھا اسے بھی اطمینان سے کہانی سنتے دیکھ کر پھر سے سراپا کان بن گیا۔ اسے یہ خیال بھی نہ آیا کہ کار پرادازان مملکت اس کی عدم موجودگی سے پریشان ہو رہے ہوں گے۔

''ہاں تو بادشاہ سلامت۔'' عورت نے بادشاہ کی طرف دیکھے بنا کہنا شروع کیا۔ ''ایک دن میرے دل نے گواہی دی کہ ہو نہ ہو شام کو سوداگر پلٹ آئے گا۔ جانے کیوں اور کیسے بیویوں کو اس قسم کی گواہیاں اور اشارے ملتے رہتے ہیں۔ ان کے اندر کوئی بیٹھا انہیں بتاتا رہتا ہے۔ سردیوں کا موسم تھا جانے کیوں میرا من مچلا اور میں سوداگر کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگی۔ پہلے بچے کو خوب نہلایا، دھلایا حالانکہ یہ کام ملازمہ ہی کیا کرتی تھی لیکن اس دن میں نے کہا نا میرا جی مچل رہا تھا چنانچہ میں نے اپنے ہاتھوں سے اسے نہلایا اور پھر خود بھی سردیوں کی پروا کیے بغیر کھلے چھت پر ہی نہانے بیٹھ گئی۔'' عورت نے تو نہیں البتہ بادشاہ کو جانے کون سا کھٹمل کاٹنے لگا کہ اس نے بے چینی سے کئی بار پہلو بدلا۔

''یہ بھی نہ سوچا کہ کسی کی بری نظر پڑ سکتی ہے کھلی فضا اور چمکتی دھوپ میں نہانے کے ساتھ ساتھ سوداگر کی واپسی کے خیال نے بے حد لطف دیا اتنا کہ انجام میں میں جھوم جھوم گئی۔ لیکن وہ کہتے ہیں ناں برا وقت کسی بھی وقت آپ کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ میں فارغ ہو کر نیچے صحن میں اتری تو ریاست کے بادشاہ کا ہرکارہ حویلی کے دروازے پر انتظار کر رہا تھا۔ میں جب نہا رہی تھی تو بادشاہ بھی اتفاق سے نیچے سر گزر رہا تھا۔ میرے حسن کی چمک سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں، میری زلفوں نے ایسی تاریکی پھیلائی کہ اس نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے شادی کا پیغام بھجوا دیا۔۔ پتہ نہیں، بادشاہ لوگ شادی کے معاملے میں اتنی تھڑ دلی اور جلدی کیوں دکھاتے ہیں۔۔۔'' بادشاہ نے بات سنی، بغلیں جھانکیں، ادھر اُدھر دیکھا، کوئی اور تو نہیں سن رہا، اطمینان کر لینے کے بعد وہ مسکرایا، بلکہ دل ہی دل میں گنگنا اور پھر سے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ عورت نے زمین کے اس ٹکڑے کو غور سے

دیکھا جو دودھ کے جذب ہونے کی وجہ سے گیلا ہو رہا تھا اور بولی۔۔

''میں بھلا بادشاہ کو اس کے علاوہ کیا جواب دے سکتی تھی کہ میرا بیاہ ہی نہیں ہو چکا بلکہ میں ایک بچے کی ماں بھی ہوں، دوسری شادی کیسے کرسکتی ہوں۔۔۔ساتھ ہی بادشاہ کا غضب بھی ڈرار ہا تھا چنانچہ میں نے ٹالنے کی غرض سے بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ سوداگر یہاں نہیں ہے وہ واپس آلے تو میں اس سے مشورہ کر کے جواب دوں گی۔۔۔دل ہی دل میں میں ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔لیکن بادشاہ سلامت! ہونی ہو کر رہی، میں ٹال نہ سکی۔رات ابھی اتری ہی تھی اور میں سوداگر کے انتظار میں اپنی آنکھیں حویلی کے دروازے کے ساتھ چپکائے بیٹھی تھی کہ سوداگر کی بجائے محل سے آئی ہوئی پالکی میرے دروازے پر آن رکی، دو ہٹی کٹی ملازمیں اندر آئیں اور مجھے زبردستی پکڑ کر پالکی میں ڈال کر محل کو ہولیں۔میں چیختی چلاتی رہی کہ میرے سوداگر کا کیا بنے گا، میرے بیٹے کو کون دیکھے گا، لیکن کوئی سننے والا ہوتا تو میرے ساتھ اتنا سب کچھ ہوتا ہی کیوں؟۔۔''عورت اتنا کچھ کہنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی اور بے دھیانی میں درخت سے ٹوٹی ہوئی ٹہنی کو اٹھا کر دھول کو کریدنے لگی، دودھ کے گرنے سے کیچڑ بن گئی تھی۔۔جانے اسے کیا کچھ یاد آ رہا تھا۔کچھ کہنے کے لیے وہ لپکتی پھر رک جاتی، پھر لپکتی، پھر رک جاتی، کبھی بادشاہ کی طرف دیکھتی، کبھی زمین کی طرف۔یہ سلسلہ تھوڑی دیر جاری رہا، ایک آدھ آنسو بھی ٹپکا، آخر کار ہمت کر کے وہ بولی۔

''بادشاہ واقعی مجھ پر مرمٹا تھا۔اس نے جب میرے لیے پھولوں کی سیج بچھائی تو میں بھی انکار نہ کرسکی اور سوداگر کے انتظار میں میں نے جتنے خواب دیکھے تھے سب کے سب بادشاہ کے قدموں میں نچھاور کر دیے کہ اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتی تھی۔بادشاہ مجھ پر اپنی جان چھڑکتا تھا حالانکہ میں نے سن رکھا تھا کہ حرم تو اس کی چہیتی بیویوں اور کنیزوں سے بھرا ہوا تھا اور حقیقتاً تھا بھی ایسا ہی لیکن۔۔۔اس نے جانے مجھ میں کیا دیکھ لیا کہ کسی دوسری کی طرف اس کی نگاہ اٹھتی ہی نہیں تھی۔جہاں پناہ سچ تو یہی ہے کہ وہ جتنا میرے قریب آنے کی کوشش کرتا میں اتنا ہی اس سے دور بھاگتی۔میرے دل و دماغ پر ابھی تک سوداگر کی حکمرانی تھی اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ دل پر جس کی حکمرانی ایک بار قائم ہو جائے وہ مرتے دم تک قائم رہتی ہے۔دل کوئی سلطنت تو نہیں ہوتا کہ جس کا جی چاہا حکمران بن گیا۔۔۔بادشاہ نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا جیسے اسے کوئی چوری پکڑے جانے کا شائبہ ہوا ہو۔پھر اطمینان کر کے کہ یہاں ان چاروں کے سوا اور ہے کون، اس نے آنکھیں اور کان اس عورت کی خدمت میں پیش کر دیے۔عورت مسکرائی اور پھر سے اپنی کہانی بیان کرنے لگی۔ایک دن ہوا ایسا کہ بادشاہ شکار کے لیے ایک جنگل میں خیمہ ڈالے پڑا تھا۔بادشاہ اور اس کے ساتھی کسی ہرن کے پیچھے خاصے دور نکل گئے تھے اور لگتا تھا اندھیرا گھرنے سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔دو چار کنیزیں میرے سامنے حاضر تھیں لیکن میرا دل اس دیار کی طرح لگتا تھا جو ابھی ابھی اجڑا ہو۔اداس ویران، میں نے خیمے کا پردہ اٹھایا اور باہر دیکھنے لگی تو جیسے میری نگاہیں پتھر ہو گئیں۔ارے سوداگر میرے سامنے موجود تھا، اس کی نظروں میں رنج تھا، غصہ اور نفرت بھی۔اس نے میری طرف دیکھا، غصے سے زمین پر تھوکا اور بولا۔

''آخر کو عورت ہی نکلی نا، بے وفا کہیں کی، میں ایک معمولی سا سوداگر ہی تو ہوں لیکن میرا نہیں تو بیٹے کا ہی خیال کیا ہوتا۔پر بیٹے کا خیال بھلا کیا آتا جب بادشاہ۔۔۔''میں اس کے زہر میں بجھے ہوئے نشتر برداشت نہ کرسکی اور میں نے تڑپ کر اسے جواب دیا۔

''کیا کہہ رہے ہو میں تو اب بھی تمہارے ہی خواب دیکھتی اور تمہارا انتظار کرتی ہوں لیکن میرا بس نہیں چلتا۔کروں تو کیا بادشاہ نے مجھے قید کر رکھا ہے۔تم بھی جو یہاں تک آئے ہو سمجھو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آئے ہو۔کسی پہریدار نے دیکھ لیا تو تمہاری گردن اڑانے میں اسے دیر نہیں لگے گی۔۔یوں بھی اسے گردنیں اڑانے اور لوگوں کو پھانسی پر لٹکانے کا بڑا ہی شوق ہے۔۔

سوداگر پل بھر چپ رہا جیسے گہری سوچ میں ڈوبا ہو۔پھر اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔۔

سنو بادشاہ کو کسی طرح گنگا یاترا کے لیے راضی کرلو۔وہ جب راضی ہو جائے تو اسے گنگا کنارے خیمے ڈالنے پر تیار کرلو۔میں تمہیں وہیں ملوں گا۔اور وہیں فرار کی ساری تفصیل طے کریں گے۔سوداگر تو غائب ہو گیا لیکن سچ جانیں جب سے میں محل میں آئی تھی پہلی بار مجھے اتنی زور کی بھوک لگی کہ میں نے بادشاہ کا انتظار نہ کیا اور پیٹ بھرنے کے بعد لمبی تان کر سو گئی۔۔۔بادشاہ کو

بھلا گنگا یاترا کے لیے تیار کرنا کون سا مشکل کام تھا۔ دو چار روز انوانی کھٹوانی پڑی رہی تو اسے بھی فکر کھانے لگی کہ اسے کون سا روگ چمٹ گیا ہے۔ جب وہ میرے گرد چکر کاٹ کاٹ کر تھک گیا تو میں اپنی سوچ کا سرا اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ بات سن کر اس کی تو باچھیں چر گئیں۔ کہنے لگا۔

''لے بھلے مانس! پہلے روز ہی بتا دیتی۔ یہ بھی کوئی فرمائش ہے۔ میں سمجھا کم سے کم ہمالہ چلنے کو کہے گی۔ میں تو اس کے لیے بھی تیار تھا۔ اور گنگا جانے کو تو میرا اپنا جی چاہ رہا تھا۔ بس مجھے ایک روز کی مہلت دے دو۔'' اتنا کہہ کر اس نے تالی بجائی اور چوبدار کے آتے ہی سارے احکامات جاری کر دیئے۔ دو روز بعد ہم گنگا کی طرف روانہ ہوئے تو میرے جیسے پر لگ گئے۔ چاہتی یہی تھی، کسی طرح ترت ہی گنگا سامنے آ جائے اور میں بھاگ کر سوداگر سے بغل گیر ہو جاؤں۔۔۔لیکن ہاتھی نے اپنا وقت لینا تھا۔ شاید چار روز کے سفر کے بعد جو میں نے کجاوے کا پردہ ہٹا کر دیکھا تو میرا دل اچھل کر جیسے گلے میں اٹک گیا۔۔۔ سامنے گنگا اپنی ساری پوتر تا کے ساتھ ٹھاٹھیں مار رہا تھا شاہی قافلے نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا اور طے پایا کہ ایک روز بعد پو پھٹتے ہی اشنان کیا جائے گا۔ شاہی اہلکار انتظامات میں مصروف ہو گئے اور میں خیمے میں ٹہل کر بیٹھ کر یا لیٹ کر بے چینی سے سوداگر کے پیغام کا انتظار کرنے لگی۔۔'' اتنا کہہ کر اس نے بادشاہ کی طرف غور سے دیکھا، پھر گھورا پھر دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگی۔

''اب مجھے یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں کہ عورت پر حکمرانی کرنے کے لیے کسی محل یا تخت کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' بادشاہ بھی اس کی بات سن کر مسکرایا۔ دیر تک اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور اسی نتیجے پر پہنچا کہ کہہ تو وہ بھی ٹھیک ہی رہی تھی۔ نتیجہ مختلف بھی ہو سکتا تھا لیکن یہاں عورت کی عمر آڑے آ گئی۔ اور پھر اس کے اپنے حرم میں بھلا کس شے کی کمی تھی۔ سر جھٹک کر بولا۔

''ٹھیک کہتی ہو۔۔ پھر۔۔'' اس نے بادشاہ کی بات کاٹ دی۔

''میری کہانی تو بڑی لمبی ہے بادشاہ سلامت۔ بے صبری دکھائی تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ ہاں تو۔۔ میں کہہ رہی تھی مجھے بے چینی سے سوداگر کا انتظار تھا لیکن اس رات یہ کرب تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ شاید رات کا پہلا پہر ختم ہوا تھا اور بادشاہ دوسرے خیمے میں سوم رس پینے میں مصروف تھا کہ مجھے سیٹی کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز تو میری جانی پہچانی تھی۔ میں نے دبے پاؤں پردے تک جا کر ہولے سے اسے اٹھایا، باہر جھانک کر دیکھا اور جب اطمینان ہو گیا کہ پہریدار اب دیر بعد ہی سامنے سے گزرے گا تو سرپٹ بھاگ اٹھی۔ آپ خود ہی سوچ لیں وہ کون سی چیز تھی جو مجھے اڑائے لیے جا رہی تھی۔؟ پڑاؤ سے باہر گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا سوداگر وہیں میرا انتظار کر رہا تھا۔ میرے پہنچنے کی دیر تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر اندھا دھند بھاگنے لگے۔ تاریک رات، اس پہ گھنا جنگل لیکن ہم کسی خطرے کی پرواہ کیے بغیر بھاگے چلے جا رہے تھے۔ سوچا یہی تھا کہ تھوڑی دیر بعد جب بادشاہ اپنے خیمے میں واپس آئے گا اور مجھے وہاں موجود نہ پا کر ہرکارے میری تلاش میں روانہ کرے گا، اس کی خاموشی جیسے ایک اور کہانی کہہ رہی تھی۔۔ دیر تک چپ رہی تو بادشاہ بولا۔

''پھر۔۔ پھر کیا ہوا؟ اچانک عورت کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے اور زمین کی دھول میں جذب ہو گئے۔

''ہونا کیا تھا بادشاہ سلامت۔ تھوڑی ہی دیر بعد سوداگر اتنی دور چلا گیا کہ بادشاہ ایک نہیں، بیسیوں ہرکارے بھی دوڑا دیتا، وہ اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ہوا یہ کہ گھنا جنگل تو ہم نے عبور کر لیا لیکن اس کے بعد لمبے سرکنڈوں میں جب ہم داخل ہوئے تو سوداگر اچانک چیخ مار کر جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا۔ میں اپنی رفتار میں خاصا آگے نکل گئی تھی۔ اس کی چیخ سن کر رکی، پلٹی اور اس کے پاس پہنچی تو اتنا ہی کہہ سکا۔

''مجھے۔۔ مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے۔۔ تم۔۔ تم۔۔ رکو نہیں۔۔ دوڑتی جاؤ۔۔ اس کے بعد اس کی آواز ڈوب گئی۔ میری تو حالت ایسی ہو گئی کہ کاٹو تو جسم سے لہو کی بوند بھی نہ نکلے۔ اب کیا کروں؟ کدھر جاؤں۔ کسے مدد کے لیے پکاروں؟؟ سنا تھا سرکنڈوں میں سانپ تو ہوتے ہیں لیکن وہ دریا میں سے تیر کر آتے ہیں اور پانی کا سانپ بھلا کیا نقصان پہنچائے گا، لیکن یہ سانپ تو اتنا زہریلا نکلا کہ اس نے سوداگر کو دوسرا سانس بھی نہیں لینے دیا۔۔ بادشاہ کا محل تو میں چھوڑ آئی تھی۔ اب واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جس کے لیے بادشاہ کا قرب تج دیا تھا وہ تو سرکنڈوں کے درمیان لمبی تان چکا تھا۔ اب سامنے سرکنڈوں کا جنگل

تھا یا دریا جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا لیکن بپھرا ہوا جیسے مجھے میرے کیے کی سزا دینا چاہتا ہو۔۔ میں نے سوچا اگر سرکنڈوں میں ہی چلتی رہتی ہوں تو ہو سکتا ہے، کوئی سانپ مجھے بھی ڈس لے۔۔ اس طرح قصہ تو پاک ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میری تلاش میں بادشاہ کے بھیجے ہوئے ہرکارے مجھے آن لیں۔ پھر۔۔ میں نے بادشاہ کے ظلم و ستم کے قصے سن رکھے تھے۔۔ درباری کیا کچھ نہیں کہتے تھے۔۔۔ اگر دریا میں کودتی ہوں تو شاید لہروں کو مجھ پر رحم آ جائے اور میں دوسرے کنارے پہنچ ہی جاؤں۔ چنانچہ میں نے چپ چاپ دریا میں چھلانگ لگا دی۔۔۔'' بادشاہ نے پتھر پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا۔۔ تھوک نگلی، لبوں پر زبان پھیری اور گردن موڑ کر گھوڑے کی طرف دیکھا جو اچانک ہی ہنہنا اٹھا تھا، شاید گھوڑے کو بھی عورت کی حالت زار پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ بادشاہ اس کی طرف سے مطمئن ہوا تو بڑی دلچسپی سے کہنے لگا۔

''اتنی بہادر تم دکھائی تو نہیں دیتیں۔۔ یا شاید بادشاہوں کے ظلم و ستم کے قصوں نے تمہیں بوکھلا دیا تھا۔ بس اب تم رکے بغیر بولتی چلی جاؤ۔'' بادشاہ کے من میں کانٹا سا چبھا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن عورت تو کانوں کی کچی پر لیٹی تھی۔

''تو میں کہہ رہی تھی کہ پرکھوں سے سنا تھا گنگا آسمانوں سے اترا ہوا دریا ہے۔۔ یہ مجھے اس وقت یاد آیا جب میں جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ اس سے پہلے اسی مقصد کے لیے تو دریا میں چھلانگ لگائی تھی۔۔ میں جوں جوں ہاتھ پاؤں چلاتی پانی اتنے ہی زور سے مجھے نیچے کھینچتا۔ یہاں تک کہ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد ہی مجھ پر عیاں ہو گیا کہ ساری کوشش بیکار ہے۔ پل بھر کو سوچا بھی اگر سرکنڈوں میں ہی چلتی رہتی تو ممکن تھا سانپ ڈس لیتا، اتنی تکلیف تو نہ ہوتی۔۔۔ یہ بھی سوچا کہ سودا اگر کا ساتھ چھوٹا، بادشاہ کو میں نے خود دھتکار دیا تھا، اب بھلا اس زندگی سے کیا حاصل ہوتا تھا۔ لیکن صرف ڈوبنے والا ہی جانتا تھا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔۔ اس کے بعد شاید ایک دوبار ہی ہاتھ پاؤں مارے اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ لہریں مجھے بہائے کہاں لیے جا رہی ہیں۔

خاصی دیر بعد جی تو نہیں چاہتا تھا لیکن صرف یہ جاننے کے لیے میں نرگ میں ہوں یا سورگ میں، آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ یقین نہ آیا۔ کہ ڈوبنے کے بعد آنکھیں کھلیں گی تو یہ منظر سامنے ہوگا۔۔ کسی کا کچا کوٹھا تھا، جس سے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔۔ جان تو میں گئی کہ بچ گئی ہوں، پر یہ دیکھنے کے لیے کہ مجھے بچانے والا کون ہے، میں نے کروٹ بدلنا چاہی لیکن پہلو میں ایسی ٹیس ابھری کہ ارادہ بدلتے ہی بنی۔

مجھے بچانے والا ایک بڑھئی تھا۔ میں لہروں کے رحم و کرم پر ڈوبتی ابھرتی بہے چلی جا رہی تھی، یہاں تک کہ پو پھٹنے لگی۔ بڑھئی گاؤں سے نکل کر اشنان اور پوجا پاٹ کرنے گنگا میں اترا ہوا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی جو اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ پہلے تو اسے یقین نہ آیا پھر میرے زیور گہنے اور شاہی لباس دیکھ کر وہ للچایا کم اور ہچکچایا زیادہ گیا اور سوچنے لگا بچائے یا اسی طرح بہنے دے؟ لیکن اس کے کہنے کے مطابق میری صورت دیکھ کر وہ قسمت آزمانے پر تیار ہی ہو گیا۔ کہ میرے سانس مجھے گھسیٹ کر دریا میں سے نکالا کنارے کی گیلی گھاس پر لٹایا۔ پیٹ میں سے دریا کا پانی نکالا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ میرے سانس بحال ہو گئے ہیں تو اس نے مجھے کندھے پر ڈالا اور اپنے کوٹھے میں لے آیا۔ اس کے کوٹھے میں آنے اور دوبارہ ہوش کی دنیا میں لوٹنے میں کتنا وقت لگا ہوگا؟ تھوڑی سی دیر لیکن اتنی دیر میں ہی سارے گاؤں میں خبر پھیل چکی تھی کہ بڑھئی کو گنگا میا نے جورو عطا کی ہے۔ جورو بھی ایسی کہ جسے دیکھ کر سورج دیوتا بھی شرما جائیں۔

بڑھئی نے دو چار روز تو میری ٹہل سیوا کی لیکن وہ ابھی تک مجھ سے بات کرنے کو کنی کترا رہا تھا۔ بہرحال ایک روز جب میں نے خود ہی ساری رام کہانی اس کے سامنے اگل دی تو وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ اس کا کوئی آگے پیچھے تو تھا نہیں، اکیلا ہی وہ اتنے بڑے گھر کا مالک تھا۔ ہم دونوں نے چند ہی روز میں شادی کر لی کہ اس نے مجھے پناہ بھی اسی شرط پر دی تھی اور پھر آج تک شرطوں کے بغیر پناہ دی بھی کس نے ہے؟''

بادشاہ کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے اس خاتون کے یوں بچ جانے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ جب کسی بادشاہ کی محبوبہ بھاگ جائے اور اسے بچائے اور اسے بچانے والا ایک بڑھئی ہو تو دوسرا بادشاہ کیسے خوش ہو سکتا ہے؟ اگر

وہ خاتون چپ چاپ موت کی آغوش میں چلی جاتی تو بادشاہ کے چہرے پر باچھیں ہی باچھیں دکھائی دیتیں۔ لیکن پھر کہانی کہنے کو کون باقی رہ جاتا؟ بادشاہ نے قدرے اکتاہٹ سے پہلو بدلا، کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، پھر سوچا چپ ہی رہے تو بہتر ہے۔۔ خاتون بھی رک گئی تھی۔ گھاس کے سوکھے تنکے سے کھیلتے کھیلتے اکتا گئی تو بولی۔

''میری شکل تو موہنی ہے ہی لیکن اس بڑھئی نے مجھے کیا پایا جیسے دنیا بھر کی دولت پالی ہو۔ کام کرنے کو وہ باہر کے کمرے میں بیٹھتا تھا۔ لیکن مجال ہے جو پل بھر بھی آرام سے بیٹھ جائے۔ آنے بہانے اندر آتا اور میرا طواف کر جاتا باہر سے ہی بیٹھے بیٹھے مجھے تاڑ لیتا یا اونچی آواز میں مجھ سے بات چیت کرتا رہتا۔ جیسے اسے یہی غم کھائے جا رہا ہو کہ کمرے میں ہوں یا نہیں۔۔ کہیں رفو چکر تو نہیں ہو گئی۔ گاؤں کنیائیں دیکھتی تھیں تو رشک کے مارے گنگ رہ جاتی تھیں۔ ان سب کے نزدیک میرے بڑھئی کی بے قراری کا کارن بس ایک ہی تھا کہ دور دور تک اس کنگلے بڑھئی کو کوئی بیٹی دینے کو تیار نہ تھا۔ اور میں حیران ہوتی تھی کہ اس شخص کے پاس کس شے کی کمی تھی، سونے کا دل جو تھا اس کا؟ پر شاید جب سے دنیا بنی ہے دل سونے کا بنا ہو یا موتیوں سے بھرا ہوا کوئی اس کی قدر نہیں کرتا۔'' بادشاہ نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا یوں جیسے اپنے زرق برق لباس کے ساتھ اس کے اندر اتر جانا چاہتا ہو۔۔ بولا تو لہجے میں للچاہٹ بھی تھی اور شاید پچھتاوا بھی۔۔

''ارے پگلی! سونے کے دل کو لے کر کسی نے چاٹنا ہے کیا۔۔ دیکھنے اور پرکھنے والے تو بس صورت کو ہی دیکھتے ہیں۔ صورت پر پھول کھل رہے ہوں تو ہر کوئی لٹو ہو جاتا ہے۔۔ اور اگر صورت پر ہی مٹی اڑ رہی ہو تو۔۔ ہاں پھر۔۔۔۔'' وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔

''میں سوچتی تھی یہ بڑھئی ہیرا ہے ہیرا۔ میں نے اپنی بقایا زندگی یہیں گزار دوں گی۔ اسے بچے دوں گی جنہیں ہم دونوں مل کر پالیں گے۔ وہ بڑے ہو جائیں گے تو باپ کا کام سنبھال لیں گے۔ پھر میں ان کی شادیاں کر دوں گی، اور وہ دوسرے کونھوں میں آباد ہو جائیں گے۔ لیکن پرماتما کو میرے یہ خواب پسند نہ آئے۔ یوں بھی پرماتما کو انسان کے خیالی پلاؤ سے دلچسپی ذرا کم ہی ہوتی ہے۔۔ یا شاید مجھے میرے گناہوں کا پھل ابھی مزید چکھنا تھا کہ ایک رات اچانک بڑھئی کو تاپ نے آ گھیرا اور قبل اس کے کہ بغل کے گاؤں میں سے حکیم جی کو بلایا جاتا اس نے ایڑیاں رگڑیں اور آناً فاناً اپنے بھگوان کے پاس چلا گیا۔ گاؤں والے تو آئے ہی اور اس کی بغل میں ابھار دیکھ بھی گئے، لیکن مجھے سمجھ نہ آئی کہ میں کیا کروں۔ رونے پیٹنے، چیخنے چلانے کو جی چاہتا تھا لیکن آنسو تھے کہ نکلنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے۔ مانا کہ میں بہت رو چکی تھی لیکن اس افتاد پر۔۔۔ مجھے یاد نہیں گاؤں والوں نے کیا کیا اور کیا نہیں میں تو بے بس چپ کی تصویر بنی ایک کمرے میں پڑی رہی۔ کوئی کہتا تھا، میں منحوس ہوں۔ کسی کی رائے تھی میرا سایہ بھی نحوست کی علامت ہے۔ چند ایک اس خیال کے حامی تھے کہ مجھے گاؤں سے نکال دیا جائے تا کہ بڑھئی کے گھر اور کاروبار پر قبضہ کیا جا سکے۔ یہ جھگڑے چند روز تک سر اٹھاتے رہے پھر جانے کیوں سب کو بس چپ سی لگ گئی۔ ایک رات میں سونے سے پہلے دروازہ کھڑکی بند کر رہی تھی کہ ہلکی ہلکی دستک نے میرے ہاتھ تھام لیے۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں ہوں دروازہ کھولو۔۔ آواز میں نے پہچان لی، مکھیا کا بیٹا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں بھی دیر نہ لگی کہ بھوکا ہے اپنی بھوک مٹانے آیا ہوگا۔۔۔ اور یہ سمجھنے میں بھی دیر نہ لگی کہ کون سی بھوک اسے میرے دروازے تک لے آئی ہے۔ میں نے پل بھر کو سوچا دروازہ کھولوں یا۔ بند رہنے دوں لیکن پھر یہ جان کر پٹ وا کر دیے کہ اگر اس کی بھوک نہ مٹی تو صبح بعد میں طلوع ہوگی اور میں دریا میں پہلے ڈبکیاں کھا رہی ہوں گی۔ دروازہ کیا کھلا وہ کسی بپھرے بیل کی طرح اندر گھس آیا اور پل بھر میں سب کچھ تہس نہس کر کے نکل گیا۔ البتہ اتنی شرافت اس نے ضرور دکھائی کہ جانے سے پہلے دو سکے میری ہتھیلی پر رکھتا گیا۔۔۔ عجیب بات ہے اسے دوسری بھوک تھی اور مجھے ازلی بھوک اور دونوں کو مٹانے کے لیے ایک آدھ سکے کی ضرورت پڑتی تھی۔۔ اس نے باہر گاؤں والوں کو جانے کیا کیا قصے سنائے کہ اس کے بعد بڑے بڑے بھلے مانس اپنی اپنی پیاس بجھانے میرے پاس آنے لگے۔ کوئی رات کے پہلے پہر دروازہ بجاتا اور کوئی رات کے پچھلے پہر۔۔ کسی کو دن کے وقت طلب تنگ کرتی اور کوئی کڑکتی دوپہر کو ہی کھڑکی پیٹنے سے باز نہ آتا۔۔ میں نے بھی سوچا جب یہی میرے مقدر میں لکھا ہے تو چوں چراں کیسی؟ اگر میں اتنی ہی بھاگوان ہوتی، میرے کرم اگر اتنے ہی اچھے ہوتے تو بڑھئی

ہی اس بیماری سے نہ مرتا۔ مجھے اس سے کیا غرض کہ سینکڑوں اس بیماری سے چلتے بنے تھے۔ مجھے تو صرف اس سے غرض تھی کہ میرا بڑھئی چلا گیا تھا اور جیسے وہ میری دنیا بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔۔۔'' بادشاہ کے منہ کا ذائقہ قدرے کڑوا ہوا۔ وہ بھی کس بیسوا کا قصہ سننے کو بیٹھ گیا ہے۔ کیا اسے اپنے اس وقت کا اس سے بہتر مصرف نظر نہیں آیا؟ لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ قصہ اپنے اختتام کو پہنچا ہی چاہتا ہے، باقی بھی سن لے، بہتری کی کوئی صورت شاید اسے سجھائی دے جائے۔ بادشاہ عورت سے بات کی تو صاف محسوس ہو رہا تھا اب وہ اکتا گیا ہے۔

''اب آگے بھی چلو نا۔۔''

''بادشاہ سلامت۔۔ بھگوان آپ کو آپ کی بادشاہت کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ سو میں اسی طرح اپنا دوزخ بھرنے کا بندوبست کرنے لگا۔ میں کوئی نئی یا انوکھی بات تو نہیں کر رہی تھی عورت بیچاری اپنا پیٹ بھرنے کے لیے صدیوں سے یہی کچھ کرتی آ رہی ہے۔ اس کے مقدر میں اور کچھ لکھا ہو یا نہیں یہ ضرور لکھا ہے۔۔۔

ایک رات ایک نوجوان میرے پاس آیا، وہ صرف رات بسر کرنا چاہتا تھا کہ اس گاؤں میں اسے اور کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ جانے کس نے اسے میرے ٹھکانے کا بتا دیا یا شاید وہ خود ہی چلا آیا تھا۔ کھانا اس نے بے دلی سے کھایا کہ وہ تھکا ہوا بہت تھا۔ پڑتے ہی سو گیا لیکن میرے بھاگ کہ میں اس کی جوانی اور خوبصورتی پر مرمٹی۔ اس دھندے میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد مجھے پسند ناپسند ستانے لگی تھی۔ وہ سونے کے لیے جتنا مچلتا، میں اسے اتنا ہی جگائے رکھنے کی کوشش کرتی۔ وہ بھڑ کنے سے جتنا انکاری ہوتا میں میں اتنا ہی اس پر تیل ڈالنے کی کوشش کرتی۔ وہ جتنا مجھ سے دور بھاگتا میں اتنا ہی اس میں ڈوبنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی۔ اسی دھینگا مشتی میں صبح طلوع ہوگئی۔ اس نے جانے کے لیے پر تولے لیکن میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ یوں اور اتنی جلدی رخصت ہو جائے۔ میں نے اسے روک لیا۔ دو چار باتیں ہی کر جائے، جانے پھر اس طرف کبھی آئے گا یا نہیں۔۔ چائے کا ڈونگا اس کے سامنے رکھتے ہوئے میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''کہاں کے رہنے والے ہو'' اب جو اس نے گاؤں کا نام بتایا تو میرے کان کھڑے ہوئے۔ بلکہ میرا سارا جسم جیسے کان بن گیا۔

''کس کے بیٹے ہو؟ میں آج بھی سوچتی ہوں کاش میں نے اس سے نہ پوچھا ہوتا یا اس نے اپنے باپ کا نام نہ بتایا ہوتا۔۔ لیکن وہ بتا رہا تھا کہ اس کا باپ تو۔۔۔ تو۔۔ مشہور سوداگر تھا۔۔۔ مجھے لگا۔۔ اس نے نام نہیں بتایا گرم پگھلتا ہوا سیسہ میرے کانوں میں انڈیل دیا ہے۔۔ سارا کوٹھا ہی گھوم رہا ہے، اس کی چھت گر گئی ہے اور میں چھت کے بوجھ تلے دبی ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں۔ میں اپنے آپ کو بچانے کی کوشش بھی کر رہی ہوں اور میرا جی یہ بھی چاہتا ہے کہ میں اسی چھت کے نیچے دبی دبی مر جاؤں۔۔ مجھے معلوم نہیں وہ کب رخصت ہوا، کیسے رخصت ہوا مجھے تو اتنا یاد ہے کہ میں نے مرجانے کی چاہت میں دریا کا رخ کر لیا تھا لیکن جانے کیا ہوا کہ دریا کنارے جا کر میری ہمت جواب دے گئی۔ میں گھر سے نکلی تھی تو جیسے سارے راستے پر انگارے بچھ گئے تھے لیکن کتنا عجیب احساس تھا کہ انگاروں پر چلنے کے باوجود میرے پاؤں ہی نہیں سارا جسم جل رہا تھا۔ دریا کنارے میری ہمت یوں جواب دے گئی کہ دریا میں بھی انگارے ہی انگارے تیرتے دکھائی دیے تو میں نے سوچا دریا میں کود کر کیا کروں گی، انگاروں پر ہی جلنا ہے تو یہ تو میں کنارے پر بھی کر سکتی ہوں۔

میں لوٹ آئی لیکن انگاروں کی تپش نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ لیٹتی تو محسوس ہوتا انگاروں پر لوٹ رہی ہوں، اول تو بھوک لگتی ہی نہیں تھی لیکن اگر کبھی کسی کے اصرار کرنے پر لقمہ اٹھا لیتی تو لگتا ہاتھ میں انگارے اٹھا رہی ہوں۔۔ یہاں تک کہ جہاں تک نظر کام کرتی، انگارے ہی انگارے دکھائی دیتے۔ ایک دن۔۔۔۔''

بادشاہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا، تھوڑا سا جھکا اور بڑے دکھی لہجے میں بولا۔

''تمہارے ساتھ تو بڑا ظلم ہوا۔۔ لیکن لہجہ یہ چغلی بھی تو کھا رہا تھا کہ وہ صرف دکھاوے کو ہمدردی جتا رہا ہے۔۔ بولا ''پھر''۔۔

''پھر۔۔۔ایک دن اس تپش سے میں اتنا تنگ ہوئی کہ بڑے پروہت کے پاس چلی گئی جو پڑوس کے گاؤں میں رہتا تھا۔ اس نے میری ساری رام کہانی بڑی توجہ اور بڑے اطمینان سے سنی۔آخر کو کہنے لگا۔۔''

''کنیا۔تمہارے پاپ کا اور کیا اپائے ہوسکتا ہے۔میری مانو تو ایک ہی راستہ ہے۔گنگا کنارے لکڑیاں ڈھیر کرو پھر ان پر تیل کا کنستر خالی کر کے ڈھیر کو دیا سلائی دکھادو۔۔جب آگ زور شور سے جلنے نہیں بھڑ کنے لگے تو تم خود اس میں کود جاؤ۔۔ہوسکتا ہے یوں تمہارا پاپ دھل جائے، میں نے اس کی بات سنی اور چپ چاپ اپنے گاؤں لوٹ آئی۔''

بادشاہ نے قدرے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا شکر ہے اس نے ایسا نہیں کیا ورنہ ایک خوبصورت چہرہ دنیا سے اٹھ جاتا۔۔سوچ کے علاوہ بادشاہ کی دلچسپی دیدنی تھی کہ کہانی انجام کو تو پہنچ ہی رہی تھی لیکن یہ منزل بھی کوئی کم چونکا دینے والی نہ تھی۔

''گاؤں آکر میں نے قریب کے جنگل میں برگد کا ایک جٹاؤں والا درخت چنا۔اردگرد سے لکڑیاں چن چن کر اس کے نیچے ڈھیر کرنے لگی۔جب اندازے کے مطابق بڑا سا ڈھیر بن گیا جو میرے اس ناپاک جسم کے ساتھ ساتھ میرے پاپوں کو بھی بھسم کر ڈالے تو میں نے ڈھیر میں اضافہ کرنا بند کر دیا۔تیل کا پیپا وہاں پہنچا دیا اور اگلی صبح پو پھٹنے سے پہلے پہلے نہا دھو کر گنگا کنارے پہنچ گئی۔ظاہر ہے کیسے چاہتی کہ کوئی دوسرا مجھے جلتا دیکھ کر میری مدد کو پہنچ سکتا اور مجھے بچالیتا۔۔پیپے کا سارا تیل میں نے لکڑیوں پر چھڑک دیا اور جب تیل ٹپک کر زمین سیراب کرنے لگا تو میں نے ڈھیر کا آگ لگا دی۔بھگوان سے پرارتھنا کرنے کے بعد سوچا، آگ میں کیسے کودوں کہ نکل نہ سکوں؟ ابھی سوچ ہی رہی تھی اور چھلانگ لگانے ہی والی تھی۔کہ وہ کہتے ہیں نا کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہے، صورتحال ہی بدل گئی۔۔''

بادشاہ نے پھر پہلو بدلا، گردن کھجلائی۔اس کا خیال تھا وہ جل مری ہوگی اور یہ اس کی بدروح ہی ہوگی۔۔بددلی سے اس نے عورت کی طرف دیکھا اور بولا۔

''تمہارا قصہ کچھ لمبا نہیں ہوگیا؟'' عورت نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں، بات واقعی لمبی ہے لیکن۔۔۔میں چھلانگ لگانے ہی والی تھی کہ دریا میں سیلاب آگیا اور لکڑیاں تیل وغیرہ ہی نہیں میں بھی پانی کے ریلے میں ڈوب ڈوب کر ابھرنے لگی۔۔اس ڈوبنے ابھرنے کے کھیل میں جانے کتنا فاصلہ طے ہوگیا کہ آنکھ کھلی تو میں ایک بار پھر ایک اجنبی کے جھونپڑے میں اس کی کٹیا پر پڑی سانسیں لے رہی تھی۔۔پیٹ میں پانی تو اس نے نکال دیا تھا لیکن تیز بخار ساری کسر نکالنے کو تیار تھا۔جانے کہاں سے لایا ہوا سفوف اس کے پاس رکھا ہوا تھا۔جو اس نے مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر دودھ سے بھرے پیالے میں گھولا اور مجھے پلا دیا۔سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے میرا بخار اتر چکا تھا۔اگلے روز میں اٹھ کر چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو دیکھا کہ مجھے ایک گوالے نے باڑھ میں سے بچایا ہے۔اردگرد اسی کے تین چار چھپر تھے۔ایک میں وہ خود رہتا تھا اور باقی میں اس کی گائیں بندھتی تھی۔۔۔۔میں اب اسی گوالے کی بیوی ہوں۔ایک بیوی پہلے سے موجود ہے لیکن وہ مجھے علیحدہ کرنے کو تیار نہیں۔کہتا ہے بھگوان کی دی ہوئی چیز بھی بھلا کوئی چھوڑتا ہے۔۔۔میں اسی کی گائیوں کا دودھ لے کر شہر جا رہی تھی کہ۔۔۔تمہارے گھوڑے نے بدک کر سارا دودھ گرا دیا بلکہ میرا مٹکا بھی پھوٹ گیا۔۔۔''

بادشاہ نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے، گھوڑے کی لگامیں کھولیں، گردن پر تھپکیاں دیں اور قدرے اکتاہٹ سے بولا۔

''بھلے مانس! کہانی تو تمہاری خوب ہے لیکن میں نے تم سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ دودھ کے مٹکے پھوٹنے اور دودھ بہہ جانے پر دوسری دو عورتیں تو رو پڑی تھیں، لیکن تم کھلکھلا کر ہنس دی تھیں، کہ تم نے کہانی سنا ڈالی۔'' عورت نے غور سے بادشاہ کی طرف دیکھا، جیسے یقین کر لینا چاہتی ہو کہ واقعی بادشاہ سے ہی مخاطب ہے، تھوڑا سا آگے بڑھی اور بادشاہ کی مونچھوں پر نظریں گاڑھ کر بولی۔۔۔

''بادشاہ سلامت۔۔ان عورتوں کا تو پہلی بار نقصان ہوا ہے، اسی لیے رو پڑی ہیں لیکن تم ہی بتاؤ، میں کس کس کو روؤں۔۔ کیا میں سوداگر نے مجھے حاصل کرنے کے لیے جو قتل و غارت گری کی، اسے یا سوداگر سے جدائی کو روؤں یا پرانے بادشاہ نے جن

بے گناہوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا یا مجھے اغوا کر کے جو اپنے حرم میں ڈال دیا، اس کا ماتم کروں یا سوداگر کو جو سانپ نے ڈس لیا اور وہ ملنے کے باوجود ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا تو اسے چیتوں یا اس بڑھئی کی موت کو روؤں جس نے مجھے دریا کی بے رحم لہروں سے بچایا اپنے اس پاپ پر ماتم کروں جو اپنے بیٹے کے ساتھ شب بسری کی وجہ سے مجھ سے سرزد ہوا یا سیلاب پر آنسو بہاؤں جس نے میرے پاپ کو دھونے کے سارے سامان کو بہا دیا پھر۔۔اس مٹکے کو ٹوٹ جانے اور دودھ کے بہہ جانے کا ماتم کروں۔۔بادشاہ سلامت تم ہی بتاؤ میں کس کس کو روؤں۔۔۔میں بہت آنسو بہا چکی، میں بڑا ماتم کر چکی، میں۔۔میں بہت رو چکی۔۔۔اب اور انہیں رویا جاتا۔۔اس لیے میں دودھ کے زمین میں جذب ہونے پر ہنس پڑی تھی۔۔۔''

○○○

تین مرتبہ ایسا ہو چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ دستک دینے والا کون ہے۔ میری بیوی
قصور میرا تھا یا نہیں مگر وہ یہی سمجھتی تھی کہ میں قصوروار ہوں۔

پہلی مرتبہ..... ہاں پہلی مرتبہ..... مگر یہ تو کئی روز پہلے کی بات ہے۔ وہ مجھے گلی میں ایک تھڑے پر بیٹھا نظر آیا تھا۔ شاید پاگل تھا..... لیکن میں نے اس کے بارے میں زیادہ سوچا نہیں تھا..... مرے گزرنے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر چلنے لگا۔ بالکل میرے پیچھے پیچھے۔ مکان کے دروازے تک۔

''کیا ہے؟'' میں رک گیا۔ وہ خاموش رہا۔ میں اندر آگیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس کے فوراً بعد میں نے دستک سنی..... یہ پہلی دستک تھی۔ میں نے بیوی کو آواز دی۔

''کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔ جواب دینے کے بجائے میں نے کھڑکی کھولی۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔

''مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''تو پھر؟'' مجھے بُرا لگا وہ اسی وقت۔

''میں زخم زخم ہوں۔'' وہ اس لہجے میں بولا۔

''کیا کہہ رہا ہے یہ؟'' بیوی پوچھ رہی تھی۔ پھر وہ خود ہی بولی۔ ''شہر میں جاؤ نا..... ڈسپنسری میں.....''

''سارا شہر نمک کا ہے'' اسکے لہجے میں ذرا بھی تبدیلی نہیں تھی۔

''سارا شہر نمک کا ہے!'' بیوی نے دہرا دیا۔ ''تمہارے پلے کچھ پڑا؟..... مجھے پاگل لگتا ہے یہ۔''

''ہاں شاید'' رک کر میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا چاہیئے تمہیں؟''

''حرارت..... مجھے حرارت چاہیئے'' اس کے لفظ یہی تھے..... ہاں یہی تھے۔

''حرارت چاہیئے؟'' عجیب سا لگا مجھے۔

''جی ہاں''۔ وہ مصر تھا۔

''تو میں کیا کروں۔'' میں چڑ گیا تھا..... ''دھوپ میں بیٹھو جا کر۔''

''کوئی گرم کپڑا''..... وہ رک گیا۔

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے کہا..... ''مگر اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا۔ کل آنا'' میں نے لمحہ بھر دیکھ لیا تھا کہ وہ سچا ہے۔ اس نے صرف ایک قمیض پہن رکھی تھی۔ میلی..... پھٹی ہوئی..... آستینوں تک لیر لیر۔ کلائیوں کی نیلی رگیں پھول رہی تھیں اور جلد کا رنگ پتہ نہیں کیا تھا..... میں نے کھٹ سے کھڑکی بند کر دی۔ واقعی سردی بہت تھی۔ کھڑے کھڑے میرے گھٹنے تک سُن ہو گئے تھے۔

بحال ہونے کے بعد میں نے بیوی سے کہا ''واقعی بہت سردی ہے۔ کوئی کپڑا وپڑا تلاش کر دینا۔''

اس نے جیسے میری بات سُنی ہی نہیں۔ اٹھ کر باہر نکل گئی۔

میں نے سوچا یہ کام میں خود ہی کیوں نہ کر لوں۔ میں نے تلاش شروع کر دی۔ مگر عجیب الجھن تھی۔ ہر کوٹ کے ساتھ کوئی نہ کوئی یاد وابستہ تھی۔ ٹائی کی شکل میں..... اور ٹائیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ عیسیٰ کی صلیب کا نشان..... ہو سکتا ہے قبل از مسیح بھی ان کا رواج ہو..... مگر میری مشکل یہ تھی کہ ہر ٹائی میرے کسی نہ کسی دوست..... بے حد عزیز دوست کی طرف سے گفٹ تھی اور کسی نہ کسی کوٹ سے میچ تھی۔ لہٰذا کوئی بھی کوٹ نہ ملا۔

اصل میں کوئی پھٹا پرانا کوٹ تھا ہی نہیں۔
بس یہی میرا قصور تھا۔
بیوی کہتی تھی کہ اگر اس شخص سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو وہ اس طرح بار بار دستک دے کر تنگ نہ کرتا۔ مگر یہ کوئی دلیل تھی بھلا؟ ہم دن میں کتنے وعدے کرتے ہیں، توڑتے ہیں، ہر لمحے کے ساتھ ہماری حیثیت بدل جاتی ہے۔ ابھی باس تھے ابھی ماتحت ہو گئے۔ کبھی شوہر، کبھی باپ۔ ہر لمحے بات تو بدلنا ہی پڑتی ہے۔ ایتھکس اور میز تو یہی ہیں۔
مگر وہ مجھے قصوروار ٹھہراتی تھی۔ بیویاں عموماً جھگڑالو ہوتی ہیں۔
''تم جھگڑالو ہو،'' میں نے چلا کر کہا۔ شادی کے بعد تم پر روپ اور مجھ پر قرض چڑھا ہے اور تم ہو کہ.....''
اب کے چوتھی دستک تھی.....! بیوی گھٹ کر رہ گئی۔
''کون ہے؟'' جانتے ہوئے بھی پوچھنا ضروری تھا۔
''میں ہوں'' آواز وہی تھی۔
''کہہ دیا نا پھر کسی وقت آنا..... ''میں نے پیچھا چھڑانا چاہا۔
''مجھے اندر آنے دیجئے..... باہر بہت ٹھنڈ ہے۔''
''اندر آنے دوں!..... میں نے کھڑکی کھول کر کہا'' کمال ہے..... جان نہ پہچان اندر آنے دو۔
کون جانتا ہے تجھے اس محلے میں۔''
''آپ جانتے ہیں مجھے'' وہ بولا۔
''میں؟'' مجھے حیرت ہوئی..... ''میں تو نہیں جانتا..... تم ہو کون؟''
''آدمی'' وہ بہت آہستہ بولا تھا۔
''آدمیوں والے کام بھی تو کرو..... ''میرا سارا غصہ کھڑکی بند کرنے میں نکل گیا.....
''احمق۔'' بیوی بڑبڑائی۔
''کم بخت'' میں نے دانت پیسے۔
مگر اس نے پھر دستک دے دی۔
''کیا ہے؟'' میں جھلا گیا تھا..... وہ کچھ نہ بولا..... صرف تکنے لگا۔ میری طرف..... گم صُم..... میں نے ماچس باہر پھینک دی۔ ''اٹھاؤ'' میں نے کہا۔ تنکے دنکے جمع کر کے آگ جلا لو۔''
''تنکے؟'' وہ اس ایک لفظ پر رک گیا تھا..... وہ کھڑا رہا..... میں نے بھی کھڑکی بند نہیں کی۔ وہ بالکل پاگل لگ رہا تھا۔
''جاؤ نا اب..... مجھے سونے دو۔ دیکھو سنو..... ''میں نے کھڑی انگلی سے اسے دھمکایا۔ ''اب اگر دستک دی نا..... سمجھے؟ تو نمٹ لوں گا تم سے اچھی طرح۔
وہ گیا تو نہیں مگر اس نے رُخ پھیر لیا۔ بڑا ہی ڈھیٹ تھا۔ سکون غارت کر دیا تھا اس نے.....
''ہرایرے غیر کو منہ لگاتے ہو..... ''بیوی غرائی..... بخدا وہ غرائی تھی... ''میں ہوتی تو..... ''تم ہوتیں تو کیا کر لیتیں۔''
مجھے غصہ آ گیا تھا..... ''میں جانتا ہوں تمہیں..... کسی مسئلے پر SHARE کرنے کے بجائے تم سارا ملبہ مجھ پر لا دیتی ہو۔''
''کس نے کہا تھا گدھوں والی حرکتیں کرو؟'' وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔
دیکھو، حد سے نہ بڑھو..... حد میں رہو..... ''میں چلایا..... ''چلو نکلو یہاں سے۔
''ہاں ں ں'' اس نے لمبی ''ہاں'' میں سب کچھ کہہ دیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں حد کے سرے پر آ گیا ہوں۔
''چائے پیو گے؟'' لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے میری کمزوری مجھے یاد دلا دی۔
''لے آؤ۔'' میں نے لاپرواہی سے کہا۔

وہ چائے لینے کے بہانے چلے گئی.....اپنی انا بچالے گئی مگر چائے نہ لائی حتیٰ کہ میرے ہاتھ سردی سے سن ہو گئے۔.....انگلیاں برف تھیں۔جھکتی نہ تھیں۔میں نے جلدی سے ہیٹر آن کر دیا۔چند لمحوں میں ہاتھ پاؤں،انگلیاں،گھٹنے،ٹخنے، پگھل سے گئے۔مجھے گرمی لگنے لگی۔

اب کیا کیا جائے۔

میں نے روشندان کھولنے کی کوشش کی ہیٹر گیس کا تھا اور روشندان کھول دینا ہی مناسب تھا۔بلکہ ضروری تھا..... مگر وہ کھل نہیں رہا تھا بڑی کوشش کے بعد بھی وہ نہ کھلا۔شاید برسوں بند رہنے کی وجہ سے اس میں زنگ لگ گیا تھا۔میرا خیال تھا کہ وہ ذرا زوردار ٹھوکروں سے کھل جائے گا۔مگر مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔اترتی نیند کا نشہ سرور بن کر خون میں پھیل رہا تھا اور اس وقت ہر قسم کی ٹھوکر لگانے کی سکت کو چاٹ رہا تھا۔

''نہ سہی'' میں نے سوچا میں ''ہیٹر بند کر دیتا ہوں''

میں نے ہیٹر بند کر دیا۔ٹمپریچر نارمل ہونے لگا۔مگر کچی گیس سے کمرہ بھر گیا تھا۔یقیناً ہیٹر میں کچھ خرابی تھی۔دم گھٹ رہا تھا۔

میں نے دروازہ کھول دیا..... مگر گیس کے ساتھ حرارت بھی نکل گئی..... کمرہ پھر ٹھنڈا ہو گیا۔پھر بھی میں نے سونے کی کوشش کی اور سو گیا۔گہری نیند۔

پھر ایک زوردار دستک نے مجھے جگا دیا۔

سورج کی کرن بند روشندان سے اندر آ رہی تھی۔

دستک دوبارہ ہوئی۔مگر یہ اس طرح کی دستک نہ تھی دبی دبی سی۔کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔مجھے الجھن ہونے لگی۔

''کون ہے'' میں نے کھڑکی کھول کر پوچھا۔

''ہم ہیں جی'' آواز آئی..... میں نے باہر جھانکا۔کچھ لوگ دروازے پر جمع تھے۔وہ پہچانے نہیں جا رہے تھے۔وہ کون تھے !پتہ نہیں کون تھے! پتہ نہیں کون تھے۔صبح ہی صبح کسی کے دروازے کو یوں پیٹتے ہیں بھلا، مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔

''حاجی افضل معلوم ہوتا ہے۔'' بیوی نے چائے بناتے ہوئے دور سے بتایا۔

''کون ہے وہ؟'' میں واقعی نہیں جانتا تھا۔

''محلے دار ہیں'' ''وہ بولی'' دس بارہ سال سے پڑوسی ہیں اپنے۔''

میں نے باہر کا دروازہ کھول دیا۔

''زحمت کے لیے معافی چاہتے ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا'' دراصل مسئلہ ہی کچھ ایسا تھا۔''

''اندر تشریف لے آیئے..... '' مجھے اپنی کیلیس بہت عزیز ہیں۔

''جی نہیں۔بس کھڑے کھڑے..... ''رک کر اس نے بات بڑھائی۔'' وہ درویش تھا نا اپنا۔

''کون درویش؟''

''وہ جی،وہ پروفیسر تھا پہلے۔''

دوسرے نے ٹکڑا لگایا

''وہ پاگل؟ وہ پروفیسر تھا؟'' میں نے ہکلا کر پوچھا۔

''اوہ جی اب تو بس ایسے ہی تھا'' تیسرا بھی بول پڑا۔

''قصہ کیا ہے؟'' میں بے صبر ہو رہا تھا۔

وہ رات مر گیا جی..... سردی سے..... اس آدمی نے نجات بھرا سانس بھر کر کہا'' کفن دفن کے لیے۔''

''جی ہاں..... تجہیز و تکفین..... '' دوسرا اتنا ہی کہہ پایا۔

''میں سمجھ گیا۔''میں نے کہا۔ میں واقعی سمجھ گیا۔۔۔''آپ کو پیسے چاہیئے نا؟ کتنے؟

''جو توفیق ہو دے دیجئے۔''

''آپ کی ضرورت کیا ہے؟''

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر لیڈر نما آدمی بولا'' کچھ رقم جمع ہو چکی ہے۔''

''کم کتنے ہیں؟''میں نے بات ختم کر دی ابھی اور سونا چاہتا تھا..... ہاں کچھ اور.....

''کم؟''وہ سوچنے لگا۔''کم..... لگ بھگ ڈیڑھ سو۔''

میں اندر لپکا.....

بیوی دروازے کے پیچھے سے سب کچھ سن رہی تھی..... بولی..... کچھ زیادہ ہی دے دیجئے۔ حیثیت کو ٹھیس نہیں لگنی چاہیئے۔

میں نے اپنی جیب سے روپے نکالے..... تو اس نے اپنا پرس بھی کھول دیا۔''سو کا ایک نوٹ ہے میری طرف سے۔''

میں نے دیکھا وہ بے حد سنجیدہ تھی اور دکھی بھی۔

''کوشش کیجئے..... وہ بولی..... ''کہ لاش زیادہ دیر نہ سڑتی رہے.... ''اور رک کر اس نے کہا..... ''یہ کمبل بھی..... سنا ہے میت کو بھی سردی لگتی ہے.....''

''ہاں..... ''میں نے تائید کی۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔''

محلے داروں سے ..... میں نے کہا..... ''کوشش کیجئے..... لاش زیادہ دیر تک نہ سڑتی رہے..... ثواب کا کام ہے۔''میں نے روپے ان کی جھولی میں ڈال دیے۔

واپس آکر میں نے سونے کی کوشش کی مگر نیند اڑ چکی تھی۔ وہ آدمی ذہن سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔

''اچھا ہوا..... مر گیا..... بے چارہ..... بیوی بولی..... روز سردی میں ٹھٹھرتا تھا۔''

''ہاں''میں نے اطمینان کا سانس لے کر جواب دیا..... ''کم از کم دستک تو نہ دے گا نا.....''

''اور کیا..... روز دروازہ پیٹتا تھا..... ''یہ بڑبڑاہٹ میری بیوی کی تھی۔

OOO

مقصود الہی شیخ

اضافی بوجھ

گھر پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی،

شام اداس نہ تھی پر اسے محسوس ہوا وہ کچھ کچھ اداس ہے!

''کہاں تھے آپ؟ کسی دوسرے شہر چلے گئے تھے؟'' سوال پوچھنے والے نے جواب سنے بغیر کہا'' ینگ مین! آپ کے ساتھ والے فلیٹ میں موت ہوگئی ہے۔''

ایشان اپنی چھوٹی بہن اشنا سے مل کر واپس آیا تو لفٹ میں داخل ہوتے ہی، پہلے سے وہاں موجود، جگت انکل پال (پال ووڈ ہیڈ) نے بری خبر سنائی۔ خبر اتنی اچانک، اتنی شدید تھی کہ وہ دہل گیا پھر سہم کر سمٹا اور سمٹ کر کچھ جاننے کے لیے انکل پال کے قریب گیا۔ اسی لمحہ لفٹ ایک جھٹکے کے ساتھ رکی اور پال نکل گیا۔ لفٹ ہر فلور پر جھٹکے کے ساتھ رکتی رہی اور بے سدھ ایشان آخری منزل پر پہنچ گیا جہاں دو چار ریل کے اکیلے پن نے چٹکی لے کر اسے جگا دیا۔ اس نے بٹن دبایا اُوپر ایک ایک کر کے دو پرے نیچے اپنے چوتھے مالے تک آیا۔

ایشان کے فلیٹ سے جڑے فلیٹ میں چاند اور سورج کی جوڑی رہتی تھی۔ ایک سندری کم سن لڑکی، ایک جوان سمارٹ لڑکا۔ کیا ان میں سے کوئی گزر گیا ہے؟ وہ بے یقینی کا شکار ہو رہا تھا۔ یہ عمر کسی لڑکے یا لڑکی کے مرنے کی نہیں ہوتی۔ دونوں میں سے کون چل بسا؟'' بغل کے پڑوسیوں سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی اسے صدمہ پہنچا تھا۔

بے رحم موت نے نرم دل ایشان کو رنجیدہ کر دیا۔

اس کا دل غم سے بھر گیا

اس نے پہلے کبھی اتنے قریب سے موت کی تپش کب دیکھی تھی؟

اس کی آنکھوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ الجھن تھی۔ رونا آ رہا تھا۔ اپنوں کی مرگ پر آنسو بہانے کا رواج تو ہے، غیروں کے مرنے پر کون روتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ رسمی افسوس تعزیت پرسا۔۔۔ بس!

دکھن بڑھ گئی!

وہ لیڈز کے ٹاور پارک کے موڈرن فلیٹ میں پانچ سال سے رہ رہا تھا۔ در سے در ملا تھا۔ نئے لوگوں کو آئے چند ہی مہینے ہوئے ہوں گے۔ دو ایک بار آمنا سامنا ہوا۔ وہ بھی ہندوستانی تھے مگر آپس میں کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

اس نے فلیٹ کھول کر سامان دروازے کے پاس پٹکا، سوچا ہمسائیگی کا ایک رشتہ ہوتا ہے۔ پرسا تو دینا ہوگا ویسے اسے ماتم پرسی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ شاید وہ ہمسائے کی بیل پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔ بدحواسی میں اندازہ نہیں ہو رہا تھا گھنٹی بجی بھی تھی؟ دوبارہ گھنٹی بجانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل تھی وہ اپنے فلیٹ میں جا سکتا تھا مگر بیل کر کے بنا بتائے چلا جاتا تو خود اسے اچھا نہیں لگے گا۔ یہ بھی تھا دروازے پر کھڑے رہنا دشوار ہو رہا تھا۔ مگر معقول حد تک انتظار کیے بنا وہاں سے ہٹنا بھی نامناسب ہوگا اس نے ارادہ کیا دو چار منٹ انتظار کرے گا۔ پھر اپنے گھر میں چلا جائے گا اور بھول جائے گا اس نے بیل کی تھی۔۔۔ مگر نہیں، ابھی اس وقت پرسہ دینا ضروری ہے۔ ورنہ بات ٹل جائے گی۔

ایک کش مکش تھی اور بے چارا ایشان تھا!

بند دروازے پر،

بوجھل قدموں پر

ایشان،

احساس ہوا۔ (بیوہ کے ساتھ قدرتاً زیادہ ہم دردی ہوتی ہے!)
نوجوان ناتجربہ کار ایشان کو مناسب لفظ نہیں سوجھ رہے تھے۔ مرد، مرد کیسے پرسا دیتا ہے؟ بیوی کے بچھڑ جانے پر شوہر کو کن لفظوں میں دلاسہ دیا جاتا ہے؟ وہ نہیں جانتا تھا ایک ناواقف کو کیوں کر تسلی دے؟ اگر دوسری صورت ہوتی تو شاید اندر آ کر بیٹھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ وہ دروازے پر پرسا دینے کے بعد رخصت ہو جاتا!

پہلے بند دروازے پر، وہ چپ چاپ کھڑا تھا،

اب،

اندر،

سنگت کے باوجود بت بنا بیٹھا تھا۔

یہ تو تھا،

جانے بنا کون چل بسا، اس کا دل بھرا بھرا ہو گیا تھا۔ جانے والے کے لیے غم اور پیچھے رہ جانے والے کے لیے اس کے من میں خبر سنتے ہی، ہم دردی کی کونپل اگ آئی تھی؟ کیا مرد کے لیے دکھ اور عورت کے لیے رنج میں فرق ہوتا ہے؟

کتنی ہی گھڑیاں بیت گئیں۔ وہ دونوں کی شمشان کے سناٹے میں گھرے کمرے میں خاموش، حیران بیٹھے رہے۔ موت کی جنس کے تعین کا سے نہ تھا۔ یاس و حسرت کی صورت بنا مرد، سوگ میں ڈوبے دوسرے مرد کو ٹک ٹک دیکھتا رہا۔

''میرا نام ایشان ہے۔ میں انڈیا میں ساؤتھ سے ہوں اور جب سے آیا ہوں اسی شہر اور اسی فلیٹ میں رہ رہا ہوں۔ آئی ٹی کنسلٹنٹ ہوں، تعارف مکمل کرتے ہوئے مزید بتایا ''میری چھوٹی بہن اشنا میرے ساتھ رہتی تھی پھر اسے گلاسکو یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ پچھلے دنوں اشنا کچھ بیمار ہو گئی تھی۔ میں اسے سنبھالنے گیا تھا۔ یہاں آ کر آپ کی اہم جدائی کی خبر ملی۔ میں سامان پھینک کر فوراً چلا آیا۔ وہ سب کہتے ہوئے جذباتی ہو گیا تھا۔ اس کے آگے بول نہ سکا افسوس ظاہر کرنے کے لیے سوچ میں آ رہے شبد ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہیں کہیں گم ہو جاتے!

سامنے صوفے پر نیم دراز شخص کی سہمی ترسی اور اندر دھنسی ہوئی یاسیت بھری نظریں پرسا دینے والے ہم درد کو مسلسل ٹٹول رہی تھیں کسی کسی وقت، وہ خلا میں گھورنے لگتا!

شاید اسے کٹھن لگ رہا تھا۔ اس نڈھال، ناتواں، غم رسیدہ شخص نے آخر بولنے کی کوشش کی کچھ کہنا چاہا مگر اس کے آنسو ابل پڑے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ تب ایشان نے قریب پڑا ٹشو کا ڈبہ اٹھا کر دیا۔ رونے والے نے ٹشو نکال کر آنسو خشک کیے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا،

''میرا نام راجن ہے۔ ہریانہ سے ہوں لوکل ریڈیو پر ہندی میں پروگرام کرتا ہوں۔ اوپن یونیورسٹی سے اس میڈیا میں ماسٹر کر رہا ہوں۔۔۔ بھاؤنا میری بیوی یونیورسٹی اسٹوڈنٹ، حیدرآباد سے تھی''۔ وہ ایک ہچکیاں لینے کے بعد راجن نے بات سے بات جوڑی، ''ہماری محبت کی شادی تھی۔ پریم بندھن۔ میرے گھر والے مجبور تھے۔ چپ ہو گئے۔ اس کے گھر والے امیر تھے اور شادی کے مخالف! ماتا پتا دونوں پہلی فلائٹ سے آ گئے۔ پہلے آتے اور رجسٹرار کے سامنے اعتراض کرتے تو شاید کامیاب رہتے۔ ہماری شادی تو ہو چکی تھی، بیٹی کو زبردستی لے جانا چاہا، ناکام رہے مگر جاتے جاتے ہماری خوشیاں برباد کر گئے۔

دیر بعد بولنے والا راجن مختصر مختصر پریم کہانی سنانے کے بعد چپ ہو گیا۔
یہ سب ایشان کے اندر کلبلاتے سوالوں کا جواب نہ تھا اس کو اپنے سماج سے جان کاری تھی۔ شادی بیاہ کے موقع پر دنگا فساد تو ان پڑھ برادریوں میں ہوتا ہے۔ روایت اور پریم پرا کا ٹوٹنا تو اب عام بات ہے۔ ہندو مسلم شادیاں ہو رہی ہیں۔ کوئی فساد نہیں ہوتا پھر یہاں کس کا بس چل سکتا ہے۔۔۔

ایشان کو ہمسائے کی پریم کہانی میں زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ وہ سمجھ نہ پایا راجن کا یوں دکھڑا گھولنا کیا ضروری تھا؟ شاید تنہائی اور غم کا مارا جی ہلکا کرنا چاہتا ہوگا۔ جب کہ ایشان جاننا چاہتا تھا ایسا کیا ہوا کہ لڑکی کی موت ہو گئی!! اسے تو اندر سے اندر کرید لگی تھی، ہوا کیا؟ سامنے سائیڈ ٹیبل پر عروسی لباس پہنے خوبصورت بڑی ہی سندر جیتی جاگتی لڑکی کی بے جان تصویر رکھی تھی۔ لڑکی کا نام کیا تھا؟ بھاؤ بتا رہا تھا پھر فوراً سوچنے لگا اسے موت کیا کھا گئی؟ بھید کیا ہے؟
کوئی سوال پوچھتے ہوئے اٹکاؤ ہو رہا تھا۔ ایشان نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

پورا فلیٹ خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر شے پر گرد و غبار پڑا ہوا تھا جیسے مرگھٹ سے خاک اڑ اڑ کر یہیں آ جمی ہو۔ کئی روز سے گھر کی ڈسٹنگ نہیں ہوئی تھی۔ ذرا فاصلے پر کچن میں کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا۔ کھڑکی میں رکھا گملا مرجھائے پھولوں سے اٹا پڑا تھا۔ میلے سلوٹیں پڑے لباس میں راجن اپنے آپ میں دھنس کر گٹھڑی بنا بیٹھا تھا۔ کسی وقت لگتا اسے پھریری سی آتی تھے جس پر وہ قابو پا لیتا ہے۔ پندرہ بیس منٹ اور بیٹھنے کے بعد ایشان نے اجازت مانگی اور واپسی کے لیے اٹھا تو راجن نے اس کا بازو پکڑ لیا اور سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہو گیا پھر لپٹ گیا اور بے تحاشا رونے لگا۔ وہ بھی بے قابو ہو جاتا مگر آنسو پی گیا۔ اپنی ہی جتنی عمر کے اجنبی کو چپ کراتے، الگ کرتے ہوئے۔ سوچا کیا سبھی اپنے من چاہے پارٹنر کی جدائی پر تھڑ ولے ہو جاتے ہیں؟ (راجن کے لیے پہلی بار ہم دردی جاگی) اچانک ایشان کو سخت بھوک لگ رہی ہے۔ اس نے راجن سے پوچھا'' کچھ کھایا پیا؟ پھر نفی میں سر ہلانے والے راجن کو باتھ روم بھیجتے ہوئے کہا'' ذرا تازہ دم (فریش) ہو جاؤ۔ میں کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔''

ایشان اکثر قریب کے پیزا ہٹ سے اپنے کھانے کے لیے پیزا منگواتا تھا۔ فون نمبر یاد تھا۔ ایک بڑا پیزا جو دونوں کے لیے کافی ہوا اور ساتھ میں کول سلا۔ پٹیٹو وج اور نیو پیپسی ٹوئسٹ کا ہوم ڈلیوری کے لیے آرڈر دے کر شاور لیتے راجن کو سنایا'' کھانا زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں پہنچ جائے گا۔''

راجن دو دن سے بھوکا تھا۔ جتنی بھوک تھی نڈھال راجن نے اس کی نسبت سے کم کھایا۔ وہ کم زور ہو رہا تھا۔ اپنے آپ سے بیٹھ نہیں پا رہا تھا۔ ایشان نے راجن کو غنودگی میں جاتے دیکھ کر بستر میں ڈالا اور اپنے فلیٹ میں آ گیا۔ بڑی دیر ہو گئی تھی۔ وہ اشنا کو خیریت سے پہنچنے کی اطلاع نہ کر سکا تھا۔ وہ اپنی کوتاہی پر شرمندہ اور نادم ہو کر رہ گیا۔ وہ اشنا کے پروفیسر کے بلانے پر گلاسگو گیا تھا۔ اشنا کی روم میٹس چھٹیوں میں اپنے اپنے گھروں کو چلی جاتی تھیں مگر سٹڈی کے خیال سے اشنا فلیٹ میں رکی رہی جہاں وہ ہر دم ہر لحظہ اپنی کتابوں میں کھوئی رہی۔ وہ پڑھائی، تنہائی اور بھوک پیاس کے دباؤ میں آ گئی تھی۔ کسی طرح اس کے پروفیسر کو پتا چلا تو اس نے ایشان کو بلا بھیجا، کہیں اشنا امتحان میں کامیاب ہونے سے پہلے محنت کرتے کرتے ''نروس بریک ڈاؤن'' لینے میں کامیاب نہ ہو جائے!

ایشان دوڑا اور دوڑا اسکاٹ لینڈ گیا اور وہاں دس روز تک بہن کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ پھر دو روز تو بہن کو مکمل آرام کرایا پھر ایک معمول بنا کر صبح سیر کے لیے باہر لے جاتا۔ ایک روز کار ہائر کر کے بہن کو'' انورنیس'' جھیل پر لے گیا۔ یہ اتنی سندر اور پیاری جگہ تو نہیں جتنی لوخ (جھیل) لوموںڈ ہے پر پورا منظر آنکھوں طراوت اتار رہا تھا۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ اوپر بادل اور اونچے پہاڑ تھے۔ پہاڑوں سے گرتے جھرنے تھے۔ منظر میں رنگ بھرتے درختوں کی الگ شان تھی۔ پیڑوں کی شاخوں میں بوسے لیتی سورج کی کھتم گھتا کرنیں چور قدموں سے آ کر ان کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ ڈالیاں جھوم رہی تھی۔ ان کو چھوتی ہوا درمیان سے گزرتی تو پتے تالیاں بجانے لگتے۔ فضا میں لفظوں کے بغیر مدھم اور مدھر گیتوں کی راگنی نے سارا سے مٹھی میں'' کیچ'' کر رکھا تھا۔ اس نے بہن کو بتایا'' دیکھو تو یہ جٹا دھاری سادھو سمان پہاڑ آسن لگائے اپنی اور بلاتی دکھائی دیتے ہیں۔ جھرنے لپ جھپ

اوپر سے نیچے چلے آتے ہیں۔ ادھر ادھر قدرتی جھاڑیاں اور میٹھی میٹھی باس بکھراتے پھول جھوم جھوم کر کیا ہمارا سواگت نہیں کر رہے؟'' تب اشنا نے گردن گھما کر ایک ہی نگاہ اور ایک ہی پل میں پورب و پچھم، اتر دکن ماپا تو اس کے تن بدن میں شکستی بھر گئی اس نے دھنک رنگوں کی یہ پھوار پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ ایسے پیارے منظر نہیں دیکھے تھے؟ پہاڑ، پہاڑ تھے، درخت اور پودے جو تھے لیکن اس کی روح میں ایسا سرور سما گیا جس نے ساری تھکن اتار دی۔ نس نس میں نئی امنگ بھر دی اشناہ کو اچانک اپنے بدن پر ماں کی چمیوں کا رنگ بخش سینک محسوس ہونے لگا!

خوش خوش لڑکی جو پیچھے پیچھے آ رہی تھی، اس نے دوڑ کر بھائی کا باز و تھام لیا۔ لگا بھائی میں ممی ڈیڈی کی آتما بھی آ براجی ہے۔۔۔۔ اس نے اپنے پتلے پتلے ہونٹوں کا باریک خوبصورت دائرہ بنا کر ہتھیلی کی اوک سے محبت بھر معصوم بوسہ آکاش کی جانب اچھال دیا۔۔۔۔ ایشان چھوٹی بہن کے امڈتے جذبوں کی علامت ہوائی بوسے سے بڑا متاثر ہوا جیسے بہن کی ہر حرکت، ہر جنبش اس کی سمجھ مین آ رہی ہے وہ جان گیا اب وہ یونیورسٹی میں اپنا نام روشن کرنے کے لیے جی جان سے نئی تازگی و توانائی سے پڑھائی میں جت جائے گی اور اپنا خیال رکھتے ہوئے بیمار بھی نہیں پڑے گی!

ایشان کو نہ جانے کیسے یہ سوچ بھی آ رہی تھی۔ کیا ستم ہے؟ ہر اچھی جگہ کسی نہ کسی رخ سے پسماندہ اور پچھڑی ہوتی ہے پر ہوتی ہے اکاٹ لینڈ ظاہری خوبیوں اور خوبصورتیوں کے باوجود غریبی اور محرومی کے مٹیلے سائے تلے دبا ہے۔ ایک پب میں بیٹھے لوگوں میں ناہمواری دکھائی دے جاتی ہے۔ یا سماج کی کرنی ہے یا قدرت کی سمجھ میں نہ آنے والی سیاست ہے؟ اس کے فکر و احساس میں ایک پھانس سی رڑکنے لگی! دوسرے ہی پل اس نے (مصلحتاً) سماجی اونچ نیچ کی سوچ کو آئندہ پر اٹھا دیا۔

وہ دونوں جھیل پر سارا دن گزار کر اپنے اندر سے باہر اور باہر سے اندر نیا پن اوڑھ کر آئے تو انہیں جینے کی تمنا عطا ہو چکی تھی۔ چھٹی کے باقی رہ گئے دنوں میں ایشان نے چھوٹی بہن کے باہر ٹہلنے کھانے پینے اور آرام کے وقفوں کو ترتیب دے کر وعدہ لیا کہ اشنا ان اوقات کی پابند رہے گی اور وہ بھی جلد جلد فون کرتا رہے گا۔

اتفاقاً پہلے ہی دن فون پر خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دینے میں کوتاہی ہوگئی اس کے پاس غم زدہ پڑوسی کی خبر گیری کا عذر تھا پھر بھی وہ رات بھر نہ سو سکا۔ صبح اشنا کے سیر پر جانے سے قبل شرمندہ ہوتے ہوئے فون نہ کرنے کا سبب بتا کر، بہن کی تشویش دور کر دی۔ اسے اپنی دبلی پتلی کانچ کی سی نازک، بے حد تیکھے نقوش والی خوبصورت گڑیا اور بے حد ذہین بہن سے عشق کی حد تک پیار تھا۔ اشنا نے بھی بھائی کی معذرت خوش دلی سے قبول کر لی۔ تب ایشان کو بڑی تسکین ملی اور وہ مطمئن ہو گیا۔

یہ بڑی عجیب سی حقیقت تھی کہ بغل کے فلیٹ میں مرنے والی جس سندر سی لڑکی کا عکس اس نے شوہر کے ساتھ عروسی لباس میں دیکھا تھا، اس کے لیے بھی ایشان کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا اس نے بہن کو یہ خبر دیتے ہوئے اس کی ہولناک موت کی تفصیل بیان کرنے سے گریز کیا تھا اگر اس سے کوتاہی نہ ہوئی ہوتی تو وہ بہن کو یہ خبر سنانا ہی نہیں چاہتا تھا اتنی دور رہنے والی حساس اور کومل سی چھوٹی بہن کو کسی وقت یہ ضرور بتائے گا کہ ایک فوٹو میں دیکھی اجنبی لڑکی جو ساتھ والے فلیٹ میں رہتی تھی کسی تراشی ہوئی مورتی سے زیادہ حسین تھی، اب نہیں رہی۔ اس لڑکی نے محبت کی شادی کی تھی۔ شادی کو زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے اور۔۔۔ اور جانے والی تصویر اس کی آنکھوں سے زائل نہیں ہو رہی حسن کسی کا ہو کہیں ہو متاثر کرتا ہے۔ وہ مر کر بھی اس کے من میں اتر گئی ہے۔ وہ اس کے پتی کا حال بھی سنائے گا؟ یہ بھی سچ تھا کہ انسانی ہمدردی ہی نہیں مرنے والی کے پتی کی اداسی بھی اس کو بے چین کر رہی ہے۔ اس سے پیوست معروفیت پہنچنے کی اطلاع نہ دینے کا سبب اور کوتاہی کا باعث تھی۔ دنوں کے بعد غیر محسوس ہونے والے انداز میں یہ سب بتا دے گا، اسے یقین تھا اشنا یہ سب سن کر کملا جائے گی۔ وہ بے چین، بے کل ہو جائے گی تب بڑی مشکل ہوگی ایسا کچھ وہ سہار نہیں پائے گا لیکن وہ بہن سے کچھ چھپا بھی نہیں سکتا۔

ایک ایک کر کے کئی دن بیت گئے۔ ابھی اس کے من میں پڑوسی کے تعلق سے بن پوچھے سوالوں کی چبھن مٹ نہ پائی تھی۔ دفتر میں ادھورے کاموں کی تکمیل اور بعض تکنیکی پیچیدگیوں کا حل ڈھونڈتے سارا وقت بیت جاتا۔ وہ تھک کر گھر آتا بستر پر گر پڑتا

اور بے سدھ ہو کر دوسری صبح تک سویا رہتا مگر بہن کو فون کرنا نہ بھولتا۔ اس بیچ میں وہ شاید ایک یا دو مرتبہ راجن کی طرف اس کا حال پوچھنے بھی گیا۔

ایک روز اس کا دھیان دروازے کے پیچھے عجلت میں پھینکے گئے سامان کی طرف گیا۔ تھ تھیلا اور نرالی توجہ کی منتظر تھی اس نے سامان ٹھکانے پر رکھا تو دیکھا لیٹر بکس منہ تک بھرا پڑا ہے۔ اس نے خط نکالے۔ تقریباً ساری جنک میل یعنی کچرا ڈاک ''ڈسٹ بن'' میں ڈالنے لگا تو اسے ایک سادہ بغیر اسٹمپ لفافہ دکھائی دیا ایسے لفافے اکثر ہوتے ہی ہوتے ہیں مگر اس پر انگریزی میں ہاتھ سے لکھا تھا ''پڑوسی کے نام'' ایشان نے بڑی احتیاط سے لفافہ الگ کر لیا۔ وہ ''پڑوسی کے نام'' خط کو کھول کر پڑھنے ہی والا تھا کہ بے تحاشا دروازے کی گھنٹی بجنے لگی۔۔ دروازے پر راجن تھا۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ سخت گھبرایا ہوا اور کپکپا رہا تھا۔ شاید رونا بھی چاہتا تھا مگر رو نہیں پا رہا تھا راجن کے ہاتھ میں بھی ایک لفافہ تھا۔

اپنے ہاتھ کا لفافہ بک شیلف کے پاس رکھی تپائی کی طرف پھینکتے ہوئے ایشان پریشان حال راجن کو اندر لے آیا۔ راجن کے نام خط پڑھ کر ایشان بھی بوکھلا گیا۔ خط کے ذریعے ڈسٹرکٹ کارونر نے بھاؤنا کی موت کے تعلق سے کارروائی بھرنے کے کے لیے راجن کو بلایا تھا تا کہ راجن کی بیوی کی خودکشی کے حالات کی ساعت کے بعد کوئی فیصلہ سنایا جائے۔ قواعد سے ناواقفیت کی بنا پر راجن گھبرا رہا تھا وہ نڈھال ہو کر کئی بار آنسوؤں میں بھیگا۔ ایشان اس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا راجن کی بیوی نے (تصویر میں جو بہت ہی سندر لڑکی تھی) جیون ہتھیا کی تھی (خودکشی کیوں کی تھی؟ یہ پوچھنے کا سے نہیں تھا) پولیس آئی۔ پوسٹ مارٹم ہوا تھا (یہ قتل تو نہیں تھا؟ راجن قاتل نہیں ہو گا ورنہ پولیس پکڑ لے جاتی!) ایشان نے اوندھے سیدھے سوالات سے من موڑ کر اپنے اندر تحمل کا جذبہ بھرتے ہوئے راجن کو تسلی دی ''یار! کیوں پریشان ہوتے ہو۔ میں ساتھ ہوں نا۔ آخر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ کارونر محض موت کا سبب مقرر (Establish) کرتا ہے یا ضرورت پڑنے پر عدالتی ساعت کی سفارش کرتا ہے۔ یہ ایشان کے ذہن میں اخباروں میں پڑھی معلومات کی گونج تھی۔ اس کا مقصد تو راجن کو تسلی دلاسہ دینا تھا۔

اگلے چند دنوں میں اسے راجن کو زیادہ وقت دینا پڑا۔ وہ کچھ اداسیوں میں ڈوبا، عدم تحفظ کا شکار اور سہما سہما تھا۔ منہ سے بولے بغیر ہر وقت ایشان کے ساتھ چپکا رہنے کی کوشش کرتا۔ اکثر ایشان کو فون کر کے وقت بے وقت بلا لیتا۔ کہتا اسے ڈر لگ رہا ہے۔ ایشان دیکھتا وہ کانپ رہا ہوتا۔ چونک چونک کر اطراف میں متجسس نگاہوں سے تکتا۔ بے وجہ ہی اٹھتا بیٹھتا جب ذرا سکون ملتا مرنے والی کی باتیں کرنے لگتا۔ وہ اسے مرنے کے بعد بہت ہی زیادہ چاہنے لگا تھا۔ ایشان جتنی دیر اس کے پاس بیٹھتا راجن اس کا ہاتھ پکڑے رہتا۔ اس کے خیالوں میں پردیس کی پولیس، اس کی تفتیش اور عدالتوں کا خوف چھایا ہوا تھا۔ شاید یہ (دونوں) کو معلوم نہ تھا کہ کارونر کی عدالت محض انکوائری کورٹ ہوتی ہے۔

ایشان کی پہچان میں آنے والی ٹکڑا ٹکڑا کہانی کچھ یوں تھی۔

بھاؤنا کو اپنے تعاقب میں آنے والے ماں باپ سے راجن کی بے رخی برتنا اور پولیس بلا لینا بالکل نہیں بھایا تھا بل کہ اپنا روکھا رویہ اس بات بے بات ''گلٹی'' محسوس کرنے اور ''ہانٹ'' کرنے لگا تھا ایک منظر تھا کہ نظروں سے اوجھل نہ ہوتا تھا۔ اس کی بے بس ماں نہایت خاموشی سے آنسو پونچھتی نکل گئی۔ تبھی ڈیڈی نے سراپ دیا تھا۔ ''جس طرح ہمیں گھر سے نکال رہی ہو ایک دن اس طرح بے عزت ہو کر نکالی جاؤ گی۔'' غصہ تو بھاؤنا کے پتہ کو داماد پر تھا پر کوستے سے ان کا نام تک لینا گوارا نہ کیا خاندانی عزت، روایت اور اقدار کی پامالی پر محبت روپ بدل کر پتھر دل بن جاتی ہے، یہ پہلی مثال نہ تھی۔ جس اولاد پر چھڑکی جاتی ہے۔ اس کے دشمن ہو کر ماں باپ بد دعا کرنے سے باز نہیں رہتے۔ ایسا تو ہوتا ہے ایشان یہ سب سمجھتا تھا۔

یہ سب تو ٹھیک ہے پر اسے اور بہت سی باتیں راجن نے نہیں بتائی ہوں گی۔ شاید وہ غیر متعلق اور غیر ضروری تفصیل بتانا بے مقصد اور فضول سمجھتا ہوں۔ ایشان کو کارونر کی عدالت میں کارروائی کے دوران معلوم ہوا کہ بھاؤنا کی جان خودکشی سمجھوتے یعنی ''مرن بندھن'' کی بنا پر گئی۔ میاں بیوی نے ایک سانجھا خط لکھنے کے بعد خواب آور (نیند لانے والی) گولیاں زیادہ مقدار میں کھائی تھیں۔ جب دروازے پر دودھ کی بوتلیں جمع ہونا شروع ہوئیں تو ملک مین (دودھ والے) نے پولیس کو اپنے شک و شبہے

راجن کی اجازت سے اس کو اور بھاؤنا کے ممی ڈیڈی کو فون پر اطلاع دی تھی۔ کوئی بھی نہ آیا۔ راجن کے گھر والے مجبور تھے، مالی بوجھ اٹھانے سے قاصر تھے تو بھاؤنا کے ''پیرنٹ'' ناراضگی کی وجہ سے نہ آئے! مرحومہ کے بیٹی کے مرنے کی بابت زیادہ کچھ نہ سنا بلکہ کہا تھا ''اس کی مم سے بات کرو۔''

ایشان نے فون پر یہ غم ناک خبر دیتے سے مرنے والی کے ڈیڈی کی آواز صاف اور غصہ اور بے رحمی محسوس کی تھی۔ ممی کی سسکیوں میں جان کنی کی سی کیفیت محسوس کی تھی۔ اسے پل بھر میں یہ شعور مل گیا، صدمے کی ماری عورت کسی امیر گھرانے کی ہو یا غریب کی، وہ بہرصورت شوہر کے نیچے اور اس کی قید ہوتی ہے۔ ماں کے روپ میں بھی وہ صدیوں سے محکوم چلی آرہی ہے۔ سولی پر لنگ لنک کر زندگی گزارتی ہے۔ وہ راجن کے گھر والوں کی مجبور لاتعلقی پر بھی کڑھا تھا۔ ایشان کو بڑی غیر یقینی صورت حال کا سامنا تھا۔ اس نے تو اپنے ماں باپ کا پیار ہی پایا تھا حالاں کہ اس کے ڈیڈی سخت اصول پرست سرکاری افسر مشہور تھے۔ لیکن اولاد کے ساتھ ان کا رویہ بڑا نرم تھا۔ ماں بھی محبت کرتی تھیں۔ انہوں نے کتنے اعتماد سے بیٹے بیٹی کو باہر بھیج دیا تھا۔ ابھی تو سوال نہیں پر وہ یا اشا من مرضی سے شادی کر لیں گے تب بھی ممی یا ڈیڈی میں سے کوئی مزاحمت یا مداخلت نہ کرے گا ایشان کو اپنوں کے لٹھور رہنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اسی کارن وہ راجن کے پیش آمدہ حالات پر رنجیدہ ہو رہا تھا۔

یہ بڑے صبر آزما دن تھے۔ اس آڑے وقت میں ایشان ہم سائیگی کا حق ادا کرتے ہوئے ملول متاسف اور حد درجہ پریشان راجن کے ساتھ رہا۔ اس کا سہارا بنا رہا پھر جیسے ہی سانس لینے کا موقع ملا اسے یاد آیا اس کے پاس گھر میں کہیں ایک خط پڑا ہے جو راجن کی اچانک آمد اور مداخلت کی وجہ سے بند ہی پڑا ہے۔ اسے ڈھونڈنا پڑے گا۔

ایک سوئی پڑی یاد جاگ اٹھی۔ ایشان کو ''پڑوسی کے نام'' خط بھولا نہ تھا۔ خط جو بغیر پڑھے وہ کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ خط جو لکھ کر پوسٹ نہیں کیا گیا تھا، دانستہ اس کے لیٹر بکس میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس بھید بھرے خط کی طرف دھیان جاتے ہی وہ بے کل ہو گیا بلکہ ایشان بری طرح ڈانواں ڈول اور خط پڑھنے کے لیے بے چین و بے قرار ہو گیا۔ اسے شک ہو رہا تھا خط بھاونا نے ہی لکھا ہوگا۔ بعض اوقات نے اس کو یقین دلا دیا، لیٹر بکس میں خط بھاؤنا ہی نے ڈالا تھا۔ واقعی اس سے بڑی خطا ہوئی وہ خط پڑھے گا اور اونگھتے، بلبلاتے سوالوں کے جوابات ڈھونڈے گا!

پھر جب ایشان خط پڑھ چکا تو متضاد و متصادم (الٹ پلٹ) کے خیالات کا شکار ہو گیا۔ مرنے والی معصوم اور راجن گناہ گار دکھائی دینے لگا۔ وہ اپنے نئے متر، بہت جلد گھل مل جانے والے دوست سے ذہناً دور ہو گیا۔ ان کی ملاقات میں وقفہ پڑ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں رہا ایشان (پڑوسی) کے نام خط بھاؤنا نے ہی ڈالا تھا اور وہ یہ بھی جان گیا راجن کو پولیس نے حراست میں کیوں نہیں لیا تھا؟ اس ملک میں خودکشی کے خلاف کوئی قانون نہیں لیکن ایشان کے قبضے میں جو تحریر تھی وہ معاملے کی نوعیت کو بدلنے کے لیے کافی تھی۔ خط میں صاف لکھا تھا۔

''آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں آپ کو نہیں جانتی۔ آپ کا نام تک معلوم نہیں، اتنا جانتی ہوں آپ اکیلے ہیں۔ شاید اسٹوڈنٹ ہیں یا کسی جگہ ملازم ہیں۔ یہ اکثر لکھنے کی ہمت یوں بندھی کہ آپ ہمارے پڑوسی ہیں۔ میرے پیرنٹس راجن سے میری شادی کے مخالف تھے۔ ہمارے بیاہ کے بارے میں جان کر پتا کرتے کرتے انڈیا سے یہاں آئے۔ کوئی سمجھوتہ نہ ہو پایا۔ وہ راجن کے پولیس بلانے پر سخت خفا ہو کر چلے گئے۔ ہم جتنے خوش تھے اتنے ہی ناخوش رہنے لگے۔ مجھے رنج سے بھرے ماں پتا کا خیال آتا ہے، میں ان کے آنے اور نراش ہو کر جانے پر کڑھتی ہوں، تب راجن ان کو برا بھلا کہتے ہیں میں سہارا نہیں پاتی۔ بے کل ہو ہو جاتی ہوں۔ اتنی سپھلتا کے بعد ہم بٹ گئے ہیں۔ میرے پتی کو خیال آتا ہے کہ کہیں میں ان کو چھوڑ کر نہ جاؤں۔ یہ ان سے برداشت نہ ہوگا۔ اس کارن ہم نے ''مرن بندھن'' یعنی Suicide pact کیا۔ جدا نہ ہوں، ساتھ مریں

گے پر جیسے جیسے مقررہ دن قریب آرہا ہے، میرا ارادہ بدلتا جارہا ہے۔ مجھ پر خوف چھا جاتا ہے۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ ماں باپ سے پیار ہے۔ سبھی سے پیار ہے۔ اپنے پتی کے ساتھ زندہ رہ کر پریم بنورنا چاہتی ہوں مگر میرے پتی اپنے ارادے پر جمے ہیں۔ یہاں میں کسی کو نہیں جانتی۔ کیا آپ کسی طرح ہمارے بیچ پڑی دھند ہٹانے میں سہایتا کریں گے، مدد کریں گے۔''

بھاؤنا

جب حادثہ ہوا ایشان گلاسکو میں تھا ورنہ بھاؤنا کو بچانے کی بھرپور کوشش کرتا۔ بھاؤنا کے زندہ رہنے کی خواہش پر سے پردہ کیا اٹھا، راجن سے اس کی دوستی میں کرواہٹ آگئی۔ راجن اس کی نظر سے گر گیا۔ ایشان کا سکون تہس نہس ہو گیا۔ اس مرنے والی کی بھولی صورت اور ہر وقت راجن کا ڈرا، سہا اور خوف ذدہ چہرہ دکھائی دینے لگا۔ راجن کا یکا یک کانپ کانپ کر خلا میں گھورنا نظروں میں گھوم گھوم جانا اور کبھی اس کا یہ کہنا'' بھاؤنا کی یاد آنے پر خود مجرمی کا احساس ہوتا ہے'' ایشان کے کانوں میں گونجتا۔ یوں ہی سوچتے سوچتے اسے لگتا بھاؤنا کی موت بھی ایک طرح کا قتل ہے جسے چھپانے میں اس کا اپنا بھی ہاتھ ہے۔ وہ گھبرا جاتا۔ کیا وہ خط پولیس کو دے دے؟ اس کی خط، خط چھپانے کی نیت نہیں تھی، نادانستہ بھول ہوگئی۔ وہ کون سا عذر ہے جسے پیش کرنے پر عدالت اس کو سچا مان لے گی۔ کیا اس پر ثبوت یعنی'' ایوڈینس'' چھپانے کا اروپ (الزام) لگ سکتا ہے؟ پولیس کے پاس جانے میں تاخیر کا سبب کیا بتائے گا؟ خط کے افشا ہوتے ہی میاں بیوی کے درمیان'' مرن پیکٹ'' کی نوعیت بدل نہیں جائے گی؟ بار بار تفتیش ہوگی۔ وہ اتنے دن آخر چپ کیوں بیٹھا رہا؟ کاش اسے قانون کی سدھ بدھ ہوتی!

وہ کئی روز تک کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔ راجن سے رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ دراصل جان بوجھ کر راجن سے دور ہو گیا تھا وہ کوئی تعلق رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے راجن مکار، جھوٹا اور برا لگنے لگا تھا۔

اس رات بارش ہو رہی تھی۔ ایشان بے وجہ کروٹیں بدل رہا تھا، کھڑکیوں پر پڑتی بوچھاڑ اور شور سے تنگ وہ کوئی دو بجے ٹی وی چھوڑ کر بستر پر گیا ہوگا۔ ساڑھے تین بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ گہری نیند سے ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کو دروازہ کھولنے میں تامل تھا۔ جب وہ بار بار کی کھٹ کھٹ سے زچ ہو کر دروازے پر گیا تو وہاں راجن کھڑا تھا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ وہ اکھڑا اکھڑا تھا وہ سخت بدحواس ہو رہا تھا۔ ایشان تو اس سے منہ موڑ چکا تھا۔ اس کے سوچ ساگر میں رنجش کے ساتھ ساتھ تعصب گھل گیا تھا۔ وہ راجن کو کھڑے کپکپاتے دیکھتا رہا۔ راجن نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بتایا سخت ڈراؤنا سپنا دیکھنے کے بعد اس پر خوف چھا گیا ہے۔ وہ اکیلا نہیں بیٹھ سکتا۔ راجن ملتجی نظروں سے ایشان کو دیکھ رہا تھا۔ ایشان چپ رہا، کچھ بھی نہ بولا۔ پہلے کی طرح مداوا نہ بنا اس کے منہ سے ہم دردی کا کوئی بول نہ نکلا۔ وہ دونوں بھیگی، نم اور سرد رات کی اس تنہائی میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے حریفوں کی طرح زیادہ دیر کھڑے بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ گھر آئے پر خواہ وہ دشمن ہی ہو، ایشان بے رحمی سے دروازہ بند نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چیخ کر راجن کو واپس اپنے فلیٹ میں بھیجنے سے قاصر تھا۔ اتنی رکھائی دکھانا بھی اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ راجن کو جسے چند ہی روز میں دوست سمجھنے لگا تھا، اس کے ساتھ سرد مہری برت رہا تھا حالاں کہ وہ اس کی بدنصیبی میں شریک غم ہو کر ہم دردی میں فریفتہ ہو گیا تھا اور اب اسی راجن کو وہ بری طرح نظر انداز کر رہا تھا۔۔۔ پل پل صدی بن کر گزر رہا تھا۔ پھر کوئی نیکی کی لہر آئی ہوگی کہ وہ راجن کے سامنے سے ہٹ گیا اور اسے بڑی بددلی سے اندر آنے دیا بن بلائے مہمان کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بستر میں گھس کر کچھ دیر جاگنے کے بعد سو گیا۔

راجن وحشت میں مبتلا خوف میں ڈوبا کچھ لمحے بیٹھا کانپتا رہا اور ایشان کے سانس کا زیر و بم سنتا اور سہم کر سکڑ کر ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ کمرے میں خاموشی کا راج تھا! آخر راجن بھی اونگھ گیا پھر ٹنڈ منڈ ہو کر وہیں سو گیا مگر صبح ہوتے ہی خنکی بڑھی تو اس کی آنکھ کھل جائے گی اور وہ بھی ایشان کے بستر میں گھس گیا۔ ایشان چونک اٹھا۔ راجن اپنے ہاتھوں میں منہ چھپائے کہہ رہا تھا۔ وہ اس کا مطلب بھاؤنا سے تھا'' روزانہ سپنے میں آتی ہے۔ آج رات دیکھا میں مار پیٹ کر رہا ہوں۔ اس کے بال نوچ کر دھکا دیا تو وہ دیوار سے جا ٹکرائی۔ سر پھٹ کر خون نکلنے لگا۔ آنکھ کھل گئی۔ میرا وحشت اور دہشت سے برا حال تھا۔ خوف تھا جیسے اس کے مرنے پر میرا ہاتھ ہے۔۔۔ میں خود مجرمی کے احساس میں جھلس رہا ہوں اور وہ مجھے پیاری تھی۔ اس کو کبھی، میں نے خفگی میں بھی نہیں

سے بچایا نہ جاتا تو آج میں بھی شمشان میں ہوتا! یہ تم جانتے ہو۔''
اگر وہ مانتا کہ اس بات میں سچائی ہے تو اس کے دل میں رنج نہ آتا، تعصب جگہ نہ بناتا۔ ایشان کے لیے تو بڑا سچ یہ تھا کہ بھاؤنا مرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے ایک انسان ہونے کے ناطے، اپنے ہمسائے سے مدد مانگی تھی۔ اس کی بدقسمتی تھی کہ ہمسایہ غیر حاضر تھا۔ اخر ایشان کیوں خفا ہے؟ یہ خیال بھی آتا، مرنے والی نے تھانے میں رپورٹ درج کرانے کے لیے نہیں کہا تھا۔۔۔ مگر یہ تو لکھا تھا کہ اسے بچالیا جائے! اوندھے سیدھے وچار ایشان کو کچل رہے تھے!
راجن سردار ٹھنڈے جسم کے ساتھ مختلف جذبوں کی گھٹتی بڑھتی حرارتوں میں تپتے ہوئے ایشان کے ساتھ چپٹا تو اسے راحت محسوس ہوئی ہوگی۔ وہ سوگیا اور ایشان پھٹی آنکھوں سے چھت کو گھورتا ہوا جاگتا رہا۔
جانے کیوں ایشان کی بھی آنکھ لگ گئی۔
رات رینگ رینگ کر صبح میں ڈھلی!
صبح تو ہونی تھی
ایشان آہٹ کیے بنا اٹھ کر کام پر چلا گیا۔ واپس آیا تو راجن بخار میں پھنک رہا تھا۔ دوستی، گلے کا ہار نہیں جی کا جنجال بن رہی تھی۔ ان چاہا یار بن بلایا مہمان بن کر اس کے در پر پڑا تھا۔ راجن کی حالت اچھی نہ تھی۔ بخار بہت تیز تھا۔ مجبوراً اسے ہسپتال لے جانا اور داخل کرانا پڑا۔
اور،
وہ دونوں، ایک بھر معمولات میں کھو گئے جیسے بہت پرانے دوست ہوں۔ بھاؤنا کا خط جہاں تھا وہیں دھرا رہ گیا۔ ایشان کو کئی بار خلش محسوس ہوئی۔ بھاؤنا کا خیال آیا اس کی بھولی سی پیاری صورت نگاہوں میں گھومتی شکایت کرتی۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کرتا۔ راجن سے چھٹکارے کے بہانے تلاشتا مگر مزاج کی نرمی منہ بند اور اسے مسلسل بے دست و پا بنائے رکھی۔ وہ زچ ہوکر، یہ سوچ کر روہانسا ہو ہوجاتا ''وقت بڑا ظالم ناگ ہے، اژدھا ہے، سچ کو نگل جاتا ہے! اصل قاتل تو وقت ہے۔''
یہ بھی ایک ہونی تھی۔ موسم اچانک خراب ہوگیا۔ پورا ملک دھند، کہر اور برف باری کی لپیٹ میں آگیا۔ شدید موسم میں وہ کام پر گئے۔ گئے ورنہ سارا وقت گھر میں آتش دان کے پاس بیٹھے رہتے۔ وہ گھر ایک ہوگئے۔ کبھی اس فلیٹ میں کبھی اس فلیٹ میں دونوں دوست رمی۔ چیس کھیلتے ہوئے۔ اکٹھے پکوان پکاتے۔ قریبی پب میں جاتے۔ دھت ہوکر گھر آتے۔ ٹی وی اور ویڈیو دیکھتے جیسے ازل سے ساتھ ہوں۔ کئی دنوں تک یہی ہوتا رہا۔ وہ ایک دوسرے کا اٹوٹ انگ بن گئے تھے۔
بے وفا وقت موسم کی برف کھا گیا۔ باقی بچی برف یہ کہ سمندر میں جاگری ہوگی اور سمندر۔۔۔ سمندر سے موجیں آکاش چھونے کے لیے لپکتی ہیں اور دھڑام سے گر پڑا ہو پر اکثر ہی گھبرا جاتا۔ اس میں عدل و انصاف کے جذبات بیدار ہوتے۔ لگتا تمام راستہ کھائیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اسے کچھ نہ سوجھتا۔ ایک بار ضمیر کی خلش عروج پر تھی اسے خودکشی کا خیال بھی آیا کہ چھت سے لٹک کر مر جائے۔ شاید وہ اس کش مکش سے چھٹکارا پانے کے لیے پھانسی لے لیتا مگر اشنا یاد آگئی جس کے لیے وہ بہ ہر صورت زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ اسے پردیس میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ اس نے کسی بڑے کام یاب اور منجھے ہوئے ایکٹر کی طرح اپنی کش مکش سے چھوٹی بہن کو اب تک غافل رکھا تھا۔ سے اپنا کیریئر بنانے سے زیادہ چھوٹی بہن کو ترقی کی چوٹی پر دیکھنے کی خواہش تھی۔ وہ بہن کو شاد آباد دیکھنا چاہتا تھا۔ یہی وہ خواہش تھی جو اس کا ہر ارادہ ڈھا دیتی۔
سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ''پڑوسی کے نام خط'' کے بارے میں میں اس کے علاوہ کسی دوسرے کو کچھ معلوم نہ تھا۔ راجن کو

[illegible]
اطمینان تھا کہ:

اشنا کو معلوم ہے کہ راجن بھاؤ نا سے محبت کرتا تھا۔ بھاؤ نا نے آتما ہتھیا کی تھی۔ اس حادثے نے راجن کو تقریباً پاگل کر دیا تھا۔ راجن کو سنبھالنے میں اس کے بھائی ایشان کا بڑا ہاتھ ہے۔ دونوں دوست بن گئے ہیں۔ وہ ایک جان دو قالب ہیں۔ اگر اشنا کچھ نہیں جانتی تھی تو صرف اس روز سے واقف تھی کہ رلیہ راجن بھاونا کا مران سمجھوتہ یک طرفہ تھا۔ بھاؤ نا مرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا ثبوت ایشان کے پاس تھا۔ وہ یہ بات ساری دنیا سے چھپا سکتا ہے مگر کیا وہ بہن سے بھی اصل حالات چھپانے کا گناہ کرے گا؟

ایسا کر سکے گا؟

کل کیا ہوا؟

مستقبل میں جھانکنے سے لاچار، وہ بے بسی میں بہت ڈر رہا تھا؟ بظاہر چپ اور شانت رہنے والا ایشان کیا اس راز پر سے پردہ اٹھا سکے گا؟ اب نہیں تو کب تک چپ رہے گا؟ سوال جواب مانگتا تھا! وقتی فیصلہ تھا۔ جواب یا جواز سوجھنے تک، جب تک ٹال نہ سکا، وہ ٹالے گا۔

اس کا راجن پر اختیار تھا نہ اشنا سے کچھ کہہ سکتا تھا۔ وہ بہن کو کیا بتاتا؟ راجن بے وفا ہے قاتل ہے۔ اس کے منہ کھولنے کی دیر ہے، حقیقت بھیانک ہو جائے گی۔ اس پر الزام تو آئے گا کہ اس نے جانتے بوجھتے حالات و واقعات پر پردہ ڈالے رکھا۔ کیوں؟ وہ سب باتوں کو پیٹھ پیچھے ڈال بھی دے لیکن حادثہ اتنا تلخ اور گھمبیر تھا، وہ چھوٹی بہن کو غافل بھی تو نہیں رکھ سکتا!

سوچوں کا بھنور تھا اور ایشان تھا

ایشان اکیلا تھا اور راجن نے اشنا کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

وہ جان گیا تھا اشنا اور راجن قریب ہو چکے ہین۔ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ بہت تھوڑی مدت میں دو دل ایک ہونے جا رہے ہیں۔ ٹوٹ پھوٹ اس کے اندر ہو رہی تھی جس کا پہلا نقصان یہ ہوا کہ وہ راجن سے بے تکلفانہ ملنے سے کترانے لگا۔ اسے دیکھتا تو لمحہ بھر کو کراہت بھی محسوس کرتا۔ دوسرے لمحے محسوس کرتا دونوں اس کو پیارے ہیں۔ وہی بے وجہ اجنبیت اور اکیلے پن کا شکار بن رہا ہے! کیا اسے بہن اور دوست کا سمبندھ ہونا پسند ہے؟

آخراس کے اندر مخالفانہ جذبہ کیوں پیدا ہو رہا ہے؟ ایک کشمکش تھی جو اشیا کو بھینچے جا رہی تھی۔ جس بات کو جس راز کو ایشان نے بھلا دیا تھا وہی بڑا مسئلہ بن کر اسے پریشان کر رہا تھا۔ کیا وہ بہن کا دل توڑ دے؟ کہ دے وہ راجن کو بیوی کا قاتل سمجھتا ہے؟ بک دے اسے راجن کے ان جانے، ان ان سلجھے، ان بوجھے اتیت (ماضی) سے بے خبری ہے۔ بس تھوڑے دن پہلے جس حادثے کے نتیجے میں بھاؤنا کی جان گئی۔ وہ صرف اس کی بھیانک تفصیل ہی سے واقف ہے۔ یہ اس کی غلطی ہی نہیں کہ اصل راز پر پردہ ڈال رکھا ہے۔۔۔ کبھی اشنا نے پوچھ لیا بھاؤنا نے خودکشی کیوں کی؟ وہ خط کا راز چھپا نہ پائے گا۔ تب بڑی مشکل ہوگی۔ اس نے جانتے بوجھتے بہن کو بھاؤنا کا ''پڑوسی کے نام خط'' نہ دکھایا تو آئندہ زیادہ پیچیدگی کا سبب بن جائے گا۔ راجن اور بھاؤنا کی کہانی کے اوجھل بوجھل رخ سے وہ اپنی بہن کو غافل نہیں رکھ سکتا۔ وہ بے وجہ نہیں سلگ رہا تھا اس کے دل میں بہن کے لیے محبت بھری تھی۔ وہ اس کی بہتری چاہتا تھا پھر خیال آتا اشنا راجن کی پہلی شادی کے بارے میں جانتے ہوئے راجن کو قبول کرنے پر تیار ہے تو وہ بیچ میں کیوں آئے؟ وہ بہن کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ خیال ہی خیال میں راجن کے کارنس پر راجن اور بھاؤنا کی عروسی جوڑے والی تصویر کی جگہ راجن اور اشنا کی تصویر دیکھتا تو اسے اچھا لگتا۔ چاند سورج کی یہ دوسری جوڑی ہوگی! کیا اب، وہ دونوں کی مسکراہٹیں نوچ کر ان کو رنجیدہ بنانے کا گناہ کرے گا۔ ایک خط میں مدفون نام نہاد جرم جو شاید ثابت کرنا مشکل ہے وہ اس کے لیے دوسرا غیر دانش مندانہ قدم اٹھائے گا۔

وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اشنا کی واپسی کا دن آ گیا۔

روانگی کے وقت، اشنا کو الوداع کہتے ہوئے ایشان نروس ہو گیا۔ اس کا ہاتھ بار بار کوٹ کی جیب کے اندر جا رہا تھا۔ اس کا نوٹس لیتے ہوئے اشنا نے اپنے کانوں کی لوؤں کو چھوتے ہوئے شرارت سے پوچھا ''بھیا دینے کو جیب میں تحفہ چھپا رکھا ہے؟ لاؤ دو'' اس نے بھائی سے کانوں کے زیور کی فرمائش کی تھی مگر سیر سپاٹوں کے دوران جیولر کے یہاں جانے کا وقت ہی نہ ملا۔ ایشان کو اپنا وعدہ یاد تھا پر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس وقت تو وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کاش کوئی اس کے قلب و ذہن میں کھولتے اندیشوں کو پڑھ سکتا۔ وہ بھاؤنا کا خط اشنا کو دینے کے لیے جیب میں ڈال لایا تھا تاکہ وہ سفر کے دوران ''پڑوسی کے نام'' وہ ''خوف ناک نوحہ'' پڑھ لے جس کے لفظ لفظ میں بھاؤنا کا زندگی سے پیار چھلک رہا تھا مگر جس کا انجام بالکل مختلف تھا۔

پریم کہانی کے تیسرے کردار راجن نے ایشان کی بے کلی کو الوداعی گھبراہٹ جان کر نظر انداز کرتے ہوئے اشنا سے پوچھا ''کیا تم نے اپنے بھیا کو کچھ نہیں بتایا؟ راجن کے من میں پیار تھا اور وہ اپنے نئے پن میں مست تھا۔ اس نے ایک طرح سے ایشان پر، اشنا سے، اپنی خفگی ظاہر کر ہی دی!

اشنا ہنس پڑی۔ ''بڑے بے صبر ہو! میں پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے سارا پروگرام بتاتی'' ابھی جملہ پورا نہ ہوا تھا، گاڑی چل پڑی۔ ایشان بن جانے بوجھے جیسے ایک ہی جست میں آگاہی کی اونچی سیڑھی پر پہنچ گیا، بولا ''اچھا تو سب طے ہے۔'' اس کے منہ سے اچانک نکلنے والا استعجاب دونوں متوالوں نے سن لیا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ٹرین دور ہوتی گئی۔ اشنا نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ بھائی سے اور راجن سے بھی! دونوں سے، پر وہ ایک پلیٹ فارم پر ساتھ تھے۔ ہم راز تھے۔ خاموش تھے۔ اس حقیقت سے واقف تھے کہ دوستی شیشے کا گلدان ہے۔ پتا بھی نہیں چلتا اور ٹھیس لگ جاتی ہے۔ منہ کھولا ایک لفظ بھی کہا تو نہ جانے کس کو چوٹ لگ جائے؟

ریلوے سٹیشن سے نکلتے ہوئے ایشان لیٹر بکس کے پاس سے گزرا تو جیب کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ وہ خط جو مدت تک بند پڑا رہا اب وہ دو ایک روز میں اشنا کے پاس پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد اشنا جو فیصلہ کرے۔

جب دونوں،

ایشاں اور راجن۔

ٹاور پارک کے ''وکٹوریہ کورٹ'' میں پہنچے تو وہاں کمپاؤنڈ میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ بھاری تعداد میں باوردی پولیس اور بہت سے دوسرے بے وردی لوگ کتے لے کر دوڑ پھر رہے تھے۔ گراؤنڈ فلور کے کونے والے فلیٹ پر چھاپہ پڑا تھا۔ وہاں ایک ایسا ہجوم

تھا جو بے بس نظر آ رہا تھا۔ کوئی حرکت میں تھا، کوئی تماشائی تھا، اور کوئی ڈرا ڈرا خاموش کھڑا تھا۔ وہاں فلیٹوں میں کوئی دہشت گرد تھا یا نہیں لیکن گھیراؤ النے والوں کی دہشت ان فلیٹوں میں رہنے والے سبھوں پر پوری طرح چھائی ہوئی تھی۔ پوری کیمونٹی ہراساں تھی اور نہیں جانتے تھے پکڑ دھکڑ اور پوچھ گچھ کا چکر کب تک چلے گا؟

دونوں ایشاں اور راجن

بظاہر لاتعلق،

چپ چاپ

بغیر توجہ کھینچے،

دھیرے دھیرے،

ساتھ ساتھ چلتے،

لفٹ سے چار فلور اوپر چڑھے اور خاموشی سے اپنے اپنے فلیٹ میں داخل ہو گئے۔

ooo

عبداللہ حسین

جلاوطن

I stood upon a high place,
And saw, below,many devils
Running, leaping,
And carousing in sin,
And looked up, grinning,
And said, ``COMRADE! BROTHER!``

Stephen Crane

ان دنوں میں ہم اپنا اپنا کھانا ساتھ لے کر جاتے تھے اور دوپہر کے وقفے میں سب ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ دفتر میں مجھ سمیت کل سات آدمی تھے: تین کلرک، ایک ڈسپیچر، ایک ٹائپسٹ، ایک چپراسی اور سب کے اوپر ایک ہیڈ کلرک۔ چنانچہ جب بارہ کا گھنٹہ بجتا تو ہم کام چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور دو میزوں کو جوڑ کر اپنے اپنے کھانے کے ڈبے ان پر لا رکھتے۔ پھر ہم پانچوں اپنی اپنی کرسیاں اُٹھا کر اُن کے گرد لے آتے اور بیٹھ کر کھانا شروع کرتے۔ جتنی دیر تک ہم کھاتے رہتے چپراسی پاس کھڑا مستعدی سے ہر ایک کو پانی پہنچاتا رہتا۔ وہ چپراسی مجھے اب تک یاد ہے۔ کلرک کے عہدے سے ترقی کرتے کرتے میں ڈپٹی سیکریٹری بن گیا ہوں اور اس دوران میں کوئی دو درجن چپراسیوں سے میرا واسطہ پڑ چکا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ایسا ذہین چپراسی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کو ہمارے بارے میں قطعی طور پر علم تھا کہ کون کون کھانے کے دوران میں کس کس وقت پر پانی پینے کا عادی تھا۔ مثلاً یہ کہ ٹائپسٹ اوسطاً ہر پانچ لقموں کے بعد آدھا گلاس پانی پیتا تھا اور یہ کہ ڈسپیچر ایک گلاس کھانا شروع کرنے سے پہلے اور ایک کھانا ختم کرنے کے بعد چڑھتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ وہ، یہ ظاہر کیے بغیر کہ وہ ہمارا بغور مطالعہ کر رہا ہے، باری باری ہر ایک کے پاس آس کے مقررہ وقت پر بغیر مانگے ہوئے پانی کا گلاس لے کر پہنچ جایا کرتا۔ اپنے اس معمول پر وہ اس سختی سے عمل کرتا کہ اگر کوئی بلا توقع اس سے پانی مانگ بیٹھتا تو وہ اس کی طرف، اور پھر باری باری سب کی طرف، اس اچنبھے سے دیکھتا کہ مانگنے والا پانی پیے بغیر نادم ہو کر بات کو رفع دفع کرنے کی کوشش کرنے لگتا۔ اس کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ گو میں نیا نیا دفتر میں نوکر ہوا تھا مگر چند ہی روز میں وہ میری اس عادت سے کہ میں کھانے کے ساتھ کبھی پانی نہیں پیتا بخوبی واقف ہو چکا تھا اور جب تک میں کھاتا رہتا میرے نزدیک بھی نہ پھٹکتا تھا۔۔ وہ ہماری عادتوں کے مطابق کام کرتا تھا یا کہ ہم اس کے کام کے مطابق اپنی عادات وضع کرتے تھے، اس بات کا میں کبھی فیصلہ نہ کر سکا۔ جب ہم کھانا ختم کر لیتے تو وہ سب ڈبوں کو بند کرتا، ان کو اُٹھا کر کونے میں رکھتا، میزوں کو جھاڑن سے صاف کرتا اور پھر باہر برآمدے میں جا کر اسٹول پر بیٹھ جاتا۔ وہاں بیٹھ کر وہ اپنا کھانا کھاتا۔ وہ اپنا کھانا خوب چبا چبا کر کھاتا اور ہر لقمے کے بعد جھاڑن سے منہ پونچھ لیتا۔ مختصر یہ کہ مجموعی طور پر ہمارا چپراسی ایک قابل ذکر شخص تھا۔

ایک اور قابل ذکر بات جو میں چھوڑ گیا ہوں مندرجہ ذیل مکالمہ ہے جو کھانے کے دوران ہمارے درمیان ادا ہوتا:

''دیکھو بھئی دیکھو۔'' کوئی کہتا۔

سب آنکھوں کے کونوں میں سے ایک طرف کو دیکھتے۔

''ہی ہی ہی۔۔،، کوئی دبی دبی ہنسی ہنستا۔

''ہی ہی ہی۔۔،، سب ایک ساتھ ہنستے۔ پھر کچھ دیر تک جبڑوں کی چپ چپ اور برتنوں کی کھنک آواز اُوپر آجاتیں۔

''ارے ہائے یار۔ کبھی تو بابا لو بیچارے کو۔'' پھر کوئی کہتا۔

''ہاں یار۔ کسی روز یہ بھی تو کر کے دیکھیں۔،،

''جانے دے یار۔ ایسا آدمی ہے کباڑیا۔،،

''بھئی بابانے کو تو کبھی نہ کبھی بلا ہی دیکھیں مگر یہ نظارہ پھر کہاں ملے گا۔ بیکار میں روز کا شغل گنوا دیں۔،،

''اور جو بیکار میں روز کی بلا گلے پڑ گئی تو؟''

''ناں بھائی ناں۔۔۔'' کوئی کانوں کو ہاتھ لگاتا،'' یہ بلا ہم گلے نہیں لیتے۔ وہ اسی انتظار میں ہے کہ کوئی جھوٹ موٹ ہی مدعو کرے۔ ذرا اس کی شکل دیکھو۔''

''پھر سب کنکھیوں سے اُدھر دیکھتے۔

''ہی ہی ہی''

''بیچارہ''

''یار ایک بات بتاؤ'' کوئی حیرت سے پوچھتا،'' یہ اتنی دولت کو لے کر کہاں جائے گا۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے، نہ رن نہ کن اور سالا کھاتا پیتا بھی نہیں!''

''ارے بعضوں کی قسمت میں ہی کچھ نہیں ہوتا۔ جنم جنم کے۔''

''ارے رے رے دیکھو دیکھو دیکھو۔''

''افوہ۔ افوہ۔''

پھر جبڑوں کی چپ چپ اور دبی دبی ہنسی کی آوازیں اور پانی کی غٹ غٹ۔ اور ایک دیوار کے پاس بیٹھا بیچارگی سے ہمیں تکا کرتا۔

''یار چندہ کر کے اس کے لیے الگ کھانا منگوا دیا کریں۔ ہیں؟'' کوئی تجویز کرتا۔

''اور وصیت میں تمہارے لیے بہت کچھ چھوڑ جائے گا نا۔ واللہ۔''

''ہاہاہا۔۔۔ واللہ''

''دیکھو دیکھو۔ ارے حد کرتے ہو یار۔ اب تو دیکھنے والا ہے۔''

''ہی ہی ہی۔''

یہ ہمارا ہیڈ کلرک تھا جس کے بارے میں، تھوڑے بہت ادل بدل کے ساتھ، یہ مکالمہ قریب قریب ہر روز دہرایا جاتا اور جس میں کلرکوں کے طبقے کی وہ ساری کوششیں شامل ہوتیں جن سے کہ وہ اپنے افسروں میں تضحیک کا پہلو نکال کر اپنی بہت سی نا آسودہ خواہشوں کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ اس کی تحصیلیوں والی آنکھیں اور راکھ کے رنگ کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جو وقت سے پہلے بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے سر پر برف کی طرح سفید گھنے بال تھے جو اس چہرے پر ایک خاص قسم کا، کسی حد تک پریشان کن اثر پیدا کرتے تھے۔ اس کا جسم مدقوق تھا اور ماتھے اور گردن اور بازوؤں پر میلے نیلے رنگ کی رگیں ابھری رہتی تھیں۔ اول تو وہ بات ہی بہت کم کرتا، اور جو بولتا تو ایسی آواز میں جو بہت دور کسی بند گنبد میں سے آتی ہوئی سنائی دیتی۔ سب سے پہلا خیال جو سننے والے کو ہوتا وہ یہ تھا کہ یہ آواز اصلی نقلی ہے، یا اس کی اپنی نہیں بلکہ مستعار لی ہوئی ہے یا کہ اس آواز کو مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا ہے یا کیا، بہر حال کچھ نہ کچھ ضرور ہے جو کسی نہ کسی طور اونچا نیچا ہے یا ٹیڑھا ہے مگر بے ڈھب ہے اور اس چہرے سے یا اس آدمی سے یا آس پاس کی کسی شے سے میل نہیں کھاتا اور دوسرے آدمی کو بے چین کرتا ہے خواہ مخواہ۔ ایسا اُس کی آواز کا اثر تھا اور ایسا اُس کے بات کرنے کا طریقہ تھا۔ یوں جیسے کوئی بات ہے جو اس کے دل پر آتی ہے یا بالکل ختم ہوتی ہے، اور رک رک کر، سوچ سوچ کر، جھک جھک کر اور گلے پر ہاتھ پھیر پھیر کر اپنا مطلب بیان کرتا تو کر نہ پاتا اور آدھی پونی بات کر کے رہ جاتا

اور دمے کے مریض کی طرح تیز تیز سانس لینے لگتا اور تھک کر کرسی کی پشت پر ٹیک لگا لیتا اور نظریں پھیر لیتا۔ بعد میں تو میں اس کا عادی ہو گیا مگر جب میں نے پہلے پہل دفتر جانا شروع کیا تو یہ سوچ سوچ کر اکثر حیران ہوا کرتا کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو محض ہم کلام ہو کر ہی اپنے مخاطب کے جسم میں سرد خون کی لہر دوڑا سکتے ہیں۔

وہ کبھی دوپہر کے وقفے میں کھانا نہ کھاتا تھا۔ سچ پوچھا جائے تو وہ کبھی دفتر کے اوقات میں کھاتا ہوا دیکھا نہ گیا تھا، اور دفتر کے باہر تو اس کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ کسی کو پتا نہ تھا کہ وہ کہاں پر رہتا ہے یا فارغ وقت میں کیا کرتا ہے۔ دوپہر کے وقت وہ صرف چائے کی ایک پیالی پیتا تھا جسے وہ چپراسی کے ہاتھ بارہ کا گھنٹہ بجنے سے پانچ منٹ پہلے منگواتا اور اچھی طرح ٹھنڈی کر کے پیتا۔ اس کا چائے پینے کا طریق بھی اس کے بات کرنے کے طریق سے مختلف نہ تھا، بلکہ کچھ اور بھی زیادہ انوکھا تھا، اس لیے کہ اس وقت اس کی شخصیت کا ایک اور قابل ذکر پہلو نمایاں ہو جاتا۔ بلا ناغہ یہ ہوتا کہ ہم سب لوگ کھانا کھا رہے ہیں اور وہ چائے کی پیالی کو اٹھاتا ہے اور کبھی اسے سونگھ کر اور کبھی اس میں اپنا عکس دیکھ کر اور کبھی اسے لبوں سے چھو کر اور کبھی محض گھما کر واپس رکھ دیتا ہے اور دوبارہ ہمیں اور ہمارے کھانے کو ندیدی نظروں سے ایک ٹک دیکھنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کے فاقہ زدہ چہرے پر ایک عجیب ناقابل بیان گرسنگی اور حسرت ہوتی جو اور قلمبند کیے گئے ہمارے مکالمے کی تشریح کرتی ہے۔ پھر جب ہم منہ چھپا کر ہنس رہے ہوتے یا پانی پی رہے ہوتے تو وہ جلدی سے پیالی کو اٹھا کر چائے حلق میں انڈیل لیتا۔

لیکن ان ساری باتوں کے علاوہ۔ اور ان کے باوجود۔ اس میں ایک چیز تھی جو عموماً بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور جس نے کہ اس کو، دنیاوی لحاظ سے، مکمل طور پر فیل ہونے سے بچا رکھا تھا۔ یہ چیز اس کی ذاتی خود مختاری اور اس کی شخصیت کا وقار تھا۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک ایسی چیز، جیسی کہ یہ ہے، اس شخص میں موجود ہو جس کا کہ تفصیلاً ذکر میں نے اوپر کیا ہے، لیکن یہ حقیقت تھی کہ جب تک وہ ہم لوگوں کو دور دور سے دیکھتا رہتا اس کی آنکھوں میں حسرت اور بیچارگی اور کم مائیگی کی کیفیت رہتی مگر جونہی وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوتا اس میں غرق ہو جاتا، اس کے ساتھ ایک ہو جاتا اور قلم کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے اور اس کے دوسرے سرے سے کبھی ماتھے کو اور کبھی میز کو بجاتے ہوئے وہ کسی بہت بڑے اخبار کے بہت بڑے مدیر کی طرح لگتا جو کوئی عظیم اداریہ لکھ رہا ہو، اور اس وقت کاغذات پر نظریں جمائے جمائے جو وہ کوئی ہدایات ہمیں ان کے بارے میں دیتا ان میں تحکمانہ کھنک ہوتی اور جس خود مختاری سے وہ کام میں مدد کرنے کی ہماری ہر پیش کش کو رد کر دیتا وہ حیرت انگیز ہوتی۔ وہ قلم کا دھنی تھا اور جس ڈرافٹ کو وہ ایک مرتبہ تیار کر لیتا پھر سٹینو سے لے کر سیکرٹری تک کوئی اسے نہ بدل سکتا نہ اس کا جواب دے سکتا اپنی میز اور فائلوں کی مختلف الماریوں کے درمیان اس کا دبلا پتلا، اپنے آپ میں کھویا ہوا جسم جنگل کے جانور کی ایسی آسانی، پھرتی اور وقار کے ساتھ حرکت کرتا۔ کاغذوں، فائلوں، میزوں، کرسیوں اور الماریوں کے ساتھ اس کا تعلق اس قدر آسان اور قدرتی سطح پر تھا کہ اس میں خوبی کار کے علاوہ خود بخود ایک گریس پیدا ہو گئی تھی جو ہمیں اس کی عزت کرنے اور کسی حد تک اس سے ڈرنے پر مجبور کرتی تھی۔ یہی چیز تھی جس نے مجھے...... کہ نیا نیا کلرک بنا تھا اور ابھی اس طبقے کی اس مخصوص ذہنیت سے بچا ہوا تھا جو کہ اسے کسی بھی نئے ذہنی تجربے یا تجسس کے قابل نہیں رہنے دیتی...... اُس سے بے لاگ دلچسپی لینے پر مجبور کیا۔ گو مجھے چند روز کے بعد ہی اس دفتر کی نوکری چھوڑنا پڑی اور اس کی شخصیت کے معمے کو حل کرنے کی خواہش کو دل ہی میں لے کر چلا آیا اور یوں یہ بات میری ان متعدد خالصتاً ذہنی ناآسودگیوں میں شامل ہو گئی جن سے ایک سوچنے والے انسان کو قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔

لیکن ان چند روز میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے کہ بعد میں...... بہت بعد میں...... اس گتھی کے سلجھانے میں میری مدد کی۔ یہ واقعہ میرا اُس کے ہمراہ اس کے گھر جانے اور ایک گھنٹہ اس کی صحبت میں گزارنے کا تھا۔ یہ یوں ہوا کہ ہمارا چپراسی چھٹی پر تھا اور ہیڈ کلرک کو معمول سے زیادہ فائلیں گھر لے جانے کی ضرورت پیش آ گئی اور چونکہ ایک خاص مقدار سے زیادہ کا بوجھ اس کا ناتواں جسم اُٹھانے کے قابل نہیں تھا چنانچہ اُس نے مجھ کو، کہ سب سے جونیئر تھا، فائلیں اُٹھا کر ساتھ چلنے کا حکم دیا۔

اُس کا گھر نسبتاً غیر آباد علاقے میں واقع تھا جہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں شہر بھر کا چکر کاٹنا پڑا۔ میں گو کہ جوان آدمی تھا اُس کی رفتار کا مقابلہ نہ کر سکا اور وہاں تک پہنچتے پہنچتے ہانپ گیا۔ جب میں نے سانس برابر کرنے کے لیے فائلوں کا بوجھ اس کی

پنجرے میں سے طوطے نے 'خوش آمدید' کہا۔ پھر ساتھ کے پنجرے سے مینا کچھ بولی جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ پھر کھاٹ پر سے ایک ننھا سا سفید کتا، جس کا چہرہ بالوں میں چھپا ہوا تھا، جمائی لے کر اُٹھا اور بڑی نفاست سے قدم رکھتا ہوا آ کر اُس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ برآمدے کے کونے میں ایک بڑے سے پنجرے میں رنگ برنگی چونچوں اور رنگ برنگے پروں والی ننھی ننھی بیسیوں چڑیاں تھیں جو ہمیں دیکھ کر پاگلوں کی طرح ہر ایک سمت میں اُڑنے اور گرنے اور پنجرے کے تاروں سے لٹکنے اور بساط بھر شور مچانے لگیں۔ دوسرے کونے میں ایک اس سے ذرا چھوٹا پنجرہ دھرا تھا جس میں بند ایک پالتو نیولا اپنی تھوتھنی اُٹھا کر تیزی سے اُوپر نیچے چکّر لگانے لگا۔ جب کمرے کا دروازہ کھول کر ہم اندر داخل ہوئے تو سیاہ اور سفید بلیوں کا ایک جوڑا میز سے کود کر میاؤں میاؤں کرتا ہوا بڑھا اور پاس آ کر اس کی ٹانگوں سے جسم رگڑنے لگا۔ وہ ہر ایک کو اس کے مزاج کے مطابق چھیڑتا، تھپکتا، کان مروڑتا، پاؤں میں دباتا، ہاتھوں میں اٹھاتا یا دور سے ہاتھ ہلاتا، مسکراتا اور انہیں ان کے عجیب و غریب ناموں سے پکارتا ہوا سیدھا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔

''بیٹھو......'' اُس نے مڑ کر دیکھے بغیر کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ کوئی اور بات کیے بغیر فائلوں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ آدھا درجن چوپائے اس کے اردگرد ننگے فرش پر اور کرسیوں پر بیٹھے تھے اور وہ، بالکل ایسے جیسے دفتر میں کام کیا کرتا تھا، قلم کے دوسرے سرے سے کبھی ماتھے اور کبھی میز کو بجاتا ہوا کام میں گم تھا۔ صرف دو باتیں ایسی تھیں جنہوں نے مجھے ذرا سا پریشان کر دیا۔ ایک تو یہ کہ کام کے دوران وہ برابر وقفے وقفے پر اپنے پالتوؤں کے نام لے لے کر باتیں کرتا جا رہا تھا، بڑے آسان، قدرتی طور پر، جیسے لوگوں سے باتیں کی جاتی ہیں، ان کے حال احوال پوچھ رہا تھا، ان کی ذرا ذرا کوتاہیوں اور بدتمیزیوں پر سرزنش کر رہا تھا اور بیچ بیچ میں ہاتھ بڑھا کر کسی ایک کو چھو بھی لیتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ظاہری طور پر اس نے مجھے بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔

آخر تنگ آ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس پر بھی اس نے ادھر توجہ نہ دی تو میں پیٹھ پر ہاتھ باندھ کر بے مقصد کمرے میں پھرنے لگا۔ کمرے میں سوائے ایک درجن میز کرسیوں کے، جو ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں، اور کچھ نہ تھا۔ صرف مغربی دیوار پر تین تصویریں لٹک رہی تھیں جن پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میں نے کنکھیوں سے گھر کے مالک کو دیکھا اور آہستہ سے پھونک مار کر ان کی گرد اُڑائی۔ پہلی تصویر ایک سیب کے گالوں اور چمکتی ہوئی آنکھوں والے صحت مند نوعمر لڑکے کی تھی جو سکاؤٹوں کی وردی پہنے ایک پہاڑی نالے کے کنارے کھڑا ہنس رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نوعمری کے زمانے کا جمال تھا اور آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھا اور اس کی مسکراہٹ میں ایسی کشش تھی جس نے مجھے کتنی ہی دیر تک اس کو دیکھتے رہنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری تصویر ایک نوجوان آدمی کی تھی جو سیاہ گاؤن پہنے، ڈگری ہاتھ میں پکڑے، بڑے اعتماد سے کھڑا تھا۔ سب سے گہرا تاثر جو اس کے چہرے پہ تھا اس کی پُرعزم نگاہوں کا تھا۔ وہ ایسے نوجوانوں میں سے تھا جو ستاروں پر کمند ڈالتے ہیں۔ تیسری تصویر چند فوجیوں کی تھی جو جنگی لباس میں ملبوس کسی نامعلوم مقام پر ایک فوجی گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ بائیں طرف کو گروپ سے ذرا ہٹ کر ڈھلتی ہوئی عمر کا ایک شخص، جو بہرحال گروپ میں شامل تھا، رائفل کی ٹیک لیے تھکے ہوئے انداز میں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے انتہائی اکتاہٹ اور درماندگی مترشح تھی۔ اس کی ہلکی ہلکی مشابہت اس شخص سے تھی جو اس وقت اس کمرے میں فائلوں پر جھکا ہوا تھا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ تینوں تصویروں پر سوائے سن اور تاریخ کے اور کچھ بھی نہ لکھا تھا۔ پہلی اور دوسری تصویر میں تیرہ سال کا فرق تھا، دوسری اور تیسری میں صرف چھ سال کا تھا۔ تصویروں کو دیکھتے دیکھتے مجھے اچانک خیال ہوا کہ ہیڈ کلرک بڑی دیر سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ جب میں مڑا تو وہ اسی طرح کام میں مصروف تھا۔ میں واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ کمرے کا فرش اور فرنیچر صاف شفاف تھا

دوران میں وہ برابر اپنے کتوں اور بلیوں کو، جو ہمارے ساتھ ساتھ باورچی خانے میں چلے آئے تھے، دھیمے لہجے میں ڈانٹتا ڈپٹتا اور مختلف ہدایات دیتا رہا۔ پھر سٹو و جلا کر اس پر پانی رکھنے کے بعد اس نے شیلف پر سے چائے کا سامان اور برتن اُتارنے شروع کیے۔ کمرے کے وسط میں ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ اُس پر اُس نے نفاست سے دو پیالیاں، چمچے اور چینی دان رکھے۔ کرسی صرف ایک تھی چنانچہ وہ بڑے کمرے سے جا کر ایک اور کرسی اُٹھا لایا۔ پانی اُبل گیا تو اس نے چائے دم کی، دودھ گرم کر کے برتن میں ڈالا اور پھر میز پر بیٹھ کر چائے بنانے لگا۔ اس سارے عرصے میں میں تقریباً مسحور بیٹھا اور اسے دیکھتا رہا تھا۔ وہ گھر کے کام میں بھی اسی طرح غرق تھا جیسے دفتر کے کام میں ہوا کرتا تھا اور یہ کام بھی وہ اسی طرح سے اپنے جچے تلے انداز میں اسی یقین اور خوبی اور خود مختاری اور صفائی سے کر رہا تھا جیسے کہ وہ کام، اور یہاں بھی وہ اپنے کتوں بلیوں طوطوں اور کھانے کے برتنوں کے درمیان اسی جنگل کے جانور ایسی آسانی اور پھرتی اور گریس کے ساتھ حرکت کر رہا تھا جیسے دفتر میں میزوں، کرسیوں اور فائلوں کی الماریوں کے درمیان کیا کرتا تھا۔ ہماری کرسیاں آمنے سامنے نہ تھیں۔ اپنی کرسی اس نے اس طرح رکھی تھی کہ میرا رُخ شمال کی جانب تھا اور اس کا مغرب کی طرف ہم نے خاموشی سے بیٹھ کر ایک ایک چائے پی۔

چائے پینے کے بعد اُس نے شیلف پر سے ایک بہت بڑا کھلے منہ والا برتن، جس میں ڈبل روٹی اور تیندوری روٹی کے ٹکڑے بھگوئے ہوئے تھے، اتار کر تینوں کتوں کے آگے رکھا۔ پھر ایک بڑے سے کٹورے میں دودھ ڈال کر بلیوں کو دیا۔ پھر اس نے ڈبے میں سے معجون نما ایک چیز نکالی اور اس کے دو حصے کر کے طوطے اور مینا کے پنجروں میں ڈالی۔ اُس کے بعد اُس نے چڑیوں کے پنجرے میں باجرے کے دانے پھینکے اور پانی کی پیالوں کو بھرا۔ پھر اس نے نیولے کا پنجرہ کھول کر اس کو باہر نکالا، پنجرے کے اُوپر سے ایک چھوٹے سے چمڑے کے پٹے کو اٹھا کر اس کی گردن میں ڈالا، اس میں پتلی سی زنجیر پھنسائی اور زنجیر کے سرے کو پکڑ کر سیڑھیوں کی جانب چل پڑا۔ نیولا کبھی اس کے ساتھ ساتھ چلتا، کبھی چھلانگ لگا کر اس کے جسم پر چڑھنے لگتا اور کندھے پر جا کر بیٹھ جاتا۔ ہم آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے چوبارے پر نکل آئے۔

یہاں پر عجیب منظر تھا۔ چاروں طرف کبوتروں کی کابکیں ہی کابکیں تھیں جو ایک دوسرے کے اُوپر رکھی چھت کو پہنچ رہی تھیں۔ جہاں کھلی چھت تھی وہاں اُونچی اُونچی مچانیں کبوتروں کے لیے لگی تھیں۔ کبوتروں کی خشک بیٹوں سے فرش بدرنگ ہو رہا تھا اور کابکوں کے اندر وہ غٹرغوں اور چوں چوں کا شور مچا رہے تھے اور ان کی بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ایک کر کے اس نے کابکوں کے دروازے اُٹھانے شروع کیے اور کبوتر پھڑ پھڑا کر نکلنے لگے۔ چند ایک تو نکلتے ہی اس کے کندھوں پر اور سر پر بیٹھ گئے۔ باقی اُڑ کر مچانوں اور دیواروں پر جا بیٹھے۔ کچھ فرش پر بیٹھ کر پروں میں چونچیں پھیرنے لگے۔ ساری کابکیں کھول کر جب وہ لوٹا تو تقریباً ڈیڑھ سو کبوتر ہر قسم کے اور ہر رنگ کے ہمارے اردگرد موجود تھے۔ پھر اس نے ان کے پانی کے برتن بھرے اور ان کو دانہ پھینکنا شروع کیا۔ مچانو اور دیواروں اور اس کے کندھوں پر بیٹھے ہوئے کبوتر غوطہ لگا کر دانے پر ٹوٹ پڑے۔ اب یہ منظر تھا کہ رنگ رنگ اور نسل نسل کے ڈیڑھ سو کبوتر مسلسل غڑغوں کرتے اور ایک دوسرے کو چونچیں مارتے ہوئے دانہ چگ رہے تھے اور وہ ان

''میں اب جاؤں؟'' میں نے پوچھا۔
اس نے چونک کر سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر فوراً منہ پھیر لیا، جیسے کہ میری موجودگی کی اطلاع پا کر اس کو اچانک صدمہ ہوا ہو۔

''یہ کبوتر'' اس نے سنبھلتے ہوئے کہا، ''تمہیں پسند ہیں۔''

''ہاں۔''

اس نے جھک کر بادامی رنگ کے سروں والے نہایت خوبصورت کبوتروں کا ایک جوڑا اُٹھایا۔

''یہ تم لے لو۔'' اُس نے کبوتر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ن...... نہیں۔'' میں نے کہا، ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

اُس نے آہستہ سے کبوتر چھوڑ دیے جو گرتے ہی دوبارہ دانہ چگنے لگے۔

''اتنے جانور...... آپ نے کیوں رکھے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جانور؟'' وہ بے خیالی سے بولا، ''ہاں۔ اچھے ہوتے ہیں۔''

''اچھے ہوتے ہیں؟'' میں نے دہرایا۔

''ہاں۔''

میں آہستہ سے ہنسا۔ اُس نے چونک کر سر اُٹھایا۔ میں پریشان ہو گیا۔

''ان کا فائدہ؟'' میں گھبرا کر پوچھ بیٹھا۔

''فائدہ؟'' وہ پہلی بار ہنسا، گہرا اور مختصر۔ پھر اُس نے جھک کر سفید کبوتروں کا ایک جوڑا اُٹھایا اور اُنہیں چہرے کے قریب لا کر پیار سے بولا، ''جب چاہو انہیں بلا سکتے ہو۔ چھو سکتے ہو۔'' پھر اُس نے کبوتر میری طرف بڑھائے۔ ''یہ لو۔''

میں خاموش کھڑا رہا۔

''لے لو۔'' اُس نے کہا، ''یا کوئی اور لے لو۔ جو بھی تمہیں پسند آئیں۔ یا طوطا لے لو۔ یا مینا۔ یا کتا لینا چاہتے ہو؟ چھوٹا کتا تم کو پسند ہے؟ وہ لے لو۔''

مَیں ہچکچاتا ہوا خاموش کھڑا رہا۔ اس نے پہلی بار سیدھا میری آنکھوں میں دیکھا اور آہستہ سے بولا: ''لے لو!'' پھر اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ سے ہلتا اُس میں ایک عجیب تبدیلی رونما ہوئی۔ اس کی نظریں واضح طور پر لڑکھڑائیں، اور پھر جیسے ٹوٹ گئیں۔ اس نے جلدی سے کبوتر پھینکے اور بچتا بچاتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ ان ایک درجن فائلوں کو، جن سے نپٹ چکا تھا، جلد جلد باندھ رہا تھا پھر اس نے ان کا بنڈل میری طرف بڑھایا اور رُک رُک کر، گلے کی رگوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر چند الفاظ میں مجھے سمجھایا کہ میں ان کو گھر لے جاؤں اور اگلی صبح دفتر لے آؤں۔ پھر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔ میں نے فائلیں بغل میں دبائیں اور چپکے سے چلا آیا۔

اگلی صبح اُس نے کوئی ایسی بات یا ایسی حرکت نہ کی جس سے ظاہر ہوتا کہ ہم میں کوئی صحبت رہ چکی ہے۔ دوپہر سے پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ چڑیوں کی چپ چپ اور دھیمی دھیمی باتیں اور دبی دبی ہنسی اور پانی کی غٹ غٹ وہ ایک بے چارہ دیوار کے پاس بیٹھا ہمیں تکا کرتا۔ چند روز کے بعد میں نے بہتر ملازمت مل جانے کی بناء پر دفتر سے استعفیٰ دے دیا۔

کئی برس گزر گئے اور میں اس واقعے کو تقریباً بھول گیا۔ مگر پھر ایک بار مجھے ایک سرکاری کام کے سلسلے میں تہران جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میرا قیام چند روز سے زیادہ کا نہ تھا مگر اپنی بیوی کے اصرار پر مجھے اس کو بھی ساتھ لے جانا پڑا۔ وہاں پر ایک روز ایک ریستوران میں کھانا کھاتے ہوئے ہم نے ایک بہت بوڑھے شخص کو دیکھا جو عجیب حسرت بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہا

تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کچھ کھائے پیے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا اور چھڑی ٹیکتا اور مڑ مڑ کر ہماری طرف دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد ہم نے ریستوران کے ایک بیرے سے، جس سے اس نے چند باتیں کی تھیں، اس کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ وہ شہر لاہور کا رہنے والا تھا جو اپنی جوانی میں وہاں آیا تھا اور پھر واپس نہیں گیا۔ اس نے وہیں پر شادی کر لی تھی اور اب تہران کے متمول تاجروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس پر مجھے یہ واقعہ یاد آ گیا جو اوئل عمر میں میرے پیش آیا تھا، اور چشم زدن میں ..... یوں کہ جیسے ہم طوفانی رات میں کہیں جا رہے ہوں اور ایک جگہ ایک سیاہ شبیہ کو دیکھ کر رک جائیں اور کھڑے رہیں اور دل میں ڈرتے رہیں کہ یکبارگی بجلی چمکے اور ہم پر انکشاف ہوا کہ ارر ے یہ تو ایک جھاڑی تھی اور ہم بے خوفی سے گزر جائیں..... یوں چشم زدن میں مجھ پر ساری بات واضح ہو گئی اور یہ معمہ، جس کو میں بظاہر بھول چکا تھا اور جو دراصل برابر میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں انکا رہا تھا اور برابر غیر محسوس طور پر میری ذہنی نا آسودگی میں اضافہ کرتا رہا تھا، وفعتاً جیسے نکل کر باہر آ گیا اور جیسے بڑی صفائی سے حل ہو گیا اور میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا کر بڑی طمانیت سے مسکرا کر اپنی بیوی کو دیکھا جو ابھی تک کھانے میں مصروف تھی اور میری آسودگی سے تقریباً بے خبر تھی، اس وقت جو چند لمحے مجھ کو خالی ملے میں ان میں مَیں نے ذرا حیرت سے سوچا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ بعض دفعہ ایک چھوٹی سی بات کے جاننے میں ایک عمر لگ جاتی ہے، کہ جلاوطن اپنے قبیلے کی کشش سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا چاہے وہ اپنے قبیلے کی کشش سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا چاہے جو وہ اپنے قبیلے سے مایوس ہی کیوں نہ ہو چکا ہو......کیسی عجیب بات ہے۔

جب ہم بل ادا کر کے باہر نکلے تو میری بیوی ابھی تک اس بات سے بے خبر تھی کہ آج مَیں اس برسہا برس پرانے واقعے کو قطعی طور پر اپنے پیچھے اس ریستوران میں چھوڑے جا رہا تھا جس میں ابھی ابھی ہم نے کھانا کھایا تھا اور جہاں ابھی تک دوپہر کو دیر سے کھانا کھانے والے اکا دکا لوگ بیٹھے تھے اور جہاں سے کچھ دیر ہوئی کہ وہ بڈھا ہم وطن اُٹھ کر گیا تھا جو میرے لیے طوفانی رات میں بجلی کا چمکارا ثابت ہوا تھا، اور کہ اب میرے لیے اس بات کا کلّی طور پر بھول جانا کس قدر آسان ہو چکا تھا۔

OOO

عزیز احمد

آبِ حیات

''اور خدائے تعالیٰ نے کہا۔ دیکھو آدمی ہمارے جیسا ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہ نیک اور بد کو پہچاننے لگا ہے
اور اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور زندگی کے درخت کا پھل بھی کھالے اور غیر فانی ہو
جائے۔ اس لیے خدائے تعالیٰ نے اسے باغ عدن سے نکلوا دیا تاکہ وہ اس زمین میں ہل چلائے
جس کے مٹی سے وہ بنایا گیا تھا۔ اس لیے اس نے انسان کو باہر نکلوا دیا تاکہ وہ اس نے باغ عدن کے
مشرق میں فرشتوں کو مقرر کیا' جن کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلواریں تھیں جو ہر سمت پلٹ سکتی تھیں'
تاکہ وہ زندگی کے درخت کے راستے کی نگہبانی کریں۔

(توریت۔ کتاب آفرینش)

گل گامش' بابل کا سب سے طاقت ور انسان' جس سے بابل کے دیوتا لرزتے تھے' اپنے دوست این کی دو کی لاش کے سامنے کھڑا تھا' اس کے چہرے کے اعصاب' غضب اور رنج کی شدت پر کھنچ گئے تھے۔ اس کے جسم کا فولاد اس آگ میں جل رہا تھا جو اس فولاد کو جلا سکتی تھی' پگھلا نہیں سکتی تھی۔

اور گل گامش نے یوں بین کیا' دیوتاؤں کے سے وقار سے۔

''میرے دوست' میرے چھوٹے بھائی جو پہاڑوں کی ڈھلوان پر میرے ساتھ جنگلی جانوروں اور میدانوں کے شیروں کا شکار کرتا تھا۔ این کی دو میرا دوست' میرا چھوٹا بھائی جو میرے ساتھ پہاڑوں کے دامن میں گورخر اور میدانوں میں شیروں کا شکار کرتا تھا' جو میرے ساتھ ساتھ ہر معرکہ سر کر سکتا تھا' جو چوٹی اور چٹانوں پر چڑھا اور جس نے آسمان کے سانڈ کو پکڑا اور ہلاک کر دیا۔ جس نے ہواوا کو اٹھا کے پھینک دیا جو جنگلوں میں رہتا تھا۔ بتا اب یہ کون سی نیند ہے جس نے تجھے جکڑ لیا ہے؟ تو سیاہ پڑ گیا ہے اور مجھے دیکھ نہیں سکتا۔''

گل گامش کے دوست کی لاش نے آنکھیں اوپر نہیں اٹھائیں۔ گل گامش نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ اس کے دل کی دھڑکن خاموش تھی۔

اور تب یہ ہوا کہ رنج کی جگہ غضب اس طاقت ور، اس ہیبت ناک انسان پر طاری ہونے لگا گل گامش پر جس سے دیوتا بھی پناہ مانگتے تھے۔ اس کا دوست کسی معرکے میں، کسی بڑی لڑائی میں، شیروں کے جنگل میں یا کسی اور انسان یا دیوتا کی تلوار سے ہلاک نہیں ہوا تھا۔ ایک بیماری تھی' ایک بخار تھا' جس نے اس کے طاقت ور ساتھی کو اس قدر نیچا دکھایا۔ وہ جو گل گامش کا ساتھی تھا اور کوئی اس کو نیچا نہ دکھا سکتا تھا۔

گل گامش نے اپنے دوست کو چادر سے چھپا دیا تھا' جیسے دلہن چادر سے چھپائی جاتی ہے اور گل گامش کی شیر جیسی آواز گونج اٹھی۔ بار بار اور پھر بار بار وہ اپنے دوست کی طرف پلٹتا اور اپنے بال نوچتا اور اپنے ناخنوں سے اپنے جسم سے زرق برق لباس تک کو کسوٹنے لگتا۔ یہ نقصان ایسا تھا کہ وہ اسے حقیقت سمجھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ گویا یہ محض ایک خواب تھا جس کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ یہ کہ این کی دو مر ہی نہیں سکتا۔ اور اسے سچ ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ سات دن اور سات راتیں گزر گئیں اور اس نے اپنے دوست کو دفن نہیں کیا۔ کیونکہ ابھی اسے یہ امید تھی کہ اس کے بین کی آواز سن کر اس کا دوست جاگ اٹھے گا۔

یہاں تک کہ سات دن اور سات راتیں گزر جانے کے بعد ایک سفید سا کیڑا این کی دو کی ناک سے باہر نکلا۔ یہ اس کی نشانی تھی کہ اس کی لاش اندر سے سڑنے لگی ہے اور تب گل گامش کو یقین آیا کہ انسان کی تقدیر اس کے دوست این کی دو پر غالب آ چکی ہے۔ اور اب گل گامش کے لیے یہی باقی رہ گیا تھا کہ وہ کبھی چین نہ لے' آرام نہ اٹھائے اور بھٹکے ہوئے شکاری کی طرح گھائی

گھائی، میدان میدان سر ٹکراتا پھرے۔

جنوبی بابل میں ایک شہر تھا اورک۔ اورک کے سردار کا نام گل گامش تھا۔ وہ انسان تھا، دیوتا نہیں تھا۔ ہرقلیس کی طرح ایک درمیانی کڑی جس میں انسان کی قوت اور مجبوری تھی، لیکن دیوتاؤں کا سا آہنی عزم اور استقلال۔ یہ گل گامش ظالم اور جابر تھا اور اس کی رعایہ اس سے خوش نہیں تھی۔ یہ بھیڑ بکریوں اور عورتوں کا خراج وصول کرتا تھا اس کے دل میں درد نہیں تھا اور اسے دوسروں کے درد کا احساس نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس کی رعایا نے تنگ آ کے بابل کے دیوتاؤں سے دعا مانگی کہ وہ گل گامش ہی جیسا ایک اور طاقت ور انسان پیدا کریں۔ اس کا ثانی تا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے رہیں اور رعایا کو چین ملے۔

دیوتاؤں نے اروک کی رعایا کی فریاد سن لی اور این کی دو کو پیدا کیا۔ لیکن گل گامش کا مدمقابل اور حریف بننے کی جگہ وہ اس کا دوست ساتھی اور حلیف بن گیا۔ طاقت ور انسان اکثر ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔ اور تب تو گل گامش کے تکبر، اس کی طاقت اور اس کی چیرہ دستی کی کوئی حد نہیں رہی۔ اب وہ اپنی رعایا کو تو بھیڑ بکریوں کی طرح بہت معمولی شکار سمجھتا تھا۔ اس کی اور این کی دو کی زد سے آسمانی شکار محفوظ نہیں تھا۔ انسانوں کی کیا حقیقت تھی۔

ان دونوں نے دور دور اور بڑے بڑے خطرناک معرکوں کا بیڑا اٹھایا۔ یہ اس گنجان جنگل میں گھس گئے جو سورج کے دیوتا این لل کی ملکیت تھا اور جس کی حفاظت کے لیے اس نے ایک بڑے مہیب دیو ہواوا کو مقرر کیا تھا۔ لیکن ان دونوں نے ہواوا کو اٹھا کے پٹک دیا اور اسے ہلاک کر ڈالا اور سورج کے دیوتا این لل کے جلال کو مشتعل کر دیا۔

جب گل گامش اور این کی دو اس ہولناک شکار سے واپس آ رہے تھے تو ایشتر کی حسین آنکھ نے گل گامش کا مردانہ جلال و جمال دیکھ لیا اور اس پر عاشق ہو گئی۔ یہ ایشتر اس زمانے میں اور اس ملک میں اناثہ کہلاتی تھی۔ ایشتر کے کئی نام تھے اور وہ عورتوں کی سرتاج اور زندگی کی خالقہ اور سب سے بڑی دیوی تھی۔ وہ کہیں ایشتر تھی، کہیں اشتارتے، وہی ستارہ تھی جسے آسمان پر زہرہ کہتے ہیں اور جو اپنی شہوت ناک نظروں سے انسانوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے، جس نے ہاروت اور ماروت کو بابل کے کنوئیں میں قید کیا، جیسے حضرت یوسف کے بھائیوں نے یا زلیخا نے حضرت یوسف کو۔۔۔۔۔ یہ ایشتر مصر میں آئی سس یا دریائے نیل تھی۔ یہی فرو ڈائے ٹی یا وی نس تھی یعنی حسن کی یونانی دیوی اور عشق کے دیوتا کیوپڈ کی ماں، لیکن یہی جونو بھی تھی۔ دیوتاؤں کے دیوتا زیس کی بیوی۔ اصل میں یہ ایشتر تموز کی ماں، بیوی اور بہن تھی جو ہر سال قتل ہوتا تھا اور جاڑے آ جاتے تھے اور نباتات پر خزاں آ جاتی تھی اور انسانوں اور جانور مرجھائے سے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ایشتر جا کے تموز کو زیریں دنیا میں پھر سے زندہ کرتی اور دنیا پر بہار آ جاتی۔ شاخوں سے شگوفے پھوٹ نکلتے، مصر میں دریائے نیل میں زمین کو زرخیز بنانے والی طغیانی آ جاتی، لبنان کے جنگل ہری ہری پتیوں سے لہلہانے لگتے۔ مندروں میں اور میدانوں میں عورتیں اپنے جسم اجتماعی عاشقی کے لیے وقف کر دیتیں، جانوروں کی جھولیں بھر جاتیں۔

یہی ایشتر تھی، یہی ایشتر جس کے راج کو صدیوں بعد یسوع مسیح نے درہم برہم کرنا چاہا اور مریم مجدلین کو اس چنگل سے چھین لیا۔ اسی کے چنگل میں حضرت یوسف کا حسن اسیر ہوتے ہوتے رہا تھا کہ بال بال بچ گیا۔ اور ان واقعات سے ہزاروں سال پہلے اسی ایشتر نے گل گامش کا انسانی جمال دیکھا جو جلال کی ایک کیفیت تھی اور وہ گل گامش پر عاشق ہو گئی، جیسے وہ ہزاروں سال بعد وینس بن کر ایک چرواہے پر عاشق ہونے والی تھی۔

ایشتر کی آنکھوں کے جادو نے گل گامش پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس کے خون میں غارت اور ریخت اور فتح کا جنون موجیں مار رہا تھا۔ عشق ایک تخلیقی فعل ہے اور عشق انا کی شکست ہے۔ اپنے اور اپنی حیات اور اپنے جسم کی شکست کا اعتراف ہے۔ عشق زمانے میں زندگی کے تسلسل کا بیج بوتا ہے اور اس وقت فتح اور طاقت کے غرور میں گل گامش کے ذہن میں یہ بھی تصور نہیں آ سکتا تھا کہ وہ فانی ہے یا اس کی زندگی یا اس کا جسم فانی ہے اور یہ کہ زندگی کے تسلسل کے لیے یہ ضروری ہے کہ جب وہ مر جائے تو کوئی اور جسم باقی رہ جائے جو اس کے جسم کے تخم سے بنا ہو اور اس طرح زندگی موت کا، اور حیات فنا کا مقابلہ کرے۔ نہیں وہ اپنے آپ کو دیوتاؤں کی طرح لافانی، نہ مٹنے والی ہستی اور باقی سمجھتا تھا۔

اور جب لیشتر نے دیکھا کہ اس کے حسن کا گل گامش پر کوئی اثر نہیں۔ ایک معمولی انسان ہو کے وہ دیویوں کی دیوی کو ٹھکرا رہا ہے۔ تو شدت غضب میں اس نے بھی وہی کیا جو مصر کی زلیخا کرنے والی تھی۔ اس نے گل گامش اور اس کے دوست این کی دو کو ہلاک کرنے کے لیے آسمانی سانڈ بھیجا جس کی سانس میں آگ تھی لیکن گل گامش اور اس کی دوست نے اس آسمانی سانڈ کو ہلاک کر ڈالا۔ اور کچھ طنز اور کچھ جلال کے عالم میں گل گامش نے اس سانڈ کا فالس اکھیڑ کے لیشتر کے منہ پر دے مارا۔

سورج کے دیوتا این لل کو اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ کیونکہ ابھی تک تو شاید وہ اور تھموز الگ الگ تھے، مگر صدیوں بعد وہ ایک ہی تو ہونے والے تھے۔ تھموز مصر میں اوسیرس اور ایشیائے کوچک اور رومتہ الکبریٰ میں اے ٹس اور یونان میں اڈوانس بننے والا تھا۔ اور لیشتر اس کی ماں، بیوی اور بہن تھی۔ ازلی تانیث۔ دیوی کی یہ ہتک وہ برداشت نہ کر سکا مگر گل گامش ار این کی دو پر ذاتی الزام جو اس نے لگایا وہ یہ تھا کہ گل گامش اور این کی دو نے اس مہیب دیو کو ہلاک کیا تھا جو اس کے جنگل کا چوکیدار تھا اور اس نے ایک معمولی سی بیماری، معمول سا بخار بھیج کر گل گامش کے رفیق اور ساتھی این کی دو کو ہلاک کر دیا۔

اور اس طرح این کی دو جس نے گل گامش کے ساتھ پہاڑوں کی ڈھلوان پر گورخر مارے تھے اور میدانوں میں شیر۔ جس نے ہواوا اور آسمانی سانڈ کو ہلاک کیا تھا۔ بالکل اتنی آسانی ایسی حقیر آسانی سے مر گیا جیسے مکھی مرتی ہے یا مچھر مرتا ہے، یا جیسے کوئی برساتی کیڑا ہلاک ہوتا ہے۔

گل گامش کو اس پر سخت رنج و تعجب تھا۔ اب وہ ظالم اور جاہل نہیں رہا تھا۔ اور اب رعایا پر ظلم کرنے کا زمانہ نہیں رہا تھا۔ اب اس کے اپنے پیکر میں انسانی شعور نے پہلی مرتبہ قضا و قدر سے انصاف کا مطالبہ کیا۔ اس انصاف کا جو بابل کی رعایا اپنا حق سمجھتی تھی۔ یہ کہ ہر خطا انسان کے خلاف ہی ہو سکتی ہے اور اس کی سزا ملتی ہے لیکن قدرت میں، قدرت کے اعمال اور افعال میں خطا اور سزا اور جزا کا کوئی تصور نہیں اور یہ کہ جس کی خطا زیادہ ہوتی ہے اسے سزا نہیں ملتی، بے گناہ کو ملتی ہے۔ مثلاً گل گامش اور این کی دو کا ہی واقعہ ہے۔ ہواوا اور آسمانی سانڈ کو ہلاک کرنے میں بڑا حصہ گل گامش کا تھا لیکن وہ محفوظ رہا۔ لیشتر کی ہتک گل گامش نے کی لیکن وہ محفوظ رہا اور سورج کے دیوتا نے این کی دو کی جان لی جو محض اس کا شریک اور رفیق تھا۔ آخر موت کا کیا جواز ہے؟ اور انسان کو فنا کے دروازے سے کیوں گزرنا پڑتا ہے؟ گل گامش نے سوچنا شروع کیا۔ یقیناً موت سب سے بڑی سزا ہے۔ یہ نفرت کی انتہاء ہے۔ قتل اس کو کیا جاتا ہے جسے ہم اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں۔ اور اسے معاف نہیں کر سکتے اور اسے زندگی کے روپ میں نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن یہ سزا قدرت بلا کسی خاص امتیاز کے بلا معیار، بے انصاف، بے مقصد ہر ایک کو دیتی ہے، کبھی جلدی کبھی دیر میں۔ مگر کیوں؟ آخر کیوں؟

اس سوال کا جواب نہ اسے ملا نہ اہل بابل کو جنہوں نے اس کی داستان تخلیق کی اور وہ آوارہ پھرتا رہا۔ وہ این کی دو کا غم بھول گیا۔ وہ جو معمولی انسانوں سے لے کر آسمانی سانڈ تک سب کو زیر کر چکا تھا۔ اب صرف ایک دشمن کو زیر کرنا چاہتا تھا۔ موت کو۔

یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ گل گامش موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ اگر وہ موت سے ڈرتا ہوتا تو اب سے بہت پہلے جب اس مہیب دیو سے لڑتے لڑتے این کی دو کی ہمت جواب دینے لگی تو وہ این کی دو کو سختی سے یہ کیوں سمجھاتا۔

''میرے دوست! وہ کون ہے جو آسمان کی بلندی تک بلند ہوا تا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ سورج کے دیوتا شمش کے ساتھ ہم مکان رہے۔ وہ محض انسان ہی تو ہے۔ اس کی زندگی کے دن محدود ہیں خواہ وہ کوئی معرکہ کیوں نہ سر کرے۔ وہ محض ہوا ہے۔ اور تم ابھی سے موت سے ڈرتے ہو۔ تمہاری ہمت اور طاقت کہاں ہے؟ دیکھو میں اس دیو پر حملہ شروع کرتا ہوں اور تم ٹھہر کے چلا کے کہو، 'ہاں بڑھو۔ ڈرو مت'' اور اگر میں مارا جاؤں تو شہرت کی وجہ سے میرا نام تو زندہ رہے گا۔ لوگ کہیں گے مہیب دیو ہواوا سے لڑنے میں گل گامش مارا گیا۔

اس طرح کی موت کے تو کوئی معنی تھے مگر یہ کیا کہ معمولی سی بیماری آئے اور این کی دو جیسے کڑیل پہلوان کا کام تمام ہو جائے۔ اور گل گامش نے موت کا مقابلہ کرنے اور موت کو شکست دینے پر کمر ہمت باندھی۔ یہ اس کا آخری اور سب سے بڑا معرکہ تھا۔ سب سے بڑی مہم۔

اب ایک ہی خیال تھا' ایک ہی فکر' ایک ہی مقصد جو دن رات گل گامش کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ یہ کہ کس طرح موت کو شکست دی جائے' کس طرح فنا کو فنا کیا جائے اور سوچتے سوچتے گل گامش کو یاد آیا کہ اس کے اجداد میں سے ایک شخص تھا (شاید وہی جسے عبرانی خضر علیہ السلام کہتے ہیں) جو اب موت کے سمندروں کے اس پار' دنیا کے اس دوسرے سرے پر رہتا تھا' اس نے بقائے دوام حاصل کر لی ہے۔ صرف اس نے' کسی اور نے نہیں۔۔۔۔ اور کسی انسان کو بقائے دوام نصیب نہیں ہو سکی۔ بقائے دوام کا راز اسے معلوم ہوگا۔ گل گامش نے تہیہ کیا کہ وہ اس کے پاس جائے گا اور اس سے یہ راز دریافت کر لے گا۔

چنانچہ تن تنہا گل گامش نے دور دراز کا سفر شروع کیا۔ اس نے ان پہاڑوں کو طے کیا جن کے اس پار آفتاب غروب ہوتا ہے۔ پھر اس نے وہ اندھیرا راستہ طے کیا' جس سے آفتاب رات بھر گذرتا ہے۔ وہ مایوس ہو گیا کہ اب پھر کبھی وہ روشنی نہ دیکھ سکے گا۔ اور بالآخر وہ ایک بحرِ ذخار کے کنارے پہنچا۔ راستہ میں اسے جو کوئی ملتا اس سے وہ اس لافانی بزرگ اتنا پشتم تک پہنچنے کا راستہ پوچھتا اور بقائے دوام کی تفصیلیں پوچھتا اور بار بار سے ایک ہی جواب ملتا۔

''گل گامش تم کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔ بقائے دوام جس کی تمہیں آرزو ہے تمہیں نہیں مل سکے گی۔ کیونکہ جب دیوتاؤں نے انسان کو بنایا تو موت اس کے نصیب میں لکھ دی اور زندگی کا راز اپنے دلوں میں محفوظ رکھا۔ گل گامش کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ۔ چین سے زندگی بسر کرو۔ دن رات ناچو۔ گاؤ۔ نئے نئے کپڑے پہنو' نہاؤ' پانی سے سر دھولو۔ اپنے بچے کی طرف دیکھو جو تمہارا ہاتھ پکڑے ہے اور اپنی بیوی کو اپنی آغوش میں لے لے کے راحت بخشو۔ انسان کو انہیں چیزوں میں مگن رہنا چاہیے۔

لیکن گل گامش عام انسانوں کا راستہ چلنے نہیں نکلا تھا۔ وہ اپنی جستجو سے باز آنے والا نہ تھا۔ بقائے دوام کی آرزو اس کے تن بدن کو جلائے دے رہی تھی اور وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ سمندر کے کنارے اسے ایک کشتی ملی اور ایک کشتی بان جو اتنا پشتم کا ملازم تھا۔ وہ اسے موت اور فنا کے اس بحرِ ذخار کے اس پار اتنا پشتم کے پاس لے گیا۔ اس نے اتنا پشتم سے پوچھا کہ بقائے دوام کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اتنا پشتم بھی اس کی مدد نہ کر سکا کیونکہ خود اس کو بقائے دوام اتفاقاً کچھ ایسے عجیب حالات میں حاصل ہوئی تھی' جن کا دوبارہ پیش آ سکنا ناممکن تھا۔ بہت عرصہ ہوا' بڑے قدیم زمانے میں جب دیوتاؤں نے انسان کی بدعنوانیوں اور گمراہیوں سے تنگ آ کر بنی نوع انسان کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کیا تو ان کے مشورے سے سورج کے دیوتا این لِل نے زمین پر ایک عالمگیر طوفان بھیجا۔ اس طوفان میں اتنا پشتم اور اس کی بیوی اور اس کے بچوں کے سوا سب ڈوب گئے۔ اتنا پشتم کو پہلے سے آنے والے طوفان کی اطلاع مل گئی تھی۔ اس نے ایک بڑی کشتی بنائی جس میں وہ خود' اس کے بال بچے' تمام جانوروں کے ایک ایک جوڑے کے ساتھ سوار ہو گئے۔ این لِل کو کچھ دنوں بعد افسوس ہوا کہ اتنا بڑا طوفان بھیجنا جلد بازی کا کام تھا' اور اسے خوشی ہوئی کہ اتنا پشتم نے زندگی کے اتنے نمونے ہلاک ہونے سے بچا لیے۔ اس کے انعام میں اس نے اتنا پشتم کو بقائے دوام عطا کی۔ لیکن ایسے واقعات بار بار پیش نہیں آتے۔

گل گامش سنتا رہا۔ وہ عبرانیوں سے بہت پہلے گزرا تھا' اس لیے وہ چونک نہیں پڑا کہ ہائیں یہ تو حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ ہے اور بقائے دوام نوح کو نہیں خضر کو عطا ہوئی اور این لِل نے انہیں عطا کی' خدائے بزرگ و برتر نے عطا کی۔ گل گامش موجودہ سائنس دانوں سے بہت پہلے گزرا تھا اس لیے اس نے نظریہ نہیں بنایا کہ طوفانِ نوح شاید بحیرہ روم کے بھرنے کی یاد ہو۔ جب جبل الطارق کے پاس کی چٹانوں کو توڑ کے بحیرہ اطلانتک کا پانی ایک بہت بڑے رقبے میں گھس آیا' جس میں انسان آباد تھا' اور جہاں آبادیاں تھیں وہاں آج بحیرہ روم ہے۔ اور نہ گل گامش نے یہ نظریہ بنایا کہ یہ بابل اور ار کی زمین میں خلیج فارس کا خروج تھا۔ اور نہ اس نے اس نظریے پر غور کیا کہ جب آخری برفانی دور کے گذر جانے پر قفقاز اور ارادات کا بہت سا برف پگھلا ہوگا تو شاید دجلہ اور فرات میں ایسی طغیانی آئی ہو کہ سارا ملک پانی میں ڈوب گیا ہو۔ نہیں گل گامش کو ماضی کے واقعات کی فکر نہیں تھی۔ وہ مستقبل کی فکر میں مبتلا تھا۔

اتنا پشتم نے گل گامش سے کہا۔ لیکن تمہیں موت سے لڑنے کی ایسی ہی تمنا ہے تو ضرور لڑو پہلے نیند سے لڑو۔ اور وہ اس

طرح کہ ایک جادو کی نیند ہے' اگر تم اس نیند سے جاگ سکے تو ممکن ہے موت کے بعد جاگ سکو۔ گل گامش جادو کی نیند سو گیا لیکن جاگنا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ ہلاک ہونے ہی والا تھا کہ اتنا پشتم کی بیوی کو اس پر رحم آیا اور اس نے اسے جادو کی نیند سے جگا دیا۔

• لیکن گل گامش کی مہم ناکام ہو چکی تھی۔ بالاخر اس ہیبت ناک ہمت ور آدمی نے ہار مان لی اور اتنا پشتم سے اروک واپس جانے کی اجازت چاہی۔ اتنا پشتم کی بیوی نے اپنے خاوند سے درخواست کی کہ رخصت ہوتے وقت وہ گل گامش کو کوئی تحفہ دے اور اتنا پشتم نے الوداعی عطیے کے طور پر اسے یہ گر بتایا کہ سمندر کی تہہ میں ایک درخت ہے' جو اس کے پتے کھا لے اس کا بڑھاپا چلا جاتا ہے اور اس طرح وہ مسلسل جوان رہتا ہے۔ یہ بقائے دوام کا راز تو نہیں تھا لیکن طبعی موت کا علاج ضرور تھا۔ اور گل گامش اس دوسری موت سے نہیں ڈرتا تھا جو دشمنوں کا مقابلہ کرنے میں' کسی مہم کو سر کرنے میں آ جائے۔ اتنا پشتم کے آخری تحفے سے پھر اس کی ڈوبتی ہوئی ہمت نے ایک نئی جولانی محسوس کی۔ امید کی ایک نئی کرن نظر آئی اور اس لافانی مرد بزرگ سے رخصت ہوا۔

اتنا پشتم کا ملاح جو اسے موت کے سمندر کے اس پار لایا تھا' پھر اسے لے چلا۔ اس نے سمندر میں ٹھیک اس مقام پر اسے لا پہنچایا' جہاں سمندر کی اتھاہ گہرائی میں جوانی کو واپس لانے والا تحفہ تھا۔ گل گامش نے غوطہ لگایا اور سمندر کی تہہ سے اس بیش بہا پودے کو اکھیڑ لایا اور پھر گل گامش کو وہی ملاح جس کا نام ارشانابی تھا اس کے دارلحکومت اروک واپس لے چلا۔ وہ دونوں خلیج فارس کے کنارے پہنچے اور پھر شاندار پیدل زمین پر منزل مقصود کی جانب روانہ ہوئے لیکن دن بڑا گرم تھا' آفتاب تیز تھا' زمین تپ رہی تھی' منزل دور تھی اور سفر سخت تھا۔ ایک چشمہ نظر آیا جس کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ نہا کے ذرا ٹھنڈا ہو لے۔ اس نے کپڑے اتارے اور نہانے کے لیے چشمہ میں اتر پڑا۔ جوانی کو واپس لانے والے پودے کو بھی اس نے چشمہ کے کنارے ہی چھوڑ دیا تھا۔ ایک سانپ نے اس پودے کی خوشبو سونگھی' اپنے بل سے باہر نکلا' اور پودے کو لے کر غائب ہو گیا۔ وہ بھی تو ایک سانپ ہی تھا جس نے آدم و حوا کو نیک و بد کے درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی تھی۔ جس کی پاداش میں وہ جنت عدن سے نکالے گئے۔ اہل بابل بہر حال اس کے قائل تھے کہ چونکہ سانپوں نے گل گامش کے لائے ہوئے جوانی اور زندگی کے درخت کے پتے کھا لیے اس لیے سانپ کبھی نہیں مرتے۔ جب وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو پرانی کینچلی اتار پھینکتے ہیں۔ اور تب گل گامش نے اپنی پہلی اور آخری شکست پر ماتم کیا۔ چشمے کے کنارے بیٹھ کے ملاح ارشا بانی سے خطاب کر کے اس نے رونا شروع کر دیا۔۔۔۔ وہ جو کبھی نہیں رویا تھا' این کی دو کی موت پر بھی نہیں۔۔۔۔ اس کے دونوں رخساروں پر آنسو بہنے لگے اور اس نے کہا۔

''ارشابانی کس کے لیے میں نے بازوؤں کا اتنا زور' اتنی طاقت صرف کی' کس کے لیے میں نے اپنا خون جگر خرچ کیا؟

مجھے خود کوئی نعمت میسر نہ آ سکی۔ ہاں زمین کے اندر رہنے والے سانپوں کی میں نے ضرور بڑی خدمت سرانجام دی۔

اور اہل بابل کو اپنے سوال کا جواب نہ مل سکا۔ اور وہ زندگی اور موت کا چیستان حل نہ کر سکے۔

(۲)

ایک یونانی نوجوان تھا۔ یا اسے نیم دیوتا' نیم نوجوان کہہ لیجئے کیونکہ اس زمانے تک انسانی ذہن خداؤں اور انسانوں میں زیادہ امتیاز نہیں کرنے پایا تھا۔ خیر اس نوجوان کا نام فارسی سس تھا۔ یہ ایک چشمے کے کنارے بیٹھا ہوا تھا اور پانی میں عکس دیکھ رہا تھا۔۔۔۔ اپنا عکس۔

اور اسے یقین تھا کہ اس کے اپنے عکس سے زیادہ حسین اور کوئی شے نہیں۔ یہ کہ اس جیسا کوئی اور پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اسی طرح سالہا سال چشمے کے کنارے بیٹھا اپنا عکس دیکھتا رہا۔

یہ چشمہ بھی شاید ویسا ہی تھا' کہ شاید وہی تھا جیسے وہ چشمہ جس میں نہانے کے لیے گل گامش نے کپڑے اتارے تھے اور جس کے کنارے اس نے سدا بہار جوانی کا پودا کھو دیا تھا۔ جسے سانپ چرا لے گئے تھے۔ شاید یہ فارسی سس وہی گل گامش تھا۔ اب وہ ہیرو نہیں رہا تھا۔ اس کی جلال کی خصوصیات رخصت ہو گئی تھیں' جمال ہی جمال باقی رہ گیا تھا۔

اور چشمے سے جو آواز بلند ہوئی صدائے بازگشت' وہ ایک پری بن گئی' ایک عورت۔ وہ اس خوش جمال انسان پر عاشق تھی۔

کہ اس کے لیے اپنے بطن میں اس خوش رو نو جوان کا تخم پھلے پھولے اور وہ ایسے ہی حسین بچوں کی ماں بنے۔ آخر اس عورت کا حضرت حوا سے کچھ تو ناطہ تھا جنہوں نے سانپ کے کہنے سے نیکی اور بدی کا علم پھل پہلے خود کھایا پھر حضرت آدم کو کھلایا اور اس کے بعد خدائے تعالٰی نے بقائے دوام کے درخت پر فرشتوں کو پہرہ دار مقرر کر دیا کہ کہیں انسان جو نیکی اور بدی کے علم سے ناواقف ہو گیا تھا' بقائے دوام بھی حاصل نہ کر لے۔

چنانچہ فاری سس نے اس پری کی آواز نہیں سنی اور اپنا عکس دیکھتا رہا اور اپنے ہی عکس پر عاشق ہوتا گیا اور یہ پری' یہ عورت اس کے عشق میں گھل گھل کے محض صدا' محض ندا' محض صدائے بازگشت بن گئی۔ اور سدا بہار جوانی کا پودا سانپوں کے قبضے میں رہا۔ یہاں تک کہ فاری سس کو اس چشمے پر شک ہوا' جس میں وہ اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ چشمہ محض ایک آئینہ تھا' ایک خطرناک آئینہ جس میں اپنے عکس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اور شاید یہ آئینہ کسی کی حسین آنکھ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک عورت کی حسین آنکھ اور اسی آنکھ کی شکل کا ایک پھول ایران میں کھلا۔ ایرانیوں نے فاری سس کا کچھ کچھ قصہ یونانیوں سے سنا تھا اور انہوں نے اس کا نام گل نرگس رکھ دیا۔

لیکن نہ یہ چشمہ اکیلا تھا' نہ یہ نوجوان اکیلا اور نہ وہ عورت وہ پری اکیلی تھی جو عشق کے غم میں گھلتے گھلتے صدائے بازگشت بن گئی تھی۔ کیونکہ بلاد فلسطین میں ایک مقدس درخت تھا۔ جس کے سائے میں ایک کنواں تھا ایک اور نوجوان چاند کی روشنی میں اس میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے حسین جسم کو چاند کی روشنی میں نیم عریاں کر دیا تھا۔ کیونکہ چاند کے حسن اور اس کے حسن میں ایک طرح کی مشابہت تھی۔ یہاں تک کہ اس نوجوان کے والد اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں آ نکلے۔ ان کی مقدس آنکھوں پر شک اور ملامت کا سایہ پڑا اور گزر گیا۔ اور انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا ''یوسف اپنی پوشاک ٹھیک کر''

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو کئی کنوؤں' کئی چشموں' کئی زندانوں سے سابقہ پڑا اور ان سب کا اپنا عکس جلوہ فگن تھا۔ فاری سس کی طرح اپنا عکس انہوں نے چشمے میں نہیں' دلوں میں دیکھا۔ مگر کچھ دل کھرے ہوتے ہیں اور کچھ کھوٹے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں اناج کا ایک خوشہ ہے اور ان کے بھائیوں کے ہاتھوں میں بھی اناج کے خوشے ہیں مگر بھائیوں کے ہاتھ کے اناج کے خوشے ان کے ہاتھ میں اناج کا جو خوشہ ہے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے ہیں۔ مصر کی قحط سالی میں یہ خواب پورا ہوا' مگر اس وقت ان کے بھائیوں کو پسند نہیں آیا۔ پھر انہوں نے خواب میں دیکھا کہ سارے کواکب ان کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے ہیں۔ یہ خواب بھی ان کے بھائیوں کو پسند نہیں آیا' جو کچھ دنوں بعد ان کو ایک کنوئیں میں پھینک آئے۔

اور تین دن کنوئیں کی تہہ میں گزار کے حضرت یوسف نے تزکیہ نفس سیکھا۔ پھر فاری سس کی صدائے بازگشت کی طرح زلیخا ان پر عاشق ہوئی۔ وہی نیکی اور بدی کا علم۔ مگر ابھی اپنے عکس کی محبت مٹنے نہیں پائی تھی اور اس مرتبہ جس غار' جس کنویں' جس زندان میں حضرت یوسف کو قضا و قدر نے اسیر کیا اس میں بجائے تین دن کے تین سال گذارنے پڑے۔ یہاں تک کہ تھموز اور اوسیرس کا سبق ان کے آنکھوں نے یاد کیا کہ کس طرح ہر سال دریائے نیل میں طغیانی آتی ہے اور زرخیز مٹی کی ایک تہہ جم جاتی ہے' پھر سے زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ بہار میں زندگی کا پھر سے نمو ہوتا ہے۔ نباتات، جمادات اور انسان اور زلیخا کو بالآخر عشق کا ثمر ملا اور حضرت یعقوب کی آنکھیں روشن ہوئیں۔

لیکن حضرت یوسف کے زمانے میں جب بیدار مغز اور نحیف الجثہ فرعون اخناتون' مذہبی تجربہ کر رہا تھا۔ اس کے ہم وطن بقائے دوام کا ایک اور بڑا دلچسپ راستہ ڈھونڈ چکے تھے۔ انہوں نے جسم کے زوال سے انکار کر دیا تھا۔ اگر جسم باقی رہ جائے تو روح ایک دن لوٹ ہی آئے گی۔ ایک دن مردہ جسم میں زندگی جاگ اٹھے گی' جیسے بہار میں مردہ درخت میں کونپل پھوٹتی ہے۔ جیسے مردہ زمین سے نباتات پیدا ہوتی ہیں۔ اور اپنے مردہ جسم کی حفاظت شروع کی۔ پہلے ناک کے راستے سے تیز اوزار کے ذریعے سارا بھیجا نکال لیا' مسالے بھر دیے۔ نفیس اور باریک کپڑے کی کئی کئی گز لمبی پٹیوں میں سارا جسم لپیٹا اور اس کو کپڑے میں ملفوف کر کے اس پر اسی مردے کی تصویر بنائی اور یہی تصویر لکڑی کے تابوت پر تا کہ جان دھوکا نہ کھانے پائے اور جب واپس آئے تو اس جسم میں واپس آئے۔ حضرت یوسف کے ہمراہی عبرانی ہنستے تھے کہ مصری مردوں کو دیوتا مانتے ہیں اور ان کے دیوتا مردہ

ہیں۔اس سرزمین میں موت، حیات پر حاوی تھی فنون لطیفہ کی محرک اوران کی سرتاج تھی۔زندگی پر حاوی تھی۔مگر انتظار زندگی ہی کا تھا زندگی کے دوام کا، زندگی کے واپس آنے کا، عبرانی ان پر ہنستے رہے، یوں معاذ اور قیامت اور مسیح موعود پر عبرانیوں کا عقیدہ بھی راسخ تھا۔مگر خیر یہ دوسری بات ہے۔اس وقت تک عبرانیوں کو وہ شبہ نہیں پیدا ہوا تھا جو ایک زوال پسند شاعر کو اپنے معشوق کے متعلق کئی ہزار سال بعد پیدا ہوا یہ کہ:

قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

(۳)

ایک تھا" میں" تیرھویں صدی عیسوی، میں مغربی یورپ میں، میں نے ایک خواب دیکھا۔ یہ کہ بہار کا موسم ہے۔ جب نباتات میں نئے سرے سے زندگی کی لہر دوڑتی ہے۔مئی کی صبح ہے اور بلا کسی مقصد کے محض زندگی کی جوئے رواں کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں۔لیکن رفتہ رفتہ اپنا مقصد، اپنی منزل مقصود کے محض ہوتی جاتی ہے۔ میں ایک باغ دیکھتا ہوں جس کے چاروں طرف چوکونی چار دیواری ہے۔ باغ کے باہر کی طرف ان تمام بھوتوں کی تصویریں ہیں جنہیں باغ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ان بھوتوں کے نام ہیں حسد، بخل، غربت، غم، ضعیفی، میں ان بھوتوں اور چڑیلوں کی تصویریں دیکھنے کے بعد باغ کی طرف دیکھتا ہوں۔ چار دیواری سے زیادہ خوشنما درختوں کی ٹہنیاں ہیں جو غنچوں اور پھلوں سے لدی ہوئی ہیں، چڑیوں کے زمزموں کی آواز آ رہی ہے۔ میں ڈھونڈ رہا ہوں کہ اس چار دیواری میں دروازہ کہاں ہے،جس کے راستے میں باغ میں داخل ہوں۔دروازہ آخر مل ہی جاتا ہے جس کی چوکیدار ایک عورت ہے،جس کا نام تن آسانی ہے۔ وہ مجھے بتاتی ہے کہ اس باغ کا نام باغ نشاط ہے اور نشاط دراصل ایک سردار ہے جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ درختوں کے سائے میں عیش مناتا ہے اور یہ درخت اس نے زیادہ تر مشرق سے یعنی عربوں کے ملک سے یہاں لا کے نصب کیے ہیں۔

اس باغ نشاط میں کئی دلچسپ مردوں اور عورتوں سے ملا۔ایک تو حضرت مذاق تھے جن کے ہونٹوں پر ہمیشہ تبسم رہتا اور جو بزلہ سنجی سے باز نہیں آتے۔ایک خاتون تھیں اخلاق بیگم، بات اس طرح کرتی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا بچھی جا رہی ہیں۔لیکن ان سب سے زیادہ جس سے مل کے میں متاثر ہوا ایک چھوٹا سا دیوتا تھا کیوپڈ۔عشق کا دیوتا یہ وہ تھا جو بڑوں بڑوں کا مان توڑتا تھا۔ جس کی ایک نظر سے زہد مرجھا جاتا تھا۔جس کی آنکھوں کی چشمک سے عصمتیں پگھل جاتی تھیں۔عشق کے دیوتا کے ساتھ ساتھ ایک نوجوان تھا جس کے ہاتھ میں دو ترکش تھے اور ہر ترکش میں پانچ تیر تھے۔ پہلے ترکش میں جو تیر تھے ان میں سے ہر ایک پر اس کا نام کھدا ہوا تھا اور ان پانچوں تیروں کے نام یہ تھے۔حسن۔سادگی۔سخاوت۔ساتھ، خوش وضعی اور دوسرے ترکش میں جو ٹیڑھے میڑھے تیر تھے ان کے نام تھے غرور۔بدمعاشی۔بے شرمی۔بے آرزوی۔پریشان خیالی۔

عشق کے دیوتا کے ہاتھ میں ہاتھ دیے میں نے ایک حسینہ کو آتے دیکھا جس کا نام حسن تھا۔اور بھی کئی حسین جوڑے اس کے ہم رکاب تھے لیکن مجھے یہاں ان کے تفصیلی ذکر کی فرصت نہیں۔ میں تو اپنی بپتا بیان کروں گا۔عشق کے دیوتا نے اپنے ساتھی خوش منظر کو حکم دیا کہ مجھ پر تیر برسائے۔اب میں باغ کے درختوں میں چھپتا پھرتا تھا اور عشق کا دیوتا اور اس کا ساتھی میرا تعاقب کر رہے تھے۔تازہ گھاس اور پھل دار درختوں کے درمیان جہاں جہاں بھانت بھانت کی چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ یہ تعاقب جاری رہا۔یہاں تک کہ تھک کے میں ایک کنوئیں کے کنارے بیٹھ گیا۔

وہی کنواں جس کے کنارے گل گامش نے سدابہار جوانی کا درخت کھودیا۔

یا وہ کنواں جس میں فاری سس اپنے عکس کو دیکھتا رہا اور عاشق ہوتا رہا اور اس نے اس پری کو ٹھکرا دیا جو اس کے فراق میں گھل گھل کے صدائے بازگشت بن گئی؟

یا وہ کنواں،جس میں حضرت یوسف کے بھائیوں نے انہیں قید کیا تھا۔وہی قید جو زلیخا کو ٹھکرا کے بھگتنا پڑی؟

بہر حال میں ایک کنوئیں کے کنارے بیٹھ گیا جس کے کنارے صنوبر کا درخت تھا اور کہتے ہیں کہ فرانس کے بڑے پرانے بادشاہ پے چن کے زمانے سے اب تک ایسا خوبصورت درخت کبھی روئے زمین پر نہیں اگا۔اس درخت کے نیچے سنگ مرمر کی

وفات پائی۔ میں اب آپ کو حسین فاری سس کا قصہ کیا سناؤں، وہ تو آپ سن چکے ہیں کہ پری اس کے فراق میں گھل گھل کے صدائے بازگشت بن گئی۔ مگر فاری سس نے عشق کے دیوتا کی نافرمانی کی تھی اور عشق کے دیوتا نے اسے اپنے ہی عکس کے عشق میں مبتلا کر دیا تھا اور اپنے عکس کے بے مصرف، بے غرض، بے نتیجہ عشق میں اس نے جان دے دی۔ کیونکہ اس طرح بقائے دوام حاصل نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہ چشمہ کنویں کے کنارے میں بہتا تھا آب حیات کا چشمہ نہیں تھا، نہیں یہ تو فاری سس کا خطرناک آئینہ تھا، خطرناک چشمہ، جہاں زندگی فنا ہوتی ہے۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ ذرا جھانک کے تو دیکھوں کہ یہ چشمہ کیسا ہے۔ اس کا پانی صاف تھا اس میں آئینہ کی سی جا تھی۔ اس کے اطراف دو دو انگل اونچی گھانس تھی۔ کبھی یہ کنواں خشک نہیں ہونے پاتا۔ لیکن میں نے جب غور سے اس کی تہہ کی طرف دیکھا تو مجھے دو چمکتے ہوئے سنگریزے نظر آئے۔ دو چمکتی آنکھیں۔ دو نرگس کے پھول۔ جب سورج چمکتا تو یہ دونوں سنگریزے اس طرح جگمگاتے کہ کنویں کی تہہ ان کی روشنی سے روشن ہو جاتی۔ پورے باغ کا عکس ان دونوں سنگریزوں میں نظر آ جاتا۔ تب میں سمجھا کہ یہی دو چمکتی آنکھیں (معلوم نہیں کسی عورت کی آنکھیں؟ یا اس کی اپنی آنکھیں؟) وہ خطرناک آئینہ تھیں جن میں اپنی پرستش کر کے فاری سس نے اپنی جان دی۔ خدا جانے فاری سس کے علاوہ اور کتنوں نے اس آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر ہلاکت کا راستہ اختیار کیا۔ کیونکہ وہ خطرناک منزل ہے جہاں بڑے بڑے دل گردے والے بے بس ہرن کی طرح شکار ہو جاتے ہیں، جہاں لوگوں کو غم و غصہ کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

لیکن اب میں اپنی داستان پھر سے بیان کرتا ہوں۔ ان سنگریزوں میں جہاں میں نے سارے باغ کا عکس دیکھا، وہاں میں نے ایک گلاب کا درخت بھی دیکھا۔ اس میں ایک گلاب کا پھول لگا تھا۔ یہ پھول کیا تھا ایک ایسی تھی کہ معلوم ہوتا تھا یہ سارا باغ اسی کے لیے لگایا گیا ہے۔ لیکن جہاں پھول ہوتے ہیں وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اس حسینہ کے اطراف ایک ایسا حصار تھا، خاردار جھاڑیوں کا، کانٹوں کا کہ اس تک پہنچنا ناممکن تھا۔ میں اس حسینہ گلاب کے دیدار ہی میں محو تھا کہ عشق کے دیوتا کو موقع مل گیا اس نے پے در پے پانچوں تیر چلائے۔ حسن، سادگی، سخاوت، ساتھ، خوش وضعی میرے قلب و جگر ان تیروں سے چھلنی ہو گئے۔ زخموں سے چور چور ہو کے میں نے عشق کے دیوتا کی اطاعت قبول کی اور اس نے ایک سنہری کنجی سے میرے قلب کو مقفل کیا تا کہ میرے دل پر اسی کا راج رہے۔ اس نے مجھے عشق کے مراسم اور آداب سکھائے۔ اس نے کئی ساتھی میری مدد کے لیے مقرر کیے مثلاً خوش بیانی۔ ذکر حبیب۔ راز داں اور دیدار لیکن سب سے بڑا دوست جو اس نے مجھے عطا کیا ایک شخص تھا جس کا نام چارہ ساز تھا اور جو اخلاق بیگم کا بیٹا تھا۔ چارہ ساز نے کہا کہ ”جناب میں آپ کی گلاب کے درخت تک رہنمائی کروں گا، اس طرح کہ کانٹوں سے آپ کا دامن نہ الجھنے پائے“ اس کی رہنمائی میں میں کانٹوں سے دامن بچاتا ہوا گلاب کے درخت کے قریب قریب پہنچ گیا لیکن دفعتاً ایک بدنہاد آدمی گلاب کے درخت کے قریب ہی کہیں سے نمودار ہوا۔ اس کا نام رقیب یا نگہبان تھا۔ یہ وہیں کہیں گھانس پات میں چھپا بیٹھا تھا کہ ہر ایسے شخص کو گرفتار کر لے جو گلاب کے پودے کی طرف ہاتھ بڑھائے اور یہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ اور بھی کئی عورتیں تھیں مثلاً زبان خلق، حیا، شرم۔ لیکن ان سب میں یہ رقیب جو اصلی نگہبان تھا بڑا ہی روسیاہ تھا۔ بڑا اونچا پورا۔ اس کی آنکھیں شعلوں کی طرح چمکتی تھیں۔ اس سے اور چارہ ساز سے پہلے تو کچھ بحث ہوئی مگر رقیب کے تیور دیکھ کر چارہ ساز بھاگ کھڑا ہوا اور میں رقیب کے نرغے میں اکیلا رہ گیا۔ مجھے ایک شریف خاتون نظر آئی جس کا نام عقل تھا اور جو عشق کو محض حماقت سمجھتی تھی۔ اس نے مجھے نصیحت کرنا شروع کی کہ عشق سے باز آؤ یہ محض جنون ہے۔ زبان خلق تمہیں بدنام کرے گی۔ حیا کو خود میں نے حسینہ گلاب کی حفاظت کے لیے مامور کیا ہے۔ اور جب وہ سب کچھ کہہ چکی اور مجھے قائل نہ کر سکی تو وہ بھی رخصت ہو گئی۔ عشق نے میرے لیے ایک اور مددگار مقرر کیا یہ میرا رفیق اور راز دان تھا۔ اس راز دان نے کہا کہ یہ رقیب بڑا ہی بے ڈھب آدمی ہے مگر خوشامد سے یہ بھی رام ہو سکتا ہے۔ اس کی بات مان کے میں رقیب سے سمجھوتے کی بات چیت کرنے کے لیے بڑھا لیکن رقیب نے خاردار جھاڑیوں سے آگے مجھے بڑھنے نہ دیا۔ میں نے بہرحال اس سے لجاجت سے کہا کہ ”میں اپنے کیے پر نادم ہوں کہ آپ کی اجازت کے بغیر اس گلاب کے درخت کے اس قدر قریب آ گیا۔ کیا کروں میں عشق کے دیوتا کا غلام ہوں اور

...گلاب کا پہلا بوسہ نصیب ہوا۔ لیکن یہ بوسہ جو وصال غرضی سے بھی بہت کم تھا' غضب ہو گیا۔ سب سے پہلے زبان خلق نے چہ میگوئیاں شروع کیں۔ پھر رشک اور حیا نے زور پکڑا۔ رقیب کو اب سب نے لعنت ملامت کی کہ وہ میری اور میرے ہوا خواہوں کی باتوں میں آ گیا اور اب رقیب نے خود افسوس کرنا شروع کیا کہ کیوں اس نے غفلت برتی۔ اب رشک نے حسینہ گلاب اور گلاب کے درخت کے اطراف ایک فصیل تعمیر کی' خندق بنائی اور میرے لیے اس تک پہنچنا ناممکن بنا دیا۔ رشک کے تمام ساتھیوں اور رقیبوں نے اس نئی فصیل کی حفاظت شروع کی۔ اب میں تھا اور فراق کا عالم میں' تڑپتا تھا اور کسی طرح گلاب تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

لیکن اب عشق کے دیوتا نے امید کو میری امداد کے لیے مامور کیا۔ یہی نہیں عشق کے دیوتا نے اپنے تمام سرداروں کی ایک مجلس مشاورت طلب کی اور بالا اخران سب نے مل کر اس حصار پر حملہ کر دیا جو رقیب نے حسینہ گلاب کے اطراف بنایا تھا۔ ایک ایک کر کے زبان خلق' شرم' حیا اور رقیب سب زیر ہو گئے اور مجھے گلاب تک رسائی نصیب ہوئی۔ گلاب کے درخت تک' حسینہ گلاب تک' گل بکاؤلی تک' بکاولی تک' یہ آب حیات کے چشمے تک پہنچنے کا دوسرا اصول تھا' جو سانپ نے حضرت حوا کو سکھایا تھا کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ چشمہ آب حیات حسینہ گلاب کا دہن ہے۔

(۴)

ایک بادشاہ تھا جس کا نام تھا عقل۔ اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام دل تھا۔ اور عقل نے دل کو اقلیم بدن کا سردار مقرر کیا۔ یہ شاہزادہ دل' اقلیم بدن کا نظم و نسق اچھی طرح چلا رہا تھا کہ کسی نے چشمہ آب حیوان کا ذکر چھیڑ دیا اور یہ ذکر سن کے دل دیوانہ سا ہو گیا کہ آخر یہ کیسا چشمہ ہے جس کا ذکر ہر زبان پر ہے لیکن جو ہر نظر سے پوشیدہ ہے۔ بالاخر دل نے اپنے ایک معتمد رفیق نظر کو روانہ کیا کہ دنیا بھر کا چکر لگائے اور چشمہ آب حیواں کا سراغ لگائے۔

نظر' ملک ملک زمین زمین تلاش کے ارادے سے روانہ ہوا۔ سب سے پہلے وہ ایک شہر پہنچا جس کا نام تھا عافیت۔ یہاں کے شہریار کا نام ناموس تھا۔ یہاں نظر کی دال زیادہ نہیں گلی۔ اس نے شہریار ناموس کی نصیحتیں سنیں اور آگے روانہ ہو گیا۔ حصار زہد میں اس نے ایک پیر مرد خمیدہ کو دیکھا جس کا نام زہد تھا اس نے اُسے اپنے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ آگے بڑھتا چلا گیا اور شہر ہدایت پہنچا۔ یہاں کا بادشاہ قوم عاد سے تھا۔ فیل تن' دیو قامت' اس کا نام ہمت تھا اور بالاخر ہمت ہی سے اسے چشمہ آب حیات کا پہلا سراغ ملا۔

ہمت نے اسے خبر دی کہ ایک بہت بڑا شہنشاہ ہے جس کا نام عشق ہے یہ بڑا ہی باجبروت شہنشاہ ہے۔ یہ شہنشاہ عشق پتھر سے مقناطیس بناتا ہے یہ لوہے کو گلا کر موم کر دیتا ہے یہ عشق ہی تو تھا جس نے سب سے پہلی شمع جلائی اور اس پہلی شمع پر پہلا پروانہ نثار ہوا۔ اسی نے باغ میں لالے کھلائے اور بلبلوں کے دل کو داغ دیا۔ اس شہنشاہ عشق کی ایک لڑکی ہے جس کا نام حسن ہے۔ ایسی پری رو کہ آسمان کا چراغ اس کا پروانہ ہے' جہاں سوز ایسی کہ اگر دریا کی طرف دیکھے تو پانی میں آگ لگ جائے۔ شہنشاہ عشق نے اپنی اس بیٹی شاہزادی حسن کو شہر دیدار کی حکومت سپرد کی۔ یہ شہر دیدار کوہ قاف کے قریب واقع ہے۔ اس شہر میں ایک جنت نما باغ ہے جسے باغ رخسار کہتے ہیں۔ اسی باغ رخسار کے کنارے چشمہ آب حیوان واقع ہے۔

لیکن جہاں ہمت نے نظر کو شہر دیدار اور گلشن رخسار اور چشمہ آب حیواں کا پتہ بتایا' وہاں یہ بھی جتا دیا کہ یہاں سے لے کر

چشمۂ آبِ حیواں تک راستہ بڑا ہی دشوار گذار اور خطرناک ہے۔ راستے میں بڑے ہولناک بیابان آتے ہیں۔ بڑے خطرناک طلسمات ہیں۔ بڑے ہی سنگ سیرت آدمی خوار راستے میں ملتے ہیں جن کا سرتاج ایک مہیب دیو ہے جس کا نام رقیب یا نگہبان ہے۔ شہنشاہ عشق کے حکم سے یہ رقیب دیو سیرت دارالملک دیدار کا دربان ہے۔ اگر تو اس کے چنگل سے بچ کے نکل گیا تب کہیں شہر دیدار تک تیری رسائی ہوگی۔ جا۔ خدا تیری مدد کرے۔

نظر ہمت کے بتائے ہوئے راستے پر روانہ ہوا۔ اس کے آقا نے اسے چشمۂ آبِ حیواں کا سراغ لگانے بھیجا تھا۔ وہ خطروں سے ڈرے بغیر ہمت کر کے بڑھتا چلا گیا اور جب وہ اقلیم عشق میں پہنچا تو دیکھا کہ یہاں عجیب حال ہے۔ گرمی کا یہ عالم ہے کہ آگ ہوا ہے اور ہوا آگ ہے۔ زمین پتھر کی طرح سخت اور پتھر فولاد کی طرح مضبوط' یہاں سرسبزی بھی تھی لیکن کچھ اور ہی طرح کی، آنکھیں نرگس کا پھول بن گئیں تھیں۔ اور لالے خونِ جگر سے سیراب تھے۔ جب اقلیم عشق میں قلعہ سنگ سار کے پاس اس کا گذر ہوا تو رقیب کے سنگ سیرت سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ جب نظر نے خود رقیب کو دیکھا تو سہم گیا۔ ایک سنگ سیرت، سنگ صورت سا شخص' قوی ہیکل' دیو پیکر' طول' بے اصول' نا قبول' ہول' دیو غول' رقیب نے اسے سرزنش کی کہ اس علاقے سے گذرنے کی تجھے آخر ہمت کیسے ہوئی جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا لیکن نظر ایک عیار تھا اس نے رقیب کو رشوت میں بہت سا سونا دیا او راسے شہر دیدار اور باغ قامت تک پہنچا دیا گیا۔ باغ قامت کا سردار ایک بلند بالا' نازک اندام سا سردار تھا۔ اس نے رقیب دیو سیرت کو دیکھ کے پوچھا اے پلنگ قلعہ زور آزمائی، اے نہنگ قلزم ناآشنائی' آج تیرے ساتھ یہ بیگانہ اور اجنبی سا آدمی کون ہے اور یہ یہاں کیسے پہنچا۔ رقیب نے کہا کہ مجھے دارالکلب کی عام بیماری ہے اور یہ شخص میرا طبیب ہے۔ میں اسے ساتھ لیتا آیا۔ قامت ایک فریس تھا' اس نے مجلس آراستہ کی اور دیو سیرت رقیب کو اتنی شراب پلائی کہ وہ مدہوش ہو گیا۔ پھر اس نے نظر سے اس کا حال پوچھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کس کام کے لیے آیا ہے؟

اور جب قامت اور نظر کی کھل کر باتیں ہوئیں تو قامت نے نظر کو اپنا ہم راز بنا لیا۔ اسے باغ قامت کے عجائبات دکھائے۔ رخسار کے دو سرخ سرخ گلاب۔ ان پھولوں کے درمیان غنچہ دہن' موئے کمر' ابھی نظر باغ قامت کی سیر ہی کر رہا تھا زلف مشکبار شکار کھیلنے آئی' اس کے ساتھ سیکڑوں حبشی سوماؤں کی فوج تھی اور یہ کمند ڈال کے نظر کو گرفتار کر کے لے گئی اور نظر نے بھی اس قید سے گلشن رخسار کا نظارہ کیا۔ گلشن رخسار میں اس نے اور بہت سے عجائبات دیکھے اور وہ مبہوت سا ہو گیا۔

نظر کا ایک بھائی تھا۔ ایک یوسف گم شدہ جو ترکستان اور خاور کی سرحد پر رہا کرتا تھا۔ نظر اس کے حال سے آگاہ نہیں تھا۔ اس کا نام غمزہ تھا اور یہ شہزادی حسن کے دربار میں ایک بڑا ذی اثر افسر تھا۔ غمزہ نے شہزادی حسن کے حکم کی بنا پر نظر کو قید کر لیا اور قریب تھا کہ تلوار کے ایک وار سے اس کا سر قلم کر دے کہ اس نے دفعتاً اس مہرہ کو دیکھ لیا جو نظر کے بازو پر بندھا ہوا تھا اور پہچان لیا کہ نظر جسے وہ قتل کرنا چاہتا تھا اس کا اپنا بھائی ہے۔ تلوار پھینک کے وہ اس سے بغل گیر ہو گیا۔

جب حسن کو یہ معلوم ہوا تو اس نے غمزے کو حکم دیا کہ نظر کو اپنے ساتھ گلزار رخسار میں لائے۔ جب خانۂ گلزار حسن کی نظر نے سیر کی تو اسے طرح طرح کے حسین نظر آئے۔ بتان چین و خطاء سمرقند کے شکر یں دہن' خوارزم کے بلا چشم' عراق کے نگار' اصفہان کے سیہ چشم' شیرز کے تنگ دہن' گلہائے تبریز' لیمحان عرب' شکرریزان مصر' منظر کثرت نظارہ اور شدت جمال سے مبہوت تھا کہ حسن نے اس سے سوال و جواب شروع کیے۔ حسن نے پوچھا ستارہ کا مقصود کیا ہے؟ نظر نے جواب دیا اس کی صنعت کاری کا نظارہ کرنا۔ حسن نے پوچھا کہ چشم بینا کس لیے بنی ہے؟ نظر نے کہا رخسار زیبا کے مشاہدے کے لیے۔ اور اسی طرح کے سوال و جواب میں نظر نے اپنے شاہزادے دل کا ذکر کیا۔ حُسن نے اپنا دِل اُسے دکھایا جو ایک گوہر سنگین تھ۔ اس کے مقابلے میں جب نظر نے شاہزادۂ دِل کا ذکر کیا، جس کا دِل دِل عادل اور دل عاشق تھا تو حسن اس کی گرویدہ ہو گئی۔

اب عشق کی آگ دونوں طرف لگی ہوئی تھی۔ حسن کا ایک پری تمثال غلام تھا' جس کا نام تھا خیال۔ خیال کو حسن نے نظر کے ساتھ ملک بدن بھیجا اور حسن نے نظر کو ایک طلسمی انگوٹھی دی کہ وہ اسے دل تک پہنچائے۔ اس طلسمی انگشتری کی خصوصیت یہ تھی کہ جو اسے منہ میں رکھ لیتا وہ خود تو سب کی نظروں سے روپوش ہو جاتا مگر خود سب کو دیکھ سکتا۔ اس انگشتری کی مدد سے مملکت عشق کے

[illegible]
اور اپنی باتوں سے ناموس کو قلندر بنا دیا۔ یہ ناموس عقل کی مملکت میں ایک بڑا سردار تھا۔

لیکن توبہ کے سامنے نظر اور غمزے کی ایک نہیں چلی۔ یہ توبہ بڑا سخت جان سردار تھا۔ یہ غمزے کا نشان چھین کے شہنشاہ عقل کے سامنے لے گیا اور عقل نے اپنے بیٹے دل کو سمجھایا۔ دل کو قائل کر دیا۔ اور دل ایک لشکر جرار لے کر اس ارادے سے روانہ ہوا کہ شہر دیدار کو مسخر کر لے لیکن اب غمزے نے ایک نئی چال چلی۔ آہو کا بھیس بدل کے اپنے ساتھ بہت سے آہوان ختن کو شریک کر لیا اور دل شکار کے شوق میں ان آہوؤں کے تعاقب میں روانہ ہوا اور اس طرح اپنے لشکر سے بچھڑ گیا۔ اب شہنشاہ عقل نے خود ایک بڑے لشکر کے ساتھ شہر دیدار کی تسخیر کا ارادہ کیا اور شہر دیدار کے قریب پہنچ گیا۔ اپنے شہر کو عقل کی زد میں پا کے شہزادی حسن نے اپنے باپ شہنشاہ عشق سے مدد مانگی۔ اور عشق خونخوار کا مہیب لشکر دل کے لشکر کے مقابلے میں روانہ ہوا۔ زلف سرکش نے دل کی فوج پر شب خون مارا۔ ابروؤں نے کمان کڑی کی مژگاں نے تیر چلا لیا اور بالآخر خیال نے دل کو قید کر لیا۔ جب دل گرفتار ہو گیا تو عقل اور دل کی سپاہ کے قدم اکھڑ گئے۔ ادھر حسن نے دل کو گرفتار کر کے چاہ زندان میں قید کر دیا۔

شہزادی حسن اپنے گرفتار یعنی شہزادہ دل کی محبت میں گرفتار تھی۔ اس کی ایک سہیلی تھی وفا۔ اس کے ساتھ وہ گلزار کی سیر کو نکلی اور یہی وفا دل کو چاہ ذقن کی قید سے باغ آشنائی میں لے آئی۔ ادھر نظر آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور شہزادی حسن سے اس نے شہزادہ دل کی سفارش کی حسن نے وفا سے مشورہ کیا۔ وفا تو یہ چاہتی تھی کہ حسن اور دل ایک دوسرے کے ہو جائیں لیکن ناز کا مشورہ تھا ''خویش را مفرش ارزاں'' ناز اور وفا میں بحث ہوتی رہی۔ بالاخر حسن نے خود ایک حل سوچا حسن نے دل کو تبسم سے بے خود بے ہوش کر دیا اور پھر اپنے پہلو میں جگہ دی۔

لیکن یہ وصال عارضی تھا۔ ابھی تک چشمۂ آب حیواں نگاہوں سے دور تھا۔ اسی عالم میں دل پر ایک مصیبت پڑی۔ رقیب کی ایک بڑی ہی مکروہ صورت، مکروہ سیرت بیٹی تھی جس کا نام غیر تھا۔ وہ بھی دل پہ عاشق تھی اور حسن سے جلتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ایسی ساحرہ تھی جسے سحر سے صورت بدلنے میں کمال حاصل تھا غیر نے ایک دن حسن کی صورت بنائی اور دل کو پھانسنے کی کوشش کی۔ اس کی اطلاع خیال نے حسن کو دی۔ اب حسن کے جلال کا عالم ہی اور تھا۔ دل نے غیر کے پہلو میں بیٹھ کر اس سے بے وفائی کی تھی۔ دل کو پھر قید کر دیا گیا۔ اس مرتبہ چاہ ذقن میں نہیں بلکہ وادی عتاب میں۔ ادھر غیر جو فطرتاً بدنہاد تھی۔ دل کے بھی درپے تھی۔ اس نے اپنے باپ رقیب سے دل کی شکایت کی اور رقیب نے دل اور اس کے رفیق نظر دونوں کو قلعہ ہجران میں قید کر دیا جو بیابان فراق میں واقع ہے۔

... یہ چشمہ آب حیات یہ چشمہ آب حیواں۔ یہ کیسا عجیب چشمہ ہے کہ اس میں زندگی کھو بھی جاتی ہے مگر اس سے
سیراب بھی ہوتی ہے۔ کبھی یہ سراب معلوم ہوتا ہے کبھی نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے کبھی اس کے کنارے سدابہار جوانی کا پود
کھوجاتا ہے۔ اسی کنویں میں یوسف کو قید کی سزا ملتی ہے۔ اسی آئینے میں فارسی سس اپنا عکس دیکھ دیکھ کے ہلاک ہوجاتا ہے لیکن
اسی سے زندگی ابلتی ہے اور زندگی کے دریا چاروں طرف جاتے ہیں۔ چاروں طرف امڈتے ہیں۔ اسی سے ابر اٹھتے ہیں اور
چاروں کھونٹ زندگی کا مینہ برساتے ہیں۔ گل گامش فنا ہوجاتا ہے۔ یوسف کا حسن ایک دن باقی نہیں رہتا۔ فارسی سس کا عکس
مٹ جاتا ہے اور صرف چمکدار سنگریزے باقی رہ جاتے ہیں لیکن انسان فنا نہیں ہوتا۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل۔ اسی چشمے کے
فیضان سے انسان زندہ ہے۔ سب سے مقابلہ کرنے کے لیے ---- سانپ سے ابلیس سے دیوتاؤں سے اور ---- اس
موذی سے جو اس کے اندر چھپا ہوا ہے۔

ooo

محمد حسن عسکری

حرام جادی

دروازے کی دھڑ دھڑ اور "کواڑ کھولو" کی مسلسل اور ضدی چیخیں اس کے دماغ میں اس طرح گونجیں جیسے گہرے تاریک کنویں میں ڈول کے گرنے کی طویل، کراہتی ہوئی آواز۔ اس کی پرخواب اور نیم رضا مند آنکھیں آہستہ آہستہ کھلیں، لیکن دوسرے لمحہ ہی منہ اندھیرے کے ہلکے ہلکے اجالے میں ملی ہوئی سرمہ جیسی سیاہی اس کے پپوٹوں میں بھرنے لگی اور وہ پھر بند ہو گئیں۔ آنکھوں کے پردے بوجھل کمبلوں کی طرح نیچے لٹک گئے اور ڈلوں کو دوبادبا کر سلانے لگے۔ لیکن کان آنکھوں کی ہم آہنگی چھوڑ کر بھنبنا رہے تھے، وہ اس سحر خیز حملہ آور کی تازہ یورش کے خلاف اپنے روزن بند کر لینا چاہتے تھے۔ اور پھر وہ بھی جھنجھنا رہے تھے۔

امید و بیم کی یہ کشمکش، جسے نیند شاید جلد ہی اپنے دھارے میں غرق کر لیتی، زیادہ دیر تک جاری نہ رہی۔ اب کے تو دروازے کی چولیں تک ہلی جا رہی تھیں اور آوازیں زیادہ بے صبر، بے تاب، کرخت اور بھرائے ہوئے گلے سے نکل رہی تھیں۔ "کھولو"...... "کھولو" یہ آوازیں پتلی، نوک دار تیلیوں کی طرح دماغ میں گھس کر نیند کے پردوں کو تار تار کئے دے رہی تھیں۔ وہ یہ بھی سن رہی تھی کہ پکارنے والا "کھولو"...... "کھولو" کے وقفوں کے درمیان آہستہ آہستہ سے ناخوشگوار ارادوں کا اظہار بھی کر دیتا ہے...... آخر اس نے آنکھیں پوری کھول ہی دیں، اور ہاتھوں کو چارپائی پر جھٹکتے ہوئے کہا "نصیبن، دیکھو تو کون ہے؟"

یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی، جب وہ اس قصبے میں مڈوائف ہو کر آئی تھی یہ سب کچھ روز ہوتا تھا...... یہی چیخیں، یہی دھڑ دھڑاہٹ، فرض اور آرام کی یہی تلخ کشمکش، یہی جھلاہٹ اور پسپائی...... سب اسی طرح۔ اسے صبح ہی اٹھ کر جانا پڑتا تھا اور پھر اس کا سارا دن نو واردوں کو احتجاجانہ چیختے چلاتے، ہاتھ پاؤں پھینکتے دنیا میں آتے ہوئے دیکھنے میں، کچھ دن کیا آئے ہوؤں کی رفتار ترقی کے معائنے میں، اور آمد و رفت کے اندراج کے لئے ٹاؤن ایریا کے دفتر تک بار بار دوڑنے میں گذرتا تھا۔ اسے دوپہر کا کھانا کھانے اور آرام کرنے کا وقت بھی ہزار کھینچ تان کے بعد ملتا تھا اور وہ بھی یقینی نہ تھا کیونکہ بچے پیدا ہونے میں موقع و محل کا مطلق لحاظ نہیں کرتے تھے۔ صبح چار بجے، دوپہر کے بارہ بجے، رات کے دو بجے...... ہر گھڑی اسے کوندا کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا، اور بچے تھے کہ ایسی تیزی سے چلے آ رہے تھے جیسے پہاڑی سے ندی میں لڑھکتے ہوئے پتھر۔ ضبط تولید کے چرچے دولت نگر کو شہر سے ملانی والی پکی اور گڑھوں والی سڑک کو طے نہ کر سکے تھے اور اگر بفرض محال وہ رینگتے ہوئے وہاں تک پہنچ بھی جاتے تو یہ یقینی بات تھی کہ قصبے والے انہیں ذرا بھی قابل اعتنا نہ سمجھتے، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بچے خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں، اس میں انسان کا کیا دخل۔ ۱۸ سالہ لڑکے، ۵۶ سالہ بڈھے...... لڑکیاں، ادھیڑ عورتیں، سب کے سب حیرت انگیز تندہی اور یکجہتی کے ساتھ سڑکوں کی نالیوں میں کھیلنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ کئے چلے جا رہے تھے، گویا وہ قومی دفاع کی خاطر کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور ہیں اور پھر وہ بیچارے کرتے بھی کیا، وہ تو خدا کے حکم سے بے بس تھے۔ غرضیکہ بچے، دبلے، پتلے، ہڈیوں کا ڈھانچہ یا بعض موٹے تازے بچے، مڑے ہوئے بالوں والے، چپٹی ناک والے، چھچھوندر کی طرح گلگلے، لکڑی جیسے سخت، ہر رنگ اور ہر قسم کے بچے۔

ایملی نے اپنی دادی سے سنا تھا کہ ان کے بچپن میں ایک مرتبہ پاؤ پاؤ بھر کے مینڈک برسے تھا۔ وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی...... اور اس وقت اسے بے ساختہ ہنسی بھی آ جاتی تھی کہ یہ بچے وہی برسنے والے مینڈک ہیں...... پاؤ پاؤ بھر کے زرد زرد مینڈک، اور اسے ان ہی زرد مینڈکوں کی بارش کے ہر قطرے کو برستے ہوئے دیکھنے کے لئے قصبے کی ٹوٹی پھوٹی روڑوں کی سڑکوں، تنگ تاریک، سیلی ہوئی گلیوں، گرد و غبار، کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں، بھونکتے ہوئے لال پیلے کتوں اور کسانوں کی گاڑیوں اور گھاس والیوں سے ٹھسے ہوئے بازاروں میں سارا سارا دن گھومنا پڑتا تھا۔ پتلی پتلی سڑکوں پر دونوں طرف ریت کا

... کی طرح
... کر سڑک پر پھیلا دیتے تھے جن سے اپنی
... پہلے فیروزی سینڈل کے بجائے اونچی ایڑی والا کالا جوتا پہننا پڑتا تھا۔ گو اس صورت
میں سڑک کے ابھرے ہوئے لاتعداد کنکر اس کے پیروں کو ڈگمگا دیتے تھے۔ راستے میں گلی ڈنڈا کھیلنے والے لونڈوں کا لاابالی پن
اس کے کپڑوں پر ہر دفعہ اپنا نشان چھوڑ جاتا تھا۔ مگر خیر یہ شکر تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی آنکھیں اور دانستہ سلامت لے آتی تھی اور یہاں
کی گرمی سے اسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یقیناً پسینوں میں گھل گھل کر ختم ہو جائے گی۔ ان تنگ سڑکوں پر بھی سورج اس تیزی سے چمکتا
تھا کہ اس کے بدن پر چنگاریاں ناچنے لگتیں اور اس کی نیلے پھولوں والی چھتری محض ایک بوجھ بن جاتی۔ جب وہ اپنی اونچی
ایڑیوں پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی دھوپ میں جلتی بھنتی، سڑکوں سے گزرتی تو اسے دوآلہا گانے کی آواز، ڈھول کی کھٹ کھٹ اور درختوں
کے نیچے تاش کی پارٹیوں کے بلند اور کرخت قہقہے، دوپہر کی نیند حرام کر دینے والی بوجھل مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح بیزار کن اور
پر استہزا معلوم ہوتے، اور وہ چار مہینے پہلے چھوڑے ہوئے شہر کا خیال کرنے لگتی۔ مگر شہر اس وقت خوابوں کی وہ سرزمین بن جاتا
جسے صبح اٹھ کر ہزار کوششوں کے باوجود یاد نہیں کیا جا سکتا اور جس کی لطافت کا یقین دن بھر دل کو بے چین کیے رکھتا تھا۔ اسے کچھ
روشنی سی معلوم ہوتی...... ایک چمک، ایک کشادگی، ایک پہنائی...... کچھ ہریالی اس کے سامنے تیرتی...... اور پھر وہ، اس تپتی ہوئی
کنکروں، نالیوں اور ریت والی سڑک پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی، چل رہی ہوتی۔ بجلی کے پنکھے والے کمرے کا تصور تک اس تپش اور
سوزش کو کم کرنے میں اس کی مدد نہ کرتا تھا۔ لیکن ہاں، جب کبھی وہ خوش قسمتی سے رات کو فارغ ہوتی اور اسے اپنے بستر پر کچھ دیر
جاگنے کا موقع مل جاتا تو اس وقت شہر کی زندگی کی تصویریں، سینما کے پردے کی پوری طرح روشنی اور صفائی کے ساتھ اس کی
نظروں کے سامنے گزرنے لگتیں، اور وہ جس تصویر کو جتنا دیر دیکھنا چاہتی ٹھہرا لیتی لیکن جب وہ ان تصویروں سے لطف اٹھانے
کے درمیان، ان مناظر کو یاد کرتی جن سے اسے بروقت دوچار ہونا پڑتا تھا، تو اس کی خستگی اور بیزاری آہستہ آہستہ عود کر آتی۔ گھر کی
دیواریں مع رات کی تاریکیوں کے اس پر جھک پڑتیں، دل بجھنے لگتا، سانس گرم اور دشوار ہو جاتا، اور اس کے سر گھنی کھا کھا کر نیند
کی بیہوشی میں غرق ہو جاتا اور وہ خواب میں دیکھتی کہ وہ پھر اُسی پرانے شہر کے اسپتال میں پہنچ گئی ہے، مگر ان در و دیوار سے بجائے
رفاقت کے کچھ بیگانگی سی ٹپکتی ہے اور خود اس کے اعضاء منجمد اور ناقابل حرکت ہو گئے ہیں اور کوئی نامعلوم خوف اس کے دل پر مسلط
ہے۔ وہ صبح تک یہی خواب تین چار مرتبہ دیکھتی اور دراصل اس کے لئے ان زندگیوں کا تقابل ہونا بھی چاہئے تھا ایسے ہی اثرات
کرنے والا۔ مانا کہ شہر میں بھی ایسی ہی سیلی ہوئی گلیاں، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، گرد و غبار، شریر لڑکے موجود تھے اور وہ ان کے وجود
سے بے خبر بھی نہ تھی لیکن وہ ہوا کی چڑیوں کی طرح ان سب سے بے پروا اور مطمئن، تانگے کے گدوں پر جھولتی ہوئی ان اطراف
سے کبھی دسویں پندرہویں نکل جایا کرتی تھی، اس کی دنیا تو ان علاقوں سے دور ضلع کے صدر اسپتال میں تھی۔ کتنی کھلی ہوئی جگہ تھی
وہ اور وہاں کی ہوا کا لطف تو وہ ساری عمر نہ بھول سکے گی۔ اسپتال کے سامنے تارکول کی چوڑی سڑک تھی جس پر دن میں دو مرتبہ
جھاڑو دی جاتی تھی اور جو ہمیشہ شیشے کی طرح چمکا کرتی تھی۔ جب وہ شام کو اپنی سہیلی ڈینا کے ساتھ اس پر ٹہلنے کے لئے نکلتی تھی تو
دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور میدانوں پر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چہرے اور آنکھوں پر لگ لگ کر دماغ کو ہلکا کر
دیتے تھے۔ اس کی ساڑھی پھڑ پھڑانے لگتی، ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ تیرتی اور اس کی رفتار سبک اور تیز ہو جاتی۔ ایسے وقت
باتیں کرنا کتنا خوشگوار اور پرلطف ہوتا تھا۔ گرد و غبار کا تو یہاں نام بھی نہ تھا۔ مئی جون کے جھکڑ بھی اسپتال کی سفید اور شیشوں والی
عمارتوں پر سنسناتے ہوئے شہر کی طرف گزرتے چلے جاتے تھے۔ اور بجلی کے پنکھے سے سرد رہنے والے کمرے میں دوپہر کی سختی
اور اداسی اپنا سایہ تک نہ ڈال سکتی تھی۔ جب وہ پروقار انداز سے ساڑھی کا پلہ سنبھالے گزرتی تھی تو اسپتال کے نوکر چاروں طرف
سے اسے "میم صاحب، میم صاحب" کہہ کر سلام کرنے لگتے تھے۔ گو یہاں بھی اسے سب لوگ میم صاحب ہی کہتے تھے۔
سڑکوں پر جھاڑو دینے والی بھنگی اسے آتے دیکھ کر تھم جاتے تھے، بلکہ قصبے کے زمیندار تک اسے "آپ" سے مخاطب کرتے تھے۔
پھر بھی یہاں وہ بات کہاں حاصل ہو سکتی تھی، وہ رعب، وہ دبدبہ، وہ مالکانہ احساس، وہاں تو اس کی شخصیت اسپتال کا ایک جزو

لائینک تھی۔ اس سفید، سرد اور متین عمارت اور اس کے غیر مرئی اور اٹل قانونوں اور اصولوں کا ایک زندہ مجسمہ۔ اسپتال کے نشتر کے سامنے آنے کے بعد کوئی شخص احتجاجاً جنبش نہیں کر سکتا تھا، اسی طرح کے حدود میں داخل ہونے والی ہر چیز کو اس کی مرضی کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ جب اس کا مریضوں کے معائنے کا وقت آتا تھا تو وارڈ میں پہلے سے تیاریاں ہونے لگتی تھیں، وہ دو روپے روزانہ کرایہ دینے والیوں تک کو جھڑک دیتی تھی کیونکہ اسے اپنے صاف کمروں میں پان کی پیک تک دیکھنا گوارا نہ تھا۔ وہ بڑی بڑی نازک مزاجوں کو ذرا سی بے احتیاطی اور ہدایات کی خلاف ورزی پر بے طرح ڈانٹتی تھی اور ہمیشہ سب سے تم کہہ کر بولتی تھی۔ مگر یہاں کی عورتیں تو بہت ہی منہ پھٹ تھیں۔ وہ اس سے ہراساں اور خوفزدہ تو ضرور تھیں مگر اسے دو بدو جواب دینے سے نہ چوکتی تھیں۔ تھوڑے دن تک ان پر اپنا اختیار جمانے کی کوشش کرنے کے بعد اب وہ تھک چکی تھی اور ان کی باتوں میں زیادہ دخل نہ دیتی تھی۔ اور صفائی اور سلیقہ کی تو ان عورتوں کو ہوا تک نہ لگی تھی۔ زچہ کو گرمی میں بھی فوراً ایک کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا جس میں جاڑوں کے لحاف، بچھونے، چاول اور دوسری جنسوں کے مٹکے۔ ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، برتن، کوئلوں کا گھڑا، سوت اور روئی کی گٹھڑیاں، سب الم غلم بھرے ہوتے تھے اور ایک انگیٹھی پر گھٹی چڑھا دی جاتی تھی۔ بعض بعض جگہ تو جلدی جلدی کمرے میں گوبری ہونے لگتی تھی جو پیروں سے اکھڑ اکھڑ کر فرش کو چلنے کے قابل بھی نہ رہنے دیتی تھی اور جس کی سیلن انگیٹھی کی گرمی سے مل کر سانس لینا دشوار کر دیتی تھی۔ گھر کی سب عورتیں......اور وہ کم سے کم چار ہوتی تھیں......اپنے بدبودار کپڑوں سمیت کمرے میں گھس آتی تھیں اور گھبراہٹ میں سارے سامان کو ایسا الٹ پلٹ کر دیتی تھیں کہ ذرا سی کترن تک نہ ملتی تھی۔ اندر کی کھسر پسر، گھڑ بڑ، کراہوں ''یا اللہ، یا اللہ'' اور عورتوں کے بار بار کواڑ کھول کر اندر باہر آنے جانے سے گھر کے بچے جاگ جاتے تھے اور اپنے آپ کو اس کے قریب نہ پا کر چن چنانا شروع کر دیتے تھے اور ان کی بڑی بہنیں چکار چکار کر اور تھپک تھپک کر انہیں بہلانے کی کوشش کرتی تھیں۔ ارے چپ، چپ......دیکھ بھیا آیا ہے......صبح کو دیکھو......منا سا بھیا۔'' مگر صبح کو منا سا بھیا دیکھ سکنے کی امید انہیں اس وقت کوئی تسکین نہ دے سکتی اور ان کی روں روں، دہاڑوں کی شکل میں بلند ہو کر کمرے کے خلفشار میں اضافہ کر دیتی۔

یہ تو خیر جو کچھ تھا سو تھا، کثیف بستروں، لیپ چڑھے ہوئے تکیوں، پسینے میں سڑے ہوئے کپڑوں، اور مدتوں سے نہ دھلے ہوئے بالوں کی بدبو سے، جسے گرمی اور بھی دو آتشہ کر دیتی تھی، اس کا جی الٹنے لگتا تھا، وہ تمام وقت ہر چیز سے دامن بچاتی ہوئی کھڑی کھڑی پھرتی تھی۔ اس کمرے میں ایک گھنٹہ گزارنا گویا جہنم کے عذابوں کے لئے تیاری کرنا تھا۔ یہ مانا کہ خود اسے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ قصبے کی عورتیں اپنے آپ کو نئے نئے انگریزی تجربوں کے لئے پیش کرنے اور اپنے آپ کو اجنبی اور عیسائی مڈوائف کے اَن دیکھے اور مشتبہ آلات سے مسلح، ہاتھوں میں دے دینے کے قطعاً تیار نہ تھیں، انہیں تو قصبے کی پرانی دائی اور پھوٹے ہوئے گھڑے کے ٹھیکروں پر ہی اعتقاد تھا۔ تاہم ان کے مردوں نے ٹاؤن ایریا سے ڈر کر انہیں اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ نئی عیسائی مڈوائف کی کمرے میں موجودگی برداشت کر لیں۔ اس طرح عملی حیثیت سے تو اس کا کام بالکل کم ہو گیا تھا لیکن آخر ذمہ داری تو اس کی ہی تھی، اور وہ ہی ٹاؤن ایریا کمیٹی کے سامنے ہر بھلائی برائی کے لئے جواب دہ تھی اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہواؤں سے لڑنا تھا۔ اکثر نوگرفتار لڑکیاں اتنی چیختی چلاتی اور ہاتھ پیر پھینکتی تھیں کہ انہیں قابو میں کرنا دوبھر ہو جاتا تھا یا پھر بعض ایسی سہم جاتی تھیں کہ وہ ڈر کے مارے ذرا سی حرکت تک نہ کرتی تھیں۔ تین تین چار چار بچوں کی مائیں تو اور بھی زیادہ آفت تھیں، وہ اپنے تجربوں کے سامنے اس ساڑھی پہن کر باہر گھومنے والی عیسائی عورت کی انوکھی ہدایتوں کو کوئی وقعت دینے پر تیار نہ تھیں۔ وہ اپنی آہوں کے درمیان بھی رک رک کر دائی کو مشورہ دینے لگتی تھیں، اور ایملی کو دانتوں سے ہونٹ چبا چبا کر خاموش رہ جانا پڑتا تھا اور دائی تو بھلا اس کی کہاں سننے والی تھی، اسے اپنی برتری اور مڈوائف کی نااہلیت کا یقین تو خیر تھا ہی، مگر اس کی موجودگی سے اپنی آمدنی پر اثر پڑتا دیکھ کر اس نے ایملی کی ہر بات کی تردید کرنا اپنا فرض بنا لیا تھا۔ گو ایملی نے اس کے طنزیہ جملوں کو پی جانے کی عادت ڈال لی تھی، لیکن اس کا دل کوئی پتھر کا تھوڑے ہی تھا، دائی کے طرزِ عمل کو دیکھ دیکھ کر دوسری عورتیں بھی دلیر ہو گئی تھیں، اس کی طرف توجہ کئے بغیر وہ پلنگ کو گھیر لیتی تھیں، اور وہ سب سے پیچھے چھوڑ دی جاتی تھی۔ اب اس کے لئے اس کے سوا کیا رہ جاتا تھا کہ وہ جھنجلا کر پیر پٹخے اور انہیں پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔

کر دیتیں اور کمر تو بالکل پتھر ہی بن کر رہ جاتی۔ وہ اپنے پرانے اسپتال کو یاد کرنا چاہتی [illegible]
سکتی...... کھڑکی کا کواڑ، مریضوں کی آہنی چارپائی کا پایہ، موٹر کے پہیے، نیم کے پیڑ کی چوٹی، پان میں سنے ہوئے کالے دانت اور
گھنی، سخت مونچھیں یہ سب باری باری بجلی کے کوندے کی طرح سامنے آتے اور آنکھ جھپکتے ہی غائب ہو جاتے، وہ کھڑکی کے کواڑ
میں ایک کمرہ جوڑنا چاہتی، مگر اس میں زیادہ سے زیادہ ایک چٹخنی کا اضافہ کر سکتی، بلکہ بعض اوقات آہنی چارپائی کا پایہ تو ایک کھونٹے
کی طرح اس کے دماغ میں گڑ جاتا اور کوشش کے باوجود بھی ٹس سے مس نہ ہوتا، نیم کی چوٹی کو کبھی تنا حاصل نہ ہو سکتا...... پھر نیم کی
ہری ہری چوٹی پر ایک ریت کے حاشیے والی نالی بہنے لگتی اور کھڑکی کے شیشے پر پان میں سنے ہوئے کالے دانت مسکراتے اور گھنے
سخت بالوں والی مونچھیں بیتابی سے ہلتیں...... مختلف شکلیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جاتیں اور دماغ کے ایک سرے
سے دوسرے سرے تک لڑتی، جھگڑتی، ٹکراتی، روندتی، دوڑتیں...... سیاہ آسمان پر روشن ان گنت تاروں کے گچھے کے گچھے بھنگوں
کی طرح آنکھوں میں گھس گھس کر ناچنے لگتے اور جلتی ہوئی آنکھیں کنپٹیوں کی خواب آور بھد بھد سے آہستہ آہستہ بند ہو
جاتیں...... سونے کے بعد تو ان شکلوں کے اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے جو باری باری آتے اور اس کے دماغ پر مسلط
ہو جانا چاہتے، اتنے ہی میں ایک دوسرا آ پہنچتا اور پہلے والے کو دھکے دے کر باہر نکال دیتا، ابھی یہ کشمکش ختم بھی نہ ہوتی کہ ایک
تیسرا آ دھمکتا۔ ان سب کی حریفانہ زور آزمائیاں اسے بار بار چونکا دیتیں اور وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ آنکھیں کھول دیتی...... پھر
آنکھوں میں تاروں کے گچھے کے گچھے بھرنے لگتے...... کہیں صبح کے قریب جا کر یہ شکلیں تھکتیں اور اپنی رزمگاہ سے رخصت
ہوتیں، ہلکی ہلکی ہوا بھی چلنا شروع ہو جاتی اور ایسی نیند میں بالکل بیہوش ہو جاتی...... مگر اس کی نیند پوری ہونے سے پہلے ''کواڑ
کھولو'' کی مسلسل اور ضدی چیخیں اس کے دماغ میں گونجتیں...... وہی چیخیں، وہی دھڑ دھڑاہٹ، فرض اور آرام کی وہی تلخ کشمکش،
وہی جھلاہٹ اور پسپائی۔

نصیبن باہر سے لوٹ آئی تھی۔ اسے شیخ صفدر علی کے یہاں بلایا گیا تھا اور پکارنے والے نے بار بار کہا تھا ''جلدی'' ......
بلایا ہے...... جلدی...... ہر ایک یہی کہتا ہوا آتا ہے...... جلدی۔ آخر وہ کیوں جلدی کرے؟ وہ نہ پہنچے گی تو کیا سب مرجائیں گے؟
اور پھر وہ کریں گے ہی کیا اسے بلا کر؟...... کہتی ہیں چڑیلیں ''اُسے کیا خاک آتا ہے''...... کیا خاک آتا ہے...... کچھ نہیں
آتا...... اچھا پھر؟ بیٹھیں اپنے گھر کون ان کی خوشامد کرنے جاتا ہے...... کچھ نہیں آتا!...... جیسے جیسے آلے اُس نے دیکھے ہیں ان
لوگوں کے تو خواب میں بھی نہ گزرے ہوں گے...... چمکدار، تیز، ہاتھی دانت کے دستے والے...... اور وہ ڈاکٹر کارٹ فیلڈ کے
لیکچر۔ وہ کیسے نقشے دکھا دکھا کر جسم کے حصوں کو سمجھاتی تھیں...... کچھ نہیں ہوتا...... ہونہ!

ایملی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پہلے تو اُس کا جی چاہا کہ کہلوا کہ وہ جلدی نہیں آ سکتی، وہ بالکل نہیں آئے گی۔ مگر پھر اُسے خیال آیا کہ یہ لوگ محض جاہل تو ہیں، ان کے بکنے سے اس کا بگڑتا کیا ہے، اور آخر ذمہ داری تو خود اُس کی ہے چنانچہ اس نے نصیبن سے کہا: "کہہ دو کہ چلو، میں آ رہی ہوں" مطمئن ہو کر اُس نے کروٹ لی، سر کو تکیہ پر ڈھیلا چھوڑ دیا، آنکھیں بند کر لیں، ایک بازو بستر کی ٹھنڈی چادر پر پھیلا دیا اور ہاتھ چہرے پر رکھ لیا۔ اس نے چاہا کہ دماغ کو بالکل خالی کر لے اور ساکت ہو جائے مگر اس کے دل کی کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ کانوں میں بج رہی تھی اور تھوڑی دیر بعد یکا یک ایک پتھر سا دماغ میں آ کر لگتا تھا......
"جلدی"...... جس سے اس کے ماتھے اور کنپٹیوں کی نسیں تن جاتی تھیں اور ٹوٹتی ہوئی معلوم ہونے لگتی تھیں...... اسے جلدی جانا تھا...... جلدی...... اور اسی بات کے تو وہ ٹاؤن ایریا کمیٹی سے تیس روپے ماہوار پاتی تھی...... جلدی جانا تھا...... لیکن آخر وہ فرض پر صحت کو تو نہیں قربان کو سکتی تھی، کل رات ہی اُسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ انسان ہی تو تھی نہ کہ مشین...... اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ اُس کے سر میں درد ہو رہا ہے، کمر بیٹھی جا رہی ہے، کندھے اور ٹانگیں بے جان ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اتنی جلدی اُٹھ جانا بہت مضر ہوگا، اور خصوصاً اس قصبے جیسی آب و ہوا میں جہاں اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ ابھی آخر مہینے میں اُسے چار دن بخار آ چکا تھا...... اور پھر وہ وہاں جا کر بنا ہی کیا لے گی، اُن لوگوں کو ایسی کیا خاص ضرورت ہے اُس کی...... تھوڑا سا اور سو لینا ہی بہتر ہوگا۔

وہ سو جاتی، مگر انگلیوں کے بیچ میں ہو کر صبح کی روشنی آ رہی تھی اور اُس کی آنکھوں کو بند نہ ہونے دیتی تھی۔ اُس نے ہاتھ آنکھوں پر کھسکا لیا، اور آنکھیں خوب بھینچ کر بند کر لیں۔ اب اُسے جھپکیاں آنا شروع ہو گئیں مگر ہر دفعہ "دودھ لو دودھ، ابے او کلمو ہے!" "اُٹھ ہٹھ! ابے پڑھنے نہ جانے کا؟" کی صداؤں اور نصیبن کے لکڑیاں توڑنے اور دیگچیاں اُٹھانے کی آوازوں سے وہ چونک پڑتی تھی۔ سونے کی کوشش کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا، سر میں درد ہونے لگا وار ماتھا جلنے لگا۔ وہ مایوس ہو کر سیدھی لیٹ گئی اور آنکھوں پر دونوں بازو رکھ لئے، اب اس کے اعضاء اور بھی زیادہ بوجھل اور نا قابل حرکت ہوئے اور وہ ان صداؤں، آوازوں ان تحکمانہ طلبیوں...... "جلدی بلایا ہے"...... اس صبح کے چاند نے، اس پر دانت پیسنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی ایسی چادر اوڑھ لے جو اس کو ان صداؤں، آوازوں، ان تحکمانہ طلبیوں "جلدی بلایا ہے۔" اس صبح کے چاند نے غرض ان سب سے چھپا لے، جس کے نیچے ان میں سے کسی کی بھی پہنچ نہ ہو، جہاں وہ ان سب سے...... اپنے آپ سے غافل ہو جائے...... اپنے کو کھو دے...... اسے محسوس ہوا کہ دو مضبوط اور مدت کے آشنا...... اس کے جسم کا حلقہ کئے بھینچ رہے ہیں...... سر کے درد کو گویا کسی نے یکا یک پکڑ لیا...... دو آنکھیں ذرا کچھ دور چمکیں، مسکراتی ہوئی معلوم ہوئیں اور اس نے اپنے آپ کو ان بازوؤں کی گرفت میں چھوڑ دیا...... جسم ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا تھا، سر ہلکے ہلکے جھکولے کھاتا موجوں پر بہا چلا جا رہا تھا، سکون تھا، خاموشی تھی، اور صرف دل کے مسرت سے دھڑ کنے کی آواز آ رہی تھی...... دو بازو اس کے جسم کو بھینچ رہے تھے...... دو مضبوط اور مدت کے آشنا بازو۔
اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ صبح کے چاند میں چمک آ گئی تھی۔ نصیبن نے چولہے کی دیگچی رکھی، بکری والا محلے سے جانے کے لئے بکریاں جمع کر رہا تھا اور کنویں کی گراری زور زور سے چل رہی تھی۔ اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور ہوا میں کسی چیز کو تلاش کرنے لگی...... دو بادامی سائے اترنے لگے، آنکھوں کے پردے...... اور پلکیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے مل گئیں گویا وہ ان سایوں کو پھنسانا چاہتی ہیں...... سائے کچھ دور پر رک گئے۔ وہ ڈگمگائے، اور دھندلے ہوتے ہوتے ہوا میں تحلیل ہو گئے...... آنکھیں صبح کے بے رنگ آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی گردن ڈھلک گئی اور بازو دونوں طرف گر پڑے...... وہ مدت کے آشنا بازو...... وہ یہاں کہاں۔
چند لمحے بے حس پڑے رہنے کے بعد وہ ولیمن کو یاد کرنے لگی۔ لمبے لمبے الٹے ہوئے بال، چوڑا سینہ، سرخ دوڑوں والی جلد، جلد پھرتی ہوئی آنکھیں، موٹا سانچلا ہونٹ، کان کی لو تک کٹی ہوئی قلمیں، سانولے رنگ پر منڈی ہوئی ڈاڑھی، گہرا نشان، آنکھوں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈیاں، اور مضبوط بازو...... دن میں کتنی کتنی مرتبہ اس کے بازوا سے بھینچتے تھے، اور ان کے درمیان وہ بالکل بے بس ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ تو جھنجھلا پڑتی تھی، مگر اس کے جواب میں اس کا پیار اور بڑھ جاتا تھا۔ اور اس کے دونوں

گالوں پر وہ گرم اور نم آلود بوسے...... اور دن میں کتنی کتنی مرتبہ...... اس کے منہ سے شراب کی تیز بدبو ضرور آتی تھی، مگر وہ کتنے جوش سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھالیتا تھا، اور پاگلوں کی طرح اس کے چہرے، ہاتھوں، گردن، سینے سب پر بوسے دے ڈالتا تھا اور پھر قہقہے مار مار کر ہنستا تھا...... "میری جان...... ہاہاہاہا...... اے مائی لو...... ڈی یر...... پیاری...... ہاہاہاہا......" اور وہ اس کی کیسی نگہداشت کرتا تھا۔ وہ اس سے اپنے بازوؤں میں پوچھتا۔ "اس مہینے میں کیسی ساڑھی لوگی، میری جان؟...... ہیں؟...... اس سینے پر تو سرخ کھلے گی! ہو، کیسی رہی! ہاہاہاہا......" اور وہ اسے دوپہر میں تو کبھی نہ نکلنے دیتا تھا۔ اگر اسے ایسے وقت اسپتال سے بلایا جاتا تو وہ کہلوا دیتا کہ مسز ولیمسن سو رہی ہیں...... وہ اس کے اٹھنے سے پہلے چائے تیار کرا کے اپنے آپ اس کے قریب میز پر لا رکھتا تھا...... اور وہ اسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا...... مگر وہ یہاں کہاں! اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا، وہ یہاں ہوتا تو وہ خود کہیں نہ جاتی۔ وہ تو ایسے کواڑ پیٹ پیٹ کر جگانے والے کا سر توڑ دیتا...... لیکن وہ یہاں ہوتا...... وہ اس کے پاس ہوتا تو وہ خود یہاں کیوں ہوتی۔

لیکن...... کچھ دوسری شکلیں ابھریں...... اچھا ہی ہے کہ وہ اس کے پاس نہیں ہے...... اس کے بال الجھے ہوئے اور پریشان تھے اور وہ اس طرح دانتوں سے ہونٹ چبا رہا تھا گویا ان کا قیمہ کر کے رکھ دے گا...... اور اس نے اسے کیسی بے رحمی سے بیت سے پیٹا تھا، اور لے گی...... بڑی بن کے آئی ہے وہ وہاں سے......" اگر میم صاحب شور سن کر نہ آجاتیں تو نہ معلوم وہ ابھی اور کتنا مارتا...... ایملی اپنے بازوؤں پر نشان ڈھونڈنے لگی۔ ایسے ظالم سے چھٹکارا ہی اچھا، کیسی خونی آنکھیں تھیں۔ اور آخر میں وہ شراب کتنی پینے لگا تھا...... مگر وہ ہوتا تو اسے سویرے کہیں نہ جانے دیتا...... مانا کہ وہ روزا کے ساتھ رات کو بڑی دیر تک ٹہلتا رہتا تھا لیکن ظاہراً تو اس کے ساتھ اس کا برتاؤ ویسا ہی رہا تھا۔ اگر وہ خود اتنا نہ بگڑتی، اور اسے ہر وقت اٹھتے بیٹھتے طعنے نہ دیتی تو شاید بات یہاں تک نہ پہنچتی...... وہ اسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا...... لیکن وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ وہ روزا کے ساتھ پھرا کرے......

روزا...... کالا تو اسی منہ پر ہڈیاں نکلی ہوئی، سوکھی جیسے لکڑی ہو...... اور فراک پہننے کا شوق تھا آپ کو بڑی میم صاحب بنتی تھیں۔ چار حرف انگریزی کے آگئے تھے تو زمین پر قدم نہ رکھتی تھی۔ مارے شیخی کے...... نہ معلوم ایسی کیا چیز لگی ہوئی تھی اس میں جو اس پر ایسا لٹو ہو گیا تھا...... اس نے خواہ مخواہ فکر کی۔ وہ خود اسے تھک کر چھوڑ دیتا...... وہ اسے تھوڑے دنوں یوں ہی چلنے دیتی تو کیا تھا...... مگر اس نے کیسی بے رحمی سے اسے مارا تھا...... ہاں...... ایک دفعہ مار ہی لیا، تو کیا ہو گیا...... وہ خود بھی تو شرمندہ معلوم ہوتا تھا اور اس کے سامنے نہ آتا تھا...... اور اگر ڈینا اسے اتنا نہ بہکاتی تو وہ شاید طلاق بھی نہ لیتی۔ بس وہ اپنا ذرا مزا لینے کو اسے اکساتی رہی......

یہ اچھی دوستی ہے...... اب وہ ڈینا سے نہیں بولے گی۔ اگر وہ ملے گی بھی تو وہ منہ پھیر کر دوسری طرف چل دے گی اور جو ڈینا خود اس سے بولی تو وہ صاف کہہ دے گی کہ وہ دھوکا دینے والوں سے نہیں بولنا چاہتی......" ڈینا بگڑ جائے گی تو بگڑا کرے، اب تو وہ شہر کے اسپتال سے چلی ہی آئی۔ اب کوئی روز کا کام کاج تو ہے نہیں کہ بولنا ہی پڑے......

وہ اسی طرح ڈینا کی مکاری پر پیچ و تاب کھاتی رہتی، اگر نصیبن اسے نہ پکارتی "اجی میم صاحب! اٹھو، سورج نکل آیا۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، اور چاروں طرف دیکھا، اب تو واقعی اسے چلنا چاہئے، مگر پھر بھی پلنگ سے نیچے اترنے سے پہلے اس نے کئی مرتبہ انگڑائیاں لیں اور تکیے پر سر رگڑا۔

وہ منہ دھو دھا کر چائے کے انتظار میں پھر بستر پر آ بیٹھی...... نصیبن لکڑیوں کو چولہے میں ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔ وہ منسیا پن کہہ رہی تھیں کہ تمہاری میم صاحب تو عید کا چاند ہو گئیں۔ کبھی آ کے بھی نہیں جھانکتیں...... اجی ہو ہی آؤ ان کی طرف میم صاحب کسی دن، بڑا یاد کریں ہیں تمہیں۔"

ہو ہی آئے ان کی طرف...... کیا کرے وہ جا کر؟ میلے کچیلے پلنگوں پر بیٹھنا پڑتا ہے، ٹوٹے ناٹے...... یہاں کی عورتوں سے وہ کیا باتیں کرے؟ بس انہیں تو یہ قصے سنائے جاؤ کہ اس کے بچہ مرا ہوا پیدا ہوا، اس کو اتنی تکلیف ہوئی، اس کو ایسی بیماری تھی، وہ کہاں تک لائے ایسے قصے انہیں سنانے کو۔ اور کوئی بات تو جیسے آتی ہی نہیں انہیں...... اور پھر یہ لوگ کتنی بدتمیز ہیں۔ سڑے ہوئے کپڑے لے کر سر پہ چڑھی جاتی ہیں...... اسے ان لوگوں کے ہاتھ کا پان کھاتے ہوئے کتنی گھن آتی ہے، مگر مجبوراً کھانا ہی پڑتا

ہے...... جب وہ اس سے باتیں کرتی ہیں تو ہلکے ہلکے مسکراتی جاتی ہیں جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہوں...... اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو...... گھور گھور کو دیکھتی جاتی ہیں گویا وہ چور ہے، اور ان کی آنکھ بچتے ہی کوئی چیز اڑا دے گی...... یہ اس سے سب عورتیں جھجکتی کیوں ہیں؟ کیا وہ ان کی طرح عورت نہیں ہے؟ یا وہ کوئی ہوا ہے......؟ عجب بیوقوف ہیں یہ عورتیں بھی...... اور ہاں جب وہ ان کے ہاں جاتی ہے تو ان کے اشارے سے جوان لڑکیاں جلدی جلدی بھاگ کر کمرے میں چھپ جاتی ہیں، وہ اندر سے جھانک جھانک کر اسے دیکھتی ہیں، اور اگر کہیں اس کی نظر پڑ جائے تو فوراً ہٹ جاتی ہیں اور اندر سے ہنسنے کی آواز آتی ہے، اور اگر انہیں اس کے سامنے آنا ہی پڑ جائے تو وہ بدن چراتی ہوئی اوپر سے نیچے تک خوب دوپٹہ تانے ہوئے آتی ہیں، جیسے اس کی نظر جان میں سے کچھ چھنا لے گی یا اس کی نظر پڑ جانے سے ان میں کوئی گندگی لگ جائے گی...... ان کی یہ حرکت اسے بالکل ناپسند ہے۔ کیا انہیں اس پر اعتماد نہیں، اور وہ اس پر شک کرتی ہیں......؟ اس سے تو ان کے ہاں نہ جانا ہی اچھا۔ بیٹھیں اپنی لڑکیوں کو لے کے اپنے گھر میں...... اور وہ گندے بچے، مٹی میں سنے، ناک بہتی، آدھے ننگے، پیٹ نکلا ہوا، وہ سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اسے ایسے غور سے دیکھتے رہتے ہیں جیسے وہ کوئی نیا پکڑا ہوا عجیب وغریب جانور ہے...... اور جب وہ ان سے بولتی ہے تو وہ سیدھے باہر بھاگ جاتے ہیں...... وحشی ہیں بالکل، جانور...... بالکل...... اور یہ خوب ہے کہ اس کے پہنچتے ہی ان کے ہاں جھاڑو شروع ہو جاتی ہے۔ مارے گرد کے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذرا خیال نہیں تندرستی کا انہیں۔ اور کوئی کیوں ان کے یہاں جا کر بیماری مول لے...... اور ان کے مرد، کتنی شرم آتی ہے اسے ان کی حرکتوں سے، وہ ہمیشہ ڈیوڑھی میں راستہ گھیرے بیٹھے رہتے ہیں، اور جب تک وہ بالکل قریب نہ پہنچ جائے نہیں ہٹتے...... ''ارے حقہ ہٹاؤ، حقہ ہٹاؤ'' اٹھتے اٹھتے ہی اتنی دیر لگا دیتے ہیں کہ وہ گھبرا جاتی ہے...... جان کے کرتے ہوں گے یہ ایسی باتیں...... تا کہ کھڑی رہے وہ تھوڑی دیر...... وہاں...... اور جب وہ اندر پہنچ جاتی ہے تو اسے قہقہوں کی آواز آتی ہے۔ عجب بدتمیز لوگ انگریزوں کے ہاں کتنی عزت ہوتی ہے عورتوں کی...... وہ بڈھے پادری صاحب جو آیا کرتے تھے، بہت اچھی آدمی تھے بیچارے۔ ہر ایک سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتے تھے۔ بلکہ اسے تو وہ پہچان گئے تھے۔ سب مل کر جایا کرتے تھے اتوار کو گرجا...... وہ خود...... ڈینا...... کٹی...... میری...... شیلا...... اور ہاں مری...... مسز جیمس کا کتنا مذاق اڑاتے تھے سب مل کر۔ سب سے پیچھے چلتی تھیں چھتری ہاتھ میں لئے ہانپتی ہوئی۔ اور ان میں تھا ہی کیا، ہڈیوں کا ڈھانچ تھیں بس...... اور گرجا سے لوٹتے ہوئے تو اور بھی مزا آتا تھا۔ سب چلتے تھے آپس میں ہنستے، مذاق کرتے...... افوہ شیلا کس قدر...... تھی، کیسے کیسے منہ بناتی تھی۔ جب ہنسنے پر آتی تھی تو رکنے کا نام نہ لیتی تھی...... مگر یہاں وہ سب باتیں کہاں...... اب تو جیسے وہ آدمیوں میں رہتی ہی نہیں...... اور واقعی کیا آدمی ہیں یہاں والے؟ اول تو اسے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ ہر وقت پاؤں میں چکر رہتا ہے...... اور پھر ایسوں سے کوئی کیا ملے...... جیسے جانور...... نہ کوئی بات کرنے کو، نہ کوئی ذرا ہنسنے بولنے کو۔ بس آؤ اور پڑ رہو...... لے دے کے رہ گئی نصیبن تو اسے اس کے سوائے کوئی بات ہی نہیں آتی کہ اس کا بیٹا بھاگ گیا، اس کے اپنے میاں سے لڑائی ہو گی، اس کے یہاں برأت بڑی دھوم دھام سے آئی...... اسے کیا ان سب باتوں سے، ہوا کرے، اس سے مطلب...... یا بہت ہوا تو اسے خواہ مخواہ ڈراتی رہے گی چوروں کے قصے سنا سنا کر...... ایک دفعہ اس نے سنایا تھا کہ ایک دوسرے قصبے کی مڈوائف کو کچھ لوگ کیسے بہکا کر لے گئے تھے، اور اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا...... بکتی ہے، بھلا کہیں یوں بھی ہوا ہے...... لیکن اگر کہیں اس کے ساتھ...... مگر نہیں بیکار کا ڈر ہے۔ جو یوں ہوا کرے، تو لوگ گھر سے نکلنا چھوڑ دیں۔ بھلا دنیا کا کام کیسے چلے...... پاگل ہے بڑھیا۔ بہکا دیا ہے کسی نے اسے...... مگر ایسی جگہ کا کیا اعتبار۔ نہ معلوم کیا ہو کیا نہ ہو۔ کوئی ساتھ بھی تو نہیں...... اگر وہ مڈوائف نہ بنتی تو اچھا تھا۔ اور وہ تو خود ٹیچر بننا چاہتی تھی، بلکہ پاپا بھی یہی چاہتے تھے، مگر ماما ہی کسی طرح راضی نہ ہوئیں...... کتنے دن ہو گئے پاپا کو مرے ہوئے...... بارہ سال۔ کتنا زمانہ گزر گیا۔ اور معلوم ہو جیسے کل کی بات ہو...... کتنا پیار کرتے تھے وہ اسے...... روز اسکول پہنچانے جاتے تھے ساتھ...... کلاس میں اس کی سیٹ میز کے پاس تھی...... اور وہ انگریزی کے ماسٹر صاحب بڑے اچھے آدمی تھے بیچارے، چاہے وہ کام کر کے نہ لے جائے مگر کبھی کچھ نہیں کہتے تھے...... اور لڑکے تو نہ جانے اسے کیا سمجھتے تھے۔ سارے اسکول میں وہ اکیلی ہی لڑکی تھی نا۔ سب کے سب ماسٹر صاحب کی نظریں بچا بچا کر اس کی طرف

دیکھتے رہتے تھے۔ سارے وہ موٹا کرم چند۔ بھلا وہ بھی تو اس کی طرف دیکھتا تھا۔ جیسے وہ بڑا خوبصورت سمجھتی تھی اسے...... اور ہاں وہ عظیم...... بڑا بھولا تھا بیچارا۔ سوکھا سا۔ زرد، مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اس کی۔ دیکھتا تو وہ بھی رہتا تھا اس کی طرف، مگر جب کبھی وہ اسے دیکھ لیتی تھی تو وہ فوراً شرما کر نظریں نیچی کر لیتا تھا، اور رومال نکال کر منہ پونچھنے لگتا تھا...... اوہ، اُس دن وہ دل ہی دل میں کتنا ہنستی تھی۔ اس دن وہ اتفاق سے جلدی آ گئی تھی۔ برآمدے میں دوسری طرف سے وہ آ رہا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا اس کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا اور کچھ کہنے سا لگا، ڈرتے ڈرتے عظیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر جلدی سے چھوڑ دیا۔ اسے گھبرایا ہوا دیکھ کر وہ خود کتنا پریشان ہو گیا تھا، اور اس نے بڑے گڑگڑا کر کہا تھا ''کہئے گا نہیں......'' وہ کتنے دن اس بات کو یاد کر کے ہنستی رہی تھی...... کتنا سیدھا تھا واقعی وہ...... وہ ابھی اسکول ہی میں رہتی تو کتنا مزا رہتا...... مگر...... وہ زمانہ تو اب گیا۔ اب تو وہ یہاں اکیلی دنیا سے الگ پڑی ہے کوئی بات تک کرنے کو نہیں...... کسی کا خط بھی تو نہیں آتا۔ وہ روز ڈاکئے سے پوچھتی ہے کہ اس کا کوئی خط تو نہیں مگر روز وہی جواب ''نہیں......'' اور جو آیا بھی تو بس وہی لمبے بادامی لفافے...... آن ہز میجسٹیز سروس...... ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کی ہدایتیں، یوں کرو اور یوں کرو۔ کوئی اس کی مانے بھی جو وہ یوں کرے، خوانخواہ کی آفت...... اور پھر خط آئے بھی کہاں سے......؟ اگر آنٹی ہی دلی سے خط بھیج دیا کریں تو کیا ہے، مگر وہ تو برسوں بھی خبر نہیں لیتیں...... ایک دفعہ جانا چاہئے اسے دلی...... اچھا شہر ہے۔ کیا چوڑی سڑکیں ہیں...... اور سینما کس کثرت سے ہیں...... اور وہ...... وہ تو خیر ہے ہی...... مگر وہ......

کائیں، کائیں، کائیں نے اسے چونکا دیا۔ دھوپ آدھی دیوار تک اتر آئی تھی، کوا زور زور سے چیخ رہا تھا، اور وہ بستر پر پیر نیچے لٹکائے لیٹی تھی۔ اسے جلدی جانا تھا، اور اس نے بیکار لیٹے لیٹے اتنی دیر لگا دی تھی۔ وہ نصیبن پر اپنا غصہ اتارنے لگی کہ اس نے چائے کیوں نہیں لا کر رکھی۔ مگر وہ سمجھ رہی تھی کہ میم صاحب سو رہی ہیں، اور واقعی، اس نے خیال کیا، اس سے تو وہ اتنی دیر سو ہی لیتی تو اچھا تھا۔ بہر حال اس نے نصیبن سے جلدی چائے لانے کو کہا۔

اس نے دو بار منہ دھویا اور الٹی سیدھی چائے پینے کے بعد وہ کپڑے بدلنے چلی۔ ٹرنک کھول کر وہ سوچنے لگی کہ کون سی ساڑھی پہنے...... سفید، سرخ کناروں والی۔ مگر کیا روز روز ایک ہی رنگ...... اور پھر سفید ساڑھی میلی کتنی جلدی ہوتی ہے۔ اس کی بہار تو بس ایک دن ہے، اگلے دن کام کی نہیں رہتی...... نیلی ساڑھی نیچے سے چمک رہی تھی...... اسے ہی کیوں نہ پہنے......؟ مگر اسے نیلی ساڑھی پہنے دیکھ کر تو لوگ اور بھی باؤلے ہو جائیں گے...... وہ جدھر سے نکلتی ہے، سب کے سب اس کی طرف گھورنے لگتے ہیں۔ اسے بڑی بری معلوم ہوتی ہے ان کی یہ عادت...... اور ان زمینداروں کو دیکھو۔ بڑے شریف بنتے ہیں...... خیر یہ تو جو کچھ ہے سو ہے، جب وہ آگے بڑھ جاتی ہے تو وہ ہنستے ہیں اور طرح طرح کی آوازیں کستے ہیں...... ''کہو یار...... ابے مجید، ذرا لیجو......'' کوئی کھانسنے لگتا ہے...... کیا وہ سمجھتی نہیں...... ذرا شہر میں کر کے دیکھتے ایسی باتیں۔ وہ مزا چکھا دیتی انہیں...... مگر یہاں وہ کیا کرے مجبور ہو جاتی ہے...... ان ہی کی وجہ سے تو اس نے رنگ دار ساڑھیاں چھوڑ دیں، اور سفید پہننے لگی۔ مگر پھر بھی نہیں مانتے...... اب اگر آج وہ نیلی ساڑھی پہن کر جائے تو نہ معلوم کیا کیا کریں گے...... تو پھر سفید ہی پہن لے...... مگر روز روز سفید...... اور کیا وہ کوئی ان سے ڈرتی ہے۔ ہنستے ہیں تو ہنسا کریں، کوئی اسے کھا تھوڑے ہی لیں گے۔ بھلا کیا بگاڑ سکتے ہیں وہ اس کا......؟ اب وہ پھر رنگ دار ساڑھیاں پہنا کرے گی۔ دیکھیں وہ اس کا کیا بناتے ہیں...... ہنسیں گے تو ضرور...... مگر اس سے ہوتا ہی کیا ہے...... آج وہ ضروری نیلی ساڑھی پہنے گی۔

نیلی ساڑھی پہن کر اس نے بال بنانے کے لئے آئینہ سامنے رکھا۔ کم خوابی سے اس کی آنکھیں لال اور کچھ سوجی ہوئی سی تھیں۔ وہ ہاتھ میں آئینہ اٹھا کر آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی...... مگر یہ اس کا رنگ کیوں خراب ہوتا چلا جا رہا تھا، اور کھال بھی کھردری ہو چلی تھی...... جب وہ لڑکی تھی تو اس کے چہرے پر کیسی چمک تھی...... رنگ سانولا تھا تو کیا، چمکدار تو تھا...... اس کی آنٹی ہمیشہ ماما سے کہا کرتی تھیں ''تمہیں بیٹی اچھی ملی ہے......'' مگر اب......

اس نے آئینہ رکھ دیا۔ اور اپنے جسم کو اوپر سے نیچے تک ایسی حیرت سے دیکھنے لگی جیسے مور اپنے پیروں کو...... اس کے

بازوؤں کا گوشت لٹک آیا ہے اور تھوڑی بھی موٹی ہوگئی ہے اور ہاتھ اب کتنے سخت ہیں، بال بھی سوکھے سوکھے سے، اور ہلکے رہ گئے ہیں اور تیزی تو اس میں بالکل نہیں رہی ہے۔ پہلے وہ کتنا کتنا دوڑتی بھاگتی تھی۔ مگر اب تو تھوڑی ہی دیر میں اس کی کمر ٹوٹنے لگتی ہے۔

اس نے ایک لمبی سی انگڑائی لی، اور پھر ایک گہرا سانس لیا۔ بے رونق چہرے اور پلپلے بازوؤں نے نیلی ساڑھی کا رنگ اڑا دیا تھا۔ اس نے بال ایسے بے دلی سے بنائے کہ بہت سے تو ادھر ادھر ازتے رہ گئے، بال بن چکے تھے مگر وہ برابر آئینے کو تکے جا رہی تھی اور اس کا دماغ سمٹ کر آنکھوں کے پپوٹوں میں آ گیا تھا جن میں ایک ہی جگہ ٹھہرے ٹھہرے مرچیں سی لگنے لگی تھیں۔

جب اس نے آئینہ رکھا تو اسے میز کے کونے پر دیوار کے قریب بائبل رکھی نظر آئی۔ یہ بچپن میں سالگرہ کے موقع پر اس کے پاپا نے اسے دی تھی۔ مدتوں سے اسے کھولا تک نہ تھا اور وہ گرد سے اٹی پڑی تھی۔ اس کتاب نے اس کو پھر پاپا کی یاد دلا دی اور وہ اسے اٹھانے پر مجبور ہوگئی۔ پہلے ہی صفحے پر اس کا نام لکھا تھا یہ خود اس کے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ لیکن اب اس کی روشنائی بہت پھیکی پڑ چکی تھی۔ یہ اس نے پانچویں کلاس میں لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے بڑی ہنسی آئی کہ اس وقت وہ کیسے ٹیڑھے میڑھے حرف بنایا کرتی تھی، اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس زمانے میں اس کے پاس ہرا قلم تھا۔ اس کا ارادہ ہوا کہ اب کے جب وہ شہر جائے گی تو ایک ہرا قلم ضرور خریدے گی۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ آخر وہ قلم لے کر کرے گی ہی کیا، اب اسے کون سا بڑا لکھنا پڑھنا رہتا ہے۔

اس کے پاپا اسے بائبل پڑھنے کی کتنی ہدایت کرتے تھے۔ اسے اپنی بے پروائی پر شرم سی محسوس ہوئی اور وہ بائبل کے ورق الٹنے لگی...... پیدائش خروج...... ورق تیزی سے الٹے جانے لگے...... استثنا...... روت...... یرمیاہ...... جبقوق...... متی...... لوقا...... رسولوں کے اعمال...... کہاں سے پڑھے...... آدم...... نوح...... طوفان...... ابراہیم...... کشتی صلیب...... مسیح...... یسوع آ جا آئے...... گرجا کا گھنٹہ...... سب مل کر گرجا جاتے تھے، ہنسی مذاق کرتے......

• آخر وہ فیصلہ نہ کر سکی کون سی جگہ سے پڑھے۔ اور پھر اسے جلدی جانا تھا، اتنا وقت بھی نہیں تھا۔ لیکن اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اب روز صبح کو بائبل پڑھا کرے گی...... ورنہ کم سے کم اتوار کو تو ضرور...... لیکن دعا تو مانگ ہی لینی چاہئے...... بہت ہی بری بات ہے۔ ماما بھی بغیر دعا مانگے نہیں سونے دیتی تھیں...... اور پھر اس میں وقت بھی کچھ نہیں لگتا...... اور لگے بھی تو کیا ہے۔ دنیا کے دھندے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اس نے دماغ کو ساکن بنانا چاہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مگر باوجود اس کی آنکھیں پھٹ پھٹانے سے پہلے تو اس کی ماما اس کی آنکھوں میں گھس آئیں اور پھر پاپا اور ان کے پیچھے پیچھے گرجا کی سڑک، گھنٹہ اور سب جو مل کر گرجا جایا کرتے تھے، ہنستے، مذاق کرتے، اس نے آنکھیں کھول کر سر کو اس طرح جھٹکے دیئے گویا وہ ان سب کو اپنی آنکھوں میں سے جھاڑ رہی ہے...... آخر دماغ بالکل خالی ہو گیا اور خاموش، صرف کانوں اور سر میں دل کے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں، دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور دعا کو دہراتی چلی گئی: ''اے میرے باپ، تو جو آسمان پر ہے۔ تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے، اور ہمارے قصوروں کو معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قصوروں کو معاف کرتے ہیں کیونکہ قدرت جلال ابد تک تیرا ہی ہو، آمین۔''

آنکھیں کھولنے پر اس نے کچھ اطمینان محسوس کیا اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے پھر آئینے میں جھانکا، اور چاہا کہ کسی خاص چیز کے لئے دعا مانگے...... لیکن کیا چیز......؟ کوئی......؟ اس کا تبادلہ شہر کو ہو جائے...... مگر وہاں اسے پھر دیسن کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سے تو یہ قصبہ ہی بہتر ہے...... پھر اور کیا......؟ وہ ایک کہانی تھی کہ ایک پری نے ایک آدمی سے تین خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کیا تھا...... پھر آخر کیا......؟

اس نے بہت بازو ملے، مگر کوئی بات یاد نہ آئی۔ اسے دیر ہو رہی تھی، اس لئے اس نے اپنی دعاؤں اور خواہشوں کو چھوڑ دیا اور چھتری اٹھا کر چل پڑی۔

سڑک پر پہنچ کر اس پر محض ایک جلدی پہنچنے کا خیال غالب تھا۔ صبح کی اس تمام کاہلی اور سستی کے بعد اسے اعضاء کو حرکت

دینے میں فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ سورج کی ہلکی سی گرمی اور چلنے سے اس کے خون کی حرکت تیز ہوگئی تھی اور سڑک کی نالی، ریت، کنکروں سب سے بے پروا اور اپنا راستہ طے کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اگر اسے کبھی اپنی رفتار میں کچھ سستی معلوم ہوتی تو وہ اور قدم بڑھانے کی کوشش کرتی۔ سڑک پر کھیلنے والے لڑکے ابھی تک نہ نکلے تھے، اس لئے اسے اپنی ناک کی حفاظت کی بھی ضرورت نہ تھی۔ جب وہ دیواروں کے سائے میں سے گزرتی تھی تو اس پیر اور بھی تیز اٹھنے لگتے تھے۔

وہ جلد ہی بازار پہنچ گئی۔ شیخ صفدر علی کا مکان اب تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا اور اسے اطمینان سا ہو گیا تھا کہ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ چلی جا رہی تھی کہ یکایک اس کی نظر ایک دکاندار پر پڑی۔ وہ اپنے سامنے والے کو آنکھ سے اشارہ کر رہا تھا اور مسکرا رہا تھا...... کیا یہ اسے دیکھ رہا تھا......؟ ممکن ہے وہ پہلے سے کسی بات پر ہنس رہے ہوں اور اسے دیر بھی ہوگئی تھی...... وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ آواز آئی: ''آج تو آسمان نیلا ہے بھئی...... بڑے دن میں ہوا ہے ایسا آج......'' اس نے چاہا کہ پلٹ کر چھتری رسید کرے اس بدتمیز کے...... چاہے کچھ ہو آج وہ کھڑی ہو جائے اور صاف صاف کہہ دے کہ وہ ان لوگوں کی باتیں اچھی طرح سمجھتی ہے اور اب وہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتی...... آخر کہاں تک......؟ پیر من من بھر کے ہو گئے تھے اور ٹانگیں تھرا تھرا رہی تھیں جس سے وہ کئی دفعہ چلتے چلتے ڈگمگا گئی...... مگر ان آنکھوں نے جواب ہر طرف سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اسے رکنے نہ دیا۔ وہ اپنی ساڑھی میں کچھ سکڑ سی گئی۔ اس نے پلہ اچھی طرح سینے پر کھینچ لیا اور سر جھکا کر قدموں کو سڑک پر سے اکھاڑنے لگی......

جب وہ شیخ صفدر علی کے مکان پر پہنچی تو وہ ڈیوڑھی میں کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے اور ایسے شکایت آمیز لہجے میں جیسے اس نے کوئی نایاب موقع ہاتھ سے نکل جانے دیا تھا جس پر شیخ جی کو اس سے ہمدردی تھی، بولے: ''آخاہ میم صاحب...... بڑی ہی دیر کر دی تم نے تو......''

''جی...... ہاں...... وہ ذرا دیر ہو گئی......'' کہتی ہوئی وہ زنانے کی طرف بڑھی۔ جب وہ دروازے پر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ قصبے کی پرانی دائی بائیں ہاتھ پر کپڑے اٹھائے اور داہنے ہاتھ میں لوٹا ہلاتی صحن سے گزر رہی ہے۔ یہ کہتی ہوئی ''جرا دیکھو تو...... ابھی تک نہ نکلی گھروے سے حرام جادی......!''

ооо

ممتاز شیریں

انگڑائی

''آپا، گلنال آپا! وہ دیکھو۔ مچھ فنا۔۔۔۔'' جاوید ننھے ننھے ہاتھوں سے میری ساری کھینچ رہا تھا۔ ''ارے ہٹ بھی۔ جب دیکھو آپا آپا۔۔۔۔ دیکھ تو میری ساری کا ناس کیے دے رہا ہے۔ سفید ساری آج ہی تو پہنی تھی اور یہ دھول میں اٹے ہوئے ہاتھ! مٹی سے کھیل رہا تھا کیا بدتمیز!'' میں نے غصے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ اس نے رونی صورت بنالی۔ ''نہیں تو آپا ۔۔۔ مچھ فنا چھ ہمالے لوڈ پہ ۔۔۔ اس نے سسکتے ہوئے۔ انہیں بلاؤ نا ۔۔۔ مچھ فنا نچھ کتنی اچھی ہیں۔

اُچھ دن مجھے کیک دیا تھا اول کوکو۔۔۔ نچھی اچھی کوکو۔۔۔ آپا انہیں بلالو اچھی آپا۔''

''ارے!'' میں چونک پڑی۔ ''مس فنانس یہاں!'' میں نے دریچے کی طرف نگاہ ڈالی، ہاں وہ سچ مچ کچھ دور پر کسی عورت سے باتیں کرتی آرہی تھیں۔ ''تو انہیں بلالوں؟'' میں نے سوچا۔ پھر جلدی سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کتابیں بکھری ہوئی اور فرنیچر! ایک کرسی دیوار کی طرف منہ کیے کونے میں پڑی ہے۔ تو ایک کمرے کے عین بیچ میں، گویا اپنی پالش سے بے نیازی پر نازاں بیٹھی ہو اور صوفہ! ہونہہ، یہ بڑا سا سوراخ اور اس میں سے میلی میلی روئی جھانکتی ہوئی ۔۔۔ ٹیبل کلاتھ؟ اس پر تو جاوید نے بڑے ہی خوش نما نقش بنا رکھے تھے اور سیاہی کے برتن میں تو بڑی فیاضی دکھائی ہے۔ مرے اللہ! ایک چیز بھی سلیقے کی ہے؟ اف کس بدتمیز نے فرش پر کاغذ بکھیرے ہیں؟ ایسے شریر بچے بھی کسی کے ہوتے ہیں؟ اور یہ دھول کی ایک انچ موٹی تہ! ۔۔۔ یہ کریمن بھی کہاں مرگئی؟ کم بخت سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ صبح صبح کمروں میں جھاڑو دے دیا کرے۔

''کریمن! او کریمن ذرا جھاڑن لیتی آنا! کیا تم نے یہ دھول بیچنے کے لیے جمع کر رکھی ہے؟''

آئی بی بی! ابھی آئی۔ ذرا توے سے روٹی تو اتارلوں، جل جائے گی۔'' بھاڑ میں جائے وہ اور اس کی روٹی۔ کمبخت ہر وقت چولہے میں گھسی رہتی ہے ۔۔۔ آخر میں کیوں اتنا جل رہی تھی۔ مجھے خود شرم آنے لگی۔ بے چاری غریب کیا کرے ایک ہی تو تھی اور گھر کا سارا کام اسی کے سر۔ ہم ایسے کوئی امیر تو نہ تھے کہ دس نوکر رکھتے۔ ایک بھی غنیمت ہے۔

مَیں نے جلدی سے ٹیبل کلاتھ بدلا اور کرسیوں کو اپنی اپنی جگہ گھسیٹ کر فرش پر بکھرے ہوئے کاغذ سمیٹنے لگی۔ سمیٹتے سمیٹتے اٹھ کر کھڑکی پر نظر ڈالی تو میری سانس جیسے رک گئی۔ اُف مس فنانس کتنی نزدیک آگئی تھیں! ''زکیہ! زبیدہ!'' میں حلق پھاڑ کر چلائی، جواب ندارد! دروازے میں جا کر دیکھا تو بس جل ہی گئی۔ دونوں آنگن میں موجود زکیہ جاوید کو اٹھائے کھڑی تھی تو زبیدہ گیٹ پر چڑھی ہوئی گردن بڑھا بڑھا کر مس فنانس کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''زکیہ! کچھ مدد بھی کروگی؟ شرم نہیں آتی تمہیں یوں باہر کھڑی ہو۔'' خفا کیوں ہوتی ہو آپا! میں ہمیشہ گیٹ میں تھوڑے ہی کھڑی ہوتی ہوں؟ یوں ہی آج'' ۔۔۔ پھر وہ میرے پھولے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہنس پڑی۔ ''اخا، آپا! آج تو آپ کے غصے کا پارہ سو ڈگری پر چڑھا ہوا ہے۔ اہاہا، ابھی اتارے دیتی ہوں۔ اپنی آپا کا ٹمپریچر۔ دیکھو نا، ایسے مزے کی بات بتاؤں گی۔'' منہ بنا کر تالی بجاتے ہوئے۔ ''بتادوں آپا؟ ۔۔۔۔ او ۔۔۔ اوں ۔۔۔۔ مس فنانس یہاں سے گزر رہی ہیں۔''

''یہ تو مجھے معلوم ہی ہے، اچھا آؤ ذرا کمرے کو صاف کرنے میں مدد دو، تمہیں تو بس باتیں ہی آتی ہیں۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''تو آپا مس فنانس کو بلاؤ گی؟'' اس نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ زبیدہ بھی ناچ رہی تھی۔ اوہ! ابھی تک یہ بچے مس فنانس کو اتنا چاہتے ہیں۔

زکیہ پھر دروازے کی جانب تکنے لگی۔ میں بھنا گئی۔ سارے کمرے میں کاغذ پھیلے پڑے تھے۔

''ہونہہ! میں نہیں بلاؤں گی! دیکھو تو گھر کتنا صاف ہے۔'' میں نے جھنجلا کر سمیٹے ہوئے کاغذوں کو زمین پر دے مارا۔

''کیا کہہ رہی ہو آپا؟'' زکیہ تعجب سے میرا منہ تکنے لگی۔ میں نے اس کی طرف توجہ کیے بغیر زبیدہ کو پکارنا شروع

لیا۔ زبیدہ! آ جاؤ اندر۔

''کیوں آپا؟'' زبیدہ نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

''آ جاؤ! اگر مس فنانس تمہیں دیکھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہمارا ہی گھر ہے اور وہ یقیناً مجھ سے ملنے آ جائیں گی۔'' میں نے جاوید کو بھی اندر گھسیٹتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو اور اچھا ہوگا۔ وہ کیوں نہ آئیں آپا؟''

''گویا تم نے گھر کو بہت اچھی طرح سجا رکھا ہے!'' ''ہم ابھی سب ٹھیک کر دیں گے انہیں آنے دو آپا!'' دونوں نے نہایت اشتیاق سے التجا کی۔

''کہہ جو دیا کہ نہیں بلائیں گے۔''

''اوہ آپا! مس فنانس! اور اتنے دنوں کے بعد انہیں دیکھنا نصیب ہوا آخر انہیں کالج چھوڑے ہوئے دو تین ماہ ہو گئے نا؟ اتنے دنوں بعد اتفاقاً وہ خود ہمارے شہر میں آئیں، ہمارے گھر پر سے گذریں اور تم!........ تم انہیں نہ بلاؤ آپا تم تو مس فنانس پر'' ۔ زکیہ سنجیدہ لہجے میں کہتی کہتی یکا یک زور سے ہنس پڑی۔ اور شرارت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ''ہوں! اچھا میں جان گئی.......... جب سے پرویز بھیا........''

''اری چپ! بہت باتیں بنانے لگی ہے۔'' میں نے زور سے اس کے ایک چٹکی لی۔

''ہونہہ آپا! تم بہت بنتی ہو۔ ابھی دیکھو نا پرویز کا نام آتے ہی کیسے شرما گئیں۔'' میں یوں ہی شرماتی لجاتی، ہمی سنائی سب کچھ بھول کر وہیں کھڑی رہی گویا اس نام نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔ کیسا حسین نام ہے کتنا پیارا نام۔ ہے!۔ پرویز!

میں اس شیریں تصور سے چونکی تو سامنے کیا دیکھتی ہوں، دروازے کے کواڑ کھلے پڑے ہیں۔ پردہ ہوا سے اڑا جا رہا ہے اور مس فنانس ہمارے گھر کے بالکل مقابل میں کھڑی مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔ جونہی میں نے انہیں دیکھا وہ مسکرا کر ہمارے گھر کی طرف بڑھنے لگیں۔

''یا اللہ! اب کیا کیا جائے؟'' میں زکیہ کو جھنجھوڑنے لگی۔ ''اب تم ہی سب کچھ دیکھ لو۔ دیکھو وہ آ رہی ہیں۔'' میں بے تحاشا وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں جا کر دم لیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے جھانک کر دیکھا مس فنانس برآمدے کے بازو والے کمرے میں کرسی پر بیٹھی تھیں اور زکیہ ایک خوشنما برتن میں کیلے اور سنگترے لیے ہوئے ان کے پاس کھڑی تھی۔ ''گلنار کو بلاؤ نا'' مس فنانس کہہ رہی تھیں' اچانک انہوں نے مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا اور مسکرا کر آواز دی ''گلنار!'' میں شرما کر دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔۔۔۔۔میرے یوں شرما جانے سے وہ کیا سمجھی ہوں گی؟ یہی نا کہ میرے جذبات ان کی طرف اب بھی ایسے ہی ہیں۔ ہونہہ! انہیں کیا معلوم کہ میں اب۔۔۔۔مگر انہیں یہ غلط فہمی ضرور ہوگی۔ میں پہلے تو ان کے سامنے یوں شرمایا کرتی تھی جب وہ کہیں سے آنکلتیں تو میں بھاگ کر جا چھپتی۔ وہ میری طرف دیکھتیں تو دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیتی گو دل تو یہی چاہتا کہ وہ یونہی دیکھتی رہیں۔ عجیب لڑکی تھی کچھ سال پہلے! رفتہ رفتہ میں اُن سے کھل کر بات کرنے لگی تھی۔ پھر بھی جب کبھی اُن سے اچانک مڈبھیڑ ہو جاتی تو میری بدحواسی نہ پوچھئے۔ وہ دن بھی کیا دن تھے! چھٹی ہونے پر کالج کے برآمدے میں گھنٹوں ان کا انتظار کرنا میرا معمول تھا۔ ہفتہ بھر میں جس دن ان کا گھنٹہ نہ ہوتا وہ دن کس قدر منحوس دکھائی دیتا تھا! ہاں میں ان پر مرتی تھی انہیں دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی اور لڑکیاں کیسے مجھے تنگ کرتی تھیں ''گلنار! نہ تم جانے کیوں مس فنانس پر مرتی ہو، وہ کون سی ایسی حسین ہیں کہ بلکہ انہیں بدصورت بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔'' جی چاہتا ان چڑیلوں کے منہ نوچ لوں۔ انہیں کیا معلوم کہ وہ مجھے کیسی حسین نظر آتی تھیں! دوسری لڑکیاں تو کیا میں زرینہ سے بھی اس دن خفا ہو کر روٹھ گئی تھی۔ گو زرینہ میری سب سے پیاری سہیلی تھی۔ ہاں اس دن میں نے کالی ساڑھی پہن رکھی تھی اور بڑے بھاسے سادو مانگ کر سیاہ 'بوٗ' بھی لگایا تھا۔ میں اور زرینہ ہاسٹل کے کمپاؤنڈ میں ٹہل رہے تھے۔ اندرا بھی کہیں سے آنکلی۔ ''ابا آج تو تم بلا کی حسین نظر آ رہی ہو گلنار!'''' مس فنانس کی بی'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''ہونہہ! مس فنانس!'' زرینہ نے طنز سے کہا تھا۔ ''مس فنانس! وہ تین دفعہ مر کر جنم لیں تو شاید تمہارا

کہ مس فنانس کی توجہ میری بجائے اس پر ہو۔ نہ جانے کہاں سے لاتی تھی ایسی خوبصورت ساڑیاں اور ...
کوشش کرتی۔ جھوٹے موتیوں سے طرح طرح کے زیور بنا کر پہنا کرتی اور بعد میں تو اس نے برقی مشین سے اپنے بالوں کو گھنگھریالے بھی بنالیا تھا۔ ہونہہ۔ ان سب جتنوں سے کیا ہوتا وہ حسین تو تھی نہیں۔ مس فنانس مجھی کو دیکھا کرتیں۔ وہ جل مرتی۔ مس فنانس کے خاص سبجیکٹ پر تو وہ دنیا بھر کی کتابیں پڑھتی۔ مگر کہیں مجھ سے اچھا لکھ سکتی تھی! مجھ سے زیادہ نمبر بھی کبھی لیے تھے؟ آخر کچھ نہ بن پڑتا تو مجھ سے خوب جلا کرتی اور ہمیشہ اسی کوشش میں لگی رہتی کہ ایسی باتیں کرے جن سے میرے دل کو ٹھیس لگے۔ یہ دیکھ کر کہ میں حسین سمجھی جاتی تھی وہ کیسے کڑھتی تھی کہا کرتی۔ ''ہونہہ! سُرخ و سفید رنگ کے بغیر بھی کوئی حسین کہا جا سکتا ہے۔ دراز قد اور چھریرا بدن تو حسن کے ضروری جزو ہیں۔'' وہ خود بھی گوری تو نہ تھی لیکن تھی دراز قد اور دبلی پتلی مگر اس کے چھریرے بدن میں خاک بھی حسن نہ تھا۔ وہ ایسے دکھائی دیتی تھی گویا ایک لانبی سی لکڑی کو تراش کر صاف کر دیا گیا ہو۔ نہ وہ بدن کے دلکش نشیب و فراز‘ نہ لچک‘ نہ کوئی ادا‘ چپٹی بے جان لکڑی! جی چاہتا منہ توڑ جواب دوں۔ ''ہونہہ! خوبصورتی کے لیے دلکش نقش صبیح رنگ سے زیادہ ضروری ہیں اور بھرا ہُوا گول بدن اتنا ہی خوبصورت ہوتا ہے جتنا نازک جسم بلکہ اس سے زیادہ دلکش۔'' مگر مسکرا کر چپ ہو رہتی اور یہ ظاہر نہ ہونے دیتی کہ میں اس کے طعن کو سمجھ گئی ہوں۔ کبھی وہ کسی گوری رنگت والی لڑکی کو دکھا کر کہتی۔ ''دیکھو گلنار! وہ لڑکی کیسی حسین ہے۔'' اور اس کی بتائی ہوئی لڑکی‘ اتنی بدصورت‘ اتنی کریہہ صورت ہوتی کہ میں بے اختیار ہنس پڑتی۔ نکٹی ناک، پھیلے ہوئے نتھنے‘ بے حد موٹے ہونٹ‘ بھدا جسم‘ مگر ہاں سفید رنگت! میں ہنس کر کہتی۔ ''تمہاری حسن شناسی کی داد دیتی ہوں۔'' جب ان باتوں سے کام نہ چلتا تو سیدھی ذاتیات پر اتر آتی اور بار بار مجھے کالی کہتی حالانکہ میرا رنگ اچھا خاصہ گندمی تھا۔۔۔۔ اور زینت، وہ تو مس فنانس کے پیچھے ہی لگی رہتی تھی۔ کیسی سادگی سے شکایت کرتی تھی۔ ''گلنار! مس فنانس تو تمہیں کو زیادہ چاہتی ہیں۔'' اور وہ بے حد موٹی لڑکی، لڑکی نہیں بلکہ عورت۔۔۔۔ وہ بھی تو انہیں کا دم بھرا کرتی تھی! اور اپنی محبت کیسی عجیب طرح سے جتایا کرتی تھی۔ مس فنانس کو بے اختیار ہنسی آجاتی اور نلینی۔۔۔۔

''گلنار بی بی!''

''کیا ہے کریمن؟''

''بیگم نے میٹھے ٹکڑے اور سموسے بنانے کے لیے کہا ہے۔ وہ جو کوئی مس صاحب آئی ہے نا!

''بہت کام ہے بیٹی‘ ذرا اس روٹی کے ٹکڑے تو کاٹ لو۔ اچھی بیٹی عمر بھر دعا دیتی رہوں گی۔''

مَیں نے کواڑ کھولے اور آہستہ آہستہ سے جھانک کر دیکھا کہ کہیں مس فنانس اِدھر دیکھ تو نہیں رہی ہیں؟ امی بھی پاس بیٹھی ہوئی تھیں وہ امی سے باتیں کرنے میں مشغول تھیں۔ میں نظر بچا کر جلدی سے باورچی خانے میں چلی آئی۔ چاقو کو اچھی طرح صاف کر کے روٹی کاٹنے میں بیٹھ گئی۔ کریمن نے گلا ہُوا قیمہ چولہے پر رکھا اور اس میں نمک مرچ پیاز ڈال کر بھوننے لگی۔۔۔ تو یہ شاہی ٹکڑے پکائے جا رہے ہیں۔ یہ انہیں بہت مرغوب تھے نا! اور میں نے کتنی دفعہ شاہی ٹکڑے اپنے ہاتھوں سے پکا کر انہیں بھیجے تھے۔ ان دنوں وہ یہیں کالج میں پروفیسر تھیں اور جب ان کا ٹرانسفر ہُوا تھا تو میں کتنا روئی تھی! وہ منا رہی تھیں، تسلی دے رہی تھیں اور میں روتی جاتی تھی۔۔۔ پھر میں نے رو دھو کر ابا کو مجھے بنگلور بھیجنے پر رضامند کر لیا جہاں مس فنانس کام کر رہی تھیں اور ان سے جا ملی تھی۔ دیکھتے دیکھتے دو سال یونہی گزر گئے۔ مجھے اس کالج کا آخری امتحان دینا تھا اور اس کے بعد مس فنانس سے دائمی

جدائی! میں اس کا خیال بھی نہ کر سکتی تھی۔ کاش اس کالج میں ایم۔ اے کا کورس بھی ہوتا اور میں دو اور سال ان کے ساتھ رہ سکتی!۔۔۔۔ پھر میں نے اس مرتبہ فیل ہونے کی ٹھان لی تھی۔ ایک ایسی لڑکی کے لیے جو جماعت میں ہمیشہ اول آیا کرتی ہو فیل ہونا کتنی شرم کی بات تھی۔ اس بات کا مجھے خیال تک نہ آتا تھا۔ پروفیسروں نے مجھ سے کتنی امیدیں باندھ رکھی تھیں۔۔۔۔۔ میں کانووکیشن میں بہت سے تمغے اور انعامات حاصل کروں گی۔ سب لڑکیوں میں اول آنا تو میرا معمول تھا، اس کے الگ تمغے ملیں گے۔ سوشیالوجی اور انگریزی میں تو ریاست بھر میں اوّل رہوں گی۔ لڑکے دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے اور کالج کا نام کیسے چمکے گا۔ ان کی امیدوں پر پانی پھرنے کی مجھے پروانہ تھی۔

آخر وہ دن آ گیا جب امتحان ختم ہو چکا تھا اور میں مس فنانس سے آخری بار ملی تھی اور تکیوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی' اتنا کہ آنکھیں سرخ ہو گئیں اور تکیہ پوش بھیگ گیا۔ پھر جب زرینہ آئی تو اس نے مجھے گلے لگا لیا اور تسلی دینی شروع کی۔ وہ جتنا مناتی تھی میں اور زیادہ روتی جاتی تھی۔۔۔۔۔ اس رات زرینہ کتنی دیر تک میرے پاس بیٹھی سمجھاتی رہی۔ یہاں تک کہ میری آنکھیں جو رونے کی وجہ سے بری طرح جل رہی تھیں نیند کے غلبے سے بند ہونے لگیں۔ کتنی محبت کرنے والی لڑکی تھی زرینہ!۔۔۔۔۔

تو تم نے ٹکڑے کاٹ لیے بیٹی؟ ادھر لاؤ انہیں میں گھی میں بھون دوں اور اچھی بیٹی ذرا ان پوریوں میں قیمہ بھر کے سموسے بنالینا۔ بیگم نے جلدی تیار کرنے کو کہا ہے۔ کیا کروں بیٹی! تم دیکھتی ہو بہت بوڑھی ہو گئی ہوں۔ ہاتھ سے زیادہ کام نہیں بن پڑتا۔ ورنہ میں تمہیں کام کرنے کو کہتی میں، تو یہ تو یہ اس بوڑھے منہ میں کیڑے نہ پڑ جاتے یہ نازک نازک ہاتھ جو صرف قلم پکڑتے تھے، ان کو میں' موئی نوکرانی کام کرتے دیکھتی! آنکھیں نہ پھوٹ جاتیں!'' بوڑھی کریمن خوشامد کرنے لگی' میں بغیر جواب دیے قیمہ بھر کر سموسے بنانے لگی۔

.........وہ خود بھی مجھے کتنا چاہتی تھیں۔ کئی بار انہوں نے مجھے اپنے گھر پر بلایا تھا اور کتنا اصرار کرتی تھیں کہ میں ان کے ساتھ سیر کو جایا کروں۔ اس دن ان کی آواز میں کیسی التجا تھی'' صرف ایک بار آجاؤ گلنار! میں تمہیں اپنی کار میں گھما لاؤں گی۔ فلاں فلاں گارڈن لے جاؤں گی۔'' میں نے بصد ناز ان کی التجا کو ٹھکرا دیا تھا۔۔۔۔۔ اور اپنے پرچوں میں مجھے کتنے زیادہ مارکس دے دیتی تھیں' اسی پچاسی فی صدی! یہ دیکھ کر لڑکیاں مجھ سے بہت جلتیں' کہا کرتیں'' آخر تم تو ان کی فیوریٹ ہونا! ہمیں کہاں سے ملیں اتنے نمبر''۔۔۔۔ میرا نام اس چٹخارے سے لیتی تھیں گویا ان کے منہ میں لذیذ مٹھائی رکھی ہو۔ جب میری طرف دیکھ کر مسکراتی تھیں تو ان کا تبسم کتنا محبت آمیز ہوتا تھا۔ میرے دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوتی کہ انہیں مس فنانس کی بجائے'' اینجلنا'' کہا کروں یا کم از کم ایک بار چپکے سے کہہ دوں۔'' میری اینجلنا۔'' مگر مجھے کبھی جرأت نہ ہوئی تھی۔ ان کے سامنے کہتی نہیں تھی تو کیا خطوں میں تو جو جی میں آیا لکھ دیتی تھی۔ میرے دل کی ملکہ' میری جان' ملکہ حسن' میری آسمانی اینجلنا' اور وہ کبھی خفا نہ ہوتی تھیں۔ انہوں نے بھی تو ایک دن۔۔۔۔۔ اس دن میں اور للتا ان کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ باتوں باتوں میں للتا نے پوچھا تھا۔'' مس فنانس آپ گھوڑے کی سواری جانتی ہیں؟'''' نہیں'' انہوں نے جواب دیا۔'' مگر بہت دنوں سے سیکھنے کی خواہش ہے اور اس کے لیے رائڈنگ سوٹ بھی سلانے والی ہوں۔'' اور پھر اچانک میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔'' کوٹ اور پتلون گلنار!'' اس انداز سے کہا تھا کہ میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔'' میں تو اس سوٹ میں بالکل مرد ہوں گی نا؟'' میں دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔ ہاں ان میں کچھ مردانہ جھلک بھی تو تھی۔ بہت دراز قد' چوڑا چکلا سینہ، اور ایسی نظروں سے دیکھتی تھیں کہ میں بے اختیار شرما جاتی۔ خواہ وہ کتنی ہی لڑکیوں کی بھیڑ میں کھڑی ہوں، وہ باتیں تو اور لڑکیوں سے کر رہی ہوتیں مگر نظر مجھی پر جمی ہوتی اور نارنجی ساری میں وہ کیسی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ شاید ساری کے عکس کی وجہ سے چہرے کا رنگ سنہری ہو جاتا اور رخساروں پر ہلکی سرخی جس میں کچھ نیلاہٹ کی آمیزش بھی ہوتی۔۔۔۔ اور دور سے تو چیچک کے داغ بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔۔۔۔

مَیں نے سموسوں کی سینی کریمن کے آگے رکھ دی۔ کریمن انہیں تلنے لگی۔ اب کہیں فرصت ملی ان کاموں سے! اتنی دیر

یہ لوالماری کی کنجیاں!"

"ہاں آپا۔ جلدی جاؤ مس فنانس بار بار تمہیں یاد کر رہی ہیں۔"

۔۔۔۔۔۔ تو وہ اب بھی مجھے چاہتی ہیں؟ ہاں شاید دو ماہ پہلے میں نے ایک لڑکی کے ذریعے انہیں خط بھیجا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا نا کہ وہ خط پا کر کیسے خوش ہوگئی تھیں۔۔۔۔۔۔ اور اس دن بھی تو وہ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھیں نا جب میں اطلاع دیے بغیر اچانک اس کالج میں آ گئی تھی جہاں وہ اب کام کر رہی تھیں۔ میں ایک ایسی جگہ چھپ گئی تھی جہاں سے میں تو انہیں دیکھ سکتی تھی مگر وہ مجھے نہ دیکھ سکتی تھیں اور ایک لڑکی کو ان کے پاس بھیجا تھا کہ انہیں اطلاع کر دے میں اس کالج میں داخلے کے لیے آئی ہوں۔ انہوں نے فرطِ مسرت سے کئی بار میرا نام دہرایا تھا۔ "گلنار! گلنار! گلنار! یہاں! سچ کہو۔" لڑکی نے انہیں یقین دلایا۔ "وہ کہاں ہیں بتاؤ نا؟" لڑکی انہیں بتا رہی تھی کہ میں کس جگہ ہوں مگر وہ مجھے دیکھے بغیر "گلنار، گلنار، تم کہاں ہو؟" کہتی ہوئی ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ انہیں یوں بے تاب دیکھنے میں بڑا ہی مزہ آیا تھا۔۔۔

"لو اللہ اللہ کر کے سب چیزیں تیار ہوگئیں اَب میں اس بوڑھے جسم کو ذرا آرام تو دے لوں۔۔۔۔۔"

کم بخت بوڑھی جب دیکھو بڑبڑاتی رہتی ہے۔ میں جھلا کر رہ گئی۔

"خدا بھلا کرے گلنار بی بی کا مجھ بوڑھی کی کتنی مدد کرتی ہے۔" کریمن باورچی خانے میں ٹاٹ بچھا کر وہیں لیٹ گئی۔ "ابا بٹی تم یہیں ہو۔ ابھی ابھی یاد کر رہی تھی۔ دیکھا بہت دراز عمر ہوگی میری بی بی کی! اور بٹی تمہارے لیے کتنی ہی دعائیں میرے منہ سے نکلتی ہیں۔ جھوٹ نہیں کہتی۔ کتنی ہی جگہ کام کیا، پر نا بابا ایسی بچی کہیں نہ دیکھی۔ ذرا سے لونڈے تک مجھے ڈانٹ پلاتے تھے۔ میری بی بی نے تو اب تک ایک سخت لفظ بھی نہ کہا۔ اب تو میرے کام کرنے کے دن گئے۔ اسی لیے تو تمہارے ہاں بھی کام چھوڑ دیا تھا۔ سچ کہتی ہوں۔ صرف تمہاری شادی کی خبر سن کر آئی۔ تمہیں ان آنکھوں سے دلہن بنی دیکھوں۔ بہت دنوں سے یہی ارمان ہے۔ خدا کرے، بہت اچھا دولہا نصیب ہو۔"

بھلا پرویز سے اچھا دولہا بھی کوئی ہوگا؟ ایک ہلکی سی مسکراہٹ میرے لبوں تک آ گئی۔ مَیں نے جلدی سے منہ پھیر لیا کہ کہیں کریمن دیکھ نہ لے۔

پھر جیسے دماغ خیالات سے یکلخت خالی ہوگیا ہو اور ان کی جگہ پرویز! پرویز! پرویز! پرویز!۔۔۔ اور ایک حسین دنیا میں جا پہنچی، جذبات کی ایک رنگین دنیا۔ ہاں نہایت حسین، کالج اور مس فنانس والی دنیا سے کہیں زیادہ حسین!!

کبھی میں یہ سوچا کرتی تھی کہ میری شادی ہو جائے تو میں اپنے شوہر سے محبت کر بھی سکوں گی۔ ایک دفعہ زرینہ نے جو پامسٹری جانتی تھی میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا۔ "تمہارے شوہر کو تم سے بے حد محبت ہوگی۔" تو مجھے اپنے اس ہونے والے شوہر پر کتنا رحم آیا تھا کہ میں اس کی محبت کا جواب نہ دے سکوں گی اور اب؟۔۔۔۔ اب تو میں اپنے پرویز کو دیوانہ وار چاہوں گی۔

"آپا ساری لے لو۔" میں نے زبیدہ سے ساری لے کر میز پر رکھ دی اور بال بنانے لگی۔ آخر میں مس فنانس کو کیسے بھلا

سکتی۔ وہ بھی تو مجھے بہت چاہتی تھیں۔ ہونہ چاہتی ہوں گی کبھی انہوں نے زبان سے اس کا اظہار بھی کیا تھا؟ میں ساتھ ہوتی تھی تو ڈر کے مارے مری ہی جاتی تھیں۔ "گلنار! لڑکیاں کیا کہتی ہوں گی؟ گلنار اگر پرنسپل دیکھ لے تو؟"

لڑکیاں دیکھیں تو دیکھیں کیا ہم نے کوئی جرم کیا تھا کہ یوں ڈریں۔ اُف رے بزدلی! اور جب ہمارے مضامین کی کاپیاں تصحیح کر کے کلاس میں لاتی تھیں تو میرے لکھے ہوئے نظریوں اور نکتوں کی تو بہت تعریف کرتیں۔ مگر کبھی لڑکیوں کو بتایا بھی تھا کہ یہ میرے پیش کئے ہوئے نکتے ہیں۔ جوابات کے پرچے واپس کرتے ہوئے تو کبھی بھولے سے بھی میرا نام نہ لیا تھا۔۔۔ مگر وہ مجھی کو سب سے زیادہ نمبر دیتی تھیں۔۔۔۔ ہونہہ! صرف زیادہ نمبر دے دیے تو کیا ہوا۔ مجھے کتنی خوشی ہوتی اگر وہ کلاس میں لڑکیوں کے سامنے میری تعریف کرتیں اور کہتیں: دیکھو گلنار نے کتنے نمبر لیے ہیں۔ فلاں نمبر نے اتنے مارکس لیے ہیں، فلاں نمبر نے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے، فلاں نمبر، فلاں نمبر میں تو بس "فلاں نمبر" ہی ہو کر رہ گئی تھی۔ اور وہ مس جونس تھیں آکسفورڈ کی ایم۔اے۔ وہ تو آدھ آدھ گھنٹے تک میرے مضمون کی تعریف کرتی تھیں۔ گو ان کے جانچنے کا معیار بہت ہی اعلیٰ تھا۔ اور مسز سوشیل! سروجنی نے کہا تھا کہ وہ میرا پرچہ لیے بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔ "ماشاءاللہ گلنار نے تو اس دفعہ کمال ہی کر دیا۔ کتنے اچھے جواب ہیں۔ میں نے تو اس پرچے کو کئی مرتبہ پڑھا" وہ دوسری ٹیچرز اور لڑکیوں کے سامنے ہمیشہ میری تعریف کرتی رہتی تھیں اور مس کملابائی بھی۔ لیڈی ٹیچرس تو کیا مرد پروفیسر بھی میری ذہانت اور قابلیت کی داد دیتے تھے! فقط تھیں تو مس فنانس جو تعریف میں ایک لفظ بھی کہنا شاید اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھیں۔ ہونہہ!

اور میرا دل کیسے چاہتا تھا کہ وہ میرے حسن کی تعریف کریں۔ ہمیشہ نہ سہی کبھی کبھی بے تابی سے کہہ دیں۔ "گلنار! تم کتنی حسین ہو!" کم از کم ایک دفعہ بے اختیار ان کے منہ سے نکل جائے۔ "آج تو تم بہت خوب صورت نظر آرہی ہو گلنار!" یا یہی سہی۔ "یہ ساری تو تمہیں بہت جچتی ہے۔" میں اس کے لیے کتنے ہی جتن کرتی تھی۔ جس دن ان کا گھنٹہ ہوتا وہی ساریاں پہنتی جو مجھے بھاتی تھیں۔ بالوں کو خاص توجہ سے سنوارتی۔ کبھی کبھی بوٹو لگاتی۔ اچھی اچھی خوش رنگ چوڑیاں پہنتی اور مجھے اپنی کلائیوں اور انگلیوں پر بہت ہی ناز تھا۔ میں اپنے ہاتھ میز پر اس انداز سے ٹیکے رہتی کہ چوڑیاں جم کر کلائیوں پر آپڑیں اور مس فنانس کی سیٹ سے انگلیوں کی خوبصورتی کا اچھی طرح جائزہ لیا جا سکے۔۔۔۔۔۔ مگر یہ تو ظاہر تھا کہ وہ مجھے حسین سمجھتی تھیں۔ ورنہ یوں نہ تکتی رہتیں اور جب کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ آج خصوصیت سے اچھی نظر آرہی ہوں ایسے موقعوں پر تو وہ مجھے بہت ہی توجہ سے دیکھ رہی ہوتیں۔ ان کی نگاہ مجھ پر سے ہٹتی ہی نہ تھی۔۔۔۔۔۔ اچھا یوں ہی سہی۔ لیکن کیا میں ایک پتھر کا مجسمہ تھی یا نقاش کی کھینچی ہوئی تصویر تھی کہ یوں خاموش داد ملتی۔ آخر میں ایک انسان تھی۔ ایک سترہ سالہ نوخیز لڑکی، رومانی اور جذباتی! کبھی تعریف کر دیتیں تو ان کا خزانہ کھو جاتا؟ مانا بھی کہ وہ پرفیسر تھیں مسز سوشیل بھی تو پروفیسر ہی تھیں کیا وہ میری صورت کی تعریف نہ کرتی تھیں۔ اس دن جب مجھے ایک ٹیبلو میں حصہ لینا تھا جس میں یہ بتایا جانے والا تھا کہ ملکہ نور جہاں رقص اور موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ مسز سوشیل میرا میک اپ کرتی ہوئی کیسے سراہتی جاتی تھیں "گلنار! نور جہاں کی تمثیل کے لیے تم ہی موزوں ہو۔" "تم کیسی اچھی انگریزی لکھتی ہو۔ مسٹر سوشیل بھی تمہارے ہی گن گاتے رہتے ہیں، وہ بھی تمہارے ٹیچر رہ چکے ہیں نا؟" پوڈر لپ سٹک روج لگا چکنے کے بعد انہوں نے کہا۔ "اب آنکھیں اوپر اٹھاؤ ان کا میک اپ بھی کر دوں۔" اور میں نے آنکھیں اٹھائیں تو "واللہ کتنی خوبصورت آنکھیں!!" ۔۔۔۔۔۔ اور کس شدت سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش مسز سوشیل کی بجائے مس فنانس ہوتیں! آخر میں مسز سوشیل ہی کو کیوں نہ چاہتی تھی؟ مس فنانس میں کون سے سرخاب کے پر لگے تھے؟۔۔۔ اور زرینہ بھی تو میری آنکھوں کی تعریف کرتے تھکتی ہی نہ تھی! اور للتا! وہ تو اشعار لکھا کرتی تھی میری آنکھوں پر! زینی بھی کہتی تھی نا۔ "گلنار" تم چشمہ نہ پہنا کرو۔ یہ تمہاری حسین آنکھوں کو چھپا دیتا ہے۔" سبھی تعریف کرتی تھیں۔ اسی لیے تو میں اس کا خاص خیال رکھتی تھی کہ مس فنانس میری آنکھوں کو دیکھیں اور ان کی کلاس میں چشمہ بھی تو اتار کر رکھ دیتی تھی۔ گو مجھے بورڈ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے میں بہت دقت ہوتی۔ ہونہہ! اس بے حس پر کچھ اثر بھی ہوتا تھا؟ مگر پرویز، پرویز کی حسن شناس نگاہیں پہلی ہی نظر میں میری آنکھوں کا حسن دیکھ لیں گی۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھیں گے۔ "تمہاری آنکھیں، غزالیں آنکھیں، کیسی سیاہ! کیسی مدھ بھری!!"

کالج ڈے میں مَیں نے صرف اس لیے ڈرامے میں پارٹ کیا تھا کہ مس فنانس دیکھیں۔ برنارڈ شا کے ڈرامے ''سینٹ جون'' کا انتخاب ہُوا تھا۔ اور میں جون بنی تھی۔ مجھے کیسی اچھی طرح سنوارا گیا تھا۔ میں خود آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ پھر مجھے ہنسی بھی آ گئی۔ جون' ایک دیہاتی لڑکی، پھر ایک قیدی جو کورٹ میں لائی جا رہی تھی۔ کیا اس وقت وہ بنی سنوری ہوگی۔ لیکن یہاں کے فلموں اور سٹیجوں پر تو صرف یہی خیال رکھا جاتا ہے کہ جو لڑکی ہیروئن کا پارٹ کرے وہ خوبصورت ہو اور اسے اچھی طرح سنوارا جائے۔ لیکن یہ مسز سوشیل اور مس جونس کی غلطی نہ تھی۔ انہوں نے تو میرا ٹھیک ہی میک اپ کیا تھا۔ مس جونس نے اپنا خاکی رنگ کا رائیڈنگ سوٹ مجھے پہنایا تھا۔ خاکی کوٹ اور خاکی پتلون اور میرے لانبے بال پنوں میں لپیٹ کے شانوں پر ڈال دیے گئے تھے۔ بالوں میں کنگھی تک نہ کی تھی۔ بال پیشانی پر اور رخساروں پر نہایت بے ترتیبی سے بکھیر دیے گئے تھے۔ غلطی تو اس لڑکی کی تھی جس نے ڈیوک اوف وارک کا پارٹ کیا تھا۔ وہ اپنے لبوں پر لپ سٹک لگا رہی تھی۔ ڈرامے کا وقت ہو گیا تھا۔ مجھے جاتی دیکھ کر اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچ لیا۔ ''ہائے گلنار! یہ کیا؟ تم تو ہیروئن ہو، نہ روج نہ لپ سٹک!'' اس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر لپ سٹک لگا دی اور گالوں پر روج مل دیا اور جاتے ہوئے میں نے آئینے پر نظر ڈالی تو خود ہی ٹھٹک گئی۔ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے روکھے بال تو اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا مس فنانس آج میری تعریف ضرور کریں گی بلکہ تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ ڈرامے کے اختتام پر مسز سوشیل مس جونس، مسز ڈیانیل، دوڑی ہوئی سٹیج پر چڑھ آئیں اور پردے کے پیچھے آ کر بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے مجھے مبارک باد دی کہ مَیں نے جون کے سے مشکل پارٹ کو بہت اچھی طرح نبھایا تھا۔ سب میری اداکاری پر عش عش کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ اور مس فنانس؟ انہوں نے حاضرین میں شامل ہو کر ڈرامہ دیکھا تک نہیں۔ پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر اداکار لڑکیوں کو ہدایت دیتی رہیں۔ میں نے کتنی التجا کے ساتھ کہا تھا کہ حاضرین میں بیٹھ کر ڈرامہ دیکھیں۔ ان کے دونوں شانے پکڑ کر نہایت ملتجی نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔ میری یہ ملتجی نگاہیں تو پتھر سے دل کو پگھلا دیتیں۔ لیکن وہ تو شاید پتھر سے بھی زیادہ بے حس تھیں۔ ''گلنار کیا کروں میں نے اپنے ذمّے یہ کام لیا ہے تو مجھے کرنا ہی ہوگا'' واہ رے تمہارا کام! تاہم انہوں نے پردے کے پیچھے سے تو دیکھا تھا۔

اس رات مجھے ہاسٹل لوٹنے میں بہت دیر ہوگئی تھی گو ہاسٹل ہی کے کمپاؤنڈ میں تھی۔ لڑکیاں قدم قدم پر مجھے گھیر لیتی تھیں۔ ''گلنار! تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ تمہاری اداکاری کے کیا کہنے۔'' ''تم اسٹیج پر کیسی حسین نظر آ رہی تھیں گلنار؟ ان سب باتوں سے پیچھا چھڑا کر تھکی ہاری ہاسٹل لوٹی۔ زرینہ باہر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ ''میری اچھی گلنار تم بال کٹوا کر یونہی میک اپ کیا کرونا۔ آج تو تم پری ہی معلوم ہو رہی ہو۔ لیکن بھئی جون کے لیے تمہارا میک اَپ ٹھیک نہ تھا ان کو ویز یٹر کہہ رہا تھا۔'' جون آج تمہارے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ اور تمہارے گالوں سے شفق پھوٹ رہی تھی!'' ہم دونوں ہنسنے لگے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہم دوڑتے ہوئے ڈائننگ ہال پہنچے۔ سب لڑکیاں کھانے پر بیٹھ چکی تھیں۔ میرے جاتے ہی سبھوں نے تعریف کی بوچھاڑ کر دی اور اس رات میں کیسی خوش خوش بستر پر جا لیٹی تھی۔ نیند ہی نہ آتی تھی۔ ہونہہ! ان سب تعریفوں کی مجھے کیا پروا؟ کل میں اپنی مس فنانس، اپنی انجلینا سے ملوں گی تو وہ یہ کہیں گی، یوں تعریف کریں گی۔۔۔۔ دوسری صبح ان امنگوں اور امیدوں کے لیے ہوئے گئی تو اپنی انجلینا کے پاس کیا رکھا تھا؟ ایک جذبات سے عاری چہرہ اور پھیکی بے مزہ باتیں۔۔۔۔ زرینہ سچ کہتی تھی۔ ''گلنار تم تو اتنی رومانوی لڑکی اور مس فنانس کی سی بے حس اور سرد مہر کہیں تمہارا جوڑ بھی ہے۔ تم تو آگ ہو اور وہ برف۔۔۔۔'' ہاں وہ ضرور جذبات سے بالکل عاری تھیں۔ بے حس اور مردہ دل۔ پتھر کا مجسمہ، برف کا تودہ! بھلا پرویز سے اس کی کیا مناسبت؟ میرے پرویز کی رگ رگ میں زندگی ہے' بجلی ہے۔ تصویر ہی میں وہ کتنے رومانٹک معلوم ہوتے تھے اور میں نے اس دن چوری سے جھانک کر انہیں دیکھ بھی لیا تھا نا! جب ابا نے انہیں سلامی دینے کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس دن بھی زرینہ آئی ہوئی تھی اور جین بھی۔ ''دولہا بھائی آ گئے۔'' زبیدہ کی آواز آئی اور میرا دل کیسے دھڑکنے لگا۔ زرینہ اور جین بھاگ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں۔ زرینہ مجھے بھی گھسیٹنے لگی۔ ''اٹھو گلنار! تم بھی اپنے دولہا کو دیکھ لو نا۔'' میں پہلے تو جھجکی گو میرا جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ انہیں ایک نظر دیکھ لوں۔ ''امی کیا کہیں گی؟'' ''ارے! امی کی بچی اُٹھ۔ ایسا زریں موقع کھو دے گی۔''

زرینہ نے آخر مجھے کھینچ ہی لیا۔ وہ ابّا کے سامنے کیسے شرمائے کھڑے تھے۔ پھر جب وہ ہال میں آئے تو ہم نے دروازے کے سوراخوں میں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ کمبخت سوراخ کتنے چھوٹے تھے! آخر ہمیں ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ جبین نے ہمارے کمرے کی روشنی گل کردی تاکہ باہر والے ہمیں دیکھ نہ سکیں اور زرینہ نے آہستہ سے چٹخنی کھول کر ایک کواڑ کو ذرا سا کھول دیا۔ پھر کیا تھا۔ جبین اور زرینہ دونوں ٹوٹ پڑیں مگر میں جانے کیوں پیچھے ہٹ گئی۔۔۔۔

''بڑا خوبصورت نوجوان ہے گل!'' زرینہ نے فرطِ مسرت سے مجھے گلے لگا لیا۔ مَیں نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ ''میری گل! ایسا اچھا جوڑ ہے تیرا اور اس کا۔'' وہ میری ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اُٹھاتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں سے کتنی محبت ٹپک رہی تھی!۔۔۔۔ وہ پھر جھانکنے لگی۔ ''فارم بھی بہت اچھا ہے، اور آنکھیں کیسی حسین ہیں۔ ادھر آ تو گل! بڑی آئی کہیں کہ امی سے ڈرنے والی۔'' زرینہ مجھے پھر گھسیٹنے لگی۔ ''دیکھا تو نے اپنے پرویز کی آنکھوں کو؟ بخدا تیری آنکھوں کا جواب ہیں وہ تو!''

۔۔۔۔ ہاں میں نے دیکھا سب کچھ دیکھا۔ اس خوبصورت چہرے کو، ان تبسم آمیز ہونٹوں کو، ان حسین آنکھوں کو جن میں شوخی اور بے تابی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔۔۔۔ ''اری بڑا رومانٹک معلوم ہوتا ہے گل! تجھ پر دیوانہ نہ ہو جائے تو میرا ذمہ! ابھی سے کہہ دیتی ہوں گل، وہ تجھے آنکھوں میں بٹھائے گا، گلے کا ہار بنا لے گا۔'' اور میں وفورِ جذبات سے چھلکی جا رہی تھی اس کے بازوؤں میں گر پڑی۔۔۔۔۔''دیوانی، مس فنانس پر مری جاتی تھی۔ آخر تو نے کیا امیدیں باندھ رکھی تھیں اس پتھر کی سی بے حس عورت سے مسرت ہو یا رنج، غصہ ہو یا بے تابی، وہی پھیکا چہرہ وہی بے نور آنکھیں! پرویز کو دیکھ کر کتنا ایکسپریشن ہے اس کے چہرے پر، گویا جذبات کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں''۔۔۔۔۔ ہاں وہ اس وقت مجسم اضطراب نظر آ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں کس بے تابی سے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ کہیں مَیں نظر آ جاؤں؟

جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ دروازے توڑ دوں، سب کی موجودگی کو فراموش کرتے ہوئے ان کے سامنے کھڑی ہو جاؤں۔۔۔۔ کاش میں کسی پردہ کی آڑ ہی میں کھڑی ہوتی۔ ایک لحہ کے لیے پردہ کھسک جاتا اور میں ان کی طرف شوخ نظروں سے دیکھ کر مسکرا دیتی۔ پھر جلدی سے نظریں جھکا کر شرما جاتی اور انہیں دم بخود کر دیتی! ہاں وہ ضرور دم بخود ہو جاتے۔ میں اس نیلی جارجٹ کی نقرئی بارڈر والی ساری میں بہت دلکش نظر آ رہی تھی نا۔۔۔۔

ہونہہ! مَیں یہ ساری کیوں پہن کر جاؤں۔ میں جارجٹ کی ساری ہی پہنوں گی جو میرے پرویز کی لائی ہوئی ہے۔ مَیں نے ساری کھینچ کر پھینک دی جو ابھی ابھی پہن رہی تھی اور زکیہ کو آواز دی۔ زکیہ ایک برتن میں سموسے لیے جا رہی تھی۔ ''زکیہ، ذرا میری نیلی ساری لے آنا وہی جارجٹ کی۔'' ''اچھا لے آؤں گی مگر تم جلد آنا۔''

مَیں نے بے پروائی سے اس کمرے کی طرف نگاہ کی۔ مس فنانس ہاتھ پر ٹھوڑی رکھے اوپر دیکھ رہی تھیں۔ جذبات سے خالی بے نور آنکھیں، بے حد پتلے، پھیکے رنگ کے ہونٹ، زرد چہرہ جس پر چیچک کے داغ ہی داغ تھے۔ مجھے ایسا دکھائی دینے لگا کہ وہ داغ بڑھ رہے ہیں گہرے ہو رہے ہیں اور پھیلتے جا رہے ہیں، ان کی صورت کیسی کریہہ ہوتی جا رہی تھی! میں جلدی سے اندر کھسک گئی اور سر کو زور سے جھٹکا دیا کہ دماغ پر کھنچی ہوئی تصویر مٹ جائے۔ اس کی جگہ دماغ کے پردہ پر ایک اور تصویر ابھرنے لگی۔ پرویز کی! وہ خوبصورت نیلی آنکھیں، بڑی بڑی، بادامی، نشیلی، لانبی خمیدہ پلکیں، بیضوی چہرہ، کشادہ حسین پیشانی اور ہونٹ؟ کتنی حسین تراش تھی ان ہونٹوں کی۔ رسیلے بھرے ہوئے اور کناروں پر وہ ہلکا سا خم گویا وہ مسکرانے کے لیے ہی بنائے گئے ہوں۔ وہ سانولا سانولا رنگ، شیام سندر! ہاں میرے شیام اور میں رادھا! میں نے میز پر رکھی ہوئی تصویر اٹھا لی، پرویز کی، اور فرطِ بے تابی سے اسے چوم لیا۔ ''یہی ساری نا؟'' میں نے گھبرا کر تصویر رکھ دی۔ زکیہ ساری لیے کھڑی تھی۔ ''ہاں یہی۔'' ''آپا جلدی آؤ نا۔ سموسے ٹھنڈے ہو رہے ہیں اور یہاں ساریوں پر ساریاں بدلی جا رہی ہیں۔ ادھر یہ بے پروائی اور ادھر دیکھو تو بے چاری مس فنانس نے گلنار گلنار ہی کی رٹ لگا رکھی ہے۔''

''اچھا ابھی آئی۔ میں نے پھر تصویر اٹھا لی اور سب کچھ بھول کر اسی حسین تصور میں کھو گئی۔ کیسا ہنس مکھ چہرہ۔ آہا یہ ہونٹ، نظر پہلے ان ہونٹوں پر ہی جا جمتی تھی۔ یہ ہونٹ اور .... اُف کیا خیال آ گیا۔ میں مارے شرم کے عرق عرق ہو گئی۔ میں نے

تصویر رکھ دی اور ساری پہننے لگی۔۔۔ان کی شخصیت میں کتنی دلکشی تھی۔اُف کس بلا کا بجیلا پن! گٹھا ہوا بدن، دراز قد، چوڑا چکلہ سینہ، لانبے مضبوط بازو۔ان بازوؤں میں۔۔۔۔۔۔اُف پھر کیسے خیال آرہے تھے۔۔۔۔۔جیسے رگ رگ میں بجلیاں کوند رہی تھیں، دل کی دھڑکن کیسی تیز ہورہی تھی! اور خون جیسے اُبلا جارہا ہو۔نس نس میں گرمی، آگ، اُف یہ جذبات کا ہجوم، یہ طوفان! میں بستر میں گر پڑی اور تکیوں میں منہ چھپالیا۔یہ ہیجان کیسی لذت تھی اس میں!

''گلنار آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟'' میں نے چونک کر دیکھا۔امی کھڑی تھیں۔ان کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔''مس فانس کب سے تمہارا انتظار کررہی ہیں۔تمہیں کچھ پاس بھی ہے بڑوں کا۔اور وہ تو تمہاری استانی ہیں۔'' امی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

''تمہارا انتظار کررہی ہیں۔'''' تمہیں کو یاد کررہی ہیں۔'''' تمہارے نام کی رٹ لگا رکھی ہے''۔

اچھا بھئی جاؤں گی۔۔۔ہاں، کیوں نہیں؟ ضرور جاؤں گی۔یہ ساری پہن کر جو میرے پرویز نے لا کر دی ہے اور ہاں وہ انگوٹھی بھی پہنوں گی جو پرویز سے میرے منسوب ہونے کی نشانی ہے۔میں نے ایک چھوٹی سی مخمل کی ڈبیا نکالی۔کیسی خوبصورت انگوٹھی تھی۔میری انگیجمنٹ رنگ پر پرویز کے نام کا پہلا حرف کس خوبصورتی سے تراشا گیا تھا! ہیروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کیے دی رہی تھی اور ان سفید نگینوں میں ایک سبز رنگ جگمگا رہا تھا۔میں نے فخر سے دیکھا اور انگوٹھی پہن لی۔ہاں اسی طرح جاؤں گی اور انہیں بتادوں گی کہ مجھے اپنی شادی کی کس قدر خوشی ہے۔وہ اپنے دل میں خیال کررہی ہوں گی کہ میں ان سے شرمندہ ہوں منہ بسورے ہوئے بڑی ہی مغموم صورت بنائے ان کے پاس آؤں گی۔درد بھرے لہجے میں اپنی مصیبت بیان کروں گی کہ میرے دل پر کیا بیت رہی ہے اور شاید رونے بھی لگوں۔ہونہہ! میں انہیں کیسے حیران کردوں گی! ساری پر نظر پڑتے ہی کہہ اٹھیں گی نا۔''کیسی خوبصورت ساری ہے'' اور میں بڑے فخر سے کہوں گی کہ یہ پرویز لائے ہیں۔پرویز ہی کی باتیں کروں گی۔خوشی سے جھومتی ہوئی انہیں بتاؤں گی کہ پرویز کس قدر حسین ہیں۔انھیں اپنی شادی میں شرکت کرنے کے لیے اصرار کروں گی اور۔۔۔۔۔جذبات کی شدت کا پورے طور پر اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دوں گی کہ میں پرویز سے کتنی محبت کرتی ہوں۔یہ سن کر بس جل ہی جائیں گی۔جلیں گی؟۔۔۔۔ضرور۔اس وقت جب میں چھٹی لیے بغیر گھر آئی تھی وہ بار بار پوچھ رہی تھیں نا۔''گلنار! کہیں تمہاری شادی تو نہیں ہورہی ہے؟'' میں نے کہا۔''نہیں'' انہیں یقین ہی نہ آتا تھا۔''تم مجھ سے چھپاتی ہو گلنار!'' اور جبھی تو انہوں نے میری منگنی کی خبر ملنے پر مبارک باد تک نہ لکھ بھیجی تھی۔۔۔۔۔اور اب تو میرے چہرے پر بجائے رنج کے یہ وفورِ شوق، مسرّت اور بے تابی دیکھ کر کیسے جل اٹھیں گی۔ہونہہ! جلیں گی تو جلیں! خوب جلیں میری بلا سے!!

مَیں نے چلتے چلتے پرویز کی تصویر بھی لے لی۔

○○○

ڈرینج میں گرا ہوا قلم

ایک دستاویزی سیاہ رات کی تاریخ ختم ہوتے ہی جب ہم صبح کو اٹھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو پیٹ کی روائتی خرابی ہمیں بستر سے ایک انچ بھی حرکت نہ کرنے پر بے بس کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود ہمیں ایک قلم دیا جاتا ہے کہ ہم اس سے آنے والی رات کا ویسا ہی من وعن پروگرام لکھیں، جو پچھلی دستاویزی سیاہ رات کا رہا ہوگا۔

ہمارے پیٹ میں ایک تیزابی مروڑ ہوئی جلن کے ساتھ درد ایک خاص حصہ میں یکا یک رک گیا۔ یعنی اگر رکتا نہ تو کسی طرح باہر ضرور خارج ہو جاتا۔ درد اور گاڑھا ہو گیا۔ لیکن ہمیں پہلی بار انتہائی غصہ آیا۔ ہم نے قلم کو مٹھی میں بھینچ دیا۔

''ہم پروگرام میں تبدیلی چاہتے ہیں۔'' ہم نے سوچا۔

''قلم میں کتنی روشنائی موجود ہے؟'' سوال کسی کو مصروف کرنے سے اٹھا اور اگلی مصروفیت کے ریہرسل کے لئے تیار ہو گیا۔

یعنی سیاہی موجود ہے، ریہرسل ممکن ہے۔

ہم نے مٹھی کی ابتدائی گرفت غصہ کے ردعمل میں بدل لی۔ قلم کو انگوٹھے اور اس کے ساتھ کی دو انگلیوں کے درمیان مضبوطی سے دبالیا اور خود سے اعلان کیا کہ پہلے ہم تمام خراب پیٹوں کے نام سے ایک اہم مسودہ تیار کریں گے۔ سیاہ دستاویز سے بالکل مختلف!

سارا عمل روشنی میں ہوگا۔

''لیکن عمل کا تعلق کس سے ہے؟'' کوئی بھی پوچھ سکتا ہے۔

کیا ان خودسر محبوباؤں سے، جو محض اپنے پیٹ کی خرابی کی بناء پر ہی ہمارے لئے تنگ ہوئیں! حتیٰ کہ وہ مخالف ہوا، جوان کے پیٹ سے نکل کر باہر کھلی ہوا میں ملنا چاہتی ہوگی، دوبارہ ان کے دماغ کی طرف پلٹ گئی۔ انہوں نے چہرے سکوڑ لئے۔ ان کی آنکھوں کا رنگ بدل گیا۔ دراصل یہ سب کچھ ہمارے خلاف ہوا حالانکہ اس سے ہمارے قلم میں کافی روشنائی تھی۔ کیونکہ ہم اب بھی جو کچھ خارج کرتے ہیں، پھیل جاتے ہیں۔ ہم تو ان عورتوں کے پیٹوں میں بھی تنگ نہیں ہوئے، جب ہم ان میں درزہ تھے۔ وہ عورتیں جو بے وقوف تھیں۔ کیونکہ وہ مرچکی ہیں۔ لیکن ان کے پیٹوں کو ہم نے نہیں ان کے شوہروں نے خراب کیا تھا۔

ہم کسی مری ہوئی ذمہ داری کو جھیلنا نہیں چاہتے۔'' ہم نے یہ اعلان بنا مائیکروفون کے کیا تھا۔ سو برا یہ ہوا کہ منہ سے نکلی ہوئی آواز دور تک نہ پھیل سکی۔ جب کہ ہم کچھ چھپانا بھی نہیں چاہتے تھے۔ گلے سے ہم کچھ بول بھی نہ سکے۔ اپنے ہی ہاتھوں کا بوجھ اپنے گردزدہ چہرے پر رکھے، ہم ان سوالوں کا انتظار کرتے رہے، جو ہم سے کسی وقت بھی کئے جا سکتے ہیں (مطلب یہ کہ ابھی کئے نہیں گئے۔)

اس عمل میں، ہم سوالوں کو تو سُن سکتے ہیں لیکن سوال کرنے والے چہروں کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس کے لئے ہمیں اتنا عرصہ درکار ہوگا۔ جتنی دیر میں وہ چہرے ہمارا ضمیر بن جائیں۔

گویا ہمیں ضمیر کا سفر یاد ہے۔ اتر پردیش کے ضلع بلیا میں ایک گھنی مگر کچی سڑک پر ہم نے جس گنوار کو، جو مٹر کے ستو کے ساتھ اس میں تین گنی دھول ملا کر کھاتے دیکھا۔ اس کا کھردرا میلا چہرا ہم سے پوچھ سکتا تھا کہ ہم اس کی طرح دھول کو رکیوں نہیں بن جاتے!

ہم دھول بھی نہ کھا سکے۔ ہمارے پاس سے بہت سی چیزیں، اور عورتیں نکل گئیں۔ ہم انہیں پہچان بھی نہ سکے۔ ورنہ ہم سے وہ بیمار گدھا بہ درجہا بہتر تھا، جس کی ٹانگوں کے بیچ میں ایک بڑا سا ناسور تھا اور جلد کی سیاہی ادھڑ ادھڑ کر ناسور کے بدگوشت کے ساتھ جھولنے لگی تھی۔ وہ لنگڑا لنگڑا کے چل رہا تھا۔ ایسے میں ہمارا یہ سمجھنا لازم ہوگا کہ وہ اپنے آس پاس چرتے صحت مند گدھوں کی

برابری نہیں کرسکتا۔ وہ اپنی نسل نہیں پیدا کرسکتا۔ لیکن اس کے برعکس وہ ضرورت پڑنے پر صحت مند گدھوں کی بہ نسبت زیادہ ہی
بہک جاتا ہے اپنی نسل پیدا کرنے کے لئے دوڑتا ہے۔ صحت مند گدھوں پر حملہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی چھپی ہوئی توانائی
جانے کیسے بدگوشت کے ڈھیر سے نکلتی ہے اور دوڑ کے نتیجہ سے جاملتی ہے۔

ڈھول خوار گنوار اور بیمار گدھا...... یہ ہمیں، ہماری بساط سے کہیں زیادہ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ورنہ ہم تو مدتوں سے
محض چوہوں کے محکوم ہیں اور اتفاق سے یہ چوہے، بہت چالاک ہیں۔ کیونکہ انہوں نے بہت پہلے ہی ہماری بساط معلوم کرلی تھی
کہ ہمارا پیٹ کسی طرح بھی بھر دیا جائے بشرطیکہ ہم ان کی پہریداری کریں۔

سوجنوبی شہر میں ہمیں چوہوں کی پہرے داری ملی۔ تب چوہوں کے دُم برداروں نے کہا۔ ''چلو روٹی کا تو انتظام ہوا۔''

ہمیں بتایا گیا کہ فلاں چوہے کا فلاں بل ہے اور فی الحال ہمیں وہیں پہرے داری کرنی ہے۔

گویا ایک چوہا ایک مرتبہ پر پہنچ چکا ہے یوں ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ ایئر کنڈیشنڈ بل میں بیٹھا ہے اس کے ہاتھوں میں ایک
قیمتی پنسل ہے، جسے وہ کتر رہا ہے اور اس کے پہلے سے کی گئی مینگنیاں میز پر پڑے کاغذ پر بکھری ہوئی ہیں۔ ہم اس کی میز کے پاس
ہی کھڑے ہیں۔ جانے وہ ہم سے کب مخاطب ہوا۔ اس کا بوڑھا چپڑاسی اس کے حکم کے ساتھ ہی ''پانی لاؤ'' پندرہ منٹ سے پرچ
میں پانی کا گلاس لئے کھڑا ہے بڑھاپے کی کمزوری سے اس کا ہاتھ کپکپا رہا ہے۔ لیکن چوہا اتنے انہماک میں مبتلا ہے کہ اس کو پندرہ
منٹ سے پرچ میں پانی کا گلاس لئے کھڑا بوڑھا چپڑاسی نظر نہیں آتا۔ اگرچہ دم بردار اور ہم پاس ہی کھڑے دیکھ رہے ہیں کہ مبادا
بوڑھے کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ جائے لیکن سب مصلحتاً چپ ہیں۔ حسب عادت صاحب مرتبہ چوہے کا پیٹ خراب ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ مسودہ روشنی میں تیار کیا جائے۔

لیکن پہلے تو ہمیں خود بستر سے اٹھنا ہے۔ خود ہمارے پیٹ میں جو کچھ ہے، اسے کہیں نہ کہیں خارج کرنا ہے اور ہمیں جو قلم
دیا گیا ہے، اسے پورے دن سے گزرنا ہے۔ ممکن ہو، قلم میں روشنائی موجود ہو...... ہمیں شام سے پہلے ہی تمام خراب پٹیوں سے
گزر جانا ہے۔

سوالوں کے انتظار میں ہم اس روائتی ضمیر سے مایوس ہو چلے جس کی بناء پر ہم مسودہ ترتیب دینے میں خود سے آمادہ ہوئے
ہوں گے لیکن سوال جب اپنے انتہائی لازمی کرب کے باوجود بھی ادا نہ ہو سکے تو اچانک ہمیں ادھورے رہ جانے کا احساس ہوا اور
اس ناگہانی ادھورے پن میں ہمیں یہ اندازہ نہ ہوا کب بستر سے اٹھے۔ حالانکہ شہر میں کچھ دن سے پھر لاکھوں خراب پٹیوں کے
پرانے ذخیروں کا مسئلہ سڑکوں پر دہرایا جا رہا تھا۔

''ذخیرے کہاں ہیں؟''

گوداموں میں جمع ہیں۔

''تو کیا لاکھوں لوگوں کی بھیڑ ان ذخیروں کو گوداموں سے باہر نکال لے گی!'' مسئلہ کا دباؤ بہر حال ہم پر پڑتا ہے۔

آخر کچھ لوگ ایسے بھی تو ہیں جو پرانی خرابی سہ سہ کر اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ بلکہ ان کے کولہوں پہ...... بار بار دہرائے
ہوئے تجربوں کے نشان ہیں۔ وہ کئی کئی دن تک خالی پیٹ اپنے کولہوں پر ضرب جھیل سکتے ہیں۔ ان کے چوگرد مطالبوں کی تختیاں
لگی رہتی ہیں۔ وہ چلاتے ہیں کہ انہیں ان کی گم شدہ غذاؤں کے ذخیرے سونپ دیئے جائیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ جو بھی
مطالبہ منظور نہیں کرتے وہ محض ضرب لگاتے ہیں۔ کانوں میں آوازیں نہیں بلکہ پھٹے ہوئے نرخرے سنائی دیتے ہیں اور ہم جبراً اس
لئے سن لیتے ہیں کہ کل یہ بھی نہیں سنائی دیں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس ملک کے لوگ صدیوں سے محض فضلہ ہیں۔ انہیں کسی طرح
بحر ہند میں اٹھا کر پھینک دیا جائے۔ مگر کون پھینکے گا؟ پھر یہ کہ ہم خود ٹریفک سے بچ بچ کر سڑک پر چل رہے ہیں اور یوں چلنے کا
ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جس قدر ہم خود کو محفوظ سمجھنے کی غلط فہمی میں ہیں اتنے ہی تناسب سے ہم اپنی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ ہم
کون ہوتے ہیں۔ لوگوں کو بحر ہند میں پھنکوانے والے؟

نظامیہ دواخانہ کے پاس ہم رک جاتے ہیں۔ ہمیں یاد آتا ہے کہ پچھلے سال جب ہم اس شہر میں نئے نئے آئے تھے تو ہم

نے لوگوں سے درخواست کی کہ ہمارے پاس بھی ایک قلم ہے لہٰذا ہمیں بھی پہچانا جائے۔ ہم خالی ہیں، ہمیں کچھ بھر دیا جائے۔ لوگوں نے ہماری درخواست منظور کی اور ہمیں مذکورہ دواخانہ کے ایک وارڈ میں داخل کرا دیا۔ اور یوں روٹی اور رہائش کا مسئلہ حل ہوا تو ہم نے بھی فاضل حکیموں اور وارڈ کے کارکنوں کو اچھی طرح یقین دلا دیا کہ ہم کون ہیں؟

ایک سال کا عرصہ کچھ زیادہ تو نہیں۔ دواخانہ کے کارکن تو ہمیں پہچانتے ہی ہوں گے۔ وہاں برآمدہ میں ایک فلش ہے اس سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے جب کہ میونسپلٹی کے بیت الخلا عام طور پر خالی نہیں ہوتے۔ پھر وہاں خاک روب صفائی کے لئے تھوڑے سے پانی کے عوض پانچ نئے پیسے لیتے ہیں اور اتفاق سے اتنے پیسے بھی ہمارے پاس نہیں (گویا پیٹ خالی کرنے کے لئے بھی پیسے چاہئیں) کم از کم دواخانہ کے فلش کے لئے تو ہمیں پیسے نہیں دینے پڑیں گے۔ ہاں ممکن ہے، کوئی کارکن اجنبی سمجھ کر ہمیں روکے پھر بھی ہم بڑے اعتماد سے اسے پرانی جان پہچان یاد دلائیں گے۔ ہم اسے قائل کریں گے کہ ہم دراصل مسائل سے بس کچھ ہی دیر کے لئے بھاگ کر آئے ہیں، ہمیں پھر مسائل ہی میں شامل ہو جانا ہے۔

برآمدہ میں کوئی کارکن دکھائی نہیں دیتا فلش کا دروازہ پہلے سے ہی کھلا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے پہلے لوگوں نے کئی بار ڈریج کو استعمال کیا ہے۔ لوگ بڑی عجلت میں ہوں گے۔ شاید وہ فلش کی زنجیر کھینچ کر وہ سب کچھ بہانا بھول گئے، جسے ہم چاہیں تو بہا سکتے ہیں۔ سو، ہم زنجیر کھینچتے ہیں مگر فلش کام نہیں کر رہا ہے۔ ٹنکی میں محض پانی کے قطروں کے رک رک کر گرنے کی آواز سنا دیتی ہے، جس کا صاف مطلب ہے کہ پانی اپنی ایک مقررہ سطح تک پہنچ رہا ہے یا بار بار کے استعمال سے پانی بہت کم رہ گیا ہے۔ اس کے باوجود ہم اپنے ایک جانے پہچانے آسن کے سہارے ڈریج کے نشیبی سوراخ کا احاطہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔

ہماری ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے باوجود بھی ہم جلد سے جلد فلش سے باہر نکلنا چاہتے ہیں کیونکہ اس عرصہ میں غالباً کئی بار دواخانہ کے کارکن فلش کے دروازے کو کھٹکھٹاتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے، انہیں اختیار حاصل ہے یا انہیں پتہ لگ گیا ہے کہ ہم باہر سے آ کر فلش میں بغیر کسی اطلاع کے داخل ہو گئے ہیں۔ اس لئے انہیں اختیار ہے کہ پرانی جان پہچان کی پروا کئے بغیر ہمیں جبراً باہر نکال دیں۔ اس خوف کو ضرورت سے زیادہ محسوس کرتے ہوئے ہم عجلت میں اٹھتے ہیں۔ اٹھتے ہی سر چکرانے لگتا ہے، ٹانگیں لڑکھڑاتی ہیں اور اچانک جیب سے قلم پھسل کر ڈریج کے سوراخ میں گر جاتا ہے۔ ہم بہت زور سے چلاتے ہیں "افسوس ہمارا قلم"...... آواز ہمارے سر میں چکرا رہی ہے۔ مطلب یہ کہ ہم اپنے اندر ہی چلاتے ہیں۔ آواز فلش سے باہر نہ جا سکی۔ یوں بھی دروازہ کے ساتھ فلش کی کھڑکیاں بھی بند ہیں۔ اب تک تو ہم اشتہاری مردی کے وہم میں رہے۔ لیکن باہر مسائل بہت طویل ہیں۔ ہم ان میں شامل ہوں تو کیسے ہوں! یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم خود سوراخ میں ہاتھ ڈال کر کسی طرح قلم کو ٹٹولیں اور اسے باہر نکال لیں یوں، ہم سوراخ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جھانک رہے ہیں لیکن قلم نظر نہیں آتا۔

بنا قلم کے ہم پھر ٹریفک سے بے ربط سڑک پر چلنے لگتے ہیں۔ اگرچہ موسم اور شہر کے درمیان ایک طرح کی تجارتی خنکی کا معاہدہ سا ہے۔ ایسے میں چالاک لوگ کافی فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ انہیں درمیانہ یا آہستہ رفتار سے چلنے میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ ٹریفک اس لئے بے ربط ہے کہ شہر کا مزاج صنعتی نہیں۔ بھیڑ تو محض اطمینان اور تفریح کی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ ہر حال میں مطمئن دکھائی دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور اتنی کثرت سے کہ ہم شمار نہیں کر سکتے۔ معطل خاندانوں کی عورتیں آٹو رکشوں میں سوار شہر کے پل سے دوسری طرف جا رہی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ انتہائی قیمتی ہو جائیں گی، فلاں ہال میں ساٹھ سال کا ایک فلاں بوڑھا، سامعین اور تماشائیوں کے سامنے اسٹیج پر اپنی عملی سوانح عمری دہرا رہا ہے۔ درجنوں دانشور، ادیب اور اخبار نویس بڑے مزے سے اس کو وہم میں مبتلا کر رہے ہیں کہ اس کی عمر پھر ایک بار پیچھے کو گھوم گئی ہے۔ نوجوان عورتیں چونک چونک کر اسے دیکھ رہی ہیں اور ہم جو خون کی کمی کی بناء پر یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتے، حسد کے مارے اسے گالیاں دینے لگتے ہیں۔ مگر ہال میں جتنے لوگ بھی موجود ہیں ان کے چہروں پر فاضل رطوبت مل دی گئی ہے گویا ملک میں کہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سبھی تفریح میں مبتلا ہیں۔ تھری ایسز بار کے مقابل مین روڈ پر جو شاندار ہائی مٹرنٹی ہوم ہے، اس میں دیسی زبان کے ایک ادھیڑ شاعر کی لڑکی کے پیٹ سے ایک لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اتفاق سے لڑکی کے شوہر کا باپ بھی وہی زبان کا ادھیڑ شاعر ہے۔ دونوں ادھیڑ

شاعر، منزینی ہوم کے گول برآمدہ میں بیٹھے ہیں۔ دونوں بہت خوش ہیں اور انہیں بدھائی دینے کے لئے شہر کے کئی دیسی زبان کے ادھیڑ اور بوڑھے شاعر وہاں جمع ہو رہے ہیں۔ یہ منظر کچھ ایسا ہے کہ حق دار ہیجڑے اپنی حق تلفی دیکھ کر واپس چلے گئے ہیں اور ہم تو ایسے ناکارہ ہیں کہ ہمیں ہیجڑوں سے بھی ڈر لگتا ہے۔

حالانکہ اس عرصہ میں ہم نے ڈرینج صاف کرنے والے گاڑھے کپڑے کی ملگجی وردی پہنے کئی خاک روبوں کو راہ میں روک روک کر پوچھا کہ کیا ان میں سے کوئی ہمارا قلم ڈرینج سے نکال سکتا ہے؟ لیکن ہر خاک روب ہمیں چونکہ کر دیکھتا ہے، بلکہ پاگل سمجھتا ہے۔ اس کے باوجود جب ہم ان سے بار بار درخواست کرتے ہیں تو ان میں سے کچھ خاک روب ہم پر رحم کھا کر ہمیں اپنی یونین کے سیکرٹری کے پاس لے جاتے ہیں۔ سیکرٹری جو اپنے لباس سے کسی سیاسی پارٹی کا رکن معلوم ہوتا ہے، ہمیں سر سے پاؤں تک گھورتا ہے۔ ''فرمایئے۔''

یہ ایک ایسا انداز ہے جو ایک طرح کی تفریحی ناگواری ظاہر کرتا ہے...... ایسے میں اگر ہم اس پر اصل واقعہ واضح کر دیں تو وہ ضرور ہمارا مذاق اڑائے گا۔ لہٰذا ہم فوراً طے کرتے ہیں کہ ہم اس سے عام باتیں کریں۔ مگر پتہ یہ چلتا ہے کہ وہ خود پہلے سے تیار ہے کہ وہ بھی کوئی خاص بات نہیں کر سکتا۔ اگر اس حد تک ہی ہمیں یہ علم ہو جائے کہ ایک بے ربط آبادی کے لاکھوں پیٹوں کا فضلہ صاف کرنے والے بھی پیٹ کے مسائل میں مبتلا ہیں تو ظاہر ہے ہمارا مقصد حل نہیں ہوتا۔ اس طرح تو ہم میں آئندہ اپنے گم شدہ قلم کی خواہش بھی نہیں رہ جائے گی۔ کم از کم اتنا فرق تو باقی رہنا چاہئے کہ ہم اس کی ضرورت محسوس کریں، اسے تلاش کریں۔

سو ہم تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ کئی بار ہمیں، شہر کا مزاج بالکل ست کر دیتا ہے۔ ہمیں بھلاوا دیتا ہے کہ ہم ہر شے سے لاپروا ہو جائیں۔ جس کا تعلق ہم سے ہو۔ اس کے باوجود ہم مصر ہوتے ہیں کہ اصل واقعہ کا دھیان جب تک باقی ہے، تعلق بھی باقی رہ سکتا ہے۔

ڈرینج سکشن کا انچارج فیصلہ دیتا ہے۔ ''ناممکن۔''

اسے معلوم ہے کہ واقعہ رونما ہوا، لیکن جس کے لئے ہوا، وہ ڈرینج کے اختیار میں ہے۔

''تو کیا ہم اسے حاصل نہیں کر سکتے!'' ہماری مایوسی میں تجسس باقی ہے۔ ڈرینج کا انچارج محسوس کرتا ہے۔ ''فضول''

مطلب یہ کہ اب کچھ باقی نہیں ہے۔ انچارج کا فیصلہ بہت حد تک درست ہوگا۔ کیونکہ اتنا تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ ڈرینج لائن بالکل سیدھی جاتی ہے یوں جب لوگ پیٹ بھرنے یا پیٹ خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ٹیڑھی تدبیریں کرتے ہیں۔ ہر موڑ پر مین ہول بناتے ہیں اور انہیں ڈھانپ دیتے ہیں لیکن ڈرینج کو عام طور پر کھلا رکھتے ہیں تاکہ ان کے پیٹ کی خرابیاں کہیں نہ رکیں۔ سیدھی لائن میں بہہ جائیں شاید ہمارا قلم بھی ہمارے پیٹ کی خرابی ہوگا، جو سیدھی لائن میں بہہ گیا۔ شاید مسودہ ترتیب دیتے ہوئے ہم نے ٹیڑھی تدبیروں سے کام لیا ہوگا۔

ooo

اسد محمد خان

غصے کی نئی فصیل

حافظ شکر اللہ خان اپنی بات اجمالاً ہی کہنا پسند کرتا تھا۔

حافظ شکر اللہ خان اچھا خاصا صاحب علم اور کم گو آدمی تھا، شاید اسی لیے اپنی بات اجمالاً کہنا پسند کرتا تھا، چناں چہ اسے تفصیلات سے اور وقت ضائع کرنے سے اُلجھن ہوتی تھی۔

گٹھے ہوئے ورزشی بدن کا یہ پڑھا لکھا روہیلہ، آس پاس کے دیہات میں غصہ ور مشہور تھا۔ شاید اسی لیے پیٹھ پیچھے اسے حافظ کا گینڈا کہا جاتا تھا۔

یہ بات بھی حافظ شکر اللہ خان کے علم میں تھی کہ اسے حافظ گینڈا کہا جاتا ہے مگر وہ ایک نوع کے حلم و درگزر سے کام لیتا تھا۔ اس نے اب تک صرف اُن لوگوں کو زدوکوب کیا تھا جنہوں نے توہین کے ارادے سے اور عمداً اسے اس کے منہ پر حافظ گینڈا کہا تھا۔ نادانستہ گینڈا کہنے والوں، بچوں اور ہم چشموں کی بے تکلفانہ بے ادبی کو وہ منہ پھیر کر ٹال دیا کرتا تھا۔

حافظ شکر اللہ خان گینڈے میں ایک عجیب بات اَور بھی تھی۔ وہ لادین لوگوں اور دوسرے مذہبوں مسلکوں والوں سے بھی خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا۔ کہتا تھا بھل منسی میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ وہ ہمارا کیا لیتے ہیں جو ہم سے متفق نہیں، وہ بے چارے تو ویسے ہی نقصان میں ہیں۔ دیہات میں بسے ہوئے کسی ملّاں کا یہ رویہ عامتہ المسلمین کو حیران کر دینے کے لیے کافی ہونا چاہیے تھا، مگر لوگ حیران نہیں ہوتے تھے.... انہیں حافظ شکر اللہ خان کا مزاج معلوم تھا۔

حافظ شکر اللہ خان کوہِ سلیمان کے دامن میں دریائے گومل کے کنارے آباد ایک گاؤں روہ ری میں رہتا تھا۔ اس نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ روہ ری گاؤں، صاحب السیف سلطانِ عادل، شیر شاہ سُوری کے بزرگوں کا آبائی وطن ہے۔ شیر شاہ کے دادا ابراہیم خان سوری اپنے نوعمر بیٹے میاں حسن خان کے ساتھ روہ ری سے چلے تھے تو پھر لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ ابراہیم خان نے پنجاب کے شہر نارنول میں اور میاں حسن خان سوری نے سہسرام، بہار، میں انتقال کیا تھا۔ سب کی طرح حافظ شکر اللہ خان بھی سمجھتا تھا کہ جب باپ اور دادا نہیں آئے تو اب سلطان شیر شاہ اس بھولے بسرے گاؤں میں کیا آئیں گے۔ اس طرح استدلال کر کے حافظ شکر اللہ خان نے طے کیا کہ اگر پہاڑ میری طرف نہیں آتا تو لاؤ میں ہی پہاڑ کی طرف چلوں۔ پس شکر اللہ خان گینڈے نے گھر والوں سے مشورے کے بعد دارالخلافہ جانے کا ارادہ کر لیا اور تیاریاں شروع کر دیں۔ شکر اللہ خان نے ملک پنجاب و ملتان سے آگے سرہند، بہار، بنگالہ، مالوہ اور خاندیش کے نظم و نسق اور خوش حالی کے قصے اور عالموں، دانش مندوں کا احوال سنا تھا۔ اس نے روہ ری گاؤں کے فرزند جلیل فرید خان شیر شاہ کے قصے سنے تھے جس نے قلیل مدت میں آٹھ سوکوس لمبی شاہراہ بنوائی تھی، زمینوں کا انصرام درست کیا تھا، ہند کے شورش زدہ علاقوں میں امن قائم کیا تھا، اور اپنی تلوار اور تدبر سے فتنہ انگیزیوں اور شرارتوں کا خاتمہ کر کے خلقت کے لیے خدا کی زمین رہنے لائق بنا دی تھی۔

شکر اللہ خان گینڈا ایک بار یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بار سلطانِ عادل شیر شاہ کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اللہ کا نام لیا، گھوڑے پر زین کسی، گاڑھے کی ایک چادر میں وہ کتابیں باندھیں جن سے زیادہ دن جدا نہیں رہا جا سکتا تھا، اور شیر شاہ سے ملنے چل پڑا۔

حافظ شکر اللہ نے اپنے بڑوں سے سیکھا تھا، اور سرکاروں درباروں سے ہو کر آنے والوں سے سن رکھا تھا، کہ لوگ کسی تاج دار کی خدمت میں پیش ہوں تو انہیں نذر گزارنی ہوتی ہے، کوئی ایسا تحفہ دینا ہوتا ہے جو پیش کرنے والے اور قبول کرنے والے دونوں کے لیے قیمتی ہو۔ حافظ نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ حضرتِ والا جاہ، سلطانِ ہند کے لیے اسے کیا سوغات لے جانی چاہیے۔

حافظ شکر اللہ خان روہ بری سے کچھ رقم لے کر چلا تھا۔ حسن ابدال میں محبت کی ماری پھوپھی نے مٹھی بھر چاندی کے سکّے حافظ کے کیسے میں ڈال دیے تھے اور لاہور تک جن بافندوں کے ساتھ آیا تھا وہ بھلے لوگ تھے، حافظ کو راہ میں کچھ خرچ ہی نہ کرنے دیتے تھے، کہتے تھے ہمارے لیے یہ سعادت کی بات ہے کہ ایک عالم وفاضل ملّاں ہم سفر ہے۔ چناں چہ دارالخلافہ جاتے ہوئے شکر اللہ خان کے پاس اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ راستے بھر بنجارے اس کوشش میں لگے رہے کہ اس رقم میں سے کچھ ہتھیالیں مگر حافظ گینڈے نے موقع ہی نہ دیا۔ بنجارے اس کے علم وفضل سے تو کیا مرعوب ہوتے، گینڈے نے اپنے گٹھے ہوئے بدن اور اپنی تلوار سے انہیں قابو کیا اور بالآخر رسد کے اس قافلے سے بچھڑ ہی جانے میں عافیت سمجھی۔

لاہور بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ دارالخلافہ ابھی کچھ فاصلے پر تھا۔ سرکاری سرایوں میں بھیڑ بڑھتی جارہی تھی۔ پیسے کی بچت بے شک تھی مگر حافظ ہجوم سے گھبراتا تھا۔ جیسے جیسے دارالخلافہ نزدیک آرہا تھا سڑک کے آس پاس بستیوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی۔ ان بستیوں میں مساجد بھی تھیں اور نجی کی سرائیں، مہمان خانے بھی۔ حافظ شکر اللہ خان نے سوچا، مسجدوں کے منتظمین تو خوش ہو کر اسے ٹھہرا لیں گے۔ پھر خیال آیا کہ پیش اماموں، مؤذنوں کی روٹی میں حصّہ بٹانے کی بجائے کیوں نہ رقم خرچ کر کے کسی نجی سرائے میں ٹھہر جاؤں۔ منزل دو منزل سر کر کے شہر پہنچ جاؤں گا۔ پھر ضرورت پڑی تو کوئی نوکری کرلوں گا۔ دارالخلافوں میں دیگر کام ہوتے ہیں۔ تو اس طرح نجی مہمان خانوں، سرایوں میں رکتا ٹھہرتا، حافظ شکر اللہ خان دارالخلافے پہنچ گیا۔

شہر کی وہ سرائے جہاں حافظ نے ٹھہرنے کا ارادہ کیا تھا، کتب خانے کے نزدیک تھی۔ شکر اللہ خان نے سوچا، شہر گھومنے سے کیا ملے گا؟ شہر سبھی ایک سے ہوتے ہیں۔ مجھے یہاں چند ہی روز تو رہنا ہے۔ یہ دن سرکاری کتب خانے میں لگا دوں گا۔ کتابیں دیکھنے، اپنے مطلب کی چیزیں نقل کرنے سے اچھی سیر اور کیا ہوگی۔ وہ سرائے کے منتظم سے ملا، سرائے میں ٹھہرنے کا کرایہ، کھانے پینے کا خرچ معلوم کیا۔ سہولتوں کے اعتبار سے کرایہ زیادہ نہ تھا۔ کھانے پینے پر بھی وہی خرچ آرہا تھا جتنا بڑے شہروں میں اچھی سرایوں میں ہوتا ہے۔ بس ایک مشکل یہ تھی، سرائے میں کوئی سموچا کمرہ، کوٹھری خالی نہ تھی۔ سرائے کے منتظم نے کہا، ''چاہو تو چار بستروں والے کمرے میں ایک بستر آپ لے سکتے ہو۔''

حافظ بولا، ''ارے بھائی! جو ہجوم کے ساتھ ہی رہنا ہوتا تو مفت کی سرکاری سرائیں کیا بری تھیں؟'' سرائے کا منتظم کتابوں کا پشتارہ دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ یہ روہیلہ ملاّں رات بھر چراغ جلا کر کتابیں پڑھے گا یا چلّہ کھینچے گا، یہاں اس کا گزارا مشکل ہے۔ اس نے حافظ شکر اللہ کو قریب کی ایک سرائے کا پتہ بتلا دیا۔ کہنے لگا، ''آپ فاضل آدمی ہو۔ وہاں کمرہ کوٹھی خالی ملے گی، اور اپنے مطلب کے لوگ بھی مل جائیں گے۔''

''اپنے مطلب کے لوگ''، منتظم نے مسکرا کر کہا تھا۔ اس وقت یہ بات حافظ گینڈے کی سمجھ میں نہ آسکی، تاہم اس نے زیادہ غور نہ کیا۔ وہ راسیں تھامے گھوڑے کو چلاتا ہوا دوسری سرائے میں پہنچا تو خوش ہوگیا۔ یہاں ایک پورا کمرہ خالی تھا، جگہ صاف ستھری اور کم خرچ تھی اور دوسری جگہوں کے مقابلے میں شور شرابا بھی بہت کم، سمجھو نہ ہونے کے برابر تھا۔

حافظ نے سرائے کے اصطبل میں اپنا گھوڑا باندھا۔ کمرے میں کتابوں کا بقچہ، زربفت کی پوٹلی، ہتھیار اور

دوسرا سامان رکھا، کاغذ قلم دان سنبھالا اور کتب خانے کی راہ لی۔ حافظ گینڈا سخت کوش پہاڑی آدمی، کھانے پینے میں شہریوں کی طرف تکلف کیا کرتا تھا۔ کتب خانے میں دن گزارتا تھا، چار چھ مٹھی بھنے ہوئے چنے فرغل کی جیب میں ڈالے اور جم کے بیٹھ گیا۔ دوپہر بعد حافظ شکر اللہ ظہر کی نماز کے لیے اٹھا، کتب خانے کے چھوٹے باغیچے میں ترنج کے ایک ہرے بھرے پھل دار درخت کے سائے میں فرض پڑھے، مٹھی بھر چنے چبائے، پانی پیا۔ کتب خانے کی سیڑھیوں کے پاس دھوپ میں ایک پھیری والا آن بیٹھا۔ وہ کوئلے کی انگیٹھی سے برتن باندھے، بہنگی سی بنائے، راستوں، بازاروں میں عربی قہوہ بیچتا پھرتا تھا۔ سکون کی جگہ دیکھ کر اب جوستانے بیٹھا تو شکر اللہ خان کو اس تھکے ماندے کی بیٹھک بھلی لگی۔ قہوے کی طلب نہ تھی مگر حافظ نے اس سے قہوہ خریدا اور پاس ہی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پینے لگا۔ قہوہ اچھا تھا۔ حافظ شکر اللہ خان جیسے کھل اٹھا۔ دو تین فنجان قہوے کے اور خرید کیے۔ دام دے کر اٹھنے ہی کو تھا کہ دیکھا کتب خانے کے دروازے سے ایک نوعمر آدمی برآمد ہوا ہے۔ وہ ادھر ہی آ رہا تھا۔ نو وارد نے حافظ کو کتابوں کے درمیان بیٹھے دیکھا ہوگا، سلام کر کے بولا، ''فاضل! کچھ دیر بیٹھیے۔ ایک فنجان میری طرف سے پی لیجئے۔''

نوجوان نے اہلِ زبان کی رواں فارسی میں بات کی تھی۔ گینڈے نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور بیٹھ گیا۔ ''ٹھیک ہے، ایک فنجان اَور سہی!'' اس نے قہوہ لیا، نو وارد کو اپنا نام بتایا، اس کا نام پوچھا۔ آنے والا اصفہان سے آیا تھا۔ وہ اپنا نام نفے رُوز بتاتا تھا۔ دونوں ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔ نفے رُوز منطق اور تواریخ کی تعلیم لے رہا تھا اور شہر جون پور کے کسی فاضل کی شاگردی کی نیت سے گھر سے نکلا تھا۔

قہوہ ختم کر کے دونوں سیڑھیاں چڑھتے پھر کتب خانے میں جا بیٹھے۔

حافظ شکر اللہ مغرب تک کتب خانے کے فراخ دریچے سے لگا بیٹھا پڑھتا رہا۔ اذان سے کچھ دیر پہلے اٹھا اور کتب خانے سے نکل گیا۔ دور گوشے میں کتابوں کے چھوٹے سے انبار کے پاس بیٹھا نفے رُوز اصفہانی کاغذ پھیلائے کچھ نقل کر رہا تھا۔

شکر اللہ خان کا یہ پہلا دن بھرپور گزرا تھا۔ عشا سے قبل سرائے میں کھانا کھا کے اس نے بازار کا ایک چکر لگایا۔ شہر کے مرکزی علاقے میں افغانوں کے نوتعمیر مدرسے سے ملی ہوئی چھوٹی سی مسجد تھی۔ حافظ نے وہاں عشا کی نماز پڑھی۔ پھر کچھ بھٹکتا، پوچھتا پاچھتا ہوا اپنی سرائے میں لوٹ آیا۔ تھکا ماندہ تھا۔ فوراً ہی سو گیا۔

خدا معلوم حافظ گینڈے نے ایک پہر نیند لی ہوگی یا دو پہر، جو اسے آدھے جاگتے آدھے سوتے میں لگا کہ جیسے ایک آدم خور غولِ بیابانی چیختا بلبلاتا اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ بھاگتا، جان بچانا چاہتا ہے مگر زمین نے جیسے اس کے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ بدن کی پوری طاقت سے وہ خود کو آزاد کرنا چاہتا تھا۔ پہلے پہل اسے کامیابی نہ ہوئی۔ غولِ بیابانی بپھرے ہوئے اونٹوں کے گلے کی طرح بلبلاتا، تعزیر سہتے جان داروں کی طرح پکارتا، بین کرتا، اس کے بالکل پیچھے، سمجھو دو قدم کے فاصلے تک آ گیا۔ آدم خور اپنے پنجے بڑھا کر حافظ شکر اللہ کو چھو سکتے تھے، اور کسی ایک نے تو اپنا نوکیلا پنجہ بڑھا کر اس کی پشت پر خراشیں بھی ڈال دیں.... تس پہ شکر اللہ خان نے ایک دبی ہوئی چیخ ماری اور جاگ پڑا۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

معاذ اللہ! یہ کیسا خواب تھا، حافظ نے سوچا۔ مگر یہ سراسر خواب نہیں تھا، کچھ حقیقت بھی تھی۔ کس لیے چیخ پکار اور غیض کی آوازوں سے کمرہ جیسے بھرا ہوا لگتا تھا۔ حافظ کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خدا پناہ میں رکھے! یہ کیسی آوازیں ہیں؟ یہاں، اس کمرے میں، یہ کیسی بلائیں آ گھسی ہیں؟ اس نے اٹھ کر چراغ کی لو بڑھائی۔ تکیے کے نیچے ہاتھ پہنچا کر اپنی پیش قبض نکالا، نیفے میں اڑس لیا۔ کمرے میں کوئی اَور نہ تھا، بس یہ رونگٹے کھڑے کرنے والی آوازیں گرد و پیش سے، اوپر سے، حد یہ کہ فرش تک سے چلی آ رہی تھی۔

حافظ گینڈے نے بدن کو دُلائی میں اچھی طرح لپیٹا، چراغ اٹھایا، اور نیام کی ہوئی تلوار لیے کمرے سے باہر آ گیا۔ سوچ رہا تھا کہ کہیں سرائے پر رہزنوں نے تو حملہ نہیں کر دیا۔ مگر یہ بھرا پُرا شہر تھا، اور شہر بھی کونسا.... دارالخلافہ۔ شیر شاہ کی عمل داری میں ڈاکوؤں لٹیروں کی یہ ہمت کہاں ہو سکتی تھی کہ بستیوں پر یوں چڑھ دوڑیں۔ رہزنوں کی تو اس وقت بن آتی ہے اب حکمراں کمزور یا

پھر حافظ کو سرائے کی چھت پر مشعلوں کی روشنی نظر آئی۔ آوازیں چھت ہی سے آ رہی تھیں۔
زینہ تلاش کیا اور چراغ اور تلوار اٹھائے دھڑ دھڑاتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔
وہاں حافظ شکراللہ خان گینڈے نے عجیب منظر دیکھا۔
اس نے دیکھا کہ سرائے کی چھت پر طرح طرح کے چراغوں، مشعلوں، دیوں، شمعوں، روشن ہانڈیوں سے جیسے رات میں بھی دن کا سماں ہے اور چالیس سے پچاس کی تعداد میں عورت مرد دائرہ بنائے بیٹھے ہیں اور حلق سے غیض وغضب کی آوازیں نکالتے ہیں۔ کبھی تو ایسا لگتا تھا جیسے اب اٹھیں گے اور ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے..... مگر اس طیش، اتنے غضب کے باوجود کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلتا تک نہیں، دوسرے پر حملہ نہیں کرتا۔ بس اپنے سامنے بیٹھے مرد یا عورت کو غصے کی آوازیں کر کے آنکھیں نکال نکال کے دانت نکوستے ہوئے دہلائے جاتا ہے۔
حافظ گینڈے نے چراغ نیچے رکھ دیا۔ تلوار اپنے بدن کی اوٹ میں کر لی اور حیرت میں ڈوبا ہوا ان لوگوں کو چیخ پکار کرتے دیکھتا رہا۔
اس نے ان میں بہت سوں کو پہچانا۔ سرائے کا مالک، جو دن میں اپنی پشت اور کہنیاں تکیوں سے ٹکائے بیٹھا اَدھ کھلی آنکھوں سے مہمانوں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا تھا، وہاں موجود تھا۔ منتظم، جو ہر مہمان کو اپنا مالک بلکہ مرشد سمجھتا تھا اور ہر ایک کے آگے بچھا جاتا تھا، اس وقت وہاں جما بیٹھا تھا۔ مطبخ کے ملازم، جو سارا دن پکانے اور چکھنے میں گزار دیتے تھے اور کھا کھا کے وزنی ہو گئے تھے، وہ بھی بیٹھے تھے۔ کئی خدمت گار، اصطبل کے خادم اور سائیں، اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ کہ سرائے میں ٹھہرے ہوئے مسافر بھی جو اپنے لباس اور آسودہ حال طمانیت بھرے چہروں کی وجہ سے الگ پہچانے جاتے تھے، اس حلقے میں موجود تھے۔ حیرت پہ حیرت یہ تھی کہ مہمان بھی سب کی طرح چہرے مسخ کیے، دانت نکالے، آنکھیں پھاڑے اپنے سامنے والے کو دیکھتے ہوئے بلبلا رہے تھے۔
''یہ میں کن لوگوں میں آ گیا؟'' شکراللہ خان نے سوچا ''یا یہ کوئی خواب ہے؟''
مگر یہ خواب نہیں تھا۔ وہ سبھی لوگ جنہیں حافظ شکراللہ نے دن کے وقت معقول طریق پر آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے دیکھا تھا، اس وقت نصف شب گزار کر وحشت زندہ ہو رہے تھے۔ ''کیا یہ کسی قسم کے جنون میں مبتلا ہیں؟''
کیا یہ لوگ بہ یک وقت کسی دورے سے گزر رہے ہیں؟ کوئی خفیہ جماعت محفل کرتی ہے؟ یا کوئی شیطانی گروہ اپنی بھیانک رسمیں ادا کر رہا ہے؟
ابھی حافظ گینڈا یہاں سے ہٹنے اور کمرے میں اپنے سامان کے پاس لوٹنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شخص حلقے سے اٹھا اور چہرے پر اس طرح ہاتھ پھیرتا کہ جیسے نیند سے ابھی بیدار ہوا ہو، حافظ کی طرف آیا۔ حافظ نے دیکھتے ہی اسے پہچان لیا۔ یہ سائیں تھا جس کے سپرد اس نے اپنا گھوڑا کیا تھا۔ سائیں کے بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت، جو اپنے تیکھے نقوش اور اپنی کھال کی رنگت سے کسی سرد ملک سے آئی لگتی تھی، حلقہ چھوڑ کر اٹھی اور چہرے پر ہاتھ پھیرتی حافظ کی طرف آئی۔ سائیں اور عورت نے نرمی سے حافظ کا ایک ایک ہاتھ تھام لیا اور اسے حلقے کی طرف کھینچنا چاہا۔ عورت کی نگاہ حافظ کی تلوار پر پڑی تو اس نے چیختی آواز میں کہا، او ''توبہ! تم ہتھیار کیوں لائے ہو؟ یہ حلقہ غیظ کا حلقہ ہے۔ تلوار کا یہاں کیا کام؟ اسے رکھ دو..... ہمارے ساتھ آؤ۔''
شکراللہ خان نے سختی کے ساتھ عورت کی گرفت سے ہاتھ چھڑا لیا۔ سائیں نے اب تک نرمی سے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا، اب جو حافظ نے عورت کی گرفت سے ہاتھ چھڑایا تو سائیں نے سختی کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے حافظ کی کلائی پکڑی اور اسے حلقے

کی طرف کھینچنے لگا۔ ''آؤ! آؤ آغا..... اور دیر نہ کرو۔ تمہیں تو پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔''

''یہ میں کس وبال میں پھنس گیا ہوں؟ حافظ گینڈے نے غصے سے جھٹکا دے کر سائیں کی گرفت سے کلائی چھڑائی اور ہاتھ اٹھا کر دور ہو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے چراغ اٹھایا اور تیز تیز قدم لیتا زینے کی طرف چلا۔

ہاتھ چھڑا کر جاتے ہوئے اسے سبھی نے دیکھا، اس لیے پورے حلقے نے بہت ہی غضب ناک آواز میں اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے شکر اللہ خان کو یوں لگا جیسے وہ تمام چالیس پچاس وحشی جھپٹتے ہوئے پیچھے آئیں گے اور اسے پھاڑ کھائیں گے۔ حافظ گینڈے نے اتنا بھیانک غصہ یا آوازوں سے غصّے کا ایسا وحشی اظہار، پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ڈلائی لپیٹے، کسی بھی پرتشدد واقعے کا سامنا کرنے کو تیار، ایک ایک قدم اترنے لگا۔ کیا خبر کب چراغ رکھ کر اسے تلوار کھینچ لینی پڑے۔ بالآخر اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سب وحشت زدہ سرائے والے اور مسافر چھت پر اپنے حلقے ہی میں بیٹھے غصّے کے جھاگ اڑاتے اور بھیانک آوازیں نکالتے رہے، سیڑھیاں اتر کے کوئی نہ آیا۔

صحن میں آکر حافظ نے عافیت کا سانس لیا۔ وہ برآمدے میں پہنچا۔ اس نے سرائے کے منصرم کا حجرہ دیکھا، پھر قطار میں بنے مہمانوں کے کمرے دیکھے۔ سب دروازے کھلے تھے، سب کمرے خالی تھے۔ شکر اللہ خان آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کمرے میں آیا اور چراغ گیر پر چراغ رکھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

تو یہ بات تھی جو پہلی سرائے کے منتظم نے کہنا چاہی تھی۔ کہتا تھا تمہارے اپنے مطلب کے لوگ ملیں گے۔ اس گیدی نے مجھے وحشت زدہ مجنون سمجھ کر ادھر ہنکا دیا۔ شکر اللہ خان گینڈے کو اتنا غصہ آیا کہ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہ فی الفور اس پہلی سرائے کے منصرم کو جا پکڑتا اور سواری کے چابک سے اتنا دھنکتا کہ گیدی کو تا عمر یاد رہتا، مگر حالات کا تقاضا یہ تھا کہ غصّے پر فی الحال قابو پا لیا جائے، غور و فکر کیا جائے۔

''میں کسی بے آباد ویرانے میں نہیں، بستی میں ہوں۔ اور بستی بھی کیسی، ایک گنجائش سے زیادہ آباد شہر، جو شیر شاہی مملکت کے قلب میں واقع ہے، اس کا دار الخلافہ ہے۔ یہاں دیوانِ شُرطہ اور دیوانِ قانون موجود ہیں۔ سڑکوں پر سے طلایہ بھی گزرتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ میں خود کوئی کارروائی کروں؟ میں تو ان مجنونوں کے خلاف، جو خلقت کی نیند میں خلل انداز ہو رہے ہیں، شکایت درج کراؤں گا اور ابھی اسی وقت درج کراؤں گا تا کہ میری نیند خراب ہوئی سو ہوئی، دوسرے بندگانِ خدا تو سکون سے اپنی نیند پوری کر لیں۔''

حافظ گینڈے نے باہر جانے کے ارادے سے کپڑے پہننا شروع کیے۔ ابھی وہ پوری طرح تیار بھی نہ ہوا تھا کہ چھت سے آتی غیظ و غضب کی آوازیں یک لخت بند ہو گئیں۔ حافظ نے دروازہ کھول کر دیکھا، صحن میں روشنیاں اور سائے حرکت کر رہے تھے۔ پھر اکا دکا مہمان برآمدے سے گزرنا شروع ہوئے۔

ایک خوبصورت بچہ اپنی ماں کا ہاتھ تھامے گزر رہا تھا۔ حافظ متوجہ ہوا تو بچے نے مسکرا کر دیکھا۔ عورت نے بچے کو مسکراتے پا کر حافظ شکر اللہ خان کی طرف نظر کی۔ پھر بچے کے تتبع میں وہ خود بھی مسکرانے لگی۔

چیزیں لحظہ لحظہ بدلنا شروع ہو گئی تھیں۔

پہلے بچہ مسکرایا تھا، پھر اس کی ماں مسکرائی تھی، پھر اس نے گاتی گنگناتی آواز میں حافظ گینڈے کو سلام کیا تھا، ''سلام علیک فاضل! خیر باشد؟''

حافظ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مسکراتی ہوئی اس وجیہ و باوقار عورت سے کیا کہے۔ اس نے آہستہ سے کہا، ''بحمد للہ..... سب عافیت۔''

عورت بچے کا ہاتھ تھامے، اس کی طرف مسکرا کر دیکھتی اور اپنی بڑی بڑی روشن آنکھیں جھپکاتی ہوئی گزر گئی۔ سرائے کا ایک خادم برتن اٹھائے حافظ کے کھلے دروازے کے سامنے سے گزرا۔ اب وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے سر کے اشارے سے حافظ شکر اللہ کو سلام کیا اور گزر گیا۔

...دعا دی کر رہی۔

یا خدا! یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ سب لوگ جواب میری طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے ہیں، مجھے سلام کرتے اور دعا دیتے ہیں، کچھ ہی دیر پہلے میرے لیے..... اور ایک دوسرے کے لیے بھی...... دشمنوں سے بدتر تھے۔ کینے اور کدورت اور حد درجہ طیش اور غضب ناکی سے دیکھتے تھے اور خوں خوار درندوں کی طرح دھاڑتے گرجتے تھے، اور اب دیکھو کیسی اپنائیت اور مہر و محبت سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، ایک دوسرے سے چھوٹی چھوٹی مہربانیاں اور صلہ رحمی کرتے اپنے اپنے کمروں کی طرف جا رہے ہیں۔

مطبخ کا ایک فربہ اندام خادم برآمدے سے گزرتا ہوا ٹھٹھکا، پھر ادب کے ساتھ حافظ شکر اللہ کی طرف بڑھا اور بولا ''غلام نے تازہ یخنی تیار کی ہے۔ آغا کا حکم ہو تو پیش کروں؟ ان شاء اللہ پسند کیجیے گا۔''

حافظ گینڈے نے بے مہری سے اس مسخرے کی طرف دیکھا۔ لو بھلا گیدی یخنی کو پوچھتا ہے! آدھی رات کو بدنصیبوں نے سوتے سے جگا دیا اور اب یہ شخص یخنی سے میری تواضع کرنا چاہتا ہے۔ دھت! حافظ نے بستر سے اٹھ کر اس مسخرے فربہ اندام باورچی کے چوڑے چکلے چہرے پر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

مگر سرائے کے اس آخری اہلکار کا تپاک دیکھ کر حافظ شکر اللہ خان گینڈے کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس نے پھر کپڑے تبدیل کیے اور سونے کی کوشش کی، اور بولا! اسے نیند بھی آ گئی۔

صبح خادموں، منصرموں کا رویہ ایسا پُر تپاک کاروباری تھا۔ دن نکلنے پر انہوں نے خبر دی تھی کہ گرم پانی رکھ دیا گیا ہے، آغا حمام کر لیں۔ پھر لوزیات اور شربت اور غذائیں اور قہوہ جس تواضع اور کثرت سے پیش کیا گیا وہ بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ مسافروں، مہمانوں نے باہم وہی تپاک برقرار رکھا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آدھی رات کے وقت یہ سب لوگ آوازوں سے اور اپنی چلت پھرت اور دھمکیوں سے ایک دوسرے کی جان کے گاہک بنے ہوئے تھے۔

حافظ کو دیر ہو گئی تھی۔ آج بعد نمازِ عصر اسے مسندِ عالی بر مازید کور کی رُو بہ کاری میں پیش ہو کر عرضی گزارنی تھی کہ وہ دربار عام میں سلطانِ ہند حضرت شیر شاہ سوری کی کورنش سلامی کو حاضر ہونا چاہتا ہے، کیوں کہ وہ نہ صرف سلطان کی رعایا میں سے ہے بلکہ ان کے جدّی گاؤں روہ ری کا باشندہ بھی ہے۔

کتب خانے میں بیٹھنے کے لیے اس کے پاس دوپہر تک کا وقت پڑا تھا۔ حافظ شکر اللہ خان کاغذوں کا پلندا اور قلم دان بغل میں مار، کتب خانے روانہ ہوا۔

پچھلے دن کی طرح وہ اسی دریچے کے برابر جا بیٹھا۔ اس نے اپنے مطلب کی کتابیں نکلوا کر مطالعے میں گم ہو جانا چاہا، مگر آج کا دن پچھلے دن جیسا نہ تھا۔ رہ رہ کر شکر اللہ کو رات کا شور غل یاد آ رہا تھا۔ اسے وہ دہشت اور بے چینی یاد آئی جو چھت سے اترتے ہوئے اس نے سیڑھیوں پر محسوس کی تھی۔

اپنا قلم دان اور کاغذ چھوڑ کر حافظ شکر اللہ خان باہر باغ میں جا کر ٹہلنے لگا۔ کھلی ہوا میں یکسوئی بحال ہوئی تو اندر جانے کا قصد کیا۔ دیکھا، گزشتہ دن کا ملاقاتی نے رُوز کتب خانے کی طرف آ رہا ہے۔ شکر اللہ خان سلام کلام کے لیے ٹھہر گیا۔ نے رُوز اصفہانی پوچھنے لگا، ''فاضل! آج غور و فکر میں ہو؟ کیا مطالعے کو طبیعت نہیں کرتی؟'' حافظ نے ٹالنے کو کچھ کہہ دیا۔

نے رُوز بولا، ''تھکے ہوئے ہو؟..... کیا رات اچھی طرح سو نہ سکے؟''

حافظ گینڈے نے پھر ٹال دیا لیکن نے رُوز کے استفسار پر رات والی پریشان کن کیفیت یاد آ گئی۔ حافظ نے سوچا، چند روز اِس شہر میں اُور رہنا ہے، نے رُوز سے کسی معقول سرائے کا پتا پوچھ لیتا ہوں۔

پوچھنے پر اصفہانی نوجوان نے کئی سرایوں کے پتے نشان بتائے، ان کے کرایے اور سہولتوں کی تفصیل بیان کی۔ شکر اللہ

منڈیوں بازاروں کے بیچوں بیچ تھیں۔ فے رُوز جاننا چاہتا تھا کہ اس وقت جہاں حافظ ٹھہرا ہوا ہے، وہاں کیا مشکل پیش آئی ہے جو وہ سرائے بدلنے کے درپے ہے۔ حافظ شکر اللہ خان کو مجبوراً ساری بات بتانی پڑی۔

فے رُوز اصفہانی پوری کہانی سن کر بجائے ہم دردی جتانے کے ہنس پڑا۔ کیا بوالعجبی ہے! حافظ گینڈے پر جو گزری تھی وہی شہر میں پہلے روز فے رُوز کو بھی پیش آئی تھی۔ کہنے لگا، ''مگر فاضل! قدرت مجھ پر مہربان تھی۔ مجھے سرِ شام ہی علم ہو گیا تھا کہ یہ مرڈوزیوں کی سرائے ہے۔ میں تو اپنا سامان اٹھا کر رات سے پہلے ہی نکل آیا تھا۔''

حافظ شکر اللہ خان مرڈوزی نام کی کسی جماعت سے واقف نہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے پہلی بار یہ نام سنا تھا۔ پوچھنے پر اصفہانی نے بتایا کہ صدیوں کی تعلیماتِ مدنیت کا بگاڑ اس فرقۂ مرڈوزیاں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ کہنے لگا، ''یہ تو نہیں معلوم کہ ان کا معلّم کون ہے اور مرکز کہاں ہے، بس اتنا جانتا ہوں کہ صاحبانِ شوکت اسے اپنے مقاصد کے حصول میں فید اور فیض رساں پاتے ہیں، سو دارالخلافوں میں یہ مسلک خوب پھل پھول رہا ہے۔ صاحبانِ ثروت کی دیکھا دیکھی کم حیثیت لوگ بلکہ اب تو شاگرد پیشہ بھی اس جماعت میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔''

شکر اللہ خان گینڈا اس فرقے کی عمومی فکر سمجھنا چاہتا تھا، تو اصفہانی نے بیان کیا کہ مرڈوزی اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ آدمی کا مزاج محبت اور غصّے اور نفرت سے مل کر تشکیل پاتا ہے، مگر اپنی تہذیب اور تعلیم اور تمدنی تقاضوں سے مجبور ہو کے انسان اپنا غصّہ اور اپنی نفرت ظاہر نہیں ہونے دیتا، جس سے فتور واقع ہوتا ہے اور نفرت مزاج کی سطح سے نیچے جا کر سڑنے لگتی ہے۔ پھر یہ آدمی کے اندر ہی پلتی بڑھتی ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ وہ غصّے سے پاک ہو چکا اور اس کے مزاج کی ساخت غصّے اور نفرت کے بغیر ممکن ہوگئی۔

مرڈوزی کہتے ہیں، ایسا نہیں ہوتا۔ غصّہ آدمی میں ساری زندگی موجود، مگر پوشیدہ رہتا ہے، تاہم اگر دن کے خاتمے پر اسے ظاہر ہونے، یعنی خارج ہونے، کا موقع دیا جائے تو ایک دن ایسا آئے گا کہ آدمی غصّے اور نفرت سے پوری طرح خالی ہو جائے گا۔ مرڈوزی اس کیفیت کو تکمیل کا نام دیتے ہیں۔

''اس لیے،'' فے رُوز کہنے لگا، ''اسی تکمیل کو پانے کے لیے، مرڈوزی فرقے کا ہر فرد رات کو حلقے میں بیٹھتا ہے اور چیخ پکار کر کے اپنی دن بھر کی کمائی ہوئی نفرت اور دن بھر کا پالا ہوا غصّہ خارج کر دیتا ہے، اور باقی رات اور اگلے تمام دن کے لیے ایک مہذب، مکمل، مہر و محبت سے بھرا ہوا انسان بن جاتا ہے۔''

فے رُوز اصفہانی نے ضمناً یہ بھی اطلاع دی کہ سلطان شیر شاہ کا وزیرِ دربار، امیر بر مازید کور مرڈوزی ہے۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' شکر اللہ خان نے جو تفاصیل سے بےزار ہو جایا کرتا تھا، فے رُوز کا طولانی بیان سن کر کہا، ''انا للہ وانا الیہ راجعون! تو ان قرم ساقوں نے غصّے اور نفرت جیسے قیمتی انسانی جوہروں کو ضائع کرنے کی سبیل بھی آخر نکال ہی لی۔''

اور یہاں حافظ شکر اللہ خان گینڈے کے ناتمام سفر کی روداد ختم ہوتی ہے۔

یہ واضح رہے کہ حافظ شکر اللہ خان گینڈا اپنی بات اِجمالاً ہی کہنا پسند کرتا تھا۔

وہ صاحبِ علم اور کم گو آدمی تھا، شاید اسی لیے تفاصیل سے حذر کرتا اور وقت ضائع کرنے سے الجھتا تھا۔

اس نے آدمی میں موجود غصّے کے اس طرح کے باالتزام ضائع کیے جانے پر کوئی نوحہ نہیں لکھا، اگرچہ گاؤں لوٹنے سے پہلے کاغذ کے ایک پرزے پر وزیرِ دربار مسندِ عالی، امیر بر مازید کور کے نام چند سطور اسی انداز کی لکھیں کہ انہیں یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا۔

رخصت ہوتے ہوئے کتب خانے کی سیڑھیوں پر حافظ شکر اللہ خان گینڈے نے زربفت کا وہ پارچہ فے رُوز اصفہانی کو تحفے میں پیش کر دیا کہ جس پارچے میں رووِری، کوہِ سلیمان سے مٹی باندھ کر لائی گئی تھی۔ سوریوں کے باڑے کی مٹی حافظ شکر اللہ نے برف جیسے سفید پھولوں کے اس تختے میں جھاڑ دی جو سیڑھیوں سے شروع ہو کر کتب خانے کے احاطے کی دیوار تک پہاڑی

ایک جسمانی ضرب نے اسے کھڑے سے سیڑھیوں ہی پر بٹھا دیا۔

کل تک جس تختے میں برف کی طرح سفید پھول کھلے تھے آج اس میں انگارہ سے لال گلاب دہک رہے تھے۔

ooo

تیسری ہجرت

تب ایک آواز اونچے اونچے ٹیلوں سے ٹکراتی ہوئی صحراؤں، مرغزاروں میں پھیل گئی۔

''لوگو! گمراہی کا سایہ انسانیت کے لئے خطرہ ہے۔ اندھیرے کی زد میں آئے ہوئے اس شہر کو چھوڑ دو۔''

لوگوں نے یہ آواز سنی اور اسے رحمت کی آواز قرار دیا پھر اپنے رستے بستے گھروں کو چھوڑ کر نئے شہر کی طرف چل پڑے، دوسرے شہر کے رہنے والے آدھے راستے تک انہیں لینے آئے اور اپنا آدھا جسم کاٹ کر ان کے حوالے کر دیا۔ تب دھیرے دھیرے، روشنی پھیلی، اور شہر نور میں نہا گئے روشنی پھیلتی گئی اور وقت چپکے سے ان گنت سیڑھیاں چڑھ گیا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا بدلیاں چھانے لگیں۔ ان کی روشنی پھیکی اور بے نور ہو گئی۔ ہر طرف زوردار آندھیاں چلنے لگیں، تاکہ روشنی بجھ جائے اور نور میں نہائے شہر کجلا جائیں، اندھیرے، بند کمروں اور تاریک غاروں سے نکلنے کی پھر کوشش کرنے لگے۔

اچانک روشنی کی لو پھڑ پھڑائی، لوگوں نے تالیاں بجائیں کہ اب روشنی بجھی اور اب اندھیرا ہوا کہ وہ سب اندھیرا چاہتے تھے۔ وہ بھی جو اپنی قندیلیں ساتھ لائے تھے۔ اور وہ بھی جو روشنی اور نور سے تہی دامن تھے۔ تب شہر والوں نے فیصلہ کیا کہ روشنی کو بجھنے دیا جائے گا۔

موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے ایک شخص نے آواز دی۔

''لوگو! اندھیروں کا ظلم مظلوم انسانیت کے لئے خطرہ ہے۔ اندھیروں میں گھرے ہوئے ان شہروں کو چھوڑ دو۔''

لوگوں نے آواز سنی اور اسے حقیقت کی آواز قرار دیا۔ اور اپنے رستے بستے گھروں کو چھوڑ کر نئے شہروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ نئے شہروں میں داخل ہوئے تو ان کے استقبال کے لئے کوئی نہیں آیا۔ انہوں نے اجڑے گھروں کے تالے توڑ دیئے اور اندر دخل ہو گئے۔ اجڑے مکان آسیب زدہ تھے۔ یہ آسیب نئے آنے والوں کے کاندھوں پر سوار ہو گئے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے، تاکہ وہ سچائی کو نہ دیکھ سکیں۔ وہ آنکھیں بند کئے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ شہر کے باسیوں نے جب انہیں اندھیروں میں بھٹکتے دیکھا تو اپنے منہ دوسری طرف کر لئے کہ وہ پہلے ہی آسیب زدہ تھے اور ان کی آنکھیں بند تھیں۔ نئے لوگوں نے ہواؤں کو گالیاں دیں اور پھیلے ہوئے ہاتھ سے ہر شے سمیٹ لینی چاہی۔ جن کے بارے میں وہ جانتے تھے جن کے بارے میں وہ نہیں جانتے تھے۔ آسیب کا اثر بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ ہر شخص خود ایک آسیب بن گیا۔

تب میں نے آنکھیں کھولیں۔ خود کو اندھیرے کے غلیظ گڑھے میں پڑا پایا۔ غلیظ گڑھا زمین پر نہیں تھا۔ آسمان پر بھی نہیں تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مجھے معلوم ہوا میں اٹھ نہیں سکتا کہ چاروں طرف پھیلے اندھیرے کی دیواریں مجھے قید کئے ہوئے ہیں۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن ایک گھمبیر اندھیرا چاروں طرف سے آنکھیں پھاڑے مجھے گھور رہا تھا۔ تب رشید نے جس کی آنکھیں خوفزدہ تھیں۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

''خوف کے آسیب تمہارے وجود کے لئے خطرہ ہیں۔ اندھیرے میں گھرے ہوئے اس مکان کو چھوڑ دو۔''

میں نے اس کی بات کو سنا۔ محبت کی آواز قرار دیا اور اسے مجبور نظروں سے دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔

''میری ٹانگوں سے خون کا آخری قطرہ تک نچڑ چکا ہے۔ میری ٹانگیں بے جان ہیں۔ میری آنکھیں بے نور ہیں۔ مجھے بیساکھیاں لا دو۔ مجھے بصارت لا دو۔''

اس نے میری بات سن کر قہقہہ لگایا۔

''تم غلط کہتے ہو۔ تمہاری ٹانگیں بے جان نہیں۔ تم چل سکتے ہو۔ تمہاری آنکھیں بے نور نہیں۔ تم دیکھ سکتے ہو۔ اٹھنے کی کوشش کرو۔''

میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ دیواریں مجھے سہارا دینے کو آگے بڑھیں میں اٹھنے لگا۔ دیواریں کانپ گئیں۔ میں گر پڑا، دیواریں اندھیرے کی تھیں، گمنام اندھیرے کی۔

میں نے آنکھیں جھپکیں مجھے معلوم ہوا، میری آنکھیں بے نور نہیں۔ میں اندھیرے کے کالے سمندر میں گھرا ہوا ہوں۔ میں نے ٹانگوں کو چھوا۔ مجھے معلوم ہوا۔ میری ٹانگیں بے جان نہیں۔ وقت کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہیں۔ میں انہیں آزاد کرا سکتا ہوں۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور سوئچ آن کر دیا۔ یک دم اندھیرے کا سکوت ٹوٹ گیا اور پھر ہر شے زرد روشنی کی زد میں آ گئی۔ لیکن ایک چپ۔ ایک مہیب سناٹا کمرے میں گردش کرتا رہا۔ میں نے کمرے سے باہر جھانکا۔ باہر گھور اندھیرے کی حکمرانی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑے اندھیرے کو گھورتا رہا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے باہر تاریکی اور خاموشی کے سمندر میں طوفان اٹھا ہوا ہے۔ تاریکی اور خاموشی کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی سرکش لہریں ہر شے کو اپنی زد میں لینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے کچھ ہی دیر میں یہ اندھا سیلاب کمرے میں داخل ہو کر ملگجی روشنی میں نہائی ہوئی ہر شے کو دبوچ لے گا۔

''میں اندھیرے کے آسیبوں کو کمرے میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔'' میں نے فیصلہ کیا۔

دوسرے کمرے سے لالے کی آواز ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔ ''اتنا غیرت مند ہے تو مکان خالی کیوں نہیں کرتا۔

''غیرت مند...... ہونہہ''

بھابی نے ساری فضا کو زہر آلود کر دیا۔ یکا یک ہوا خاموش ٹھاٹھیں مارتے ہوئے کالے سمندر سے ٹکرا گئی۔ ایک خوف ناک دھما کا ہوا۔ درو دیوار لرز گئے۔ ذہن سناٹا کر رہ گیا۔ اچانک کانپتے ہوئے درو دیوار سے ایک آواز ٹکرانے لگی۔

''یہ اندھیرے تمہیں دبوچ لیں گے۔ تمہاری بے نام ذات کو پیس کر رکھ دیں گے۔ اندھیرے میں گھرے ہوئے اس مکان کو چھوڑ دو۔''

میرے ذہن میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ خاموشی کا سکوت ٹوٹنے لگا۔ میں نے فیصلہ کیا اندھیروں کو کمرے میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔

میں نے دوسری چارپائی کی طرف دیکھا۔ جہاں میری بیوی اور ننھی منی رفعت بے خبر سو رہی تھیں۔ انہیں اتنے بڑے حادثے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ میں نے غور سے ان کے چہروں کو دیکھا۔ کمزور روشنی کی ساری پیلاہٹ ان کے چہروں پر ناچ رہی تھی۔

''میں ابھی اس مکان کو چھوڑ دوں گا''

میں نے گھڑی دیکھی۔ بارہ بج رہے تھے۔

''کہاں جاؤں گا۔ کیسے جاؤں گا۔ میں جا بھی سکوں گا......؟''

مدافعت کی لہریں تاریکی کا وجود ختم کرنے کی بجائے آسیب زدہ مکان کے پرانے دروازے کی دہلیز پر سر پٹخ پٹخ کر دم توڑنے لگیں۔ میری نظریں سنگار میز کے بڑے آئینہ پر جا پڑیں۔ میں اسے گھورنے لگا۔ آئینہ میں سہا ہوا ایک شخص خوفزدہ نظروں سے اندھیرے کو گھور رہا تھا۔ میں نے سوچا۔

''شاید سائے بھی اندھیرے سے ڈرتے ہیں۔''

میں کھڑا ہو گیا۔ سایہ بھی کھڑا ہو گیا۔ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ سایہ مجھ سے دور ہونے لگا۔ میں اور آگے بڑھا۔ سایہ غائب ہو گیا۔

''فکر نہ کرو۔ خود بخود تمام پرابلم سالو ہو جائیں گے۔

اسی لمحہ سرور کا سہا ہوا فکر مند چہرے میرے سامنے آ گیا اور میں بتی بجھا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

''نیا مکان ملا۔''

''مل ہی جائے گا۔''

''نہیں۔کبھی نہیں۔ہم سب پرانے مکانوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ہم سب کی رگوں میں پرانے مکانوں کا زہر دوڑ رہا ہے۔ہم یہ مکان کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔''

ایک مانوس آواز نے مجھ سے کہا۔

''پرانا مکان!...... ہاں پرانے مکان کا زہر ہمارے جسموں میں سرایت کر رہا ہے۔لیکن میں تو پرانا مکان چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ایک دن ہم سب پرانے مکانوں کو چھوڑ دیں گے۔

میں نے جواب دیا۔

''نہیں۔تمہیں نیا مکان کبھی نہیں ملے گا۔تم بزدل ہو۔پرانے مکان کے عادی ہو چکے ہو۔اسے چھوڑنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔''

''نیا مکان۔ہاں نیا مکان۔''

فکرمند چہرے نے لمبی سسکاری بھری۔معاً ہم نے ایک دوسرے کی طرف گھور کر دیکھا کہ ہم تینوں اپنی اپنی ذات کے لامتناہی اندھیرے کی چار دیواری میں قید تھے۔''

ooo

کیا۔ اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔

اس کے تیسرے دن یوں ہوا کہ الیعذر کی لونڈی گجردم الیعذر کی خواب گاہ میں داخل ہوئی اور سہمی ہوئی الیعذر کی جورو کے پاس اُلٹے پاؤں آئی۔ پھر الیعذر کی جورو خواب گاہ تک گئی اور حیران و ہراساں واپس آئی۔ پھر یہ خبر دور دور تک پھیل گئی اور دور دور سے لوگ الیعذر کے گھر آئے اور اس کی خواب گاہ تک جا کر ٹھٹھک ٹھٹھک گئے کہ الیعذر کی خواب گاہ میں الیعذر کی بجائے ایک بڑا بندر آرام کرتا تھا۔ اور الیعذر نے پچھلے سبت کے دن سب سے زیادہ مچھلیاں پکڑی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک نے دوسرے کو خبر دی کہ اے عزیز! الیعذر بندر بن گیا ہے۔ اس پر دوسرا زور سے ہنسا "تو نے مجھ سے ٹھٹھا کیا۔" اور وہ ہنستا ہی چلا گیا حتیٰ کہ منہ اس کا سرخ پڑ گیا اور دانت نکل آئے اور چہرے کے خدوخال کھنچتے چلے گے اور وہ بندر بن گیا۔ تب پہلا کمال حیران ہوا۔ منہ اس کا کھلا کا کھلا رہ گیا اور آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں اور پھر وہ بھی بندر بن گیا۔

اور الیاب، ابن زبلون کو دیکھ کر ڈرا اور یوں بولا کہ اے زبلون کے بیٹے تجھے کیا ہوا ہے کہ تیرا چہرا بگڑ گیا۔ ابن زبلون نے اس بات کا برا مانا اور غصہ سے دانت کچکچانے لگا۔ تب الیاب مزید ڈرا اور چلا کر بولا کہ اے زبلون کے بیٹے تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے، ضرور تجھے کچھ ہو گیا ہے۔ اس پر ابن زبلون کا منہ غصہ سے اور الیاب کا چہرہ خوف سے بگڑتا چلا گیا۔ ابن زبلون غصہ سے آپ سے باہر ہوا اور الیاب خوف سے اپنے آپ میں سکڑتا گیا۔ اور وہ دونوں کہ ایک مجسم غصہ اور ایک خوف کی پوٹ تھے آپس میں گتھ گئے۔ ان کے چہرے بگڑتے چلے گئے۔ پھر ان کے اعضاء بگڑے پھر ان کی آوازیں بگڑیں کہ الفاظ آپس میں مدغم ہوتے چلے گئے اور غیر ملفوظ آوازیں بن گئے۔ پھر وہ غیر ملفوظ آوازیں وحشیانہ چیخیں بن گئیں۔ اور پھر وہ بندر بن گئے۔

الیاسف نے کہ ان سب میں عقلمند تھا اور سب سے آخر تک آدمی بنا رہا تشویش سے کہا کہ اے لوگو! مقرر ہمیں کچھ ہو گیا ہے۔ آؤ ہم اس شخص سے رجوع کریں جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا ہے۔ پھر الیاسف لوگوں کو ہمراہ لے کر اس شخص کے گھر گیا اور حلقہ زن ہو کے دیر تک پکارا کیا۔ تب وہ وہاں سے مایوس پھرا اور بڑی آواز سے بولا کہ اے لوگوں وہ شخص جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا کرتا تھا آج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اور اگر سوچو تو اس میں ہمارے لیے خرابی ہے۔ لوگوں نے یہ سنا اور دہل گئے۔ ایک بڑے خوف نے انہیں آلیا، وحشت سے صورتیں ان کی چپٹی ہونے لگیں اور خدوخال مسخ ہوتے چلے گئے۔ اور الیاسف نے گھوم کر دیکھا اور سکتہ میں آ گیا۔ اس نے سامنے دیکھا اور بندروں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ پھر اس نے دائیں بائیں نظر ڈالی اور ہر سمت بندر دیکھے۔ تب وہ ڈرا اور ان سے کترا کر چلا اور بستی کے اس کنارے سے اس کنارے تک چلا گیا اور کسی کو آدمی نہ پایا۔ جاننا چاہیے کہ وہ بستی ایک بستی تھی سمندر کے کنارے، اونچے برجوں اور بڑے دروازوں والی حویلیوں کی بستی۔ بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا، کٹورا بجتا تھا۔ پر دم کے دم میں بازار ویران اور اونچی ڈیوڑھیاں سونی ہو گئیں اور اونچے برجوں میں اور عالیشان چھتوں پر بندر ہی بندر نظر آنے لگے اور الیاسف نے ہراس سے چہار سمت نظر دوڑائی اور سوچا

کہ کیا میں اکیلا آدمی ہوں اور اس خیال سے وہ ایسا ڈرا کہ اس کا خون جمنے لگا مگر اسے الیاب یاد آیا کہ خوف سے کس طرح اس کی صورت بگڑتی چلی گئی اور وہ بندر بن گیا۔ تب الیاسف نے اپنے خوف پر غلبہ پایا اور عزم باندھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور آدمی ہی کی جون میں مروں گا اور اس نے ایک احساس برتری کے ساتھ اپنے مسخ صورت ہم جنسوں کو دیکھا اور کہا کہ تحقیق میں ان میں سے نہیں ہوں کہ وہ بندر ہیں اور میں آدمی کی جون میں ہوں۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں سے نفرت کی۔ اس نے ان کی لال بھبوکا صورتوں اور بالوں سے ڈھکے ہوئے جسموں کو دیکھا اور نفرت سے چہرہ اس کا بگڑنے لگا۔ مگر اسے اچانک ابن زبلون کا خیال آیا کہ نفرت کی شدت سے صورت اس کی مسخ ہو گئی تھی۔ اس نے کہا کہ اے الیاسف نفرت مت کر کہ نفرت سے آدمی کی کایا بدل جاتی ہے اور الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا اور کہا کہ بے شک میں انہیں میں سے تھا اور اس نے وہ دن یاد کیے جب وہ ان میں سے تھا اور دل اس کا محبت کے جوش سے امنڈنے لگا۔ اور اسے بنت الاخضر کی یاد آئی کہ فرعون کے رتھ کی دودھیا گھوڑیوں میں سے ایک گھوڑی کی مانند تھی اور اس کے بڑے گھر کے در سرو کے اور کڑیاں صنوبر کی تھیں۔ اس یاد کے ساتھ الیاسف کو بیتے دن یاد آئے کہ وہ سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے مکان میں عقب سے گیا تھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا جس کے لیے اس کا جی چاہتا تھا۔ اور اس نے دیکھا کہ لمبے بال اس کے رات کی بوندوں سے بھیگے ہیں اور چھاتیاں ہرن کے بچوں کے موافق تڑپتی ہیں اور پیٹ اس کا گندم کی ڈھیری کی مانند ہے کہ پاس اس کے صندل کا گول پیالہ ہے۔ اور الیاسف نے بنت الاخضر کو یاد کیا اور ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کے تصور میں سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے گھر تک گیا۔ اس نے خالی مکان کو دیکھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا جس کے لئے اس کا جی چاہتا تھا اور پکارا کہ اے بنت الاخضر تو کہاں ہے؟ اے وہ کہ جس کے لیے میرا جی چاہتا ہے، دیکھ موسم کا بھاری مہینہ گزر گیا اور پھولوں کی کیاریاں ہری بھری ہو گئیں اور قمریاں اونچی شاخوں پر پھڑپھڑاتی ہیں۔ تو کہاں ہے اے خضر کی بیٹی۔ اے اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر آرام کرنے والی تجھے دشت میں دوڑتی ہوئی ہرنیوں اور چٹانوں کی دراڑوں میں چھپے ہوئے کبوتروں کی قسم تو نیچے اُتر آ اور مجھ سے آن مل کہ تیرے لیے میرا جی چاہتا ہے۔ الیاسف بار بار پکارا تا آنکہ اس کا جی بھر آیا اور وہ بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا۔

الیاسف، بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا مگر اچانک اسے الیعذر کی جورو یاد آئی جو الیعذر کو بندر کی جون میں دیکھ کر روئی تھی حتیٰ کہ اس کی ہڑکی بندھ گئی اور بہتے آنسوؤں میں اس کے جمیل نقش بگڑتے چلے گئے اور ہڑکی آواز وحشی ہوتی چلی گئی ------ یہاں تک کہ اس کی جون بدل گئی۔ تب الیاسف نے خیال کیا کہ بنت الاخضر جن میں سے تھی ان میں مل گئی۔ اور بے شک جو جن میں سے ہے وہ ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا کہ اے الیاسف ان سے محبت مت کر مبادا تو ان میں سے ہو جائے۔ اور الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا۔ اور الیاسف نے ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کو فراموش کر دیا۔

الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور اپنے ہم جنسوں کی لال بھبوکا صورتوں اور کھڑی دم کو دیکھ کر ہنسا۔ اور الیاسف کو الیعذر کی جورو یاد آئی کہ وہ اس قریے کی حسین عورتوں میں سے تھی۔ وہ تاڑ کے درخت کی مثال تھی اور چھاتیاں اس کی انگور کے خوشوں مانند تھیں۔ اور الیعذر نے اس سے کہا تھا کہ جان لے کہ میں انگور کے خوشے توڑوں گا۔ اور انگور کے خوشوں والی تڑپ کر ساحل کی طرف نکل گئی۔ الیعذر اس کے پیچھے پیچھے گیا اور پھل توڑا اور تاڑ کے درخت کو اپنے گھر لے آیا۔ اور اب وہ ایک اونچے کنگرے پر الیعذر کی جوئیں بین بین کر کھاتی تھی۔ الیعذر جھر جھری لے کر کھڑا ہو جاتا اور وہ دم کھڑی کر کے اپنے میلے کچیلے پنجوں پر اٹھ بیٹھتی اور الیعذر کے اگلے پیر اس کے بدرنگ بالوں والی پشت پر ٹک جاتے۔ الیاسف یہ دیکھ کر ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا اور اس کے ہنسنے کی آواز اتنی اونچی ہوئی کہ اسے ساری بستی گونجتی معلوم ہوئی۔ اور وہ اپنے اتنی زور سے ہنسنے پر حیران ہوا۔ مگر اچانک اسے اس شخص کا خیال آیا جو ہنستے ہنستے بندر بن گیا تھا۔ اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا۔ اے الیاسف تو ان پر مت ہنس مبادا تو ہنسی کی جنس بن جائے۔ اور الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔ الیاسف محبت اور نفرت سے، غصہ اور ہمدردی سے، رونے اور ہنسنے سے، ہر کیفیت سے گزر گیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کران سے بے تعلق ہو گیا۔ ان کا درختوں پر اچکنا، دانت پیس پیس کلکاریاں کرنا، کچے پکے پھلوں پر لڑنا اور ایک دوسرے کو لہولہان کر دینا، یہ سب کچھ اسے آگے کبھی ہم جنسوں پر رلاتا تھا، کبھی ہنستا تھا، کبھی غصہ دلاتا کہ وہ ان پر دانت پیسنے لگتا اور انہیں حقارت سے دیکھتا۔ اور یوں ہوا کہ انہیں لڑتے دیکھ کر اس نے غصہ کیا اور بڑی آواز سے جھڑکا۔ پھر خود ہی اپنی آواز پر حیران ہوا۔ اور کسی کسی بندر نے اسے بے تعلقی سے دیکھا اور پھر لڑائی میں جٹ گیا۔ اور الیاسف کے تئیں لفظوں کی قدر جاتی رہی کہ اب وہ اس کے اور اس کے ہم جنسوں کے درمیان رشتہ نہیں رہے تھے۔ اور اس کا اس نے افسوس کیا۔ الیاسف نے افسوس کیا اپنے ہم جنسوں پر، اپنے آپ پر اور لفظ پر۔ افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے کہ لفظ میرے ہاتھوں میں خالی برتن کی مثال رہ گیا۔ اور سوچو تو آج بڑے افسوس کا دن ہے کہ آج لفظ مر گیا۔ اور الیاسف نے لفظ کی موت کا نوحہ کیا اور خاموش ہو گیا۔

الیاسف خاموش ہو گیا اور محبت اور نفرت سے، غصہ اور ہمدردی سے، ہنسنے اور رونے سے در گذر کیا۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں کو ناجنس جان کران سے کنارہ کر لیا اور اپنی ذات کے اندر پناہ لے لی۔ الیاسف اپنی ذات کے اندر پناہ گیر ہو کر جزیرے کی مانند بن گیا۔ سب سے بے تعلق، گہرے پانیوں کے درمیان خشکی کا ننھا سا نشان۔ اور جزیرے نے کہا کہ میں گہرے پانیوں کے درمیان زمین کا نشان بلند رکھوں گا۔

الیاسف کہ اپنے تئیں آدمیت کا جزیرہ جانتا تھا۔ گہرے پانیوں کے خلاف مدافعت کرنے لگا۔ اس نے اپنے گرد پشتہ بنالیا کہ محبت اور نفرت، غصہ اور ہمدردی، غم اور خوشی اس پر یلغار نہ کریں، کہ جذبہ کی کوئی رو اسے بہا کر نہ لے جائے۔ اور الیاسف اپنے جذبات سے خوف کرنے لگا۔ پھر جب وہ پشتہ تیار کر چکا تو اسے یوں لگا کہ اس کے سینے کے اندر پتھری پڑ گئی ہے۔ اس نے فکر مند ہو کر کہا کہ اے معبود کیا میں اندر سے بدل رہا ہوں۔ تب اس نے اپنے باہر پر نظر کی۔ اور اسے گمان ہونے لگا کہ وہ پتھری پھیل کر باہر آ رہی ہے، کہ اس کے اعضاء خشک، اس کی جلد بدرنگ اور اس کا لہو بے رس ہوتا جا رہا ہے۔ پھر اس نے مزید اپنے آپ پر غور کیا اور اسے مزید وسوسوں نے گھیرا۔ اسے لگا کہ اس کا بدن بالوں سے ڈھکتا جا رہا ہے اور بال بدرنگ اور سخت ہوتے جا رہے ہیں۔ تب اسے اپنے بدن سے خوف آیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ خوف سے وہ اپنے اندر سمٹنے لگا۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ٹانگیں اور بازو مختصر اور سر چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ تب اسے مزید خوف ہوا اور اعضاء اس کے خوف سے مزید سکڑنے لگے۔ اور اس نے سوچا کہ کیا میں بالکل معدوم ہو جاؤں گا۔

اور الیاسف نے الیاب کو یاد کیا کہ خوف سے اپنے اندر سمٹ کر وہ بندر بن گیا تھا۔ تب اس نے کہا کہ میں اندر کے خوف پر اسی طور پر غلبہ پاؤں گا۔ جس طور پر میں نے باہر کے خوف پر غلبہ پایا تھا۔ اور الیاسف نے اندر کے خوف پر غلبہ پالیا اور اس کے سمٹے ہوئے اعضاء کھلنے اور پھیلنے لگے۔ اس کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے اور اس کی انگلیاں لمبی اور بال بڑے اور کھڑے ہونے لگے اور اس کی ہتھیلیاں اور تلوے چپٹے اور نجلے ہو گئے اور اس کے جوڑ کھلنے لگے۔ اور الیاسف کو گمان ہوا کہ اس کے سارے اعضا بکھر جائیں گے۔ تب اس نے عزم کر کے اپنے دانتوں کو بھینچا اور مٹھیاں کس کر باندھیں اور اپنے آپ کو اکٹھا کرنے لگا۔

الیاسف نے اپنے بدہیئت اعضا کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اسے لگا کہ اس کے اعضا کی صورت بدلتی جا رہی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا، کیا میں، میں نہیں رہا ہوں۔ اس خیال سے دل اس کا ڈھینے لگا۔ اس نے بہت ڈرتے ڈرتے ایک آنکھ کھولی اور چپکے سے اپنے اعضا پر نظر کی۔ اسے ڈھارس ہوئی کہ اس کے اعضا تو جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ اس نے دلیری سے آنکھیں کھولیں اور اطمینان سے اپنے بدن کو دیکھا اور کہا کہ بے شک میں اپنی جون میں ہوں۔ مگر اس کے بعد آپ ہی آپ اسے پھر وسوسہ ہوا کہ جیسے اس کے اعضا بگڑتے اور بدلتے جا رہے ہیں اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

الیاسف نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کر لیں تو اس کا دھیان اندر کی طرف گیا اور اس نے جانا کہ وہ کسی اندھیرے کنوئیں میں دھنستا جا رہا ہے اور الیاسف نے درد کے ساتھ کہا کہ اے میرے معبود میرے باہر بھی دوزخ

وقت کچھ زیادہ بگڑے بگڑے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سوچا کیا، میں ہی ہوں۔ اور اس آن اسے خیال آیا کہ کاش بستی میں کوئی ایک انسان ہوتا کہ اسے بتا سکتا کہ وہ کس جون میں ہے اور یہ خیال آنے پر اس نے اپنے تئیں سوال کیا کہ کیا آدمی بنے رہنے کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ آدمیوں کے درمیان ہو۔ پھر اس نے خود ہی جواب دیا کہ بے شک آدم اپنے تئیں ادھورا ہے، کہ آدمی، آدمی کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور جو جن میں سے ہے ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور جب اس نے یہ سوچا تو روح اس کی اندوہ سے بھر گئی اور پکارا کہ اے بنت الاخضر تو کہاں ہے کہ تجھ بن میں ادھورا ہوں۔ اس آن الیاسف کو ہرن کے تڑپتے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کی یاد بے طرح آئی۔ جزیرے میں سمندر کا پانی اُمنڈا چلا آ رہا تھا اور الیاسف نے درد سے صدا کی کہ اے بنت الاخضر، اے وہ جس کے لئے میرا جی چاہتا ہے۔ تجھے میں اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر اور بڑے درختوں کی گھنی شاخوں میں اور بلند برجیوں میں ڈھونڈوں گا۔ تجھے سرپٹ دوڑتی دودھیا گھوڑیوں کی قسم۔ قسم ہے تجھے کبوتریوں کی جب وہ بلندیوں میں پرواز کریں۔ قسم ہے تجھے رات کے اندھیرے کی جب وہ بدن میں اترنے لگے۔ قسم تجھے اندھیرے کی اور نیند کی اور پلکوں کی جب وہ نیند سے بوجھل ہو جائیں تو مجھے آن مل کہ تیرے لیے میرا جی چاہتا ہے۔ اور جب اس نے یہ صدا کی تو بہت سے لفظ آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ جیسے زنجیر الجھ گئی ہو، جیسے لفظ مٹ رہے ہوں، جیسے اس کی آواز بدلتی جا رہی ہو۔ اور الیاسف نے اپنی بدلتی آواز پہ غور کیا اور ابن زبلون اور الیاب کو یاد کیا کہ کیوں کر ان کی آوازیں بگڑتی چلی تھیں۔ الیاسف اپنی بدلتی ہوئی آواز کا تصور کر کے ڈرا اور سوچا کہ اے معبود کیا میں بدل گیا ہوں اور اس وقت اسے یہ نرالا خیال سوجھا کہ اے کاش کوئی ایسی چیز ہوتی کہ اس کے ذریعہ وہ اپنے چہرہ دیکھ سکتا۔ مگر یہ خیال اسے بہت انہونا نظر آیا اور اس نے درد سے کہا کہ اے معبود میں کیسے جانوں کہ میں نہیں بدلا ہوں۔

الیاسف نے پہلے بستی کو جانے کا خیال کیا مگر خود ہی اس خیال سے خائف ہو گیا اور الیاسف کو بستی کے خالی اور اونچے گھروں سے خفقان ہونے لگا تھا اور جنگل کے اونچے درخت رہ رہ کر اسے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ الیاسف بستی واپس جانے کے خیال سے خائف چلتے چلتے جنگل میں دور نکل گیا۔ بہت دور جا کر اسے ایک جھیل نظر آئی کہ پانی اس کا ٹھہرا ہوا تھا۔ جھیل کے

کنارے بیٹھ کر اس نے پانی پیا، جی ٹھنڈا کیا۔ اسی اثناء میں وہ موتی ایسے پانی کو تکتے تکتے چونکا۔ یہ میں ہوں؟ اسے پانی میں اپنی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ اور الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا تھا۔ اور وہ بے تحاشا بھاگا چلا جاتا تھا۔ وہ یوں بھاگا جاتا تھا جیسے وہ جھیل اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دکھنے لگے اور چیپے ہونے لگے اور کمر اس کی درد کرنے لگی۔ پر وہ بھاگتا رہا اور کمر کا درد بڑھتا گیا۔ اور اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوا چاہتی ہے اور وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں۔ الیاسف نے جھک کر ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں اور بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں ہاتھ پیروں کے بل تیر کے موافق چلا۔

OOO

انوار احمد

جب راج کرے گی خلق خدا۔۔۔ایک نوحہ!

یہ بالکل باسط تھا، میں نے پہچان لیا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں دراز قد غیر ملکی حاکموں کے نمائندوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ایک بے تعلق قسم کی رعونت تھی یا پھر وہ یہ مقام اور منصب پانے کے بعد اب باسط کی بجائے ڈاکٹر بی علی اور ساتھ ہی بے دیدہ ہو گیا تھا اس نے سول سوسائٹی، گراؤنڈ ریالٹی، گراس روٹس، کیمونٹی پارٹی سپیشن، سی بی ایم (کان فی ڈینس بلڈنگ میئرز) وغیرہ جیسے چلتے لفظوں میں ہمیں آج تیسرا لیکچر دیا تھا۔ اسے بے دید کہنے میں میں نے شاید عجلت کی ہے، وہ اگر بدلا تھا، تو میں بھی تو اپنی جگہ پر نہ رہا تھا، تاہم حرج نہیں کہ میں اپنے اور اس کے مشترک ماضی کا ذکر کردوں۔

ہم دونوں ملتان کے ایک کالج میں ایم۔ اے کے طالب علم تھے، جب ایوب خان کے خلاف تحریک کا آغاز ہوا، میں کالج میگزین کا ایڈیٹر تھا، جب دس سال تک اقتدار میں رہنے والے ایوب خان کے نورتنوں میں ایک، الطاف گوہر کا ایک حکم نامہ دو لرزہ براندام افسروں سے گزر کر ہمارے پرنسپل کے پاس پہنچا کہ کالج میگزین 'نخلستان' میں بھی ڈکٹیٹر کے عشرہ ترقی کے بارے میں ایک سیکشن شامل کیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ قصیدہ نما مواد بھی وزارتِ اطلاعات کی طرف سے فراہم کردیا گیا کہ مختلف طالب علموں کے نام سے اسے میگزین میں شائع کیا جائے۔ جو اداریہ میں لکھ چکا تھا، سٹاف ایڈیٹر اور پرنسپل کے حکم پر اس میں اس نئے سیکشن کے تعارف کے حوالے سے چند جملوں کا اضافہ کیا گیا۔ یہ اور بات کہ میگزین چھپ کر تب آیا، جب طالب علم، وکیل، صحافی اور ادیب بپھرے ہوئے تھے، چنانچہ اس میگزین کی کئی کاپیاں کالج اور شہر میں جلائی گئیں اور کالج میں ایک دن مشتعل ہجوم نے اسی باسط کے کہنے پر مجھے پکڑ لیا، قمیص پھاڑ دی، دو تین تھپڑ بھی جڑ دیے۔ میں نے کرش ہال کی سیڑھیوں پر چڑھ کر اپنی صفائی میں جلے اوراق میں سے اداریہ تلاش کیا اور کہا ''میرے غیور اور باشعور طالب علم بھائیو، میں نے تو جبر کی سنگینوں تلے صرف اس جملے کا اضافہ کیا ہے ''فیلڈ مارشل ایوب خان نے دس سال تک جو کچھ ملک میں کیا ہے وہ کسی باشعور سے مخفی نہیں، سو میرے غیور اور باشعور بھائیو بتاؤ کیا یہ آپ سے مخفی ہے کہ اس ڈکٹیٹر نے اس ملک کے ساتھ کیا کیا ہے؟'' اچانک ہجوم نے میری پھٹی ہوئی قمیص اور سوجے ہوئے گال نظر انداز کر کے میرے حق میں نعرے لگانے شروع کر دیے۔ تب خوش دلی سے باسط مجھے گلے ملا اور سرپرستانہ انداز میں سرگوشی کی 'تم کافی چالاک ہو، تم میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ پھر ملک میں یک لخت سرخ انقلاب سے الفت پیدا ہونے لگی، کسان، مزدور، طالب علم، سیاسی کارکن سٹڈی سرکل میں آنے لگے، اس سلسلے میں ملتان کے علی برادران کافی مشہور ہوئے، مارکسزم سبقاً سبقاً پڑھائی جانے لگی، پھر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں مولانا عبدالحمید بھاشانی کی کسان کانفرنس ہوئی، باسط میرے ساتھ ساری رات، جالو، جالو، آگن جالو کے نعرے لگاتا، حالانکہ ان دنوں بھی ملتان میں کافی گرمی پڑ رہی تھی اور آگ پہلے سے لگی ہوئی تھی۔ پہلی مرتبہ ملک میں الیکشن ہوئے تھے، ہم سب کا ہیجان دیدنی تھا، ریڈیو پر نتائج آ رہے تھے، باسط، خالد، اصغر، حیدر اور ان گنت دوست رات دو بجے چوک ڈیرہ اڈہ پہنچ گئے، ہم میں سے کسی کے گھر میں فون نہیں تھا، مگر ہم سب ٹھیک ایک ہی وقت میں وہاں پہنچ گئے تھے کہ انقلاب کا خواب دکھانے والے ایک اخبار 'امروز' کا دفتر وہاں تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں گلے میں خاکستری گانی رکھنے والے طوطے تو کچھ اور کہتے ہیں، ممکن ہے باسط کی بھی وہی رائے ہوگئی ہو اور اب میں خود جدھر جا رہا ہوں، کچھ عرصے بعد میں بھی پورا سچ بولنے کی طاقت سے محروم ہو جاؤں سو دوستو، مشرقی پاکستان میں جب فوجی آپریشن کیا گیا، اسی روز ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے دن کی روسیاہی بھی ساتھ ہی چلی آئی۔ پھر نئے پاکستان میں تبدیلیاں تو آتی رہیں، مگر انقلاب کا خواب تحلیل ہوتا گیا۔

باسط کچھ عرصے بعد گوبل یونیورسٹی میں معاشیات پڑھنے لگ گیا تھا اور میں ایک تکنیکی غلطی کی وجہ سے دو شادیاں کر کے صحافی سے وکیل بن گیا تھا۔ سوم، مادی اور تاریخی جدلیت نے اب میرے گھر میں ڈیرہ ڈال لیا تھا، اس کے باوجود سفینہ سے اپنی

محبت اور انقلاب سے اپنے لگاؤ کو اپنی دونوں بیویوں اور بعض وجوہ کی بنیاد پر مہربان ہونے والے ججوں سے چھپانے میں کامیاب رہا تھا، چنانچہ میرا اندازہ ہے کہ میں معاشی طور پر خوشحال ہوتا گیا، دوسرے سے تیسرا مکان بنواتے ہوئے مجھے رہ رہ کر یہ خیال بھی آتا رہا کہ محنت کشوں پر اپنے بہت سے ارمان اور رومان ضائع نہیں کرنے چاہئیں، پھر سانپ جیسی آنکھوں والے کا دور آیا اور نئے سرے سے مسلمانوں کے ختنے چیک ہونے شروع ہو گئے [۴۶۔۴۷ء کے فسادات میں ایسا ہوا تھا]، ایک صالح جماعت نے اس حاکم کے سائے میں اخبارات، سرکاری ملازمتوں، خاص طور پر تعلیمی اداروں میں طہارت کے بہانے کئی لوگوں پر رزق کے دروازے بند کرنے شروع کیے۔ انہی دنوں اچانک باسط مجھے ملا، اس کی قمیض اور پتلون میں سلوٹوں سے زیادہ سوراخ تھے۔ اس نے لرزتی آواز میں مجھ سے ایک ہزار روپے مانگے، میرا خیال ہے کہ میں اتنی رقم تو اسے دے سکتا تھا، مگر نہ جانے میں نے سوکھا منہ بنا کر اپنے موکلوں، بیویوں اور بچوں کا شکوہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ اس وقت تم مجھے کچھ دے سکتے ہو؟ مجھے اپنا دل کا بوجھ ہلکا کرنے دیں کہ میں نے کمینگی کی اور بڑی مشکل سے اسے دو سو روپے دیے۔ اس نے وہ پیسے لیے اور خدا حافظ کہے بغیر چلا گیا (ہاں یہ ہدایت بھی اسی دور میں ہوئی کہ خدا حافظ کے بجائے اللہ حافظ کہا جائے کہ شاید خدا ایرانیوں کا رہا تھا) اصل میں باسط اس دن کا دوسرا ایسا سوالی تھا، پہلا ایک یونیورسٹی میں اسلامیات کا استاد تھا۔ جس نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں مواخات مدینہ کی حکمتِ عملی کی دنیاوی معنویت بتانے کی کوشش کی تھی۔ سو اس کے ایک حاسد رفیق کار کی تحریک پر اس کے گھر کو جلا دیا گیا تھا۔ ملازمت سے بھی نکال دیا گیا تھا اور اب شاید واجب القتل بھی قرار دے دیا تھا گیا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے ادھار تو نہیں مانگا تھا۔ مگر قانونی اور اخلاقی مدد مانگی تھی۔ مگر ہوا یہ تھا کہ اس سے محض ایک روز پہلے ڈپٹی کمشنر نے بلا کر مجھے کہا تھا کہ ہم سے حاکم مجلسِ شوریٰ کے لیے کچھ نام مانگے گئے ہیں۔ میں آپ کا نام بھیجنا چاہتا ہوں۔ بس آپ کو اپنے غیر محتاط ماضی کے کچھ نام نہاد دوستوں سے پرہیز کرنا ہوگی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ بھٹو کے عدالتی قتل اور اس کے بعد کی سرکاری پالیسی نے اور کچھ میرے گھریلو حالات نے میرے اندر کافی تلخی پیدا کر دی تھی۔ اتنی بھی نہیں کہ میں بھول جاتا کہ میں حاکمِ ضلع کے سامنے بیٹھا ہوں۔ میں نے کافی شائستہ پیرائے میں اس نامزدگی سے تو معذرت کی، البتہ متوسط اہلیت کے ہر وکیل کے طور پر کہہ آیا کہ اگر چیف صاحب، یا ایجنسیوں والے، ججی کے لیے نامزدگیاں مانگیں تو میں حاضر ہوں۔ سو میں نے بہاولپور سے آنے والے اس معتوب پروفیسر سے ہمدردی کے باوجود اتنا فاصلہ رکھا کہ وہ اپنی زخمی آنکھیں میرے سینے میں گاڑ کر چلا جائے۔ مجھے اعتراف ہے تب سے میں اپنی نظروں میں کچھ مشکوک سا ہو گیا۔ بے تکلف دوستوں کے درمیان حاکم کے لطیفے سنا کر خود پر چھائے خوف کو دور کرنے کی کوشش کرتا۔ شاہی قلعے میں اسیر کارکنوں۔ پروفیسروں اور صحافیوں کے اہل خانہ سے بھی ملتا۔ مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والوں کی مجلس میں بھی جاتا۔ مگر سرکاری و نیم سرکاری لوگوں میں اپنے حواس اور زبان پر قابض رہتا۔

ایک رات باسط کا پیغام ملا کہ کمپنی باغ کے برگد والے پلاٹ میں رات دس بجے آؤ۔ کچھ دانشور دوست صورتِ حال پر تبادلہ خیال کریں گے۔ پرانا رومان جاگ گیا۔ میں جان بوجھ کر بس کے ذریعے کینٹ اور پھر پیدل کمپنی باغ پہنچا۔ دوسرے چکر میں ایک سائے نے سرگوشی کی۔ میرے ساتھ آؤ۔ ایک تاریک گوشے میں محض آواز کے سہارے ایک سہانا خواب بتایا گیا کہ جمہوریت کی بحالی ہی اس ملک میں وہ سماجی عدل لا سکتی ہے۔ جو ہم سب کی آرزو ہے۔ سربکف مجاہد تو حاکم اور اس کے ساتھیوں کو اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم صرف اپنے نصب العین کے حق میں پمفلٹ لکھیں۔ سیاسی لیڈر کی فکری تیاری میں کردار ادا کریں۔ مزدور انجمنوں سے اپنا رابطہ بڑھائیں اور عوامی سطح پر یاسیت اور خوف کے طلسم کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آج بہت کچھ بدل گیا۔ مگر تب یہ خیال سادہ لوحی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ہمارے پمفلٹ پڑھ کر کسی جج، جیلر یا جلاد کا ضمیر بیدار ہو جائے گا۔ سو باسط اور میں نے بعض دوستوں سے رابطہ کیا۔ پمفلٹ سائیکلو سٹائل ہوتے، رات کے اندھیرے میں فوجی افسروں کے گھروں میں، کبھی حاکم کا آلہ کار بننے والوں کے کاشانوں میں اور کبھی مظفر گڑھ یا ڈیرہ غازی خاں کے ڈاک خانوں سے کچھ نیم جان تومندوں کو ڈالے اور بھیجے جاتے۔ پھر ٹکٹکیوں سے باندھ کر باضمیروں کو اس طرح کوڑے مارنے کی ہدایت (؟) آئی کہ اس

ان کے منہ کے آگے مائیک رکھ کر چیخوں کو مہیب اور عبرت ناک بنا دیا جائے۔ یہی زمانہ تھا جب ایک رات باسط کے گھر ڈاکہ پڑا۔ ڈاکو ہر اعتبار سے تربیت یافتہ تھے اور کند ذہن لوگوں کی سمجھ میں بھی آتا تھا کہ یہ کن کی طرف سے اور کیوں بھیجے گئے تھے؟ اس کی ماں اور بہنوں پر اس طرح تشدد کیا گیا تھا کہ خود باسط بھی ایک دو ہفتے گم صم سا رہا، پھر اچانک معمول سے زیادہ ایک سیاہ رات کے آخری پہر میں جب ایک گمنام فون کال کے ذریعے مجھے بتا کر دہشت زدہ کیا گیا کہ باسط اپنے کچھ ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا گیا ہے۔ بہت کچھ اس نے اگل دیا ہے۔ اسی کی فراہم کردہ معلومات سے اس گینگ کے باقی ماندہ لوگوں کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ مجھے اسی کال کے ذریعے یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ میں زیرزمین چلا جاؤں۔ جانے سے پہلے میں نے نیم خواندہ لوگوں تک کو متاثر کرنے والی تمام کتابیں، ٹیپیں اور فلمیں جلا دیں دونوں بیویوں کے سامنے الگ الگ قسمیں کھائیں کہ میں ان میں کسی سے ایک کے پاس یا کسی تیسری کے پاس روپوش نہیں ہو رہا۔ سوئے ہوئے بچوں کو پیار کرنے سے منع کیا گیا ہے پر میں نے یہ کیا، آخر ایک کامریڈ کے گھر میں جا چھپا۔ جو ناظم زکواۃ بھی تھا، یہاں سے تین ہفتے بعد ہی مجھے پکڑ لیا گیا، پہلے کسی اندھیرے، ویران گھر میں رکھا گیا اور پھر بیس اکیس دن بعد لاہور کے شاہی قلعے میں بھیج دیا گیا، اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ وہ لمبی کہانی ہے، میرے لیے بہت مشکل ہے کہ میں یہ کہوں کہ میں نے یہ سب کچھ بہادری اور استقامت سے برداشت کیا۔ اس دوران مجھے جب بھی سونے یا اونگھنے کا موقع ملا۔ میں بچوں کی طرح ڈراؤنے انداز میں چیختا ہی نہیں بلکہ کپڑے بھی خراب کرتا رہا، میں یہیں تھا، جب ایک سنتری نے بتایا کہ میری بیوی نے خلع کی درخواست دے دی ہے۔ مجھے کئی دن تک تو یہ پتہ ہی نہ چل سکا کہ ایسا صابرہ نے کیا ہے یا وجیہہ نے؟ میں نے جب وجیہہ کو پہلی دفعہ دیکھا تھا، تب اس کا نام نہیں جانتا تھا اور ویسے بھی وہ اس دن صابرہ کے گھر میں آئی ہوئی تھی، جب اسے ایک دریچے میں دیکھ کر میں اس کی محبت میں مبتلا ہوا تھا۔ میں نے اس کا رشتہ لینے کے لیے اپنی ماں کو بھیجا، جس نے تازہ تازہ شجاع آباد سے آنکھوں کا آپریشن کرایا تھا، شادی کے بعد غلطی نہیں بلکہ مغالطے کا احساس ہوا تو وجیہہ سے شادی کے لیے کافی جتن کرنے پڑے۔ یہ خوش قسمتی یا بدقسمتی، میری یا صابرہ یا وجیہہ اور ان سے ہونے والے پانچ بچوں کی صابرہ اور وجیہہ کے والد صاحبان مشترکہ طور پر جعل سازی کے ایک مقدمے میں پکڑے گئے۔ تب ان سب پر میری وکالت اور تعلقات کے جوہر کھلے اور اس طرح جسے میں نے دریچے میں دیکھا تھا۔ وہ میری آنگن میں آ گئی۔ یہ اور بات کہ جب میری زندگی میں دریچہ تو کیا۔ روزن بھی نہ رہا تھا۔ جو خبر ملتی کہ مجھ سے خلع لینے کی آرزومند صابرہ ہے یا وجیہہ؟ کوئی تین ہفتے بعد وجیہہ کی بہن جو ایک جرنیل سیکریٹری اطلاعات کی دوست تھی۔ میرے لیے کچھ سہولتوں کی خوش خبری لائی اور پھر اگلے ہی دن اس نے مجھ سے دو کاغذوں پر دستخط کرائے۔ ایک کے نتیجے میں مجھے رہائی اور دوسرے کے بدولت وجیہہ دونوں بیٹیوں کے ساتھ مجھ سے آزاد ہو گئی۔

پھر ہم میں سے بہت سے کامریڈ ایک دوسرے کو حکومت کا مخبر سمجھ کر تقریباً قطع تعلق کر بیٹھے۔ مگر ایک رات ہماری زندگی میں ایسی آئی جسے فراموش کرنا بہت مشکل ہے۔ مزدور رہنما پاشا نے جلاوطن شاعر فیض کی سالگرہ منائی۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ پہلے تقریریں ہوئیں۔ کچھ نیم گرم جوش نعرے گونجے اور سب لوگ رفتہ رفتہ ایک رشتے میں تب پروئے گئے، جب فریدہ خانم نے فیض کا ایک انقلابی ترانہ چھیڑا،

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل پہ لکھا ہے

سارے خواب دیکھنے والے زندہ سے زندہ تر ہوتے گئے۔ ان کے درمیان دوستی اور محبت کا وہ رشتہ استوار ہونے لگا۔ جس سے ظالم اور طاقت ور خوف زدہ رہتے ہیں۔ پہلے بے روزگار صحافی واجد نے جھوم کر کہا، لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔ پھر کوڑے کھانے والے زیدی نے والہانہ انداز میں کہا' وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے، جیل کی سی کلاس میں رہنے والے پروفیسر عابد نے کہا' جو لوحِ ازل پہ لکھا ہے'۔ ترانہ اپنے بول کے راز کھولتا گیا مغنیہ اپنی آواز کا جادو جگاتی گئی اور مجمع اپنے آپ سے ایک اور طرح سے

آشنا ہوتا گیا اور اس آگاہی سے سرشار ہوتا چلا گیا۔

جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے
اور مظلوموں کے پاؤں تلے
یہ دھرتی دھڑ دھڑ، دھڑ کے گی
اور اہلِ حَکَم کے سر اوپر
یہ بجلی کڑ کڑ، کڑ کے گی

عام طور پر نظر انداز ہو جانے والوں کے حلق سے غراہٹ سے مشابہ آوازیں پہلے تحسین اور ستائش بنیں پھر نعروں میں ڈھلیں اور پھر رزم گاہ میں اترنے کے لیے تیار سپاہ کے نہتے ہاتھوں کی جھنکار ہو گئیں۔ اس بند کو کئی مرتبہ سنا گیا اور پھر جب یہ کہا گیا۔

ہم اہلِ صفا، مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے

تو 'بائے' کہہ کر پہلے ملکوں کے پشتینی نوکر، کاکو اور شعبانا اٹھے، پھر نواب پور کی لگی اٹھی، پھر تین نسلوں سے بھٹہ پر مزدوری کرنے والے کنبے کا بڑا حیا تا اٹھا اور یہ سب ناچنے لگے، یہ مسند کے پورے معنی جانتے تھے یا نہیں، لیکن انہیں یہ ضرور پتا تھا کہ بوریا یا دری نہیں، کوئی ایسی چیز ضرور ہے، جس پر چند ٹھیکیداروں نے قبضہ کر رکھا ہے۔

جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے

تخت و تاج کے ساتھ نخوت بھرے سر بھی اچھالنے کی تمنا، ہر کمزور کے دل پر اس طرح حاوی ہوئی کہ وحشیانہ سرشاری میں ڈوبی ہوئی چیخیں، سبھی کے گلے، سر اور دل سے نکلنے لگیں، پہلے شاکر اٹھا اور ایک نعرہ لگایا، ڈیبہ، یہ علی کی ملتانی تصریف تھی، پھر، ٦ ماہ بہاولپور جیل میں سیاسی قید گزارنے والی پٹھانی اٹھی اس کے ساتھ بتول بھی جس کی قرآن سے شادی کی گئی تھی، تاکہ جائیداد گھر سے باہر نہ جا سکے، اور پھر انقلاب کے نام کے دیوانوں کا ایک جمِ غفیر اپنی تعبیر کو اتنا قریب پا کر رومی کے درویشوں سے بھی زیادہ والہانہ انداز میں رقص کرنے لگا۔

پھر نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے، حاضر بھی
جو منظر بھی ہے، ناظر بھی
اٹھے گا انا، الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں، اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

اور پھر خلقِ خدا اپنے راج کرنے کے تصور، اپنی پامالی کو توقیر میں بدلنے کے خیال سے ہی مخمور ہو کر ایسے سنائی اور دکھائی دی کہ شاعر جلاوطنی کے عالم میں اور مغنیہ ملتان جیسے قدامت پسند شہر میں اس ترانے کی ایسی پذیرائی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ مجھے اپنی پوری زندگی میں ایسا روحانی تجربہ نہیں ہوا تھا، باسط کا بھی یہی حال تھا، وہ، محسن اور اصغر کئی مرتبہ ایک دوسرے کو اور ایک مشترک خواب کو چوم چکے تھے۔

مگر آج باسط نے ہمیں گراس روٹ لیول پر جمہوریت مستحکم کرنے پر لیکچر دیا تھا، وہ ڈاکٹر بی۔علی ہو گیا تھا، میں بھی ایک دو پریشانیوں سے بچنے کی خاطر ایک معتبر ذریعے کو یقین دہانی کرا کے ڈسٹرکٹ کونسل کا رکن بن گیا تھا، مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ مجھے ثابت قدم رہنے پر ضلع ناظم بنا دیا جائے گا۔ اور پھر شاید میں بھی کانٹریکٹ پر رکھے جانے والے وزرائے اعظم میں کبھی شامل ہو جاؤں، میرا خیال ہے کہ ایک دن میں یہ منزل پا ہی لوں گا، آخر باسط بھی تو اپنے خواب بیچ کر ڈاکٹر بی۔علی بن گیا تھا، اب یہ بات بتانی چاہیے یا نہیں کہ میں جب کبھی اس ترانے کی کیسٹ گاڑی میں سننے لگتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جو لوگوں کے نعرے اور داد و تحسین کی آوازیں تھیں، وہ نوحہ کرنے والوں کی آہ و بکا میں تبدیل ہو رہی ہیں، صرف یہ پتا نہیں چلتا کہ میری اپنی آواز اس نوحے میں شامل ہے یا نہیں؟

ooo

انور سجاد

کینسر

یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑے سہتے، امڈتے، ٹھٹھرتے سیاہ بادلوں کے پیچھے سرد سورج، آسمان اور زمین کے اتصال میں دراڑ بناتا یوں اترتا ہے کہ بادلوں کے پیچھے لرزتی پیازی نارنجی کرنیں، نیلاہٹ مائل سرمئی چٹان کی دراڑ میں اُلٹے پاؤں اترتے سردی میں کانپتے کیکڑے کی تھراتی ٹانگیں دکھائی دیتی ہیں۔

شاید اس لیے کہ سورج ان دنوں چوتھے بُرج یعنی سرطان میں غروب ہوتا ہے۔

چند لمحوں میں سب کچھ تاریک بادلوں میں ٹھٹھرتا تاریک ہوجاتا ہے۔

لیکن ٹوٹے شیشوں کی کھلی کھڑکی میں رکھے گملے میں کھلا تنہا پھول روشن ہے۔ وسط میں سیاہ تھالی پر ننھے منے پیلے نقطے اور تھالی سے پھوٹتی لمبی لمبی پتیاں تنی، جوان، روشن، سورج مکھی، کئی سورجوں کی تمازت لئے جسے یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑے سہتے، امڈتے، تاریک بادل بھی تاریک نہیں کر سکے، ٹھٹھرا نہیں سکے کہ اس کا رُخ ہمیشہ اس اور رہتا ہے جہاں پیار کی حدت اور امید کی روشنی لیے دو بڑی بڑی آنکھیں اسے ہر وقت دیکھتی رہتی ہیں۔

ان آنکھوں اور پھول کو ایک دوسرے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے دیکھنے والا، ایک دوسرے کو روشنی اور حدت پہنچاتے ہوئے محسوس کرنے والا لمحہ بھر کے لیے تمیز نہیں کر پاتا کہ سورج مکھی کون ہے اور آنکھیں کون۔

سورج مکھی اور آنکھیں۔

آنکھیں اور سورج مکھی ایک زرد رو لڑکی کی ملکیت جس کا جسم آہستہ آہستہ گھل رہا ہے اور پیٹ پھول رہا ہے۔ آہستہ آہستہ، بالکل یوں جیسے گھڑی پر گھنٹے کی سوئی جو چلتی تو رہتی ہے پر چلتی نظر نہیں آتی۔ چہرہ زرد، جیسے روشنی کی کرنوں کے ساتھ ساتھ پھول کی کالی تھالی سے پیلے نقطوں کا بُور بھی اُڑ کر اس کے چہرے اس کے جسم پر پیلاہٹ بن کر آہستہ آہستہ جذب ہو رہا ہے، رفتہ رفتہ بالکل یوں جیسے بادلوں سے پاک راتوں میں ٹوٹے شیشوں کی کھڑکی سے نظر آتے تارے جو مسلسل حرکت میں ہوتے ہیں پر حرکت کرتے نظر نہیں آتے۔

اس لڑکی کے لیے گھنٹے کی سوئی اور ستاروں کی حرکت کی رفتار کوئی معنی نہیں رکھتی۔ کھڑکی میں کُھلا اس کا سورج اس کی طرف چہرہ کیے سدا روشن رہتا ہے اور اس کی نظروں کی حدت اسے لوٹاتا رہتا ہے۔ اس لیے اسے سردی گرمی، رات اور دن میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

رات کو جس کے سانس اتنے گہرے، میٹھے، خوشبودار ہیں جیسے جوان ہوتی لڑکیوں کے جسموں میں تڑپتے رازوں سے امڈتا، خشک ہو کر فضاؤں میں پھیلتا پسینہ۔

دن، کہ جس کے کان اتنے تیز، اتنے حساس ہیں کہ فضاؤں میں پھیلتے پسینے کے ایک راز کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل جان لیتے ہیں اور خود بھی پسینہ پسینہ ہوجاتے ہیں۔

رات، گزرے ہوئے دن اور آنے والے دن کے درمیان منقش پردہ۔

سردی سے کانپتی تاریکیوں سے ہوا کا ٹھٹھرتا جھونکا۔ ٹوٹے شیشوں کی کھڑکی سے تیزی کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ سورج مکھی جھوم جھوم جاتا ہے۔ لڑکی کے نیلے پڑتے ہونٹوں پر پیلی سی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔

نہیں، اسے کسی لحاف کمبل کی ضرورت نہیں، اس کے رفتہ رفتہ سکڑتے جسم اور آہستہ آہستہ پھولتے پیٹ، آنکھیں بنتے چہرے پر پھیلتی سورج مکھی کی کومل، پیلی اور کوسی کوسی کرنیں ہیں۔

وہ مسکرائے جاتی ہے۔

دنیا بھر میں پھیل گئی ہے۔ جیسے دنیا بھر کی سسکیاں اس کی ماں کے سینے میں سمٹ آئی ہیں۔ جیسے ماں کی سسکیاں اس کے سینے سے نکل کر دنیا میں چاروں اور پھیل گئی ہیں۔

اس کے پیٹ میں درد کی ایک اور شدید لہر اٹھتی ہے۔ وہ پیٹ کے درد کو ہاتھوں میں سمیٹے، بھینچی آنکھیں کھول کر سورج مکھی کو دیکھتی ہے۔

سورج مکھی مسکرا دیتا ہے۔

وہ بھی مسکرا دیتی ہے۔

اس کی غذا ماں کی سسکیاں ہیں اور باپ کے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے جبڑوں کی آوازیں۔ باپ اسے بالکل بھول چکا ہے۔ ماں کبھی کبھی دروازے میں آتی ہے اور چند لمحے پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھنے کے بعد چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر نے اس کی بیٹی کے لیے کوئی غذا تجویز نہیں کی۔ اس کے باپ نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ اسے کچھ نہ دیا جائے۔ اس سے ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ لڑکی کی بیماری بڑھے گی نہیں اور دوسرے خوراک کی کمی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ ڈاکٹر نے لڑکی کے لیے کوئی دوا بھی تجویز نہیں کی کہ ہر قسم کے ایکس رے اور ٹیسٹوں کے باوجود وہ تشخیص نہیں کر پایا کہ آخر اس لڑکی کو مرض کیا ہے۔

......کہاں ہے وہ جس نے تمہارے خواب چور چور کر کے تمہارے پیٹ میں بھر دیے ہیں۔ ہم تمہارے علاج پر لگائیں یا غذا پر۔ صدیوں دور سے آتی، ماں کی آواز اس کے کانوں میں چکرا جاتی ہے۔

......وہ دیکھو۔ کھڑکی میں مسکرا رہا ہے ماں۔ لڑکی کی آواز صدیوں پر پھیل جاتی ہے۔ ایک حاسد جادوگر نے اسے پھول میں تبدیل کر دیا ہے۔

......حاسد جادوگر؟ ماں اپنے چھیدوں والے دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہے۔

......ہاں ماں جس نے ابا کو جابر بنا دیا ہے، ان کے جبڑے نکال کر کتے کے جبڑے لگا کے۔ اور تمہارے سینے میں سسکیاں بھر دی ہیں کہ تمہارے منہ سے اور کوئی آواز ہی نہیں نکلتی۔ وہ حاسد جادوگر کون ہے ماں؟ اسے تلاش کرو اور ابا کے جبڑوں میں دے دو۔ ہنستے ہنستے لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

ہو سکتا ہے وہ نہ ہو جو سمجھتی ہوں۔ واقعی رسولی ہو۔ ماں سوچتی ہے۔ جو اس کے پیٹ سے نکل کر دماغ میں بھی جا پہنچی ہو جو یہ ایسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہے۔

ماں اپنی آنکھوں پر چھیددار دوپٹہ رکھ کر سسکیاں لیتی چلی جاتی ہے۔ لڑکی کے منہ سے خود بخود آہ نکل جاتی ہے۔ ٹھنڈی سی۔ یہ رسولی ہوتی ہی ایسی ہے کہ اس کے چھوٹے چھوٹے ذرے ٹوٹ کر جسم کے ہر حصے میں گھر بنا لیتے ہیں۔ پتہ نہیں جسم کے ایک خلیے کو کیا ہوتا ہے کہ وہ بھیڑیے کا روپ دھار لیتا ہے کہ صحتمند خلیوں کو غذا بنا کر پھولتا پھلتا رہتا ہے اور اس سے کرچیاں ٹوٹ

...ہوتے رہتے ہیں، اسی رفتار سے دھیرے دھیرے جس رفتار سے اس لڑکی کا جسم گھلتا ہے، پیٹ پھولتا ہے، جیسے گھڑی پر گھنٹے کی سوئی، جو چلتی تو رہتی ہے پر چلتی نظر نہیں آتی، جیسے اس کے چہرے اور جسم میں جذب ہوتا سورج مکھی کا پیلا نور۔ زرد روشنی، دھیرے دھیرے، جیسے بادلوں سے پاک راتوں میں ٹوٹے شیشوں کی کھڑکی سے نظر آتے ستارے جو مسلسل حرکت میں ہوتے ہیں پر حرکت میں نظر نہیں آتے، جیسے سردیوں میں ٹھہرا ہوا آسمان رفتہ رفتہ ساون کے کڑکتے جگمگاتے برستے آسمان میں ڈھل جاتا ہے اور پتہ اس وقت چلتا ہے جب گرم کپڑے جسم کو کاٹنے لگتے ہیں۔

تو اب تاریک آسمان پر پھیلے، پانیوں سے بوجھل بادل بجلی کے لشکتے کوڑوں سے روشن روشن برسنے لگتے ہیں، لڑکی کے سینے میں لشکنے دھڑکنے لگتے ہیں۔ وہ بے طرح دھڑکتے دل سے بصد مشکل اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنے پیٹ کو سنبھالتی، لڑکھڑاتی، ٹوٹی کرسی کا سہارا لیتی کھڑکی میں آتی ہے۔ بارش میں بھیگا کول ہوا کا جھونکا اس کے پسینے میں تر چہرے کو اور بھی بھگو جاتا ہے۔

وہ سورج مکھی کو بازوؤں میں سمیٹ کر سینے کے ساتھ لگا کے باہر بازار میں جھانکتی ہے۔

موسلا دھار بارش سے بازار میں سیلاب سا آ گیا ہے جس میں شہر کی روشنیاں ڈوبتی ابھرتی ہیں اور بچے، لاتعداد بچے، پھولے پیٹوں اور سوکھے بازوؤں، سوکھی ٹانگوں، سوکھے چہروں والے شور مچاتے بچے ایک دوسرے پر پانی اچھالتے اس سیلاب میں بارش کو اپنے مساموں میں اتارتے کھیلتے کودتے دکھائی دیتے ہیں۔

وہ اپنے سارے جسم میں تڑپتے رازوں سے اٹھتا، خشک ہو کر خوشبو کی صورت فضاؤں میں پھیلتا پسینہ اپنے ہونٹوں میں سمیٹ کر سورج مکھی کے ہونٹوں پر ثبت کرتی ہے اور پچھلا دروازہ کھول کے باہر بازار میں بارش کے سیلاب میں بچوں کے ساتھ مل کر ان پر پانی اچھالتی، شور مچاتی، بچوں میں بچہ، شور میں شور، بارش میں بارش، سیلاب میں سیلاب ہو جاتی ہے۔

ڈلیوری روم سے باہر صرف اس کی ماں بیٹھی ہاتھوں پر چھیدوں والا دوپٹہ پھیلائے سسکیاں بھرتی ہے جسے کبھی کبھی کہیں دور سے آتی اس لڑکی کے باپ کے غذا چباتے جبڑوں کی آواز نگل لیتی ہے۔

اور ڈلیوری روم کے اندر ڈاکٹر اپنی تشخیص پر شرمندہ لڑکی کے پیٹ میں بچہ ہے، رسولی نہیں، اور تشویش میں مبتلا کہ بچہ تو شش ماہا ہوگا۔ جانے بچے گا بھی یا نہیں۔ اسے ہاتھوں کی لرز پر قابو پا کر نشتر سے لڑکی کا پیٹ چاک کرنے کے بعد اس کے رحم کو کھولتا ہے، دیکھتا ہے اور حیران رہ جاتا ہے۔

لڑکی کے رحم میں سورج مکھی کا بہت بڑا پھول دھڑکتا نظر آتا ہے جس کی پیلی پیلی پتیوں سے پھیلتی شعاؤں نے جیسے اس لڑکی کے وجود کو اکائی میں قائم کر رکھا ہے۔ اس کی حیرت زدہ نظریں بے ہوش لڑکی کے چہرے کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔

وہ اپنی بے ہوشی میں بھی مسکراتی ہے۔

اپنے ہونٹوں پر کھڑکی میں کھلے تنہا، روشن سورج مکھی کی مسکراہٹ لیے۔

اور باہر کول ہواؤں پر سوار اڑتے روشن بادلوں کے پیچھے سورج یوں زمین اور آسمان کے اتصال میں دراڑ بناتا ابھرتا ہے کہ بادلوں کے پیچھے اس کی کول، سرخ، نارنجی، پیلی کرنیں، نیلاہٹ مائل سرمئی چٹان کی دراڑ سے تمازت اور حدت لیے باہر کو رینگتی نکلتی کیکڑے کی ٹانگیں دکھائی دیتی ہیں۔

○○○

انیس ناگی

ایک افسانے کی تیاری

☆☆☆ میرا بیٹا ڈاکٹر ہے اور دو سالوں سے بے کار ہے۔
☆☆☆ میرے بیٹے کی بیوی ڈاکٹر ہے جو ایک سال سے بے کار ہے۔
☆☆☆ پھر اس نے ایک گلی میں کلینک چلایا تھا جو چلتے ہوئے بھی نہیں چلتا تھا۔
☆☆☆ پھر اس نے ایک لیڈی ڈاکٹر سے شادی کر لی تھی کہ دونوں مل کر کلینک چلائیں گے۔
☆☆☆ دونوں نے بہت محنت کی لیکن اوور ہیڈ اخراجات سے تنگ آ کر کلینک بند کر دیا۔
☆☆☆ وہ ایک سال سے بے کار ہیں اور شادی پر ملی سلامیوں پر گزر اوقات کر رہے ہیں۔
☆☆☆ تین سالوں کے وقفے کے بعد محکمہ صحت نے ڈاکٹروں کی بے روزگاری ختم کرنے کے لیے دور دراز علاقوں میں بنیادی ہیلتھ یونٹ کھولنے کا اعلان کیا ہے اور اچھی تنخواہ کا لالچ بھی دیا ہے۔
☆☆☆ تنخواہ پانچ ہزار، نہ کوٹھا نہ مکان
☆☆☆ میاں شمال میں اور بیوی جنوب میں۔
☆☆☆ بڑے شہروں کے بیکار ڈاکٹر چھوٹے شہروں میں نہ گئے، چھوٹے شہروں کے ڈاکٹر اسمبلیوں کے ممبروں کی انگلیاں تھام کر بڑے شہروں کے نزدیک آ گئے۔
☆☆☆ میرا بیٹا اور بیوی باہر نہیں گئے، وہ میرے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ شادی کرنے پر پچھتاتے ہیں۔
☆☆☆ دونوں ایک دوسرے سے یا بے کاری سے تنگ آ کر ایک دوسرے کو چھوڑنے پر مائل ہیں۔ دونوں جلاوطنی کے موقع کی تلاش میں ہیں، روزانہ اخباروں میں اشتہار دیکھتے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا ان کے لیے تنگ سے تنگ تر ہوتی جا رہی ہے۔

O

میں نے افسانہ شروع کرنے سے پہلے ہی اس کا پس منظر بیان کر دیا ہے حالانکہ مجھے پیش منظر سے پس منظر کی طرف جانا چاہیے تھا۔ تاہم اگر پیش منظر اور پس منظر کو ملا بھی دیا جائے تو افسانہ نہیں بنتا، کہانی سے افسانہ بنانا پڑتا ہے، اس لیے میں اپنے آپ کو اس بیان میں شامل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

دراصل میں نے زندگی بھر کوئی کام نہیں کیا۔ میرے والد نے وراثت میں دو کوٹھیاں چھوڑی تھیں میں نے ایک کوٹھی بیچ کر اس کی رقم فکسڈ ڈیپازٹ میں جمع کرا دی تھی۔ اب میرا گزارہ اس کے سود پر ہوتا ہے۔

شکر ہے میری اولاد ایک بیٹے تک محدود ہے۔ میری گندی حرکتوں کی وجہ سے میری بیوی ایک مدت سے اپنے میکے میں مقیم ہے اس کی ماں اور ایک بھائی ابھی تک بقید حیات ہیں اور بندوغم سے آزاد ہیں۔ وہ کھاتے پیتے لوگ ہیں اس لیے انہیں میری ضرورت نہیں ہے۔

میں نے اپنے بیٹے کی شادی بادل نخواستہ کی تھی۔ میرا بیٹا اور اس کی بیوی لالچی قسم کی مخلوق ہیں جو میرے فکس ڈیپازٹ کی رقم کو کنکھیوں سے دیکھتے ہیں۔ میرا بیٹا مجھے کاہلی اور عمر بھر کوئی کام نہ کرنے کے طعنے دیتا رہتا ہے میں اس کے عف عف کرنے کی پروا نہیں کرتا۔ نئی نسل ہے ہی بدتمیز۔ میں نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا ہے اسے فی الحال منسوخ تصور کیا جائے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں کئی دنوں سے ایک افسانہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اپنی بے کاری کو چت کرنے کے لیے میں نے یہ نیا مشغلہ کر لیا ہے۔

... ہونے کا امکان ہے اس لیے میں جہاں سے چاہوں گا اسے شروع کردوں گا اور جہاں چاہوں گا اسے ختم کردوں گا۔

☆☆☆ یہاں ایک فرق بیان کردینا ضروری ہے کہ کہانی اور افسانے میں فرق ہوتا ہے۔ افسانہ ڈھانچہ ہوتا ہے جس میں کہانی کی لڑی چلتی ہے۔ میں اس کہانی کو سوچے سمجھے بغیر، کسی منصوبہ بندی کے بغیر لکھتا جاؤں گا، دیکھیں یہ افسانہ بنتا ہے یا کہانی تک پہنچ کر دم توڑ دیتا ہے۔

☆☆☆ دراصل اس کہانی کا راوی میرا بیٹا ہے جسے خود راوی ہونا چاہیے لیکن وہ کھردرا سا پروفیشنل قسم کا نوجوان ہے جسے ایسی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے پیسے کمانے کی دھن ہے اور وہ مجھ سے الگ رہنا چاہتا ہے۔

O

☆☆☆ میرا بیٹا، اس کی بیوی، اس کی بیٹی اور اس کا سابقہ ڈسپنسر اقبال کار میں سوار ہو کر شہر سے تیس میل دور ایک قصبہ چک تنبولی کی طرف جا رہے ہیں۔ کار کی ڈگی میں کچھ بچی کھچی دوائیاں ہیں جو میرے بیٹے نے کلینک بند کرنے کے بعد سنبھال لی تھیں۔

☆☆☆ اقبال ڈسپنسر سیاہ رنگ کا ہنومان کی شکل کا ایک دیہاتی ہے جو چک تنبولی کا رہنے والا ہے۔ وہ صبح شام پیسے دوگنے کرنے کے چکر میں رہتا ہے۔ اس افسانے میں اس کی شمولیت ضروری ہے کیونکہ وہ واقعات کو جنم دے گا۔ وہ اس بیان میں اپنی جگہ خود بنا لے گا۔ اس کے باپ کی تھوڑی سی زمین ہے جس پر اس نے اپنا ڈیرہ بنایا ہوا ہے۔ ڈیرے سے باہر اس نے ٹاہلی کے درخت پر ایک بورڈ آویزاں کیا ہوا ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبال

پی اے ٹو ڈاکٹر ۔۔۔۔ (یہاں پر میرے بیٹے کا نام اور اس کی ڈگریاں درج ہیں۔)

☆☆☆ جب میرے بیٹے کے کلینک میں کام کرتا تھا اس نے بہت سے نسخے یاد کر لیے تھے جن کی مدد سے وہ اپنے گاؤں کے لوگوں کا علاج کرتا ہے۔ وہ بہت زیادہ لالچی ہے اس لیے لوگوں کا اس پر اعتماد اٹھ گیا ہے۔ وہ مریضوں سے زبردستی پیسے چھین لیتا ہے بقایا پیسے واپس نہیں دیتا۔ جو مریض فیس دینے کے قابل نہیں ہوتا، اس کی جامہ تلاشی کرتا ہے اور بعد میں مارتا ہے کہ وہ غریب کیوں ہیں۔ اس کے پاس آنا بیماروں کی مجبوری ہے کیونکہ دور دراز تک کسی ڈاکٹر کا نشان نہیں ہے۔

☆☆☆ آج صبح ہوتے ہی اس نے مسجد سے اعلان کروا دیا تھا کہ شہر سے ایک بڑا ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر اس کے کہنے پر علاج کے لیے آ رہے ہیں، تمام مریض اس کے ڈیرے پر صبح دس بجے جمع ہو جائیں۔

☆☆☆ آج صبح ہوتے ہی بہت سے مریض اس کے ڈیرے پر جمع ہو چکے ہیں جو جو معذور ہیں انہیں چارپائیوں پر اٹھا کر لایا جا رہا ہے۔ اقبال عرف بالا کی آنکھوں میں بے تحاشا خوشی کی چمک ہے کہ ہر مریض اس کی خوش قسمتی ہے۔ اس نے پچاس روپیہ فیس لی ہے اور میرے بیٹے کو چالیس روپے بتائی ہے۔

☆☆☆ سہ پہر تک میرا بیٹا اور اس کی بیوی مسلسل مریض دیکھ رہے ہیں۔ اک دیہاتی نے میرے بیٹے کو بتایا ہے کہ پانچ میل

دور ایک سرکاری ڈسپنسری ہے جہاں صرف ایک چوکیدار رہتا ہے اور وہاں ڈاکٹر کبھی نہیں آیا۔ وہ اپنی تنخواہ کا کچھ حصہ اوپر دے دیتا ہے۔

☆☆☆ very good میرے بیٹے کی بیوی نے دوسرے کمرے سے آواز لگائی ہے، تم بھی ایسا کوئی ہیلتھ یونٹ ڈھونڈ لو۔

☆☆☆ میرے بیٹے نے اس بات یا طعنے کا کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ وہ بڑے انہماک سے مریض کا معائنہ کر رہا ہے۔

☆☆☆ بس میں اور مریض نہیں دیکھوں گا میں تھک گیا ہوں باہر مریضوں کی تعداد کم ہونے میں نہیں آتی۔ اس نے حساب لگایا ہے کہ ایک دن کی کمائی سے دو ہفتے آرام سے گزر جائیں گے۔

☆☆☆ باہر اقبال مریضوں کی جیبوں سے پیسے نکالنے اور لڑائی جھگڑا کرنے میں مصروف ہے اگر کوئی فیس کے پیسے نہیں دے سکتا تو وہ اس کی چادر اتار لیتا ہے۔ وہ مقررہ فیس سے ایک پیسہ کم لینے کو تیار نہیں۔ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیسے اکٹھے کرنا چاہتا ہے۔ وہ مریضوں کو گالیاں بھی دے رہا ہے۔

☆☆☆ ''میرے پاس ڈلیوری کے دو کیس ہیں یہاں تو کوئی بندوبست نہیں ہے اس سے کافی پیسے مل جائیں گے'' دوسرے کمرے سے میرے بیٹے کی بیوی نے انگریزی زبان میں کہا ہے۔ اسی دوران اقبال گھبرایا ہوا میرے بیٹے کے پاس آیا ہے۔

☆☆☆ ڈاکٹر صاحب بڑے چوہدری صاحب نے آپ کو بلایا ہے ان کی ماں بیمار ہے۔

☆☆☆ میں ابھی نہیں آ سکتا ہے، ابھی بہت سے مریض بیٹھے ہوئے ہیں۔

☆☆☆ ''ڈاکٹر صاحب آپ کمال کرتے ہیں، یہ کہہ کر اس نے میرے بیٹے کے گھٹنے پکڑ لیے ہیں۔'' وہ علاقہ کا بڑا زمیندار ہے آپ نہ گئے تو وہ میرے گھر والوں کو کولہو میں ڈال دے گا، یہ کہہ کر اس نے میرے بیٹے کا میڈیکل باکس اٹھا لیا ہے۔

☆☆☆ آپ کی والدہ کی شوگر بہت زیادہ ہے'' میرے بیٹے نے اپنا گلوکو میٹر بند کرتے ہوئے کہا ہے۔ اس نے ایک دوائی لکھ کر زمیندار کو دے دی ہے جس کی عمر پچاس برس کے قریب ہے۔ اس کی چار پانچ کنال کی کوٹھی ہے جو دیہاتی طریقے سے سجائی گئی ہے اس نے ایک سو روپیہ بطور فیس میرے بیٹے کو دے دی جس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اسے جیب میں ڈال لیا ہے۔

☆☆☆ چوہدری صاحب آپ کے علاقے کے لوگوں کی حالت بہت خراب ہے۔ اکثر لوگوں کو ٹی بی ہے اور دور دور تک علاج کا کوئی بندوبست نہیں ہے آپ کچھ کریں۔ یہ گاؤں والے آپ کے بچے ہیں۔

☆☆☆ زمیندار شکل سے کن کٹا لگتا ہے، اپنا تلے والا کھسہ پہن کر کہنے لگا ہے'' یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ڈرائیور کو گاڑی باہر نکالنے کے لیے کہا ہے۔

☆☆☆ ڈاکٹر صاحب آپ جوان ہیں اس لیے جذباتی آدمی ہیں، آہستہ آہستہ آپ کو ایسی باتیں سننے کی عادت ہو جائے گی۔ میں اصل میں شہر میں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ رہتا ہوں۔ گاؤں میں میری والدہ کے ساتھ میری پہلی بیوی رہتی ہے۔ ہم دیہاتی لوگ چھوٹی چھوٹی بیماریوں کی پروا نہیں کرتے، وہ خود ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔''

☆☆☆ اقبال نے میڈیکل باکس اٹھا لیا ہے۔ Bastard کمرے سے باہر نکلتے ہوئے میرے بیٹے نے کہا ہے۔

☆☆☆ میرا بیٹا اپنی تھکن بھول کر پھر مریض دیکھنے میں مصروف ہو گیا ہے دوسرے کمرے میں اس کی بیوی حاملہ عورتوں کا معائنہ کر رہی ہے ایک عورت درد سے بلبلا رہی ہے۔

☆☆☆ میرے بیٹے نے جھنجھلا کر کہا ہے'' اسے آزاد کرو۔''

☆☆☆ کیسے کروں یہاں نہ تو کوئی اوزار ہے اور نہ ہی کوئی دوائی، دستانے تک نہیں ہیں۔ اقبال نے کس قسم کا کلینک بنایا ہوا ہے۔''

☆☆☆ ''ڈاکٹر صاحبہ دستانے تو ہیں لیکن اونی ہیں۔''

☆☆☆ ''شٹ اپ، ایڈیٹ''

☆☆☆ باہر ان دو حاملہ عورتوں کی ساسیں بہ بانگ دہل لڑکوں کی پیدائش کا مطالبہ کر رہی ہیں۔

☆☆☆ ایک دوسرے کو کہہ رہی ہے "فضلو کے اوپر نیچے تین بیٹیاں ہوئی ہیں، اس مرتبہ بھی لڑکی ہوئی تو میں اس کے لیے ایک اور لنگائی لے آؤں گی۔"

☆☆☆ دونوں حاملہ عورتیں میرے بیٹے کی بیوی کے سامنے تھر تھر کانپ رہی ہیں۔ ان میں ایک نے ڈرتے ہوئے پوچھا ہے "ڈاکٹرنی لڑکا کیسے پیدا ہوتا ہے؟

☆☆☆ جیسے لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ لڑکا اور لڑکی دونوں مرد پیدا کرتے ہیں میرے بیٹے کی بیوی نے مریضہ کی شلوار میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولتے ہوئے کہا ہے اسے ایک دم کچھ یاد آ گیا ہے اور ایک شرارہ اس کی آنکھوں کے سامنے فضا کو کاٹتا ہوا غائب ہو گیا ہے۔ جب الٹرا ساؤنڈ کی مشین نے اسے بتایا تھا کہ اس کے پیٹ میں لڑکی ہے تو وہ سر پٹخنے لگی تھی۔

☆☆☆ باہر ایک چیخ بلند ہوئی ہے میرا بیٹا اور اس کی بیوی گھبرا کر باہر نکلے ہیں چار آدمی ایک عورت کو میت کی طرح چار پائی پر لے کر کھڑے ہیں، ان کے ساتھ گاؤں کی کچھ عورتیں بھی ہیں۔

☆☆☆ اقبال ایک چیتے کی طرح جست لگا کر ان کی طرف بڑھا ہے اور چار پائی پر چیخ و پکار کرتی ہوئی مریضہ کے خاوند کے بارے میں پوچھا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر دیہاتی اس کی طرف بڑھا ہے۔

☆☆☆ چوہدری یہ چار پائی پر تمہاری بھی ہے۔"

☆☆☆ "ہاں"

☆☆☆ اقبال نے اشارہ کر کے چار پائی کو زمین پر رکھوایا ہے۔ چوہدری ڈاکٹرنی کی دوسو روپیہ فیس ہے بچہ پیدا کروانا ہے، کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

☆☆☆ باؤ لے میرے پاس پچاس روپے ہیں، اس نے منمنا کر کہا ہے

☆☆☆ "اسے دائی کے پاس لے جاؤ۔"

☆☆☆ وہ کہتی ہے یہ خطرناک کیس ہے۔"

☆☆☆ اسی لیے اس کی فیس دوسو روپیہ ہے۔ ادھیڑ عمر کے دیہاتی نے جیب سے پچاس روپے کا ایک میلا کچیلا نوٹ نکال کر اقبال کی طرف بڑھایا ہے، جو گومگو کے عالم میں ہے۔

☆☆☆ واہ شیر کے بچے کبھی پچاس روپے میں بھی بچہ پیدا ہوتا ہے" یہ کہہ کر اقبال کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی صدری میں ہاتھ ڈال کر اکٹھی کی ہوئی رقم گن رہا ہے۔ وہ کرسی سے ایک دم اٹھا اور چار پائی پر لیٹی عورت کے خاوند کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا ہے۔

☆☆☆ "سنو چوہدری، تیری ٹماٹر کی تین پیلیاں ہیں ایک کی فصل مجھے دے دو، اور بچہ لے لو"

☆☆☆ میرے بیٹے کی بیوی ہاتھ میں سٹیتھو سکوپ لیے کمرے سے باہر نکلی ہے اور سب کے سامنے چار پائی پر لیٹی عورت کے اوپر سے چادر اٹھا کر سب کے سامنے اس کا معائنہ کرنے لگی ہے اس نے اپنی آستینیں چڑھا لی ہیں۔ ایک دیہاتی لوٹے سے اس کے ہاتھ دھلانے لگا ہے۔ میرے بیٹے کی بیوی نے غصے سے کہا ہے "ہنو مان کے بچے سب کے سامنے ڈلیوری کر دوں، تم لوگ پیچھے ہٹو، چاروں طرف چار پائیاں کھڑی کر دو اور اوپر چادریں ڈال دو۔" ہجوم میں موجود لوگ کھسیانے ہو کر پیچھے ہٹنے لگے ہیں۔

☆☆☆ "ڈاکٹر صاحبہ آپ بچہ کھینچنے کی کریں ڈبل فیس طے ہوئی ہے۔"

☆☆☆ "شٹ اپ"

☆☆☆ چار پائیوں کی اوٹ میں ڈلیوری میں مصروف ہے زچہ کی دلخراش چیخیں بلند ہوئی ہیں اور کچھ وقفے کے بعد ایک بچے کی رونے کی آواز سنائی دی ہے۔ وہ چار پائیوں کی اوٹ میں سے باہر نکلی ہے اس کے ہاتھ خون آلود ہیں۔

☆☆☆ لڑکا، لڑکی؟ ہجوم میں سے آوازیں اٹھی ہیں۔

☆☆☆ انسان، میرے بیٹے کی بیوی نے چیخ کر کہا ہے۔ "اس کی آنول کیسے کاٹوں" اس نے میرے بیٹے سے پوچھا ہے۔

☆☆☆ ہجوم میں سے کسی عورت نے کہا ہے" ہرل کے دھوئیں سے۔۔"
☆☆☆ "جاہل کہیں کی"
☆☆☆ اتنے میں ایک بڑھیا ہجوم کو کاٹ کر باہر نکلی ہے اور ایک پرانے سے کپڑے میں نوزائیدہ کو لپیٹنے لگی ہے پھر ایک دم چیخنے لگی ہے" ڈاکٹرنی اسے سانس نہیں آ رہا' تین پوتیوں کے بعد پوتا ملا ہے' کچھ کرو خدا کا واسطہ ہے۔"
☆☆☆ میرے بیٹے نے بچے کا معائنہ کر کے اپنی بیوی سے کہا ہے" aspiration کی ضرورت ہے۔"
☆☆☆ "یہ میں کس طرح کر سکتی ہوں۔"
☆☆☆ میرے بیٹے نے ایک دیہاتی کو کہا ہے کہ وہ جلدی سے بوتل پینے والا تیلا لے کر آئے۔ یہ کہہ کر اس نے نومولود کے حلق میں تیلا اتارا ہے اور اس کی دادی سے کہا ہے کہ وہ دوسری طرف سے زور زور سے اندر کی طرف سانس کھینچے۔
☆☆☆ اس عمل سے بچے کے حلق سے لیس نکلنے لگی ہے' جس سے اس کی چیخیں کم ہوگئی ہیں۔
☆☆☆ مائی گاڈ یہاں سے چند میل دور سب سہولتیں موجود ہیں" یہ کہہ کر میرا بیٹا اپنے میڈیکل باکس کی چیزیں اکٹھی کرنے لگا ہے،اس کی بیٹی شرارتیں کر کے چارپائی پر سوگئی ہے۔ اس کی جانے کی تیاری دیکھ کر اقبال تیزی سے اندر داخل ہوا ہے اور میرے بیٹے کے ہاتھ سے میڈیکل بکس پکڑ لیا ہے۔
☆☆☆ "ڈاکٹر صاحب ابھی تو بہت سے مریض باقی ہیں۔"
☆☆☆ "میں تھک گیا ہوں اور مریض نہیں دیکھوں گا۔"
☆☆☆ "بالے کتنی فیسیں جمع ہوئی ہیں" میرے بیٹے کی بیوی نے سختی سے پوچھا ہے۔
☆☆☆ "ڈاکٹر صاحبہ میں نے ابھی گنتی نہیں کی۔"
☆☆☆ "Out with the money" اس نے پھر سختی سے کہا ہے۔
☆☆☆ اقبال ہنومان کی منہ بنا کر جیبوں سے پیسے نکال رہا ہے۔" وہ پیسے بھی نکالو جو تم نے چھپائے ہوئے ہیں اور لوگوں سے کتنا ادھار کیا ہے؟ میرے بیٹے کی بیوی نے اس سے سختی سے پوچھا ہے۔
☆☆☆ ڈاکٹر صاحبہ چار مریضوں سے۔"
☆☆☆ میرے بیٹے کی بیوی نے گن کر سارے پیسے بالے سے وصول کر لیے ہیں اور اسے ایک سو روپے کا نوٹ دیا جس پر اس کا منہ بن گیا ہے۔۔" دیکھو بالے جن لوگوں سے تم نے ادھار کیا ہے ان کے پیسے تم رکھ لینا۔"
☆☆☆ میرے بیٹے نے اپنی بیٹی کو کاندھے پر بیٹھا لیا ہے اور انتظار میں ہے کہ بالا اس کا میڈیکل باکس اٹھا لے لیکن اس نے منہ دوسری طرف کر لیا ہے۔
☆☆☆ ڈاکٹر صاحب میرا حق زیادہ بنتا ہے' اگلی اتوار پھر۔۔۔؟"
☆☆☆ "بس اب نہیں"۔ میں ڈاکٹر ہوں قصائی نہیں ہوں۔" یہ کہہ کر میرے بیٹے نے کار سٹارٹ کر دی ہے۔

پس نوشت:

میں نے کہانی کو افسانہ بنانے کی پوری کوشش کی ہے اور بہت سے پینترے بھی بدلے ہیں۔ لیکن جب کہانی افسانہ بننے لگی تو سارے پینترے دھرے کے دھرے رہ گئے اور کہانی مجھ سے پوچھے بغیر خود بخود افسانہ بن گئی ہے۔

ooo

حیدر قریشی

اپنے وقت سے تھوڑا پہلے

خواہش تھی کہ اک بار کبھی خود سے بھی ملتے
فرصت کبھی اے گردشِ حالات عطا کر

جرمنی کی مصروف ترین زندگی میں معمولاتِ زندگی مشینی انداز سے گزر رہے ہیں۔ مجھے نہ صرف بہت سارے عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات نہ ہو سکنے کی حسرت رہتی ہے بلکہ کبھی کبھار تو خود سے ملنے کی بھی شدید خواہش ہوتی ہے۔ لیکن یہاں مکروہاتِ دنیا سے یا معمولاتِ زندگی سے مہلت ہی نہیں مل رہی۔ مجھے اتنا اندازہ ہے کہ میرے اندر میرے باہر سے زیادہ بہتر، کچھ ہے۔ لیکن جہاں بدن کے تقاضوں سے ہی جان نہ چھوٹ رہی ہو وہاں اندر کی طرف دھیان کہاں جا سکتا ہے۔ ڈیوٹی پر آنے جانے سمیت دس گھنٹوں کی مشقت کے بعد ساڑھے نو بجے شب کو گھر پہنچتے ہی پہلے لباس تبدیل کرتا ہوں، باتھ روم سے فارغ ہوتا ہوں۔ پھر انٹرنیٹ پر آئی ہوئی ای میلز دیکھتا ہوں اور ان کے جواب لکھتا ہوں۔ دس بجے شب ٹیلی کاسٹ ہونے والے جیو ٹی وی کے خبرنامہ کے پہلے پندرہ بیس منٹ کی خبریں دیکھنا میرا معمول ہے اور اسی دوران ہی رات کا کھانا کھاتا ہوں۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے لئے باہر سیر کرنے کے لئے نکل جاتا ہوں۔ دس منٹ کی سیر کے بعد واپس آکر مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے پڑھتا ہوں۔ گیارہ بجے کسی اہم ٹاک شو کو دیکھتا ہوں اور دیکھتے دیکھتے ہی صوفے پر سو جاتا ہوں۔ صبح فجر کی نماز کے وقت پر جاگ جاتا ہوں۔ حوائجاتِ ضروریہ کے بعد نماز، قرآن کی بچپن کی پڑی ہوئی عادت پوری کرتا ہوں۔ اس دوران بیوی بچے بھی جاگ جاتے ہیں۔ سب اپنے اپنے کام پر جانے کی تیاریوں میں مشغول ہوتے ہیں۔ بیوی ناشتہ تیار کرتی ہے تو ہم دونوں مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔ پھر میں کچھ دیر کے لئے سو جاتا ہوں۔

دس بجے کے لگ بھگ جاگ کر تازہ دم ہوتا ہوں۔ کچھ وقت انٹرنیٹ پر گزارتا ہوں۔ پھر ملازمت پر جانے کی تیاری کرتا ہوں۔ سوا بارہ بجے والی بس مجھے میرے گھر کے پاس سے مل جاتی ہے۔ بس پر بیٹھ کر اپنے شہر ہیٹرس ہائم کے ریلوے اسٹیشن تک پہنچتا ہوں۔ وہاں سے مجھے فرینکفرٹ شہر تک جانا ہوتا ہے۔ پلیٹ فارم نمبر 1 پر فرینکفرٹ جانے والی ٹرین آتی ہے جبکہ پلیٹ فارم نمبر ۲ پر فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آتی ہے۔ میں سیڑھیوں کے قریب اپنی ٹرین کا انتظار کرتا ہوں۔ میری ٹرین سے تین منٹ پہلے فرینکفرٹ سے ٹرین آ جاتی ہے اور اس کے آگے جانے تک میری اپنی ٹرین پہنچ جاتی ہے۔ میں اپنی ٹرین کے آگے والے ڈبے میں بیٹھا کرتا ہوں کہ وہاں سے مجھے اپنی اگلی منزل کی طرف جانے میں چند قدموں کے چلنے کی بچت ہو جاتی ہے۔ اس حساب سے چونکہ میں فرینکفرٹ جانے والی ٹرین کے پہلے ڈبے کے مقام پر کھڑا ہوتا ہوں، اس لئے فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کا آخری ڈبہ میرے قریب آ کر رُکتا ہے۔ یوں میں تین منٹ کے عرصہ میں اس ٹرین سے اترنے والی سواریوں کو سرسری سا دیکھ لیا کرتا ہوں۔ ہم سب آنے اور جانے والے مزدور اور دفتر پیشہ لوگ ہوتے ہیں۔ اس لئے تقریباً سارے چہرے عام طور پر جانے پہچانے سے ہوتے ہیں۔ ایک دن میں نے معمول کے مطابق فرینکفرٹ کی طرف سے آنے والی سواریوں کو دیکھنے کی بجائے ویسے ہی اپنے پلیٹ فارم پر اپنی ٹرین کی آمد کا انتظار شروع کر دیا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے میرے کندھوں کو تھپتھپایا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو میرا چھوٹا بیٹا تھا جو طبیعت تھوڑی سی خراب ہونے کی وجہ سے دفتر سے جلدی آ گیا تھا۔ اس کو ڈاکٹر سے فوری رجوع کرنے کی ہدایت کرنے کے باوجود مجھے اپنے بیٹے سے اس طرح کی اچانک ملاقات خوشگوار سی لگی۔ اور پھر عجیب سا معاملہ ہوا۔ تب سے جب بھی میں فرینکفرٹ کی طرف جانے والی ٹرین کے لئے جاتا ہوں، فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کو صرف اس وجہ سے دیکھتا ہوں کہ شاید میرا چھوٹا بیٹا پھر اس ٹرین سے اترے۔ ایک بار سنیچر کا دن تھا۔ آفس میں چھٹی کے باعث بیٹا گھر پر ہی تھا لیکن مجھے اپنے اولڈ ہوم میں معمول کے مطابق کام پر جانا تھا۔ میں گھر کے دوسرے افراد کی طرح بیٹے سے بھی ہاتھ ملا کر اور خدا

حافظ کہہ کر گھر سے نکلا۔ لیکن شہر ہیٹرس ہائم کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر جیسے ہی فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آئی، میں اس طرح اسے دیکھنے لگا جیسے ابھی اس میں سے میرا بیٹا اُترے گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بیٹا تو گھر پر ہے، میں کس کا انتظار کر رہا ہوں! اب بیٹے نے اپنی کار لے لی ہے اور وہ کار پر ہی آفس آتا جاتا ہے لیکن میں پھر بھی ہر بار فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کو ایسے دیکھتا ہوں جیسے میرا چھوٹا بیٹا اس میں سے اترے گا اور میں اس سے ہونے والی ہلکی سی ملاقات کی خوشگواری کو محسوس کروں گا۔ جاب پر جا کر سب سے پہلا کام یہ کرتا ہوں کہ ظہر اور عصر کی نمازیں جمع کر کے پڑھ لیتا ہوں۔

پچھلے دنوں جرمنی کی سب سے زیادہ مالیت ۳۵ ملین یورو کی لاٹری کے بخار نے پورے جرمنی کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ لاٹریوں کے چکر میں نہ پڑنے کے باوجود ۳۵ ملین اتنی بڑی رقم تھی کہ میں نے بھی اسے کھیلنے کا ارادہ کر لیا۔ کچھ خاص دعائیں پڑھ کر حصہ لے لیا۔ ۳۵ ملین یورو کا مطلب ہے ساڑھے تین کروڑ یورو۔ اور اس رقم کو پاکستانی مالیت میں تبدیل کیا جائے تو یونے تین ارب روپے بنتے ہیں۔

لاٹری کھیلنے کے بعد میں نے اس کا فیصلہ ہونے سے پہلے بہت سارے منصوبے بنا لئے تھے۔ جرمنی میں ہی ایک بڑا رہائشی منصوبہ، جس میں میرے سارے بچے اپنے اپنے گھروں میں ایک ساتھ ہوں گے۔ جرمنی میں ایک کمپنی کا قیام اور پاکستان اور انڈیا میں اس کمپنی کی طرف سے انویسٹمنٹ کے پروجیکٹس۔ بچوں کے لئے ان کے ذہنی میلانات کے مطابق جرمنی میں مناسب کاروبار۔ پاکستان میں اپنے پرانے گاؤں کے آس پاس ایک بڑی حویلی کی تعمیر۔ پھر بہت سارے قریبی عزیزوں اور دوستوں کے لئے بعض منصوبے، جن کے مطابق انہیں مالی امداد دینے کی بجائے اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑا کرنے کے منصوبے شامل تھے۔ اسی طرح بعض فلاحی پروگرام شروع کرنے کے خاکے۔ بہت ساری باتیں میرے ذہن میں آگئی تھیں اور میں نے خود کو ذہنی طور پر ان ساری ذمہ داریوں کے لئے تیار کر لیا تھا۔ جس دن شام کو قرعہ اندازی ہونا تھا اس دن میری معمول کی تلاوت کے دوران سورۃ انفال کی آیت انما اموالکم و اولادکم فتنہ نے مجھے ہلکا سا جھٹکا دیا۔ یہ آیت آج کے دن ہی کیوں پڑھنے میں آئی اور پڑھتے وقت اتنی توجہ کیوں کھینچ گئی؟ لیکن پھر میں نے اسے ایک اتفاق سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔

قرعہ اندازی کا شفاف عمل ٹی وی پر میں نے اور میرے بیٹے نے براہِ راست ایک ساتھ دیکھا۔ میرا بیٹا کافی جذباتی ہو رہا تھا۔ تب میں نے اسے سمجھایا کہ اگر انعام نکل آئے تو تب بھی اپنی حیثیت سے باہر نہیں ہونا۔ انعام نہیں نکلتا تو غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دونوں صورتوں میں خود کو نارمل رکھنا ہے۔ قرعہ اندازی ہوئی تو ہمارا انعام نہیں نکلا۔ ۳۵ ملین کا انعام کسی اور کو مل گیا۔ بیٹا میرے سمجھانے کے باوجود کافی افسردہ ہوا۔ میں اسے تسلی دیتا رہا۔ مجھے لاٹری کا بڑا انعام حاصل نہ کر پانے کا افسوس نہیں تھا لیکن اپنے کئی منصوبوں کے ادھورے رہ جانے کی تھوڑی سی حسرت دل میں ضرور ہونے لگی تھی۔ انعام نکل آنے کی صورت میں اگلے دن میں نے اپنی مزدوری والی جاب پر نہ جانے کا طے کر لیا تھا۔ انعام نہیں نکلا تو اگلے دن میں معمول کے مطابق اپنی جاب پر چلا گیا۔ جاب سے واپسی پر روز کے معمولات سے گزرتا ہوا، رات کا کھانا کھا کر چندمنٹ کی سیر کے لئے نکلا۔

اپنے گھر کے قریب کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اچانک مجھے عجیب سی روشنی محسوس ہوئی، سٹریٹ لائٹس سے بالکل مختلف، جیسے مستقبل کے کسی دَور کی کوئی روشنی ہو۔ اسی روشنی میں یکا یک ایک نوجوان دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے ایک بریف کیس مجھے تھماتے ہوئے کہا اس میں ۳۵ ملین یورو مالیت کے قیمتی ہیرے اور سونے کے بسکٹ ہیں۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ آپ اسے لے لیں، میری طرف سے آپ کے لئے تحفہ ہوا۔ اور پھر وہ نوجوان آناً فاناً غائب ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے میرے سارے منصوبے پورے کرنے کے لئے خدا نے کوئی آسمانی مدد بھیج دی ہے لیکن اس خیال کے ساتھ ہی پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دَم تیز ہو گئی۔ میں اپنی سیر کو ادھورا چھوڑ کر گھر کی طرف واپس پلٹا لیکن ابھی میں کا پنی بلڈنگ کے قریب ہی پہنچا تھا کہ سائرن بجاتی ایک پولیس کار میرے قریب آ کر رُک گئی۔ پولیس والے مجھ سے اُسی نوجوان کی بابت پوچھ رہے تھے لیکن میرے جواب دینے سے پہلے ہی اُن کی نظر میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس پر پڑ

گئی۔تب مجھے بائبل کی ایک آیت یاد آئی: "ہم سونے کو آگ سے اور انسان کو سونے سے آزماتے ہیں"

پولیس مجھے گرفتار کر رہی تی، اسی لمحے مستقبل کے کسی دور جیسی عجیب سی روشنی غائب ہوگئی اور میں نے سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں دیکھا کہ سڑک کے دوسری طرف پولیس نے ایک نو جوان کو گرفتار کیا ہوا ہے۔اس کا بریف کیس پولیس کی تحویل میں ہے۔وہ نو جوان بالکل وہی تھا جو کچھ دیر پہلے مجھے اپنا بریف کیس دے گیا تھا۔لیکن اب نہ تو میرے پاس کوئی بریف کیس تھا اور نہ ہی پولیس نے مجھے کوئی ہتھکڑی لگائی ہوئی تھی۔تو پھر جو کچھ مجھ پر گزرا، یا میں نے محسوس کیا وہ سب کیا تھا؟ کیا میں نے کوئی کشفی نظارہ سا دیکھا تھا یا کسی روشنی نے مجھے اپنے وقت سے چند منٹ پہلے کا سفر کرا کے پھر واپس اپنے مقام پر چھوڑ دیا تھا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔لیکن کچھ سمجھ آ بھی رہی تھی۔

کل رات والے نظارے یا تجربے کے بعد ساری رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آ سکی تھی اور آج جب میں جاب پر جانے لگا ہوں تو طبیعت کافی بوجھل ہے۔گھر سے باہر نکلا تو گہرے بادل اور دھند ایک دوسرے میں مدغم دکھائی دیئے۔ ہیڈرس ہائم ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو ریلوے کے عملہ کی طرف سے اعلان ہو رہا تھا کہ ویز بادن سے فرینکفرٹ جانے والی ٹرین دس منٹ لیٹ آ رہی ہے۔دھند لی فضا نے ریلوے اسٹیشن کی روشنیوں کو بھی مدھم کر رکھا ہے۔اس دوران فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین اپنے ٹھیک وقت پر آ گئی اور میں اپنی عجیب سی عادت کے مطابق دیکھنے لگتا ہوں کہ شاید میرا بیٹا اس میں سے اُتر کر آ رہا ہو۔فضا کی دھندلاہٹ کے باوجود واقعی میرا چھوٹا بیٹا انجن کے ساتھ والے ڈبے سے نیچے اُترا ہے اور میری طرف آ رہا ہے۔میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔لیکن جیسے جیسے میرا بیٹا قریب آتا جا رہا ہے، میری مسکراہٹ، حیرت آمیز ہوتی جا رہی ہے۔کیونکہ اب وہ میرا بیٹا نہیں لگ رہا بلکہ صاف طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ میرے ابا جی میری طرف آ رہے ہیں۔میں ابا جی کا استقبال کرنے کے لئے ان کی طرف آگے بڑھ کر جاتا ہوں۔لیکن جب ان کے قریب پہنچتا ہوں تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔یہ تو میں خود ہوں!

میں اپنے آپ سے گلے مل رہا ہوں اور ایسے لگ رہا ہے کہ میں خود سے نہیں بلکہ اپنے سارے آباو اجداد اور اپنی ساری موجودہ اور آنے والی نسلوں کو گلے مل رہا ہوں۔اسی حالت میں دیکھتا ہوں کہ فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آ رہی ہے۔دور سے اس کی ہیڈ لائٹ کی چمک اسٹیشن کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔

مجھے رات والا واقعہ یاد آ جاتا ہے اور میں مزید کسی حیرت میں پڑے بغیر یقین کر لیتا ہوں کہ فرینکفرٹ سے آنے والی جو ٹرین کچھ دیر پہلے آ چکی تھی، وہ دراصل اب آ رہی ہے، ٹرین اسٹیشن پر رُک رہی ہے اور میں اس کے سب سے اگلے ڈبے سے اپنے اترنے کا انتظار کرنے لگتا ہوں!

OOO

خالدہ حسین

پرندہ

ہاں! میں انہیں خوب پہچانتا ہوں۔ یہ اسی کے قدموں کی چاپ ہے۔ زینے پر پوری گیارہ سیڑھیاں۔ پھر دروازے کی ہلکی سی آہٹ۔ اور وہ قدم۔ نرم رواں بادلوں کے سے تیرتے قدم۔ ادھر اسی دہلیز سے اندر ہوں گے۔ اور اس کمرے کا وجود بدل جائے گا۔ میں بدل جاؤں گا۔ ایک ان دیکھا مفہوم اس کمرے میں، میرے، اس کے، ہر چیز کے گرداگرد تن جائے گا۔ وہ آہستگی سے اپنے سرد ہاتھ سے میری کلائی تھامے گی۔ اس کی بے وزن انگلیاں میری نبض ٹٹولیں گی اور گھڑی کی ٹک ٹک چاروں سمت فضا بن کر بہنے لگے گی۔

"گڈ" وہ سرہانے رکھے چارٹ پر جھک جائے گی۔

"رات نیند کیسی آئی؟" وہ کرسی میرے قریب کھسکا لے گی۔ تب مجھے وہ تمام باتیں بھولی بسری۔ دو. ...ٹی دہ، ادھر ادھر کونوں کھدروں میں پڑی، خاک اٹی یادیں آجائیں گی۔ ایک دم سے، ایک ساتھ ایک ہی ساعت میں۔ اور میں اسے بتاؤں گا دیکھو یہ جو ایک سیدھی لکیر کا تسلسل ہمارے تمہارے ذہنوں میں ہے سب فریب ہے۔ میں تو اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کہیں بھی کوئی پہلے یا بعد شروع اور آخر۔ آگے اور پیچھے نہیں۔ سب کچھ ایک ہی ہے ساعتیں ایک دوسرے میں گھل مل رہی ہیں۔ ایک محلول ہے، میرے سامنے۔ میری زبان پر۔ یا شاید میری آنکھوں میں۔ بے رنگ، بے ذائقہ محلول جس طرح بے کار، بے ذائقہ زبان۔ اور یہی سب کچھ ہے۔ دراصل وجود ہے۔ اور یہ سب کچھ میں اس سے نہایت آسانی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور وہ اسی ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ سمجھ سکتی ہے۔ مگر یہی کہتے کہتے میرے سب الفاظ گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ جب یہ خیال آتا ہے کہ اس کمرے کے بعد۔ آگے قطار میں اور بھی کمرے ہیں اور سب میں ایک ایک میں، ہاں ایک ایک میں اسی طرح بستر پر کسی ایک ساعت کا منتظر۔ اس سے خائف، اس سے پناہ لئے پڑا ہے۔ اور کیا معلوم میں ان میں سے کونسا ہوں۔ چنانچہ میں اس سے صرف اسی قدر پوچھتا ہوں۔

"کیا تم کو بھی ایک ساعت۔ ایک پیچھے پیچھے لپکنے والی ساعت کا انتظار ہے اور تم اس سے خائف ہو۔ ایک تجسس کے ساتھ؟"

"ہاں ہم سب اس کے منتظر ہیں۔ اس سے خائف ہیں اور متجسس۔"

"مگر تم ابھی۔ تمہیں مجھ پر کتنی ہی فوقیتیں حاصل ہیں!"

"تم نے پھر بھاری بھاری لفظ بولے۔ دیکھو میں یہ فوقیتیں وغیرہ نہیں سمجھتی۔ میں تو صرف اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ لفظ...... خالی لفظ نہایت مبتذل چیز ہیں۔"

"مبتذل؟ تو کیا تم بھی......"

"ہاں......تم عجیب آدمی ہو......نہ چاہتے ہوئے بھی میں تم سے وہ تمام باتیں کہہ دیتی ہوں جو میں کبھی کسی قیمت پر کسی اور سے نہ کہوں......لفظوں میں سوچنا......محسوس کرنا نہایت مبتذل حرکت ہے۔"

"تو پھر کس طرح سوچا اور محسوس کیا جائے۔" میں آپس میں محلول ہوتی ساعتوں میں بہہ گیا۔ ایک بے ذائقہ، بے رنگ احساس میری زبان پر تھا اور یہی سب پر محیط تھا۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔ اسی لئے میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔" اس نے کرسی کی پشت کے ساتھ سر لگا کے اطمینان سے کہا۔ مجھے اس کی خودفریبی پر ہنسی آگئی اور پہلی بار میں نے نہایت اعتماد کے ساتھ محسوس کیا کہ میں ہر طرح سے اس سے کہیں بہتر ہوں۔ اس پر فوقیت رکھتا ہوں۔

"شاید اس لئے کہ تم لکھ ہی نہ سکتی تھیں۔ تم اچھی رائٹر نہ تھیں لکھنے والے تو کبھی لکھنا نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ سب کے سب

ہم پیدا کرتے ہیں۔ وہ ... ں ہوا میں ...

لہٰذا یہ غلط ہے۔"

"مگر جب ہم لکھیں گے نہیں تو لفظوں میں سوچیں گے ضرور۔"

"اور سوچ۔ سوچ بغیر عمل کے نہایت مبتذل ہے۔"

"تو پھر ہم کیا کریں؟"

"عمل...... صرف عمل...... اور لکھنا اور سوچنا تو صرف نبیوں اور ولیوں کا حصہ ہے۔"

"تم بھی حیران کرتی ہو...... سخت حیران۔" میں نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہو...... لیٹے رہو...... اس نے آہستگی سے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کے مجھے لٹا دیا۔

اور مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں تو منتظر ہوں۔ وہ سب بھی منتظر ہیں اور یہ جو میرے سامنے بیٹھی ہے اس کو مجھ پر کتنی فوقیتیں حاصل ہیں۔ کوئی گننا چاہے تو نہ گن سکے۔

"دیکھو...... یہ سب انتہائی غلط ہے کہ ہم اپنی سوچ کو یوں بحث میں لائیں۔ آئندہ ہم ایسا نہیں کریں گے۔

"ہم"...... تو کیا میرے تمہارے درمیان وجود کے مفہوم کا کوئی رشتہ بھی ہے۔ اگر ہے تو یہ صرف میرے ساتھ نہیں ہے۔ ان باقی تمام کے ساتھ بھی ہے، تو تم اس طرح علامت سی بن جاتی ہے اور یہ سب نہایت غلط بات ہے۔ بہرحال میں تو تمہیں بتانے والا تھا کہ میں وہاں پھر گیا تھا۔"

"تم...... تم وہاں گئے تھے؟" وہ اپنی حیرت نہ چھپا سکی اور فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ رہی۔

"ہاں...... میں وہاں گیا تھا۔ مگر تم کب یقین کرو گی......" شاید میری آواز میں حد سے زیادہ آزردگی تھی۔

"نہیں...... نہیں...... اگر تم چاہو گے تو میں یقین کروں گی۔ تم وہاں گئے تھے؟"

"ہاں...... میں وہاں پھر گیا تھا۔ آج بھی دھوپ بہت تیز تھی۔ سڑک تپ رہی تھی۔ میرا سر یوں تھا جیسے کیتلی میں پانی ابلتا ہو۔ پیاس کے مارے زبان پر کانٹے پڑ گئے تھے۔ مگر سنو یہ کتنی عجیب بات ہے۔ وہاں کی سڑکیں بالکل ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ وہ کناروں کناروں سے، جہاں جہاں سے گلیوں کی اینٹیں کھڑی تھیں۔ اسی طرح تھیں۔ گھروں کی کھڑکیوں پر رنگین چقیں اس طرح گری تھیں۔ وہ کونے والا مائی جنت کا مکان ہے۔ اس کا بوریئے کا پردہ تو ہوا میں ہلتا تھا اور حد ہے اس نے اب تک اس کا سوراخ مرمت نہیں کیا تھا۔ نالیوں میں خربوزے کے بیج آموں کے چھلکے پڑے تھے۔ تو جب میں اسکول والی گلی پار کر کے آگے بڑھا تو میرے گھر کا لکڑی کا دروازہ ادھ کھلا تھا حالانکہ ان گلیوں میں بھیڑ بکریوں کا گھس آنا تو ایک عام سی بات ہے۔ پھر بھی ان لوگوں نے دروازہ کھلا رکھا تھا...... تو میں بغیر دستک دیئے اندر چلا گیا۔ اندر نہایت اندھیرا تھا اور ٹھنڈک۔ میں ڈیوڑھی پار کر کے صحن میں پہنچا تو بڑی اچھی پرسکون روشنی تھی۔ آنکھوں کو آرام دینے والی۔ سامنے برآمدے میں تخت پوش پر ماں بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔ اور حقے کی نے اس کے منہ میں تھی۔ مجھے دیکھ کر ماں نے کہا۔ "بڑی سخت لو چل رہی ہے۔ تم کہاں گلیوں میں مارے مارے پھرا کرتے ہو۔ چلو نمکین لسی کا گلاس پیو۔ وہاں میز پر جگ رکھا ہے۔ میں میز کی طرف بڑھا تو ماں نے پیچھے سے کہا۔

بغیر کچھ کہے سنے۔"

"میں......؟ ہاں تو کیا حرج ہے...... ہاں...... میں نے ہی رکھا ہے...... پھر......؟" میں غصہ میں باہر آ گیا۔ "کیا تم جانتی ہو وہ پنجرہ وہاں کیوں ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں...... میں نہیں جانتی۔ اور کیا تم جانتے ہو کہ وہ مکان، وہ گلیاں...... آج سے بیس برس پہلے کارپوریشن والوں نے ڈھادی تھیں۔ تمہاری ماں کی زندگی ہی میں؟"

"نہیں نہیں...... میں نہیں جانتا...... مگر اتنا جانتا ہوں کہ میں وہاں گیا تھا۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"ہاں...... تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا اب میں چلوں۔ وقت ہو گیا ہے۔" اس نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ مگر اس کے جانے کے بعد...... فوراً بعد میں نے اگلے روز اس کے آنے کی ساعت کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ساعتیں ایک دوسرے میں گھل مل کر سیال بنیں میری آنکھوں کا خون، پورے وجود کے اندر باہر چاروں سمت بہہ نکلی تھیں۔ اور وہ یہ کہہ گئی تھی کہ لفظوں میں سوچنا اور سوچ کے متعلق سوچنا نہایت مبتذل حرکت ہے۔ کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ وہ اور میں...... ہم دونوں ابتذال سے اس قدر خوفزدہ ہیں۔ مگر یہ کیا کہ وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی...... اسکی آنکھوں میں اس کی آنکھوں میں ایک جانتا ہوا سا...... راز بھرا احساس تھا وہ یقیناً جانتی ہے، سب جانتی ہے کہ وہ میرے برآمدے کی چھت سے لٹکتا پنجرہ وہاں کیوں ہے۔ کیا میں اسے وہاں رکھ آیا تھا؟ ماں کہتی ہے...... اور وہ اس پر لپٹا کپڑا؟ ہاں رات کو پرندے جانوروں سے ڈرتے ہیں...... شاید اسی لئے...... مگر ماں کہتی ہے وہ بیمار ہے۔ وہ پردہ ہٹا تو ڈر جائے گا، مر جائے گا۔ تو کیا وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی۔ شاید وہ مجھ سے چھپا رہی تھی۔ اب اس کے آنے کی ساعت، جو ایک روشن دیوار کی طرح کہیں میرے پیچھے کھڑی تھی۔ اور میں اس کے سایہ میں تھا۔ اب اس دیوار نور کے میرے قریب آنے میں آوازوں، لفظوں اور ادھوری حرکتوں کے رینگتے سرسراتے ٹکڑے حائل ہیں۔

اس کے قدموں کی چاپ پر میں سنبھل کر ہی بیٹھا۔ میرا روں رواں ساعت بن گیا۔ اور گھڑی کی ٹک ٹک کا سمندر چاروں سمت بہنے لگا۔

"گڈ......" اس نے آہستہ سے کرسی آگے کھسکائی۔ "رات نیند کیسی آئی؟"

"سنو روز تم مجھ سے پوچھتی ہو...... آج تم بتاؤ...... رات تمہیں نیند کیسی آئی؟" وہ کچھ ٹھٹھکی، پھر ہلکی سی مسکراہٹ سے کہنے لگی۔

"نیند......؟ نیند دراصل بہت ہی ذاتی قسم کی...... بے حد ذاتی قسم کی چیز ہے اور میں اس کا حجاب نہایت ضروری سمجھتی ہوں۔"

"تم مجھے حیران کرتی ہو۔" میں نے پھر کہا۔ "جب تم میں اور مجھ میں ایک خاموش معاہدہ ہے...... مگر میں تم سے یہی کہنے والی تھی کہ نیند سے پہلے کے چند لمحے وہ ہیں جب ہم بالکل تنہا اور ننگے ہوتے ہیں۔ اور ہمارے اردگرد کے تمام حصار ٹوٹ چکتے ہیں تو اس وقت محض ایک خوف مجھے گھیر لیتا ہے...... وہ تم جانتے ہو......؟"

"ہاں میرا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں۔"

''ہاں یہ خوف کہ یہ نہتہ لمحہ اگر کبھی ختم نہ ہوا تو...... اگر یہی ہمارے حصے کا تمام وقت بن گیا تو......؟''
''ہاں...... تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر تم کو مجھ پر اتنی فوقیتیں حاصل ہیں۔ تمہیں ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ تم خود کہتی ہو یہ مبتذل ہے۔''
''یہ سوچ نہیں......اس کے لفظ ہیں...... یہ تو احساس ہے۔
محض احساس...... دن کے اجالے میں ہم اپنے آپ کو دوسروں میں کھودینے کی کوشش کرتے ہیں سمجھتے ہیں کہ وہ لمحہ ختم ہوا۔
مگر یہ سب غلط ہے۔ رات، نیند اور فنا ہم پر تنہا آتی ہے۔ تم نے سنا...... تنہا۔''
''ہاں...... میں نے سنا...... میں نے سن لیا۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ یہ ممکن نہیں کہ یہ تنہا ہو کیا یہ ممکن نہیں؟ کیا یہ بالکل ناممکنات میں سے ہے؟'' میں نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے کہا...... مگر اس نے اپنے خوبصورت ہاتھ کے ذرا سے دباؤ سے مجھے لٹا دیا۔
'' لیٹے رہو...... لیٹے رہو۔ یہ میں نہیں جانتی......'' اس نے فوراً مجھ سے نگاہ چرائی۔ اور باہر کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔
''تمہیں معلوم ہے یہ خزاں کا موسم ہے۔ باہر ٹھنڈی تخ...... تیز ہوائیں چلتی ہیں خشک بالکل خشک۔ اور درختوں سے خشک پتے مسلسل ہر لمحہ۔ ہر آن گرتے چلے جا رہے ہیں۔ صبح و شام...... اور کبھی کبھی اچانک بے حد مصروفیت میں میں رک جاتی ہوں...... یک دم مجھے خیال آتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ میرا آخری دن ہے چنانچہ میں اس آخری دن کو دیکھتی ہوں۔
اس کی اترتی دھوپ کو اور جب دیواروں کو اور سوچتی ہوں یہ میرا آخری دن ہے۔ یہ کیسا لگتا ہے۔ اور شاید ہر کوئی کبھی کسی وقت اچانک رکتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ آخری دن ہے۔ مگر یہ بھول گئی ہم نے طے کیا تھا کہ کبھی اپنی سوچ پر بات نہ کریں گے۔''
''نہیں...... نہیں...... ہمیں ضرور بات کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ بہت سی باتیں جب نہ کی جائیں تو ٹھوس واقعہ بن جاتی ہیں اور پھر ان کو ختم کرنا ان سے بچنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔'' میں نے اسے روکنے کی نہایت کمزوری کوشش کی۔ وہ گھڑی دیکھ رہی تھی۔
''تم وقت کی اتنی پابند ہو...... کیوں اتنی پابند ہو۔ تم ایک لمحہ پہلے آتی ہو نہ بعد میں۔ دو پل رُک جانے کو کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔''
''کیوں...... یہ تو محض تمہارا خیال ہے۔ دراصل مجھے گھر وقت پر پہنچنا ہوتا ہے...... جب میں ان کو کھانا کھلاتی ہوں تو میری تمام بے کار سوچ مر جاتی ہے، میں خوش ہوتی ہوں۔ مگر پھر کچھ ہی دیر میں وہ لڑھکتے موتیوں کی طرح مجھ سے الگ۔ دور ہو جاتے ہیں اور عمل رک جاتا ہے۔ وقت رواں رہتا ہے، لفظ یلغار کرتے ہیں، اور یہ سب انتہائی بے سود ہے۔''
''ہاں...... تم ٹھیک کہتی ہو...... مگر......''
''اچھا...... دوا کھانا نہیں بھولنا...... اور سر او نچا رکھو ادھر تکیہ پر......''
وہ بادلوں کے سے تیرتے قدموں سے چلی گئی۔ اور دروازہ بند ہو گیا...... اوہ خدا...... اس کے جاتے ہی یہ مجھے اتنا کچھ یاد کیوں آ جاتا ہے۔ مجھے تو اس سے پوچھنا تھا اس پنجرہ کے متعلق اور اس کے اندر رہنے والے کے بارے میں۔ پھر یہ سب کچھ کل پر ملتوی ہو گیا۔ لیکن نیند سے پہلے کا ایک یہ نہتہ لمحہ اگر طویل ہو گیا۔ مخلول ہو گیا اور ساعتوں میں تو سب کا رنگ بدل جائے گا...... ذائقہ بدل جائے گا...... اور ہم سب کے سب اس میں بہہ جائیں گے۔
مگر اچانک مجھے برابر والے کمرے سے پلنگ اور کرسیاں گھسٹنے کی آواز آئی...... پھر بوجھ گھسیٹتے، بمشکل سیڑھیاں اترتے ناہموار قدموں کا ہجوم...... اور سب کچھ تھم گیا۔ تو یہ واقعی کسی کا، ساتھ والے کا آخری دن تھا۔ یہ کیسا تھا؟ میں نے کھڑکی میں سے باہر نظر دوڑانے کی کوشش کی...... وہاں کہیں کہیں اکا دکا پتے اڑ رہے تھے اور بس...... تو یہ دن بھی اور دنوں کا سا تھا۔ اور پھر ایک دم مجھے ہنسی آ گئی تو ایک بار پھر۔ ایک بار پھر وہ کوئی دوسرا تھا...... میں نہ تھا۔ میرے پیٹ میں ایک تاریک ہستی قل قل کرتی تھی۔ اچھا وہ کل سب سے پہلے مجھے یہی خبر دے گی۔
مگر میرا خیال غلط تھا۔ اس نے اگلے روز مجھے یہ خبر نہ دی۔ وہ اسی طرح ایک خوشگوار واہمے کی صورت وارد ہوئی میری نبض گنی۔ اور چارٹ پر جھک گئی۔ اس کی جھکی آنکھیں دیکھ کر مجھے گزری رات کی بھولی بسری ساعتیں یوں آئیں جیسے صدیوں پہلے کی

بات۔ اتنی جلد ان پر خاک اٹ گئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے خوشدلی سے پوچھا۔

''میری طرف دیکھو۔'' میں نے ڈوبتی آواز میں کہا...... میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان وجود کے مفہوم کا کونسا رشتہ ہے۔ مگر وہ اسی طرح جھکی چارٹ پر لکھتی رہی شاید وہ بھی اس رشتہ کا تعین کرنا چاہتی تھی۔ اور مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔ گرم لہو میری کنپٹیوں اور آنکھوں میں کھولنے لگا۔ میرا سر بھاپ بن کر اڑ گیا۔

''میری نبض نہ گنو...... میرا بلڈ پریشر نوٹ نہ کرو...... اس کاغذ کو چاک کر دو۔'' میں نے گویا زہر گلے سے اتارتے ہوئے کہا۔

''اگر تم نہ بھی آؤ تو کیا ہے۔ لیکن یہ تو تمہارا فرض ہے۔ مجھے بتاؤ اور تمہارا کیا کیا فرض ہے...... میں نے...... میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔'' میں نے غصہ سے کانپتی آواز میں کہا۔ میری مٹھیاں زور سے بھینچ گئیں۔

''سکون...... سکون...... لیٹ جاؤ......'' اس نے مجھے آہستگی سے لٹانا چاہا۔

''نہیں...... تم نے ایک ان کیا معاہدہ توڑا ہے۔ تم نے مجھ سے بہت کچھ چھپایا ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دینا چاہا۔ مگر مجھ میں اتنی قوت کہاں تھی۔ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھی رہی۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ خاموش رہی اور گھڑی ٹک ٹک بولتی رہی۔

''سنو...... اگر سن سکتی ہو تو سنو...... میں وہاں پھر گیا تھا۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ تم کچھ نہیں جانتیں...... جب آج میں وہاں گیا تو ماں وہاں تخت پوش پر بیٹھی چاول چن رہی تھی اور گھر کا آنگن ایسا تھا جیسے ابھی ابھی ابا جی ناراض ہو کر، بول بول کر، باہر نکلے ہوں...... ماں نے کہا بیٹھ جاؤ۔ آج جانے کیا بات ہے اس میں کوئی آواز نہیں آ رہی...... کوئی ہل جل نہیں۔''

''کس میں سے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے برآمدے کی چھت سے لٹکے اس ڈھکے ڈھکائے پنجرہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے لپک کر اٹھا کہ دیکھوں کیا بات ہے۔ مگر ماں نے مجھے روک دیا۔

''نہیں نہیں...... رہنے دو۔ بیمار ہے بیچارا۔ ڈر جائے گا۔ مر جائے گا۔ وہ آتی ہی ہوگی۔ خود ہی دیکھے گی۔''

''وہ کون......؟'' میں نے پوچھا تو اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا...... میں نے دیکھا وہاں تم کھڑی تھیں...... تم...... اور تم کہتی ہو تم وہاں کبھی نہیں گئیں۔''

''میں کھڑی تھی؟'' وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔

''ہاں تم...... اور پھر جانتی ہو سب سے بڑا نبیٹہ لمحہ وہ تھا جب تم نے مجھے دیکھنے کے باوجود نہ دیکھا۔ تم چپکے سے آئیں پنجرہ کا غلاف اٹھایا...... پھر تمہارے منہ سے عجب حقارت اور کراہت بھری آواز نکلی ''اوں ہوں'' تم نے انگلی اور انگوٹھے کے درمیان اسے کنڈے سے اٹھایا۔

''اوں ہوں...... سب کا سب کیڑوں سے بھرا ہے......'' تم نے پنجرے کا دروازہ کھول کر اسے زور سے باہر نالی میں الٹ دیا...... اس کو جو اس کے اندر تھا۔ اس کے گرنے کی آواز آئی...... میں آگے لپکا کہ دیکھوں...... اسے دیکھوں۔ مگر تم راستے میں کھڑی تھیں اور مجھے اس خوف نے آ دبایا کہ کہیں یہ اس نبیٹے لمحے کا آغاز نہ ہو اور میں رو گیا۔ چلا آیا...... چلا آیا بھاگتا ہوا۔ دیکھو میرے پاؤں میں چھالے پڑے ہیں۔''

نہیں...... نہیں...... مجھے نہیں دکھاؤ......'' اس نے میری پیشانی پر اپنے خوشگوار ٹھنڈک بھرے ہاتھ رکھے۔ ''مجھے نہیں دکھاؤ۔ یہ ہمارا معاہدہ ہے...... ہم ایک دوسرے کے زخم نہیں دیکھیں گے مگر کیا تمہیں یقین ہے کل رات جو آوازیں برابر کے کمرے سے آئیں وہ اسی کمرے کی تھیں تمہارے کی نہ تھیں؟

ooo

رشید امجد

دشتِ امکاں

خزانے والا خواب برسوں پرانا تھا،
ایک صبح ناشتہ کرتے ہوئے ماں نے کہا تھا "مجھے یقین ہے کہ اس گھر میں کہیں خزانہ ہے"۔
ان کی خاموشی پر وہ جھجک سی گئی "رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا ہے"۔
اس نے پوچھا "کون سا خواب"؟
"وہی خزانے والا، میں وہاں تک پہنچ بھی گئی تھی"۔
اس نے ہنستے ہوئے کہا "تو پھر نکال کیوں نہ لائیں؟"
"بس" ماں نے جھرجھری لی "میں وہاں تک پہنچ تو گئی لیکن......" "لیکن کیا؟" چھوٹی بہن نے جلدی سے پوچھا۔
"جب میں ہاتھ بڑھا کر اٹھانا چاہا تو......" ماں نے پھر جھرجھری لی، ایک لمحہ کیلئے جیسے خواب اُس کی آنکھوں میں مجسم ہو گیا "کسی نے میری کلائی پکڑ لی"۔
وہ ہنس پڑا "خزانے کے سانپ کی بات تو سنی ہے لیکن سانپ نے کلائی کب سے پکڑنی شروع کر دی ہے"۔
ماں نے بُرا سا منہ بنایا اور بولی "تم تو بس مذاق ہی اڑانے کیلئے ہو، لیکن میں سچ کہتی ہوں اس گھر میں کہیں خزانہ ضرور ہے، ایک دن تم...... یاد رکھنا بس"۔
اس نے کندھے جھٹکے "جلدی سے چائے بنا دیں، دفتر دیر ہو رہی ہے"۔
بس میں سوار ہوتے ہوئے اسے لمحہ کیلئے ماں کی بات یاد آئی اور خزانے کی نرم نرم گرمی اس کے جسم میں لہراتے لمس کی طرح رقص کرنے لگی، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی نظریں اگلی سیٹوں سے چپکیں، وہ ابھی ابھی سوار ہوئی تھی اور کن آنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نظروں ہی نظروں میں سٹاپ آ گیا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے سرگوشی کی "واپسی پر چائے کا کپ چلے گا نا"۔
وہ مسکرائی اور اٹھلاتی ہوئی آگے نکل گئی۔
چائے پیتے ہوئے وہ چپ چپ رہی۔
اُس نے پوچھا "کیا بات ہے آج ہیڈ مسٹریس سے ڈانٹ تو نہیں پڑی"۔
"نہیں تو"
"پھر"
"بس اب تم ماں جی کو ہمارے گھر بھیج ہی دو"۔
وہ چپ ہو گیا، بہت دیر چپ رہا، پھر بولا "بھیج دینے میں تو ہرج نہیں اور ماں آنا بھی چاہتی ہے لیکن......"
"لیکن کیا؟"
"سوچتا ہوں کچھ ہاتھ کھل جاتا تو اچھا تھا"۔
ایک لمحہ کیلئے اسے خزانے کا خیال آیا، کیا معلوم واقعی گھر میں کہیں خزانہ ہو، اگر ہاتھ آ جائے تو، ایک گرم لہر نے اس کے اندر انگڑائی لی،
"کیا بات ہے؟" وہ ہنسی "اندر ہی اندر مسکرا رہے ہو"۔
"بس ایسے ہی" اس نے سر ہلایا "خواب بھی عجب چیز ہیں"۔

''سوچتا ہوں اگر خواب نہ ہوتے تو ہم جیسوں کا کیا بنتا''۔
وہ ہنسی ''اُسی تنخواہ پر گزارہ کرتے''۔
چند لمحے خاموشی رہی، پھر بولی ''تو کب آ رہی ہیں ماں جی؟''
''جب کہو'' اس نے شانے اچکائے ''لیکن بہنوں کی شادی ہو جاتی تو اچھا تھا باپ تو میرا ہے نہیں، آخر یہ سب کرنا تو مجھے ہی ہے''۔
''تو مل کر کریں گے'' اس نے اس کا ہاتھ دبایا ''اب تم اکیلے ہو، پھر میں تمہارے ساتھ ہوؤں گی''۔
وہ کچھ نہیں بولا، بس خیال سا آیا کہ کیا معلوم گھر میں کہیں خزانہ ہو ہی؟
رات کو کھانا کھاتے ہوئے اس کا دل چاہا کہ ماں خزانے والی بات پھر چھیڑے، لیکن ماں کو اُس رات گیس اور بجلی کے بلوں کی فکر تھی کہ اگلے دن ان کی آخری تاریخ تھی۔
پھر کئی ماہ گزر گئے۔ خزانے اور خواب آئے گئے ہو گئے۔ اس دوران ماں اُس کی شادی کی بات پکی کر آئی۔
ایک صبح ناشتہ کرتے ہوئے ماں نے پھر خزانے کا ذکر چھیڑا اور بولی ''رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا ہے لیکن بس'' لمحہ بھر چپ رہنے کے بعد بولی ''بس کوئی میری کلائی پکڑ لیتا ہے ٹھنڈے برف ہاتھ والا''۔
بہن نے پوچھا ''آپ نے مڑ کر نہیں دیکھا کہ وہ کون ہے؟''
ماں نے خوف سے جھرجھری لی ''ایک ٹھنڈا برف ہاتھ، میرا تو سارا جسم کانپنے لگتا ہے اور پھر آنکھ کھل جاتی ہے''۔
وہ بولا تو کچھ نہیں لیکن سوچا، کیا معلوم واقعی یہاں خزانہ ہو، اور یہ کوئی غیبی بشارت ہی ہو؟
اگلے دن ماں اور بہنوں نے اس کے سسرال تاریخ مقرر کرنے جانا تھا۔
وہ گھر میں اکیلا رہ گیا، کچھ دیر پڑھتا رہا، پھر جانے کیسے خزانے کا خواب آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس کے اندر داخل ہوا اور لمحوں میں سارے وجود پر پھیل گیا۔
اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور سوچنے لگا کہ اگر خزانہ ہے تو کہاں ہو سکتا ہے؟
برسوں سے خزانے کا ذکر سنتے سنتے ایک دو جگہیں اس کے ذہن میں کلبلاتی رہتی تھی، لیکن دوسروں کی ہنسی اور اس خوف سے کہ کہیں اس کے تجسس کا مذاق نہ اڑایا جائے اُسے کبھی انہیں دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اب گھر خالی دیکھ کر اس نے پرانے تھیلے سے چھینی اور ہتھوڑا نکالا اور بڑے دلان کی الماری کے آخری خانے کی طرف چل پڑا۔ یہ خانہ اسے ہمیشہ اندر سے کھوکھلا محسوس ہوا تھا۔ کیا معلوم اس کے نیچے کوئی خفیہ خانہ ہو اور اس میں، تختہ نکالتے نکالتے اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا، لیکن خزانے کے گرم گرم لمس نے درد کا احساس ابھرنے نہ دیا۔ خانے کے نیچے کچھ بھی نہیں تھا۔
لیکن وہ مایوس نہیں ہوا۔
سونے کے کمرے کے فرش کا ایک ٹکڑا بھی اسے مشکوک لگتا تھا تختے کو اپنی جگہ جما کر اُس نے سونے والے کمرے کی غربی دیوار کے ساتھ کی ان دو اینٹوں کو نکالا جو ذرا مختلف انداز سے لگی ہوئی تھیں۔ لیکن وہاں سے بھی کچھ نہ نکلا۔ ایک دو جگہیں اور بھی تھیں لیکن گھر والوں کی واپسی کا وقت ہوا جا رہا تھا۔
اگلے چند دن شادی کی تیاریوں اور ہنگاموں میں گزر گئے۔ بیوی کے آنے سے گھر میں کچھ آسانیاں ہو گئیں۔ اس کی تنخواہ نے کئی رکی ہوئی ضرورتوں کو پہیے لگا دئے۔ جہیز کی چیزوں نے خالی گھر کو بہت حد تک بھر دیا۔
اگلے دو سالوں میں بہنیں بھی بیاہ کر اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔
اس دوران ماں کبھی خواب کا ذکر کرتی تو چند دنوں کیلئے خزانے کا تصور اسے ایک نئی گرماہٹ سے آشنا رکھتا۔ وہ موقعہ دیکھ کر مختلف جگہوں کی کھدائی کرتا رہتا۔ مایوس ہوتا، چند دن بعد کسی دوسری جگہ کا انتخاب کرتا، کچھ دن خزانے کا خواب اسے اپنی نرم گرم بغل میں دبائے رکھتا پھر آہستہ آہستہ زندگی کی رواروی کی ٹھنڈک اس پر غالب آ جاتی۔

ماں بھی اب خزانے کا ذکر سب کے سامنے نہ کرتی شاید اسے بہو کے سامنے اپنے خواب کا ذکر کرتے جھجک آتی تھی۔
لیکن کبھی کبھی جب بہو باورچی خانے میں ہوتی تو اِدھر اُدھر دیکھ کر سرگوش کرتی ،خزانہ کہیں ہے ضرور"
وہ سنجیدگی سے پوچھتا" لیکن کہاں؟"
اور کبھی مذاق سے کہتا" تو کیا سارے گھر کو کھود ڈالوں ،ایک گھر ہی تو ہے ہمارے پاس"۔
ماں چپ ہو جاتی اور خزانے کے ذکر پر کئی کئی مہینوں کی دھول پڑ جاتی ،لیکن مرنے سے چند روز پہلے وہ تواتر سے خزانے کا ذکر کرنے لگی۔ ناشتہ کی میز پر جونہی بہو کچھ لینے اِدھر اُدھر ہوتی وہ سرگوشی میں کہتی" پھر وہی خواب ،ضرور یہ کوئی غیبی بشارت ہے"۔
بظاہر وہ اس کی بات پر توجہ نہ دیتا لیکن اندر ہی اندر اسے یقین سا ہونے لگتا کہ خزانہ کہیں ہے ضرور ،سب کی نظریں بچا کر وہ ان جگہوں کو بار بار دیکھتا جن کے بارے میں اسے شبہ تھا کہ وہاں خزانہ ہو سکتا ہے۔
ماں کے مرنے کے بعد بھی خزانے کا تصور اس کے ذہن سے پوری طرح محو نہ ہوا۔ مرنے سے ایک دن پہلے اُس نے پھر کہا تھا" میرا خواب جھوٹا نہیں ہو سکتا یہ تو غیبی اشارہ ہے"۔
جب کبھی گھر خالی ہوتا تو وہ پرانے تھیلے سے اپنے اوزار نکال کر مختلف جگہیں ٹٹولتا۔ واپسی پر اسکی بیوی کسی اکھڑی ہوئی اینٹ یا الماری کا ٹوٹا خانہ دیکھ کر استفسار کرتی تو وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے ٹال دیتا ،کچھ دن کیلئے خزانے کا تصور دھندلا جاتا۔
پھر کسی صبح ماں یاد آ جاتی تو خزانہ بھی چمکنے لگتا اور جب بیوی بچوں کو لے کر کسی دن میکے جاتی تو وہ اپنے اوزاروں کے تھیلے کو نکال لیتا ،ہاتھ زخمی ہوتے ،دیواروں کا کھڑا پلستر گھر کی خستگی میں اور اضافہ کر دیتا۔
پھر متعدد الماریوں ،دیواروں اور فرش کے حصوں کو اکھیڑ اکھیڑ کر وہ خزانے سے مایوس ہو گیا اور رفتہ رفتہ کئی سالوں میں خزانے کا خواب ،اسی کی گرماہٹ اور چمک اس کی زندگی سے نکل گئی۔
لیکن اب برسوں بعد ناشتہ کرتے ہوئے جب اُس کے بیٹے نے یہ کہا کہ" ابو میرا خیال ہے اس گھر میں کہیں خزانہ ہے" تو وہ چونک پڑا۔
"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"
بیٹا ایک لمحے چپ رہا پھر بولا" ابو میں نے رات خواب دیکھا ہے"
جواباً وہ کچھ نہیں بولا اسے یاد آیا کہ اگلے ماہ وہ دونوں میاں بیوی ریٹائر ہو جائیں گے تو گھر کا سارا بوجھ بیٹے پر آن پڑے گا۔ اُس نے اپنے کندھے پر اُس ٹھنڈے برف ہاتھ کی ٹھنڈک کو محسوس کیا۔ ایک انجانا خوف اس کے سارے وجود پر چھا گیا۔ بڑی حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے سوچا" شاید وارثت میں خواب بھی منتقل ہو جاتے ہیں"۔

ooo

سمندر شفاف دیوار کے اس پار دور تک سویا ہوا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سوتا ہوا سمندر کروٹ بدل کر اپنی کہنیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ آج کی رات بھی ایک ایسی ہی رات ہے۔ آج شام ہی سے سمندر اپنی کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن نہ جانے کیا چیز اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔ میں بہت دیر سے یہاں بیٹھی سمندر کو دیکھ رہی ہوں اور آج پر ہی کیا موقوف ہے، میں تو ہر شام یہاں آ بیٹھتی ہوں، اور اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا، جب وہ تمام زنجیریں توڑ کر اٹھ بیٹھے گا، اور میرے پاس چلا آئے گا۔ میں ایک ایسی ہی رات کا نہ جانے کتنی راتوں سے انتظار کر رہی ہوں۔ یہ راتیں جو پھیل کر صدیاں بن گئی ہیں، اور کٹتی ہیں، تو عذاب کا ایک جہنمی لمحہ......

سمندر میں دور بہت دور کھڑے ہوئے جہازوں پر جو روشنی ہے، وہ میری آنکھوں کے الاؤ ہیں، جن میں انتظار کے تناور درختوں کی بریدہ شاخیں جل رہی ہیں۔ میں یہ بات جان گئی ہوں کہ میری آنکھیں یہاں ہیں اور روشن الاؤ میں۔ سمندروں کی لہروں میں اور ستاروں کے قلب میں اور میری یہ تمام آنکھیں جو اَن گنت ہیں، مجھے شیشے کی اس دیوار کے پیچھے دیکھ رہی ہیں۔

تم نے کبھی انتظار کو انتظار کے مقابل دیکھا ہے؟ اگر نہیں دیکھا، تو مجھے دیکھو، میری آنکھوں کو دیکھو، جن میں تمہیں اپنی آنکھیں نظر آئیں گی......لیکن اگر یہ تمہاری آنکھیں ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر میری آنکھیں کہاں ہیں؟ یہ فیصلہ کون کرے گا؟ یہ فیصلہ میں کروں گی یا سمندر؟ میری آنکھوں کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ ریت کے ذرّے کریں گے، یا ہوا کے جھونکے؟ یا پھر رات کے وہ آنسو جو کشتیوں اور آبی پرندوں کی شکل میں شیشے کی دیوار پر بہہ رہے ہیں، یہ فیصلہ آخر کون کرے گا؟

میں تمہیں بتاتی ہوں کہ یہ فیصلہ کوئی نہیں کرے گا، اس لئے کہ یہاں کون ہے، جو دوسروں کے لئے حکم بن سکے۔ یہاں کی ہر شے خود ہی مدعی ہے، خود ہی مدعا علیہ، اور خود ہی منصف......وجود کی عدالت تنہائی کی عدالت ہے، اور جب کوئی حتمی اور آخری فیصلہ سننے کے لئے میں حجرۂ ذات میں جھانکتی ہوں، تو دیکھتی ہوں کہ سفید محرابوں اور گنبد نما چھت والے اس حجرے میں انسانوں کا ہجوم ہے، اور اس ہجوم کے شانوں سے شانے ملائے خداوندوں اور دیوتاؤں کے پرے ہیں، اور سب سے آگے اور سب سے الگ خداوند خدا ہے، جو داناؤں کے کہنے کے مطابق محرکِ اوّل ہے اور انہی کے کہنے کے مطابق خود حرکت نہیں کرتا۔

ذہن مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے، اور میں جان لیتی ہوں کہ یہ تنہائی کی عدالت ہے۔ یہ جان کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے، میں اور مجھ ایسے دوسرے کتنے عیار ہیں کہ تنہائی کی عدالت میں بھی ہجوم میں اور حرکت میں ہیں۔ اور دوسری طرف خداوند خدا ہے، جسے فرض کیا گیا، پھر اپنے آپ پر فضیلت دی گئی، اور محرکِ اوّل قرار دے کر حرکت سے محروم کیا گیا، اور اس طرح اسے یکسر تنہا کر دیا گیا۔ شاید میں اور مجھ ایسے دوسرے لوگ ایذا رسانی کی انتہاؤں کو پہنچے ہوئے ہیں۔

حجرۂ ذات کے فرش پر لمحوں کا ایندھن دہک رہا ہے، اور اس کا پرتو وجود کی دیواروں پر عجب سریت آمیز نقوش بناتا اور بگاڑتا ہے۔ دھوئیں کی چادر ہے، اور اس مدھم سی روشنی کی تحریر ہے۔ روشنی کی یہ تحریر ان شکلوں کو واضح کرتی ہے جو اس گنبد نما چھت میں آویزاں ہے۔ ان شکلوں کو پہننے والوں میں سے کچھ الٹے لٹک رہے ہیں اور کچھ سیدھے، کچھ نے فرشتوں سے پر مستعار لئے ہیں، اور طاقتِ پرواز کی تلاش میں ہیں، اور وہاں وہاں بعض دراز داڑھیوں والے بھی ہیں، اور جو اپنے ہاتھوں میں دانائی کے موتی لئے بیٹھے ہیں اور انہیں نوحِ گل پر ٹانکتے چلے جاتے ہیں۔ لمحوں کے دہکتے ہوئے ایندھن کا پرتو ان شکلوں کو کبھی اجاگر کرتا ہے، اور کبھی تمام مناظر دھندلا جاتے ہیں، لیکن خداوند خدا کا وجود ان سب سے الگ ہے، ہر منظر سے جدا......اس لمحے مجھے یونانی

یاد آتے ہیں کہ وہ مجھ سے اور میرے لوگوں سے زیادہ خدادوست تھے، وہ اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اپنی ہی خامیوں اور اپنی ہی خوبیوں کے سانچے میں ڈھالتے تھے اور انہیں تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔

میں خداوند خدا کے چہرے پر تنہائی کی اذیت ناک تحریک دیکھتی ہوں، اور اس کے اردگرد پھیلے ہوئے مہیب اور تنہا سناٹے کی گونج سنتی ہوں، تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے ایک آئینہ رکھ دوں اور اس طرح وہ جس نے کبھی اپنا چہرہ نہیں دیکھا، اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھے، اور اسے اپنی دوسراہٹ سمجھے، اور دوسراہٹ سے باتیں کرے۔ لیکن جب میں اس کے سامنے آئینہ رکھنا چاہتی ہوں، تو دیکھتی ہوں کہ حجرۂ ذات سراب ہے اور اُس کی گنبد نما چھت پر بنی ہوئی اشکال بھی محض خیال کا پھیلایا ہوا جال ہیں، اور حقیقت تو کچھ یوں ہے کہ میرے سامنے شیشے کی دیوار ہے، اور اس کے پار سمندر ہے، اور تاروں بھرا آسمان ہے، اور ریت کے ان گنت ذرے ہیں، اور میری پشت پر پتھر کی دیوار ہے، جو ریت کے ان گنت ذروں کو سمندر کے پانی سے گوندھ کر بنائی گئی ہے، اور جس پر ستاروں جیسی خنک روشنی دینے والا دودھیا بلب روشن ہے۔ پتھر کی اس دیوار میں ایک طاق ہے، اس طاق میں ایک گھڑی رکھی ہے، جس کے ڈائل کا رنگ سیاہ ہے، جس کے ہندسے سنہری رنگ کے ہیں اور ان ہندسوں کا بوسہ لینے والی سوئیاں بھی سنہری ہیں۔

میں یہاں بیٹھ کر سمندر کا انتظار کرتی ہوں، تو حرکت کرتی ہوئی یہ سوئیاں سرگوشی کرتی ہیں۔ ان سرگوشیوں نے بھی مجھے بتایا ہے کہ فراق، وصال کی دوسری جہت ہے، اور کائنات میں انتظار کہیں نہیں ہے، اور یہ بھی کہ وقت لامحدود ہے، اور اس کے ساتھ ہی محدود بھی۔ کیونکہ وہ کائنات کی مانند ایک دائرہ ہے، جو کہیں سے شروع نہیں ہوتا، اور نہ کہیں ختم ہوتا ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم وقت کو خطِ مستقیم میں سفر کرنے والی غیر محسوس اور نامعلوم شے سمجھتے ہیں اور ہم یہ نہیں سمجھتے کہ وقت گردش میں ہے اور اس گردش نے ایک دائرے کو جنم دیا ہے، اور دائرہ جب مکمل ہو جاتا ہے تو پھر اس کے بارے میں کون بتا سکتا ہے کہ اس کا نقطۂ آغاز کہاں ہے، اور انجام کہاں...... وقت بھی کبھی نہیں گزرتا، ہمیشہ لوٹ آتا ہے، کیونکہ گردش کرنے والی چیز اپنے آغاز کی طرف لوٹتی ہے، اور کتنی عجیب بات ہے کہ آغاز ہی انجام بھی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بھی غلط ہے کہ وقت اپنے آغاز کی طرف لوٹتا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ وقت گردش میں ہے، اور ہم سب اس گردش کا ایک حصہ ہیں جو وقت ہم پر سے پہلے گزر چکا ہے، اس کا کوئی حصہ یا ذرہ اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ لیکن ہم کچھ نہیں جانتے، کچھ نہیں سمجھتے۔ وقت کائنات کے دائرے میں گردش کرنے والی دھول ہے، جو ہمارے سروں پر جمتی ہے، تو بڑھاپا بن جاتی ہے اور ہمارے بدن سے لپٹتی ہے، تو ہم مٹی میں مل جاتے ہیں۔ وقت خاک ہے اور باد ہے، وقت خدا ہے، اور کائنات ہے، وقت سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔

میں وقت کو شکل دینا چاہتی ہوں، اس کی تجسیم چاہتی ہوں اور جب یہ خواہش مجھے ہلاک کرنے لگتی ہے تو میں کائنات کے تمام رنگ اپنی ہتھیلی پر سجا لیتی ہوں، اور مشتری کی انگلی سے وقت کے خدوخال کھینچنا چاہتی ہوں، لیکن وقت کی فراخی، وسعت اور اس کی ازلیت اور ابدیت میری آنکھوں کی پتلیوں پر اپنی کوئی شبیہ اپنی کوئی تصویر نہیں بننے دیتی۔ میں سوچتی ہوں کہ وقت کا تصور کس طرح قائم کروں کہ گویائی اس کے نقش ونگار بیان نہیں کر سکتی اور بینائی اس کے دیدار سے قاصر ہے۔ بس یوں ہے کہ وقت کو الفاظ کے ذریعہ بیان کرنے کی کوشش بیکار ہے اور اس سے منسوب کی جانے والی تمام اشکال جھوٹی ہیں، بے سروپا ہیں۔

خاک بر فرق وسرِ تمثیلِ من

وقت نے کائنات میں عجب بساط بچھائی ہے، اس کے کھیل کا انداز نرالا ہے، اس کے مہروں کا کوئی رنگ نہیں، ان کی کوئی شکل نہیں، اور اس کا کوئی حریف نہیں۔ وہ خود اپنا مقابل ہے، اور اس کی غیر مرئی انگلیاں کائنات کے بساط کے مہروں کو گردش میں لاتی ہیں، کبھی وہ اپنے آپ سے جیت جاتا ہے، اور کبھی اپنے آپ کو آن کی آن میں شہ مات دے دیتا ہے۔ یہ بھی اس کے کھیل کا ایک حصہ ہے کہ میں اب اپنے سامنے یوں بیٹھی ہوں، جیسے آئینہ آئینے کا سامنا کرے۔ میں سامنے والے اپنے وجود کو چھوتی ہوں، لیکن وہاں کچھ بھی نہیں ہے، سب کچھ خواب درخواب ہے، اور سراب اندر سراب...... خلاء ہے، کائنات بھی معدوم ہے، اور سمندر کی لہریں جو مجھے نظر آرہی ہیں، وہ بھی کہیں نہیں ہیں۔ میری آنکھیں جن چیزوں کو دیکھ رہی ہیں، میرے ہاتھ انہیں چھونے